اس کے علاوہ پانچ سال کی قلیل مدت میں اتحاد پارٹی کی کوششوں سے ناساز گار حالات کے باوجود

(۱) مالیہ میں چھ کروڑ کی تخفیف ۔

(۲) آبیانے میں ساڑھے سینتیس لاکھ سالانہ کی تخفیف ۔

(۳) حکومت کے اخراجات میں دو کروڑ روپے سال کی کمی عمل میں آئی ۔

اتحاد پارٹی کی خدمات تو ایک ضخیم کتاب میں سما سکیں گی - چند موٹی موٹی باتیں اوپر درج کی گئی ہیں - ان مشکور مساعی کی قدر و منزلت میں یہ خیال کر کے اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ اتحاد پارٹی اقلیت میں تھی اور حکومت اس پارٹی کے مخالف ممبرانِ کونسل کی مدد سے قدم قدم پر اتحاد پارٹی کو ناکام بنانے کے درپے رہی ۔

اس سے یہ اندازہ کرنا بیجا نہ ہوگا کہ جدید انتخاب میں اتحاد پارٹی جب خود مختارانہ حیثیت میں حکومت کے نظم و نسق کی مالک ہوگی - تو سارا صوبہ چند سال میں زندگی کی شادابیوں سے لہلہا اٹھے گا ۔

آنریبل وزیر تعلیم پنجاب

آنریبل سر شہاب الدین قبلہ کا بحیثیت وزیر تعلیم تقرر سارے صوبے میں استحسان کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے - غیر مسلم طبقات اس تقرر سے مطمئن اور صوبے کے مسلمان مسرور ہیں ۔

اگر ایک جانب انہوں نے ایک یورپین ڈویژنل انسپکٹر کو تبدیل کر کے ایک قابل ترین مسلم ماہر تعلیم کو اس منصب پر سرفراز کیا تو دوسری جانب ہندو ڈویژنل انسپکٹر کی جگہ ہندوؤں کے لئے محفوظ رکھتے ہوئے رائے بہادر منوہن آئی، ای، الیس کو اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر فرما کر اپنی مدبرانہ رواداری کا بہترین ثبوت دیا ہے ۔

صوبے کی اتحاد پارٹی کے ایک سربرآوردہ لیڈر سے اسی حق رسانی اور اسی تدبر کی توقع کی جاتی تھی - یقیناً رائے بہادر منوہن اپنی کاردانی، تجربے اور قابلیت کے پیش نظر اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق تھے - اور شکر ہے کہ ہمارے آزاد خیال اور جمہوریت پسند وزیر نے فرقہ وارانہ فضا سے بلند ہو کر اس استحقاق کو ہندو مسلم سوال پر قربان ہونے سے بچا لیا ۔

حکومت کا یورپین اسٹاف اگر ایک محاذی طاقت ان کی راہ میں حائل نہ کر دیتا تو مسٹر پارکنسن کی جانشینی خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب کے حصے میں ضرور آتی - مگر سب جانتے ہیں کہ موجودہ دستورِ حکومت میں وزراء بالکل آزاد نہیں ہیں ۔

آنے والے نئے کانسٹی ٹیوشن میں وزارت ایک آزاد طاقت ہوگی ۔

اُس وقت ہر وزیر اہل صوبہ کے استحقاقِ قابلیت میں مداخلت بیجا کی آزادی سے روک تھام کر سکے گا - اس پابند فضا میں بھی آنریبل سر شہاب الدین نے جس پامردی سے حق رسانی اور رواداری کی روایات کو قائم رکھا - یہ انہیں کا حصہ ہے ۔

محکمہ تعلیم پنجاب کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر

یہ مسرت آفریں اطلاع پنجاب کی تعلیمی فضا میں موجب طمانیت ہوگی کہ مسٹر آرم سٹرانگ کے ڈائرکٹر تعلیم ہونے پر رائے بہادر منوہن آئی ای الیس اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنا دئے گئے - اس عہدے کے لئے رائے بہادر موصوف کا انتخاب بہت ہی موزوں ہوا ہے - اس صوبے میں اُن کی گراں اور دیرینہ تعلیمی خدمات کار آگہی اور قابلیت انہیں اس منصب کا اس سے بہت پہلے مستحق بنا چکی تھی ۔

ہم اس موقع پر رائے بہادر مسٹر منوہن کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔

امید ہے کہ وہ اپنے عہد انتظام میں محکمۂ تعلیم کے مستقل اجارہ دار پبلشروں کے ہمہ گیر تسلط کا خاتمہ کر دیں گے - تعلیمی لٹریچر کے نام سے جس خرافات کی اشاعت ہو رہی ہے - اس کا استیصال کر کے کام کے مصنفین کی دماغی جولانیوں کے لئے میدان پیدا کریں گے ۔

ورنیکولر ایجوکیشن انسپکٹر پنجاب

محترم ملک غلام رسول شوق ایم - اے ورنیکولر ایجوکیشن انسپکٹر پنجاب کے تقرر پر بعض مقامی معاصرین تو اس تقرر کے اس لئے مخالف ہیں کہ ملک صاحب مسلمان کیوں ہیں اور بعض مسلم معاصرین کو یہ اعتراض ہے کہ وہ احمدی کیوں ہیں مسلمان کیوں نہیں

گویا ان کا ایک ماہر تعلیم ایک ماہر السنہ ایک تجربہ کار افسر معائنہ ایک غیر معمولی ذہین و فطین ہونا ان کے لئے سند افتخار نہیں بلکہ ایک ہندو یا ایک غیر احمدی ہونا اس منصب کی اہلیت کے لئے کافی ہوتا - خواہ مذکورہ صفات سے وہ بالکل کورے ہوتے - اس ذہنی پستی اور ذلیل قسم کی فرقہ داری کی بھی کوئی انتہا ہے ؟

اگر خدانخواستہ صوبے کی اسمبلی میں اس ذہنیت کے حضرات کو کوئی اقتدار حاصل ہو جائے تو ہر محکمے میں ہر عہدے کی اہلیت کا معیار صرف غیر احمدی اور غیر مسلم ہونا قرار پا جائے ۔

لطف یہ ہے کہ ان مذہب کے علم برداروں کو عملی حیثیت سے اپنے اپنے مذہب سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں ۔

یعنی ان کے نزدیک اگر ایک غیر احمدی مسلمان خدا کا بھی منکر ہو اور ایک ہندو اگر اپنے دھرم سے عقاید سے کلیتہً بیزار ہو چکا ہو تو بھی اُس کے تقرر کے لئے اُس وقت تک ہر عہدہ موزوں اور ناقابلِ اعتراض ہے - جب تک سول لسٹ میں اس کا نام بحیثیت ہندو اور غیر احمدی مسلم درج ہو - ورنہ اُس کی کسی منصب کے لئے تمام

اہلیتیں بے مصرف ہو جاتی ہیں - اس بوالعجبی بلکہ بوالفضولی کا بھی کوئی ٹھکانا ہے !!

مسٹر چرچل کو ہمارے ان نام نہاد تعلیم یافتہ حضرات کی اس ذلیل ذہنیت کا اندازہ ہوتا تو وہ کبھی اس خطرے کا اظہار نہ کرتے کہ "برطانوی کابینۂ وزارت کی غلط بخشیوں کے سبب ہندوستان ہاتھ سے جارہا ہے -"

انہیں مطمئن ہونا چاہیئے کہ ہمارے اہلِ ملک ذہنیتوں کے ایسے لاعلاج بحران میں مبتلا ہیں کہ اُس کی موجودگی میں ان کا دماغی توازن کبھی درست نہ ہوسکے گا - اور بے دماغوں کا کوئی ملک کبھی آزاد نہیں ہوا -

ایڈوائزری بورڈ

محکمۂ تعلیمات پنجاب کے تازہ انقلاب میں بہت سی ضروری اصلاحات بروئے کار آئی ہیں -

ان میں سے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی شکست و ریخت اور اس کے خاکستر پر ایڈوائزری بورڈ کی تعمیر بھی شامل ہے - ایڈوائزری بورڈ کی جدید اسکیم کے مطابق آئندہ درسیات کا انتخاب بذریعہ مقابلہ قرار پایا تھا - اس سے مقصود یہ تھا کہ ہر شعبۂ امتحان کے لئے وہ پانچ کتابیں مقرر کی جائیں گی جو پیش کردہ کتابوں میں نقادوں کے نزدیک سب سے بہتر اور مفید تر ثابت ہوں گی اور پھر انہیں صوبے کے پانچ ڈویژنوں پر تقسیم کر دیا جائے گا -

اس سے کئی فوائد پیشِ نظر تھے -

(۱) کتابوں کے رطب و یابس انبار میں سے بہترین کتابوں کا انتخاب ہوگا - تو تعلیمی نشو و نما میں نمایاں ترقی ظہور پذیر ہوگی -

(۲) پبلشروں کی رشوت فشانیوں کی وبائے عام کا استیصال ہوسکے گا -

(۳) مصنفین بطور خود بھی اس مقابلے میں کامیابی حاصل کرکے اپنی دماغی کاوشوں کی داد پائیں گے -

(۴) منتخب کتابیں درسی حیثیت حاصل کرکے پانچ سال تک باقی رکھی جائیں گی اور اس طرح بچّوں کے والدین آئے دن کے درسیات کے تغیّر و تبدیلی سے زیربار نہ ہوں گے -

یہ اسکیم اگر ان مقاصد کے پیشِ نظر جاری رہتی تو تعلیمی راہ سے بہت سی مشکلات دور ہو جاتیں - مگر ہوا یہ کہ سب کچھ ہونے کے بعد کچھ بھی نہ ہوسکا مصنفین اور بے سفارش پبلشر منتظر تھے کہ مجوزہ و مشتہرہ اسکیم کے مطابق جدید درسیات کے لئے صلائے عام کا اعلان ایک سال قبل ضرور ہوگا -

ایک سال کی مدّت میں تمام پبلشر اور مصنف اپنی اپنی بساط اور حیثیت کے مطابق مقابلۂ انتخاب کے لئے جدید کورس تیار کرسکیں گے - لیکن محکمۂ تعلیم کا یہ اعلان اشاعت پیشہ حلقوں اور تصنیفی اداروں میں صورِ اسرافیل کی طرح سُنا گیا کہ

"پہلی بار موجودہ منظور شدہ کورسز ہی میں سے ہر جماعت کے لئے پانچ پانچ بہترین کورس پانچ سال کے لئے چُن لئے جائیں گے - لہٰذا تین ماہ کے اندر اندر ہر پبلشر اپنی کتابیں مقابلۂ انتخاب کے لئے پیش کردے -"

خیال فرمایئے تین ماہ کے قلیل وقت میں کوئی جدید پبلشر یا مصنف شبانہ روز بھی سعی کرے تو اس مصنوعی دعوتِ مقابلہ کے لئے کام کی کتابیں نہیں پیش کرسکتا - دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو تین اجارہ دار پبلشنگ فرموں کے علاوہ جو ہر جماعت کے لئے درجنوں کتابیں پہلے ہی سے تیار کرچکی ہیں کسی عام پبلشر یا مصنف کو قسمت آزمائی کے جائز حق سے محروم کر دیا گیا ہے -

محکمے کی یہ عاجلانہ کارروائی اندھیرگردی کے مرادف ہے - اگر جدید اسکیم کے لئے یہ انجام مقدر تھا تو پھر یہ اسکیم اسکیم کا شور کیوں مچایا جارہا تھا -

سچ تو یہ ہے کہ اس اعلان کی مندرجہ شتاب کاری سے بے چارے عام پبلشروں کی بڑی ہمت شکنی ہوئی ہے -

ضرورت ہے کہ تمام پبلشر فرمیں اور مصنف محکمے کی اس جلدبازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں اور اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہمارے بیدار دماغ جدید اسسٹنٹ ڈائرکٹر اپنے اثر سے کام لے کر اس اعلان میں ایک سال کی توسیع کرائیں - اس اعلان سے اجارہ دار پبلشنگ فرموں کا بھی فائدہ ہے کہ وہ اپنا موجودہ اسٹاک ۱۹۳۷ء میں فروخت کرسکیں گی - اور نئے مقابلے کے لئے جدید درسیات کی فراہمی بھی سب کے لئے آسان ہوگی -

اُردو مرکز بک ڈپو

"اردو مرکز" کے اشاعتی پروگرام کی تعمیل میں اردو ادب کی بہترین کتابوں کا ایک مرکزی کتب خانہ قائم کرنے کے متعلق میرا شیریں خواب منت پذیر تعبیر ہونے کو ہے -

چودھری نذیر احمد و چودھری برکت علی بی - اے کی صورت میں دو جوان کارکن کاروان اور منتظم نوجوانوں کی امداد مجھے حاصل ہوگئی ہے - اب "اردو مرکز بک ڈپو" میں ہر عہد اور فن کے مستند مشاہیر اہلِ قلم کے جدید و قدیم تصنیفی کارناموں کی فراہمی کا انتظام ہو رہا ہے - ملک کے محکمہائے تعلیم، اہلِ نظر اور عام اردو خواں پبلک کے لئے قابلِ مطالعہ استعداد آفرین اردو لٹریچر مہیا کیا جارہا ہے -

اچھے کارکن نہ ملنے کے سبب آج تک مجھے اپنے وسیع ذرائع فروخت سے اردو ادب کو حسبِ مراد فائدہ اٹھانے کا کبھی موقعہ نہیں ملا - جدید انتظامی

عمدہ کئی سال سے ایک اشاعتی فرم کو نہایت کامیابی سے چلا رہا ہے۔ اب خدائے عزیز کا فضل شاملِ حال رہا تو "اردو مرکز" کے ذریعہ اہلِ علم، اہلِ تعلیم، اور اردو خوانوں کے شوقِ مطالعہ کی تسکین کے لئے بلند پاکیزہ اور حیادار لٹریچر پیدا کریں گے۔ میرا مقصدِ زندگی یہ رہا ہے کہ بلند پایہ مصنفین کی منتخب تصانیف . . . ذوقِ نظر رکھنے والے حضرات کے لئے لاگت کے لگ بھگ بہم پہنچاؤں۔ مگر اس مقصد کے ذرائع (رسالہ ادبی دنیا و شاہکار) نے مجھے اُلجھا لیا اور خائن کارکنوں کی تخریبی مساعی تکمیلِ مقصد کی راہ میں دیوار حائل بنی رہیں۔

جدید منتظم میرے اس کاروبار میں مالکانہ حیثیت سے حصّہ دار ہیں۔ اور اپنے سابقہ تجربات سے "اردو مرکز" کو صحیح معنی میں اردو مرکز بنا رہے ہیں۔ اب خدا نے میری چوتھائی صدی کی ہمت آزما مساعی کو بارور ہونے کا زرین موقعہ نصیب کیا ہے۔

اب اُن حضرات سے جو میری ادبی بربادیوں پر ہمیشہ دلسوزی کا اظہار کرتے رہے ہیں میری درخواست نہیں بلکہ اصرار ہے کہ وہ اپنے شوقِ مطالعہ کو پورا کرنے کے لئے ملک کے جس اردو مصنف کی جو کتاب بھی حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں براہِ راست "اردو مرکز" کے ذریعہ حاصل کریں۔

امید ہے کہ محکمۂ تعلیمات کے افسران "لائبریری بکس" کی خریداری کا آرڈر دیتے وقت "اردو مرکز" بک ڈپو کو نظر انداز نہ فرمائیں گے۔ یونیورسٹیوں کالجوں اور اسکولوں کے محترم اساتذہ لائبریریوں کے انچارج حضرات سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی لائبریریوں کے لئے ہر قسم کی اردو کتابیں اردو مرکز بک ڈپو کی معرفت خرید فرمائیں گے۔

"اردو مرکز" کو امداد پہنچانے کے لئے اس کے قابل کارکنوں نے یہ بھی انتظام کیا ہے کہ محکمۂ تعلیمات کی ہر قسم کی منظور شدہ درسی کتابیں اپنی معرفت بہم پہنچائیں۔ اس لئے اسکولوں کے اُن صدر اساتذہ (ہیڈ ماسٹر صاحبان) اور افسران تعلیم سے جو "اردو مرکز" کے بانی کی خدمات کو بہ نظرِ ہمدردی و پذیرائی دیکھتے ہیں۔ گزارش ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے اسکولوں اور حدودِ اقتدار کے لئے ہر مصنف اور ہر پبلشنگ فرم کی ہر قسم کی درسی کتابیں "اردو مرکز" بکڈپو کے ذریعہ طلب فرما کر اس خالص ادبی ادارے کو کامیاب بنائیں۔

اردو مصنفین

عریاں افسانوی لٹریچر، صنفی معلومات پر مشتمل کوک شاستروں، برہنہ منظومات اور شرمناک مصور کتابوں کے شوقِ بیمار کی اصلاح "اردو مرکز" کا ہمیشہ فرض رہے گا۔ اس کے علاوہ اُن بے مغز پیشہ ور پبلشروں کے خلاف بغاوت عام کی تلقین بھی اردو مرکز کا ایک مقصد ہے جو نادار مصنفین کی مجبوریوں سے ظالمانہ استفادہ کرنے کی دھُن میں اپنے ناروا وسائل کے ذریعہ بے جان لٹریچر کی اشاعت سے اردو فضا کو مسموم و متعفن بنا رہے ہیں۔ ہم کام کے اردو مصنفین کی ذہنیت افروز کتابوں کا معقول معاوضہ دینے کی رسم جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ ہمارے وسائلِ فروخت عام پبلشروں اور بک ایجنسیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے مصنفین کو یہ یقین دلانے کا حق رکھتے ہیں کہ اُن کی کتابوں کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا جائے گا۔ اور یہ کہ "اردو مرکز" بک ڈپو سے جو کتاب شائع ہو گی یا جس کی فروخت اردو مرکز بکڈپو کے ذریعہ کی جائے گی۔ اُس کتاب کو تھوڑے سے وقت میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہونے کا فخر نصیب ہو سکے گا۔ مصنفین کی رائلٹی اور معاوضے کی تجویز و ادائگی کا انتظام میری زیرِ نگرانی ہو گا۔ اور مجھے خدائے برتر کی توفیق پر اعتماد ہے کہ ہر معاملے میں دیانت داری کے اصول پر وہ مجھے قائم رکھے گا۔

امید ہے کہ اردو مصنفین اپنے تصنیفی کارناموں کی اشاعت یا اُن کی فروخت کے لئے پبلشروں اور تاجرانِ کتب کا انتخاب کرتے ہوئے "اردو مرکز" بک ڈپو کو نظر انداز نہ فرمائیں گے۔ کہ یہ ادارہ انہیں کی حق رسی و قدر شناسی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

"مذہب اور باطنی تعلیم"

محترم مرزا احمد سعید صاحب دہلوی ایم۔ اے، آئی ای ایس کی یہ معرکۃ الآرا ضخیم و حجیم تصنیف دو ڈھائی ماہ سے زیورِ طبع سے آراستہ الماریوں کی زینت بن رہی ہے۔ مجھے اپنے مصائبِ حواس پاش نے کاروبار کی جانب سے ایسا بیخبر کئے رکھا کہ اس کی تکمیلِ طباعت کا اعلان ہی نہ کر سکا۔ دفتر کے سہل انگار کارکنوں نے میری غیر ارادی بیخبری کی ارادۃً پیروی کی۔ مجھ پر کچھ ایسی خود فراموشی طاری رہی کہ دفتر کی ڈاک بھی نہیں دیکھ سکا۔ انبار در انبار خطوط بند کے بند پڑے رہے۔ کچھ ہوش ہوا تو دل پر جبر کر کے سب سے پہلے ان خطوط کو پڑھا اور اپنے اسسٹنٹ کی مدد سے ان کے جواب دینے شروع کئے ہیں۔ امید ہے کہ تاخیرِ جواب کے متعلق میرے عذر کی معقولیت مراسلہ نگار حضرات محسوس فرمائیں گے۔ جن حضرات کے اسمائے گرامی رجسٹر میں پہلے سے درج تھے۔ انہیں "مذہب اور باطنی تعلیم" تکمیلِ طباعت کے بعد فوراً بھیج دی گئی تھی۔ مجوزہ فہرست کے مطابق ملک کے منتخب اخبارات و رسائل کو بھی اظہار رائے کے لئے بھیجی جا چکی ہیں۔

قارئین شاہکار میں جو حضرات اس گراں بہا کتاب کے خرد افروز اور

یہ حاصل مقدمے کا مطالعہ کرکے اس کی افادی حیثیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ دفتر "اردو مرکز" ۹۔ لوئر مال لاہور سے طلب فرماکر اپنے شوق مطالعہ کی تکمیل فرماسکتے ہیں۔

کتاب کی معنوی حیثیت کے متعلق تو اتنا ہی عرض کردینا کافی ہونا چاہیئے۔ کہ ملک کے ایک ایسے عالی جاہ مصنف کی تحقیق و تفحص کے دس سال اس کی تصنیف پر صرف ہوئے ہیں۔ جو مشرقی و مغربی علمیات کا جامع اور ماہر تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کی ہمہ گیر قابلیت اہل نظر سے خراجِ اعتراف وصول کرچکی ہے۔

اپنے اہم موضوع کے اعتبار سے بھی یہ کتاب اردو ادب کی پہلی گراں قدر تصنیف کہی جاسکتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کی اور کسی زبان میں بھی اس موضوع پر ایسی کوئی محققانہ اور مستند تصنیف دستیاب نہ ہوسکے گی۔ اردو مرکز کے کارپردازوں نے اسے ایک زرّین رقم کاتب سے لکھوایا۔ گراں اجرت پر ایک محتاط مطبع میں بہت قیمتی کاغذ پر چھپوایا۔ ایک سابہرت دفتری نے اس کی جلد بندی کا کام کیا۔

کتاب کی تقطیع ۲۰×۲۶/۸۔ حجم ۷۶۲ صفحات۔ انگریزی نمونے کی حسین جلد۔ اور قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ڈھائی روپے ہے۔

جو حضرات اشاعتی کاموں کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس کے اخراجاتِ اشاعت کا اندازہ کرکے اس کی لاگت اور قیمت کے تناسب پر تعجب ضرور کریں گے۔ سچ یہ ہے کہ اس کتاب کی ضخامت، طباعت، کتابت، کاغذ اور جلد کے مقابلے میں اس کی قیمت بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔

ادبی حادثات

۱۹۳۶ء یوں تو ساری دنیا کے لئے موجبِ خلفشار بنا رہا۔ مگر اردو ادب کے لئے تو اس کی سبز قدمی بڑی دہشت خیز ثابت ہوئی۔

ان بارہ مہینوں میں ایوانِ اردو کے کئی سر بہ فلک ستون سطحِ خاک کے برابر ہوگئے۔

اس سال کے ادبی پرچوں کا کوئی نمبر ایسا شائع نہ ہوسکا جس میں کسی بلند رتبہ ادیب کا مرثیہ نہ درج ہوا ہو۔ مولینا نورالحسن نیّر مؤلف نوراللغات کی موت۔ مولینا اصغر گونڈوی کا سانحۂ ارتحال، منشی پریم چند کا داغِ مفارقت، خلیقی دہلوی کا حادثۂ وفات۔ عرش گیاوی کی زمین گیری، گویا موت نے اردو کا گھر دیکھ لیا ہے۔ آہ اصغر نثری سحر فشاں شاعری ختم ہوگئی۔

ایسا ذہین و فطین آتش بیان ادیب سکوتِ ابدی سے ہمکنار ہوگیا۔

وائے نورالحسن کی موت۔ اردو زبان کا محسن اعظم جس نے کامیاب وکالت پر خاک ڈال کر ساری زندگی زبان و ادب کی خدمت میں بسر کردی۔ قہر ہے کہ نوراللغات کا عالی منزلت مؤلف دیکھتی آنکھوں آسودۂ خاک ہوگیا۔

ہائے خلیقی دہلوی "ادبِ لطیف" کا خلاق۔ جس کی غیر فانی نثر تڑپتے ہوئے فقروں کا ایک ہنگامہ زار ہوتی تھی۔ یہ طوطیٔ شیوا بیان بھی سکوتِ گور کا ہمنوا بن گیا۔

موت! ظالم ہماری زبان پر رحم کر کہ ؎
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

پنجاب یونیورسٹی اور اسکولوں کے اساتذہ

پنجاب یونیورسٹی انٹرنیس کے ممتحن تجویز کرتے ہوئے اسکولوں کے اساتذہ کے حق کو شروع سے نظرانداز کرتی چلی آتی ہے۔ الیف-اے، بی-اے، ایم-اے کے امتحانات پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو حقِ اجارہ حاصل ہے۔ اور یہ شرف اُن کی جاگیر بنا دیا گیا ہے۔

حالانکہ اسکولوں میں ہر مضمون کے ایسے قابل استادوں کا قحط نہیں۔ جو ان امتحانات کے لئے موزوں ممتحن قرار دئے جاسکتے ہوں لیکن ہماری یونیورسٹی نے کسی قابل سے قابل اسکول ماسٹر کو بھی ان امتحانات کی جانب نگاہ اُٹھانے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

ادھر اسکولوں کی قناعت پذیر فضا سے اس حق تلفی کے خلاف کبھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ اس جبری خاموشی کا اسکولوں کو یہ صلہ مل رہا ہے کہ انٹرنیس کے امتحانات پر بھی کالجوں کے اساتذہ کو حقِ ترجیح مل رہا ہے اور اس معاملے میں حق رسانی کی روایات پر یونیورسٹی کے "بورڈ آف سکولز" نے خاک ڈال رکھی ہے۔

"بورڈ آف سکولز" میں لاہور کے اسکولوں کے چند ہیڈ ماسٹر بھی ممبر ہیں۔ لیکن انہیں کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ جس جماعت کی نمائندگی کے صدقے میں ہمیں یہ اعزاز مل رہا ہے اُس بدبخت جماعت کے حقوق کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ اسکولوں کے طلبہ کی ذہنیت و ذہانت، استعداد اُن کے درسیات کے حُسن و قبح اور نصاب کے مشکلات سے اسکول ماسٹر براہِ راست آگاہ ہوتے ہیں۔ کالجوں کے استاد اس راہ سے قطعاً ناآشنا رہتے ہیں۔ اس لئے ایک اسکول ماسٹر جو پرچہ سیٹ کرے گا۔ بچوں کی ذہنیت و استعداد کو سب سے پہلے پیشِ نظر رکھ سکیگا۔ پروفیسر ممتحن بعض اوقات ناد انستگی کے سبب کورس سے باہر کے بھی سوالات پوچھ لیا کرتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ میٹرک کے امیدواروں کی ذہنیت کو نظرانداز کرکے ممتحن اپنی قابلیت کی نمائش پرچۂ سوالات میں زیادہ ضروری سمجھ لیتا ہے۔ پھر جوابات پڑھتے ہوئے ممتحن عموماً یہ بھول جاتے کہ "دسویں جماعت کے طلبہ" نے یہ جوابات لکھے ہیں۔ بنابریں طلبہ تعداد معیّن سے زیادہ فیل ہوجاتے ہیں۔ اور اس

طرح کسی خاص ذہنیت کے ممتحن کی تنگ بخشی سے اسکولوں کے نتائج خراب ہو جاتے ہیں - اس لئے پنجاب یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو اسکولوں کے اساتذہ اور طلبہ کے حقوق و مصالح کا لحاظ رکھنا سب سے ضروری ہے -

حادثۂ صحافت

صوبۂ پنجاب کے مقتدر ترین انگریزی روزنامہ ٹریبیون کے اسسٹنٹ ایڈیٹر پنڈت پیارے موہن دتاتریہ بی - اے - ایل - ایل - بی کے انتقال کی خبر اس ملک کی صحافتی فضا میں نہایت رنج سے سُنی جائے گی -

پنڈت آنجہانی ملکی سیاسیات کے ماہر تھے - اردو زبان وادب اُن کے گھر کی چیز تھی - اردو اور انگریزی میں بے تکان تحریر و تقریر کر سکتے تھے - نہایت درجہ شریف طبع اور مرنجاں مرنج انسان تھے -

ہمیں اس صدمے میں اپنے محترم علامہ کیفی دہلوی کے ساتھ دلی ہمدردی ہے - کہ اس پیرانہ سالی میں انہیں اپنے جواں سال فرزند کا داغ جُدائی نصیب ہوا -

تاجور

غزل

اِدھر کو جام بڑھانا تو مُسکرا دینا | بُجھا ہوا ہے دل اِک آگ سی لگا دینا

نسیم صبح چمن میں پچھاڑیں کھاتی ہے | گلو اپتہ مرے گُل کا اسے پتا دینا

خراب حال نہیں خاک تیرہ بختوں کی | تڑپ اُٹھے تو اسے آئینہ بنا دینا

یہ شوخیاں اسی چشم کرشمہ ساز میں ہیں | کہ بات میں بھی کسی بجلیاں ملا دینا

چمن میں صبح کو لینا وہ تیرا انگڑائی | یہ رنگ دیکھ کے غنچوں کا مُسکرا دینا

کسی کے دیکھنے والوں سے ہے یہ قول جنوں | کوئی ہے؟ طور کے ٹکڑے ذرا اُڑا دینا

یہ اتفاق عجب ہے یہ انقلاب عجب | مجھے بُھلا کے مری یاد بھی بُھلا دینا

لٹا دوں نام خزاں پر بہار اے صیّاد | قفس میں سوکھے ہوئے خار کچھ بچھا دینا

گناہگارِ محبت، گناہگار نہیں | جزا بھی رشک میں آجائے وہ سزا دینا

یہ ناشکیبئی دل سے ہے قولِ ضبط فراقؔ
متاع درد بھی اس طرح کیا لٹا دینا

فراق گورکھپوری

انیسؔ اور حالیؔ ...... میری نظر میں

رسالہ "شاہکار" بابت ماہ نومبر ۱۹۳۶ء میری نظر سے بھی گذرا ہے وہ دو صفحے جو پروفیسر تاجورؔ کے خون آلود جذبات کی عکس ریزی یا اُن کے ٹوٹے ہوئے دل کی آئینہ داری کر رہے تھے۔ پڑھکر بے اختیار آنسو نکل آئے۔ بلاشبہ نوجوان بیٹوں کی بے وقت موت نے ان کی کمر توڑ دی ہوگی۔ انیسؔ نے کتنا صحیح ہے۔ ؎

اللہ کسی کو بھی نہ دکھائے پسر کا داغ
آنکھوں کا نور کھوتا ہے نورِ نظر کا داغ

لیکن کیا کیا جائے کہ دنیا کا دستور یہی ہے۔ اقبالؔ نے بالکل درست فرمایا ہے:۔ ؎

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت — گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت — دشت و در میں، شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں — ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں
نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر — ہے اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر
نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے — زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے
آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں — خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

اب صبر و شکر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ خدا ان لوگوں کو جنت نصیب کرے۔ ؎

میں جفا پر تری خاموش ہوں اے پیرِ فلک — ورنہ کون اگلے بزرگوں کا ادب کرتا ہے"

نومبر کے شاہکار میں سید مہدی حسین صاحب کا مضمون "حالی کی مسدس نگاری" پڑھنے میں آیا۔ یہ مضمون جناب محمد اکبر صدیقی کے اس مضمون (مطبوعہ شاہکار بابت ماہ ستمبر) کا جواب الجواب ہے جو انہوں نے مہدی حسین کے مضمون (مطبوعہ شاہکار بابت ماہ مئی) کے جواب میں لکھا تھا۔ موضوع زیرِ بحث جس قدر فرسودہ تھا۔ اسی قدر روز بروز دلچسپ ہوتا جا رہا ہے، اور بجز اس کے کہ فریقین محض خوش عقیدگی کی بنا پر صف آرا ہیں۔ اور کوئی حقیقت نہیں۔ بہرحال اس سلسلے میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اپنا خیال ظاہر کر دوں۔

انیسؔ اور حالیؔ کا تقابل کیسا ہے۔ یہ آخر میں کہوں گا۔ اس وقت مجھے صرف اتنا کہنا ہے۔ کہ اس تقابل و مباحثے کی وجہ صرف مولانا عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کے مضمون مطبوعہ "صدی ایڈیشن مسدس حالی" کا یہ ٹکڑا ہے۔ کہ

"ہماری شاعری میں مسدس نظم کی ایک ایسی قسم ہے جسکا نبھانا آسان نہیں ہے۔ اچھے اچھے مشاق شاعر بھی رہ جاتے ہیں۔ اور بھرتی کے مصرعوں سے جوڑ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیس سا باکمال شاعر بھی مسدس جس کی ملک ہو گئی ہے۔ بھرتی کے بے ربط مصرعے داخل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن حالیؔ کا یہ کمال ہے۔ کہ چھیوں مصرعے ایک جان اور ایک ذات ہو گئے ہیں۔"

مولانا کی یہ تحریر غایت خوش عقیدگی ظاہر کر رہی ہے۔ اور یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح خود مولانا حالیؔ مرحوم نے غایت حسنِ عقیدت کی بنا پر انیسؔ کی ثنا خوانی کے سلسلے میں نظیرؔ اکبر آبادی سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھ دیا تھا۔ کہ

"اگرچہ نظیرؔ اکبر آبادی نے شاید میر انیسؔ سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مگر اس کی زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں۔ بخلاف میر انیسؔ کے کہ اس کے ہر لفظ اور محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔"

حالانکہ وہ خود ایک جگہ انیسؔ کے کلام میں مبالغہ اور اغراق کا عیب بتا چکے تھے۔ اسی طرح غایت خوش عقیدگی کا باعث یہ بھی ہے۔ جیسے جناب مہدی حسین صاحب کی زبان سے حالیؔ اور انیسؔ کی مثال ذرہ اور آفتاب کی سی ہے۔ چہ نسبت خاک را

باعالمِ پاک" کہلایا۔ اور جناب اکبر صدیقی کے قلم سے" لیکن جب حالی قوم کے زوال کا مرثیہ سناتے ہیں تو انیس تو انیس اگر ان سے بہتر مرثیہ نگار بھی ہو سکتا۔ تو حالی کی گرد کو نہ پہنچ سکتا" لکھوا دیا اور نہ معلوم ابھی اور کیا کیا لکھوائے گی۔ بہرحال خوش عقیدگی کو برطرف کرکے آیئے دیکھیں کہ دونوں کس پائے کے شاعر گزرے ہیں۔

جناب محمد اکبر صدیقی میر انیس کی مرثیہ گوئی پانچ پشت سے بتاتے ہیں اول تو کسی اہل کمال کے لئے خاندانی عزت و وجاہت کوئی چیز نہیں۔ میر غالب اور اقبال اپنے وقت کے عدیم المثال شاعر گزرے اور ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کے خاندان میں شاعری نہ تھی۔ دوئم یہ کہ انیس کے خاندان میں مرثیہ گوئی صرف تین پشت سے آ رہی تھی۔ چوتھے مرثیہ گو خود میر انیس ہیں۔ صدیقی صاحب نے مشہور مصرع

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

کو انیس سے منسوب کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ مصرع جس مشہور مرثیہ کا ہے۔ "وہ نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری" سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہ مصرع انیس نے اپنے معلوج اور دائم المرض بیٹے کی نام نامزد کر دیا تھا۔ جن کا نام میر عسکری رئیس تھا۔ اس بات کی یوں بھی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ میر وحید یعنے انیس کے بھتیجے اور میر انس کے بیٹے اپنے مرثیہ میں فرماتے ہیں۔

شمشیر فصاحت پہ یہ ہے پانچویں صیقل

اور پھر میر جلیس جو میر انیس کے پوتے اور میر سلیس کے بیٹے تھے۔ اپنے مرثیے میں یوں افتخار کرتے ہیں۔

میں چھ پشتوں کا ہوں مداح امام ابن امام

اس لئے میر انیس کے متعلق یہ کہنا کہ اُن کے خاندان میں مرثیہ گوئی پانچ پشت سے آ رہی تھی۔ قطعاً غلط ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مرثیہ گوئی اُن کی خاندانی چیز تھی۔ کیونکہ میر ضاحک اور میر حسن یعنے انیس کے دادا اور پردادا کے زمانے میں مرثیہ گوئی کا جو رنگ تھا وہ اظہر من الشمس ہے البتہ انیس کے باپ میر مستحسن خلیق نے اپنے وقت میں کچھ رنگ بدلا تھا۔ ورنہ ان کے قبل تو مرثیہ گوئی سودا کے اس شعر کے مطابق تھی۔ ؎

استقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکیں کہاں ہیں

ایسی صورت میں اُن کی خاندانی مرثیہ گوئی کوئی وقعت نہیں رکھتی درحقیقت مرثیہ گوئی کا رنگ انیس نے بدلا۔ اور اس میدان میں انیس نے جسقدر جولانی دکھائی وہ نہ صرف اس کا حصہ ہے۔ بلکہ صرف اسی کی خداداد طبع کا نتیجہ ہے۔ اور اسے خاندانی وراثت کہنا ایک بے معنی سی بات ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ صدیقی صاحب نے انیس کا تعلق دہلی سے جو بتایا ہے وہ بھی غلط۔ انیس کا وطن فیض آباد تھا۔ مگر اُن کی ساری عمر لکھنؤ میں گذری۔ دہلی سے اُن کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیے میں اکثر "جگہ" کو "جاگہ" لکھا ہے۔ جو فیض آباد کی زبان ہے۔ اس کے علاوہ بعض محاورات کے استعمال پر جب انہیں ٹوکا جاتا تھا۔ تو فرمایا کرتے تھے۔ کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہے حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے" غالباً اسی کو جناب صدیقی صاحب نے اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ کہ" ان کا اس پر ناز تھا کہ اُردو میرے گھر کی زبان ہے"۔ اولاً تو یہ جملہ ہی نامعلوم کہاں سے نقل کیا گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ اور اگر فرض کیا جائے کہ ایسا کہا بھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا اشارہ دہلی کی زبان کی طرف[1] تھا؟ بہرحال نہ تو انہوں نے مرثیہ میں دہلی کی زبان استعمال کی ہے اور نہ اُن کا گھر وہاں تھا۔ اس لئے انیس کا تعلق دہلی سے بتانا غلط ہے۔

اب آیئے اصل موضوع سخن کی طرف۔ اول تو حالی اور انیس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ دوسرے کسی ایک خاص رنگ کے پابند شاعر کا دوسرے کسی خاص رنگ کے شاعر سے تقابل کرنا عجیب قسم کی زبردستی ہے۔ کیونکہ تقابل یا موازنہ دو برابر کی چیزوں یا دو ایک ہی صنف کے شاعروں میں ہو سکتا ہے نہ کہ دو متضاد خیالات واصناف کے پابند شاعروں میں؟ حالی اور انیس کی شاعری میں دو بین فرق ایسے ہیں، جن میں کسی کا ابہام نہیں ہے۔ اولاً یہ کہ حالی ایک قومی شاعر تھے۔ اور انیس مذہبی مرثیہ گو۔ اس لئے ان دونوں کا کوئی تقابل نہیں۔ ہاں حالی کا مقابلہ اگر اقبال سے کیا جاتا تو ایک بات تھی۔ کیونکہ دونوں قومی شاعر تھے۔ اور دونوں کے دل قومی ہمدردیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور ہیں۔ اسی طرح اگر انیس کا موازنہ نظیر اکبرآبادی سے کیا جاتا تو ایک بات تھی۔ کیونکہ ان دونوں نے جس کسی خاص عنوان پر قلم اٹھایا ہے، تو اُس کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اور الفاظ کا اس قدر استعمال کیا ہے۔ جو کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکتا۔ دوسرا معمولی فرق یہ ہے۔ کہ انیس ایک رنگین بیان شاعر گذرا ہے۔ برخلاف اس کے حالی بالکل سادہ گو چنانچہ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا۔ پھر ایک سیدھے سادے شاعر کا ایک رنگین بیان شاعر سے کیا مقابلہ ــــ ؟ بہرحال اب قبل اس کے کہ انیس اور حالی کا فرق بتاؤں۔ میں اس موازنہ کے قضیئے کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ اور اس کی

---

[1] انیس کے دادا میر حسن دہلوی تھے۔ ان کی مثنوی سحر البیان اہل دہلی کی جانب سے اہل لکھنؤ کو بطور تحدی پیش کی گئی تھی۔ مدیر

بہتر صورت یہ ہے۔ کہ خود مولانا حالی کے مقرر کردہ معیار پر انیس اور حالی کو جانچ لیا جائے۔ مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں فرماتے ہیں۔

"آجکل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے بھی کیا
جاتا ہے۔ کہ اس نے اور شعراء سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی
اور شائستگی سے استعمال کئے ہیں۔ اگر ہم اسی کو معیار کمال قرار
دیں۔ تو بھی میر انیس کو اُردو شعراء میں سب سے برتر ماننا پڑیگا"

جب خود مولانا حالی الفاظ کی زیادتی استعمال کو معیار قرار دے کر انیس کی برتریت مانتے اور فوقیت تسلیم کرتے ہیں۔ تو پھر اس میں کس کو مجال سخن ہے؟ خاصکر اس صورت میں جب کہ مولانا حالی نے الفاظ کے استعمال کی کوئی کوشش ہی نہیں کی؟ ایسی صورت میں ان دونوں کا تقابل سعی لاحاصل ہے۔

جب اس مقابلے کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے۔ کہ جناب سید مہدی حسین اور جناب اکبر صدیقی کے دعوے کس حد تک صداقت پر مبنی ہیں کیا واقعی انیس کی حیثیت آفتاب اور حالی کی حیثیت ذرہ کی ہے؟ یا کیا حقیقتاً حالی نے بحیثیت شاعر مسدس گوئی میں کوئی ایسا کمال دکھایا ہے۔ جو انیس اُن کی گرد کو بھی پہنچ نہیں سکتے؟

میرا ذاتی خیال یہ ہے۔ کہ انیس اور حالی دونوں کی شاہراہ الگ ہے۔ اور ان دونوں کی یکجائی قطعی مہمل کیونکہ بعض خوبیاں ایسی ہیں۔ جو صرف حالی ہی میں ہیں۔ اور میر انیس کو اس سے دور کی بھی مناسبت نہیں۔ اور بہتیری خوبیاں ایسی ہیں۔ جو صرف میر انیس میں ہیں۔ مولانا حالی کا کلام اُن سے خالی ہے۔ دونوں کا فرق ملاحظہ کیجئے۔

انیس۔ انیس حالی سے چھتیس سال قبل پیدا ہوئے۔ اور اُس دور میں پیدا ہوئے جب کہ آتش، ذوق، مومن، شیفتہ، اسیر اور امانت وغیرہ کی گل و بلبل والی شاعری کمال عروج پر تھی۔ اور مرثیہ گوئی ایک بے جان سی چیز کہی جاتی تھی۔ اس کا مقصد اس وقت صرف رونا اور رلانا تھا۔ چنانچہ انیس نے یہ دیکھ کر کہ خداداد ذہانت شعری کو بُری طرح برباد کیا جا رہا ہے۔ اس شاہد عشرت کو تقدیس کا جامہ پہنایا اور بجائے اس کے کہ وہ غزل گوئی کرتے۔ انہوں نے اپنا سارا کمال مرثیہ گوئی میں صرف کر دیا۔ اور مرثیہ گوئی کو وہ عروج دیا۔ جو اس وقت بھی عدیم المثال ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ انیس نے مرثیہ گوئی میں نہ صرف یہ کمال دکھایا کہ شہدائے کربلا کے واقعۂ شہادت کو منظوم کر دیا۔ بلکہ ہر ایک معمولی سے معمولی بات کو بھی اس قدر عمدگی سے لکھا اور دکھایا کہ ایک مصور بھی شاید اس طرح نہ دکھا سکتا تھا۔ نثر جس میں کامل آزادی حاصل ہے۔ اور اس میں انسان ہر واقعہ کو مشرح و بسط کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ سینکڑوں واقعات کربلا لکھے گئے۔ پھر بھی میر انیس کے منظوم واقعات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اس میں بیحد دشواریاں اور پابندیاں حائل تھیں۔ مرثیہ اٹھا کر دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ جس تفصیل سے میر انیس نے واقعات لکھے ہیں۔ اس قدر کسی ناثر نے نہیں لکھے۔ انیس ایک ایک گفتگو، ایک ایک حرکت، ایک ایک معرکہ، اور ایک ایک بات اس طرح لکھتا ہے۔ جیسے وہ خود موجود تھے۔ معرکۂ کربلا کا نقشہ جس طرح انیس نے الفاظ میں کھینچا ہے۔ وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے نظر کے سامنے ہو رہا ہے۔ اور اگر مذہبی پاس ادب مانع نہ ہوتا۔ تو میر انیس کے مرثیہ کو پیش نظر رکھ کر واقعات کربلا کی فلم تیار کی جا سکتی تھی۔ اور وہ ایسی ہوتی جو سرتاپا حقیقت معلوم ہوتی۔

انیس کا تیسرا کمال یہ ہے۔ کہ وہ ایک ہی طرح کے واقعے اور ایک ہی قسم کے مضمون کو جب لکھتا ہے۔ تو اس انداز سے کہ اس کے الفاظ بالکل نئے! اس کا انداز بالکل انوکھا، اور اس کی شان بالکل جدا۔ اگر تلوار یا گھوڑے کی تعریف شروع کی تو حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، حضرت قاسمؑ اور حضرت علی اکبرؑ غرض ہر فرد کے تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں نئے نئے الفاظ استعمال کئے۔ انیس نے ایک مقررہ مضمون کو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اُردو زبان اس طرح کی عدیم المثال تصنیف پیش کرنے سے عاری ہے۔ کیا یہ سحر نگاری نہیں؟

چوتھا کمال یہ ہے۔ کہ اس نے ایک ایک لفظ واقعات، مواقع اور حفظ مراتب کا خیال کر کے لکھا ہے۔ نہ تو کوئی لفظ اس طرح بے موقع ادا کیا۔ جو کسی کے خلاف مرتبہ ہو۔ اور نہ ایک جملہ ایسا ... جو بے محل کہا جائے۔ یہ ایک ایسا کمال ہے۔ جو اوروں اور اُن کے ہم پلہ میرزا دبیر کو بھی حاصل نہیں۔ میرزا دبیر ہزار با کمال صحیح لیکن اس میدان میں وہ ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ ایک بالکل معمولی اور بہت مشہور واقعہ کو لے لیجئے۔ میدان کربلا میں ایک اعرابی آ کر امام حسین کو دریافت کرتا ہے امام حسینؑ خبر پا کر اُس کے نزدیک جاتے ہیں۔ اور اس کے پوچھنے پر اپنے کو روشناس کراتے ہیں۔ انیس اس واقعۂ روشناسی کو اعرابی کی زبانی یوں بیان کرتا ہے۔ ؎

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اس واقعہ کو میرزا دبیر اس طرح لکھتے ہیں۔

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

دیکھئے بمقتضائے ادب حسین علیہ السلام کہنا ضرور ہے۔ مگر انیس ہے۔ کہ اگر "علیہ السلام" یا کوئی لفظ تعظیماً لکھا جائیگا۔ تو واقعہ نگاری خاک میں مل جائے گی۔ کیونکہ "حسین" خود اپنے کو روشناس کرانے علیہ السلام نہیں کہہ سکتے

اور اگر صرف حسین کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ تو پاس ادب مانع ہے اس لئے اس نے اعرابی کی زبانی "شہ مشرقین" کہلا کر ان کی عظمت و بزرگی پہلے ظاہر کر دی۔ اور اس کے بعد امام حسین کے منہ سے صرف "حسین" کہلا کر واقعہ نگاری کو معراج کمال عطا کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ "فرمایا" میں کیا تصنع ہے۔ اور "مولانا نے سر جھکا کے کہا" میں کیا حقیقت اور لطف ہے۔ یہ ہے انیس کے کمالات کا ایک ذرہ ورنہ اس کے کلام میں اس طرح کے ہزاروں آفتاب بھرے پڑے ہیں۔

پانچواں کمال اس کا یہ ہے۔ کہ اس نے لکھ تو ہے ایک مقررہ مضمون یعنی مرثیہ لیکن بیک وقت اُس نے مرثیے میں مصوری، کردار نگاری، واقعہ نگاری، رزمیہ، بزمیہ، طربیہ اور حزنیہ نگاری، شستگی زبان، برجستگی، رنگین بیانی اور فطرت انسانی کی نقاشی کا وہ کمال دکھایا ہے جو نہ صرف اُردو زبان میں عدیم المثال ہے بلکہ یکجائی طور پر کسی دوسری زبان میں بھی اس کی مثال نہیں ملے گی۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ انیس نے مرثیہ بے حد طویل لکھا ہے۔ مگر اس میں دلچسپی کا جادو اس طرح بھر دیا ہے۔ کہ طبیعت کو ناگوار نہیں ہوتا۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب ایم۔اے نے اپنی تصنیف "ہماری شاعری" میں مختصر گوئی کی بیحد تعریف کی ہے اور طول نویسی پر جو مختصر نویسی کو ترجیح دی ہے۔ بلاشبہ صحیح ہے۔ مگر میرانیس اور صرف میرانیس کے مرثیے میں یہ کمال ہے کہ باوجود طویل ہونے کے بھی بیحد دلچسپ ہے اس کی سحر آگینی کا یہ عالم ہے۔ کہ جب اٹھائیں تو پھر رکھنا جبر ہو جاتا ہے حق تو یہ ہے کہ ایسی طول نویسی پر ہزاروں مختصر گوئی قربان ہے۔

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ انیس نے جس عنوان کو لیا ہے "اس پر معرکتہ الآرا نظم لکھی ہے۔ اور بقول مصنف "آب حیات" "صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شام کی اُداسی کبھی رات کا سناٹا غرض جس حالت کو لیا ہے اُس کا سا باندھ دیا ہے۔" یہ ایک ایسا کمال ہے جس میں بجز نظیر کے اُردو زبان میں ان کا کوئی دوسرا شاعر مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بہر کیف انیس کی خصوصیات ناقابل تشریح ہیں۔ اور ان کی تصریح ایک فعل عبث کیونکہ ان کے کمالات عالمگیر ہیں۔ اور ایسے ہیں۔ جو اپنی جگہ اٹل ہیں! اور اس لئے ان کی یہ تعلی کہ ؎

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر — مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمین سخن — تجھے بات میں آسماں کر دیا

بالکل صحیح ہے۔ حقیقتاً انیس نے اُردو زبان پر وہ احسان کیا ہے۔ جس سے سبکدوشی مشکل ہی نہیں۔ بلکہ ناممکن ہے۔ اور شاد مرحوم کا یہ کہنا کہ ؎

لے انیس اب چمن نظم ہو ویراں اے شاد + ایسا اب تک نہ کوئی زمزمہ پرداز آیا

بالکل صحیح ہے۔ غرض یہ ایسی خصوصیات ہیں جن سے مولانا حالی کو کوئی لگاؤ نہیں۔ ع

سماع وعظ کجا نغمۂ رباب کجا

حالی۔ اب آیئے حالی کی طرف۔ حالی میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو میرانیس کو حالی سے قطعاً جدا کرتی ہیں۔ اور جن سے میرانیس کو کوئی سروکار نہیں پہلی خصوصیت یہ ہے۔ کہ حالی نے اپنے معاصرین امیر مینائی، داغ دہلوی، جلال لکھنوی، ریاض خیرآبادی، اور شاد عظیم آبادی وغیرہ سے علیحدہ ہو کر اکبر الہ آبادی کی طرح اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ اور پرانی شاعری کے قلب میں ایک نئی روح ڈالی کہ اس کو بیکار اور فضول استعاروں اور تشبیہوں سے نجات دلائی۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ صرف حالی کا کارنامہ ہے۔ جو اس وقت گل و بلبل کی شاعری کو ناپسند کیا جانے لگا ہے۔ ورنہ اگر حالی نہ پیدا ہوتا تو اس وقت تک شعر و شاعری کا وہی قدیم رنگ قائم رہتا۔ جو ابتدا سے آ رہا تھا۔

دوسری خصوصیت اس کی یہ ہے۔ کہ اُس نے شعر و شاعری میں ادبی یا پر از تصنع زبان استعمال کرنے کے بجائے روزمرہ استعمال کیا۔ اور وہ اس قدر صاف سلیس اور عام فہم کہ سبحان اللہ اس نے خیال کو زبان سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ تھا۔ کہ اس کا خیال پڑھنے والے کے ذہن میں جاگزیں ہو جائے۔ مسدس حالی کی مقبولیت کا راز یہی ہے۔ کہ اس میں تصنع سے منزہ خیالات اس قدر عام فہم اور سادہ الفاظ میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ کہ اُن کے قلم یا زبان سے نکلتے ہی ہر خاص و عام کے دل میں کھُب گئے۔ اگر مسدس انیس کی زبان میں لکھی جاتی تو اُسے وہ مقبولیت ہرگز نہ حاصل ہوتی۔ جو اس وقت حاصل ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حالی نے نظم شاعری کے مقصد کو گل و بلبل سے آزاد کرایا۔ بلکہ یہ ثابت کیا کہ شاعری کا وجود صرف داد سخن حاصل کرنے یا امرا کی شان میں قصیدہ خوانی کر کے اُن سے انعام حاصل کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ذریعہ ایک خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کا بھی کام لیا جا سکتا ہے چنانچہ اس کا بیّن ثبوت "مسدس حالی" ہے۔ جو از شرق تا غرب مشہور ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں انہوں نے اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے تقریباً کل اہل قلم واقف ہیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں وہ ایک فطری شاعر تھا۔ وہاں مصلح قوم بھی۔ جہاں اس میں ذوق شعری بھرا تھا۔ وہاں ہمدردی قوم بھی۔ جہاں وہ ہندوستانی مردوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتا تھا۔ وہاں مستورات کو بھی آزادی دلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ بحیثیت شاعر وہ پہلا شخص ہے۔ جس نے بدقسمت ہندوستانی

بیوہ عورتوں کی ہمدردی میں "مناجات بیوہ" لکھ کر صدائے احتجاج بلند کی۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیم نسواں کی بھی حمایت کی۔ اور "مجالس النسا" لکھ کر اس فرضی قصّے کے ذریعے لوگوں کو تعلیم نسواں کی ترغیب دی۔ اور اپنی دونوں تصنیفات میں زبان اتنی سلیس استعمال کی جو بہ آسانی سمجھ لی جائے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے "فنِ تنقید" کی اُردو زبان میں بنیاد ڈالی۔ اور اس فن پر ایک مبسوط کتاب میں "مقدمہ شعر و شاعری" کے عنوان سے لکھی جو اس وقت تک اہل نظر کی راہبری کر رہی ہے۔ مولانا حالی پہلے شخص ہیں جو اُردو زبان میں بحیثیت نقاد جلوہ گر ہوئے۔ اور اس فن کی بنیاد ڈال کر عوام کو اس کا شوق دلایا۔ اس فن پر "مقدمہ شعر و شاعری" ایک ایسی جامع اور بلند پایہ کتاب ہے جس کا جواب نہ تو عربی میں ہے نہ فارسی میں۔ حالی نے اس تصنیف میں بتا دیا ہے کہ ایک نقاد کا کیا فرض ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ ایک نقاد کو ظاہری عیوب سے قطع نظر کر کے مغز سخن کو دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ ظاہری عیوب کوئی اہمیت نہیں رکھتے ان کا یہ خیال ہڈسن کے خیالات سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے۔ بہر کیف یہ ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جو انیس کیا کسی کو بھی حاصل نہیں۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وُہ نہ صرف شاعر انقلاب اور مصلح قوم یا نقاد تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ سیرۃ نگار بھی تھے۔ انہوں نے جس شان اور انداز خاص سے دیوانِ غالب حیاتِ سعدیؒ اور حیاتِ جاوید لکھی ہے۔ وُہ اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا شبلیؒ نے بھی حیاتِ سعدی لکھی ہے۔ مگر دونوں بالکل علیحدہ چیزیں ہیں حالی نے ان تصنیفات میں جو طرزِ نگارش اور طریقۂ استدلال اختیار کیا ہے اس سے مولانا شبلیؒ کو کوئی نسبت نہیں۔ اور اگر اس سلسلے میں ہم وسعت نظری سے کام لے کر مولانا حالی کی خدمات کا اعتراف کریں۔ تو کہنا پڑتا ہے۔ کہ مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو زبان میں سوانحعمریاں لکھنے کا رواج دیا۔ اور مولانا شبلیؒ نے یہ چیز مولانا حالی ہی سے حاصل کی۔

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ حالی متصوفانہ شاعری میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ یوں تو بہتیرے متصوفین شعرا ہوئے۔ مگر خواجہ میر درد کے بعد غالب ہی ایک ایسا شاعر ہوا جسے تصوف گوئی میں ایک خاص ملکہ تھا۔ مگر حالی نے اس سلسلے میں اپنے استاد سے بھی زیادہ کارنمایاں دکھائے ہیں۔ "مسدس حالی" کو علیحدہ کر کے اگر ان کے باقی کلام کو دیکھا جائے تو وُہ صوفی شاعر کہے جانیکے مستحق ہیں۔ انہوں نے فارسی کے اس مصرع کی

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

کی جس طرح تکذیب کی ہے وُہ داد سے مستغنی ہے۔

بہر حال یہ ایسی خصوصیات ہیں جن سے انیس کو کوئی علاقہ نہیں۔ اور انیس اس سے بہت دُور ہیں۔ پھر انیس کا حالی سے کیا مقابلہ؟ ع

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

یہ ہے دونوں کے اغلاط و اسقام تو وہ ہر ایک شاعر کے کلام میں موجود ہیں۔ چاہے انیس ہوں یا حالی، میر ہوں یا نظیر، غالب ہوں، اقبال بقول حافظ

ازیں چمن گلِ بے خار کس نچید آرے
چراغ مصطفوی با شرار بو لہبیست

لیکن یہ اغلاط و اسقام ان کے کمالات کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ جناب سید مہدی حسین صاحب نے حالی کے چند اشعار ایسے پیش کئے ہیں جو اُن کی دانست میں لغو ہیں۔ مگر اولاً شاید انہوں نے اس پر غور نہیں کیا۔ کہ اُن کا شمار معجزات شاعری میں نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصد صرف اصلاح قوم ہے اور وُہ اشعار اپنے مقصد میں بیحد کامیاب اور آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ ثانیاً کیا انیس کا کلام ایسے اغلاط سے پاک ہے؟ ہرگز نہیں "موازنہ انیس و دبیر" میں مولانا شبلیؒ نے انیس کی کمزوریاں کچھ اپنی اور کچھ مولوی عبدالغفور نساخ کی زبانی دکھائی اور بتائی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہر قسم کے اغلاط و اسقام موجود ہیں جنہیں دیکھ کر بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ حقیقتاً انیس کا کلام ایسا نہیں جس کے ہر لفظ کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔ مگر یہ بھی قابل توجہ نہیں۔ کیونکہ بحیثیت ایک انسان ہونے کے کسی شاعر و ادیب کا کلام ایسا نہیں۔ جو اغلاط و اسقام سے پاک ہو سیماب نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

ازل سے سہو و خطا ہے سرشت میں میری
ہے اعتراف کہ سیماب آدمی ہوں میں

جناب مہدی حسین صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ شاہکار ماہ مئی ۱۹۳۶ء میں جناب مجنوں گورکھپوری کی یہ رائے کہ

"اہل ذوق سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ حالی نے مسدس کہہ کر بحیثیت شاعر کے اپنا گلا گھونٹ لیا"

نقل کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ "میری بھی یہی رائے ہے" تو اس کے متعلق بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ

فرق آنکھوں کا نہیں فرق ہے بینائی کا
عیب بیں عیب، ہنرمند ہنر دیکھتے ہیں

ورنہ حالی تو ایسا شاعر تھا جسکے متعلق اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسہ میں حالی کی ایک نظم پڑھنے سے قبل فرمایا تھا۔ کہ ؎

مشہور زمانے میں ہے نام حالی — معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا — نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

اور خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے "عصر جدید" میں لکھا تھا۔ کہ

"بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مولانا حالی صوفیہ خیالات کے رُو
سے ایک صاحب باطن ولی تھے"

اور "مسدس حالی" تو وہ نظم ہے۔ جو ملٹن کے فردوس گم شدہ یا بائرن
کے چائلڈ ہرولڈ پلگریج ——————

——————) کا مقابلہ کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ملٹن اور بائرن کی نظم جس مقصد کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس مقصد میں کامیاب ہوگئی اور حالی کی نظم نے بے حس و جامد قوم پر اس حد تک اثر نہ کیا جس حد تک حالی چاہتے تھے۔ پھر بھی جو انقلاب پیدا ہوا وہ "مسدس حالی" کے پر زور الفاظ کا اثر اور پر درد الفاظ ہی کا نتیجہ یا فیض ہے۔

جناب سید مہدی حسین صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ شاہکار نومبر میں جناب مجنوں گھورکھپوری کی زبانی تحریر فرمایا ہے۔ کہ مسدس حالی کی جلد اب بھی ہرگز نہیں ملے گی۔ مگر اس کا مصرف صرف زینت الماری ہے۔" شاید ہمارے محترم کو یہ نہیں معلوم کہ مرثیہ میر انیس کا بھی یہی حشر ہے۔ اور وہ بجز عشرۂ محرم کے کبھی الٹ کر اب نہیں دیکھی جاتی۔ اور اس لئے مسدس اور مرثیہ کا وزن برابر ہے۔ دوسرا دعوی مہدی صاحب کا یہ ہے۔ کہ "مرثیہ قوم انیس کے میراثی کی خوشہ چینی کا نتیجہ ہے"۔ تو اس کے متعلق گذارش ہے۔ کہ مرثیہ میر انیس بھی شاہنامہ فردوسی کا نچوڑا ہوا عطر ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے اس دعوی کو تو جانے دیجئے۔ کہ "انیس کی رزمیہ شاعری سراسر فردوسی کے شاہنامہ کا ترجمہ ہے"۔ نواب نصر حسین خیال عظیم آبادی نے گو حسن عقیدت کی بنا پر یہ لکھ دیا۔ کہ "شاہنامہ دنیوی بادشاہوں کا فسانہ ہے۔ اور مرثیہ ہمارے دینی سرداروں کا کارنامہ اس لئے ان کا بیان فردوسی کے کلام پر سبقت چاہتا ہے"۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے۔ کہ "میر انیس کے مرثیوں کی بیشتر لڑائیاں شاہنامہ کی جنگوں کی تصویر نظر آتی ہیں"۔

بہر کیف حالی اور انیس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اور نہ اس کی ضرورت کہ خواہ مخواہ کسی ایک صنف کے باکمال شاعر کو کسی دوسرے صنف کے باکمال شاعر پر ترجیح دے کر کسی ایک کے کمالات سے انحراف کیا جائے۔ کیونکہ

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

حال ہی میں جناب بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" نے "اُردو کا بہترین شاعر" کے دلچسپ عنوان پر مقابلے کے مضامین لکھوائے تھے۔ چنانچہ انعامی نمبر کی اشاعت سے معلوم ہوا۔ کہ میر، غالب، انیس، حالی اور اقبال پر مضامین موصول ہوئے اور ہر ایک مضمون نگار نے اپنے ہیرو (Hero) کو ایک انداز خاص سے پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ "اُردو کا بہترین شاعر" وہی ہے۔ اس موقع پر جہاں تک انعام کو دخل تھا۔ اس کے مستحق سید وحی رضا صاحب قرار پائے۔ جنہوں نے میر انیس کو اُردو کا بہترین شاعر ثابت کیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انعام طرز نگارش کا صلہ تھا۔ ورنہ جناب بشیر کے یہ جملے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"غنیمت ہے کہ ہمیں یہ فیصلہ نہیں کرنا پڑا۔ کہ اُردو کا بہترین شاعر
کون ہے۔ اہل قلم نے جس محبت اور محنت سے اپنے اپنے پسندیدہ شاعر
کو پیش کیا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری شاعری کے
چمنستان کا ہر پھول بجائے خود خوبصورت ہے۔ البتہ ہر پھول کا رنگ و
بُو اور ہر گلچیں کا مذاق جداگانہ ہے"

حقیقت یہ ہے کہ ہر شاعر اپنے اپنے رنگ میں باکمال گذرا۔ کسی ایک پر دوسرے کو ترجیح دے کر کسی ایک کے کمالات کا غیر معمولی طور پر معترف یا منحرف ہونا بعید از دانشمندی ہے۔ اسی طرح انیس اور حالی دونوں اپنے اپنے رنگ میں یکتائے روزگار ہوئے۔ اور اُردو ادب پر ان دونوں کے جو احسانات ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ اردو شاعری کو گل و بلبل سے علیحدہ کر کے انیس نے اُسے جامۂ تقدیس و تعظیم عطا کیا۔ اور حالی نے شاعری کو غفلت زدہ اور خوابیدہ قوم کی بیداری کا ذریعہ بنایا۔ اس لئے دونوں آفتاب ادب کہے جا سکتے ہیں۔ ورنہ بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ کہ ایک ہی طرح پیدا ہوئے۔ ایک ہی طرح مرے اور ایک ہی طرح دونوں کا صرف نام زندہ ہے۔

اور اسی طرح بقول شاد ؎

اجل سُلا دیگی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر
نہ ہم رہیں گے، نہ تم رہوگے نہ شاد یہ داستاں رہے گی

عطاء اللہ

عہدِ اکبری

کے علمی و ادبی نوادر

ہندِ قدیم و جدید کی تواریخ شاہد ہیں کہ جہانتک ملکی سیاسیات کا تعلق ہے۔ غلام آباد ہندوستان کیلئے مسلمانوں کا زمانہ ہر لحاظ سے بہترین زمانہ ثابت ہوا ہے۔ مسلمانوں کا تدبر۔ اُن کا عدل و انصاف۔ ان کا نظامِ سلطنت۔ انکی علم پروری، انکی شان و شکوہ، انکی رواداری اور انکی معاشرت زبان زدِ خاص و عام ہے۔ اسلامی عہد کے جملہ مورخین بلا امتیازِ مذہب و ملت اس امر پر متفق ہیں کہ شاہانِ اسلام ہند میں سے شاہانِ مغلیہ ہر لحاظ سے طغرائے امتیاز کے مستحق ہیں۔ اُنہوں نے علمی دریا بہائے۔ یہ تاریخ ہند کے محافظ ہیں۔ اُنکے سیاسی کارنامے سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ اُنکی سپہ گری مشہور ہے۔ اُن کا زمانہ پُرامن زمانہ تھا۔ اُنکے عہد سے خوشحالی ٹپکتی تھی۔ شاہانِ مغلیہ بقول ڈیچو ڈمیتہ [illegible] فنِ تعمیر کے امام ہیں۔ اِس خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں اپنے علم و فضل کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھیں۔ سلطنتِ مغلیہ کا بغور مطالعہ کرنیسے ہم اس نتیجہ پر بآسانی پہنچ سکتے ہیں کہ ان تمام الوالعزم سلاطین میں سے جلال الدین اکبر ہمیں اتنا ہی ممتاز نظر آتا ہے جتنا کہ ہندوستان کی تمام اسلامی تاریخ میں یہ عہد بذاتِ خود۔ جلال الدین اکبر کا عہد ہر لحاظ سے موردِ تحسین و آفرین ہے۔ مغلیہ سلطنت کی بنیادیں ہمایوں کی طبعی مرنجاں مرنج حکمتِ عملی کے سبب کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اکبر نے ان متزلزل بنیادوں کو از سرِ نو مستحکم کیا۔ اکبری پرچم کشمیر سے کاٹھیاواڑ تک اور بلخ سے بنگال تک لہرائے۔ بیجاپور۔ گولکنڈہ اور احمدنگر بھی اکبری زد سے نہ بچ سکے۔ راجپوت جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے چلے آتے تھے۔ اکبر کے عہد میں اُن سے گھُل مِل گئے۔ اکبر نے ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کر دیا۔ یہ اکبر ہی کا رسوخ و اثر تھا کہ ہلدی گھاٹ کے مقام پر راجپوت راجپوتوں سے بھڑ گئے۔ سیکری۔ آگرہ اور لاہور میں عظیم الشان عمارتیں اُسکے جلال کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اکبر کا دینِ الٰہی حاکم و محکوم کو باہمی اُنس و محبت میں پرونیکا ایک ذریعہ تھا۔ اکبر نے جس طرف رُخ کیا فتح و نصرت نے آگے بڑھ کر قدم لئے۔ اکبر کا فوجی نظام اُسکی سلطنت کے قیام کا باعث ہُوا۔ اُسکے عہد کا بندوبستِ اراضی انگریزی حکومت کیلئے بھی مشعلِ راہ ثابت ہُوا۔ سرزمینِ ہند کی موجودہ صوبجاتی تقسیم اکبری عہد کی ملکی تقسیم کا چربہ ہے۔ ستی جیسی قبیح رسم کے خلاف سب سے پہلے اکبر نے ہی بیڑا اٹھایا۔ اصلاح و رسوم کے بارے میں اکبر کو ہم مصلحِ اعظم کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دستورِ سیاسی اکبری کابینۂ وزارت اور اُسکی مشاورتی مجالس کی پوری پوری نقالی ہے۔ اکبر کی مذہبی رواداری سے کون شخص واقف نہیں اکبری عہد کے خارجی تعلقات اُسکی ہر دلعزیزی کو ثابت کرتے ہیں۔ اس عہد مشاہیر نے پھر جنم نہ لیا۔ غرضکہ اکبر ہر لحاظ سے اعظم تھا۔

اکبر کے علمی کارناموں کا مجمل طور سے ذکر کرنے کیلئے بھی دفتر چاہئیں دُنیائے معلوم کے ہر گوشہ سے علماء فضلاء کی آمد شروع ہوئی۔ ہندوستان ایران۔ عرب۔ مصر و دیگر ممالک سے بیش بہا قلمی نسخے فراہم کئے گئے ماہرینِ فنِ تحریر سے اُنکی نقلیں کروائیں۔ ماہرینِ السنہ مختلفہ سے اُنکے تراجم کروائے ایک ایک نسخے کے عوض اشرفیوں کے ڈھیر اٹھوا دیئے۔ پایۂ تخت میں شاہی محلات کے اندر ایک عظیم الشان عمارت میں ایک لاثانی کتبخانہ قائم کیا۔ نستعلیق نویسی کو عروج پر پہنچایا۔ جلد بندی و جلد سازی کے نئے نئے نمونے اختراع کئے۔ قسم قسم کے رسم الخط وضع کئے گئے۔ علمی لطائف و ظرائف نے شاہی محافل کو گرمایا۔ فلسفہ۔ طب۔ تصوّف۔ الٰہیات۔ بیان۔ تاریخ۔ مؤسیقی۔ عروض اور نظم و نثر کی بیشمار کتابیں لکھوائی گئیں۔ علمی و مذہبی مباحث کیلئے پایۂ تخت میں معقول انتظام کیا۔ ایک خاص عمارت اس کام کیلئے تعمیر کروائی۔ اس عمارت میں ہفتہ وار مجالسِ مباحثہ و مناظرہ انعقاد پذیر ہوتیں۔ یہود۔ نصاریٰ ہنود۔ مسلمان اور بدھ مت کے بھکشو باقاعدہ اپنے اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کرتے۔ اکبر بذاتِ خود اس قسم کے مباحث میں حصّہ لیتا۔ سورت و گوا سے بڑی بڑی مشنریوں کو بلوا کر اسلامی مناظروں سے دوچار کرواتا۔ بہت سے اولیاء و اصفیاء کے وظائف مقرر کر دیئے۔ شاعروں کو اسقدر رواج دیا۔ کہ ایران کے تمام شعراء یکے بعد دیگرے ہند پہنچ گئے۔ ایران ویران نظر آنے لگا۔ تمام چوٹی کے شعراء ہندوستان پہنچکر نہ صرف امن و امان میں آ گئے۔ بلکہ نان و نفقہ سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ اکبر کے ذوقِ شعری نے مسلم و غیر مسلم شعراء

کو یکساں طور پر اپنے اپنے طبعی جوہر دکھانے پر مجبور کر دیا۔ اس عہد میں تاریخیں وہ مرتب ہوئیں جو کبھی نہ لکھی گئیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل اور شعر کی تمام اقسام مختلفہ نے متوازی ترقی کی۔ اِس عہد میں جملہ علوم وفنون نے یکساں طور پر ترقی کی۔

اکبر بذاتِ خود بھی مجموعہ کمالات تھا۔ وہ بیک وقت ادیب۔ شاعر۔ مناظر مقرر۔ فلاسفر۔ علوم دینیہ کا ماہر۔ زباندان۔ مورخ۔ سیاح۔ فقیہہ۔ مدبر۔ سیاستدان بذلہ سنج۔ علم موسیقی کا ماہر۔ منتظم۔ معمار۔ موجد۔ مخترع۔ سپاہی اور مقتدر اعلیٰ تھا۔ لکھا کچھ نہیں۔ مگر لکھوایا بہت کچھ۔ قضاء و قدر نے اکبر کو نہایت ہی موزوں طبیعت عطا کی تھی۔ اشعار ذیل اسکی جودتِ طبع کا نتیجہ ہے:۔

گریہ کردم ز غمت موجبِ خوشحالی شد ✤ ریختم خونِ دل از دیدہ دلم خالی شد

~~~~~~~

مے ناز کے دل خوں شدہ از دوریٔ او ✤ من یار نہ دوست مہجوریٔ او ✤
در آئینۂ چرخ نہ قوس وقزح است ✤ عکس است نمایاں شدہ از چوریٔ او

۹۹۷ھ کا ذکر ہے کہ اکبر نے مریم مکانی کو کشمیر بلوانے کیلئے یہ عرضداشت لکھی۔

حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج ✤ یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

اس شعر سے اکبر کی شاعرانہ عظمت عیاں ہے۔ سمتھ (Smith) مشہور مورخ نے بار بار لکھا ہے کہ اکبر علمی و مذہبی مباحث میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اکبر کی تقریر میں جادو کا سا اثر تھا۔ اکبر نے کئی ایک معرکے اپنی تقریر کے بل بوتے پر فتح کئے۔ اکبر ایک نئے فلسفہ کا بانی ہے۔ اُس نے ادیانِ عالم کا بنظر تعمق مطالعہ کیا۔ دَعْ ماکدر خُذْ ماصَفا۔ اُسکی مذہبی حکمتِ عملی تھی چونکہ خود ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر تھا۔ اسلئے اسکی روزمرہ کی گفتگو ہندی الفاظ سے بھرپور ہوتی۔ تاریخ ادبِ اردو کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں الفاظ اکبر کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ اکبر نے بطور سیاح کے ایران۔ کشمیر اور ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ چپہ چپہ بھر زمین کے حالات لکھوا تا رہا۔ اسے فقراء کی مجالس کا چسکا تھا۔ اسکا تدبر اور اسکی سیاستدانی قابلِ تعریف تھی۔ اُسکی بذلہ سنجی بیربل کے لطائف سے ظاہر ہوتی ہے۔ تان سین جیسے گویئے کی موجودگی اکبر کے علم موسیقی کی داد دیتی ہے اسے عمارتیں بنوانے کا بے حد شوق تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ یہی شوق شاہجہاں کو ورثے میں ملا۔ اکبر نے ایک ایسی گاڑی ایجاد کی جو مسافرت اور بار برداری کے علاوہ غلہ چھڑنے کا کام بھی دیتی تھی۔ اکبر ایک خاص قسم کی بندوق کا موجد ہے۔ اس سے پہلے بندوق کی نالی صاف کرنے کیلئے ایک آدمی کو اپنی پوری طاقت سے کام کرنا پڑتا تھا۔ اکبر نے ایک ایسی چکی ایجاد کی جس سے چند لمحوں میں بندوق کی سولہ نالیاں بیک وقت بآسانی صاف ہوسکتی تھیں۔ یہ چکی بیل کی مدد سے چلتی تھی۔ اس نے ایک ایسی گاڑی ایجاد کی جسے ایک ہاتھی کھینچتا تھا۔ یہ گاڑی سفری غسل خانہ کے لانے اور لے جانے کے کام آتی۔ اس نے ایک گوئے آتشیں ایجاد کی جس سے اندھیری رات میں کھیلا جایا کرتا تھا۔ اکبر ایک خاص قسم کے رتھ کا موجد بھی ہے۔ اس نے ہاتھی پکڑنے کا ایک نہایت ہی آسان مگر کامیاب طریقہ ایجاد کیا۔ گنگ محل اسی کی اختراع ہے۔ بازاری چھکلے کا نام شیلا ان پورہ اکبر نے ہی رکھا۔ اس نے جامہ کا نام سرب گاتی، لنگی کا پت گت، برقعہ کا چتر گت جوتے کا چرن دھرن اور موباف کا کیس گہن رکھا۔ اسکی فتوحاتِ ملکی اسکے کامل سپاہی ہونے پر دال ہے۔ صوبجاتی تقسیم اور ملک کی عام خوشحالی اس کے انتظام سلطنت کی بین دلیل ہے۔ قوت حافظہ اس قدر تیز تھی کہ جس کتاب کا ایک صفحہ کبھی سُن پاتا اسکا نفسِ مضمون ہمیشہ یاد رہتا۔ اس نے اپنے دربار میں ہر قسم کے علم و فن کے ماہرین جمع کر رکھے تھے۔ اکبر کے نورتن مشہور ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علم اور اپنے اپنے فن کا ماہر تھا۔ مشاہیرِ ذیل نے اکبری دربار کو چار چاند لگائے۔

فیضی آپ شیخ مبارک کے بڑے بیٹے تھے۔ آگرہ وطن تھا۔ نورتنوں میں شمار ہوئے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، نجوم اور ریاضی کے ماہر تھے۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ شعرگوئی میں نام پیدا کیا۔ رامائن، مہابھارت کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اکبر نامہ لکھنے کا ارادہ کیا اور کچھ لکھا بھی لیکن پورا نہ ہو سکا۔ مثنوی نلدمن تصنیف کی ۱۰۰۳ھ میں شاہی فرمان کے مطابق پنج گنج نظامی کی تقلید میں ایک الگ پنج گنج لکھی۔ فیضی کی دوسری تصانیف موارد الکلم سواطع الالہام۔ انشائے فیضی، دیوان، تذکرہ، القرون بید۔ اور لیلاوتی ہے۔

ابوالفضل آپ فیضی کے چھوٹے بھائی تھے۔ لائق باپ کے لائق بیٹے تھے اپنے زمانے کے علامہ کہلائے۔ جوہر قابل سمجھ کر اکبر نے وزارتِ عظمیٰ کے فرائض سپرد کئے۔ بے مثل انشاء پرداز تھے۔ انکی طرز تحریر انہی سے مختص تھی دفاتر ابوالفضل انہیں کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ آئین اکبری لکھی۔ کلیلہ دمنہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور عیار دانش نام رکھا۔ مہابھارت کا دیباچہ بھی لکھا۔ آپ بھی رتن تھے۔ اکبر کو ان سے بے حد الفت تھی۔ جب شہزادہ سلیم کے اشارہ پر علامہ موصوف قتل ہوئے تو بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا۔ سلیم سے کہا کہ اگر تمہیں تخت و تاج مطلوب تھا تو مجھے قتل کر دیا ہوتا۔

شیخ مبارک آپ علامہ فیضی و علامہ ابوالفضل کے والد ماجد تھے۔ آگرہ وطن تھا۔ بڑے صوفی منش تھے۔ آپنے ۹۸۳ء میں عربی زبان کی ایک کتاب مراۃ الحیوان کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔
~~~~~~~

تان سین یہ مکرند برہمن کا بیٹا تھا۔ قریب گوالیار میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کی دعا سے پیدا ہوُا۔ دربار اکبری میں شامل ہوکر رتن بنا۔ اور اسلام قبول کیا۔ راجہ مان سنگھ کے مکتبِ موسیقی میں داخل ہوُا۔ وہاں سے راجہ امی چند بگھیلہ والئی ریاست ریواہ کے پاس چلا گیا۔ شہرت سنکر اکبر نے بلوا بھیجا۔ ہندی راگ میاں لال کلونت سے سیکھے۔ آخرش موسیقی میں وہ نام پیدا کیا جو رہتی دُنیا تک رہیگا۔ ماہ اپریل ۱۵۸۹ء میں فوت ہوُا۔ قبر گوالیار میں ہے۔ یہاں پر ہر سال میلہ لگتا ہے۔ مزار پر املی کا درخت کھڑا ہے۔ مشہور گویئے موسیقی میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اس املی کے پتے کھایا کرتے ہیں۔ تان سین نے علم موسیقی پر ایک کتاب "سنگت سارتا" تصنیف کی۔

نظیری آپ مشرقی دنیا کے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں۔ آپ کا مولد نیشاپور ہے۔ طبیعت بچپن ہی سے شاعری کی طرف راغب تھی۔ تھوڑی سی مشق کے بعد ہی ایران بھر میں مشہور ہو گئے۔ آپ نے خراسان میں پہنچکر بہت شہرت حاصل کی پھر کاشان پہنچکر شجاع، رضاعی، حاتم، فہمی اور مقصود جیسے مشہور زماں شعراء کی شاعرانہ مجالس سے مستفیض ہوئے۔ عبدالرحیم خانخاناں نے انہیں ہندوستان بلوا بھیجا۔ آپ ۹۹۲ھ میں آگرہ پہنچے ازاں بعد اکبری دربار تک رسائی حاصل کی۔ نظیری غزل کا اُستاد مانا جاتا ہے ملاحظہ ہو نمونۂ کلام۔

از کف نے دہد دل آساں ربودہ را ؎ دیدیم زور بازوئے نا آزمودہ را

~~~~~~~

زپائے تا بسرش ہر کجا کہ مے نگرم ؎ کرشمۂ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است

~~~~~~~

بغل از نامۂ احباب پُر کردہ نمے خواند ؎ کہ مے ترسا شود مکتوبِ من ہم از میاں پیدا

~~~~~~~

دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بہ حرف ؎ نامِ خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

~~~~~~~

شاد و شگفتہ مطرب و ساغر طلب کند ؎ یک شو نہند حجاب در آید بکار خوش

~~~~~~~

قاصد کہ مے فرستی رطل گرانش در دہ ؎ کز ما خبر نیابد تا بے خبر نباشد

محمد الدین خوافی آپ اکبری عہد میں خراسان سے ہندوستان پہنچے خواف کے رہنے والے تھے جو خراسان میں ایک مشہور بستی ہے۔ بڑے بلند پایہ شاعر گذرے ہیں۔ بادشاہ کے ایماء پر شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں خارستان لکھی۔

صلائی آپ ۹۵۵ھ میں ساحل مرغاب میں پیدا ہوئے۔ الغرائن میں پرورش پائی۔ نسلاً چغتائی تھے۔ آپ کا تعلق طوس کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ شعر گوئی۔ حکمت۔ فلسفہ۔ نجوم اور ریاضی میں مہارتِ تام حاصل کی۔ اکبرِ اعظم کی علم پروری کی داستانیں سنکر ۹۸۱ھ میں ہندوستان پہنچے دربار سے بیش قرار تنخواہ مقرر ہوئی ۹۸۹ھ میں گولکنڈہ پہنچے۔ ۹۹۷ھ کو اپنا مسکن بنایا ۹۹۹ھ میں حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔ پورے تیس سال ہندوستان میں گذارے۔ بڑے زور کا قصیدہ کہتے تھے۔ مگر ہندوستانیوں کے طرزِ سلوک کے ہمیشہ شاکی رہے۔ اُن کا شعرِ ذیل اس امر کی پوری پوری تصدیق کرتا ہے۔

ہندی ار بو علی بود مشل ؎ طینتش نیست پاک از نقصاں

مُلا حیاتی گیلانی آپ اکبری عہد میں گیلان سے ہندوستان آئے۔ نہایت ہی خوش فکر شاعر تھے۔ عبدالرحیم خانخاناں کی مداحی آپ کا مشغلہ تھا۔ چنانچہ سرکارِ خانخاناں سے بیش قرار وظیفہ پایا۔ ایک دفعہ بیمار پڑے۔ جب تنفس میں فرق آنے لگا تو خانخاناں نے اپنا طبیبِ خاص انکے علاج کیلئے بھیجا۔ طبیب نے دیکھ کر کہا کہ کچھ فکر کی بات نہیں۔ سینہ میں قدرے تکلیف ہے جو جلد دور ہو جائیگی۔ حیاتی نے یہ سُنکر فی البدیہہ یہ کہا ؎

ازبسکہ رفو زدیم و شد چاک

این سینہ ہمہ بدو ختنی رفت

میاں لال کلونت یہ اس عہد کا مشہور گویّا ہے۔ جہانگیر نے بھی اسے بہت نوازا۔ تزک جہانگیری میں اس کی وفات کا ذکر ہے۔ شعر بھی کہتا تھا۔

باز بہادر یہ بھی اکبر کے عہد کا مشہور گویّا ہے۔ بہت سے گائن اس کی طرف منسوب ہیں۔

سورداس اکبری عہد کا مشہور ہندی شاعر گذرا ہے۔ نمونہ کلام ؎

کھیت بہت کا ہے تم نانے سین سئی آراج

دیونہ جانت پار اُتر آوے چاہت چڑھی جہاج

تلسی داس اس نے رامائن کو ہندی لباس پہنایا۔ ۱۶۲۴ء میں وفات پائی۔ اس کے اخلاقی دوہے ملک بھر میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ نمونہ کلام ؎

جو مینا مَیں نا کہے بیٹھی شکر کھائے ؎ جو بکری میں مَیں کرے ریج میں ماری جائے

تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر

فرزیں شاہ نہ ہو سکے گت ٹیڑھی تاثیر
~~~~~~~

نوری (۱۵۵۶ء) آپ اعظم پور کے رہنے والے تھے۔ قاضی زادہ مشہور تھے۔ علامہ فیضی سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے فارسی زبان میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ فنِ بدیع اور معمّہ کے ماہر تھے۔ بدیہہ گوئی انکی مشہور تھی۔ میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں ان کا ایک شعر درج کیا ہے ؎

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بہ ترسد
بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

محمد افضل آپ جھنجانہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ تلسی داس کے ہمعصر تھے۔ ایک ہندو عورت پر فریفتہ ہو کر طرح طرح کے بہروپ بدلے۔ آخر ایک برہمن کا روپ دھار کر اُس مندر کے پُجاری بنے جہاں انکی محبوبہ پوجا پاٹھ کیلئے جایا کرتی تھی۔ آخر ش اس کے دل میں بھی محبت کا جوش پیدا ہوا۔ اور انکی ہو رہی۔ انہوں نے اپنی داستانِ محبت والہانہ انداز میں اردو زبان میں ایک مثنوی کی شکل میں نظم کی ہے۔ یہ مثنوی کافی طویل ہے۔ انکی ایک نظم بارہ ماسہ بھی مشہور ہے۔ آپنے ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا۔

سعدی آپ بھی دربارِ اکبری کے ایک مایۂ ناز شاعر گذرے ہیں عوام الناس انہیں غلطی سے شیخ سعدی شیرازی مان چکے ہیں۔ آپنے بہت عرصہ دکن میں بھی گذارا ہے۔ آپ ریختہ گو شاعر تھے۔ اکثر تذکروں میں ان کا ذکر آیا ہے۔ میں صرف ایک مقطع پر قناعت کرتا ہوں۔ جو زبان ریختہ کے ہی متعلق ہے ؎

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

مولانا عہدی آپ کے والد ماجد کا نام محمدؐ تھا۔ آپ ابنِ محمدؐ کے نام سے مشہور ہوئے۔ عہد اکبری میں عروج حاصل کیا آپ موضع باتو کے باشندہ تھے۔ آپنے رسالہ "عہدی" تصنیف کیا ہے یہ رسالہ ۹۹۷ھ میں لکھا گیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو پنجابیت ٹپکتی ہے ؎

نو سے ورہے ستانویں جاں گذرے وچ شمار
پچھے ہجرت مصطفےٰ تدن تہیا طیار

احمد دکنی آپ دکنی زبان کے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸-۱۰۲۰ھ) نے بھی اہنیں بہت نوازا۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں تصنیف کی۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

کہاں تیس سوں تجھ نسبت کھڑے جو استی ہماری شرم ہیں پرے
اگر اپنی حد سے پر کٹ پڑے پچھانے جداں کام آ کر کھڑے

فرشتے جو آدم کوں سجدہ کیتے سو یہ مال آدم بچن تے لیتے
تجھے نت من مت سوں شادی شراب برہ کی خماری تھے میں سو خراب

عبدالرحیم خانخاناں آپ اکبری دربار کے رتن تھے۔ بذات خود بڑے علم دوست تھے۔ شاعر نواز بھی تھے۔ شعر و شاعری سے چسکا تھا۔ فنِ شعر کے ماہر تھے۔ آپکا مرتبہ بطورِ شاعر بہت بلند تھا۔ شعراء پروری پر خزانے لُٹا دیئے۔ ہزاروں شعراء آپکے خوانِ ادب کے خوشہ چین تھے۔ آپ کی سرکار سے بڑے بڑے مصنفین، ادباء اور شعراء کو گرانقدر وظائف ملتے۔ آپکے دستِ سخاوت نے ایرانی شعراء کو کشاں کشاں ہندوستان بلوالیا۔ آپ نے دربارِ اکبری کی رونق کو دوبالا کر دیا۔ آپنے اکبر کے کہنے پر ۹۹۷ھ میں تزک بابری کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ تزک جہانگیری میں لکھا ہے۔

زبان عربی و ترکی و فارسی و ہندی میدانست، و از اقسامِ دانش
عقل و نقل حتیٰ علوم ہندی بہرہ وافی داشت و بزبانِ فارسی و ہندی
شعر میگفت۔

نرہری :- آپ بھی دربارِ اکبری کے بلند پایہ شاعر گذرے ہیں۔ نمونہ کلام مل نہیں سکا۔ متلاشی ہوں۔

ماناکوی دربارِ اکبری کے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں۔ ان کا اصل نام متھور یا پھالک تھا۔ علمِ موسیقی کے ماہر تھے۔ بادشاہ نے انکی مہارتِ فن کا اعتراف کرتے ہوئے راؤ کا خطاب اور ربتش قرار جاگیر عطا کی۔ خانخاناں کی نوازشات سے بہرہ در ہوا۔ آپ "کلی جرتر" کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کے ایماء پر لکھی گئی۔

شیخ بہاؤالدین برناوی آپ مخدوم شیخ فریدالدین برناوی مہاجر مکہ کے پوتے اور جانشین تھے۔ جو ۹۸۷ھ میں فوت ہوئے۔ فنِ موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ قاضی عارف برناوی نے ابجد خوانی شروع کروائی۔ پھر مُلا انور رہتکی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ازاں بعد مزید تعلیم و تدریس کیلئے شیخ اللہ داد پانی پتی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ آپ شکار کے بہت شوقین تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد تمام لہو و لعب ترک کر دیا۔ سیر و سفر آپ کا مسلک تھا۔ دکن، گجرات، جونپور، پٹنہ، سرہند، لاہور، ہانسی اور حصار کی سیر کی۔ جکری، خیال، چٹکلہ، قول، ترانہ، ساورہ، دھرپد، اور بشن پد میں اشعار لکھے۔ ہندی زبان میں خوب شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

کیس کی سمرد توں من چنچل تو کبوں کہوڈولی اودتیک یک باد کرت رہے یا ہے کا بنولی
آنک للاری لکھی تو تیپی پیتی لیگ گانٹھ کو کھول جے استر کینے بدھا تن کی سدا کلول

شیخ صوفی دانشمند :- آپ سنسکرت، ہندی اور فارسی کے جیّد عالم تھے آپ

بھی قصبہ جھنجانہ قرب میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ اکبر نے سنسکرت اور ہندی کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بزبانِ فارسی انہی سے کروایا۔

حکیم علی آپ اپنے زمانہ کے مشہور و معروف انجنیئر گذرے ہیں۔ ۱۵۹۵ء یعنی ۴۰ جلوس میں آپ نے بادشاہ کے کہنے پر تہہ آب ایک تہہ خانہ بنایا کہ زمانہ مابعد کے بڑے بڑے کاریگر انگشت بدنداں رہ گئے۔ بادشاہ کو بہ نفسِ نفیس اس آب دوز تہہ خانہ کی سیر کروائی۔ حکیم صاحب بڑے بلند پایہ ادیب بھی تھے۔

فطرتی کشمیری اکبر بادشاہ کی مذہبی رواداری مشہور ہے۔ ہر مذہب کی پاسداری ملحوظِ خاطر تھی۔ کبھی کبھی آفتاب پرستی کی طرف بھی رجوع ہو جاتا تھا۔ چنانچہ فطرتی کشمیری نے اس مضمون کو اسطرح باندھا ہے۔

قسمت نگر کہ در خورِ ہر جوہری عطاست
آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او کرد اگر مشاہدۂ حق در آئینہ
ایں میکند مشاہدہ حق در آفتاب

اس رباعی پر انہیں شاہی جیب سے بارہ ہزار روپیہ انعام ملا۔

شیخ سعدی قریشی شاعری آپ کا مشغلہ تھا۔ عام طور پر شہزادہ مراد کے دربار میں رہے۔ اور انہی کی نوازشات سے متمتع ہوتے رہے۔ نمونہ کلام۔

روزِ عید است لبِ خشک مے آلود کنید ؛ چارۂ خویشتن اے خشک لباں زود کنید
دہر گاہست کہ از دہر معاں دور نسیم ؛ زود باشیم بکف جامِ زر اندود کنید

ملا شیری آپ ہجو گو شاعر تھے۔ اکبر بھی ان کی ہجو سے نہ بچ سکا۔ جب اکبر نے دینِ الٰہی کا اعلان کیا تو فوراً شعرِ ذیل کہا۔

شاہ امسال اگر دعویٰ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

آپ نے ایک کتاب ہری بنس کا جس میں کرشن جی کے حالات ہیں۔ فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

عرفی آپ کا نام محمد جمال الدین تھا۔ باپ کا نام زین الدین علوی اور دادے کا جمال الدین [illegible] تھا۔ عرفی نے اپنے کمالاتِ طبعی کے اظہار کیلئے میدان شاعری کو پسند کیا۔

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے حسن پر غائبانہ عاشق ہو کر ہندوستان آئے۔ علامہ فیضی کی وساطت سے دربار تک رسائی ہوئی۔ فیضی نے اُن کی خوب قدر دانی کی۔ حکیم ابوالفتح گیلانی کے طفیل عرفی کو دربار اکبری میں کافی شہرت حاصل ہو گئی۔ عرفی بہت عرصہ خانخاناں کے دربار میں بھی رہا۔ عرفی اپنے حسب و نسب کی بنا پر بہت زیادہ مغرور تھا۔ اسکی نخوت کیوجہ سے تمام درباری شعراء عرفی سے برسرِ پرخاش رہے۔ عرفی[5] نے زیادہ تر قصائد میں طبع آزمائی کی ہے۔ عرفی ۳۶ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ تذکرہ داغستانی میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اسکو زہر دیدیا نمونہ کلام:۔

خیز و شرابِ حیرتم زاں قدِ جلوہ ساز دہ
روئے بروئے حسن کن دست بدستِ ناز دہ

~~~~~~

اے برہمن چہ زنی طعنہ کہ در معبدِ ما
سبحہ نیست کہ آں غیرتِ زنّار تو نیست

~~~~~~

ہلاکِ جوہرِ شمشیرِ نازِ خوبانم ؛ کہ تارِ زخم جدا گشتہ زنگ میگیرد
آنانکہ وصفِ حسنِ تو تفسیر میکنند ؛ خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر مے کنند

حکیم ابوالفتح گیلانی آپ بڑے جید عالم تھے۔ طب میں یدِ طولے رکھتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کے طبیبِ خاص تھے علم طب پر بہت سی تصانیف کیں۔

راجہ مان آپ نے موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ صوفی منش انسان تھے۔ ان کی دھرپد میں تصوف کی چاشنی غالب ہے۔ اور در اصل یہی ان کے دھرپد کا کمال ہے۔

نانک بخشو آپ مسلمان تھے۔ راجہ مان کے شاگردِ رشید تھے۔ راجہ مان کے فوت ہونیکے بعد اُن کے فرزند راجہ بکرماجیت کے پاس رہے وہاں سے کالنجر کے راجہ کیرت کے پاس پہنچے۔ طبعاً بڑے سیلانی تھے۔ جب کالنجر رہتے رہتے جی اکتا گیا۔ تو بہادر شاہ والیٔ گجرات کے دربار میں باریابی حاصل کی۔ اور باقی ماندہ تمام عمر وہیں بسر کی۔

اکبر بادشاہ کو علم موسیقی سے تعشق تھا۔ دربار میں سینکڑوں نہیں ہزاروں ماہرین فن گویے اکٹھے کر رکھے تھے۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ بابا رام داس سبحان خاں، سرگیان خاں، چاند خاں، میاں جنید، میاں لال، سرمنڈل خاں میر سید علی، نبات خاں، سرود خاں، نایک چرجو، پربین خاں، سوردا س تان ترنگ خاں، بچتر خاں، دربارِ اکبر کے مشہور گوّیے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے فنِ موسیقی میں نہ صرف کمال حاصل کیا۔ بلکہ اُس فن کے متعلق تصانیف چھوڑی ہیں۔

~~~~~~

[5] جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے۔ عرفی شیرازی اپنے معاصرین میں کسی سے پیچھے نہیں۔ عرفی کو محض قصیدہ گو شاعر تصور کر لینا عین بے انصافی ہے (مدیر)
~~~~~~

اسکندر ارمنی پہلے بادشاہ کی خدمت میں ادنیٰ ساخدمتگذار تھا۔ بادشاہ نے اسکی شادی عبدالحیٔ ارمنی کی بیٹی سے کردی۔ جو بذاتِ خود شاہی حرم سرائے میں ملازم تھی۔ اسکندر ارمنی کو بھی شعر و موسیقی سے دلچسپی تھی۔

سلطان یہ دربار کا ظریف شاعر تھا۔ سلطان اپنا تخلص کرتا تھا۔ قندھار کے قرب جوار میں ایک گاؤں سبلک کا باشندہ تھا۔ اکبر نے اس کا نام سبلکی یعنی سبکلی (چھپکلی) رکھ لیا۔ سلطان اپنا نام سُن سُن کر بہت شرمایا کرتا تھا۔ مُلا بدایونی نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف منتخب التواریخ کے صفحہ ۳۰۵ پر اس شاعر کی نسبت عبارت ذیل لکھی ہے۔

"عوام ہندوستاں او را سبکلی میخوانند کہ کیلاس باشد۔
ازیں معنی بسیار رنجیدہ بود ومیگفت مکیتم بنام آں طور جانورے کثیف
مردار میخوانند۔"

شیخ برہان آپ اکبری عہد کے بزرگ گذرے ہیں۔ اپنی عمر کا اکثر حصّہ کالپی میں بسر کیا اور یہیں آپ کا مزار ہے۔ آپ نے میاں اللہ داد دھاریوال سے جو ایک واسطہ سے سید محمد جونپوری کے مرید خاص ہیں فیض حاصل کیا۔ کم وبیش پچاس سال تک گوشت نہیں کھایا۔ محض دودھ پر گذراوقات کرتے آپ اکثر ہندی اشعار کہا کرتے تھے جو محض پندو نصیحت پر مشتمل ہوتے۔ تصوف وسلوک سے آپ کو خاص شغف حاصل تھا۔ آپ نے ۹۷۰ھ میں سو سال کی عمر پاکر انتقال فرمایا۔

شیخ گدائی کنبوہ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ جمال تھا۔ آپ اکبری عہد میں صدارت کے عہدہ پر فائز تھے۔ فارسی زبان کے علاوہ ہندی موسیقی سے بھی دلی وابستگی تھی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے انکی نسبت منتخب التواریخ کے صفحہ ۴۰۰ پر لکھا ہے۔

"طبع نظم داشتہ و نقش وصوتِ ہندی خوب مےبست ومیگفت
وبآں وادی مشعوف ومالوف۔"

میر عبداللطیف قزوینی انہیں اکبر بادشاہ کا اُستاد ہونے کا فخر حاصل ہے ان کا بیٹا نقیب خاں بھی مشہور و معروف گذرا ہے انکے پوتے کا نام کوکب تھا۔ جو کتاب مجمع المضامین کے مصنف تھے۔ آپ پکے سُنی تھے چونکہ سلاطین صفویہ اہل تشیع تھے اور یہ حنفی العقیدہ تھے۔ اس لئے ان پر بہت سی سختیاں کی گئیں۔ چونکہ سلاطین صفویہ کے ہاتھوں تنگ آکر لاکھوں روپیہ کی جائداد چھوڑ کر ہندوستان آگئے۔ سلاطین مغلیہ نے انکی بہت آؤ بھگت کی۔ شہنشاہ اکبر نے دیوان حافظ میر عبداللطیف قزوینی ہی سے پڑھا۔

میر غیاث الدین۔ آپ میر عبداللطیف کے بیٹے تھے۔ آپ تواریخ میں نقیب خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ فن تاریخ میں وحید العصر تھے۔ آپ کو بادشاہ کی خلوت وجلوت حاصل تھی۔ بادشاہ انہیں ہروقت اپنے حضور میں رکھتا۔ ان کی جدائی ایک منٹ کیلئے بھی ناگوار خاطر تھی۔

میر علاؤ الدین قزوینی آپ میر عبداللطیف کے برادر خورد تھے۔ تذکرہ نفائس المآثر انہی کی تصنیف ہے۔ بڑے بلند پایہ ادیب گذرے ہیں۔ الغرض قزوینی خاندان اپنی علمیت و فضیلت کی بنا پر عہد اکبری میں خاص طور پر مشہور و معروف تھا۔

عشقی خاں آپ عشقی تخلص کرتے تھے۔ اسماعیل تاش کی اولاد میں سے تھے جو ترکوں کے پیرو مرشد گذرے ہیں۔ اکبر نے انہیں میر بخشی بنایا بے حد منکسر المزاج اور متواضع تھے۔ آپ کے دیوان بھی چھوڑا ہے۔ حدیقۂ سنائی کے وزن پر ایک مثنوی بھی نظم کی۔ آپ ۹۹۰ھ میں فوت ہوئے نمونہ کلام۔

بشنوائے نکتہ سنج خوش گفتار ۔ ازمن ایں طرفہ حقّہ پُر کار
گرم وسرد زمانہ را دیدہ ۔ نظم کردم ز طبع تجربہ کار
گفتہ ام در بیانِ شادی وغم ۔ نکتہ ہائے ہمچو لولوئے شہوار

زن ہندی ز یک طرف گوید ۔ بنوں تیری لونڈی توں مرا خوندگار
تم جو مجھ کوں پیار کرتے ہو ۔ ہوں بھی کرتی ہوں تمہارا پیار
زنِ ہندی ز یک طرف گوید ۔ تیری ماں کولی تیرا باپ چمار

مُلا عصام الدین ابراہیم آپ اکبر کے اُستاد تھے۔ اکبر نے مُلا یزید۔ مُلا عبدالقادر، مُلا پیر محمد کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا۔ اکبر نے ۹۷۰ھ میں عربی پڑھنے کی غرض سے شیخ مبارک کو اپنا اُستاد بنایا۔ اکبر نے ان اساتذہ سے قابوس نامہ، حدیقۂ سنائی، مثنوی مولانا روم۔ شاہنامہ فردوسی کلیات جامی، دیوان خاقانی، گلستان و بوستان سعدی پڑھی۔

مُلا عبدالقادر بدایونی آپ اکبری عہد کے بڑے زبردست مورخ گذرے ہیں۔ منتخب التواریخ آپ ہی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے آپ صحیح معنوں میں ہمہ داں تھے۔ اکبر کی فرمائش پر ۹۸۲ھ میں سنگھاسن بتیسی کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا تاریخی نام نامۂ خرد افزا رکھا۔ نواب جہانداد تیر اندازی میں ایک کتاب المعروف بہ "کتاب الاحادیث" لکھ کر ۹۸۶ھ میں اکبر کی نذر کی۔ ۹۹۰ھ میں ہزار سال کے واقعات کی تاریخ لکھی گئی۔ اور اس کا نام تاریخ الفی رکھا گیا ۱۰۰۲ میں آپ نے جلد اول و دوم کو درست کیا۔ ملا صاحب نے ۹۹۲ھ میں چند پنڈتوں کے ساتھ مل کر رامائن کا ترجمہ شروع کیا جو ۹۹۷ھ میں ختم ہوا۔ کل کتاب پچیس ہزار شلوک پر مشتمل ہے۔ ۹۹۲ھ میں ابوالفضل کے ایما پر جامع رشدی کا خلاصہ کیا۔ تاریخ کشمیر کا

جو سنسکرت زبان میں تھی فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ خواجہ نظام بخشی کی فرمائش پر ۹۹۹ء میں نجات الرشید لکھی۔ یہ تمام کتب اکبر کے ایماء پر لکھی گئیں۔

میر فتح علی شاہ آپ نے اکبر کے کہنے پر مرزا الغ بیگ کی زیجِ جدید کا ترجمہ کیا۔

قاضی جلال الدین ملتانی آپ بڑے فہیم و مدبر بزرگ تھے عدل و انصاف آپ کا زبان زدِ خاص و عام تھا آپ کو صدر جہاں کا خطاب ملا ہوا تھا۔ آپ کل ہندوستان کے مفتی تھے۔

حکیم ہمام آپ بھی اکبری رتن تھے۔ بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ آپ نے ۹۹۹ھ میں معجم البلدان کا ترجمہ اکبر کی فرمائش پر فارسی زبان میں کیا۔

لکھی خاں گجراتی آپ نے بادشاہ کے لئے علم ہیئت کی ایک مشہور و معروف کتاب تاجک کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔

عبدالستار ابنِ قاسم انہوں نے شاہی کتب خانہ کے لئے ایک کتاب ثمرۃ الفلاسفہ لکھی۔

پیرِ تاریک کوہستانِ پشاور کے تمام قبائل آپ ہی کے معتقد ہیں۔ آپ "خیر البیان" کے مصنف ہیں۔

حضرت بو علی قلندر آپ کا مزار پانی پت میں ہے۔ ایک اعتقادی مزار کرنال اور دوسرا اعتقادی مزار بڈھاکھیڑا ذاحی کرنال میں ہے۔ آپ مجذوب تھے۔ فارسی زبان کی ایک مثنوی آپکا علمی کارنامہ ہے۔ بادشاہ بذاتِ خود آپ کی زیارت کیلئے آیا کرتا تھا۔

مُلا شاہ محمد آپ قصبہ شاہ آباد کے رہنے والے تھے۔ بادشاہ کے حکم سے تاریخ کشمیر کا ترجمہ شروع کیا۔ لیکن ناپسند ہوا۔ پھر یہی کام مُلا بدایونی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

شیخ بہاول یہ دراصل ایک برہمن زادہ تھا۔ لیکن بخوشی مسلمان ہوکر شاہی خواصوں میں داخل ہوا۔ اکبر نے اسے اتھربن بید کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔

میر حیدر معمائی انہوں نے ۱۰۰۲ھ میں حومن حکیم علی وانعہ لاہور کی مکمل تاریخ قلمبند کی۔

شیخ منجو یہ ایک پُرفن قوال تھا۔ قوالی گاتا بھی تھا۔ اور قوالی کہتا بھی تھا۔ شیخ ادہن غونپوری کا مرید تھا۔

مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری ۔ آپکو انصار سے تعلق تھا۔ ان کے بزرگ ملتان چھوڑ کر سلطانپور (اکبرآباد) میں آکر آباد ہوئے۔ آپ بڑے زبردست فقیہہ تھے۔ آپنے مولانا عبدالقادر سرہندی سے فیض حاصل کیا۔ آپ پکے حنفی تھے۔ پہلے ہمایوں کے ساتھ رہے۔ پھر شیر شاہ کے دربار کو رونق بخشی انہوں نے ایک سال بھی لکھا ہے۔ گلبدن بیگم و سلیمہ سلطان بیگم کے ساتھ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہوئے۔ آپ ۹۹۰ھ میں احمد آباد میں فوت ہوئے۔ لیکن جالندھر میں دفن ہوئے۔ کشف الغمہ، عصمت الانبیا، منہاج الدین اور سیر نبوی آپ کی تصانیف ہیں۔

شیخ عبدالنبی آپ کے والد ماجد کا نام شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس تھا۔ آپ کا وطن اندری (حال ضلع کرنال) تھا۔ آپ سُنت جماعت تھے۔ آپنے مدینہ منورہ جاکر علم حدیث سے استفادہ کیا۔ آپ شاہی فرمان کے مطابق ۹۷۳ھ میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ بادشاہ بنفسِ نفیس تحصیل علم کی خاطر ان کے گھر پر جایا کرتا۔

گلبدن بیگم بابر بادشاہ کی چہیتی بیٹی، ہمایوں کی غمخوار بہن، اور اکبر بادشاہ کی پھوپھی تھیں۔ بڑی زبردست صاحبِ قلم ہوئی ہیں۔ ہمایوں نامہ آپ ہی کی تصنیف ہے۔ یہ معرکتہ الآرا تصنیف مشرقیوں کی کور ذوقی کی بھینٹ چڑھ چکی تھی کہ ایک مغربی خاتون کے ذوقِ تحقیق نے اسے از سرِ نو تدوین کیا۔ اس مختصر سی کتاب میں عہد بابری و عہد ہمایوں کے اکثر چشم دید حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ آپ کا طرزِ تحریر نہایت سادہ، بامحاورہ اور واقعات پر مبنی ہے بڑی عمر میں وفات پائی۔

شہزادہ دانیال بادشاہ اکبر کا بیٹا تھا۔ ہندی زبان کا مسلم الثبوت شاعر تھا۔ ہندی موسیقی میں کمال حاصل کیا تھا۔ تزک جہانگیری میں اس کی نسبت یہ الفاظ موجود ہیں۔

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود۔ گاہے بزبانِ اہلِ ہند باصطلاحِ ایشاں شعری گفت۔ بد نبودے"

شہزادہ سلیم جو بعد میں شہنشاہ جہانگیر کہلائے۔ طبع موزوں رکھتے تھے۔ اور سلیس لکھتے تھے۔ ان کی تزکِ جہانگیری ادبیاتِ عالم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے علم و فن اور کمالاتِ ذہنی کی مفصل داستان کسی آیندہ قسط میں پیش کرونگا۔

(سید) **نیاز احمد ترمذی**
بی۔اے۔بی ٹی

"جگ بیتی" کا ایک ورق

ملک کے مشہور ادیب جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اردو زبان میں ایک نئے رنگ کی مثنوی تصنیف فرمائی ہے۔ جس کی اشاعت کا اہتمام انجمن ترقی اردو نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ مثنوی خلافِ معمول مختلف بحروں میں ہے۔ اس کے ساڑھے تیرہ سو اشعار میں کسرۂ اضافت کہیں نہیں۔ اردو مثنوی میں علامہ موصوف کی یہ کوشش قابلِ قدر کوشش ہے۔ قارئین ذیل میں اُس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ (مدیر)

جو صبح ہوتے ہی کالج میں پہنچا وہ جوگی — تو باغ و راغ پہ اک کیفیت شباب کی تھی

تجلیوں کی وہ بارش وہ نور کا عالم — تمام کوہ پہ چھایا تھا طور کا عالم

درخت ہیں کہ انگڑائی لے کے اٹھ بیٹھے — جماہی لینے لگے آنکھ کھول کر غنچے

دیا تھا اوس نے کیا غسل پھول پتی کو — جگایا چھینٹوں سے پربت کے ہر نواسی کو

صبا چمن کے حسینوں کو گدگداتی تھی — کلی کلی وہیں شوخی سے کھل کھلاتی تھی

وہ نرم نرم ہوا۔ اس کی اہلی گہلی چال — جو بن میں بوٹے تھے وہ ہو رہے تھے اب چونچال

تھی تازگی جو وہاں ڈال ڈال سے پیدا — تو پات پات تھا گلبرگ کا جواب بنا

درخت جھوم کے مستی میں لہلہاتے تھے — پرندے جوش میں آ آ کے چہچہاتے تھے

وہ راگ چڑیوں کے، ان کی مٹھاس اور ملہار — چہک سے جن کی سبق لیں ہزار موسیقار

ہوائیں اور فضا میں وہ کیف پاشی تھی — کہ جام و بادہ سے مستی کو بے نیازی تھی

تھی کیاری کیاری کی چھب تختی دل لبھانے کو — کرے وہاں سے نہ رضواں کا جی بھی جانے کو

تمام کوہ کو مہکا رہی تھی کستوری ؎ — بو اس کی لینے کی خاطر ہوا ختن سے چلی

تھی بن بہار کی خوشبو کو پا کے مست نسیم — تھی کیف پاشی میں ہمثل و بے نظیر شمیم

ابھی تھا باغ کی گلگشت ہی میں وہ جوگی — کہ اک طرف جو نظر کی یہ کیفیت دیکھی

کہ ایک کیاری میں اک نوجوان لڑکی ہے — نثار جس پہ ادا۔ حسن اور جوانی ہے

وہ پھول توڑ رہی تھی اِدھر اُدھر پھر کر — ہے عندلیب کا کیا شغل اسے ہوئی نہ خبر

جو والہانہ ادائیں تھیں آج بلبل کی ؎ — جمالیات میں گلشن کے تھیں انوکھی سی

؎ کستوری اور بن بہار، پہاڑی خودرو پودوں کے نام ہیں۔ جن کے پھول نہایت خوشبودار ہوتے ہیں۔

کبھی تو پھول کی ٹہنی پہ چھپاتی تھی
کبھی وہ دوش پہ گلچیں کے آکے گاتی تھی

وہ گل کو دوش سے گلبن سے رُخ کو تکتی تھی
وہ ایک رائے پہ ظاہر تھا جم نہ سکتی تھی

بہ طور دیکھے جو اس کے حسین گلچیں نے
وہاں سے دوسری کیاری کو چلدی شرما کے

ایک اور فصل میں سے

زمانہ ہے یہ کس قدر فتنہ آرا
بھلوں کا یہاں ہو تو کیوں کر گزارا

بھلائی کرو جس سے تم دوست ہو کر
وہی پیچھے پڑ جائے بس ہاتھ دھو کر

جو بے لاگ ہو اور بے واسطہ ہو
حسد کے نہ حملے سے وہ بھی بچا ہو

تلے چین پانی کے ہے اور نہ اُوپر
نہ کر تو بھی اللہ کے قہر سے ڈر

بُرائی کبھی تم نے جس سے نہ کی ہو
کرو یاد۔ اُسی سے اذیت ملی ہو

یہ کیسا اُلٹ پھیر ہے یا الٰہی
یہ اندھیر کیسا ہے کیسی تباہی

بھلے تو سہیں آفتیں آفتوں پر
بجاتے ہیں بغلیں بُرے کِھل کِھلا کر

مصائب سے ہرگز نہ پائے مضر تُو
جو کر تو بھی ڈر تُو۔ نہ کر تو بھی ڈر تُو

مہذب جنہیں آج کہتی ہے دُنیا
اُن اقوام ہی نے یہ آئیں نکالا

جو منظور ہے امن ہو اس جہاں میں
نہ جانے کوئی جنگ کو اس جہاں میں

تو تم جنگی طاقت کو اپنی بڑھاؤ
جہاں تک بنے توپیں گیسیں بناؤ

ہوا پر۔ سمندر میں۔ اور اس زمیں پر
کرو قتل و غارت کے سامان یکسر

جو تیار ہو جاؤ اس طرح سب تم
تو ہو جائے گی جنگ ہی دہر سے گُم

مدبر یہ مغرب کے کہتے ہیں ہم سے
جہانگیر ہو امن توپ اور بم سے

یہ مغرب کی قوموں کا جو فلسفہ ہے
اِسی پہ عمل ہر ریاکار کا ہے

کسی نے بدی تم سے کی یا نہ کی ہو
بدی تم کرو اس سے ہو سکتی ہو جو

غرض یہ کہ تم سے ڈریں لوگ سارے
کرو دانو پہلے تو ہیں وارے نیارے

کیفی دہلوی

محبّت اور فرض

پیاری مرناؔل!

تم کتنی سنگدل ہو، ایک نہیں تین تین خط بھیج چکا، تم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ تمہیں بتاؤ، یہ سنگدلی نہیں اور کیا ہے؟ مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ نسوانی دل بھی اتنا سخت، اتنا پتھر ہوتا ہے۔ میں تو یہی جانتا تھا اور یہی سمجھتا ہوں کہ عورت کا دل رقیق اور گداز ہوتا ہے۔ اس میں مروت، محبّت اور نرمی ہوتی ہے، لیکن تمہاری حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔

معلوم نہیں کیوں تمہاری جدائی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے جب کسی طرح دل نہیں مانتا تو قلم دوات کاغذ لے کر تمہیں خط لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے تم میرے سامنے موجود ہو اور میں تمہیں اپنی داستانِ محبت سُنا رہا ہوں، اس طرح ایک گونہ میرے بھڑکے ہوئے جذبات کو سکون ہو جاتا ہے اور دل کی بیقراری قدرے کم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو میں تمہیں بار بار خط لکھتا ہوں کاش تم بھی اس دلچسپی اور توجہ سے پڑھتی ہو مگر تم سے اس کی امید کہاں!

مرناؔل! کیا تم واقعی بے مروّت ہو؟ کیا واقعی تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟ کیا دراصل میرا خط لکھنا تمہیں ناگوار ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو صاف صاف بتا دو۔ پھر میں تمہیں خط نہ لکھا کروں گا، میں تمہیں کسی طرح تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

میں آج تم سے بہت دُور ہو گیا ہوں، اتنی دُور جس کا میرے دل میں کبھی وہم بھی نہ گزرا تھا۔ لیکن کیا کروں فرض سے مجبور ہوں، معلوم نہیں یہاں سے ابھی اور کتنی دور جانا پڑے۔ خیر کیا ہوا، یہ دوری ہم دونوں کے جسموں کے درمیان چاہے جتنی جدائی ڈال دے لیکن ہمارے دل محبّت کے مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، ان کے درمیان کوئی چیز تفرقہ انداز نہیں ہو سکتی۔ میں جیسے جیسے تم سے دُور ہوتا جاتا ہوں تم سے ملنے کی تڑپ بڑھتی جا رہی ہے۔ پیاری مرناؔل! میں تمہارے بغیر سکون و راحت کی ایک سانس بھی نہیں لے سکتا۔ احساسِ فرض اور اس کی ذمہ داریوں نے مجھے تم سے جدا کر رکھا ہے، میں ایسے فرض سے بیزار ہو چکا ہوں، میری روح تو تمہاری محبت کی پیاسی ہے اور اس کے لئے تڑپ رہی ہے۔

تمہیں خبر ہے مرناؔل، میرے احباب میری نسبت کیا کہتے ہیں؟ کہتے ہیں میں سُوکھ کر کانٹا ہو گیا ہوں۔ میرا وہ چہرہ جسے تم پیار سے گلاب کہتی تھیں واقعی گلاب سے کانٹا بن چکا ہے، لوگ غلط نہیں کہتے۔ کیا تمہاری نظر تو نہیں لگ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، نہ کوئی تکلیف ہے نہ بیماری، اچھی طرح کھاتا ہوں، محنت سے کام کرتا ہوں۔ دوستوں کے ساتھ ہنستا بولتا اور کھیلتا کودتا بھی ہوں۔ آرام و راحت کے تمام سامان مہیّا ہیں، پھر بھی کمزور اور ناتواں ہوتا جا رہا ہوں۔ میں اس کی وجہ معلوم کرنے سے قاصر ہوں۔ شاید تم سمجھ سکو۔

امید ہے، تم اس خط کا جواب ضرور دو گی۔ کاش میری یہ امید بر آئے۔ اور تم خط لکھ سکو تو میں اپنے کو کتنا خوش نصیب سمجھوں۔

کملاؔ کو بھی خط لکھا ہے، ممکن ہے پرسوں تک اس کا جواب آ جائے۔ معلوم نہیں وہ گھر آتی ہے یا نہیں؟ وہ بھی کتنی سیدھی سادی اور بھولی بھالی لڑکی ہے مرناؔل! مگر بے چاری خانہ داری کے بوجھ میں دب کر پس رہی ہے۔ غریب کسقدر قبل از وقت اس مصیبت میں مبتلا ہو گئی۔

اب میں خط کو ختم کرتا ہوں۔ نہ زیادہ لکھنا تمہاری مزید بدمزگی اور ناگواری کا باعث ہو گا۔ میرا تو خیال ہے کہ تم خط کو پڑھنا بھی پسند نہ کرتی ہو گی۔ مجھے اس سے چنداں بحث بھی نہیں، میں تو تمہیں خط بھی اپنا ایک فرض ہی سمجھ کر لکھتا ہوں، اور فرض کی ادائیگی میں صلے کے ملنے اور نہ ملنے کا سوال ہی عبث ہے۔

اچھا رخصت، امید ہے کہ تم ہر نوع خوش ہوں گی۔

تمہارا - کشورؔ

میرے دیوتا!

معلوم نہیں تمہیں خط لکھتے کیوں جھجکتی ہوں۔ اور تمہارا غضب آلود خط پڑھ کر تو اور بھی قلم اٹھاتے ہاتھ کانپ رہا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میری اتنی سی کوتاہی تمہارے لئے اسقدر رنج و اذیت کا باعث ہو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کے لئے تم سے معافی مانگوں۔ جسقدر میں نے تمہیں تکلیف دی ہے کیوں نہ اسی قدر تکلیف تم مجھے بھی دو؟ خبر نہیں اس طرح بھی میرے گناہوں کا ازالہ ہو گا یا نہیں۔ لیکن میرے دل کو تو کچھ نہ کچھ تسکین ضرور ہو جائے گی۔

میرے سب کچھ! تمہیں کیسے معلوم کہ میں تمہارا خط نہیں پڑھتی۔ مجھے تمہارا خط پڑھنا پسند نہیں۔ مجھے تم سے ہرگز ایسی توقع نہ تھی کہ میری نسبت ایسی دل آزار بات لکھو گے۔ عورتیں سچ ہی کہتی ہیں کہ مرد بڑے بے رحم ہوتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے قلم سے ایسے الفاظ نہ نکلتے۔

ایک بات کہوں؟ نہیں، نہ کہوں گی، شرم معلوم ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک بار تمہیں "پیارے" کے لفظ سے مخاطب کروں، لیکن نہیں کرسکتی۔ معلوم نہیں کیوں یہ لفظ مجھے بہت بھونڈا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے میں تمہیں "تم" کہہ کر مخاطب کرنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔

اور ایک بات سنو۔ ہے تو پرانی لیکن تمہارے لئے شاید نئی ہو۔ جس روز تم انتہائی سنگدلی کے ساتھ مجھے چھوڑ کر چلے گئے مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میں اس روز واقعی تم پر بہت غصہ تھی، شادی ہوئے نہ مہینہ ہی ہی گزرا نہ ہفتہ ہی پورا ہونے پایا۔ اور تم چلے گئے، جانتے ہو، جوانی اور جوانی کی امنگ میں بالکل پاگل ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہیں نہ جاؤ، ورنہ زہر کھالوں گی، لیکن زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ تم چلے گئے، تمہارا پہلا خط آیا، میں نے واقعی اسے کھولا تک نہیں، اٹھا کر الماری میں ڈال دیا، تمہارے چلے جانے سے میرے دل کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ اس طرح موجود تھا۔ دوسرا خط آیا، تقریباً اس کا بھی وہی حال ہوا۔ میرا غصہ اب تک فرو نہیں ہوا تھا، پھر میں تمہارا خط کیوں کھولتی، کیوں پڑھتی، لیکن تمہارے تیسرے خط کو میں بے پڑھے نہ رہ سکی، اس کی وجہ تھی جسے میں بتانا نہیں چاہتی۔ تیسرے خط کے پڑھنے کے بعد مجھے پہلے اور دوسرے خطوط بھی پڑھنے پڑے، اس روز سے سوچ رہی تھی کہ جواب لکھوں اور ایسا لکھوں کہ تم بھی یاد کرو، سمجھو کہ کسی سے واسطہ پڑا ہے، لیکن ارادے کو عمل میں نہ لاسکتی تھی، اب تمہارا چوتھا خط سامنے ہے اور یہ جواب لکھ رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں بے اختیار تمہاری طرف کھنچی جا رہی ہوں۔ تمہیں بتاؤ من موہن! آخر تم میں کیا کشش پیدا ہو گئی ہے؟ میرا دل تمہارے لئے کیوں بے اختیار ہو رہا ہے؟

میں تو میں، مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تم خود بھی میری جانب کھنچے چلے آ رہے ہو، میرے دیوا! یہاں کیا ہے؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ محبت؟ اور وہ بھی میری؟ فرض کے سامنے محبت کی حقیقت؟ میں جانتی ہوں کہ محبت زندگی کا جزو ہے۔ لیکن کیا محبت کے لئے دو جسموں کا ایک جگہ ہونا لازمی ہے؟ میرا دل بھی محبت کے لئے تڑپ رہا ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم ہمیشہ میرے گلے ہی سے لگے رہو۔ یہ محبت نہیں ہے۔ یہ تو نفس پرستی ہے۔ محبت قرب و بعد سے بے نیاز ہے۔ تم نے تو خود ہی لکھ دیا ہے کہ ہمارے دل محبت کے مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی چیز تفرقہ انداز نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک صداقت ہے۔ اور صداقت کسی حالت میں باطل نہیں ہوسکتی۔

بے شک تم مجھ سے بہت دور چلے گئے ہو، مگر ادائے فرض کے راستے میں دور و نزدیک کا خیال عبث ہے، تم بڑھتے جاتے ہو، بڑھتے جاؤ۔ لیکن کیا کبھی وہ وقت بھی آسکتا ہے جب ہم دونوں ساتھ ہوں؟ آہ! قسمت کے نوشتے کا حال کون جان سکتا ہے؟

مجھے تم سے معافی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ میری گذشتہ فروگذاشتوں سے درگذر کرو، اب میں برابر جواب لکھا کروں گی۔ تمہارے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تم بالکل بے صبر ہو رہے ہو۔ ایسا نہ ہو گھبرا کر بھاگ آؤ۔ اگر تم نے ایسی غلطی کی تو یاد رکھو؟ محبت کرتے ہو کرو۔ لیکن محبت کی توہین نہ کرو۔ اتنا اشارہ کافی ہے۔

کملا بہن آئی تھیں، تمہارا خط بھی دکھاتی تھیں، معلوم نہیں کیوں ان کے سامنے میری زبان ہی نہیں کھلتی، لیکن وہ مجھے کتنا مانتی ہیں، کتنی محبت کرتی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ کملا بہن اُنس و محبت کی پتلی ہیں، دونوں بھائی بہن .... جانے دو۔ نہ کہوں گی۔

انہوں نے کہا۔ کیا آپ کو ان کی ضرورت ہے کملا بہن؟

تم جانتے ہو اس پر کملا بہن نے کیا کیا؟ میرے گالوں پر... میرے ہونٹوں پر.... اور نہ جانے کہاں کہاں.... پھر کہنے لگیں۔ پھر ایسی بات منہ سے نکالوں گی؟

میں بہت پریشان ہو چکی تھی۔ بولی —— نہیں،

اس کے بعد ہم دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

کملا بہن اوپر سے جسقدر خوش معلوم ہوتی ہیں دل سے نہیں، سمجھ میں نہیں آتا اس کی وجہ کیا ہے؟ چاہتی ہوں پوچھوں، مگر ہمت نہیں پڑتی، تم نے مدد کے لئے لکھا ہے۔ آخر اس کی صورت کیا ہوگی؟ انہیں ناگوار تو نہ ہو؟

مجھے معلوم نہ تھا کہ کملا اتنی مجبتی ہیں۔ مجھے تو ان کے بغیر رہنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ نہ جانے کیوں انہیں دیکھتے ہی تمہاری صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ بھائی بہن میں اتنی مشابہت، اچھا تو یہ جوڑا.... ! نہیں معافی چاہتی ہوں، اب رخصت دو۔"

تمہاری —— مرنالنی

پیاری مرنال!

تمہارا خط مل گیا تھا، اس بار مجھی کو خط لکھنے میں دیر ہوئی، کیا کروں۔

کام میں بیحد زیادتی ہو گئی ہے - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کام کرتے کرتے سونے کا وقت ہو جاتا ہے - سونے کا ارادہ کرتا ہوں کہ پھر کام نکل آتا ہے - نیند پوری نہیں ہونے پاتی، کیا بتاؤں کہ دل کسقدر گھبرا گیا ہے، لیکن کوئی چارہ نظر نہیں آتا -

تم سمجھتی ہوں گی - کام وام کچھ نہیں، میں صرف باتیں بنا رہا ہوں لیکن تم یقین کرو کہ میں نے حرف بحرف سچ لکھا ہے، تمہارے اس بار کے خط سے میرے دل کو جو تقویت پہنچی ہے اس کا اظہار زبانِ قلم سے ناممکن ہے - اگر تم ادائے فرض کی راہ پر ثابت قدم رہنے کی ہدایت نہ کرتیں تو میں سچ کہتا ہوں - میرا یہاں ٹھہرنا ناممکن تھا - میں اب تک تمہارے پاس پہنچ چکا ہوتا - اس خط و کتابت کا سلسلہ ہی ختم ہو چکا ہوتا - میری تو عجیب حالت ہو رہی ہے - ایک طرف فرض ہے اور دوسری طرف محبت، اور دونوں اپنی اپنی جانب کھینچ رہے ہیں - نہ مجھ سے آگے بڑھا جاتا ہے اور نہ پیچھے ہٹا جاتا ہے، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا معاملہ ہے - میری مدد کرو مرنال! مجھے سہارا دو -

میری پیاری مرنال! میں آج خود کو تمہارے سامنے مجرم سا محسوس کر رہا ہوں - مجھے اس کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ میں نے تمہاری ازدواجی زندگی کو بالکل بے کیف بے لطف بنا رکھا ہے - جوان جذبات جتنے سرکش اور مطلق العنان ہوتے ہیں اس سے میں ناواقف نہیں ہوں، مجھے معلوم ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں - ان کی تسکین کیوں کر ہو سکتی ہے تسکین نہ ہونے کی حالت میں وہ کس طرح تمام قید و بند کو زیر و زبر کر دینے پر تیار ہو جاتے ہیں ان جذبات پر قابو پانا عام آدمیوں کا کام نہیں، اور ہم تو بہت کمزور لوگوں میں سے ہیں - اس لئے مجھے لازم تھا کہ فرض کے ساتھ تمہاری حالت کو بھی ملحوظ رکھتا - یہ بھی میرا ایک فرض ہی تھا - لیکن میں اس فرض کو ادا نہ کر سکا - میں اپنی اس کوتاہی پر کتنا محجوب اور شرمسار ہوں - میں نے اپنے جذبات کی پیروی کی، مگر تمہارے جذبات کو ٹھکرا دیا - اپنا ارمان پورا کیا - تمہارے ارمان خاک میں ملا دئے - میں نے انسانیت کی خلاف ورزی کی، مجھے جہاں اپنے ایک فرض کی ادائیگی کی خوشی ہے وہاں دوسرے فرض کے فوت کر دینے کا صدمہ بھی ہے - اور یہ صدمہ اتنی شدت اختیار کر چکا ہے کہ جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا سب سے اہم فریضہ تمہیں خوش کرنے اور خوش رکھنے کے سوا اور کوئی نہیں ہے - لیکن یہ سب کچھ سوچنے اور سب کچھ چاہنے پر بھی کیا کروں کہ بالکل مجبور رہوں -

مگر نہیں میں، جوان ہوں - اور مجبوری کا لفظ جوانوں کے شایانِ شان نہیں - میں کسی مجبوری کو اپنے راستے میں حائل ہونے دینا گوارا نہ کروں گا - میں اپنے کو قربان کر کے بھی تمہارے پاس پہنچوں گا اور دیکھ لینا مرنال ضرور پہنچوں گا - ہا! وہ وقت بھی کتنا مسرت آگیں ہوگا!

مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ تم نے مجھے جو خط لکھا تھا وہ میرے افسر کے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے اسے پڑھ بھی لیا - تم نے جس عزم و حوصلہ اور صبر و استقلال کا اظہار کیا ہے اس سے تو وہ خوش ہیں، لیکن میری طرف سے ان کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے، ان کا خیال ہے کہ میں اپنے کام کی طرف سے سست اور بے پروا ہوتا جا رہا ہوں - انہوں نے مجھے تیاری کی ہدایت کر دی ہے - شاید اسٹیشن سے بہت دور دیہات میں بھیجنا چاہتے ہیں - جہاں یا تو مجھے تمہارا خط ملے گا ہی نہیں یا بہت بہت دنوں بعد ملے گا - لیکن چارہ کیا ہے؟ جب ادائے فرض کا عہد کیا ہے تو اس کی پابندی تو ہر حال میں لازمی ہے - لیکن اس کے تصور ہی سے میری روح بیقرار ہو رہی ہے کہ ہم بجائے ملنے کے اور جدا ہوئے جا رہے ہیں - آہ! کیا کہیں وہ راستہ نہ ملے گا - جو ہم بچھڑے ہوؤں کو آپس میں ملا دے؟

مجھے کملا کا خط بھی مل گیا ہے - مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم اسے پسند کرتی ہو، اور تمہارے دل میں اس کی عزت ہے - صحیح ہے، اس کے ظاہر و باطن میں بہت فرق ہے - وہ اپنی ظاہری خوشی میں اندرونی مصیبت کو چھپائے رہنا چاہتی ہے - میرے گھر والوں نے اس پر انتہائی ظلم کیا کہ ایک بوڑھے کے ساتھ اس کی زندگی تباہ کر دی، لوگوں نے خاندان دیکھا - دولت دیکھی، کملا کو نہ دیکھا - یہ نہ دیکھا کہ ایک کمسن لڑکی دائم المریض بوڑھے کے ساتھ کیوں کر نبھائے گی - دن رات کام کی چکی میں پستے اور اس پہ ایک چڑچڑے بوڑھے مریض کی بد مزاجیوں کا سامنا کرنے میں اسے کتنی تکلیف و اذیت ہوتی ہوگی - اس نے لکھا ہے کہ اس کا شوہر قریب المرگ ہے - اسی سے اس کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے - ایسا نہ ہو بے چاری کا رہا سہا سہاگ بھی لٹ جائے - معلوم نہیں سماج کی آنکھیں کب کھلیں گی؟ اندھی سوسائٹی کب دیکھے گی کہ کتنی کمسن لڑکیوں کی زندگی بیوگی کی حالت میں برباد ہو رہی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا یہ تباہ کن سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟

کملا کی دیکھ بھال کرتی رہنا - ہو سکے تو اس کے گھر جا کر اسے تسکین و تشفی دینا - اس کی مالی امداد بھی کر سکتی ہو - لیکن کسی حیلے سے - یوں امید نہیں کہ وہ کوئی مدد قبول کرے گی -

ایک بات کہوں، برا تو نہ مانو گی؟ جس طرح تم میری اور کملا کی صورت میں مشابہت پاتی ہو اسی طرح یہاں ایک مرد ہے تمہاری صورت کا - بالکل تمہارا ہمشکل، تمہارے جیسا چہرہ، تمہاری ہی طرح کی رنگت، کسی بات میں فرق نہیں - تم اسے مانتی بھی بہت ہو - پیار بھی بہت کرتی ہو - میں یہ کہوں

تو بے جا نہ ہوگا کہ تمہارے نزدیک اس کے مقابلے میں میری بھی کوئی حقیقت نہیں ہے - بتاؤ، تم اسے جانتی ہو؟ بے شک جانتی ہو، لیکن میرے سامنے کیسے اقرار کرو گی - تم اقرار کرو یا نہ کرو، مجھے تو پتہ چل ہی گیا - کہو تو اس کا نام بھی بتاؤں - کرشن، کہو ہے نہ یہی نام؟ تم دونوں آپس میں کون ہو؟ کہیں بھائی بہن ہونے کے بجائے . . . . - اچھا معاف کرو

جواب کا منتظر

تمہارا - کشور

پیاری مرنال!

پرسوں کا خط تمہیں مل گیا ہوگا، آج پھر خط لکھنے کا اتفاق ہو گیا - میں سمجھ رہا ہوں کہ اس خط کے پڑھنے سے تمہیں خوشی نہ ہو گی، پھر بھی تمہیں صورت حال سے مطلع کر دینا ضروری تھا -

تمہیں معلوم ہے کہ خدمتِ وطن کے جس مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے ہم نے اپنے کو وقف کر دیا ہے - وہ فریق ثانی کے اغراض و مصالح کے منافی ہے - یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے بہت سے رفقائے کار ہمارے اندر موجود نہیں ہیں - اور ہمیں نہیں معلوم کہ چند گھنٹوں بعد ہم کہاں ہوں گے - لیکن بہرحال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ضبط و تحمل سے کام لینا، شاید اب ہمیں خط لکھنے کا موقع نہ ملے - اس لئے خط کا انتظار نہ کرنا -

اگر تم میری یاد کو اپنے دل سے دور کر سکو تو ضرور کر دو - میری یاد سے تمہیں خواہ مخواہ تکلیف ہو گی - اور فائدہ کچھ نہیں، ممکن ہو تو کملا سے مل کر کسی ایسے سلسلۂ کار میں منسلک ہو جاؤ جس کی مصروفیت تمہارے غم کو بھلا سکے -

یاد رکھو دنیا صرف راحت و خوشی جگہ نہیں ہے - مقام ایثار و عمل بھی ہے - اور یہی ہمارا مقصد زندگی ہونا چاہیئے - ہماری زندگی خوشگوار ہو یا مصیبت ناک ہمیں لازم ہے کہ ہر حالت میں اپنے مقصدِ زندگی کو مقدم رکھیں اور فرض سے روگرداں نہ ہوں - کملا کو میرا پیار پہنچا دینا، مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی زندگی کو کامیاب اور خوش و تنومند نہ بنا سکا - تمہاری طرف سے میں البتہ مطمئن ہوں - مجھے یقین ہے کہ تم سے فرض شناسی میں کوتاہی نہ ہو گی - تم اپنے فرض کو پورا کرو گی اور اس طرح میرے فرض کی ادائیگی میں بھی باعثِ تقویت ہو گی - تم اپنے بھائی نوین کے پتے سے مجھے خط بھیج سکتی ہو - میں نے اس سے کہہ دیا ہے - وہ تمہارا خط میرے پاس بھیج دیا کرے گا - بس اب رخصت کرو، زیادہ پیار -

صرف تمہارا : کشور

پیارے ......!

لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہا ہے، دل دھڑک رہا ہے، لیکن جو بات ہو چکی ہے اس سے تمہیں بے خبر رکھنے سے کیا فائدہ؟ کملا بہن کا سہاگ لٹ گیا - ان کے اندوہ و قلق کی انتہا نہیں ہے - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیسے تسلی دوں - کیا کہہ کر ڈھارس بندھاؤں، خود رہ رہ کر میرا دل بے قابو ہو جاتا ہے تو ان کے دل کی جو حالت ہو کم ہے -

لیکن مجھے تعجب ہوا جب میں نے کملا کو تمہارا آخری خط پڑھ کر سنایا - معلوم ہوا ان کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے - ان پر ذرا بھی تو اثر نہیں ہوا - مجھے ضبط نہ ہو سکا - میرے منہ سے اتنا نکل ہی گیا - تمہیں اپنے بھائی کے جیل جانے کا کوئی رنج و افسوس نہیں ہے - بڑے تعجب کی بات ہے -

اس پر کملا بہن ہنسنے لگیں - بولیں - اس میں رنج و افسوس کی کون سی بات ہے؟ اس جواب سے میرا غصہ اور بھی بھڑک اٹھا - اس وقت مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں - میں نے کہا - تم اس وقت ہنستیں جب تمہارے ..... جیل چلے جاتے تو جانتی - کملا کی ہنسی پھر بھی نہ رکی، بولیں - بھابھی! تم بھی اس کا ذکر کرتی ہو جو کبھی واپس آ ہی نہیں سکتا؟ جیل جانا واقعی کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے - ایک سال، دو سال، دس سال میں آخر آدمی آئے گا ہی - اس لئے اس کا رنج و غم فضول ہے -

اب میں سمجھی کہ کملا بہن کتنے مضبوط دل کی عورت ہیں - اور انہوں نے کتنی اچھی سمجھ پائی ہے - وہ تو ایک طرح اپنا غم بھول چکی ہیں، لیکن میں اپنی حالت کیا لکھوں - کسی طرح دل کو صبر نہیں آتا - نہ جانے تم نے کس منحوس ساعت میں گھر سے قدم نکالا - اگر میں جانتی کہ یہ نتیجہ ہوگا تو تمہارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی - تمہارے قدموں سے لپٹ جاتی - تمہیں کسی طرح نہ چھوڑتی -

تم نے لکھا ہے مجھے بھلا دو - کیسے بھلا دوں؟ جو دل میں بسا ہوا ہو جس کی تصویر آنکھوں کی پتلیوں میں کھنچی ہو اسے کیسے بھول جاؤں؟ تمہیں بتاؤ اس کا کوئی طریقہ -

آجکل کملا بہن یہیں آ گئی ہیں - بس یہی خیریت ہے - وہی میرے لئے باعثِ تسکین بنی ہوئی ہیں - اگر وہ ڈھارس بندھانے کے لئے موجود نہ ہوتیں تو اب تک میں نہ جانے کیا کر چکی ہوتی - وہ میری کمزوریوں سے واقف ہیں - اس لئے سایہ کی طرح ہر وقت ساتھ رہتی ہیں، معلوم نہیں ان کے صبر و تحمل کی کتنی قوت ہے - میں فرطِ غم سے بت بن جاتی ہوں - لیکن وہ اس وقت بھی مسکراتی رہتی ہیں، میں خوب سمجھتی ہوں - کہ اس مسکراہٹ کا اثر صرف ہونٹوں تک محدود ہوتا ہے ورنہ ان کے دل میں بھی وہی آگ دہکتی رہتی ہے - جو میرے سینے میں شعلہ زن ہوتی ہے، لیکن یہ ان کا ضبط و استقلال ہے - جہاں تک ہو سکے جلد اپنی خیریت کا خط لکھو - میرا دل کسی طرح قابو میں نہیں آتا -

غمزدہ —— مرنالنی

پیارے ......!

بالوجی سے تمہارے حالات معلوم ہوئے - یہ بھی معلوم ہوا کہ جوریوں نے کیا فیصلہ کیا - اُف! سات برس کی بامشقت قید! اتنی مدت کے لئے! کہو دیلو! سات برس کے یہ لمبے دن کیسے کٹیں گے؟

لیکن کملا بہن ضبط و قرار کے سمندر کی طرح متین اور خاموش ہیں، نہ ان پر غم کا اثر معلوم ہوتا ہے نہ خوشی کا - جس روز سے بالوجی تم سے مل کر واپس آئے ہیں وہ دیہات دیہات پھر کر تنظیم کا کام کر رہی ہیں - انہوں نے رضاکار عورتوں کی ایک جماعت بنائی ہے - اس جماعت کو وہ خود چلا رہی ہیں - ان کی تقریر میں عجب اثر ہوتا ہے - میں خود ان کی تقریروں سے اسقدر اثر پذیر ہو چکی ہوں کہ اب تمہارے لئے میرے دل میں رنج و غم کا شائبہ بھی باقی نہیں ہے میں بہت باتیں بنایا کرتی تھی - میں بہت عقلمند بنتی تھی، لیکن محبت اور فرض کی حقیقت دراصل مجھ پر اب منکشف ہوئی ہے اور میں نے اب سمجھا ہے کہ محبت کے مقابلے میں فرض کا کیا درجہ ہے -

میرے دیلو! تم مجھے جس کام کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے اس کے لئے اب میرے دل میں ایک خاص جوش و ولولہ پیدا ہو گیا ہے، میں خود اسی راہ پر گامزن ہوں، اب نہ مجھے کوئی فکر ہے نہ تشویش - خوف ہے نہ ہراس - مجھے تو کھانے پینے تک کی پروا نہیں رہتی - یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کب صبح ہو رہی ہے - اور کب شام، کتنی اچھی زندگی ہے -

میں کیا جانتی تھی کہ مجھے ایسی کامیاب زندگی بھی نصیب ہو سکتی ہے کملا بہن واقف تھیں اس لئے وہ اس وقت بھی ہنستی تھی جب میں روتی تھی -

بہرحال میں نے اپنے فرض کو پہچان لیا ہے - میں قومی خدمت کے میدان میں برابر آگے بڑھتی جا رہی ہوں - اور اسی طرح بڑھتی چلی جاؤں گی - مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ اس راہ میں کن الام و مصائب کا سامنا ہوگا - یہ ہمارے لئے آزمائش کا وقت ہے اور ہمیں اس وقت کامیابی نصیب ہو سکتی ہے جب ہم پیش آمدہ آزمائش میں پورے اُتر جائیں، کیا ہم اس امتحان میں کامیاب... ہوں گے دیلو؟

اب میں خط کو ختم کرتی ہوں - جاؤ، سات برس کی طویل مدت کے لئے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر تمہیں رخصت کرتی ہوں - تم اپنا فرض ادا کرو - میں بھی اپنے فرض کی ادائیگی میں تا امکان کوتاہی نہ کروں گی - کملا بہن کا سلام قبول کرو - اور میرا.....!

تمہاری خوش نصیب - مرنال

مہتاب رائے ایم - اے

حُسن

پیاری جبینِ ناز! اپنی اِن نیم باز آنکھوں پر فخر نہ کر -
جو اپنے آسمان حُسن میں صبح کے آخر تاروں کی طرح چمکا کرتی ہیں -
نہ تجھے اس پر فخر ہونا چاہیئے کہ تو چاہے جس دم -
دُنیا کا ایک ایک دل اپنی زُلف گرہ گیر میں اُلجھا ہوا دیکھ سکتی ہے اور خود اپنا دل آزاد و مستغنی -
پیاری! اپنی زلفوں کے اس زرین اندوختہ پر بھی نازاں نہ ہو -
جو محبت کی پُر کیف ہوا میں جھوما کرتی ہیں -
دیکھ - وہ یاقوت جو تُو پہنے ہوئے ہے -
اور جو تیری نرم و نازک کان کی لو میں ہر دم آویزاں رہتا ہے -
آخر وہی قیمتی پتھر رہے گا -
جبکہ تیرے جہانِ حُسن کا خاتمہ ہو چکا ہو گا ——

محمد جمیل احمد برنی - بی - اے

اشکبار فراق سے

مرے الم میں نہ ہو اشکبار جانے دے — خزاں قبول نہ کر لے بہار جانے دے!

یہ زرد حسن محبت یہ سرخ دیدۂ شوق — یہ اہتمام شب انتظار جانے دے!

شباب میں غم الفت کو مشغلہ نہ بنا — غلامیٔ دل بے اختیار جانے دے!

نہ باندھ رات کے دامن سے دامن فریاد — کرم کرم! مرے اختر شمار جانے دے!

نگاہ حسن طلب سے نہ دل ہو شرمندہ — تصورات کا کیا اعتبار جانے دے!

تری حیا کے تصدق، تری وفا کے نثار — لٹا نہ اپنا سکون و قرار جانے دے!

لہو اگل کے نہ مر جائے عشق ضبط پسند — یہ سینہ کوبیٔ لیل و نہار جانے دے!

نہ پھینک کاہکشاں پر کمند نالۂ غم — شب چمن کو نہ کر سوگوار جانے دے!

نظر فروز جوانی کو پائمال نہ کر — نہ کر بہار میں خون بہار جانے دے!

فلک نشین ستاروں کے دل نہ رک جائیں — پکار مجھ کو نہ دیوانہ وار جانے دے!

میں گڑگڑا رہا ہوں کہ تو اور دم بھر سے میرا — بس اور مجھ کو نہ کر شرمسار جانے دے!

مری حیات حزیں میں بشاشتوں کو نہ ڈھونڈھ — مری خزاں میں نہیں ہے بہار جانے دے!

نہ اس طرح مجھے ممنون کر کہ مر جاؤں!
فقیر پر یہ کرم شہریار جانے دے!

احسان دانش

مشاہیرِ عالم

رضا شاہ پہلوی

جلالِ جم۔ شوکتِ دارا، شانِ نوشیرواں، عظمتِ کیخسرو کا سرمایہ دار ایران ذلت وخواری کی حالت میں مبتلا تھا۔ اربابِ حکومت واقتدار کی نفس پروری اور عیش پرستی نے ملک کو مجبور ومفلوج بنا دیا تھا۔ مزدوروں، کسانوں اور طبقۂ عوام کی کس مپرسی، بے چارگی اور مفلوک الحالی نے ملک کی روحِ حیات کو مضمحل کر دیا تھا۔ اس طرح ملک کی ناطاقتی وناتوانی انتہا سے گزر گئی تھی۔

اِس مردِ مریض کی اس عاجزی ودرماندگی کو دیکھ کر ایک طرف سے انگلستان کا دیوِ استعمار اور دوسری جانب سے روس کا عفریت اقتدار اسے نگلے چلا جا رہا تھا۔ اور اس میں ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کی تو کہاں سکت تھی، اس لائق بھی نہ تھا کہ آہ کر سکتا اور آہ کر سکتا۔ اس سے زیادہ کس ملک کی حالتِ یاس وحسرت اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن عین اس ـــ ناامیدی کے عالم میں پردۂ غیب سے ایک مرد نمودار ہوا۔ جس نے ایران کی قسمت یکسر پلٹ دی، مریضِ ایران کے اسی مسیحا نفس کا نام نامی رضا شاہ پہلوی ہے۔

رضا شاہ کون ہے؟ کس خاندان سے ہے؟ کس کا بیٹا ہے؟ کہاں کا تعلیم یافتہ ہے؟ اتنا بڑا عظیم المرتبت شخص، ایسے عظیم الشان انقلاب کا بانی۔ ایسے پُر عظمت ملک کا مالک، لیکن اس کے متعلق ان موٹے موٹے اور عام سوالات کا کوئی متعین اور متفق علیہ جواب موجود نہیں۔ کوئی کہتا ہے رضا شاہ ایک کسان کا بیٹا ہے، کوئی کہتا ہے اس کا باپ وزارتِ عظمیٰ کے منصبِ جلیلہ پر فائز تھا۔ کوئی کہتا ہے وہ ایران کے پہلوی نسل کے ایک فلک زدہ خاندان کا فرد ہے۔ اس کی تعلیم وتربیت کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ کوئی اس کی صلاحیت واستعداد کو مغربی تعلیم وتہذیب کا فیضان قرار دیتا ہے، کوئی ترقی یافتہ ممالک کی سیر وسیاحت، لیکن ان میں سے ساری روائتیں حکایت وافسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ نہ وہ وزیرزادہ ہے۔ نہ مغرب کا تعلیم یافتہ۔ نہ اس نے سرحدِ ایران سے باہر کہیں قدم رکھا۔

وہ یقیناً ایک کسان کا بیٹا ہے۔ اس کی تعلیم وتربیت کاملاً دیہاتی ہے۔ اس کی استعداد وصلاحیت کو کسب سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تمامتر وہبی اور عطیۂ فطرت ہے۔ اگر رضا شاہ وزیرزادہ اور مغرب کا تعلیم یافتہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان امور میں اسقدر اختلاف واضداد ہوتا، اور اصل تو یہ ہے کہ رضا شاہ کے لئے آب وجد کی بحث ہی عبث ہے۔ اگر نادر شاہ کے لئے شمشیر ابن شمشیر کا شرف کافی تھا تو رضا شاہ کے لئے بھی یہی بس ہے کہ وہ رضا شاہ ہے۔

کن ابن ما شئت واکتسب ادبا
یغنیک محمودہ عن النسب

رضا شاہ اپنی حیاتِ ممیزہ کے خود بانی ومعمار ہیں۔ ان کی تعمیر زندگی کسی غیر کے دستِ کرم کی ممنون ومنت پذیر نہیں۔ وہ غبار زمین سے اُٹھے اور ترقی وکامرانی کے آسمان کے مہر وماہ بن گئے، وہ سترہ سال کی عمر میں دیہات سے چل کر پایۂ تخت میں پہنچے، وہاں کاسک فوج میں بھرتی ہوئے۔ اور اپنی غیر معمولی استعداد وصلاحیت کے باعث تختِ جم اور عظمت نوشیرواں کے مالک ہو گئے۔

رضا شاہ میں ابتدا ہی سے قابلیت وترقی کے جوہر موجود تھے۔ انہوں نے اپنی تنومندی اور اولوالعزمی سے بہت جلد اپنی فوج کے سپاہیوں پر اپنا رعب واثر قائم کر لیا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ پہلی بار سرکش جنگلیوں کی تہدید د تنبیہ کے لئے فوج کے ساتھ بھیجے گئے۔ اس مہم میں انہوں نے ایسی قابلیت کا اظہار کیا کہ دفعتہً انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دوسرے سال آذربائیجان کے اشتراکیوں اور کاسک فوج میں جنگ ہوئی جس میں کاسک فوج کا شیرازہ پریشان ہو گیا۔ اس پراگندہ فوج کی ازسرِ نو ترتیب وتنظیم میں رضا شاہ نے غیر معمولی کارگزاری کا ثبوت دیا۔ جس کے صلے میں وہ قاسم خاں اور مسعود خاں کے ماتحت کرنیل بنا دئے گئے۔

طہران کے نامور اخبار "رعد" کا مدیر سید ضیاء الدین انقلاب حکومت

میں کوشاں تھا۔ اس نے پہلے مسعود خاں کو اور اس کے توسط سے قاسم خاں اور رضا خاں کو اپنا شریک راز بنایا۔ اس کی تجویز کے مطابق اولوالعزم رضا خاں ۲۰ اور ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کی درمیانی شب میں ڈھائی ہزار سپاہ کے ساتھ براہ قزوین طہران میں داخل ہوا۔ اور رات ہی رات حکومت کے تمام دفاتر پر قبضہ کر لیا۔ لوگ سو کر اُٹھے تو حکومت میں انقلاب عظیم برپا ہو چکا تھا۔ سید ضیاء الدین وزیر اعظم اور رضا خاں سردار سپاہ کے مناصب پر قابض ہو چکے تھے۔ برطانوی وفد مالیات کے رکن آنریبل جے ایم بالفور جو ان ایام میں طہران ہی میں مقیم تھے۔ اس حیرت انگیز انقلاب کے متعلق کہتے ہیں کہ "انہیں صبح کی حاضری کے وقت تک پتہ نہ چل سکا تھا کہ حکومت میں کوئی انقلاب ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ کسی مقام پر بھی کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی۔"

رضا خاں کو اپنی قوت، عمل اور صلاحیت کارکردگی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس لئے اب ان کی حوصلہ مند طبیعت موجودہ حالت پر قناعت کرنا پسند نہ کر سکی۔ اُنہوں نے فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے روپے طلب کئے اور ساتھ ہی اس امر پر آمادگی ظاہر کی کہ انہیں سرکش امرا و روٗسا کی سرکوبی پر مامور کیا جائے۔ اس زمانے میں ٹیکس کی وصولی نفی کے درجے تک پہنچ چکی تھی اور مالگذاری کی وصولی کا بھی یہی حال تھا۔ اس لئے سید ضیاء الدین کو ایسے باحوصلہ شخص کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ اُس نے رضا خاں کو حکم دیا اور متعدد امراء و روٗسا گرفتار کر کے جیل بھیج دئے گئے۔ گرفتاروں میں شہزادہ فیروز اور اُس کا باپ فرمان فرما بھی تھا۔

اس کے بعد رضا خاں نے دوسرا قدم اُٹھایا۔ انہوں نے سید ضیاء الدین کو مجبور کر کے وزارت عظمیٰ کے منصب سے علیحدہ کر دیا اور جدید وزارت کی ترتیب کے وقت قوام السلطنت کو قلمدان وزارت دیکر خود وزیر جنگ بن گئے۔

جدید عہدے پر فائز ہونے کے بعد رضا خاں نے اور سرگرمی سے ملک کی خدمت شروع کی، فوج میں اضافہ کیا۔ سرقہ اور رہزنی کا انسداد کیا۔ سڑکوں پر پہرے مقرر کئے۔ اور سرکش قبائل کی گوشمالی اور مطلق العنان صوبوں کو مرکز کے ماتحت بنانے کی جدوجہد کے لئے اپنے کو وقف کر دیا۔ رضا خاں کی ان کارپردازیوں اور سرگرمیوں نے انہیں حکومت کا دست راست ثابت کر دیا۔ اور اہل ملک انہیں قدر و محبت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

اس وقت تک رضا خاں کو ملک میں جو قبولیت و ہردلعزیزی حاصل ہو چکی تھی اور حکومت میں وہ جو دخل و تصرف حاصل کر چکے تھے اس کے اعتبار سے انہیں دوسروں کی ماتحتی میں رہنا عبث معلوم ہوا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں انہوں نے وزارت عظمیٰ کے منصب پر قبضہ کر لیا۔ اور وزارت جنگ کو بھی بدستور اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ قوائے حکومت کے ضعف و انحطاط نے عناصر ملک کو خودسری اور مطلق العنانی پر جری کر دیا تھا۔ شمالی علاقہ سردار کوچک خاں کے ہاتھوں تباہ ہو رہا تھا۔ بلوچستان میں بھی بغاوت کے جراثیم اپنا کام کر رہے تھے۔ خوزستان میں شیخ خزعل محمرہ نے برطانی حمایت میں آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ اس نے ۱۹۲۴ء میں بختیاریوں اور کاشغیوں کو طرح طرح کے انعام و اکرام کی ترغیب دے کر جنوب و مغربی علاقوں میں آتش فتنہ و فساد شعلہ زن کر دی۔

اہل ایران برطانوی نفوذ و اثر سے کافی حد تک متاثر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شیخ محمرہ کی تنبیہ و تادیب کے لئے کوئی قدم اٹھایا گیا تو برطانوی حکومت خاموش نہ رہے گی۔ لیکن رضا خاں نے جو اس وقت شیراز میں مقیم تھے باغیوں اور فتنہ پردازوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں روانہ کر دیں۔ بختیاریوں نے اطاعت قبول کر لی۔ شیخ محمرہ نے بھی بذریعہ تار معافی کی درخواست کی مگر حوصلہ مند رضا خاں نے تار ہی کے ذریعے انکار میں جواب دے دیا۔ اس کے بعد وہ بو شہر سے پہلوی جہاز پر سوار ہو کر خود عازم محمرہ ہوئے۔ ۵ دسمبر کو رضا خاں بمقام سفیری خیمہ انداز ہوئے۔ جہاں شیخ محمرہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے غیر مشروط طور پر عہد اطاعت کیا۔

شیخ محمرہ کی اطاعت رضا خاں کی آئندہ کامیابیوں کی عظیم الشان بشارت تھی۔ کیونکہ شیخ محمرہ اپنے رسوخ و اثر، مال و جاہ اور فتنہ و فساد کے باعث ملک کے لئے زبردست خطرہ تھا۔ اس کی اطاعت مالی حیثیت سے بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اس کے خراج کا تخمینہ ایک کروڑ بیس لاکھ کیا گیا جس کی ادائیگی کی نسبت اسی وقت سے اس سے اقرار نامہ لکھوا لیا گیا۔

اس مہم کو سر کر کے رضا خاں طہران واپس آئے تو شاہی شان و شوکت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ شہر کے تمام مکانوں اور دکانوں کو آراستہ کیا گیا تھا۔ ان کی خدمت میں قصیدے پیش کئے گئے جن میں پُرجوش شعراء نے انہیں دارا اور کیخسرو پر بھی فوقیت دی تھی۔

اس فتح و کامرانی نے رضا خاں کو اہل ایران کے دلوں کا مرکز محبت و پرستش بنا دیا تھا۔ رضا خاں کی حوصلہ مندیاں اور عملی سرگرمیاں برابر ترقی پذیر تھیں۔ وہ مرکزی حکومت کو مستحکم کر چکے تھے اور صوبوں کو مرکز سے وابستہ کرنے میں مصروف جدوجہد تھے۔ ایران کا فرمانروا احمد شاہ تھا۔ جو نہایت نا اہل اور عیش پرست تھا۔ چنانچہ جس زمانے میں رضا خاں ملک کی نجات و رستگاری میں شبانہ روز سرگرم سعی و عمل تھے۔ احمد شاہ تعیش زا فرانس میں

وقت عیش و نشاط تھا اور صحائف عالم کے لئے شاہدانِ پیرس کے ساتھ تصویریں کھنچوا رہا تھا - احمد شاہ کی اس گمراہی و ضلالت نے اہلِ ملک کے قلوب میں رضا خاں کی شاخِ محبت کو اور بھی پھلنے پھولنے کا موقع دیا -

رضا خاں کے عروج و اقبال کا آفتاب سُرعت کے ساتھ نصف النہار کی جانب صعود کر رہا تھا - چنانچہ احمد شاہ کی معزولی کے متعلق پورے سال بھر کی بحث و گفتگو اور غور و فکر کے بعد بالآخر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو ایرانی پارلیمنٹ نے بادشاہ کے عزل کا اعلان کر کے عارضی حکومت کی عنان رضا خاں کے سپرد کر دی - اور اس کے تیسرے مہینے ۱۴ دسمبر کو مجلس انتخاب نے رضا خاں کو ایران کا مستقل بادشاہ منتخب کر دیا -

ایران کی حکومت و فرمانروائی سے بہرہ ور ہونے کے بعد رضا خاں نے اپنے خاندان کی تعمیر و اہتمام کی جانب توجہ کی - ان کا بڑا بیٹا شاہانہ جمال و وجاہت سے محروم تھا - اس لئے انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے محمد رضا خاں کو ولیعہد قرار دیا - اور شہزادے کی والدہ اور اپنی دوسری بیوی کو ملکہ کے خطاب سے سرفراز کیا - شہزادہ ولیعہد کی ماں بڑی ہیں مگر بادشاہ نے دونوں کو برابر کا منصب عطا کیا ہے - رضا شاہ نے ولیعہد کی تعلیم و تربیت کا اتنا مکمل و معقول انتظام کیا ہے - کہ جو خامیاں ان کی ذات میں ہیں - ان میں سے ولیعہد میں ایک بھی رہنے نہ پائیں - شہزادے کا نصف وقت فوجی اور جسمانی ورزش کے لئے وقف کیا گیا - اور نصف مذہب و سیاست، تاریخ و سائنس اور مختلف زبانوں کی تحصیل میں جن میں فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں -

۲۵ اپریل ۱۹۲۶ء تاریخ ایران میں ایک خاص شان رکھتی ہے - اسی تاریخ کو رضا شاہ کی تقریب تاجپوشی عمل میں لائی گئی - محل گلستان میں ایران کے شاہی عجائبات سجائے گئے تھے - رضا خاں کی نشست کے لئے تخت نادری نکالا گیا تھا - جو عرصہ سے خزانۂ شاہی میں مقفل تھا - یہ وہی تیموری تخت ہے جسے نادر شاہ دہلی سے ایران لے گیا تھا - قاچاری تاج رضا شاہ کو پسند نہ تھا اس لئے امراء و اعیانِ شہر نے چندہ کر کے ایک جدید جواہر نگار طلائی تاج تیار کرایا خلعتِ شاہی بھی اپنی مالیت اور شان و تجمل کے اعتبار سے لاجواب تھا - اس میں سیاہ و سفید اور گلابی موتی چکن کی طرح قرینے سے پروئے ہوئے تھے - سلطنتوں کے نمائندوں اور ملک کے اعیان و اکابر کی موجودگی میں یہ باعظمت و جلال تقریب ادا کی گئی -

سہ پہر کو اسی تاج و خلعت میں تخت نادری پر جلوہ فرما ہو کر رضا شاہ نے شہر کا گشت کیا - تمام بازار آراستہ و پیراستہ تھے - لوگ جوشِ مسرت میں جا بجا "رضا خاں زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے -

رضا شاہ کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جسقدر اولوالعزم اور حوصلہ مند ہیں اسی قدر بیدار مغز اور مآل بین بھی ہیں، ابتدائے حال سے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ کسی منصبدار کو زیادہ دنوں تک اس کے منصب پر نہیں رہنے دیتے کہ مبادا اقتدار و استحکام حاصل کر کے کسی فتنہ کا موجب بنے - چنانچہ اپنے اس رفیق کار خدا یار خاں کو جس نے حصولِ عروج و اقبال میں ان کی غیر معمولی اعانت کی تھی اور بادشاہ ہو کر جسے انہوں نے وزارت عظمیٰ کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا تاجپوشی کے بعد ہی علیحدہ کر دیا - اور اس کی بجائے متوفی الممالک کو وزیر اعظم بنا دیا -

سادگی اور جفاکشی رضا شاہ کے خصائص میں داخل ہے - ان کے مزاج میں استکبار و رعونت نام کو نہیں ہے - ایک امریکن سیاح نے جو بذاتِ خود رضا شاہ سے ملاقی ہوا تھا - ان کے متعلق جو بیان دیا ہے - اسی کے اقتباس پر میں اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں - وہ کہتا ہے :-

> رضا شاہ کے لباس میں حیرت انگیز سادگی ہے - ان کے لباس کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ فوجی نظام کے ماتحت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں - انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی عشرت پسند مشرقی تاجدار نہیں ہیں بلکہ جفاکش اور حد سے زیادہ محنت و مشقت کرنے والے ایرانی سپہ سالار اعظم ہیں -
>
> وہ صبح چار بجے سے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں - اس وقت ان کی میز پر حکومت کے تمام شعبوں کی یوم گذشتہ کی مکمل رپورٹ موجود ہوتی ہے -
>
> سرکش قبائل کی تنبیہ کے لئے جو فوجی کارروائیاں کی جاتی ہیں - ان کی سرکردگی کے فرائض بعض اوقات رضا شاہ خود انجام دیتے ہیں -
>
> طہران کے بازاروں میں کبھی کبھی ایک طویل القامت شخص پھرتا دکھائی دیتا ہے - وہ شخص دکانوں میں بھی گھس جاتا ہے - عورتیں اسے دیکھ کر اشارہ کرتی ہیں اور سائل و گداگر اسے گھیر لیتے ہیں - یہ شخص رضا شاہ ہوتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ رضا شاہ اپنے شہری کام خود کر لیتے ہیں -
>
> رضا شاہ ایک سپاہی ہیں - اس حیثیت سے ترقی

کرے وہ شاہی کے مرتبۂ بلند تک پہنچے، فوج ہی کی اعانت ورفاقت نے ان کے مقاصد و عزائم میں انہیں کامیاب و کامران بنایا۔ اس لئے ان کی توجہات کے اہم ترین مرکز فوج ہے۔ وہ راتوں کو اُٹھ کر فوجی بیرک میں پہنچ جاتے ہیں اور اگر نظام عسکری کے خلاف کوئی چیز ظہور پذیر دیکھتے ہیں تو افسران بالا کو سخت تنبیہ و تادیب کرتے ہیں۔

دوسرے شعبوں میں کسی قسم کا اضمحلال ہو تو ہو لیکن صیغۂ فوج کا نظام اتنا زبردست اور مکمل ہے کہ معلوم ہوتا ہے سپہ سالارِ اعظم کا منصب اب بھی رضا شاہ سے وابستہ ہے۔

حسیب احمد

غزل

وہ میرے الفاظ تولتا ہے مری تمنا ٹٹولتا ہے　　تو پھر کہیں زیرِ لب تبسّم کے ساتھ پردو نمیں بولتا ہے

وہ مست آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ نرم لہجے میں بولتا ہے　　نظر کو کڑوی شراب دیتا ہے شہد کانوں میں گھولتا ہے

تموّجِ قلزمِ مصیبت سے ڈر کے ساحل پہ رکنے والو　　جو کود جاتا ہے بحرِ زخّار میں وہ موتی بھی رولتا ہے

قیاس کی دسترس سے باہر ہے صنعتِ صانعِ ازل بھی　　ہر ایک بُت میں وہ صنعتیں ہیں کہ جیسے اب منہ سے بولتا ہے

تری صدا پر مریضِ اُلفت کو سامنا ہے مصیبتوں کا　　ترے تصوّر میں فرق آجائے گا اگر آنکھ کھولتا ہے

میں جانتا ہوں کہ جس سبب سے کھٹک رہی ہے تمام دنیا　　مجھی پہ اُس کی عنایتیں ہیں مجھی سے وہ ہنس کے بولتا ہے

جب اُس سے کہتا ہوں ایسی باتیں نہیں ہیں جن کا جواب کوئی　　تو ایسے قصّے بھی چھیڑتا ہوں کہ ہو کے مجبور بولتا ہے

ہماری صورت ہماری حالت سے آشکارا ہے رنجِ فرقت　　جہاں میں رازِ غمِ محبّت کو جان کر کون کھولتا ہے

تمام دنیا کے تاجداروں سے شادؔ قسمت بلند لایا
کہ صبح کو اُٹھ کے اپنی آنکھیں کسی کے چہرہ پہ کھولتا ہے

شاد عارفی

موت

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد:۔
(۱) ساد ھو
(۲) چرواہا

پہلا سین

طلوعِ آفتاب —————— سلسلۂ کوہ

ایک پہاڑی کے دامن میں ایک سادھو اپنی کٹیا میں —— جو غیر ہموار اور کھُردرے پتھروں سے بنائی گئی ہے —— بیٹھا ہے، اس کے گلے میں ناتراشیدہ انسانی ہڈیوں کی ایک مالا ہے، اس کی بائیں طرف کونے میں چند انسانی کھوپڑیاں پڑی ہیں، سادھو کے سامنے ایک مدھم سی آگ جل رہی ہے، اس کی نگاہیں سنجیدہ ہیں، مگر لبوں پر مصنوعی تبسم رقصاں ہے، وہ کھوپڑیوں پر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔

اس کے سامنے ایک وسیع چراگاہ ہے، جس کے پرلے سرے پر ایک سڑک واقع ہے۔ چراگاہ میں کچھ مویشی چر رہے ہیں، جن کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کا "لطیف شور" فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر رہا ہے مویشیوں سے کچھ دور چرواہا ایک چٹان پر بیٹھا ہے، اس کی آنکھوں میں الھڑ جوانی کی چمک ہے، وہ اپنے آپ سے کھیل رہا ہے مُسکرا رہا ہے۔ وہ ایک رنگین انداز سے اپنی لاٹھی پرے پھینک دیتا ہے۔ اور تیزی میں اپنے پہلو سے بانسری نکالتا ہے۔ جو اس کی تہ بند میں اٹکی ہوئی ہے۔ وہ اسے لبوں سے لگا کر بجاتا ہے، مگر کوئی آواز نہیں نکلتی، وہ بے چینی سے —— جیسے اس کے دل میں نغمے اُبل رہے ہیں —— بانسری کو اِدھر اُدھر سے دیکھتا ہے اور جیسے وہ ناکارہ ہو چکی ہے، اسے زمین پر پٹک دیتا ہے، پھر آسمان کی طرف منہ کر کے گانے لگتا ہے۔

آئے گئے تھے، جائے رہے ہیں
اس میں رونا دھونا کیا؟
اس سنسار کی ریت یہی ہے
پانا کیا اور کھونا کیا؟

ابھی وہ اپنا گیت ختم ہی کرنا چاہتا ہے۔ کہ سڑک پر ایک جنازہ گزرتا ہوا نظر آتا ہے، جسے چار آدمی اپنے کندھوں پر اُٹھائے جا رہے ہیں۔ اور جن کے پیچھے بہت سے لوگ ہیں، جن میں کچھ آہ وزاری کر رہے ہیں، کچھ خاموش آنسو بہا رہے ہیں۔

سادھو انہیں دیکھ کر مُسکراتا ہے۔

سادھو:۔ (ایک ترش آواز سے جس میں نفرت اُلجھی ہوئی ہے، یہ دُنیا کے بیوقوف چلّا رہے ہیں! ایک انسان کے جُدا ہو جانے پر —— جیسے یہ خود زندگی میں پھولوں کی سیجوں پر لیٹتے ہیں! جیسے یہ سنسار ان کے لئے بہشت ہے۔ اور وہ "ایسی رنگینیوں" اور اس "بہشت" سے محروم ہو کر جا رہا ہے! جیسے یہ کوئی دائمی زندگی رکھتے ہیں! جیسے قدرت ظالم ہے اور یہ اُس پر بہت "مہربان" تھے! جیسے ان کے تاریک —— گھرانوں اور غمخانوں کی نسبت یہ وسیع زمین اُس کو پناہ میں لینے کے لئے تنگ ہے! ....

بے شعور انسان! تو خودکن لذتوں اور آسائشوں سے آگاہ ہے جن سے اُسے کبھی روشناس کرنا چاہتا تھا؟! .... دوستوں کی فریب کاریاں، ظالم اور خود غرض لوگوں کی ستم ظریفیاں، اپنے ہاتھوں سے پلے ہوئے نافرمان عزیزوں "کے نیزوں سے کلیجے میں پڑے ہوئے ناسور، تجھے کچھ ایسی لذت دے رہے ہیں جس سے اسے بھی واقف ہونا چاہیئے تھا ...... دیکھ! موت سے گھبرانے والے ناکام انسان! تو موت کی قیمت اور عظمت کا کس بُری طرح انکار کر رہا ہے؟ کن مضحکہ خیز [illegible] کیسے کیسے بہانے تراش رہا ہے؟ ... کبھی کمین گاہوں میں چھپتا ہے۔ جیسے موت تمہیں کبھی ڈھونڈ نہ [illegible]! ... کبھی موت کو ظالم اور مکروہ کہہ کر اسے دور رکھنا چاہتا ہے۔ جیسے وہ تمہارے غصّے اور [illegible] سے خوف کھا کر پھر تمہارے نزدیک ہی نہیں آسکے گی!— کبھی شور و ہاؤ ہو سے آسمان سر پہ اٹھاتا ہے، اس کے آگے گڑگڑاتا ہے — جیسے وہ تم پر رحم کھا کر تمہاری جاں بخشی کر دے گی؟ —— لیکن آہا ہا! موت کی حسین دیوی تمہاری ان سب فریب کاریوں سے بے نیاز ہے، وہ اپنا فرض ادا کئے جا رہی ہے —— چلی جا رہی ہے، فنا کے نغموں میں رقص

کرتی ہوئی..... فانی انسان کو بقائے دوام سے روشناس کراتی ہوئی.....
اس دنیا کے فخر و غرور کے جھنڈوں کو سرنگوں کرتی ہوئی..... ہاں! مسکراتی ہوئی۔ چلی جا رہی ہے ——— کبھی غریبوں کو شاہوں کے پہلو میں سلاتی ہے۔ کبھی ان بیکسوں کو ——— جن کے ایک اشارے پر بستیوں کی بستیاں برباد کر دی گئیں ——— موت! حسین دیوی!! دیکھ یہ فانی انسان تیرے پنجوں سے اپنی لمحاتی زندگی کو کس محبت، پیار اور کوشش سے بچائے ہوئے ہے؟! اس کے لئے بعض اوقات اسے کتنی اہم اور مہنگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے؟! اس کو بچانے کے لئے، اسے ہر روز کتنے آلام، مصائب اور بربادیوں سے روشناس ہونا پڑتا ہے؟! (اس کی آنکھیں سُرخ ہیں، جیسے ان میں آگ اُبل رہی ہے) اس کی آواز میں غیر معمولی تیزی اور شدت ہے) یہ نہیں سمجھتا ——— ہاں! یہ نہیں سمجھ سکتا!! موت کا سکون ——— جہاں ظالم اور پُر فریب انسانوں کے دراز ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ جہاں ان کی ناپاک زبانوں سے نکلے ہوئے تلواروں کی طرح تیز اور مکروہ الفاظ اس زمین کی چھاتی کو چیر کر نہیں پہنچ سکتے..... جہاں حرص و ہوا سے ایمانوں کا سودا نہیں ہوتا ——— جہاں انسان کی ضمیر چند فرسودہ چاندی اور تانبے کے ٹکڑوں کے بدلے نہیں بکتی ——— ہاں موت کا سکون، انسان نہیں سمجھ سکتا! ——— اس کی عقل اتنی عظیم سچائی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی! ۔ یہ اس "سکون" میں جانے سے گھبراتا ہے ——— جیسے ایک بچہ تاریک کوٹھری میں جانے سے چلاتا ہے ———

آہاہا! بھلا! موت بھی کوئی تاریک کوٹھڑی ہے....؟

(چند لمحات کی خاموشی کے بعد)

یہ موت، موت نہیں ——— یہ آہ و زاری نہیں!

دوسرا سین

سورج اب کچھ بلندی پر آ چکا ہے، نوجوان چرواہا خاموش بیٹھا ہے، اس پر ایک درخت کا سایہ پڑ رہا ہے۔ دور سے شہنائیوں، نقاروں اور ڈھولوں کا شور سنائی دیتا ہے ——— جیسے کوئی برات آ رہی ہے۔ ——— چرواہا اپنی بانسری اٹھاتا ہے، اور اس میں پھونک مارتا ہے۔ وہ بجنے لگتی ہے۔ چرواہا حیران ہو کر مسکراتا ہے، ——— جیسے اس کی بانسری پر جادو کا اثر ہو گیا تھا؟ ——— اتنے میں وہ برات سڑک پر سے گزرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ برات کے آگے آگے چند نوجوان اپنے ہاتھوں میں جھانجھیں لئے ناچتے جا رہے ہیں

آئے گئے تھے۔ جائے رہے ہیں
عیش و خوشی میں گاتے ہیں
اس سنسار کی ریت یہی ہے
آتے ہیں اور جاتے ہیں!

سادھو مغموم اور سنجیدہ نگاہوں سے، فانی انسان کی اس وقتی خوشی کا جائزہ لیتا ہے۔

سادھو: ۔ (مدھم آواز میں، جیسے وہ کسی متبرک فرشتے سے ہمکلام ہے) ہماری زندگی، محض تخیلات کے سایوں میں رقص کر رہی ہے..... دیکھو! فانی انسان کس قدر مست ہے ——— جیسے وہ اس عشرت کی دیوی کو تمام عمر اپنے گلے لپٹائے رہے گا؟ ——— یہ خوشی جب ان کی رگوں میں منجمد ہو جائے گی۔ جب ان کی تمام ناکام آرزوئیں اور امیدیں، ان کی نگاہوں میں جمع ہو کر اس دنیا کا آخری نظارا کریں گی ——— اور جب ان کی لاشیں زمین پر رینگتے ہوئے خوفناک کیڑوں کا شکار ہوں گی، اور ان کی ہڈیاں (وہ اپنی نزدیک پڑی ہوئی کھوپڑیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) خوشی، خوف اور خطرات سے بے نیاز ہو کر ٹھوکریں کھاتی پھریں گی ——— تو ——— (وہ یکدم کانپ جاتا ہے، اس کے جسم میں کپکپی شروع ہو جاتی ہے، مگر وہ تیز کانپتی ہوئی آواز میں تقریر جاری رکھتا ہے) دیکھو! (وہ اپنے سامنے پڑی ہوئی راکھ کی طرف اشارہ کرتا ہے) یہ ان تمام نسلوں کا پسماندہ غبار ہے ——— جنہوں نے دنیا میں اپنی حکومت فرعونیت اور انانیت کے نشہ میں لاکھوں بے گناہوں کو خاک اور خون میں تڑپایا، لاکھوں دلوں کو اپنے ظلم اور فریب کے زلزلوں سے چور کر دیا ——— ہاں! ان پراگندہ نشانات میں دنیا کی حسین ترین صورتیں پوشیدہ ہیں! ——— دیکھو! دنیا میں دنیا کا مدفن بن رہا ہے۔ مگر پھر بھی وہی تگ و دو، وہی ہنگامے وہی بزم آرائیاں ہیں؟! ——— آہ! تاج و تخت دولت و عظمت، یہ سب بے وقوف لوگوں کے کھلونے ہیں ——— یہ زمزمے، ہنگامے، ہاؤ ہو سب بیکار لوگوں کے وقتی مشغلے ہیں۔

(چند لمحات کی خاموشی کے بعد)

یہ زندگی، زندگی نہیں ——— یہ خوشی، خوشی نہیں۔

تیسرا سین

سورج اب غروب ہونے کے قریب ہے، سڑک پر ایک مرد اور ایک عورت پہلو بہ پہلو، آہ و زاری کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں ان کے قدموں میں لغزشیں ہیں۔ ان کے کپڑے بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ کبھی اپنے بالوں کو نوچتے ہیں، کبھی اپنا منہ پیٹتے ہیں، کبھی چلتے چلتے یکدم ٹھہر جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کو حیرت سے تکتے ہیں ——— جیسے وہ بالکل اجنبی ہیں۔ اور پھر آنسوؤں کے دریا بہاتے ہوئے اپنی نامعلوم

منزل کی طرف چل دیتے ہیں۔

سادھو:۔ (سرد آہ بھر کر) آہ! سب سے زیادہ قابلِ رحم..... یہ بدقسمت دو روحیں..... جو دنیا میں اپنی زندگی کا سہارا کھو چکی ہیں.... چرواہا اپنے مویشیوں کو ہانکنے کے لئے جا رہا ہے، وہ اپنی بانسری توڑ چکا ہے۔ اور وہی گیت الاپ رہا ہے۔

آئے گئے تھے، جائے رہے ہیں
آنا کیا اور جانا کیا؟
اس سنسار کی ریت یہی ہے
کھونا کیا اور پانا کیا؟

امین حزین بہاولپور

غزل

دل میں وہ کیا سما گئے گویا … میری ہستی پہ چھا گئے گویا
سارے عالم کو کیا تباہ کیا … ایک دُنیا بسا گئے گویا
یہ تصوّر کی شانِ جلوہ گری؟ … سامنے آپ آ گئے گویا
کچھ اس انداز سے نظر پھیری … بات دل کی سُنا گئے گویا
تم نے یوں دل میں یاد چھوڑی ہے … نقش کوئی جما گئے گویا
اس ادائے حجاب سے دیکھا … ایک بجلی گرا گئے گویا
خوگرِ جورِ ناز کر کے مجھے … اور ہمت بڑھا گئے گویا
جاتے جاتے رہی نگاہِ غضب … چلتے چلتے ہنسا گئے گویا
کر کے ممنونِ یک نگاہ مجھے … عمر بھر کو رُلا گئے گویا
اُف، وہ اُن کا تصوّرِ کامل … میں یہ سمجھا، کہ آ گئے گویا

کوئی فتنہ نہیں رہا حرماںؔ
وہ قیامت اُٹھا گئے گویا

حرماںؔ خیرآبادی

شاعر اور رُوح الامیں

شاعر

مجھ کو بتلا کہ یہ ہستی کا تماشا کیا ہے — قیس کے دل میں تپاں خواہشِ لیلیٰ کیا ہے
کس لئے شمع پہ ہوتا ہے پتنگا قرباں — آہ اس ننھے سے کیڑے کی تمنّا کیا ہے
پھول کے کان میں گاتی ہے یہ کیا بادِ نسیم — چارۂ دردِ دلِ بُلبلِ شیدا کیا ہے
داغ کیا سینہ میں رکھتی ہے کلی لالے کی — اور یہ نرگس کی کنکھیوں میں اشارہ کیا ہے
موج آ آ کے لپٹ جاتی ہے کیوں ساحل سے — یہ سمندر کے کلیجے میں تڑپتا کیا ہے
سینۂ سنگ میں کیوں دب کے شرر رہتا ہے — اور مرے دل میں تاثر کی یہ دُنیا کیا ہے

تیرے دروازے پہ آیا ہوں سوالی بن کر
ہوں میں اک ذرّۂ ناچیز مجھے خرمن کر

رُوح الامیں

تشنہ لب ساحلِ دریا پہ جو تُو آتا ہے — جوہرِ آئینۂ آب تڑپ جاتا ہے
حیرت انگیز ہے عالم تری بیتابی کا — جب کسی شیشے میں تو سامانِ تپش پاتا ہے
کتنا آشفتہ ہے تو بادیہ پیمائی کا — ذرّے ذرّے سے پڑا ٹھوکریں تو کھاتا ہے
کر گئی حد سے تجاوز تری چیرہ دستی — دامنِ بادِ صبا چاک ہوا جاتا ہے
ہے تری موت یہ اے طفلکِ آغوشِ مجاز — کتنا ناداں ہے حقیقت سے جو ٹکراتا ہے
تیری توفیق سے بڑھ کر ہے مئے راز کا جام — شعلۂ شوق بھی اس آگ میں پھک جاتا ہے
خیر تو دُور سے آیا ہے تو مایوس نہ ہو — تیری سیماب وشی پر مجھے رحم آتا ہے

تیری خاطر سے بہنتا ہے مجازی حلّہ — سن! اکہ بولی ہیں تری کوئی ملک گاتا ہے

ایک نشّہ ہے کہ ہر جام کو چھلکاتا ہے — ایک نغمہ ہے کہ ہر ساز کو تھرکاتا ہے
ایک سینا ہے کہ ہر ذرّے کو چمکاتا ہے — ایک قطرہ ہے کہ ہر موج ہیں لہراتا ہے
ایک پارہ ہے کہ ہر برق کو تڑپاتا ہے — ایک جوہر ہے کہ ہر ذات کو پگھلاتا ہے

اب یہاں اور ٹھہرنا ترا منظور نہیں
عرشِ اعظم ہے۔ کوئی انجمنِ طور نہیں

روشن دین (کیل)

غزل

ابر اُٹھا ہے مے خوارو! کیفیتیں برسانے — موجِ مئے کوثر میں غرقاب ہیں مے خانے
موتی سا چمکتا ہے کیسا یہ سرِ مژگاں — ہیں پیشِ نظر شاید بھولے ہوئے افسانے
ان خانہ خرابوں کی ناچیز محبّت کیا — کیوں سعئ محبّت میں بے تاب ہیں دیوانے!
منزل کی طرف اپنے اب پاؤں نہیں بڑھتے — بیکار کیا ہم کو رہبر کی تمنّا نے
جس جوشِ جنوں زا کا آغاز ہو بے تابی — اس جوشِ جنوں زا کا انجام خدا جانے
اے شمعِ محبّت! کچھ ارزانی جلوہ کر — سونا ہے درِ کعبہ۔ ویران ہیں بتخانے
جذبات کی دنیا میں ہیجان کیا پیدا — ہر نغمۂ رنگیں نے۔ ہر شاہدِ زیبا نے
ہر نقش تھا خود ورنہ نقّاش کا آئینہ
سو پردے کئے حائل اک دیدۂ بینا نے

ہربنس لال نسیم

اقتصادیات

کیا بیکاری کا کوئی حل ہے؟

اس بات پر تو رعایا اور حکومت متفق ہیں کہ ملک میں بے روزگاری خطرناک طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اُس کا کوئی مداوا بھی ہے؟

ملک کے سیاسی جرائد میں آئے دن جو بیکاری کے گوناگوں علاج تجویز کئے ہوتے ہیں اُن میں سے میرا تجربہ ہے کہ ننانوے فیصدی "بازاری حکیموں" کی طرف سے ہوتے ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم اُن تمام تجاویز کو پرکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو حل کنندگانِ بیکاری کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں۔

آپ اخبارات اٹھائیے یا ہندوستانی مسائل پر معاشیات کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو بیروزگاری کے حل کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز نظر آئیں گی:-

(۱) طریقۂ تعلیم بدل دیا جائے۔
(۲) ٹیکس ہلکے کئے جائیں۔
(۳) نوجوانوں کو زراعت کی طرف راغب کیا جائے۔
(۴) ملک میں صنعت و حرفت کے کارخانے جاری کئے جائیں۔
(۵) نوجوان سرکاری ملازمت نہ کریں بلکہ تجارت کریں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا متذکرہ بالا... تجاویز قابلِ عمل و قابلِ پذیرائی ہیں۔

کیا طریقۂ تعلیم ناقص ہے؟

بعض مفکرین ہمارے موجودہ طرزِ تعلیم کو قابلِ مذمت خیال کرتے ہیں اور اُن کی دلیل اس بارہ میں یہ ہے۔ کہ موجودہ طرزِ تعلیم سے نوجوان روٹی نہیں کما سکتے۔

لیکن میرا سوال یہ ہے کہ کیا تعلیم کا مقصد محض روٹی کمانا ہونا چاہیئے؟ اگر یہ بات ہو تو کیا علم تواریخ۔ سیاسیات۔ علم المعشیت۔ سائنس فلسفہ۔ نفسیات اور دیگر اسی قسم کے علوم بالکل بے سود ہیں اور اُن کی طباعت و اشاعت بالکل بند کر دینی چاہیئے؟

دراصل ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم اتنا خراب نہیں ہے۔ جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد صرف وسعتِ نظر اور دماغ کی ترقی ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اُس کی قیمت روپیہ پیسہ کی شکل میں معلوم کی جائے۔ مثلاً سائنس اور آرٹ پڑھانے کی بجائے اگر ہم صرف روپیہ پیسہ کے حصول کے ڈھنگ بتانا شروع کر دیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دُنیا میں علم و ادب کی ترقی کیسے ہو گی؟ اگر ہم بقول کسے "شکسپیر کے ڈرامے پڑھ کر تیس روپے کی محرّری حاصل نہیں کر سکتے تو اس میں ڈراموں کا کیا قصور ہے؟ اُن کا فائدہ تو صرف یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں وسعتِ نظر پیدا کریں۔ نہ کہ روپیہ پیسہ کے ڈھنگ بتائیں۔ ہم نے مانا کہ کھانے کمانے کی ذمّہ داری نوجوانوں پر ہے لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ ڈرلسنے کی یا پوئٹری کی کتابیں نہ پڑھیں۔ جو خصوصیات اُن کو نوکری کے حصول کے لئے درکار ہیں وہ علوم و فنون کی تحصیل کے دوش بدوش بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔

پھر یہ تو سوسائٹی کا قصور ہے کہ وہ آرٹس گریجویٹ کو کہیں کھپا نہیں سکتی۔ ورنہ پڑھائی کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

پس یہ خیال غلط ہے کہ ہمارے طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص ہے۔ تمام علوم جو آجکل یونیورسٹیوں میں مروّج ہیں اپنی اپنی جگہ پر نہایت مفید اور کار آمد ہیں۔ لیکن اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ ایک خشک ماہر علم المعیشت کی طرح روپیہ پیسہ میں لگانا سخت نادانی ہے۔

فنّی تعلیم کا کیا فائدہ؟

پھر کہا جاتا ہے کہ آرٹس کی بجائے نوجوان کو فنّی اور صنعتی تعلیم دلوانی چاہیئے! میری سمجھ میں یہ دلیل کبھی نہیں آئی۔ فرض کیجئے کہ ہم سب نوجوان صنعت و حرفت کی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر اُس کے بعد کیا ہو گا؟ کیا ہم سب کارخانے اور فیکٹریاں کھول لیں گے؟ جو یہ خیال کرتے ہیں میری فالست میں اُن سے زیادہ سادہ لوح اِس دُنیا میں کوئی نہ ہو گا۔

افسوس ہے قلتِ گنجائش کے باعث میں اس مسئلہ پر بحث نہیں کرسکتا۔ کہ آیا فنّی تعلیم پہلے ہونی چاہیئے یا کارخانے؟ لیکن حق یہی ہے کہ جب تک ملک میں کارخانے نہ ہوں فنّی تعلیم دلوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ جب تک کارخانے جاری کرنے میں بعض خارجی مشکلات ہیں۔ اُس وقت تک ماہرین کی موجودگی کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ پہلے "سیاسی مصالح" اور "حکومتی مشکلات" دُور کرو پھر فیکٹریاں جاری ہوں گی۔ جس کے لئے ہم طلبہ کو فنّی تعلیم دلوائیں گے۔

فرض کیجئے ہم میں سے کوئی جہازرانی اور جہاز سازی کا علم بیرونی ممالک سے سیکھ کر آیا ہے کیا وہ . . . . . یہاں آتے ہی جہاز سازی کا کارخانہ کھول سکے گا؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ گورنمنٹ کی طرف سے ایسا کارخانہ جاری کرنے کی اجازت نہیں۔

اسی طرح آپ پارچہ بافی کے ماہر بن جائیں۔ کیا ہندوستان میں پارچہ بافی کے لئے میدانِ ترقی ہے؟ اہلِ علم جانتے ہیں کہ بوجہ لنکاشائر کے مال پر ترجیحی محصول اور دیگر قدرتی مشکلات کے اِس صنعت کے لئے ہمارے ملک میں غیر محدود میدان نہیں ہے۔

اسی طرح دیگر صنعتوں کا حال ہے۔ پس جب تک "سیاسی مصلحتوں" کا علاج نہیں ہوتا۔ فنّی تعلیم دلوانے کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہے۔

باقی رہی پیشہ وری کی تعلیم مثلاً نجاری۔ لوہاری وغیرہ سو ہر کوئی جانتا ہے کہ مشینوں اور کلوں کے اعلیٰ مال کے سامنے دستکاری کی کوئی حیثیت نہیں اور نہ ایسی مصنوعات کے لئے بازار میں کوئی مطالبہ ہے۔

پس یہ کہنا کہ نوجوانوں کو فنّی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے بالکل عبث ہے۔ کوئی دس بیس اگر ہزار میں سے یہ فن سیکھ لیں تو ہرج نہیں۔ لیکن ایک . . . Mass Movement. (تحریک عامہ) اس کے لئے قائم کردینی قرینِ دانشمندی نہیں۔

ٹیکس ہلکے کرنا بیکاری کا علاج نہیں

دوسرا حل بیکاری کا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ٹیکس ہلکے کئے جائیں تاکہ لوگوں پر سے اقتصادی بوجھ اُتر سکے۔ میں نے اکثر یہ تجویز مطالعہ کی ہے اور ایک دفعہ اسمبلی میں بھی پیش ہوئی تھی۔ لیکن مجھے اس کو سُن کر ہمیشہ ہنسی آتی ہے۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹیکس ہلکے کرنے سے بیکاری کیسے دُور ہوگی؟ یہ تو امیروں اور خوشحال زمینداروں کے مزید تعیش کے لئے ایک تجویز ہے نہ کہ بیکاری کو دور کرنے کے لئے کوئی امداد۔

کہا جاتا ہے کہ یہ رقم بیکاروں پر خرچ ہوگی؟ لیکن کیسے؟ اگر آپ اس کو بطور امدادی وظیفہ سب پر بانٹنا شروع کردیں گے تو اس سے بیکاری اور زیادہ بڑھے گی۔ کیونکہ ہر کوئی وظیفہ لینے کی خاطر بیکار کہلانا پسند کرے گا۔

اگر آپ یہ رقم کسی صنعتی ادارہ پر صرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کے لئے میری گذارش یہ ہے۔ کہ یہ رقم مکتفی نہ ہوگی۔ کیونکہ اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے اوّل تو کمی کی گنجائش ہی نہیں اور اگر بفرضِ محال کمی واقع کر بھی دی جائے تو مجموعی رقم نہایت قلیل ہوگی۔ دوسرے جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا ملک میں صنعتی ادارے قائم کرنا قرینِ مصلحت ہی نہیں۔

نوجوان اور زراعت

اکثر تجویز پیش کی جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زرعی زمینیں دیدی جائیں تاکہ وہ زراعت کی طرف مائل ہوں۔ لیکن کوئی صحیح الدماغ آدمی اس تجویز سے متفق نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہماری آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصّہ پہلے ہی کاشتکاری میں لگا ہوا ہے اور زمین پر آبادی کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ پس ایسی حالت میں بجائے آدمیوں کو زراعت کی طرف مائل کرنے کے ہمیں پہلے آدمیوں کی بھی حوصلہ فرسائی کرنی چاہیئے۔

اس کے علاوہ اگر ہم اس تجویز پر عمل کریں تو اُن لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ جو پہلے ہی اس پیشہ میں لگے ہوئے ہیں۔ کیونکہ بہرحال اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے نئے تعلیمیافتہ لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ دوسرے الفاظ میں اگر ایک جماعت بارروزگار ہوتی ہے تو دوسری بے روزگار ہوجائے گی۔ اگر زراعت کو ہی بہتر بنانا مقصود ہو تو نئے طریقہ ہائے کاشتکاری پرانے لوگوں کو ہی سکھائے جاسکتے ہیں۔

کارخانوں کا اجراء

کہا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کو ملک میں کارخانے اور فیکٹریاں جاری کرنا چاہئیں لیکن ایسا کہنے والے لوگ یہ بھُول جاتے ہیں کہ دُنیا میں پہلے ہی کثرتِ پیداوار کی وجہ سے کساد بازاری پھیلی ہوئی ہے۔ اور درحقیقت موجودہ بے کاری کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ دنیا میں کارخانے ضرورت سے زیادہ بن گئے ہیں۔

پس اگر ہندوستان مزید کارخانے جاری کرے تو اُس کے سوائے اس کے کوئی معنی نہ ہوں گے کہ وہ بے کاری میں اور زیادہ اضافہ کرے۔

سرکاری ملازمت یا تجارت؟

اکثر سننے میں آیا ہے کہ آجکل کے تعلیم یافتہ نوجوان تجارت کی بجائے

سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے زیادہ "بیقرار" نظر آتے ہیں۔ اور یہ طریقۂ تعلیم کا قصور ہے ——!

میری گزارش اس بارہ میں یہ ہے کہ ہم گورنمنٹ سروس اس لئے نہیں کرتے کہ طریقۂ تعلیم کی طرف سے کوئی مجبوری ہوتی ہے بلکہ اس کی دو وجوہات ہیں

(۱) سرکاری ملازمت میں محافظت اور استقرار زیادہ ہے۔ پرائیویٹ سروس میں جب کبھی مالکان کی مرضی ہوتی ہے کسی کارکن کو جواب دیا جاسکتا ہے۔ لیکن گورنمنٹ سروس میں ایسا کرنا سخت محال ہے۔ پھر گورنمنٹ سروس میں گریڈ اور سالانہ ترقی کی بھی باقاعدگی ہے۔ لیکن تجارتی اداروں میں ایسا نہیں ہے۔

(۲) سرکاری نوکری سہل ہے۔ اوقاتِ کار کم ہیں۔ اور زیادہ دیر تک محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ گورنمنٹ سروس میں سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کے ساتھ کوئی بندھا نہیں ہوتا۔ آپ وقت پر آئیں اور وقت پر چلے جائیں۔ لیکن پرائیویٹ سروس میں اس وقت تک بیٹھنا پڑتا ہے جب تک کہ سپرنٹنڈنٹ بیٹھا رہے۔

اسی طرح تجارت میں دکاندار کا کام کوئی سہل نہیں ہوتا۔ صبح سے رات کے بارہ بجے تک برابر دکان میں بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ اور امید صرف یہی ہوتی ہے کہ اب گاہک آیا۔ اب گاہک آیا۔ اور بعض دکاندار تو ہر راہ گیر پر "اشتباہ" کرتے ہیں کہ شاید یہ شخص ہمارے ہاں سے سودا خریدے گا۔ یہ عدم تیقن اور آمد کا معین نہ ہونا ہی نوجوانوں کو تجارت سے بدظن کر دیتا ہے۔

میں مانتا ہوں۔ کہ بعض اچھی دکانیں اور فرمیں نہایت اعلیٰ چل رہی ہیں۔ اور اُن پر گورنمنٹ کے وزراء کو بھی رشک کرنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا عام نوجوان آدمی جس کے پاس اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے بھی پیسہ نہیں۔ اتنی بڑی دکان کے لئے سرمایہ بہم پہنچا سکتا ہے؟ اور پھر تجارت کے لئے کاروباری ذہنیت کا ہونا بھی اُتنا ہی لازمی ہے جتنا کہ سرمایہ ضروری ہے۔ اور وہ ہر شخص کے پاس نہیں ہوتی۔ جن لوگوں کے اندر وہ ذہنیت پیدا ہوجاتی ہے وہ خود بخود تجارت شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کو تبلیغ کی ضرورت نہیں۔ لیکن عام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ تجارت شروع کر دیں۔ بغیر اس کے کہ اُن کو یہ بھی بتایا جائے کہ وہ سرمایہ کہاں سے حاصل کریں یا تجارتی ذہنیت کہاں سے لائیں۔ میرے خیال میں (مجھے ایسا کہنے والے معاف کریں) سخت نادانی ہے۔

ادنیٰ تجارت کرنا بے سود ہے

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ پہلے چھوٹا کام شروع کرنا چاہیئے۔ اور آہستہ آہستہ ترقی حاصل ہوگی۔ لیکن اگر ایسے لوگوں نے موجودہ تجارت کے راز کو مطالعہ کیا ہوتا۔ تو وہ جانتے کہ آجکل چھوٹی تجارت کے لئے کوئی میدانِ ترقی نہیں ہے۔ فرض کیجئے کوئی نوجوان اپنے گھر پر کھڈی لگوا لیتا ہے۔ یا لوٹ بنانے کا کام شروع کر دیتا ہے کیا وہ مشینوں کے مال سے مقابلہ کر سکے گا؟

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کسی بڑی فرم کی چیزیں لے کر اُن کی کنویسنگ کریں۔ لیکن اس شعبہ میں بھی ترقی کی زیادہ گنجائش نہیں۔ کیونکہ اوّل تو اس طریقہ کار سے صنّاعین کو فروخت کنندہ سے زیادہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ دوسرے یہ کام بذاتِ خود نہایت کم درجہ کا ہے۔ آپ سارا دن دربدر دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور جب جاکر کوئی گاہک ایسا میسّر آتا ہے جو کم از کم آپ کی باتیں سننے کے لئے تیار ہو۔ ورنہ اکثر لوگ ایجنٹ کی شکل دیکھتے ہی اسے کہہ دیتے ہیں "بابا معاف کرو۔" پھر چھوٹے پیمانے پر تجارت کرنے والے زیادہ ترقی نہیں کرسکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ ایجنٹ یا کنویسر سے ایک معمولی جھاڑی فروش یا دکاندار بن جائیں۔ یہ کبھی بھی ممکن نہیں کہ وہ ٹاٹا یا برلا کا مقابلہ شروع کردیں

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ جو ہم کتابوں یا اخباروں میں آئے دن پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں آدمی چھوٹے درجہ سے ترقی کرتے کرتے فلاں بامِ رفعت تک پہنچ گیا۔ یہ بھی گذشتہ صدی کی باتیں ہیں۔ ورنہ جنگ کے بعد ایسی "ترقیاں" مسدود ہوچکی ہیں۔ اب تو وہی لوگ ترقی کرتے ہیں جن کے پاس پیسہ ہے۔ جن کے پاس سرمایہ ہے۔ اور یا جو امیروں اور مالداروں کے لڑکے ہیں۔

گورنمنٹ بدلنا بعید از قیاس ہے

بعض انتہاپسندوں کا خیال ہے کہ اگر ہم موجودہ نظامِ حکومت کو بدل دیں تو بے روزگاری بہت حد تک دُور ہوسکتی ہے۔ مثلاً اس وقت کئی ملازمتیں غیر ملکی لوگوں نے سنبھالی ہوئی ہیں۔ جو ہندوستانیوں کو دی جاسکتی ہیں۔ پھر جرمنی روس۔ ترکیہ و اطالیہ کی مثالیں بیان کی جاتی ہیں کہ جب ان لوگوں نے خارجیوں کو باہر نکال دیا۔ تو ملکی شعبہ جات ترقی پذیر ہوئے۔ اور نوجوانوں کو نوکریاں میسّر ہوئیں۔

یہ طریقہ خواہ کسقدر ہی کارگر کیوں نہ ہو لیکن بہرحال بعید از قیاس ہے۔ ہم یہ طریقہ تجویز کرکے ملک کے سامنے کوئی ٹھوس اور سریع الاثر لائحہ عمل پیش نہیں کرتے بلکہ صرف ایک جنّت دکھاتے ہیں جو فی الحال ناقابلِ حصول ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ملازمتوں کا حصول روز بروز مشکل

ہوتا گیا - تو نوجوانوں کے اندر اس قسم کے جراثیم پیدا ہو جائیں گے ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ لیکن ہمیں اس کی ترغیب دینے کی بھی حاجت نہیں - کیونکہ یہ جذبہ از خود پیدا ہوتا ہے ۔

بہرحال موجودہ زمانہ میں اس کو بطورِ علاج پیش کرنا حماقت ہے ۔ کیونکہ جب تک یہ معرضِ وجود میں آئے گا کئی لوگ بے روزگاری کی وجہ سے خودکشیاں کر چکے ہوں گے ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سامنے کوئی قابلِ عمل اور سریع الاثر لائحہ عمل رکھا جائے ۔

اصولِ بقائے قابل ترین

اوپر کے بیان سے ناظرین پر واضح ہو چکا ہوگا کہ میں نے قریباً اُن تمام تجاویز کو رد کر دیا ہے جو بیکاری کے دفعیہ کے لئے مختلف اطراف سے پیش کی جاتی ہیں - تو اب قدرتی طور پر ہر شخص کے دل میں خیال پیدا ہوگا۔ کہ آخر بیکاری کا اصلی علاج کیا ہے ؟

میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے لیکن مجھے اس کا حل تجویز کرنے کے لئے اپنے عجز کا اعتراف ہے - یہ الگ بات ہے کہ گورنمنٹ سر سپرو رپورٹ پر عملدرآمد کر رہی ہے لیکن باوجود اس کے کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا - کہ بے کاری کو بالکل دور کرنا کسی کے بس میں ہے ۔

میرے ذہن میں تو صرف ایک بات آتی ہے جس کا اظہار میں یہاں کر دیتا ہوں ۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس دنیا میں بقائے قابل ترین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ کا اصول نہایت شدّت سے کارفرما ہے - یعنی وہی لوگ کامیاب بن سکیں گے جو سب سے زیادہ قابل ہیں - اگر کوئی شخص حوادثِ دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتا - تو اس کے لئے کسی گوشہ دل میں ہمدردی کا جذبہ رکھنا جائز نہ ہوگا ۔

اب حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ بیکاری کن لوگوں میں زیادہ ہے - ذرا سے غور کے بعد آپ پر واضح ہو جائے گا کہ صرف وہی لوگ بیکار ہیں جو اپنی نالائقی کی وجہ سے کسی شعبہ میں کامیاب نہیں ہو سکے - نہ پبلک سروس کے کسی امتحان میں - نہ تجارت میں - نہ کسی پرائیویٹ ادارہ میں ۔

کیا ان شعبہ جات میں اُن لوگوں کے لئے جگہ ہے جو بیکار پھر رہے ہیں ؟ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں - کہ قطعاً نہیں - تو پھر وہ کیا کریں ؟ اپنے آپ کو قابل بنائیں - تاکہ وہ کسی نہ کسی جگہ سر چھپا سکیں - گورنمنٹ کو بیکاری کی سرپرستی کر کے لوگوں کو ناقابل نہیں بنانا چاہیئے ۔

عبدالرحیم شبلی

غزل

حدیثِ لالہ و گُل از شرار می جوئیم — شکستِ رنگِ طلسمِ بہار می جوئیم

سرابِ منزلِ گمگشتہ آرزو دارم — فسونِ طالعِ ناسازگار می جوئیم

زشعلہ ہا کہ فسردہ است نالہا گسست — زنغمہ ہا کہ شکستہ قرار می جوئیم

دگر فروغ دہم داغِ ناتمامی را — دگر فریبِ شبِ انتظار می جوئیم

گہے ز آہِ شکستہ ، گہے زشورِ فغاں
گہے نہاں و گہے آشکار می جوئیم

حمید عرفانی ایم - اے

بے چین روحیں

آج پنڈت چتربھج اتنے بشاش ہیں۔ جیسے انہیں گدی مل گئی ہے۔ رہ رہ کر اُن کے منہ سے قہقہے نکل رہے ہیں۔

اُن کے سامنے کرسی پر اُن کا بیٹا شام لال بیٹھا ہے۔ اور شام لال کی برابر والی کرسی پر پنڈت جی کی بیوی چندرمنی!

شام لال نے حیرت سے پوچھا: "آج پتاجی اتنے خوش کیوں ہیں؟"

پنڈت چتربھج نے پیچوان کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ —— نا سلاماں"

شام لال نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ وہ غریب گاؤں کا نائی ——"

چتربھج کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ اُس نے کہا۔ "ہاں بے چارا۔ محض غریب۔"

چندرمنی نے پوچھا۔ "تو اُسے کیا ہوگیا۔ مرگیا۔ کیا؟"

چتربھج نے کہا۔ "واہ تم ہی دعائیں مانگا کرو۔ اُدھر وہ مرگیا۔ اور اِدھر ہمارے پیسے مارے گئے۔ تب کاروبار خوب ہی چمک اٹھیگا۔"

چندرمنی نے کہا۔ "آخر بات بھی کوئی ہو۔ تو سمجھ لیں۔"

چتربھج نے پیچوان رکھ دیا۔ اور پھر فاتحانہ انداز میں بولے۔ "آج اُس کی قرقی ہوگئی۔ اڑھائی سو روپے میں اس کا سب کچھ چلا گیا۔ جھونپڑی۔ برتن۔ بستر۔ کپڑے لتے۔ غرضیکہ سب کچھ ——"

شام لال نے پوچھا۔ "آخر اس کی وجہ؟ اتنی سختی!"

چتربھج بولے۔ "بدبخت نے تین سال سے لٹکائے رکھا تھا۔ روز "آج کل آج کل" کی رٹ لگا رہا تھا۔ ایک ہی نالش داغ دینے سے سارا روپیہ ٹھکانے لگ گیا۔"

شام لال نے پوچھا۔ "کتنے روپے اُس کے ذمے تھے؟"

چتربھج نے کہا۔ "ایک سو بیس اصل۔ اور ایک سو تیس سود کے۔"

شام لال نے کہا۔ "پھر تو غریب مارا گیا۔"

چتربھج سے رہا نہ گیا۔ اُس نے غصہ میں کہا۔ "نالائق کہیں کا۔ تمہارے بس کی بات ہوتی تو تم بزرگوں کی ہڈیوں پر ہاتھ صاف کر بیٹھے ہوتے۔"

شام لال چپ ہورہا۔ تو چندرمنی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اسے کیا معلوم پیٹ کاٹ کر روپیہ جوڑ کر دوسرے کو دیدینا کتنا مشکل ہے۔ آخر بچہ ہی تو ہے۔"

شام لال کی خواب گاہ میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ دو کرسیاں۔ ایک میز۔ چند کتابیں۔ اور ایک چارپائی۔

اُس کی شادی بھی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ پنڈت جی کا خیال تھا۔ بی اے کی تعلیم ختم کرنے کے بعد شام لال کی شادی کرنی چاہیئے نہیں تو لڑکے کے خراب ہو جانے کا احتمال ہے۔ اور بی۔ اے پاس کرنے میں ابھی ایک سال کی فرصت تھی۔

روٹی کھانے کے بعد شام لال چارپائی پر لیٹ نہیں سکا۔ میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ "سلاماں اب کہاں رہے گا۔ اُس کے ننھے ننھے بچے۔ اُس کی بالغ بیٹی۔ وہ سب کہاں مارے مارے پھریں گے۔ کون انہیں سر چھپانے کو جگہ دے گا۔ آہ کتنی ظالم ہے یہ دُنیا۔ اور اس سے بھی زیادہ کسقدر ظالم ہیں ہم لوگ! جو غریبوں کا خون گنّے کے رس کی طرح چوستے ہیں اور پھر خوشیاں مناتے ہیں۔" کچھ اس قسم کی باتیں اُس نے سوچ لیں۔ اور پتہ نہیں کب اُسی کرسی پر اُس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جھروکے سے سورج کی کرنوں نے داخل ہوکر اُسے جگا دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ آنکھوں میں اپنی تمام چیزوں سے۔ سارے گھر سے۔ جیسے اُسے نفرت سی ہوگئی۔

نیچے صحن میں پنڈت چتربھج نریل لئے بیٹھے تھے۔ نوکر کام میں مصروف تھے۔ چندرمنی چلی گئی تھی۔

شام لال مکان سے باہر نکل گیا۔ اپنی گلی کو پھاندتا ہوا وہ سڑک پر پہنچا۔ دیکھا سامنے سے ماں چلی آرہی ہے۔

چندرمنی نے اُسے اس طرح سے دیکھ لیا۔ تو ششدر رہ گئی۔ شام لال روزانہ صبح بہت دیر سے اُٹھنے کا عادی تھا۔ آج وہ دن چڑھتے ہی کہاں جا رہا ہے۔

"شام ۔ کہاں جا رہے ہو؟" چندرمنی نے حیرت سے پوچھا۔

شام لال نے کہا "رات کو بڑی تکلیف ہوگئی ۔ ڈراؤنے خواب دیکھے ماں ۔"

چندرمنی توہم پرست بہت تھی ۔ اُس نے قدم روک لئے ۔ اور پوچھا۔

"خواب ۔ کوئی یاد بھی ہے ـــــ؟"

شام لال نے کہا "کچھ بھی نہیں ماں ۔ صرف اتنا ہی ۔ کہ سدا ماں ـــ وہی نائی ۔ اُسترا لے کر میرے پیچھے دوڑ رہا تھا ۔ اور کہہ رہا تھا ۔ تمہارے باپ نے میرے بچوں کا خون چوس لیا ۔ میں اُس کے بچے کا چوس لوں گا۔ اُس کے ہونٹ ستار کے تار کی طرح کانپ رہے تھے اور آنکھیں جیسے جل رہی تھیں ۔"

چندرمنی اداس ہوگئی ۔ وہ آگے نہ چل سکی ۔ جیسے اُس کے پاؤں میں زنجیریں ڈالی گئی ہوں ۔ اُس نے کہا "اوہ ۔ میں ابھی اس کا علاج کرا دیتی ہوں"

شام لال نے پوچھا ۔ "وہ کیسے ؟"

چندرمنی نے کہا ۔ "سدا ماں کو ابھی بلواؤں گی اور اتنا پٹواؤں گی ۔ کہ اُس کی چمڑی لال ہو جائے ۔ اسی سے خواب کا اثر جاتا رہے گا ۔"

شام لال نے بے ساختہ اُس کے پیر پکڑ لئے ۔ اور کہا ۔ "نہیں ماں ایسا نہ کیجو ۔ ایسا نہ کیجو ۔ غریب ہے ۔ مر جائے گا ۔ اور ہتیا چمٹ جائے گی ۔"

چندرمنی بھی کانپ رہی تھی ۔ اسے شاید خواب کی تعبیر معلوم تھی ۔

اُس نے پوچھا ۔ "تب کیا ہوگا ؟"

شام لال نے کہا "میں سدا ماں سے معافی مانگوں گا ۔ وہ بخشیگا ۔ ایسے آدمیوں کا دل بہت بڑا ہوا کرتا ہے ۔"

چندرمنی نے چونک کر کہا ۔ "بہو ـــ وہاں نہ جانا ۔ چنڈال ہے ۔ کون جانے کس طرح سے پیش آئے گا ۔"

لیکن شام لال ماننے والا نہیں تھا ۔ وہ آگے بڑھا ۔ ہوا کی طرح ۔ اور تنگ و تاریک کوچوں سے ہوتا ہوا وہاں پہنچا ۔ جہاں سدا ماں کی جھونپڑی تھی ۔ دیکھا دروازہ میں قفل پڑا ہوا ہے ۔ جس کے اوپر لاکھ کی مُہر ہے ۔ اور صحن میں مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن ۔ میلا سا چراغ ۔ پُرانے چھیتڑے ۔ چمڑے کے بوسیدہ ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہیں ۔ کچھ چھیتڑے کتوں کے شغل کا سامان بن گئے ہیں ۔ جنہیں وہ ایک دوسرے کے منہ سے چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ اور ساتھ ہی ساتھ خوش بھی ہیں ۔

شام لال مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا سکا ۔ اُس نے دیکھا ۔ غریب کی جھونپڑی کا ہر حصہ رو رہا ہے ۔ ہر طرف سے اُداسی سی کھیل رہی ہے ۔ جہاں کل قہقہے گونج رہے تھے ۔ وہیں آج یاس و حسرت بارش کی طرح برس رہی ہے ۔"

پاس سے گزرنے والے ایک آدمی نے اُسے دیکھا ۔ اور پوچھا ۔ "کسے دیکھ رہے ہو بابوجی ۔"

شام لال نے مُڑ کر دیکھا ۔ اور کہا ۔ سدا ماں نائی کہاں چلا گیا ہے ؟"

اُس آدمی نے دُور ایک چنار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ "وہ تو وہاں بیٹھا ہے ۔ چنار کے نیچے ۔ ساہوکار نے بیچارے کا سب کچھ چھین لیا ۔ خدا اُسے غارت کرے ۔ جس کے دل میں غریب کے لئے رحم نہیں ۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔ اور شام لال اس طرف چل پڑا ۔ جہاں سدا ماں بیٹھا تھا ۔ دیکھا ۔ تو سدا ماں ایک پھٹی سی چادر میں لیٹا پڑا ہے ۔ اُس کے ننھے ننھے بچے اُس کے چاروں طرف بیٹھے ہیں ۔

سدا ماں کی بیٹی نے شام لال کو دیکھا ۔ تو وہ کھسک سی گئی ۔ لیکن شام لال نے کہا ۔ "بیٹھے رہو ـــ بیٹھے رہو ۔"

شام لال نے سدا ماں سے پوچھا "سدو ۔ سدو جی ـــ ؟"

سدا ماں نے آنکھیں کھولیں ۔ لیکن بول نہیں سکا ۔

شام لال نے پوچھا ۔ "کیا بات ہے ۔ طبیعت خراب ہو چلی ہے ۔"

سدا ماں نے مشکل سے کہا ۔ "ہاں ۔ لیکن شام ـــ اب ـــ اب میرے پاس کیا ہے ۔"

شام لال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ بچوں نے اُسے روتے دیکھا ۔ تو وہ مارے خوشی کے اچھل گئے ۔ اور ایک دوسرے سے کہنے لگے "آبا کی طرح رو رہا ہے ۔ آہا ۔ کل آبا بھی اسی طرح رو رہے تھے نا ـــ"

اِس بات سے شام لال کا دل اور بھی ڈوب گیا ۔ بچپن کی بے فکری اور ناامیدی کی دو خوشنما تصویریں قدرت نے اس کے سامنے رکھ دی تھیں اُسی جگہ جہاں ایک طرف فطرت کی معصومیت تھی ۔ اور دوسری طرف اس بے پناہ دنیا کی جمع کی ہوئی بےکسی ۔ اور جہاں افلاس کے حُسن اور شباب کی قرقی خزاں کے سیاہ دل ساہوکار نے کرا دی تھی ۔

اس نے سدا ماں سے کہا ۔ "سدو ۔ ہمیں بخش دو ۔ پتا جی نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ۔ ہمیں بخش دو ۔"

سدا ماں کے ہونٹ مُسکرا اُٹھے ۔ دراصل یہ مسکراہٹ نہیں تھی ۔ انتہائی رونا تھا ۔ جسے شام لال شاید نہ سمجھ سکا ۔

اور پھر بولا ۔ "اچھا شام بابو ـــ"

شام لال نے کہا۔ "مجھے چھوڑ دیجئے۔ مجھے اسی حال میں رہنے دیجئے"
پنڈت چتربھج نے کہا۔ "امتحان کے دن نزدیک آ رہے ہیں کب تک یونہی پڑے رہوگے"
شام لال نے کہا۔ "جب تک مالک کی مرضی ہوگی۔"
چتربھج نے کہا۔ "یہاں کیا کروگے ——— ؟"
شام لال نے کہا۔ "اُن کی سیوا۔ جن کا دُنیا میں کوئی بھی نہیں۔"
چتربھج نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔ بڑے سیوا دھاری ہو۔ آج تک تو چھپے رستم ہی رہے۔"
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ "اٹھو۔ سدا آماں کے اس حال پر ترس مت کھاؤ۔ یہ بڑا حضرت ہے۔ سانپ کی طرح کینچلی بدلنے والا۔ کچھ نہ بن پڑا۔ تو لوئی لپیٹ کر سوگیا۔ کچھ نہیں۔ محنت کئے بغیر منہ میں نوالا تو جائے گا نہیں۔"
شام لال نے حقارت بھری نظروں سے پنڈت چتربھج کو دیکھا اور بے اختیار بول اُٹھا۔ "ہے ایشور ———"
پنڈت چتربھج بھی غصے ہو گئے۔ اور یہ کہہ کر واپس لوٹے۔ "تمہاری ایسی ہی مرضی ہے۔ تو ایسے ہی سہی۔ دیکھوں گا۔ اس طرح سے کتنے دن گزار سکتے ہو۔"

لیکن ہفتہ کی بیماری کاٹنے کے بعد سدا آماں مرگیا۔ بیچارے کی موت پر رونے والا بھی کون تھا۔ صرف نابالغ بیٹی۔ اور شام لال۔"
معصوم بچے اُس وقت بھی کھیلنے میں مصروف تھے۔ انہیں کیا خبر تھی۔ "آبا کیوں مرگیا۔ کیسے مرگیا۔ کب مرگیا۔"
شام لال نے سدا آماں کی بیٹی مالولتا کو دھیرج دی۔ پھر آپ بازار چلا آیا۔ وہاں سے کفن وغیرہ خرید کر لایا۔ اور گاؤں سے کچھ آدمیوں سے لاش کو ندی کے کنارے اٹھوا کر اُسے سپردِ آتش کیا۔ پھر چولھا جلا کر روٹی پکائی۔ ننھے ننھے بچوں کو کھلایا۔
شام کو پنڈت چتربھج آ گئے۔ اُن کے ساتھ آٹھ دس آدمی تھے۔ کچھ اُن کے کارندے کچھ ان کے حواری۔
شام لال نے پھر کہا۔ "سدا آماں نے بچوں کو میرے حوالے کیا ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

پنڈت جی کے ایک حواری نے کہا۔ ان کے رشتہ دار ہوں گے وہاں پہنچا دیں گے۔"
شام لال نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو رشتہ دار مصیبت کے وقت کام نہ آئیں۔ اُن کا ہونا نہ ہونا مساوی ہے۔ مصیبت کے وقت اگر انسانی ہمدردی جوش میں نہ آسکے۔ تو زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔"
اس تقریر سے پنڈت چتربھج کی آنکھوں کا پردہ ہٹ گیا۔ وہ اُٹھا۔ اور اپنے بیٹے کے آگے گر پڑا۔ اور کہا۔ "آج تک میں تمہیں اپنا بیٹا مانتا تھا۔ آج سے تم میرے گورو ہو۔ تم نے میری وہ آنکھیں کھول دیں۔ جو صدیوں عبادت کرنے سے بھی شاید نہ کُھلتیں۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اپنی جائداد کا نصف حصہ غریبوں کی امداد کے لئے وقف کروں گا۔
شام لال نے حیرت سے مُسکرا کر پوچھا۔ "سچ۔ آبا جی۔ سچ ؟"
پنڈت چتربھج نے کہا۔ "ہاں سچ سچ۔ سدا آماں کی موت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ اسی عہد سے شاید میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔"

پنڈت چتربھج کے گھر میں سادگی برستی تھی۔ لیکن اسی سادگی میں ایک دائمی سکون سا کھیل رہا تھا۔
گھر کا بچہ بچہ شام بابو کی رانی مالولتا کا مداح تھا۔ سب کہتے تھے۔ "سدا آماں کی بیٹی نے چتربھج کے گھر کو چمکا دیا ہے۔"
اور سدا آماں کے بچے۔ وہ جیسے پنڈت چتربھج کے اپنے بیٹے تھے۔ پنڈت چتربھج کے تمام وسوسے۔ نابود ہو چکے تھے۔ وہ اب گھر میں بیٹھ کر چین کی بنسری بجا رہے تھے۔ شام بابو نے دکان کھولی تھی۔ ساہوکاری کا کام ختم کیا گیا تھا۔
کہتے ہیں۔ شام بابو کے احساس بھرے دل نے کئی بے چین روحوں کو سکون اور آرام دلایا۔ جو انہیں کہیں بھی میسر نہ آتا۔

پریم ناتھ سادھو رونق کاشمیری

غزل

آ، کہ پھر گریاں در و دیوار ہیں تیرے لئے
قلب کے ناسور پھر خوں بار ہیں تیرے لئے

پھر تری خاطر تمنّا ہے وصالِ مرگ کی
پھر وداعِ زیست پر تیار ہیں تیرے لئے

آ، کہ تیری یاد سے غافل نہ ہو جائیں کہیں
ہوش اتنا ہے، کہ اب ہشیار ہیں تیرے لئے

کیا خبر تجھ کو، کہ کیوں ہیں بے سکون و بے قرار
کیا کہیں تجھ سے، کہ دل افگار ہیں تیرے لئے

یا یہی دنیا، کہ تھی تیری محبّت سے بہشت
یا اسی دُنیا سے اب بیزار ہیں تیرے لئے

یا وہی ہم تھے، کہ تھے تیری عنایت سے غنی
یا رہینِ منّتِ اغیار ہیں تیرے لئے

جن کو کل تک تیری دلداری پہ فخر و ناز تھا
آج وہ لذّتِ کشِ آزار ہیں تیرے لئے

اب نہ وہ رندی، نہ وہ مستی، نہ وہ کیف و نشاط
مختصر یہ ہے، خراب و خوار ہیں تیرے لئے

تُو سراپا جلوۂ لطف و مسرّت بن کے آ!
ہم مجسّم بندۂ ایثار ہیں تیرے لئے

دیکھ جا وارفتگی و شوق کی سرگرمیاں،
یہ مناظر قابلِ دیدار ہیں تیرے لئے

تنکے تنکے سے صدا آتی ہے تیری یاد کی
ذرّے ذرّے خاک کے بیدار ہیں تیرے لئے

پوچھتا ہے عشق کی افزونیوں کے کیا سبب
مست ہیں تیرے لئے سرشار ہیں تیرے لئے

دیکھ، اشکِ دیدۂ حرماں بھی اک دن آ کے دیکھ!
ابرِ نیساں بن کے گوہر بار ہیں تیرے لئے

حرماں خیرآبادی

سینما

رنگین فلمیں

فلموں کے پردۂ وجود پر آنے سے قبل کون کہہ سکتا تھا کہ تصویریں بھی جاندار اجسام و ابدان کی طرح نقل و حرکت کریں گی اور ان سے اسی طرح جذبات و کیفیات کا اظہار ہوگا جیسے ان کے کاسۂ سر میں بھی متفکر دماغ اور پہلو میں متحرک قلب ہے؟ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بولنے اور بات کرنے کے سوا تصویریں سب کچھ کرنے لگیں۔

علم و حکمت کا یہ کتنا محیر العقول اور شاندار کارنامہ تھا! دنیا ورطۂ حیرت و استعجاب ہوگئی۔ اس عجیب و غریب تماشے نے جو انسان کے پردۂ تصور سے بھی بالاتر تھا دنیا کے تمام تماشوں کے ہنگاموں کو سرد کر دیا۔ شہر شہر تصویر نما نے اور سینما ہال کھل گئے، تفریح و دلچسپی کا سب سے بڑا ذریعہ تھیٹر تھا۔ سینما کے سامنے اس کی رنگینیاں، اس کے ساز و سامان، اس کے رقص و نوا کی دلچسپیاں و دلکشیاں بھی، ہیچ و حقیر ہوگئیں۔ تھیٹر کا دیکھنا "اولڈ فیشن" اور "فرسودہ مذاق" سمجھا جانے لگا۔

دنیا کے لئے تو متحرک تصویریں حکمت و سائنس کا معراج کمال تھیں لیکن ارباب علم و حکمت کے نزدیک یہ کمالِ فن کا پہلا درجہ تھا۔ چنانچہ ہنوز متحرک تصویروں کے تماشا آرائے عالم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ساکت و صامت تصویریں گویا ہوگئیں اور سینما کا خاموش اسٹیج ساز و نوا سے بہشت گوش بن گیا۔

سائنس کے اس انقلاب آفریں اقدام نے نہ صرف تماشائیوں میں ایک ہلچل ڈال دی۔ بلکہ اہلِ تماشا میں تہلکہ برپا کر دیا۔ جب تک فلمیں خاموش تھیں آواز اور طرزِ کلام کا کوئی سوال نہ تھا۔ لیکن تصویروں کی گویائی نے دنیائے فلم کے لئے ایک جدید مسئلہ پیدا کر دیا۔ کوئی اداکار فن تمثیل اور جذبات نگاری میں کتنا ہی مہارت و کمال رکھتا ہو لیکن اگر اس کی آواز موزوں اور طرزِ گفتگو مناسب نہیں ہے تو متکلم تصویروں میں اسے قبولیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس انقلاب نے کتنے شہرۂ آفاق فلم اسٹاروں کو گوشۂ گمنامی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور کتنے غیر معروف اداکاروں کو آسمانِ فلم کا زہرہ و مشتری بنا دیا۔

لیکن اس عظیم الشان اقدام و ارتقاء کے بعد بھی صنعت فلمسازی میں ایک اہم نقص باقی ہے۔ تصویریں نقل و حرکت کرتی ہیں۔ چلتی پھرتی ہیں، زبان و اشارات سے بولتیں اور اظہار جذبات و خیالات کرتی ہیں۔ لیکن تصویروں کو دیکھ کر یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ صاحبِ تصویر کے جسم کی قدرتی رنگت کیسی ہے؟ اس کے کپڑے کس رنگ کے ہیں؟ پورا لباس ایک ہی رنگ کا ہے یا مختلف رنگوں کا؟ تصاویر کا گونگاپن دُور کرنے کے بعد اب اہلِ سائنس اس نقص کے ازالہ کے لئے کوشاں ہیں، اگر وہ کامیاب ہوگئے تو جہاں تماشائی زیبا و گوہر اور آوا ماشتی کے مکالمات اور گانے سنتے ہیں اور ان کے حُسن و جمال کے عمولی خد و خال سے نشاط اندوز ہوتے ہیں وہاں ان کی قدرتی صباحت و ملاحت کو بھی نودہ نظر بنا سکیں گے۔ اور دیکھ سکیں گے کہ ان کی ساریاں اور بلاؤزکس درجہ دلکش اور نظر نواز ہیں۔

اہلِ سائنس ۱۹۰۸ء سے فلموں کو رنگین بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعدد تجربات کئے مگر کامیاب مساعی نہ ہو سکے۔ ہندوستان میں بھی بعض تجربے ہوئے، لیکن نتیجے کی بجائے صفر ہی رہا۔ دونوں جگہ قلم ہی سے کام لیا گیا جو ناکام ثابت ہوا۔ بعد میں کچھ علمی طریقے استعمال کئے گئے جس میں کسی حد تک کامیابی ہوئی۔ اب تک تین طریقوں سے تصویریں رنگین بنائی جاتی ہیں۔ پربھارت کمپنی کی "سیرندھری" انہیں میں سے ایک طریقے کے مطابق بنائی گئی تھی۔ جو ناکام ہوگئی۔ اس زمانے میں غیر ممالک میں جتنی رنگین فلمیں تیار ہوئیں وہ بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ چنانچہ "میئر گولڈن ون" نے "ہاؤس آف اوتھ چائیلڈ"، کو رنگین بنایا تھا جس کی حالت "سیرندھری" سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ اس کے بعد Lacuecavacha تیار کی گئی۔ جو بے شک تمام سابقہ رنگین فلموں سے زیادہ کامیاب تھی لیکن جن فلموں کو پورے طور پر کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ اب تیار ہوئی ہیں۔ ان کے نام Garden Of Alla. اور Dancing Pirati. ہیں۔ ان رنگین فلموں کے دیکھنے کے بعد اب صحیح قسم کی رنگین تصاویر کی تیاری کا امکان پیدا ہوگیا ہے۔ مسٹر الگزینڈر کورڈا جو "لنڈن فلمس پروڈکشن" سے تعلق رکھتے ہیں۔ فلموں کے رنگین بنانے میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔

ناگزیر انقلابات

جو چیزیں سادہ فلموں میں کام دے رہی ہیں وہ رنگین فلموں میں کارآمد نہ ہوں گی، ان میں بہت کچھ تغیر و تبدل کی ضرورت ہو گی۔ سب سے اہم تبدیلی "میک اپ" کے سلسلے میں کرنی ہو گی۔ بدن کا اصلی رنگ ظاہر کرنے کے لئے بہت ہلکے رنگ کا میک آپ کرنا ہو گا۔ اس وقت میک اپ کے ذریعے جلد کے عیوب کی پردہ پوشی ناممکن ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں وہی ایکٹرسیں فلموں میں کام کر سکیں گی۔ جو بے عیب و بے داغ صورتوں کی مالک ہوں گی۔ رنگین فلموں کا دور قدرتی حسن و جمال اور صحت و تندرستی کا دور ہو گا۔ جن کے چہروں میں داغ دھبے یا جھری وغیرہ کے عیوب ہوں گے انہیں پردہ سیمیں پر بار ملنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ ہالی ووڈ کا شہرۂ آفاق میک اپ مسٹر کامنت میں کہتا ہے کہ "جب تک ایکٹرسیں حسین ہونے کے ساتھ ہی تندرست نہ ہوں گی۔ رنگین فلموں میں کام نہیں کر سکتیں نتیجہ یہ ہو گا کہ انہیں اس پیشے ہی سے کنارہ کش ہو جانا پڑے گا۔"

صنعت فلمسازی میں بھی مختلف قسم کے انقلابات و تغیرات رونما ہوں گے۔ ڈائرکٹروں کو فن رنگ سازی میں بھی کامل مہارت حاصل کرنی پڑے گی۔ صنعت فلمسازی کا یہ انقلاب دنیائے فلم میں اس سے بھی زیادہ تہلکہ ڈال دے گا۔ جس کا مظاہرہ ساکت فلم کے بعد ناطق فلم کے آغاز میں ہوا تھا۔

ایک ماہرِ فن کے خیالات

مسٹر Ernestla itsch. شہرۂ آفاق ڈائرکٹر ہے۔ وہ رنگین فلموں پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ دیکھئے آپ کی ٹائی نیلے رنگ کی ہے۔ لیکن اس کے رنگ کو ہم اس وقت تک محسوس نہیں کرتے جب تک اس کے بارے میں ہم کچھ غور نہیں کرتے۔ لیکن جب رنگین فلمیں بننے لگیں گی تو آپ کی یہ نیلی ٹائی اس قدر شوخ کر دی جائے گی کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں ان کے نیلے پن کو فوراً محسوس کر لیں گی۔ متکلم فلموں کے آغاز میں بھی یہی ہوا تھا۔ اداکار یہ دکھانے کے لئے زور سے کھانستا تھا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ تصویر سے کھانسنے کی بھی آواز آتی ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں رنگین فلمیں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ اداکاروں کو محض اس خیال سے رنگ رنگ کے ساز و سامان سے سجایا جائے گا۔ تاکہ تماشائی دیکھیں اور اعترافِ کمال کریں کہ کیسی رنگین فلمیں ہیں، اس بے جا تکلفات کے باعث زیادہ تر وہ بر خود غلط ڈائرکٹر ہوں گے جو اس فن سے بے بہرہ ہوتے ہوئے بھی اس میں دخل دیں گے۔"

مستقبل

رنگین فلموں کا مستقبل نہایت دل آویز، شاندار اور پُرکشش ہے۔ جس زمانے میں رنگین تصویریں بننے لگیں گی جو لوگ آگرہ جا کر عجوبۂ روزگار تعمیر تاج محل کو اور اجنتا جا کر وہاں کی سنگ تراشی کے حیرت انگیز کمال کو دیکھنے سے مجبور اور قاصر ہیں وہ اپنے شہر کے سینما ہال میں جا کر عین اسی رنگ میں ان نادر الوجود کمالات آدم کو دیکھ لیں گے۔ جس رنگ میں وہ فی الحقیقت ہیں۔ حالات حاضرہ میں حسین و جمیل اور نازنین و ناز آفریں ایکٹرسوں کی فلمیں دیکھ کر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کے رخسارے کس طرح ... خورشید کو دعوت مقابلہ دیتے ہیں اور ان کے نازک لب کس طرح لعل ... کو شرماتے ہیں۔ لیکن رنگین فلموں میں ہم سب کچھ ہو بہو دیکھ لیں گے۔ وہی صباحت، وہی ملاحت، وہی رنگینی، وہی رعنائی ان کی خوش رنگ اور دلفریب ساڑیاں اور ان کے خوبصورت اور قیمتی زیورات ہمیں اس طرح دعوتِ کیفِ نگاہ دیں گے جس طرح اصل صورت میں دیکھنے والوں کو دیتے ہیں، رنگین فلموں کے اس مستقبل کا تصور کیجئے اور سوچئے کہ ساکت فلموں کے بعد ناطق فلموں کے دور میں سینما کو جس قدر قبولیت حاصل ہوئی ہے اس سے بھی کس قدر وسیع حسن قبول رنگین فلموں کے دور میں سینما کو حاصل ہو گا؟

رنگین فلموں کی یہی ایک خصوصیت نہ ہو گی کہ ان کی دلکشی و دل آویزی میں بیش از بیش اضافہ ہو جائے گا۔ ان میں ایک نمایاں ترقی یہ بھی ہو گی کہ وہ اصلیت سے اور زیادہ قریب ہو جائیں گی۔ اس وقت باغ کے سین میں ہمیں ہر قسم کے پھول اور پتے ایک ہی رنگ کے نظر آتے ہیں۔ اس سین سے لطف اندوز ہونے میں ہمارے تصورات و تخیلات غیر محسوس طریقے سے ہمارے ذوق کی امداد نہ کریں تو بجائے دلچسپی کے ہمیں کوفت ہو سکتی ہے لیکن رنگین فلموں میں ہم گلاب کو سرخ اور سبز پتوں کے درمیان چمیلی کو بالکل سفید دیکھ سکیں گے۔ اس وقت سینما میں جو غیر معمولی کشش و جاذبیت پیدا ہو جائے گی اس کا اندازہ تصور اور خیال کی امداد سے ہم اس وقت بھی اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ رنگین تصویریں مناظر اور کوائف کی تفہیم میں ہمیں ہماری مزید اعانت کریں گی تصویر خانوں نے اس وقت بھی تھیئٹر ہاؤسوں کی رونق و دل آویزی کو کچھ کم صدمہ نہیں پہنچایا ہے۔ لیکن رنگین تصویروں کے عہد میں پردۂ سیمیں کے سامنے "اسٹیج" کی رنگینیاں اور بھی بے کیف اور ناقابلِ توجہ بن جائیں گی۔

رنگین فلمیں اور ہندوستان

ہندوستانی کمپنیاں بھی رنگین فلموں کی تیاری کا ارادہ کر رہی ہیں۔ چنانچہ

(باقی بر صفحہ ۵۳)

مالٹا

موجودہ زمانہ میں مالٹا نے اخباری دنیا میں ایک عجیب صورت اختیار کر لی ہے۔ جس کا خاص سبب سیاسی اور تقا کی کشمکش ہے۔ اور یہی چیز ہے جس نے سیاحوں کے دلوں میں اس کی جانب سے بے پروائی پیدا کر دی ہے۔ اور اس کے کیف آگین مناظر کو اُن کے لئے تلخ بنا دیا ہے۔ اگرچہ حقیقتاً مالٹا میں سیاسی جد و جہد بہت ہی سخت ہے اور سپاہیانہ زندگی کا دور دورہ ہے۔ تاہم اس سے صرف ایک محدود طبقہ متاثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جزیرے کی جاذبیت اور دلربائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں واقع ہوُا۔

مالٹا ایک عجیب و غریب جزیرہ ہے جغرافیائی حیثیت سے یہ برّ اعظم افریقہ کا ایک حصّہ ہے جس سے یہ کسی وقت میں ملحق تھا۔ نسلی اعتبار سے یہ ایشیا سے متعلق ہے۔ اور سیاسی مصالح کی بنا پر یہ یورپ کا حلقہ بگوش ہے۔ اس کی تاریخ بتلاتی ہے۔ کہ یہ یکے بادیگرے فنیشی، یونانی، رومی، اسپینی، فرانسیسی، اور برطانوی حکمرانوں کے زیر اثر رہا ہے۔ پھر بھی یہاں کے باشندوں نے اپنی انفرادی شخصیت، لباس، رسم و رواج اور زبان کو پوری طرح برقرار رکھا۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہونے دیا۔ بلاشبہ قدیم زمانے میں یہ ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ اور بعد میں صلیبی اور اسلامی محاربات کے دوران میں یہ نصرانیوں کا فوجی مرکز بن گیا تھا۔ مالٹا کے باشندے آج بھی مذہب کے پکے جفاکش محنتی ہمدرد اور وفاکش ہیں۔ اور اپنی قومیت اور وطن پرستی اور اپنے قدیم رسم و رواج کے پورے طور پر محافظ ہیں۔ مالٹا کی اکثر عورتیں آجتک فیلڈیٹا ——— ایک عجیب و غریب قسم کی سیاہ ٹوپی پہنتی ہیں۔ جس کی ابتدا کا حال اب تک نہ معلوم ہو سکا کہ وُہ کس طرح وجود میں آئی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مالٹائی عورتوں کا فیلڈیٹا اسپینی عورتوں کے مینٹیملا کی بدلی ہوئی صورت ہے اور بعض یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ اس قدیم رسم کی تدریجی ارتقاء سے وجود میں آیا جب عورتیں اپنے سروں کو کسی خاص کپڑے سے ڈھانک کر کلیسا جایا کرتی تھیں۔ ایک نہایت مشہور قصہ اس کے وجود کی یہ توجیہ پیش کرتا ہے۔ کہ جب فرانسیسیوں نے ویلیٹا میں ——— لوٹ مار اور قتل و غارت کیا تو مالٹائی عورتیں اپنی بہنوں کی شہادت کا سوگ منانے اور خود کو سپاہیوں کے دستبرد سے بچانے کے لئے یہ سیاہ ٹوپی پہننے لگیں۔ بہرصورت یہ لباس کسی طرح بدنما اور ناموزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اور غالبًا اس کی مقبولیت کا خاص سبب یہی ہے۔

مالٹا کے باشندے اپنی جہازرانی اور ملاحی کے لئے بہت مشہور ہیں اور اس فن میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی عجیب و غریب شکل کی کشتی جو دغاساس کہلاتی ہیں جزیرے کے بندرگاہوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان کشتیوں کو دیکھتے ہی ہمارا ذہن وینس کی اُن کشتیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن کو گنڈولا کہتے ہیں۔ دغاساس کا اگلا حصّہ بحر روم کی کشتیوں کی طرح لمبا ہوتا ہے۔ اور اسی طرح پچھلا حصّہ بھی اسی ساخت کا ہوتا ہے۔ جس میں ایک بڑا بانس لگا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بحر روم کے گنڈولا نے تبدیل ہوتے ہوتے مالٹا کے دغاساس کی صورت اختیار کر لی۔ یہ مالٹا کے مخصوص حالات کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ کیونکہ کشتی کا اگلا حصّہ اس کو چٹانوں سے ٹکرانے سے بچا لیتا ہے۔ مالٹا کے ملاحوں میں خاص بات یہ ہے۔ کہ وُہ کھڑے ہو کر کشتی چلاتے ہیں۔ اور ان کا رُخ کشتی کے اگلے حصے کے جانب ہوتا ہے۔ اور وُہ پتوار کو چلاتے رہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وُہ بیٹھ کر چلائیں۔ اور اُن کا رُخ کشتی کے پچھلے حصّے کے جانب ہو پھر بھی وہ اس قدیم طرز کی جہازرانی کی نہ تو کوئی تشریح کر سکتے ہیں اور نہ کوئی توجیہہ۔

جزیرہ کا صدر مقام ویلیٹا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف خوبصورت فصیل ہے جو شہر پناہ کا کام دیتی ہے۔

یہ ایک نہایت پُر فضا شہر ہے۔ اس کی سڑکیں تنگ اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ جا بجا عجیب و غریب دلچسپ پرانی تاریخی عمارتیں ہیں۔ بدقسمتی سے اکثر جگہ شہر پناہ کی دیواریں گرتی جاتی ہیں۔ لیکن مالٹا کے رؤسا کے اکثر محلات د) اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ انہیں پتھر کی بنی ہوئی سڑکوں پر مالٹی لوگوں کی گاڑیاں چلتی ہیں جن کو کیروزی کہتے ہیں۔ یہ نہایت ہلکی پھلکی بنی ہوتی ہیں۔ اور آسانی کے ساتھ پہاڑی ڈھلوانوں پر اتر چڑھ سکتی ہیں۔

اگرچہ کسی حالت میں بھی آرام دہ نہیں کہی جا سکتی ہیں۔ دارالسلطنت کی سڑکیں بکریوں کے گلّوں سے اٹی پڑی رہتی ہیں جو ایک دروازے سے دوسرے دروازے کو ہانکی جاتی ہیں۔ اور بوقت ضرورت دوہ لی جاتی ہیں۔ یہ جفاکش اور محنتی جانور کس طرح اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ ایک معمہ ہے کیونکہ جزیرے بھر میں چراگاہیں معدوم ہیں۔ اور یہ تیقن کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ زیادہ تر سڑکوں پر پڑے ہوئے فضلہ سے پیٹ پالتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ مالٹائی بخار کا اصل سبب انہیں بکریوں کا دودھ ہے۔ پھر بھی مالٹائی اسقدر قدامت پرست ہیں۔ کہ اس کے پینے سے باز نہیں آئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے بڑی حد تک اس بیماری سے نجات حاصل کر لی ہے۔ برطانوی فوجی دستوں نے بکری کے دودھ کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اور اس کی بجائے وہ ٹین کے ڈبوں میں بند دودھ جو بیرون نجات سے آتا ہے استعمال کرتے ہیں۔ اور اس طرح مالٹائی بخار تقریباً فوجی حلقوں سے معدوم ہو گیا ہے۔ سیاح سیر کرنے والوں کو بھی اس بخار سے کوئی اندیشہ نہیں اگر وہ بھی اس تدارک پر عمل کریں۔

حال ہی میں مالٹا کے ایک گاؤں ٹاکسیو ——— میں چند پتھر کے زمانے ——— کی چیزیں دستیاب ہوئی ہیں جنکی وجہ سے لوگوں کی اور توجہ مبذول ہو گئی۔ ان چیزوں میں سب سے زیادہ تین پتھر کے بنے ہوئے مندروں کے کھنڈر ہیں۔ ان میں سے ایک چار ہزار برس قبل مسیح میں بنایا گیا تھا۔ ابھی تک وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ ان عبادت خانوں میں کس طور کی عبادت ہوتی تھی۔ لیکن مویشیوں، بکریوں اور سوروں کی تصاویر سے جو ان پہ کندہ ہیں۔ اور مختلف قسم کے چونے سے بنی ہوئی ہڈیوں کے ملنے سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے۔ کہ عبادت میں قربانی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ بات کس قدر تعجب خیز ہے۔ کہ ان مندروں پر بکریوں کی جو تصویریں کندہ ہیں۔ وہ آج کل کی بکریوں سے قریب قریب بالکل مشابہ ہیں۔ ایک مندر میں پتھر کے ایک بت کا بہت بڑا ٹکڑا بھی ملا ہے۔ اور جسے لوگ زراعت کا دیوتا کہتے ہیں۔ اور غالباً قدیم زمانے کے کاشتکار اسی کی پوجا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ پرانے مندر میں ایک پوشیدہ کمرہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ بنا تھا جس میں بیٹھ کر ایک پوشیدہ پجاری لوگوں سے خطاب کر سکتا تھا۔ اور اکثر مختلف قسم کی اشیاء پوشیدہ طور پہ پھینک دیا کرتا۔ پتھر کی پٹیاں جو ان میں لگی ہیں بہت وزنی اور بڑی ہیں۔ اور غالباً چار میل کی دوری سے لائی گئی ہونگی۔ معماروں نے اپنے فن کی پختگی اور مہارت کا وافر ثبوت دیا ہے۔ وہ رولر ——— کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ اکثر جگہوں میں یہ رولر دستیاب بھی ہوئے ہیں۔ ایک مندر کے ایک حصے کی چھت قبا نما تھی۔ اور غالباً اس طرح خصوصیت کا یہ سب سے پہلا نمونہ ہے۔ ان قدیم معماروں کی مہارت کی عظمت اس سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارتیں پتھر کے اوزاروں سے بنائی گئی ہیں۔ اور مالٹائی قوم کی اس بلند تہذیب کا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے عہد قدیم میں حاصل کر لی تھی۔

عبدالعلیم ہاشمی

(سینما کا بقیہ)

اغلب یہ ہے کہ امپیریل کمپنی بمبئی کا ان فکر و توجہ کے ساتھ رنگین فلمیں بنانے کی تجاویز سوچنے میں سرگرم ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ ہالی روڈ کی Tranklin Cranville Produetien. Ltd ایسٹ انڈیا کمپنی کلکتہ کی شرکت میں رنگین فلموں کے متعلق کوئی اسکیم بنا رہی ہے۔ یہ اطلاعات جہاں صنعت فلمسازی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے موجب مسرت ہیں وہاں ہندوستان کی اقتصادی زبوں حالی کا احساس رکھنے والوں کے لئے باعث رنج و افسوس بھی ہیں۔ اگر ہندوستان آزاد ہوتا اور فلم انڈسٹری کے متعلق ہر قسم کا سامان یہاں بنتا ہوتا تو رنج و افسوس کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن بحالت موجودہ غریب ہندوستان کا کروڑوں روپیہ باہر چلا جائے گا۔

میں آپ سے اس اجمال کی کسی قدر تفصیل عرض کروں، جس وقت امپیریل کمپنی اپنی اسکیم کو عمل میں لانا چاہے گی اسے لاکھوں روپوں کی مشینری باہر سے منگانی پڑے گی۔ اور متعدد غیر ملکی فلمساز رکھنے پڑیں گے جنکی تنخواہیں بیشقرار ہوں گی۔

جب امپیریل کمپنی اپنی ان مساعی میں کامیاب ہو جائے گی اور دوسری کمپنیاں دیکھیں گی کہ وہ تنہا سارے ملک کی دولت سمیٹ رہی ہے۔ تو وہ بھی رنگین فلمیں تیار کرانا چاہیں گی۔ اور انہیں بھی باہر سے سامان اور صناع بلانے پڑیں گے، اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہندوستان کی سینکڑوں فلم کمپنیاں اسی طرح باہر سے سامان اور آدمی منگائیں گی۔ تو ہندوستان کا کتنا روپیہ باہر چلا جائے گا؟

رنگین فلموں کے اس خاص پہلو پہ غور کرنے کے بعد کوئی محب وطن اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ رنگین فلموں کے لئے ملک کا کروڑوں روپیہ باہر چلا جائے۔

تماشائی

پیّا مِلن کی آس

اپنی حد سے گذر گئے اب کیا ہے؟ + منجدھار سے پار اتر گئے اب کیا ہے؟
ای شوقِ وصال اے تمنائی سکون + دونوں پلّے تو بھر گئے اب کیا ہے؟

مقتضائے وقت، مقام، مقتضائے حوادث و واردات کے تحت زندگی کا تلخ یا شیریں ہونا مسلّم سہی۔ مگر شخص زاویۂ نگاہ اور شخصی مذاق کے لحاظ سے شیرینی و تلخی کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے جو گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ تمام قوائے جسمانی فرسودہ ہو چکے ہیں۔ چلنا پھرنا تو کجا کروٹ بدلنا بھی ایک منزل طے کرنا ہے۔ اب اس کے لئے زندگی کا کیا مزہ رہا۔ دُنیا گویا اندھی ہو گئی مگر یہ تلخی انہیں لوگوں کے لئے ہے۔ جو زندگی کی چند روزہ جسمانی لذت کو حاصل زندگی سمجھتے رہے ہیں۔ ذرا ان لوگوں کے خاتمہ بالخیر پر بھی نظر کیجئے۔ جن کا شخصی مذاق یا زاویۂ نگاہ ایسے ہولناک وقت میں بھی تلخیوں سے شیرینی کا پہلو نکال لیتا ہے۔ تلخیٔ موت جن کے لئے لفظ بے معنی ہے۔ غور تو کیجئے ایسے لوگ کس گرو کے چیلے ہونگے؟

تلخیوں کے ہجوم میں خوشی کا پہلو ڈھونڈھ نکالنا ایک بڑا مشکل فن ہے اور اس فن کا زبردست ماہر شاعر کے سوا اور کون ہوگا؟ یہ رازدانِ فطرت برائی میں بھی بھلائی اور (Pessimism.) میں بھی (Onlimism) پیدا کر دکھاتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقتوں کی دنیا بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے خلاق المعانی کہلاتا ہے۔ مصیبت کے وقت جب انسان کو راحت کی تلاش ہوتی ہے۔ تو شاعر اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ غمزدوں کے دُکھ درد کو پہنچنے والا شاعر سے بڑھ کر کون ہے؟ یہ شاعر کی شان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ٹھیرو چھری تلے دم لو۔ ابھی سمجھ میں آیا جاتا ہے۔ کہ پرائے درد کو محسوس کرنے والا بلکہ بانٹ لینے والا اس کے جیسا کوئی نہیں۔ ورو بانٹ ہی نہیں لیتا۔ بلکہ دردمندوں کے لئے سامانِ سکون و طمانیت بھی مہیا کر دیتا ہے۔ کیونکر؟ دو چار ٹکوں یا دو چار رقموں سے نہیں۔ یہ مادی چارہ سازی کہاں تک کارگر ہوگی؟ وُہ اپنے درد آشنا دل اور مہارتِ فن کی بدولت چارہ سازی میں کمال دکھاتا ہے۔ یعنے مصیبت زدوں کی دنیائے خیال ہی کو بدل دیتا ہے۔ وُہ مصیبت کی بھی تاویل راحت سے کرتا ہے۔ برائیوں میں بھلائی کا پہلو دکھا کر سامانِ تسکین پیدا کر دیتا ہے۔ خیال بدلتے ہی احساسِ درد کمزور ہونے لگتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ سکون ہو جاتا ہے۔

آخر وقت جب موت انسان کے سر پر کھڑی ہوتی ہے۔ اور وُہ مجبوری و بے بسی کی حالت میں دنیا پر نگاہِ حسرت ڈالتا ہے۔ تو شاعر کا حسّاس دل اس درد انگیز نظارے سے تڑپ اٹھتا ہے۔ موت کو ٹال دینا تو ممکن نہیں البتہ موت کی تلخیوں کو کم کر دینا یا تلخی کو خوشی سے بدل دینا شاعر کا خاص فن ہے وُہ اپنے فلسفۂ رجا —————— کی اُمید افزا لہروں کے ساتھ مسافرِ عدم کی روح میں سما جاتا ہے۔ اور آن کی آن میں اس کا زاویۂ نگاہ بدل دیتا ہے۔ پیکرِ یاس سراپا اُمید ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار وُہ شاعر کا ہمنوا ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔ کہ اپنی حد (خودی) سے گذر گئے۔ اب کیا ہے۔ نہ زندگی کی پروا نہ موت کا کھٹکا۔ کھٹکا کیوں ہو؟ اسی موت کے دم سے تو پیا ملن کی آس بندھی ہے۔ موت سے بے پروا ہو کر اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیتا ہے کہ۔ اور اس فرض انسانی میں کہاں تک کامیاب رہا۔ اور کسی حد تک کوتاہی کی۔ اپنی حد سے گذر کر دنیا کی فانی لذتوں سے محروم ہو جانا اس کے آخری لمحوں کو تلخ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ بندگانہ توقعات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ ؎

لے چلا ہوں وعدۂ فردا گرہ میں باندھ کر
چاہئے ہے اور کیا زادِ سفر میرے لئے
فطرتِ مجبور کو اپنے گناہوں پر ہے شک
وا رہے گا کب تلک توبہ کا در میری لئے

زاویہ نگاہ بدلتے ہی اب وُہ یہ محسوس کرتا ہے جیسے منجدھار سے پار اتر گئے کشمکش سے چھوٹ گئے۔ وصال و سکون کی دوگونہ نعمت مل گئی دونوں پلّے بھر گئے۔ مراد کو پہنچ گئے۔ اب کیا ہے؟

(میرزا یگانہ)

آہ! اصغر گونڈوی

رائیگاں آخر دُعاؤں کا اثر ہو ہی گیا — کارواں سے رہنمائے کارواں کھو ہی گیا
صفحۂ ہستی سے نقشِ زندگی دھو ہی گیا — موت کے آغوش میں بیمارِ غم سو ہی گیا
آتے آتے آخرش وقتِ زبوں آ ہی گیا
رفتہ رفتہ چشمِ تر میں دل کا خوں آ ہی گیا

دِل کی دُنیا پر سوادِ شامِ غم چھا ہی گیا — دردِ مہجوری کسی کا دِل کو تڑپا ہی گیا
یہ قیامت خیز منظر سامنے آ ہی گیا — نازشِ گلشن تھا جو وُہ پھُول مرجھا ہی گیا
آخرش اڑ ہی گئی رنگینئ باغِ سخن
آخرش تاراج ہی ہو کر رہا سارا چمن

اَب بہاریں باغِ رضواں سے اُتر آئیں تو کیا — لالہ وگل اب چمن میں برگ برسائیں تو کیا
اَب گھٹائیں اُودی اُودی آکے چھا جائیں تو کیا — ماہ و انجم آئینۂ گلشن کو دکھلائیں تو کیا
لطف کیا جب اُٹھ گیا وُہ بلبلِ رنگیں نوا
جسکے نغموں پر بہاریں رقص کرتی تھیں سدا

ہو گیا ہو چاک غم سے جب گلوں کا پیرہن — سو گیا ہو بلبلِ رنگیں نوا زیرِ کفن
اٹھ گئی ہو انجمن سے جب بہارِ انجمن — کیا سمجھ کر پھر نظر ڈالے کوئی سوئے چمن
مِٹ گئی اُف مٹ گئی باغِ سخن کی کائنات
بن گیا گلزارِ ہستی ایک زندانِ حیات

کون چھیڑیگا چمن میں اَب "سرودِ زندگی" — کس سے گلزارِ سخن کی ہوگی اَب تابندگی
کون سمجھائے گا اَب رازِ نیازِ بندگی — عرشِ منزل اَب بنے گی کسکی سرافگندگی
روحِ پاکاں جانِ خاصاں صاحبِ عرفاں چلا
زندگی تیرے "نشاطِ روح" کا ساماں چلا

جی میں آتا ہے ہوائے سیرِ گلشن چھوڑ دیں — جسطرح ہو اس قفس کی تیلیوں کو توڑ دیں
یا ترا رُخ جانے والے سُوئے دُنیا موڑ دیں — یا ترے دامن سے پھر اپنا گریباں جوڑ دیں

ہائے اب روئیں کہ دامن پھاڑ کر صحرا چلیں
درد مہجوری بتا کچھ تو ہی آخر کیا کریں

آہ اصغر آہ اے ملک سخن کے تاجدار
سو بہاریں تیرے انداز تکلم پر نثار
تیرے مرنے کا نہیں ہوتا ہے دل کو اعتبار
کیا یہ سچ ہے چل دیا تو دہر سے بیگانہ وار
کیا قیامت بن کے مرگ ناگہاں آ ہی گئی
کیا دلوں پر نامرادی کی گھٹا چھا ہی گئی

چھُٹ گیا اُف چھُٹ گیا ہاتھوں سے دامان بہار
رخصت اے تسکین خاطر رخصت اے صبر و قرار
السلام اے اشک ہائے دیدۂ خوں نابہ بار
الخروش و الخروش اے نالۂ بے اختیار
کیا کیا یہ کیا کیا اے دست گلچین قضا
جان گلشن تھا جو گل تو نے اُسی کو چُن لیا

میں نہ سمجھا تھا کہ تو دوش فنا پر ہے سوار
دے رہی ہے تجھ کو دھوکا زندگی مستعار
کچھ تو ہوتا آخری دیدار سے تیرے قرار
تا قیامت تو نہ ہوتا مجھ کو تیرا انتظار
اَب نہ جانے آہ تیری روح کس منزل میں ہے
عشق کے دامن میں ہے یا حُسن کے محمل میں ہے

کس قدر چھایا ہوا ہے خواب ہستی کا خُمار
سامنے نظروں کے ہے اب تک تماشائے بہار
سو گیا ہے تو ہمیشہ کے لئے زیرِ مزار
دے رہی ہے زندگی لیکن فریبِ انتظار
ہے نگاہوں میں وہی ہنستی ہوئی صُورت تری
دل کو بھرماتی ہے اب تک موہنی مورت تری

تو نہاں ہوں میں نگاہوں میں دلوں میں ہے مکیں
کیسے سمجھوں خواب کی میرے حقیقت کچھ نہیں
کیسے ہو سکتا ہے مجھ کو تیرے مرنے کا یقیں
زندۂ جاوید کو بھی موت آتی ہے کہیں
یاد ہے اصغرؔ مجھے یہ قول رندانہ ترا
"ہر کہ دارد میلِ دیدن در سُخن بیند مرا"

آ گئی میری سمجھ میں اَب یہ وجہِ انفصال
موت آئی تھی تجھے دینے کو پیغامِ وصال
ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھ کو اب تری شامِ ملال
اَور تو جنّت میں ہے محو تماشائے جمال
ہجر کے پردے میں وصلِ جان و جاناں ہو گیا
دردِ دِل اتنا بڑھا آخر کہ درماں ہو گیا

وحشی کانپوری

تعلیمات

گریجوئیٹوں کے فرائض

جامعہ عثمانیہ کے قدیم طلبا کی چوتھی سالانہ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات و تعلیمات دکن نے اپنے بہت قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا ہے - ذیل کا اقتباس نواب صاحب موصوف کی تقریر سے لے کر درج کیا جاتا ہے - (مدیر)

ہمارے طیلسانین تعلیم یافتہ نوجوان ہیں - یہ وہ طبقہ ہے جس سے ملک کی امید وابستہ ہے - ان کو ملک کا دل و دماغ کہنا چاہیئے ان کی بیداری ان کا احساس ان کی ہلچل قابل مبارکباد ہے طیلسانین جامعہ عثمانیہ کے بہت سے حقوق اس ریاست پر ہیں - کیونکہ ملکی ہونے کے علاوہ وہ طیلسانین بھی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ جہاں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ فلاں فلاں حقوق ہم کو حاصل کرنا چاہیں وہاں ہم کو یہ بھی خیال کرنا چاہیئے کہ ملک آپ سے کبھی امید لگائے ہوئے ہے - لفظ طیلسان کا انگریزی ترجمہ گریجوئیٹ ہے - اس سے مطلب یہ ہے کہ اس نے علم کے میدان میں پہلا قدم رکھا ہے - آپ نے علم کے وسیع میدان کی پہلی منزل میں پہلا قدم رکھا ہے - دو ہی دن ہوئے کہ مجھے علی گڈہ میں اردو کانفرنس میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا اور مجھے معلوم ہوا کہ جس زبان میں آپ کی جامعہ قائم ہے اس کے بولنے والے لوگ ۱۴ کروڑ ملک ہندوستان میں موجود ہیں - سینسس رپورٹ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ ہندوستان میں ہیں - ہم نے ذریعۂ تعلیم اس زبان کو رواج دیا - جو سب سے زیادہ بولی جاتی ہے -

اس سے یہ مطلب نہیں کہ دوسری زبان نہ سیکھیں جس کے ذریعہ مغربی ترقی حاصل کی جائے -

آج کل کے زمانہ کے لحاظ سے انگریزی زبان اچھی طرح حاصل کی جائے - اس لئے اس بات پر زور دیتا ہوں کہ انگریزی اچھی طرح سیکھنا چاہیئے - ترجمہ سے پورا کام نہیں نکل سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ -

آئندہ ماہ اپریل سے انگریزی صوبجات خود مختار ہو جانے والے ہیں - یوپی میں کانگریس کا غلبہ ہونے والا ہے - یہی حالت مدراس سی پی کی ہے - اس وقت ہم کو یہ جاننا چاہیئے کہ ہم کو کسی صوبے سے گرے ہوئے نہ رہنا چاہیئے - کانگریس کی خواہش ہے کہ طبقہ کو الٹ دیا جائے - نیچے کا طبقہ اوپر آ جائے اور اس چیز کے حاصل کرنے میں وہ اچھی طرح کوشاں ہیں - یہ بڑی کوتاہ اندیشی ہوگی کہ ہم اس کے اصول سے واقف نہ ہوں - یہ تمام امور آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کو جاننا چاہئیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ حضور والا اعلیٰ حضرت بہادر جب دورہ کرتے ہیں تو ایک ایک گاؤں میں جا کر ہر ایک کاشتکار کو دیکھتے ہیں - وہ ہوشیار ہیں اور مدبر ہیں - اس سے بنی نوع انسان کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے - جو غریب بیکس ہیں ان میں تعلیم جاری کرنے کی کوشش کی جائے - ہمارے جاگیرداروں کی یہ حالت ہے کہ میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنی جاگیر کو بھی نہیں دیکھا - اگر گریجوئیٹوں میں کوئی جاگیردار ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ اپنی جاگیر سے ناآشنا نہ رہیں - اور ان کے دکھ درد کی فکر کرنی چاہیئے - غالباً گریجوئیٹوں میں بعض سرمایہ دار ہوں گے - یہ دیکھا گیا ہے کہ گرمیوں میں مزدور آٹھ یا دس گھنٹے کام کرتے ہیں جہاں ہوا وغیرہ نہیں آتی - اور ان محنت کرنے والوں میں بڑے بچے سب شریک ہیں - ان کے ذریعہ وہ لاکھوں روپیوں کی دولت پیدا کرتے ہیں - جس سے وہ کروڑپتی ہو جاتے ہیں - میں چاہتا ہوں کہ مزدوروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے - ملک کی پیدوار میں دو شریک ہیں ایک سرمایہ دار دوسرا مزدور - یہ ٹھیک نہیں ہے کہ محنت کرنے والے کو کچھ نہ ملے اور وہ سب خود کھا جائے - آپ دیکھیں گے کہ انقلاب کے خواہشمند فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ہر شخص کا فرض ہے اس سے بہرہ اندوز ہو - غریبوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے خود ہم کو آئندہ فکر ہونے والا ہے کہ کسب معاش کے لئے ہم کو کیا کرنا چاہیئے - میں ابھی کہہ رہا تھا - کہ گریجوئیٹوں کی معشیت کا کیا حشر ہونے والا ہے - کیونکہ جو چیز عنقا ہے اس کے لئے تلاش کرنا عبث ہے - نوکریاں محدود ہیں - اس وقت ہمارا نظام معشیت یہ ہے کہ ملک کو اس قسم کی تھوڑی سی اصلاح ضروری ہے کہ آپ ایسا کون سا کام کر سکتے ہیں جس - آپ کو روزی میسر ہو - اور ملک میں دولت پیدا ہو - ملک کے اندر کس چیز کی

مانگ ہے وہ دریافت کرنا چاہیئے ملک کی مانگ کی اشیاء ملک ہی میں بننی چاہئیں - اس کو دریافت کرنا چاہیئے - وہ ملک بڑا خوش قسمت ہے جس میں اس ملک کی مانگ کی اشیاء موجود ہیں - جب آپ اپنے بچّوں کو تعلیم دیں اس کو ابتدا سے اس بات کا عادی ہونا چاہیئے کہ وہ مختلف قسموں کی صنعت میں حصّہ لیں - یہ ایک ہی واحد حل ہے اور اس میں صرف وہی حصّہ زیادہ لے سکتے ہیں - جو زیادہ تعلیم یافتہ ہیں ہندو مسلم کا سوال نہیں ہے - سوال صرف یہ ہے کہ سرمایہ دار و جاگیردار کون ہے - بڑا نازک وقت آگیا ہے - دنیا کی حالت بہت خطرناک ہے -

.. .. ..

"درسِ عمل"

تو عزم کا تیشہ ہاتھ میں لے اور طبع کو یوں دلگیر نہ کر
ہاں توڑ طلسمِ کوہِ الم اور فکرِ جوئے شیر نہ کر

خود قسمت کا قسام ہے تو سازندۂ تقدیر ہے تُو
اُٹھ باندھ کمر بگڑی کو بنا اور شکوۂ تقدیر نہ کر

جا نکلے جہانِ تازہ میں بے خوفِ رواں جو رہتے ہیں
اے صاحبِ ہمت خوابوں کی تو اپنے غلط تعبیر نہ کر

چل راہِ عمل پہ تیز قدم آفات کی کچھ پرواہ نہ کر
کیا بگڑے برق و باراں سے کچھ فکرِ تیشہ و تیر نہ کر

اس بحرِ الم سے پیر نکل کیوں ڈرتا ہے طوفانوں سے
ہمت کا دھنی ہے لعلؔ جو تُو اندیشہ چرخِ پیر نہ کر

؟

یہ اتفاق ہے یا اس میں راز ہے کوئی
کہ غزنوی ہے جو کوئی ایاز ہے کوئی

غریب حال کوئی شادکام ہے کوئی　　شکستہ پا ہے کوئی تیز گام ہے کوئی
حقیر ذرّہ کوئی آفتاب ہے کوئی　　نقاب پوش کوئی بے نقاب ہے کوئی
کسی کو عیش میسّر ہے خواب گاہوں میں　　ذلیل و خوار ہے کوئی غریب ہوں میں
کوئی ہے مفلس و نادار اور غنی کوئی　　غرض خدا ہے کوئی اور آدمی کوئی
کسی کے واسطے جینا شراب پینا ہے　　کسی کا درد و الم قہر میں سفینہ ہے

کوئی تو بات ہے یہ امتیاز کیسا ہے
دیارِ حق میں نشیب و فراز کیسا ہے

پربھدیال لعل
(باغبانپورہ)

خواب

گمشدہ مسرّت

دن بھر ساحل پر، جہاں دھوپ ناچ رہی تھی، "زندگی" بیٹھی رہی۔

دن بھر نرم رو ہوا اس کے بالوں سے کھیلتی رہی۔ اور اس کی جوان حسین آنکھیں سمندر سے پرے دیکھتی رہیں۔ وہ انتظار کر رہی تھی ــــــ وہ منتظر تھی لیکن وہ خود نہیں جانتی تھی کہ کس کی؟

دن بھر موجیں بالو پر دوڑ کر آگے بڑھتی اور واپس ہوتی رہیں۔ اور وہ گلابی سیپیاں ٹکراتی رہیں۔ "زندگی" بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ دن بھر سورج کی کرنوں کی چمک آنکھوں میں لئے وہ بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ تھک کر اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور سو گئی . . . . . انتظار کرتی۔

تب بالو پر کچھ آواز ہوئی۔ اور ایک قدم ساحل پر تھا۔ "زندگی" جاگ گئی۔ اور اس نے سنا۔ ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا گیا اور اس کے سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور اپنے اوپر "عشق" کی عجیب کھلی کھلی آنکھیں دیکھیں ــــــ اور اب "زندگی" نے جان لیا کہ وہ کس کے انتظار میں تھی۔

اور "عشق" نے "زندگی" کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

اور اس ملاقات سے ایک چیز پیدا ہوئی، نادر اور حسین ــــــ "مسرت"۔ اس کا نام "مسرتِ اوّلیں" رکھا گیا۔ دھوپ سمندر پر چمک کے اتنا خوش نہیں ہوتی، گلاب کی کلیاں جب وہ آفتاب کے پہلے بوسہ کے لئے اپنے لب وا کرتی ہیں اتنی سُرخ نہیں ہوتیں! ۔ اس کی ننھی نبضیں تیزی سے دھڑک رہی تھیں۔ یہ اتنی گرم تھی، اتنی نرم! یہ کبھی بولتی نہ تھی۔ لیکن ہنستی اور دھوپ میں کھیلتی۔ اور "زندگی" اور "عشق" بے انتہا خوش تھے۔ کوئی، دوسرے سے، آہستہ سے زیرِ لب کہتا نہیں کہ "یہ ہمیشہ ہماری رہے گی۔" لیکن دونوں کے دل کی گہرائیوں میں یہ خیال، یہ تمنا تھی۔

پھر ایک وقت آیا ــــــ کئی ہفتوں کے بعد؟ یا کئی ماہ کے بعد؟ ("زندگی" اور "عشق" وقت کی پیمائش نہیں کرتے) ــــــ جب کچھ تغیر ہوا۔

یہ "مسرت" کھیلتی اب تک تھی، ہنستی بھی تھی۔ بگینی قوت سے اپنے ہونٹ بھی رنگ لیتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس کے ہاتھ تھک کر لٹک جاتے تھے۔ اور ننھی آنکھیں مضطربانہ سمندر سے پرے دیکھنے لگتیں۔

اور "زندگی" اور "عشق" ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر یہ پوچھنے کی جرأت نہ کرتے کہ "ہماری پیاری کو کیا ہوا؟" دونوں کے دل سرگوشیوں میں کہتے۔ "یہ کچھ نہیں، یہ کچھ نہیں . . . . وہ کل ہنسے گی" لیکن کل اور کل آئے۔ آئے اور چلے گئے۔ بچی ان کے پاس کھیلتی رہی لیکن بے دلی سے۔

ایک دن "زندگی اور عشق" سو گئے۔ اور جب جاگے تو وہ غائب تھی۔ ان کے نزدیک گھاس پر ایک ننھی اجنبی ہستی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں خوب کھلی تھیں اور ان میں ملاحیت تھی اور اداسی۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ لیکن دونوں الگ ہو کر رونے لگے "آہ! ہماری مسرت! ہماری "گمشدہ مسرت"! کیا اب تمہیں ہم کبھی نہیں دیکھیں گے؟"

ملیح اداس آنکھوں والی اجنبی نے اپنے ایک ایک ہاتھ میں ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور انہیں نزدیک کر لیا۔ اور "زندگی" اور "عشق" اسے اپنے درمیان میں لئے ہوئے چلے۔ اور جب غم کی ماری "زندگی" نیچے دیکھتی تو ان ملیح آنکھوں میں اپنے آنسو منعکس دیکھتی اور جب "عشق" رنج سے پاگل ہو کر چیخ اٹھتا: "میں تھک گیا! میں آگے نہیں جا سکتا۔ روشنی پیچھے چھوٹ گئی ہے۔ آگے ایک دم اندھیرا ہے۔" تو ایک گلابی ننھی انگلی سامنے پہاڑی پر چمکتی ہوئی دھوپ کی طرف اشارہ کرتی۔ ہمیشہ اس کی بڑی آنکھیں اداس اور متفکر رہتیں۔ ہمیشہ ان دلبر لبوں پر تبسم رہتا۔

جب "زندگی" کے پاؤں نکیلے پتھروں پر زخمی ہوتے، وہ اپنے دامن میں خون پونچھتی اور اپنے ننھے ہونٹوں سے زخمی پیر کا بوسہ لیتی۔ جب صحرا میں "عشق" کمزور ہو کر بیٹھ گیا ("عشق" کمزور بھی ہو جاتا ہے۔) تو وہ اپنے ننھے ننگے پیروں سے گرم بالو پر دوڑتی پھری اور صحرا میں پانی کھوج نکالا اور "عشق" کے لب تر کئے۔ وہ بوجھ نہیں تھی ــــــ وہ ان پر بھاری نہ تھی۔ وہ انہیں

سفر میں مدد دے رہی تھی۔

جب وہ اندھیرے غاروں میں پہنچے جہاں برف کے ٹکڑے لٹکے تھے ــــ کیونکہ "عشق" اور "زندگی" کو عجیب ویران جگہوں سے گزرنا پڑتا ہے ــــ تو وہاں، جہاں تمام برف ہی برف تھی۔ اور سخت سردی، اس نے ان کے سرد ہاتھ لئے اور اپنے دھڑکتے ہوئے ننھے دل سے لگا لیا۔ اور گرم کیا ــــ اور آہستہ آہستہ انہیں آگے لے گئی۔

اور ــ اور آگے جب وہ دھوپ اور پھولوں کی سرزمین میں آئے تو ننھی آنکھیں عجیب طرح سے چمک اُٹھیں اور تمام چہرہ ملاحت سے بھر گیا۔ ہنستی ہوئی وہ نرم گھاسوں پر دوڑی، کھو کھلے درختوں سے شہد نکالا اور اپنی ہتھیلی پر لائی ــــ کنول کی پتیوں میں انہیں پانی پلایا۔ اور پھول جمع کئے اور ہار ان کی پیشانیوں سے لپیٹے۔ وہ انہیں اسی طرح چھوتی جیسے ان کی "مسرت" انہیں چھوتی تھی۔ اس کی انگلیاں اور محبت بھری تھیں!

اور اس طرح وہ بھٹکتے پھرے، تاریک ملکوں میں، روشن سرزمینوں میں۔ اور وہ خنداں رقصاں ہستی ہردم ان کے ساتھ تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی پہلی خوشی یاد کرتے اور زیرِ لب بول اٹھتے: "کاش وہ بھی ہمیں مل جاتی!"

آخر کار وہ وہاں آئے جہاں "عکس" بیٹھا رہتا ہے۔ یہ پُر اسرار بوڑھا ہمیشہ اپنی ایک کہنی گھٹنے پر رکھے اور ٹھوڑی ہاتھوں میں لئے بیٹھا رہتا ہے۔ اور جو ماضی سے روشنی چرا کر مستقبل پر ڈالتا ہے۔

اور "عشق" اور "زندگی" چلا اُٹھے: "اے دانا، ہمیں بتا! جب ہم پہلی بار ملے تو ہمارے پاس ایک پیاری حسین ہستی تھی ــــ ایک خوشی، آنسو سے پاک، دھوپ، سایہ سے معرا! آہ! ہم نے کیا گناہ کیا کہ یہ ہم سے چھین گئی؟ ہم کہاں جائیں کہ پھر وہ ہمیں ملے؟"

اور اس دانا بوڑھے نے جواب دیا: "اسے واپس لینے کو۔ جو تمہارے ساتھ ہے اسے قربان کرو گے؟"

اور رنج والم سے بیتاب ہو کر "عشق" اور "زندگی" چیخے: "نہیں!"

"اسے قربان کردوں؟" "زندگی" بولی "جب مجھے کانٹے چبھینگے تو اُن کا زہر کون چوسے گا؟ جب میرا سر درد کرے گا تو کون اسے اپنے ننھے ہاتھوں سے دبائے گا؟ تاریکی اور سردی میں کون میرے یخ بستہ دل کو گرمائے گا؟"

اور "عشق" نے چیخ کر کہا: "اس سے بہتر ہے کہ میں مر جاؤں! "مسرت" کے بغیر میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ لیکن اس کے بغیر نہیں! میں مر جاؤں گا لیکن اسے علیحدہ نہ کروں گا!"

اور دانا بوڑھے نے کہا: "اے احمقو! اندھو! جو پہلے تمہارے پاس تھا وہی اب بھی ہے! جب "زندگی" اور "عشق" پہلے پہل ملتے ہیں تو ایک وہ خشک ہستی وجود میں آتی ہے۔ بغیر سایہ کے۔ جب راستہ ناہموار ہونے لگتا ہے۔ جب سایے تاریک ہونے لگتے ہیں، جب دن سخت ہو جاتے ہیں اور راتیں طویل اور سرد ــــ تب تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ "عشق" اور "زندگی" اسے نہیں دیکھ سکتے، نہیں جان سکتے ــــ یہاں تک کہ ایک روز وہ چونک پڑتے ہیں۔ اور چیخ اٹھتے ہیں: "اے خدا! ہم نے اسے کھو دیا! یہ کہاں ہے؟" وہ نہیں جانتے کہ وہ اس خنداں ہستی کو بیابان اور کوہستان اور برف میں بلا تبدیل ہوئے نہیں لے جا سکتے۔ وہ نہیں جانتے کہ جو ان کے ساتھ ہے وہ وہی "مسرت" ہے، لیکن بڑھ گئی ہے۔ اب اس سنجیدہ، پیاری ہستی ــــ سرد ترین برف میں بھی گرم، اداس ترین بیابانوں میں دلبر ــــ کا نام "ہمدردی" ہے۔ اور یہی "کامل محبت" ہے!

(ترجمہ)

تمنائی

غزل

(جناب احقر مرحوم)

دیکھا کبھی نہ چشمِ تصوّر سے روئے دوست — ہم اپنے رازدار سے بھی بدگماں رہے

دونو اُسی کے گھر تھے حرم کیا کنشت کیا — دو دن یہاں رہے کبھی دو دن وہاں رہے

کرتے رہے وصال میں وہ ذکرِ غیر کا — ہم موسمِ بہار میں وقفِ خزاں رہے

اُردُو شاعری کے محاسن کا اعتراف

مادھوری ہندی کا موقر ماہنامہ ہے، لکھنؤ سے اشاعت پذیر ہوتا ہے، اس کا ایک پُرانا پرچہ میرے سامنے ہے جس میں "اردو شاعری میں اصلاح" کے عنوان سے ایک مضمون درج ہے۔ مضمون نگار برجموہن صاحب ورما ہیں جو معلوم ہوتا ہے اردو اور ہندی دونوں کی ادبیات سے شوق دلچسپی رکھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس مضمون میں دونوں زبانوں کی شاعری پر رائے زنی کی ہے اور ہندی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری کے محاسن کا صاف و صریح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

برجموہن صاحب ورما لکھتے ہیں :-

"عمر کے لحاظ سے شاندار دو زبان ہندوستان کی سب سے کمسن زبان ہے، آبحیات کے مصنف حضرت آزاد مرحوم اسے شاہجہانی بازار کا بچہ قرار دیتے ہیں، بعض اس کی پیدائش کا زمانہ چودھویں صدی بتاتے ہیں، اور ثبوت میں امیر خسرو کو پیش کرتے ہیں۔ بعض حضرات اردو کے علیحدہ زبان ہونے کے دعوے ہی کی تردید کرتے ہیں، ان کا قول ہے کہ اُردُو کوئی جداگانہ زبان نہیں ہے، فارسی آمیز ہندی ہی کو زبردستی اردو کا لقب بخش دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے اس قول میں صداقت کا ایک بہت بڑا حصہ موجود ہے۔ اردو دراصل ہندی ہی کی تبدیل شدہ شکل ہے لیکن اس حقیقت کا انکار بھی ناممکن ہے کہ موجودہ ہندی اور اردو میں کافی بعد ہوگیا ہے، بات یہ ہے کہ مسلمانی ہندی کو اردو کا نام ملنے کے بعد اس کا عروج کچھ ایسے نرالے ڈھنگ سے ہوا کہ صرف دو صدی کی قلیل مدت میں وہ ایک چھپاتی ہوئی لطیف زبان بن گئی"

"اگر اردو ڈھائی تین سو برس کی پُرانی ہے، تو ہندی ہزار سال سے زیادہ زمانے کی قدیم ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان میں خصوصاً شاعری کی زبان میں محاوروں کا استعمال جس کثرت اور خوبی سے ہوتا ہے۔ اس کی مثال ہماری ہزار سال کی پختہ ہندی میں کم ملے گی۔ اردو شاعری نے صاف ستھری اور منجھی ہوئی زبان کے اعتبار سے حیرت انگیز کمال کا اظہار کیا ہے، اردو شاعری کی ترقی فارسی شاعری کے لہجے پر ہوئی ہے، اس کا طور و طریق غیر ملکی ہے اس کے تخیلات پر غیر فطری جذبات کا سیاہ زنگ چڑھا ہوا ہے، اردو شاعروں کا معشوق خونریزی کے فن میں یکتا، پورا جلاد، اور بیچارے عاشق قطع و برید شدہ، لہولہان، بسمل اور نیم جان نظر آتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اردو شاعروں کی زبان میں ایک خاص کیفیت اور پختگی ہے، اس میں ایک عجیب روانی ہے، ایک انوکھا بانکپن ہے اور اردو شاعری کی عالمگیر ہر دلعزیزی کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے" ؂

مجھے اس سے بحث نہیں کہ از روئے جذبات و خیالات اردو شاعری فطری ہے یا غیر فطری اس کی تعریف و تردید ایک جداگانہ مسئلہ ہے، مجھے تو صرف یہ دکھانا ہے کہ ہندی کے ایک مضمون نگار نے ہندی کے مقابلے میں اردو زبان اور شاعری کے محاسن کا کس طرح اعتراف کیا ہے ؂

اس کے بعد برجموہن صاحب لکھتے ہیں :-

"اب آیئے اس بات پر غور کیجئے کہ اردو کی اس صفائی و پاکیزگی، اس نکھار اور زیب و زینت کا سبب کیا ہے؟ اتنی قلیل مدت میں اس نے یہ پختگی کیونکر حاصل کرلی؟ اس کے محاسن کا راز کیا ہے"؟

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو زبان کی ولادت دلّی میں ہوئی تھی۔ یعنی "مسلمانی ہندی" کو اردو کا خطاب دلّی ہی سے ملا، اس کا عروج دلّی اور اس کے آس پاس کے مقامات میں ہوا، اس لیئے اردو کے ماہروں اور اس کے بانیوں نے دلّی اور اس کے قرب و جوار کی بول چال کی ہی زبان کو سند قرار دیا

انہوں نے اس بات کا خاص لحاظ رکھا کہ صرف دلی کی بول چال کی زبان اور محاورے اردو میں جگہ پا سکیں، دوسرے صوبوں کے محاوروں اور مثلوں کے لئے انہوں نے اردو کے دروازے پر "نو ایڈمیشن" لکھ دیا۔ پھر بھی دکن کے تعلقات کے سبب بہت سے دکنی الفاظ اور محاورے زبردستی اردو کے گھر میں داخل ہو گئے، مگر اردو شاعروں نے ان مداخلت بیجا کرنے والے بغیر لائیسنس کے لفظوں کو اردو کے دائرے سے نکال باہر کر دیا +

دو چار بگڑے دماغ شاعروں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اردو دلی والوں کے سوا کسی کو آ ہی نہیں سکتی، آبحیات میں میر تقی میر کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایکبار قمر الدین خان منت میر کے پاس کچھ غزلیں بغرض اصلاح لے گئے میر صاحب نے ان کا وطن دریافت کیا، انہوں نے سونی پت بتایا - یہ سونی پت دلی کے قریب پانی پت کے پاس ایک مقام ہے اس پر میر صاحب نے فرمایا۔ جناب! اردو خاص دلی کی زبان ہے، آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجئے" +

اس نقطے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو والوں نے اپنی زبان کو درست رکھنے کے لئے کس سختی سے کام لیا ہے، اردو کے باغباں گاہ بگاہ اردو کے چمن کی قطع و برید کر کے اس کی اصلاح و درستی کرتے رہے ہیں سودا اور میر کے استاد خان آرزو کے تذکرے میں لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے اردو کے محاورے درست کئے، نئے محاوروں کو داخل کیا اور پرانے محاوروں کو جن کا رواج کم ہو گیا تھا، کاٹ چھانٹ کی، اس طرح اردو کی صفائی و پاکیزگی برابر ترقی کرتی گئی +

برجموہن صاحب دلی کی بربادی کے تذکرے کے بعد لکھنؤ کے متعلق لکھتے ہیں :-

" وہ زمانہ لکھنؤ کی ترقی کا تھا، اس زمانے میں لکھنؤ دولت و خوشحالی سے معمور تھا۔ وہاں دلی کے شعراء کا خیر مقدم ہوا، اس طرح اردو کی ترقی کا دوسرا مرکز لکھنؤ بن گیا۔ لکھنؤ والوں نے اردو کو اپنا ایک جداگانہ رنگ دیا اگرچہ دہلوی اردو اور لکھنوی اردو میں چنداں فرق نہیں ہے.......... پھر بھی دلی والوں نے اس کی مخالفت کی، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ اور دلی کی زبانوں میں زبردست رقابت پیدا ہو گئی۔ اس رقابت نے اردو کے چمکانے میں بہت مدد پہنچائی، لکھنؤ والوں نے زبان کو رنگین بنانے اور آراستہ و پیراستہ کرنے میں خاص تکلف سے کام لیا جس سے لکھنوی اردو سے سادگی معدوم ہو گئی، لیکن اس میں ایک خاص قسم کی مصنوعی نزاکت پیدا ہو گئی، اس طرح اردو کے دو جداجدا اسکول قائم ہو گئے اس وقت سے اب تک اردو کے جتنے اہل قلم یا شعراء پیدا ہوئے وہ اسی دو اسکولوں میں سے کسی نہ کسی کا دم بھرتے رہے، لیکن امتداد زمانہ نے اس اختلاف کو بھی تقریباً زائل کر دیا ہے، اس لئے اردو خواہ حیدر آباد کی ہو یا لاہور کی، کلکتے کی ہو یا بھوپال کی تقریباً ایک ہی سی ہے۔ اس میں صوبجاتی بو نہیں ہے، مقامی الفاظ کا عمل دخل نہیں " +

جس زبان کو برجموہن صاحب صاف و پاکیزہ، اسقدر منظم و منضبط، اسقدر با اصول، اسقدر اعلےٰ اور اسقدر عالمگیر یا ملک گیر قرار دے رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس زبان کو ان کے ہمقوم مٹا کر اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کے لئے کوشاں ہیں +

اس کے بعد برجموہن صاحب نے لکھا ہے :-

" یہ کہا جا چکا ہے کہ اردو شاعری کی زبان کا نکھار بہت صاف ہے اس میں زبان کی روانی، بندشوں کی چستی اور محاوروں کا استعمال دیکھنے کے قابل ہے، ان سب کا ایک خاص سبب ہے اردو شاعری کی استاد شاگرد کی رسم، اردو شاعری کے آغاز ہی سے اس کی نشو و نما استاد شاگرد کے سلسلے کے ساتھ ہوئی ہے، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں، کوئی کسی کو شاعر بنا نہیں سکتا، شاعری کی صلاحیت ایک قدرتی عطیہ ہے، جن کا رجحان طبع فطری طور پر شاعری کی جانب ہوتا ہے، جن کی طبیعت خاص طور پر اس کے لئے موزوں ہوتی ہے، وہی اور صرف وہی شاعر ہو سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ جن لوگوں میں یہ قدرتی اوصاف موجود ہیں۔ ان کی صلاحیت کو تھوڑی سی ٹریننگ، تھوڑی سی ترمیم اور اصلاح سے کئی گونہ روشن اور درخشاں بنایا جا سکتا ہے " +

اردو شاعری کی ترقی میں اس اصلاح نے بہت بڑا حصہ لیا ہے، اردو کے شاعر جس وقت سے کچھ شد بد کرنے لگتے ہیں، اسی وقت سے اچھے، ماہر فن شاعر کو اپنا استاد بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تصانیف کو استاد کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، جن میں استاد مناسب اصلاح و ترمیم کر دیا کرتے ہیں، شاگرد استاد کی اصلاحوں، ان کے بتائے ہوئے معائب اور ان کے دور کرنے کے طریقوں پر برابر غور کرتے رہتے ہیں، اس طرح ان کے کلام میں پختگی، زبان میں صفائی، بندشوں میں چستی، خیالات میں پرواز اور طرز انشاء میں خوبی پیدا ہو جاتی ہے +

یہ استاد اور شاگرد کا رواج اور اصلاح کا طریقہ اسقدر عام ہو گیا کہ اسے ایک ضابطے کی حیثیت حاصل ہو گئی، اس میں شک نہیں کہ غالب جیسے متعدد بلند پایہ شعراء کسی کے شاگرد نہ تھے۔ تاہم سودا، میر،

ذوق وغیرہ جیسے باکمال شاعروں نے استادوں سے تربیت پائی تھی۔

مشاعروں میں اساتذہ کے علاوہ جتنے جدید شاعروں کی تصانیف پڑھی جاتی تھیں۔ ان میں تقریباً ہر کلام پر کسی نہ کسی استاد کی تصدیقِ اصلاح ضرور ہوتی تھی۔ اس ضابطے کے اثر کا اندازہ آپ کو دہلی کے بادشاہ کے استادِ شاعری ذوق کی زندگی کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ذوق نے شروع میں شاہ نصیر کو اپنا استاد قرار دیا تھا۔ شاہ صاحب کے بیٹے بھی شعر کہتے تھے شاہ صاحب بیٹے کو بڑھانے کے لئے ذوق سے بے اعتنائی برت کر ان کی حوصلہ فرسائی کرنے لگے، اس پر ذوق نے ان کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ایک روز ایک جگہ مشاعرہ تھا، ذوق نے بھی غزل کہی تھی، وہ بےچین ہوکر گھر سے نکلے اور شام ہوتے ہوتے جامع جا پہنچے! اتفاق سے وہیں میر کلّو حقیر بیٹھے ہوئے ملے، انہوں نے دیکھتے ہی پوچھا۔ کیوں بھئی! اداس کیوں کیوں ہو؟ خیریت تو ہے؟

ذوق نے اپنی داستان کہہ سنائی، میر صاحب نے کہا، ذرا اپنی غزل مجھے بھی سناؤ۔ ذوق نے غزل کہی، حقیر نے غزل کو پسند کرکے کہا جاؤ مطمئن ہو کر مشاعرے میں غزل سناؤ کوئی اعتراض کریگا تو میں نپٹ لونگا۔

ذوق نے مشاعرے میں غزل پڑھی جس کی بہت تعریف ہوئی۔

اس واقعہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اُردو شاعری میں اصلاح کو کسقدر اہمیت حاصل ہے، دوسری بات یہ کہ اس زمانے میں مہمل اور بے سر و پا کلام پر مشاعروں ہی میں اعتراض کر دیا کرتے تھے، ان سب کا حاصل آپ کو اردو شاعری کی زبان کی صفائی محاوروں کے استعمال اور درستی و پاکیزگی میں ملے گا۔

اس استادی شاگردی کے رواج کی بدولت بہت سے اکابر شعراء کے شاعری کے خاندان بن گئے، آج آپ کو اردو کے بیسیوں شاعر ایسے ملینگے جن کا سلسلۂ تلمذ میر، سودا، خانِ آرزو وغیرہ تک پہنچتا ہے، معمولی شاعروں کے لئے کسی بڑے استاد کی شاگردی کی سند کسی "سرٹیفکیٹ آف آنر" سے کم نہیں سمجھی جاتی، ساتھ ہی بہت سے استاد بھی ایسے خوش قسمت ہیں جن کے شاگردوں نے اپنے کمال سے اپنے نام کے ساتھ اپنے استاد کے نام کو بھی روشن کیا ہے۔

اردو استادوں کے شاگرد صرف ان کا نام ہی قائم نہ رکھتے تھے۔ بلکہ ایک حد تک ان کی شاعری کا رنگ بھی قائم رکھتے تھے، کیونکہ برسوں تک استاد سے اصلاح لیتے رہنے کے سبب ان کی شاعری پر استاد کا کافی رنگ چڑھ جاتا تھا۔

افسوس ہے کہ ہماری ہندی دنیائے شاعری میں اس استادی شاگردی کے طریقے کا قطعی فقدان رہا ہے، اردو کے چھوٹے چھوٹے استاد بھی ہونے کے بعد سینکڑوں شاگرد چھوڑ جاتے ہیں جو ہمیشہ ان کا دم بھرتے ہیں مگر ہندی کے بڑے سے بڑے شاعروں کی موت کے بعد کوئی ان کا نام لینے والا بھی باقی نہیں رہتا، پرانے زمانے کی بات جانے دیجئے، ابھی حال ہی میں پنڈت سری گردھر پاٹھک اور پنڈت ست نارائن جیسے درخشاں ستارے ہمارے آسمانِ شاعری پر غروب ہو گئے، مگر افسوس کہ ان کا نام زندہ رکھنے والا ان کا ایک شاگرد بھی نہیں ہے، ان کی شاعری کا رنگ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گیا۔

ہندی میں اس استاد شاگرد کے رواج کے فقدان کے باعث ہماری شاعری کی زبان میں کافی صفائی بھی پیدا نہ ہو سکی، بالعموم ہر شخص خود پسندانہ زبان اور الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ آجکل شاعری کی زبان کھڑی بولی ہو گئی ہے۔ مگر اس کھڑی بولی میں بھی مطلق العنانی و بے سر و پائی کا وہ زور ہے جس کی انتہا نہیں، بیشمار خود رو شاعر اپنی اپنی من مانی کر رہے ہیں، کوئی سنسکرت کے ثقیل اور نامانوس الفاظ جمع کر دینے کو شاعری سمجھ رہا ہے تو کوئی دو قافیوں کی چول بٹھا کر ملک الشعراء بن رہا ہے، کوئی تُک بندی کا بھی روادار نہیں، بے تُکی ہی الاپ رہا ہے اوزان و بحور سے بے نیاز ہو کر بے بحری کی اڑا رہا ہے دنیائے شاعری کی اس مطلق العنانی و خود سری کے باعث زبان کی صفائی و درستگی تو کیا ہوتی، اور اس کی مٹی پلید ہو رہی ہے، بیچاری زبان اپنی زبانِ بے زبانی سے بہت کچھ شور و فغاں کرتی ہے مگر کوئی سننے والا نہیں، کچھ لوگ ہندی کے سیدھے سادے مذکر الفاظ کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر بنانے میں مشغول ہیں۔

کسی طرح کی نگرانی اور بندش نہ رہنے کی وجہ سے آجکل بے وزن و بے قافیہ کی شاعری کے ساتھ بے معنی کی شاعری کا بھی رواج سا ہو گیا ہے کچھ لوگ محض الفاظ سے معمور مہمل کلام ہی کو کمالِ فن کا نمونہ سمجھتے ہیں مشاعروں کے اجتماعات میں بھی ایسے کلام پڑھے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایکبار ایک مشاعرے میں اردو کے شاعرِ اعظم مرزا غالب کے دقیق کلام کے متعلق حکیم آغا جان نے یہ اشعار پڑھے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا تب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

کہتے ہیں کہ اس کے بعد غالب نے اپنا کلام آسان کردیا۔ مگر آجکل ہماری ہندی شاعری میں بکثرت ایسے کلام ملینگے۔ جن کے مصنف فخر یہ کہہ سکتے ہیں ؎

بھلا وہ بھی کوئی کہتا ہے جس کو سن لیا سمجھے
نہیں ہے آرٹ کچھ اس میں جسے ہر بے پڑھا سمجھے

اس نئے زمانے کی ہندی دنیا میں اصلاح اور استادی شاگردی کے رواج کی آواز کون بلند کرسکتا ہے؟ یار لوگ تو تلسی داس کی غلطیاں نکال رہے ہیں۔ کیشو داس کو کسی حیثیت سے بھی شاعروں کی صف میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں، اور سینہاری کے گیتوں کے مقابلے میں بابا بالمیک اور کالیداس کو چیلنج دیتے پھرتے ہیں۔ پھر بھلا کرۂ ارض پر ایسا کونسا شخص پیدا ہوا ہے جسے وہ استاد تسلیم کرسکیں .... ؟

اندریں صورت زبان میں صفائی کہاں سے آئے؟ شستگی و روانی کیسے پیدا ہو؟ محاوروں کے نگینے کیسے بیٹھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف شعراء کی زبان میں یکسانی و یکرنگی موجود نہیں ہے، ہمارے اکابر ادبا نے دنیائے ادب میں قدم رکھتے وقت جو غلطیاں کی تھیں، آج بیس پچیس برس کی مشق و مہارت کے بعد بھی وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔

یہ ہے ہندی اور اردو شاعری کی نسبت، ہندی کے ایک اہل قلم کی رائے، اور یہ ہے ہندی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری کی زبان بندش، استعمال محاورات اور دوسرے محاسن کا اعتراف ◆

ابو محمد امام الدین

غزل

ذوقِ تپش بھی خام ہے درد بھی ناتمام ہے
مبدءٔ سوز و ساز کیا عشق اسی کا نام ہے؟

رُوح میں جاگزیں تو ہے، دور سہی کہیں تو ہے
اس کی پیامبر مری کوشش ناتمام ہے

مَیں نے تجھے خدا کہا، تو نے مجھے بُرا کہا
میرا گناہ خاص ہے، تیرا گناہ عام ہے

بیت گئیں جوانیاں، بھول گئیں کہانیاں
میرے لبوں پہ آج تک نالۂ ناتمام ہے

یہ میری اشکباریاں، یہ میری بیقراریاں
تیرے بغیر زندگی، میرے لئے حرام ہے

وقت کہیں چلا گیا۔ دَور کئی گزر گئے
سینۂ کربلا مگر۔ آج بھی لالہ فام ہے

ڈوبتے چاند کے قریب کانپ رہا ہے اک شرر
چیخ کے کہہ رہا ہے دل، یہ بھی نیا پیام ہے

عرش سے اُس طرف کہیں، نُور کی کہر میں ندیم
میرا وہیں مقام تھا۔ میرا وہیں مقام ہے

احمد ندیم قاسمی

نورجہاں

دیر سے تاریک و افسردہ تھی بزمِ حسن و عشق ہو چکی تقویم پارینہ تھی نظمِ حسن و عشق
سازِ اُلفت تشنہ و بیگانۂ مضراب تھا بحرِ زخّارِ محبت خشک تھا۔ پایاب تھا
دیکھتا تھا دل رہِ غارت گرِ ایمان و ہوش آفتِ جاں کے لئے خود جان تھی صرفِ خروش
بربطِ عشّاق تھا بے نغمۂ ناز و نیاز عشق کہتے ہیں کسے؟ تھا اک معمّہ ایک راز
ساقی و مطرب کی تھیں بے کیف سب رنگینیاں غم زدہ مے تھی نہ فرحت زا ترنم ریزیاں
نغمۂ سازِ محبّت! یعنی اے مہرالنسار تُو نے آکر آتشِ افسردہ کو بھڑکا دیا

عشق کی بیجان قالب کو ملی تازہ حیات
بھر گئی جذباتِ اُلفت سے فضائے کائنات

اے کتابِ حُسن! اے سرنامۂ تحریرِ عشق! شرح و تفصیلِ محبّت! معنی و تفسیرِ عشق
حکمرانِ کشورِ دل! فاتحِ ملکِ دماغ تاجِ اکبر کی ضیا! مشکوئے بابر کے چراغ
ہو گئی تیری مکاتب دہر میں ضرب المثل مرحبا! آنے نہ پایا تیری عفّت میں خلل
حیرت افزا ہے تری دوشیزگی و بیوگی کعبۂ دل میں شہنشاہی کی کچھ وقعت نہ تھی
وہ شباب و حسن اور وہ عیش سامانی تیری فخر کے قابل ہے بیگم! پاک دامانی تیری
قلعۂ فولاد تھا کوئی کہ یہ تیرا ضمیر پا سکی جس پر نہ قابو رفعتِ تاج و سریر
گر تری عصمت سرا میں آیا پیغامِ وصال آنکھ بدلی۔ چڑھ گئی تیوری۔ ہوئی غصّہ میں لال
جب حقارت سے ہوس کو رد کیا ٹھکرا دیا تاجِ شاہی سے تیری نعلین کو سجدہ کیا
عزّتِ ایران! اے نورجہاں! اے بنتِ غیاث تیرا ضبطِ نفس و عفّت رفعتِ قدرِ اناث
رُوپ دیوی! خوبیاں اس درجہ عورت ذات میں جان تھی لفظوں میں تیرے رُوح تیری بات میں

امتحان ایسا زبیدہ کو نہ تھا دینا پڑا　　چاند بی بی پر تھی یہ مشکل نہ وقت اتنا پڑا

گو رضیہ نے دکھائے خوب مردانہ ہنر　　معترض تاریخ ہے اس کے مگر اخلاق پر

قصۂ شیریں بھی گویا اک افسانہ ہو گیا　　تیرا اے بیگم وہ پُر معنی فسانہ ہو گیا

راکھ ہو جانا چتا میں سہل ہے آسان ہے　　زندہ رہ کر جو رہے ثابت قدم۔ انسان ہے

شاہ بیگم ہو کے بھی تو فرض سے غافل نہ تھی　　خدمتِ ملک و تمدن کچھ نہ کچھ کرتی رہی

ہاں بھرا کی شیشۂ ہندی میں ایرانی شراب　　تیری جو ایجاد تھی بے مثل تھی اور لاجواب

تُو نے اپنے ہاتھ سے کھولیں سیاسی گُتھیاں　　منحصر تھا تیری خوش تدبیر پر امن و اماں

شہرۂ آفاق ہے وہ کار آگاہی تیری

وہ جہانگیری تری وہ سطوتِ شاہی تیری

زندۂ جاوید بیگم آج تیری قبر پر　　حسرتیں ہیں مرثیہ خواں اور عبرت نوحہ گر

وہ جہانداری نہیں ہے اور وہ شاہی نہیں　　وہ جہانگیری نہیں۔ دارائی جم جاہی نہیں

سطوتِ تیمور و بابر سطوتِ اکبر مٹی　　لُٹ گئی وہ حشمت و شانِ رایت و افسر مٹی

آہ اے مہرالنساء شمعِ شبستانِ نشاط!　　انقلابِ دہر نے اوندی الٹ دی وہ بساط

اے غریب و بے سر و سامان بیگم! آہ! آہ!　　آج ہے بے حاجب و دربان تیری خوابگاہ

اجنبی کو روکنے والا یہاں کوئی نہیں　　سونے والی! تیری عظمت کا نشاں کوئی نہیں

ڈھیر مٹی کا بلا جاروب ہے اور بے چراغ　　مرثیہ خوانی کیا کرتے ہیں جس پر بوم و زاغ

ہوں گے یوں تو اور بھی ویرانے اور عزت کدے　　پر بہ حسرت کہہ رہے ہیں ذرے تیری خاک کے

"برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گُلے

نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبُلے"

واسطی (مرحوم)

(مرسلہ سید افضال شاہ آبادی)

صفحۂ اطفال

چوہوں کا سوراج

(سلسلہ کے لئے پچھلے نمبر سے ملا کر پڑھو)

ایک چوہیا:۔ اوئی کیا بلا تھی۔ چودھری کو یہ کیا چھیڑ سوجھی ہے۔ یہ کیا کیا۔ بھائی آپ نے ابھی تو روشنی بھی نہیں آئی؟

فجا:۔ بھابی! آنکھیں بند کرلے "ہوحق" کئے جا۔ اب آئی روشنی۔ ان کی مت سن! یہ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ اپنے ساتھ تمہارا ہمارا وظیفہ بھی خراب کر دیا۔

چودھری:۔ بھابی! اپنے میاں کی آنکھیں کھلواؤ۔ بڑا دھوکا ہوا۔ چجن بڑی ڈائن نکلی۔

چوہیوں نے جو چجن کی طرف نگاہ اٹھائی تو ششدر رہ گئیں۔ اللہ، چیخنے چلانے۔

چوہیاں:۔ ہائے ہائے میرے بچے؟ اے چودھری یہ کیا ہو رہا ہے؟

فجا:۔ بھابی روشنی آرہی ہے۔ ہوحق کئے جا رہے ہیں بچے وہ تو اللہ جنت نصیب کرے کبھی کی روشنی دیکھ چکے۔

مسیتا:۔ بھابی۔ بچوں کی پھر خبر لینا! کسی طرح ہوحق کرنے والوں کی آنکھیں کھلواؤ۔

دوسری چوہیا:۔ (اپنے خاوند سے) اے اللہ دی کے باپ ارے ہوحق کر رہے ہو۔ ساری برادری پر وقت پڑ رہا ہے آنکھیں کھولو! اللہ اس جیونا کا ستیا ناس کرے۔ مراثی نے ہمیں بھی موت کے منہ لا ڈالا۔ کہاں ہے یہ اجڑا؟

فجا:۔ روشنی دیکھنے گیا ہے۔ ہم تم بھی وہیں جانے والے ہیں بھابی۔ اب آئی روشنی ہوحق کئے جاؤ۔ آسمان سے روشنی چل پڑی ہے۔ کوئی دم میں دماغوں کو چڑھنے والی ہے۔

چوہیا:۔ اوئی بھیا! خاک پڑو تمہیں اب بھی دل لگی سوجھی ہے۔ موت سر پر کھڑی ہے۔ کیسے کیسے سورما اس موت لی کے سر صدقے ہو چکے۔ ارے میرے بچے کہاں ہیں؟

فجا:۔ جیونا کے ساتھ روشنی دیکھنے گئے ہیں بھابی جان!

چودھری:۔ بھابی اسے بکنے دو!

سب مل کر ڈوری کھینچو کہ ان کی آنکھیں کھلیں۔

لو لگاؤ زور۔

سب نے زور لگایا۔ تو دس گیارہ چوہے چوہیاں چوٹ کھا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

ایک چوہا:۔ ایں..... یہ کیا ہو رہا ہے؟

فجا:۔ روشنی ہو رہی ہے "ہوحق" کئے جاؤ!

چودھری:۔ ہو کیا رہا ہے۔ برادری حلال کی جا رہی ہے سب مل کر باقیوں کی آنکھیں کھلواؤ۔

سب نے پھر زور لگایا۔ تو بہت سے چوہے منہ کے بل آ رہے۔ اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

چودھری:۔ بھائیو! دھوکا، فریب، جگن نے پچاسوں چوہا کاٹ ڈالا۔ زندگی پیاری ہے۔ تو ڈوری مل کر کھینچو! اور مل کر شور مچاؤ کہ آنکھیں کھولو! "جگن ڈائن نے مار ڈالا"

چوہوں نے جگن کے کرتب دیکھے تو رونے چلانے لگے۔

چودھری:۔ رونے چلانے سے کچھ نہ ہوگا۔ مل کر ڈوری کھینچو اور باقیوں کی آنکھیں کھلواؤ!

یہ سن کر سب نے زور لگایا۔ اور کہا جگن ڈائن نے مار ڈالا! اس دفعہ سارے چوہے چوہیاں ایک دوسرے گر پڑے! اور "جگن ڈائن نے مار ڈالا" کا نعرہ سنا۔ تو سب نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلیں تو یہ خونی تماشا دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چوہیوں نے سینے پیٹنے شروع کر دئے۔ ہائے میرے بچے؟ کا غلغلہ بلند ہوا۔

کوئی کہتی "اری اے بھابی دیکھ رہی ہو؟ قیامت برپا ہے۔ ارے کہاں ہیں منشی کے باپ۔ اے منشی کے ابا! کہاں ہو تم؟ ہائے میرے بچے؟

اے جیونا تو اتنا ہی غارت ہو جائے۔ ہتیئے! ہمیں بھی موت کے گھاٹ کھینچ لایا۔

کوئی پکارتی۔ ارے کدھر گئے پیرو کے دولھا بھائی! ہائے میرے اللہ! کیسی جان پر بن گئی؟" اجی تم کہاں ہو بولو تو۔ مجھے تو سوجھتا نہیں کچھ۔

ارے پیرو کے دولھا بھائی! اری کہاں ڈھونڈوں؟ اے کلو کی اماں! دیکھتی نہیں ہو! یہ کیا قیامت آ رہی ہے؟

فجا:۔ قیامت نہیں بھابی روشنی آ رہی ہے؟

چوہیا:۔ اے فجا بھائی وہ کہاں گئے؟

فجا:۔ بھابی! روشنی دیکھنے۔

چوہیا:۔ ارے کیسی روشنی دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔

فجا:۔ وہ جو دل سے اٹھ کر دماغ کو چڑھے گی وہ روشنی! بتاتا نہیں ابھی جگن خالہ نے ہوحق کئے جاؤ۔ آنکھیں بند کر لو۔

چوہیا:۔ جھاڑو پھرے بھیا تمہارے مذاق پر۔ پھانسی کے تختے پر بھی ہنسی دل لگی نہ گئی تمہاری۔

ارے میری بچی کہاں ہے لوگو! میں لٹ گئی۔

فجا:۔ جیونا بھائی کے ساتھ روشنی دیکھنے گئی ہے۔

چوہیا:۔ دور ہو کلموئے!

چودھری:۔ بھائی گھبراؤ مت۔ جو بچ رہیں گے۔ سب مل جائیں گے۔ اس وقت اس بلا سے مخلصی کسی طرح مل جائے۔ اللہ سے رحم کی دعا مانگو!

آخر چودھری نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔

چوہا برادری کے ممبرو! وقت کم ہے۔ موت سامنے ہے۔ بہت سے بھائی بہن حلال ہو چکے ہیں۔ اب یہ کرو!

جی کڑا کر کے اس ڈائن پر مل کر حملہ کر دو! دیکھو اپنے اوسان قائم رکھو! اور حوصلہ کر کے بڑھو آگے۔

یہ سننا تھا کہ ساری برادری جمن پر ٹوٹ پڑی۔ جمن نے جو دیکھا کہ ہوحق کے نعرے ختم ہو کر حملے کی پکار ہو رہی ہے۔ سنبھل بیٹھی!

چوہا برادری آگے بڑھی تو۔ مگر بلی اور چوہے کا بیر مشہور ہے۔ چوہے دو سو ہوئے یا تین سو آخر چوہے ہیں۔ بلی کی خوراک۔ شروع سے چوہیا مائیں بی مانو سے ڈراتی رہی ہیں۔ دلوں پر بلی کا رعب عمر بھر کا گھڑی بھر میں کیسے دور ہو سکتا ہے؟ اس کے قریب جا کر یہ یلغار رک گئی۔

پیارے بھائیو! اور بہنو! یہ وقت سرگوشیوں اور سازشوں کا نہیں ہے۔ ہم نے ذرا اور دیر کی تو یہ حبشی بلا ایک ایک کر کے ہمیں توڑ لے گی۔ مانا کہ اس کے پنجے سنگینوں کی طرح تیز ہیں۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں جھڑ رہی ہیں۔ اس کے پنجے توپ کا کام دے رہے ہیں۔ اس کا جھپٹا فولادی ٹینک سے کم نہیں۔ اس کی "میاؤں" توپ کی گرج سے زیادہ ہے۔ مگر حوصلے اور ہمت کے سامنے اس کے سب ہتھیار بیکار ہو جائیں گے۔ ہم میں پھوٹ پڑ گئی تو یہ اس کا فائدہ اٹھا کر ایک ایک کو موت کے حوالے کر دے گی۔

بھائیو! اتفاق، اتفاق، اتفاق، سب مل کر ایک ساتھ دھاوا بول دو! موت برحق ہے۔ ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی مگر ذلت کی موت سے مرنا چوہوں کا کام نہیں۔ عزت کی موت مرو! کہ ہماری قوم ہم پر فخر کرے۔" جان صدقہ آبرو ہے اپنی قوم عزت پر قربان ہو جاؤ!

نواب قمر جاہ کے گھر کے چودھری چوہے نے اپنے ساتھیوں سے کہا!

بھائیو! سردار چودھری ہمیں گھیر گھار کر موت کے منہ میں لے جا رہا ہے۔ جمن خالہ ہزار اکیلی سہی۔ مگر آخر بلی ہے۔ چوہے کیسے ہی جیالے ہوں۔ تعداد میں کتنے ہی ہوں۔ پھر چوہے ہیں۔ بلی سے بازی نہیں لے جا سکتے۔ آنکھوں دیکھتے آگ میں مت کود و! اسے خدا نے بلی بنایا ہے بلی۔ ہمارے اگلوں نے بھی سنا ہے۔ بلی کے گلے میں گھنٹی ڈالنے کے لئے اس وقت کی برادری کو اکٹھا کیا تھا۔ پنچایت ہوئی اور اس میں چودھری جیسے بے وقوف بہادروں نے بڑے ڈون کی لی۔ کہ ہم بلی کے گلے میں گھنٹی ضرور ڈال دیں گے۔ بلی کی مجال کیا ہے۔ جو ہمارے سامنے دم مارے۔ ہماری فوج کو دیکھ ہی کر وہ گردن نیچے ڈال دے گی۔"

ان ناتجربہ کار نوجوانوں کی شوشاں نے بہت سے چوہوں کو ان کا ہم خیال بھی بنا دیا۔ آخر ایک تجربہ کار بوڑھے سردار چوہے سے جب رائے لی گئی۔ تو اس نے کہا کہ بھائیو! تمہاری بہادری مبارک ہے۔ تم ایسا ضرور کر سکتے ہو۔ مگر مجھے یہ تو بتاؤ جب بلی آئے گی تو اس کی "میاؤں" کو کون پکڑے گا" بوڑھے کی یہ چچی تلی بات سن کر سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

تو بھائیو! خدا نے جسے حکومت بخشی ہے۔ آقائی دی ہے۔ اس کا مقابلہ نادانی کی نشانی ہے۔ بابا ہم تو جان بوجھ کر اس اندھیرے کنوئیں میں گرنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں لڑنے دو۔ یہ تو ہاتھی کے ساتھ گنّے کھانے چلے ہیں۔ ہماری ٹولی الگ رہے گی۔ ہم چھچھن خالہ سے ہاتھ جوڑ کر کہہ دیں گے۔ کہ ہم تمہارے وفادار ہیں۔ وہ ان لوگوں کی سرکشی کے مقابلے میں ہماری وفاداری دیکھ کر ضرور پسیجے گی اور یقین ہے۔ کہ ہماری جان بخشی کر دے گی۔"

راجہ بھانند کے گھر کے چوہوں نے الگ مسکوٹ کی۔ ان کا چودھری انہیں سمجھانے لگا کہ

"بھائیو! نواب صاحب کے چوہوں نے تو چھچھن خالہ سے ساز باز کر کے اپنی جان چھڑانے کی صلاح کر لی ہے۔ پھر ہم کیا گھر سے فالتو ہیں۔ برادری گئی جہنم میں۔ دوسروں کے پیچھے ہم کیوں جان جوکھوں میں ڈالیں؟ چلو نوابی چوہوں سے پہلے ہی چھچھن کے پاس وفد بنا کر چلیں۔ اپنی سچی جان نثاری اور نوابی چوہوں کی نمائشی وفاداری کا یقین دلا کر چھچھن کے رحم و کرم کے حصہ دار بن جائیں۔"

بڑے چودھری کو جو معلوم ہوا کہ چوہا برادری میں پھوٹ ڈالی جا رہی ہے اور فرقہ داری کی نحوست برادری کے بعض رہنماؤں پر طاری ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ ذاتی غرض اور اپنے مطلب کے لئے انہوں نے فرقہ داری کی وبا پھیلا دی۔ تو آج چھچھن کے پو بارے ہیں۔ وہ چھوڑے گی تو کسی کو بھی نہیں۔ مگر یہ فرقہ پرست چودھری ساری برادری کو موت کے منہ میں جھونک دیں گے۔" یہ سوچتے ہی سردار چودھری نے للکارا۔ کہ نوجوانو! کیا دیکھ رہے ہو؟ کیسی سرگوشیاں ہیں؟ سمجھ رکھو کہ یہ ڈائن ایک ایک کو لقمہ بنا لے گی۔ کسی کو نہ چھوڑے گی۔ اس سے رحم کی امید رکھنا بڑی حماقت ہے۔

یاد رکھو! اگلی چوہا برادریوں کی بربادی کا باعث ان کی بے اتفاقی تھی۔ ذاتی فائدے پر برادری بھر کے مفاد کو قربان کرنا تمہیں بڑا مہنگا پڑے گا۔ یہ بلا کسی کو نہ چھوڑے گی۔ اس کے وفادار بھی اس کی خوراک بنیں گے۔ اور جو اس سے بگاڑیں گے وہ بھی اتفاق کے بغیر اپنا کچھ نہ بنائیں گے۔

دوستو! اگر اس وقت اتفاق سے کام نہ لیا گیا۔ تو یہ گھر سب کا قبرستان بن جائے گا۔ فرقہ داری کے برابر کوئی خود غرضی نہیں۔ یہ لعنت ہندوستانی انسانوں ہی کو مبارک رہے۔ ان کے گھروں میں رہنے سہنے سے چوہا برادری میں بھی فرقہ داری کی ہوا چلنے لگی۔ اس سے زیادہ ہماری برادری کے لئے اور کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی۔

بھائیو! چوہا آزاد پیدا ہوتا ہے۔ آزادی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور آزاد ہی مرنا چاہتا ہے۔ ہمیں غلامی کی موت چاہیئے نہ زندگی۔ ہم اپنے قومی کھیت میں پھوٹ کی بیل کو پھلنے پھولنے نہیں دیں گے۔

چوہے بھائیو! برادری کے نفع و نقصان کو اپنا نفع و نقصان خیال کرو۔ دنیا میں عزت سے رہو گے۔ دوسری برادریاں

تمہاری عزت کریں گی۔ اور اگر ذاتی غرض کے تم بندے بنے
رہے تو پھر تمہاری برادری صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔
اور تم پر آنے والی نسلیں لعنت بھیجیں گی۔ نکال دو دماغ سے
غلامی کی ذہنیت۔ غلام کی دنیا میں کہیں عزت نہیں۔ غلامی کی
رسم انسان کی ایجاد ہے۔ چوہوں کی نسل میں کبھی کوئی غلام پیدا
نہیں ہوا۔ نہ آئندہ پیدا ہوگا۔ غلام گھروں کے بُرے خیالات
کو دماغوں میں جگہ نہ دو! نواب قمر جاہ اور راجہ پرماتند خود بھی
دوسروں کے غلام ہیں۔ اور اپنے محلوں میں بھی باندی غلام
بنا رکھے ہیں۔ ان کی چال کی پیروی نہ کرو!

جو چوہے تمہیں یہ بتاتے ہیں۔ کہ بلی ہماری آقا اور بادشاہ
ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے بادشاہ کا وفادار رہنا چاہیئے۔"
وہ چوہے خود بھی دھوکے میں ہیں۔ اور تمہیں بھی فریب دینا
چاہتے ہیں۔ بھلا بلی ہماری بادشاہ کیسے ہوسکتی ہے۔ وہ اور
جنس ہم اور۔ وہ بادشاہ ہوگی تو بلیوں کی ہوگی۔ چوہوں کی
بادشاہ بلی ہرگز نہیں ہوسکتی۔

بھائیو! بلی ہماری نہ حاکم، نہ آقا، نہ بادشاہ۔ وہ تو ہماری
برادری کی موت ہے۔ جب سے دنیا قائم ہے۔ بلی اور
چوہے میں دشمنی چلی آتی ہے۔ کبھی کسی بلی نے کسی چوہے پر
رحم نہیں کھایا ہے۔ ہمارا بادشاہ خدا اسے سلامت رکھے۔
چوہا برادری کا سب سے بڑا سردار ہز میجسٹی کا لو چوہا ہے۔
اپنے بادشاہ کے ہم وفادار ہیں۔ جو چوہا بلی کو اپنا بادشاہ مانتا
ہے وہ چوہا نہیں شیطان ہے۔ برادری کا غدار ہے۔ ہم
بلی کو کبھی بادشاہ نہیں مان سکتے۔ انسانوں کا بادشاہ انسان۔
بلیوں کی بادشاہ بلی۔ بندروں کا حاکم بندر۔ اسی طرح چوہوں کا
بادشاہ چوہا ہی ہوگا۔ چوہا ہی ہوسکتا ہے۔ بلی چوہوں کی حکمران
کیسے ہوسکتی ہے۔ کبھی نہیں۔ بلی نامراد تو چوہا برادری کی موت
ہے۔ تم خدا کا نام لے کر ٹوٹ پڑو اس پر۔ اس وقت حوصلہ ہار
بیٹھے تو موت سے پھر بھی نہیں بچو گے!

پیارو! اس طرح جان دو! کہ تمہاری موت تمہاری آنے
والی نسلوں کو بہادر بنادے۔ دماغ سے غلامی اور بزدلی کے
خیالات نکال دو۔ آج تخت ہے یا تختہ۔ بچ گئے تو برادری
ہمیشہ کے لئے اس مصیبت سے آزاد ہوجائے گی۔ مرگئے۔
تو قومی آن پر مرمٹنے والوں میں شمار ہوں گے۔

اُٹھو، بڑھو! میرے نوجوانو! چلو! جان کا کھیل ہے۔
جان پر کھیل کر دکھا دو۔ یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

تمہارے بھائی بہنوں، ماں باپ کی یہ لاشیں تمہیں پکار
پکار کر کہہ رہی ہیں کہ "ہمارا خون رائگاں نہ کرو۔" اٹھو قومی
آن پر مرمٹنے والے بہادرو! بڑھو! ایک ساتھ حملہ کردو۔
یقین کرو کہ خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔"

چودھری کی یہ ولولہ انگیز تقریر جادو کا کام کرگئی۔ چوہوں
میں شیروں کی سی بہادری پیدا ہوگئی۔ نوجوان چوہوں نے
"چوہا برادری کی جے" کے نعرے لگاتے ہوئے چمّن خالہ کو
جا پکڑا۔ اور پھر تو۔ تو چل میں آیا۔ ساری برادری یلغار کر کے
ٹوٹ پڑی۔ چمّن بھی ان کے تیور بھانپ کر نوک پنجے سے

یس ہوگئی تھی۔ ایک ہی جھپٹے میں پانچ سات کی گردنیں مروڑ ڈالیں۔ مگر چودھری کی تقریر نے چوہوں کی رگوں میں بجلیاں بھردی تھیں۔ انہوں نے جان کی مطلق پروا نہ کی اور لپٹ پڑے خالہ کو۔ دس بیس دُم کو لپٹ گئے۔ کچھ پیٹ کو جا چمٹے۔ اور کاٹ کاٹ کے لہو لہان کر دیا۔ اب تو جمن کو بھی تارے نظر آنے لگے۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ چودھری نے اس کی گھبراہٹ سے فائدہ اٹھایا اور اللہ کا نام لیتے ہوئے اچھل کر جو ٹھونگی ماری تو آنکھ پر بیٹھی۔ پھر کیا تھا، بلبلا اٹھیں جمن خالہ۔ ایک پنجے سے آنکھ کو ملنے لگیں۔ ادھر سیتا چوہا داؤں لگائے ہوئے تھا۔ اچھلا اور دوسری آنکھ کا پوٹا ادھیڑ لایا۔ اب تو جمن کو ایک ایک کے دو دو دکھائی دینے لگے اور تو کچھ سوجھا نہیں۔ چیختی چلاتی پتہ توڑ بھاگی۔ اسے بھاگتے دیکھا تو

"چوہا برادری کی جے"

سے مکان گونج گیا۔

چودھری بولا:۔ کھڑی تو رہ چڑیل! بھاگتی کہاں ہے۔ آج عمر بھر کا بدلہ لینا ہے تجھ سے! تو بھی کیا یاد کرے گی۔ کسی قوم سے پالا پڑا تھا۔ چوہے کھا کھا کے بہت ہل گئی تھی ڈائن! آج سب چوہے تجھ سے اُگلوانے ہیں۔ چوہوں نے ہاتھ بندھے بندھے دور تک پیچھا کیا۔ جمن کی آنکھیں تو پھٹ ہو ہی چکی تھیں۔ چوہوں کی آہٹ کو سٹے پر سُنی تو دوسری چھت پر کودنے کے لئے چھلانگ لگا بیٹھی۔ بُری گھڑی سر پہ آ چکی تھی۔ چھلانگ لگائی۔ اوچھی۔ پاؤں دوسری چھت کی منڈیر پر جم نہ سکا۔ تیسری منزل سے دھڑام سے سڑک پر آ گری۔ سڑک کا کھڑنجا نیا نیا لگا تھا۔ گرتے ہی چکنا چور ہو گئی۔ چوہوں نے اس غیر معمولی فتح پر دیوانہ وار

"چوہا برادری کی جے"

کے دیر تک نعرے لگائے۔ جب تھک گئے تو چودھری نے کہا کہ اب اپنی اپنی ڈوری کتر دو! تاکہ ان قومی فدائیوں کو آخری منزل تک پہنچا دیں۔ چنانچہ سب نے اپنی اپنی ڈوری کترنی شروع کی۔ بچوں کی ڈوری ماؤں نے کتری۔ اور اس طرح اس آفت ناگہانی سے آزادی حاصل کی۔ سب آزاد ہو چکے تو مرے ہوئے چوہوں کے سر جمع کر کے جینا مرحوم کے بل میں دفن کئے۔ اور اس بل کا نام شہید منزل رکھا۔ شہید منزل کے کتبے پر یہ فقرہ لکھوایا گیا:۔

"یہاں چوہا برادری کے وہ سورما ہیں جنہوں
نے قومی آن پر اپنی جان قربان کی ہے۔"

تاجور

ایڈیٹر
پروفیسر تاجور

ادارہ:-
خواجہ محمود جاوید ایم-اے
سید عبدالرشید یزدانی جالندھری
میرزا ادیب بی-اے

شاہکار

بابت ماہ فروری ۱۹۳۷ء

جلد ۴ نمبر ۵

فہرست

تصاویر:- (سہ رنگی) :- فرصت گفتگو۔
(یک رنگی) :- پہلا سبق - بت سازہ عورت - وینس اور کیوپڈ

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

آنریبل وزیر تعلیم پنجاب کے لئے

خوش قسمتی سے پنجاب کے موجودہ وزیر تعلیم صوبے کے پہلے وزیر ہیں جو ملکی زبانوں کی حفاظت و ترویج کے اصولی طور پر حامی ہیں۔ ورنہ راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام کے علاوہ اب تک جتنے وزرائے تعلیم بنتے آئے ملکی زبانوں سے عموماً نابلد اور کم سے کم بے اعتنا ضرور رہے۔ وزرائے سابق کی اسی نابلدی اور بے اعتنائی کے زیر سایہ پنجاب یونیورسٹی ملکی زبانوں کے حقوق پامال کرتی رہی۔ کئی سال کے مسلسل احتجاج کے بعد پنجاب یونیورسٹی ایف۔اے اور بی۔اے میں ملکی زبانوں کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت میں صرف پچاس نمبر تک شامل کرنے پر بمشکل رضامند ہوئی ہے حالانکہ ہندوستان کی باقی تمام یونیورسٹیوں سے ہر سال اردو ہندی کے ایم۔اے ایک جم غفیر کی صورت میں نکلتے ہیں۔ لیکن پنجاب یونیورسٹی اردو ہندی کے ایم۔اے بنانے سے تو رہی ایف۔اے اور بی۔اے میں صرف پچاس نمبر کا پرچہ ضابطے کی خانہ پُری کے لئے ملکی زبانوں کو بخش سکی ہے۔ پھر لطف یہ کہ بی۔اے کے امتحان میں ملکی زبانوں کے نمبر ڈویژن میں بھی شمار نہیں کئے جاتے۔ گویا بی۔اے میں ملکی زبانوں کی تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔

مزید براں یہ ظلم بھی روا سمجھ لیا گیا ہے کہ مشرقی زبانوں کے پرچے کے جوابات کے لئے انگریزی زبان لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ یعنی اگر کوئی طالب علم ایف۔اے یا بی۔اے میں فارسی کے پرچے کے جوابات اردو میں دے لے تو خواہ وہ ان درجوں کے فارسی امتحان کے تمام امیدواروں سے اپنا پرچہ بہتر بنا کر پیش کر دے۔ پھر بھی فارسی کے پرچے میں فیل کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یونیورسٹی فارسی کے پرچے میں بھی انگریزی ہی کا امتحان لیتی ہے۔

حالانکہ جو السنۂ شرقیہ کے استاد ہیں وہ اس امر واقعی کا صحیح اندازہ رکھتے ہیں کہ ایف۔اے اور بی۔اے کے طلبہ فارسی و عربی کے مضامین پہلے اردو میں سمجھتے ہیں پھر مترجموں کے انگلش ترجمے عموماً بے سمجھے رٹ رٹا کر انگلش میں فارسی عربی کے پرچے کا جواب لکھتے ہیں۔ لیکن یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو طلبہ کی اس دماغ سوزی پر مطلق رحم نہیں آتا۔ اور خواہ خود ان کی انگلش کبھی کسی نے تسلیم نہ کی ہو۔ مگر وہ طلبہ کو مجبور کرتے ہیں کہ فارسی عربی کے پرچوں کے جوابات صرف انگلش ہی میں دیں اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو مشرقی زبانوں کی تیاری میں دوہرا وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس طالب علم کی فارسی یا عربی بہت اچھی ہے اور انگلش کمزور وہ فارسی اور عربی دانی کے باوجود فارسی کے پرچے میں فیل ہو جاتا ہے۔

پھر لطف یہ کہ کمزور انگلش والا اپنے انگلش کورس کو رٹ کر اس لئے انگلش کے امتحان میں پاس ہو جاتا ہے کہ عام طور پر اس کے ساتھی انگلش میں کمزور ہوتے ہیں اور انگریزی پرچے کا ممتحن یونیورسٹی کے کامیاب امیدواروں کی تعداد پورا کرنے کی غرض سے کمزوروں کو بھی پاس کر دیتا ہے۔ لیکن فارسی عربی پرچے کے ممتحن چونکہ اپنے مضمون انگلش ترجموں کے توسط سے تیار کرتے ہیں۔ اُن کا سارا زور توجہ امیدوار طلبہ کی انگلش پر مبذول ہو جاتا ہے وہ یہ مطلق نہیں دیکھتے کہ امیدوار فارسی یا عربی میں دوسروں سے بہتر ہے بس اُسے انگلش میں کمزور دیکھ کر فیل کر دیتے ہیں۔ اس طرح فارسی اور عربی

"شاہکار" کے متعلق ایک قابل قدر رائے

آنریبل سر ملک فیروز خاں نون ایم۔اے (آکسن)

بیرسٹرایٹ لا، سابق وزیر تعلیم پنجاب حال کمشنر فار انڈیا انگلینڈ

میں "شاہکار" کے مضامین نہایت دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ "شاہکار" کا اہم ترین مقصد عوام کو غیر ممالک کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ ہمارے اکثر رسائل و جرائد سیر و سیاحت، تاریخ جدید اور روزانہ واقعات پر روشنی نہیں ڈالتے۔

کا ایک ذی استعداد طالب علم انگریزی میں کمزوری کے باعث اپنی عربی و فارسی
کی لیاقت کا صلہ پانے سے محروم رہ جاتا ہے اور پھر وہ اصل معاملے کی تہ کو
پہنچتا نہیں زندگی بھر فارسی اور عربی کا مخالف بنا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں یونیورسٹی
کے چند اہل بصیرت نے پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل میں یہ تجویز پیش
کی تھی کہ

"ایف۔اے اور بی۔اے کے امیدواروں کو یہ سہولت دی جائے
کہ وہ مشرقی زبانوں کے پرچے کا جواب ورنیکولر میں دے سکیں۔"

یہ سہولت اگر طلبہ کو مل جاتی تو ایک جانب طلبہ کی بہت بڑی مشکل رفع
ہو جاتی۔ دوسری جانب مشرقی زبانوں سے طلبہ کی بڑھتی ہوئی بددلی دور
ہو سکتی۔

لیکن ایسا کیوں ہونے لگا تھا جبکہ عربی فارسی کے وہ نام نہاد
فاضل اس تجویز کی مخالفت اپنے بے سواد ساتھیوں کے ہجوم کے ساتھ
کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جن کی عربی دانی صرف اس وقت تک قائم ہے
جب تک عربی کتابوں کے نکلسن اور براؤن کے انگریزی ترجمے لائبریریوں میں
موجود ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ طلبہ کو یہ سہولت مل گئی تو پھر اُن اہل علم کو جو السنہ
مشرقیہ کے اصلی عالم و ماہر اور براہ راست ان ادبیات سے وابستگی رکھتے
ہیں۔ ہماری نمائشی قابلیتوں کو رسوا کرنے کا موقعہ ہاتھ آ جائے گا۔ چنانچہ اُن
کے بھیانک شبہات نے انہیں اس توفیق سے محروم رکھا کہ اس ضروری اور
مفید ترین تجویز کی حمایت کریں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی ٹولیوں کو ساتھ
لے کر اس مفید تجویز کو نامنظور کرا دیا۔

یہ دردناک واقعات و حالات آنریبل وزیر تعلیم پنجاب سے التفات
طلب ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی سرکاری خزانے سے لاکھوں روپیہ لے چکی ہے
اور سال بہ سال لے رہی ہے۔ آنریبل وزیر تعلیم یونیورسٹی کے ان مغرب زدہ
بے سوادوں کو جو مشرقی اور ملکی زبانوں کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے ناقابل
تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ "ایاز قدر خود بشناس" کی تنبیہ سے توازن
دماغی قائم رکھنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے قیام کی پہلی غرض
یہ بتائی گئی تھی کہ اس میں مغربی علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ دی
جایا کرے گی۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ مشرقی ادبیات کے لئے بھی ذریعۂ تعلیم
انگریزی زبان کو قرار دے لیا گیا ہے۔ ہمارے بیدار مغز آنریبل وزیر تعلیم
نے زندگی بھر ملکی زبانوں کی حمایت کی ہے۔ اُن کے عہد وزارت میں ملکی
زبانوں کے حقوق کی پامالی اُن کے عہد کی ایک افسوسناک حیرت تصور
کی جائے گی۔ ہمیں توقع ہے کہ ملکی زبانوں کی جانب سے پنجاب یونیورسٹی کی
ظالمانہ بے پروائی کو وہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ اور اپنی پہلی فرصت
میں صوبے کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے کو اس مشرق کش پالیسی سے
دست بردار ہونے پر مجبور کریں گے۔

پنجاب یونیورسٹی میں اسکولوں کے نمایندے

انٹرنیس کے بیس ہزار طلبہ کی امتحان کی فیسوں سے یونیورسٹی کے اخراجات
بے کراں وابستہ ہیں۔

لیکن پنجاب یونیورسٹی سب سے زیادہ اسکولوں ہی کے حقوق کی
جانب سے آنکھیں بند کئے رکھتی ہے۔ یونیورسٹی کے نام نہاد اسکول بورڈ
میں زیادہ تعداد کالجوں اور یونیورسٹی کے پروفیسروں اور وکیلوں کی ہے۔
جنہیں اسکولوں کی ضروریات، اور اُن کے جائز حقوق کا علم ہی نہیں۔ لاہور
کے دو چار ہیڈ ماسٹر بھی برائے بیت اس بورڈ کے ممبر بنا دئے جاتے ہیں۔
یہ ہیڈ ماسٹر بھی اسکولوں کے مفاد کا بہت کم احساس رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ اسکولوں کے اساتذہ یونیورسٹی سے اپنے جائز حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔
لاہور کے دو چار اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر پٹینٹ دواؤں کی طرح یونیورسٹی
کے مستقل ممبر بنتے چلے آتے ہیں۔ اگر باقاعدہ انتخاب کا طریقہ رائج ہوتا تو انہیں
یہ احساس پیش نظر رہتا کہ ہم سارے پنجاب، کشمیر، سرحد، بلوچستان اور ریاستہائے
پنجاب کے مدارس ثانویہ کی جانب سے نمایندے بن کر آئے ہیں۔ مدارس ثانویہ
کی تعلیمی ضرورت کی تکمیل، استادوں کے حقوق کی حفاظت اور طلبہ کی تعلیمی
مشکلات کا ازالہ ہمارا پہلا اور آخری فرض ہے۔

اگر ان میں یہ احساس ہوتا تو ناممکن تھا کہ انٹرنیس کے امتحانات
کے ممتحن اسکولوں کے اساتذہ کی بجائے کالجوں کے پروفیسر بنائے جاتے۔
کیونکہ جب اسکولوں کی فضا میں ایسے لائق اساتذہ کی کمی نہیں جو ہر مضمون کے
ایف۔اے، بی۔اے اور ایم۔اے کے ممتحن بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔
لیکن اس کے باوجود ان امتحانات کی جانب اُنہیں نگاہ اٹھانے کا مجاز نہیں
سمجھا جاتا تو پھر انٹرنیس کے امتحان میں کالجوں کے پروفیسروں کو حصہ دلانے
کا کیا حق پہنچتا ہے؟

مگر ہو یہی رہا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی پر زیادہ تر وکیلوں اور پروفیسروں
کا قبضہ ہے اور اسکولوں کی نمایندگی برائے نام ہوتی ہے۔ اصل بات یہ
ہے کہ اسکولوں کی فضائیں بے جا خوف اور اس وجہ سے پست حوصلگی کے
سبب مردہ ہو چکی ہیں۔ اسکولوں کے اساتذہ میں کوئی تنظیم نہیں، اپنے حقوق

حاصل کرنے کے لئے کوئی اجتماعی طاقت نہیں۔ ورنہ آج وہ منظم ہو جائیں تو کل سورج کی پہلی کرن کے ساتھ انہیں اپنے جائز حقوق مل سکتے ہیں۔

لاہور کے چند ہیڈ ماسٹروں کو یونیورسٹی کے اسکول بورڈ کا ٹھیکہ دار بنا دیا گیا ہے۔ اگر پنجاب میں ڈویژن وار استادوں کی باقاعدہ انجمنیں بن جائیں تو لاہوری ہیڈ ماسٹروں کی ٹھیکہ داری بھی ختم ہو جائے۔ جب تک یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اسکول بورڈ کی ممبری کے لئے صرف اسکولوں کے لائق استادوں کو مخصوص نہ کریں گے اور ہر ڈویژن سے ایک ایک دو دو استادوں کو بذریعہ انتخاب ممبر نہ بنائیں گے۔ یونیورسٹی میں اسکولوں کے حقوق پر دوسروں ہی کا قبضہ رہے گا۔ اور اسکولوں کی تعلیمی ضروریات تشنۂ تکمیل ہی رہیں گی۔

کاش پنجاب کے ہر تعلیمی ڈویژن میں ایسی منظم ٹیچرز سوسائٹیاں بن سکیں جو متفقہ طور پر اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کر سکیں تو پنجاب یونیورسٹی کبھی ایسی اہم اکثریت کو جو اس کے لاکھوں روپے کے اخراجات کی کفالت کر رہی ہے نظر انداز نہ کر سکتی۔ سارے تعلیمی پنجاب میں پانچ مردان کار ہمت باندھ لیں تو اسکولوں کی نیم مردہ و نیم خوابیدہ بستیوں کو بیدار کر کے پنجاب یونیورسٹی پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ مگر ساری اسکولی فضا ایک قبرستان کی طرح خاموش اور اساتذہ پر خوابِ مرگ طاری ہے۔

پنجاب ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی اب ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کے نئے نام سے جلوہ گر ہوئی ہے۔

ایڈوائزری بورڈ کے فرائض میں پرائمری اور مڈل اسکولوں کے لئے نصاب کا سلیبس تجویز کرنا اور اسکولوں کی تعلیمی ضروریات کی بہم رسانی بھی ہے۔

مگر اس بورڈ کے تمام ممبر زیادہ تر کالجوں کے پروفیسر، پرنسپل اور کچھ ہیڈ ماسٹر ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی داعی تھی کہ اس بورڈ میں مڈل اور پرائمری اسکولوں کے کچھ تجربہ کار لائق اور کاردان استاد بھی بطور ممبر شامل کئے جاتے تاکہ کتب نصاب کی تجویز، ترمیم و تنسیخ کے سلسلے میں وہ اپنے تجربات کی روشنی میں بورڈ کو مفید مشورہ دے سکتے۔

لیکن انہیں بالکل نظر کر دیا گیا ہے۔ شائد اس لئے کہ پروفیسروں اور پرنسپلوں کے شانہ بشانہ بیٹھنے کی عزت یہ پست معاشرت حضرات حاصل نہ کر سکیں۔ بورڈ کی یہ تنگ نظری صوبے کی مڈل اور پرائمری تعلیم کو مفید رہنمائی سے محروم کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اساتذہ سالہا سال سے مڈل اور پرائمری کے طلبہ کو تعلیم دے رہے ہیں۔ انہیں بچوں کے دماغی نشو و نما، ان کی تعلیمی مشکلات اور اسکولوں کی تعلیمی ضروریات کا براہِ راست اندازہ اور تجربہ ہوتا ہے۔ ان کا یہ قیمتی تجربہ ایسی بے کار چیز نہیں کہ اُسے نظر انداز کر دیا جائے۔

کالجوں کے اساتذہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے مفاد کی نمائندگی تو کر سکتے ہیں۔ لیکن پرائمری اور مڈل اسکولوں کی فضائیں ان کے لئے مانوس نہیں ہو سکتیں۔ اُن کے تعلیمی مشورے ایک معیاری انداز میں اعلیٰ تعلیم کے متعلق تو کارآمد ہو سکیں گے۔ مگر اسکولوں کے عام حالات سے ان کی بیخبری انہیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے راستے کا رہنما نہیں بنا سکتی۔

پھر کیا ایڈوائزری بورڈ کے فرشتوں میں یہ مڈل اور پرائمری کے گنہگار اساتذہ صوبے کے تعلیمی مفاد کی خاطر بھی شریک نہیں کئے جا سکتے؟ تعلیمی علم برداروں کی یہ کم بینی اور خود پرستی تعلیم کے اصلی اور مخلص خدمت گزاروں کو آخر کب تک نظر انداز کرتی رہے گی؟

پرائیویٹ اسکولوں کے اساتذہ

پرائیویٹ اسکولوں کی فضا استادوں . . . . کے لئے بہت ناساز گار ثابت ہو رہی ہے مستثنیات سے قطع نظر عام طور پر پرائیویٹ اسکولوں کے مینیجر نواب بے ملک کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ غریب استادوں کی مجبوریوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا کوئی موقعہ نظر انداز نہیں کرتے۔ بعض اسکولوں میں استادوں کی تنخواہیں دفتر کے رجسٹروں پر کچھ ہیں اور انہیں مندرجہ تنخواہوں سے بہت کم دی جاتی ہیں۔ مینیجر صاحب کا پرائیویٹ سمجھوتا چُنگی کا کام دیتا ہے۔ اور چُنگی بھی ایسی کہ چار آنے فی روپیہ وصول کرنے والی۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ تعطیلات موسم گرما سے پہلے پہلے اکثر اسکولوں میں کچھ استادوں کو جواب دے دیا جاتا ہے تاکہ تعطیلات کی تنخواہ نہ دینی پڑے۔ بعض اسکولوں میں مینیجر برائے نام ایک خانہ ساز کمیٹی بنا لیتے ہیں اور اُس کے نام پر اسکول کے مفاد کو خود حاصل کرتے رہتے ہیں اور یہ شکایت تو وبائی صورت اختیار کر چکی ہے کہ استادوں کو کئی کئی ماہ تنخواہیں نہیں دی جاتیں۔

اس دورِ بدحالی میں تنخواہ کا وقت پر نہ ملنا جیسی کچھ معاشرتی مشکلات کا باعث بن سکتا ہے کسی پر مخفی نہیں۔ ان ہمت آزما حالات میں اساتذہ کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ضلع گورداسپور کے ایک ہائی اسکول کا مینیجر متعدد بار محکمۂ تعلیمات کے عتاب میں آ چکا ہے۔ مگر طبع کا موذی مرض اُس کے لئے تپ دق بن گیا ہے۔ اس اسکول کے ذمہ دار اساتذہ سے جو حالات اس مینیجر کے معلوم ہوئے ہیں حد درجہ ناروا ہیں۔ جدید اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات کی بیدار مغزی

سے یہ توقع بعید نہیں کہ وہ پرائیویٹ اسکولوں کے حالات کی چھان پھٹک کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کی سعی فرمائیں گے ۔ غریب اور پریشان حال اساتذہ کی یہ شکایت کہ وہ تعلیمی ترقی جاری نہیں رکھ سکتے اُس وقت تک بیجا ہے جب تک اُن کے لئے ایک اطمینان کی زندگی فراہم نہ کر دی جاسے ۔

جامعہ ازہر (مصر) کا وفد

مصر (قاہرہ) کی مشہور یونیورسٹی جامعۂ ازہر کے اساتذہ کا ایک وفد ہندوستان کا دورہ کر رہا ہے ۔ اس وفد کا مقصد سیاحت یہ ہے کہ مصر اور ہندوستان کے درمیان علمی و تعلیمی تعلقات استوار کئے جائیں ۔

جامعۂ ازہر کو قائم ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اپنے ہزار سالہ دورِ حیات میں جامعہ ازہر نے علوم و فنون کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں ۔ ان سے اسلامی دنیا کا گوشہ گوشہ منور ہو رہا ہے۔ ایسے ایسے نامور علماء اس یونیورسٹی سے نکلے جنہوں نے اقصائے عالم کے مسلمانوں کو اپنی مذہبی سیادت و علمی رہنمائی سے مستفید کیا ۔ جن کی یادگار علمی تصانیف بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔

اس وفد کو ہندوستان کی مذہبی و علمی پستی کا شکوہ ہے ۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مغربی تہذیب کے سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں ۔ اور صحیح اسلام ہندوستان میں مدفون کتاب ہے۔ لیکن ان کا شکوہ ایک غلام ملک کے مسلمانوں سے بیجا ہے ۔

آجکل مصری علماء کا یہ وفد پنجاب کے دار السلطنۃ (لاہور) میں فروکش ہے ۔ ہم اس معزز وفد کا جذبات احترام و عقیدت سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

امید ہے کہ پنجاب کے اہلِ علم اس وفد کے محترم اراکین سے مل کر اپنے ملک کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق تبادلۂ خیال کر کے استفادہ کریں گے ۔

جالندھر کے انگلش ٹیچر

جالندھر ڈسٹرکٹ بورڈ نے اپنے ایک اجلاس میں اپنے ماتحت تمام ڈی بی اسکولوں کے انگلش ٹیچروں کی تنخواہوں میں تینتیس ۳۳ فی صدی کے قریب تخفیف منظور کی ہے ۔

یوں تو انگلش کی تعلیمی اہمیت کے ہم شروع سے منکر ہیں کہ اس کی لپیٹ میں ملکی زبان کس مپرسی کی حالت میں ہو گئی ہے ۔ شاید جالندھر ڈسٹرکٹ بورڈ کے معزز ممبر ہمارے ہمنوا ہو گئے ہیں اور انہوں نے انگلش کے مضمون کو اختیاری اور اردو کو اس کی بجائے لازمی قرار دے دیا ہو۔

اگر ایسا ہوا ہے تو جالندھر ڈسٹرکٹ بورڈ کا یہ اقدام بہت مبارک ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں یعنی انگلش غلام ہندوستان کے دوسرے رقبوں کی طرح جالندھر میں بھی ابھی تک "اکاش بانی" کا درجہ رکھتی ہے ۔ تو پھر بےچارے انگلش کے استادوں کی تنخواہوں میں ایسی بیدردانہ تخفیف کیا معنی رکھتی ہے ۔

تینتیس ۳۳ فی صدی کی تخفیف کو تخفیف کی بجائے سزا کا نام دیا جانا موزوں ہوگا" تخفیف کی اس ظالمانہ تجویز سے نقشہ کیوں کر پلٹ جاتا ہے ۔ ملاحظہ طلب ہے :-

اصل تنخواہ	تخفیف کے بعد
۲۰۰ روپے ماہانہ	۱۴۰ روپے ماہانہ
۱۴۰ روپے "	۱۰۰ روپے "
۱۲۵ روپے "	۷۵ روپے "
۷۵ روپے "	۵۰ - ۴۰ روپے "

مندرجہ بالا نقشے کو دیکھتے ہوئے کون نہ سمجھے گا ... کہ یہ تخفیف تخفیف نہیں سزا ہے جو بغیر اثبات جرم نافذ کر دی گئی ہے ۔

ہمیں توقع ہے کہ جالندھر ڈویژن کے انسپکٹر مدارس بورڈ کی اس بیہودہ غریب آزاری کو عملی صورت نہ دینے دیں گے ۔

پیشتر ازیں یہ طریق بھی تھا کہ جن اساتذہ کی تنخواہ دو سو روپیہ تک پہنچ جاتی تھی انہیں دوسرے اضلاع میں بھیج کر وہاں سے کم گریڈ کے اساتذہ بلا لئے جاتے تھے ۔ اب بھی یہی طریق رائج رہے تو انگلش کے استاد اس سزا سے نجات پا سکتے ہیں ۔ یعنی جن اساتذہ کی تنخواہ دو سو روپے یا اس سے زیادہ تک پہنچ چکی ہے ۔ اور جالندھر ڈسٹرکٹ بورڈ ان کی بڑھی ہوئی تنخواہیں ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے اساتذہ کو دوسرے اضلاع میں اپنی موجودہ تنخواہوں پر تبدیل کر دیا جائے ۔ اور وہاں سے کم تنخواہوں والے انگلش استاد جالندھر میں تعینات کئے جائیں ۔ اس صورت میں اساتذہ کو تبادلہ کی زحمت کے سوا بدحالی کی مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑے گا ۔

تاجور

عیدِ شدید

اے ہلالِ عید! اے سرمایہ دارِ انبساط!
اے ہلالِ عید! اے پروردگارِ انبساط!

عید کا پیغام دینے خلق کو آیا ہے تُو
عید کی خوشیاں جہاں کے واسطے لایا ہے تُو

تیرے دیوانے بہت بیتاب تھے تیرے لئے
اِک مجسّم دیدۂ بیخواب تھے تیرے لئے

اہلِ عالم کو تمنّا تھی ترے دیدار کی
جستجو تھی چشمِ انجم کو ترے انوار کی

بن گئی تیری تجلّی راحت افروزِ حیات
آج ہر انساں ہوا ہے بہجت اندوزِ حیات

تیرے دامن میں مگر میرے لئے کچھ بھی نہیں
آہ! تیری دید سے حاصل مجھے کچھ بھی نہیں

تیر انظارہ ہے آشوبِ نظر میرے لئے
اب کے عید آئی ہے نشتر بر جگر میرے لئے

دید تیری تھی کبھی میرے لئے پیغامِ عید
میرے غم خانے میں بھی ہوتا تھا فیضِ عامِ عید

میرے گھر بھی تو نویدِ عیش لاتا تھا کبھی
میرے گھر کا آسماں بھی جگمگاتا تھا کبھی

میرے گھر بھی دو جواں بھائی تھے شیدائی ترے
حُسن میں تجھ سے سوا تھے یہ تماشائی ترے

تیرے شوقِ دید میں رہتے تھے دونوں بیقرار
ہفتوں پہلے سے کیا کرتے تھے تیرا انتظار

کیا کہوں؟ وہ میرے گھر کے ماہ پارے کیا ہوئے
میری دنیا جن سے روشن تھی وہ تارے کیا ہوئے

وہ ترے بدست میرے گھر سے رخصت ہو گئے
آہ! وہ تارے چراغِ شامِ تُربت ہو گئے

میرے ویرانے میں تیرا منتظر کوئی نہیں
اِس سیہ خانے میں تیرا منتظر کوئی نہیں

تیری تابانی سرور انگیز تھی جن کے لئے
ہر ادا تیری مسرّت خیز تھی جن کے لئے

اُن کو پہنایا ہے اپنے ہاتھ سے میں نے کفن
پھوٹا پڑتا تھا کفن میں سے بھی اُن کا بانکپن

بن گئی ہے میرے حق میں گردشِ افلاک عید
عید میرے گھر بھی آئی ہے مگر غمناک عید

عید کے دن عید کی خوشیاں منائے گا جہاں
عشرتِ فردوس کا منظر دکھائے گا جہاں

گدگدائے گی ہر اک دل کو تمنّائے نشاط
ہر بشر کی رُوح ہو گی نغمہ پیرائے نشاط

بیخودی سی سرسرائیگی ہوا میں ہر طرف
شادمانی مُسکرائے گی فضا میں ہر طرف

گلشنِ آفاق کی ہر شے جواں ہو جائے گی
ہر کلی کھِل کر حریفِ گلستاں ہو جائے گی

عید میں سب نوجواں کپڑے بدل کر آئیں گے
عیدیاں اپنے بزرگوں سے مچل کر پائیں گے

مسجدِ جامع کو جائیں گے سب اتراتے ہوئے — اپنی سج دھج سے نرالی شان دکھلاتے ہوئے
لیکن اس عیش و طرب کے جاں فزا ہنگام میں — محو ہوگا دل مرا اک آرزوئے خام میں
یاد اپنے دو جواں مرحوم مجھ کو آئیں گے — دل سے اک فریاد اُٹھے گی کہ دل ہل جائیں گے
جستجو اُن دو جوانوں کی مٹا دے گی مجھے — یاد اُن کی اپنے مرکز سے ہلا دے گی مجھے
جن کے دم سے ہر گھڑی اک عید تھی میرے لئے — جن کی صورت مطلعِ خورشید تھی میرے لئے
نشۂ جاوید سے مخمور تھا جن کا شباب — میری آنکھوں میں سراپا نور تھا جن کا شباب
میرے غمخانے میں جن کے قہقہوں کی تھی بہار — جن کی نورانی جبینیں تھیں مسرت آشکار
آہ! وہ دن کیا ہوئے مجھ کو بھی جب بھاتی تھی عید — یاد آیا میکہ میرے گھر میں بھی آتی تھی عید

اے مہِ نو! اب کہاں ہیں وہ تمنائی ترے؟ — کونسی دُنیا میں رہتے ہیں وہ سودائی ترے؟
آ دکھاؤں تجھ کو وہ دُنیا جہاں رہتے ہیں وہ — پہلے رہتے تھے کہاں، اور اب کہاں رہتے ہیں وہ
اِک فسردہ سرزمیں لاہور کی بستی سے دُور — بزمِ عالم سے پرے، ہنگامۂ ہستی سے دُور
ذرّہ ذرّہ ہے یہاں کا درد سے لبریز دیکھ — اے سفیرِ آسماں! یہ منظرِ غم ریز دیکھ
شہرِ خاموشاں کے ہیں سب تودہ ہائے خاک چُپ — چھائی ہے ساری فضا پر ایک وحشت ناک چُپ
بے صدا نالے ہیں قبروں کے ہوا میں بیقرار — ہے مسلّط ہر طرف خاموشیٔ فریاد کار
جھاڑیاں خاموش، سبزہ چُپ ہے، اور بالیں اُداس — دو جواں مرگوں کی دو قبریں بنی ہیں پاس پاس
آہ! اِن قبروں میں میرے دو خزانے دفن ہیں — اِن میں میری زندگی کے دو فسانے دفن ہیں
دو جواں بھائی ہیں اِن خاموشیوں میں محوِ خواب — اِن نقابوں میں ہیں دو چہرے مثالِ آفتاب
میری بزمِ خانداں کے انجمن آرا تھے یہ — قالبِ خاکی کے آئینے میں مہ پارا تھے یہ
میری بزمِ خانداں رشکِ گلستاں اِن سے تھی — آہ! شامِ زندگی میری فروزاں اِن سے تھی
اُٹھ گئے وہ، میری دُنیا میں اندھیرا چھا گیا — آفتابِ زندگی میرا لبِ بام آ گیا
دم قدم سے اِن کے میری کامراں تھی زندگی — اِن جواں مرگوں کے جلووں سے جواں تھی زندگی
یہ فضا پرواز تھے آزاد طائر کی طرح — ایک سیلِ تُند رَو تھے طبعِ شاعر کی طرح
یہ کسی کے قبضۂ قدرت میں آ سکتے نہ تھے — بیکراں تھے اپنی دُنیا میں سما سکتے نہ تھے
اِن کے شریانوں میں بجلی بن گیا تھا دورِ خوں — کیسے صیّادِ اجل کا چل گیا اِن پر فسوں
اِن پہ کیا بپتا پڑی ایسی کہ یوں مجبور ہیں — آج اِن محدود زندانوں میں کیوں محصور ہیں

کس زمیں پر آج زیرِ آسماں ڈھونڈوں تمہیں! — اے مرے افغان شہزادو! کہاں ڈھونڈوں تمہیں!

دیدۂ پُرنم حریفِ خواب ہے تیرے لئے!
آہ! اے عرفان! دل بیتاب ہے تیرے لئے!

کیا خبر تھی مجھ سے پہلے ہی تجھے موت آئے گی!
یہ تری اُٹھتی جوانی خاک میں مل جائے گی!

میری دُنیا بھر کی راحت مٹ گئی ہے تیرے ساتھ!
میں نے اپنی ساری دُنیا دفن کی ہے تیرے ساتھ!

آہ! اے رضوان! اے میرے رفیقِ مہرباں!
اے منیرِ نکتہ داں! اے فیلسوفِ نوجواں!

چین آتا تھا نہ تجھ کو اک گھڑی میرے بغیر!
قبر میں کیسے تجھے نیند آ گئی میرے بغیر!

گھر کی ہر شے تیری فرقت میں ستاتی ہے مجھے!
اب تو ہر منظر سے تیری یاد آتی ہے مجھے!

صبر کی تلقین کرتے ہیں مجھے احباب کیوں؟
ضبطِ گریہ کے سکھاتے ہیں مجھے آداب کیوں؟

بیس دن کے آگے پیچھے دو جواں بیٹوں کی موت
موت ـ پھر تم جیسے فخرِ خانداں بیٹوں کی موت

صبر بے شک صبر لیکن صبر کی کچھ حد بھی ہے؟
جبر ہے یہ صبر پھر اس جبر کی کچھ حد بھی ہے؟

ہاں کروں گا صبر تم کو اپنے مرجانے کے بعد
دل سے بھولوں گا تمہیں جی سے گزر جانے کے بعد

زندگی میں دید کی اُمید باطل ہو چکی؛
مجھ میں تم میں قبر کی دیوار حائل ہو چکی؛

تم سے ملنے اب تمہارے پاس خود آؤں گا میں
اِس طلب میں بزمِ ہستی سے نکل جاؤں گا میں

دلکشی اب بزمِ ہستی میں نہیں پاتا ہے دل؛
اب تو اِس اُجڑی ہوئی محفل سے گھبراتا ہے دل

موت نے تاراج کر ڈالی بہارِ زندگی؛
ہو رہا ہوں زندگی میں دلفگارِ زندگی؛

لیکن اِس تاراج و بربادی کا میں شاکی نہیں
ہاں! اجل کی نوحہ گر میری جگر چاکی نہیں

خارجی تحریک سے ہے موت کی بیداد بھی
ہائے کیسا خوب ہے فاخر کا یہ ارشاد بھی

"آدمی مجبور ہے تو موت بھی مجبور ہے"
اس کی ہیبت میں بھی اک بیچارگی مستور ہے

یہ بھی ہے فرماں پذیر اُس حاکمِ مختار کی
کانپتی ہے جس سے جباری ہر اک جبار کی

جس کی دہشت سے ہے لرزہ وادی و کہسار میں
جو تلاطم آفریں ہے قلزمِ ذخار میں

جس کے جلووں میں درخشاں ہیں فسانے برق کے
جو لگاتا ہے فلک کو تازیانے برق کے

جس کے تابندہ تبسم میں جھلکتا ہے شباب
نور بن بن کر چمکتا ہے، دمکتا ہے شباب

کُنجِ گلشن میں جلاتا ہے جو فانوسِ بہار
ذرّے ذرّے کو عطا کرتا ہے ملبوسِ بہار

بخشتا ہے خاک کو اعجازِ تشکیلِ حیات
کر رہا ہے موت کے پردے میں تکمیلِ حیات

ہاں اُسی کے دام میں ہے مرگِ ہیبتناک بھی
ہے اُسی کے حکم کی پابند یہ سفاک بھی

آہ! اِس خونخوار ظالم کی شکایت کیوں کروں!
اپنے خالق کی مشیت سے بغاوت کیوں کروں!

تاجور

موت کا تحفہ

"موت کا تحفہ" ملک کے مایۂ ناز نوجوان افسانہ نگار و ڈراما نویس میرزا ادیب بی۔اے مدیر "ادبِ لطیف" کے "نفسیات آشنا" قلم کا نتیجہ ہے۔ اپنے جادو طراز افسانوں و ڈراموں اور جدید اسلوبِ نگارش کے باعث میرزا صاحب نے دنیائے ادب میں جو ممتاز حیثیت حاصل کر لی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میرزا صاحب نے نہ صرف نیا اسلوب، نیا خیال، نئی ترتیب اور نئی ترکیبیں ہی پیش کی ہیں۔ بلکہ اردو میں ڈراموں اور افسانوں کے ایک نئے معیار کی طرح ڈالی ہے۔ میں ان کا بیحد ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے اپنا تازہ ترین شاہکار "شاہکار" کے لئے عنایت فرمایا۔ (مدیرِ معاون)

اندرا نے ایک دلربایانہ ادا سے، کتاب کو، جسے وہ بہت دیر سے، عالمِ استغراق و وارفتگی میں پڑھ رہی تھی، بند کر کے، ایک طرف صوفے پر رکھ دیا۔ شعلہ گوں رخساروں پر بکھری ہوئی سیاہ زلفوں کو، دونوں ہاتھوں سے پیچھے ہٹایا اور ٹھوڑی کو، دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ یہ رنگین داستانِ عشق، یہ دلآویز افسانۂ محبت، جسے اس نے ابھی ابھی ختم کیا تھا، اس کے دل و دماغ کو از حد متاثر کر رہا تھا۔ اس کے سینے کی گہرائیوں میں، ایک عجیب لذت آفریں ہلکا ہلکا درد، میٹھا میٹھا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔ وہ چند منٹ اسی حالت میں رہی پھر کسی فوری جذبے کے زیرِ اثر بیتابانہ اُٹھی اور کھڑکی کے پاس آ کر پیانو بجانے لگی ——— دور، گوشۂ مغرب میں زرد رو آفتاب ایک قریب المرگ انسان کی مانند جو زندگی کی حرارت، زندگی کے نور سے لمحہ بہ لمحہ محروم ہو رہا ہو، کائنات پر حسرت بآغوش الوداعی نظریں ڈالتا ہوا غائب ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہو ہو کر دیواروں اور ریشمیں پردوں سے ٹکرا ٹکرا کر مدھم سی آواز پیدا کرتے ہوئے اسی راہ سے واپس جا رہے تھے۔ اندرا کی نازک انگلیاں، پیانو کے پردے پر لرز رہی تھیں، اور نگاہیں افقِ لبسیط پر رنگین ابر پاروں کے نظارے میں محو! یکایک دروازے کے پردے کو جنبش ہوئی۔ اور اس کی بے تکلف سہیلی شیلا مسکراتی ہوئی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا ——— تم جب بھی آتی ہو۔ آندھی کی طرح آتی ہو ———!" اندرا نے پیانو سے انگلیاں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"آج سیر کو نہیں چلو گی؟"

اندرا نے انکار کی صورت میں سر کو جنبش دی۔

"کیوں؟"

"ہماری مرضی، تم پوچھنے والی کون ہو؟!"

"تمہاری مرضی؟ خوب، اور اگر میں تمہیں مجبور کر دوں تو ——— ؟؟"

"آخر کیوں تم مجھے مجبور کرنے لگیں؟"

"اس لئے کہ تمہیں ضرور سیر کرنی چاہیئے ——— سمجھی؟" شیلا نے اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے مجھے زبردستی لے چلو!"

"تو اُٹھو"

"میں خود اُٹھوں تو پھر تمہاری زبردستی کہاں؟!"

"میں زیادہ باتیں سننے کی خوگر نہیں ہوں۔ جلدی چلو، آج تمہیں اپنی ایک بڑی پرانی سہیلی سے ملاؤں گی"

"نہیں ایسا ظلم نہ کرنا۔ میں باز آئی تمہاری بڑی پرانی سہیلی سے"۔

"مطلب یہ کہ آج تمہیں مجبور کر کے ہی لے جانا پڑے گا۔"

"نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمہارے مجبور کرنے پر بھی میں آج نہیں جاؤں گی۔"

"وجہ؟"

"وجہ؟ کیا کروں میرا دل ہی چاہتا ہے۔"

"اوہو، میں اب سمجھی۔" شیلا نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہارا بہانہ معقول ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر سے ایک تصویر اُٹھائی اور اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ "کیا کرے بیچاری دل کے ہاتھوں مجبور ہے ———"

"کیا بک رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد ———"

"تم اپنی شرارت سے کبھی باز نہیں آؤ گی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیا کروں میرا دل ہی چاہتا ہے۔"

اس پر دونوں بے اختیار ہنس پڑیں۔ شیلا نے تصویر رکھ دی اور ع

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"

گاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کمرے میں شام کی تاریکی بتدریج پھیل رہی تھی۔ اندرا نے اُٹھ کر سوئچ دبایا۔ اور میز پر رکھی ہوئی اسی تصویر کو دیکھنے لگی۔ یہ تصویر اس کے منگیتر برج کمار کی تھی۔ برج کمار ایک تعلیم یافتہ، متمول خاندان کا چشم و چراغ اور اندرا کی آرزوؤں کا مرکز تھا۔ آج سے ایک سال پیشتر وہ اس سے ملا اور اسی پہلی ملاقات میں دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے تھے۔ ملاقاتوں نے آتشِ محبت پر تیل کا کام کیا۔ دونوں معاشرتِ جدید کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں آزادانہ ایک دوسرے کو اپنا شریکِ حیات منتخب کرنے میں کونسی روک پیش آسکتی تھی؟ آخر ان کی منگنی ہو گئی۔ دونوں کی زندگیاں ساتھ ساتھ چاروں طرف نکہت بداماں فضا میں اپنی کامیابی کے کیف پرور دلاویز ترانے سنتی ہوئی، قہقہوں کے آغوش میں انگڑائیاں لیتی ہوئی، محبت کے مسرت انگیز راستے پر گامزن تھیں۔ اندرا کو کبھی اس بات کا خیال تک بھی نہ آسکتا تھا کہ دنیا کا بڑے سے بڑا حادثہ بھی برج کمار کو اس سے جُدا کر سکتا ہے! برج کمار کے ذہن میں یہ تصور بھی پیدا ہو تو ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ اندرا کسی حالت میں بھی اس سے جُدا ہو سکتی ہے!! دونوں خوش و خرم تھے۔ دونوں اپنی کامرانی محبت کی شادمانیوں میں مست۔

چند لمحات تصویر دیکھنے کے بعد وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر میز کے پاس آکر رُک گئی۔ یہ تصویر، یہ حسین و جمیل شکل، اسے بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ تصویر کو نہایت غور سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی، ایسا کرنے پر اسے دل نے مجبور کر دیا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے پردے سے ٹکرانے پر سرسراہٹ پیدا ہوئی، اندرا دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر ذرا مایوس ہو کر پیانو کے پاس بیٹھ گئی۔ اضطراب میں ملفوف لذتِ محبت اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی متبسم نظریں میز کے ایک کونے پر جمی تھیں۔ لبوں پر ایک عجیب دلکش مسکراہٹ لرز رہی تھی۔ یکایک اس کے عقب میں ایک پردے کو جنبش ہوئی۔ اور برج کمار اس کے پیچھے سے نکل کر آہستہ آہستہ چل کر اس کے پاس آکھڑا ہوا۔ اندرا اپنے خیالات میں غرق تھی۔

"خوب" کمار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اندرا نے گھبرا کر منہ پھیرا اور کمار کو دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔

"اوہو، یہ بات ٹھیک نہیں۔ اپنا شغل جاری رکھو۔"

"تم آج کہاں غائب رہے؟"

"بتاتا ہوں۔ مال روڈ پر تو تم کئی بار گئی ہو، وہیں ایک کونے میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے، میں آج اسی کے کونے میں چھپا بیٹھا رہا۔ سمجھ گئیں نا؟"

"تو اب کیوں آگئے ہو؟" اندرا نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ آدمی ایک ہی جگہ غائب رہے۔ آخر تمہارا ڈرائنگ روم کس لئے ہے؟"

"مگر تم آئے کب؟"

"جب تمہاری سہیلی آندھی کی طرح یہاں آنکلی تھی۔ اسی وقت میں بھی بارش کے قطرے کی مانند ٹپک پڑا تھا۔"

"اتنا اتنی دیر پردے کے پیچھے چھپے رہے؟"

"اب تو تم پرماتما کی دیا سے بہت سمجھدار ہو گئی ہو۔ اتنا بڑا معمہ حل کر لیا۔"

"خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ مجھے آج تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ چند کتابوں کے متعلق بھی کچھ دریافت کرنا ہے۔"

"اور مجھے بھی تم سے ایک بہت بڑی بات کہنی ہے۔"

"کہو"

"سنو۔ غور سے سنو —— نہیں تم غور سے نہیں سُن رہی ہو؟"

"کہتے کیوں نہیں؟"

"کہنا تو چاہتا ہوں۔ لیکن تم غور سے سننے پر تیار ہی نہیں ہو۔ خیر میں سناتا ہوں۔ تاہم میں چاہتا ہوں۔ تم غور سے سنو:"

"میں کئی بار تم سے کہہ چکی ہوں کہ ہر ایک بات کا مذاق نہ اڑایا کرو۔"

"کیا کروں میرا دل یہی چاہتا ہے۔"

اندرا ہنس پڑی اور کمار بھی ہنسنے لگا۔

"شیلا بڑی شریر لڑکی ہے۔" اندرا نے پیانو کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"افسوس میں تمہاری تائید نہیں کر سکتا۔"

"تو مجھے کیا؟"

"کچھ نہیں، صرف تمہیں تھوڑا سا رنج پہنچے گا۔" ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں کلکتے جا رہا ہوں چار ماہ کے لئے۔"

"کیوں؟"

"فرم کا کام ہے!"

"مگر تم کیوں جاؤ۔ اور کوئی کیوں نہ جائے؟"

"اس کا جواب یہ ہے، میں کیوں نہ جاؤں، اور کوئی کیوں جائے؟؟"

"تم تو ہر بات مذاق میں ٹال دیتے ہو حالانکہ یہ عادت ——"

"حالانکہ یہ عادت بہت بُری ہے —— ہے نا؟" کمار نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتی!"

"بہتر —— مگر صرف ایک بات سن لو۔ کلکتے میں چار ماہ رہوں گا۔ کیونکہ فرم کا نہایت ضروری کام ہے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن تمہیں خط لکھتا رہوں گا اور تم اچھی لڑکی بن کر جواب دیتی رہنا ——"

"سُن لیا"

"تو مہربانی کر کے ایک بات کا جواب بھی دے دو۔ تمہاری سالگرہ کا دن پرسوں ہے یا اترسوں؟؟"

"پرسوں اترسوں کیا کل ——"

"صرف کل؟" "ہاں"

"تو کل بھی میں یہاں نہیں ہوں گا۔ اِس لئے کل کا تحفہ آج ہی دئے جاتا ہوں"

"لاؤ جلدی۔"

کمار نے جیب سے ایک ہاتھی دانت کی صندوقچی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اندرا نے اسے کھولا۔ اور ایک خوشبو میں لپٹا ہوا ریشمی رومال اس کے ہاتھ میں نظر آنے لگا۔

"بہت بہت شکریہ" اندرا نے رومال کے ایک کونے کو، جس پر لفظ ب۔ک کاڑھا ہوا تھا، دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو اب مجھے اجازت دو۔"

"اگر تم نہ جاؤ تو؟"

"جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ نہ جاؤں۔ مگر کیا کروں۔ فرم کا از حد ضروری کام ہے۔ اور میرے سوا اور کوئی اسے کر بھی نہیں سکتا۔"

"خط لکھتے رہو گے نا؟"

"یقیناً"

برج کمار اُٹھا، اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اندرا نے رومال کو بے اختیار اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

(۲)

آج شہر کے کامیاب بیرسٹر، مسٹر نند لال نے اپنے مخصوص دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ نند لال بلڈنگ کے ایک عالیشان آراستہ و پیراستہ کمرے میں ہر دو صنف انسانی کے افراد، قہقہے لگانے اور سیاسیاتِ حاضرہ پہ گپ زنی کرنے میں مصروف تھے۔ جب کوئی نووارد مہمانوں پر جھلکتی ہوئی نظر ڈالتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا۔ تو ایک ستم ظریف اس پر فقرہ چست کرتا، حاضرین کی متبسم نظریں ایک خاص انداز میں اس پر جم جاتیں۔ پھر فضا میں قہقہے گونجنے لگتے اور بیچارے نووارد کی مدہم آواز، قہقہوں کے سیلاب میں ڈوب جاتی۔ کمرے کے ایک کونے میں برج کمار بھی اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ اچانک دروازے پر نند لال کے پہلو میں نوجوان مصور ہریش چندر کا سنجیدہ چہرہ نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی حاضرین بے اختیار ہنس پڑے۔ مگر وہ تمام نکتہ چینیوں، فقرہ بازیوں سے بے پرواہ، اپنے چہرے پر غم و غصہ کا ہلکا سا اثر ظاہر کئے بغیر پوری سنجیدگی۔ پورے وقار سے قدم اٹھاتا ہوا برج کمار کے پاس آ بیٹھا۔

"کیوں مصور صاحب!" برج کمار نے شرارتاً مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ فرانس میں تصویروں کی بین الاقوامی نمائش کے موقع پر آپ کی تصویر کو اس سال کی بہترین تصویر سمجھا گیا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟"

"یہ بات تو بالکل معمولی ہے۔" دوسرا دوست بولا۔ "اگر ہریش چندر کی تصویر کو بہترین تصویر نہ سمجھا جاتا تو ہمیں ارباب نمائش کی عقل پر ماتم کرنا پڑتا۔ بھلا آفتاب کو کون آفتاب نہ کہے گا؟؟"

"شاید یہ خبر سول ملٹری میں شائع ہوئی ہے۔ مگر مصور صاحب کو انعام کیا ملا؟"

"انعام —— ! فرانس کی آدھی سلطنت" برج کمار نے کہا۔ اس پر تمام نے قہقہہ لگایا۔

ان تمام چیزوں کے باوجود ہریش چندر نہایت سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

"کیوں مسٹر ہریش! تم خاموش کیوں ہو؟" ایک دوست نے پوچھا۔

"غالباً یہ سوچ رہے ہیں کہ آدھی سلطنت دے کر ارباب نمائش نے میری ہتک کیوں کی ہے؟"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ پوری سلطنت انعام میں دینی چاہیئے تھی؟"

"بالکل درست"

اس کے بعد ہنسی مذاق کی باتیں رہیں۔ لیکن ہریش چندر کی سنجیدگی اور وقار میں کوئی فرق نہ آیا۔ کھانا کھانے کے بعد مہمان رخصت ہونے لگے۔ آخر کار کمرے میں ہریش چندر اور برج کمار کے سوا اور کوئی نہ رہا۔

"ہریش چندر! تم عجیب انسان ہو۔ سنجیدگی بہت اچھی چیز ہے۔ مگر ہر وقت نہیں۔"

"درست ہے۔" مصور نے جواب دیا۔

"تو پھر تم خود کو اتنا سنجیدہ کیوں ظاہر کرتے ہو؟"

"نہیں میں خود کو اتنا سنجیدہ تو نہیں ظاہر کرتا۔"

"میرے دوست! بعض انسانوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی نگاہوں میں پُراسرار شخصیتیں متصور ہوں۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر وہ ہر وقت چہرے پر سنجیدگی کی مسرت کش نقاب ڈالے رکھتے ہیں۔ اپنے مقصد میں وہ کامیاب تو ہو جاتے ہیں مگر ایک بڑا نقصان اٹھانے کے بعد اور وہ نقصان یہ ہے کہ ان کی زندگی ناقابلِ برداشت حد تک تلخ ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے تم بھی انہیں بے وقوفوں میں سے ہو!"

"نہیں کمار! تمہارا خیال غلط ہے۔ بظاہر میں غمگین نظر آتا ہوں۔ مگر حقیقتاً میں بےحد مسرور ہوں۔ جیسی روحانی مسرت مجھے حاصل ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی تمہیں مہیا نہیں۔"

میرے دوست! حقیقت اور چیز ہے۔ اور خود کو دھوکا دینا اور شے۔ خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ آجکل تم کون سی تصویر بنا رہے ہو؟ کلکتے سے آنے کے بعد میں تمہاری کوئی نئی تصویر نہیں دیکھ سکا۔

ان دنوں تصویریں تو میں نے چند ایک ضرور بنائی ہیں۔ مگر وہ کسی کام کی نہیں۔ میں چند دنوں کے بعد ایک ایسی تصویر بنانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ جو میرا شاہکار ہوگا۔ فنِ مصوری اس پر فخر کرے گا۔"

"تمہارا یہ شاہکار کب تک مکمل ہو جائے گا؟"

"تمہیں یا دُنیا کو اس سے کیا؟ کیونکہ میرا یہ شاہکار صرف مجھی تک محدود رہے گا۔"

"تم پھر شاعری کرنے لگے۔"

"حقیقت گوئی بھی شاعری کہلاتی ہے؟" ہرلش چندر نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ حقیقت ہے؟ خوب۔"

"تمہارا کیا ارادہ ہے۔ یہیں ڈیرہ ڈالو گے؟" نندلال نے آ کر پوچھا۔

"ہم جا رہے ہیں بھائی، گرم کیوں ہو رہے ہو۔" برج کمار نے جواب دیا۔ اور دونوں دوست باہر نکل آئے۔ ہرلش چندر کا محل وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس لئے وہاں جاتے جاتے خوب تاریکی پھیل گئی۔ آخر کار وہاں پہنچ گئے۔ محل ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے واقع تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ دونوں باغیچے میں سے ہوتے ہوئے محل میں داخل ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد برج کمار برقی قمقمے کی روشنی میں ایک نہایت دلکش تصویر دیکھ رہا تھا۔ . . . . اس تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ سارس کی مادہ زخمی ہو کر آگ کے شعلوں میں گر رہی ہے۔ سارس بھی اس کے پیچھے پیچھے آگ میں کود رہا ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا "محبت کی طاقت" ــــــ برج کمار دیر تک اس تصویر کو دیکھتا رہا۔

"تمہاری یہ تصویر نہایت اعلیٰ ہے ــــــ نہایت ہی اعلیٰ۔"

"یہ کچھ نہیں۔ وہ تصویر جسے میں بنانے کا ارادہ کر رہا ہوں میرے کمالِ فن کا پورا پورا مظاہرہ کرے گی۔"

"یہ تصویر ہوگی کیا؟"

"یہ تصویر ایک عورت کی ہوگی ــــــ ایک ایسی عورت کی جو میری دنیائے تخیل پر حکمران ہے۔ جو میری روح کی تابندگی ہے۔ جس کی ضیائے رُخ سے میری آرزوؤں، امیدوں کی پیشانی درخشاں و روشن ہے۔"

"ایک خیالی عورت۔ خبطی ہو تم۔"

"نہیں خیال نہیں۔"

"تو اور کیا؟"

"اگر میں نے ثابت کر دیا کہ وہ خیالی نہیں؟"

"تو کرو، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟"

ہرلش چندر نے کمرے کے ایک کونے میں سے ایک خوبصورت ڈبیہ نکالی۔ اسے کھولا اور ایک ریشمی رومال لا کر برج کمار کے سامنے رکھ دیا۔ لو دیکھ لو۔ یہ رومال میری محبوبۂ دلنواز کا ہے۔"

رومال کو دیکھتے ہی برج کمار کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔

"دیکھا یہ میری پیاری محبوبہ کا رومال ہے۔"

برج کمار برابر رومال کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کیونکر دھوکا کھا سکتی تھیں؟ وہی رومال، وہی کونے پر لفظ ب۔ ک کاڑھا ہوا۔

"یہ رومال والی ــــــ" برج کمار کہنے لگا مگر آگے نہ کہہ سکا۔

"یہ رومال والی میری محبوبہ ہے۔ میری زندگی، میری روح کی مالکہ ہے ہائے۔

اس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے
جس نے چاہا اور جو چاہا ــــــ گیا

"کیوں برج کمار، کتنا پیارا شعر ہے۔"

برج کمار کا غم و غصہ کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیا اندرا اتنے دن تک مجھے دھوکا ہی دیتی رہی۔

"تمہیں یہ رومال ملا کیونکر؟"

"میری محبوبہ نے تحفتہً دیا۔"

برج کمار اُٹھا۔ ہرشن چند حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں کیا ارادہ ہے؟"

"میں جاتا ہوں، ایک سخت ضروری کام یاد آگیا۔"

"ضروری کام ہے تو میں تمہیں نہیں روکتا" ہرشن چندر نے رومال کو تہ کر کے صندوقچی میں رکھتے ہوئے کہا۔

برج کمار کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہرشن چندر نے رومال پھر نکالا اور اسے آنکھوں سے لگا کر صوفے پر لیٹ گیا ——!!

(۳)

برج کمار جب ہرشن چند کے محل سے نکلا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی شخص تیز نشتر سے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ چند منٹ پیشتر —— صرف چند منٹ پیشتر، وہ خود کو نہایت خوش قسمت انسان تصور کرتا تھا۔ اور اب ایک واقعے نے ایک ایسے واقعے نے، جو سوائے اس کے تمام دنیا کی نگاہوں میں نہایت معمولی —— نہایت حقیر تصور کیا جاتا۔ اس کی زندگی کو تمام مسرتوں سے محروم کر دیا تھا۔ اس کا دماغ جہنم کدۂ اضطراب بنا ہوا تھا اور دل خلش اور بیکلی کی جولانگاہ ——! زندگی کا وہ رنگین، وہ دلآویز خواب مسرت جو ہر لحظہ، ہر گھڑی اس کی نگاہوں پر چھایا رہتا تھا۔ ابر کے ایک ٹکڑے کی مانند جس کا وجود آہستہ آہستہ بارش کے قطروں میں تحلیل ہو رہا ہو۔ مایوسی کے تاریک پردوں میں غائب ہوتا جا رہا تھا۔ اندرا ہی اس کے لئے سب کچھ تھی۔ اس کی زندگی کی روح، روح کی روشنی، اور اب یہ زندگی کی روح، یہ روح کی روشنی اس سے چھن گئی تھی۔ ہر قدم کے ساتھ مایوسیوں کا ایک طوفان اس کے دل کو گھیر لیتا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے میں داخل ہو کر سیدھا اندرا کے کمرے کی طرف چلنے لگا اور چند لمحوں کے بعد وہ اس کے کمرے میں تھا۔ اندرا ابھی تک سیر سے واپس نہیں آئی تھی۔ وہ کوچ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ گزشتہ واقعات کی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ یہی وہ کمرہ تھا، جہاں محبّت کے عہد و پیمان ہوئے تھے۔ جہاں ایک دل نے اپنی دھڑکن کی زبان سے اپنا سب سے قیمتی راز دوسرے دل تک پہنچایا تھا۔ اور جہاں دو نرگسیں آنکھوں نے، آنسوؤں، شفاف قطروں کے جو کھنٹوں میں جڑے ہوئے نقوشِ محبّت کو دوسرے کی نظروں کے سامنے پیش کیا تھا۔ واقعات کی تصویریں اس کی نگاہ تخیل کے سامنے آآ کر غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ آخر کار رومال، بھڑکتے ہوئے، سرخ شعلے کی صورت میں اس کے سامنے ظاہر ہوا اور اس کے ساتھ اندرا حسب دستور مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"اوہ تم۔ آج پردے کے پیچھے کیوں نہیں چھپے؟"

"میرا رومال کہاں ہے؟" کمار نے اس کی بات اَن سنی کر کے کہا۔

"کون سا رومال؟"

"وہی جو میں نے کلکتہ جانے سے پیشتر تمہیں دیا تھا۔"

اندرا کو اس کے تلخ لہجے پر حیرت ہوئی۔ اس سے پیشتر کبھی اس کا لہجہ اتنا تلخ نہیں ہوا تھا۔

"میں نے پرسوں جو کہہ دیا تھا کہ تمہارا دیا ہوا خوبصورت ریشمی رومال کمپنی باغ میں کہیں کھو گیا ہے۔"

"سچ سچ بتاؤ ——!"

"سچ سچ کیا؟"

"اندرا اصل حقیقت بتاؤ میرا رومال کہاں ہے؟"

"آخر اس رومال میں تھا کیا؟ بھلا خود ہی بتاؤ۔ چیزیں گم نہیں ہو جاتیں؟ وہ بھی گم ہو گیا۔ اور ویسے بھی اس کے کھوئے جانے کے متعلق تمہیں پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ رومال تم نے مجھے دے دیا تھا۔ میں نے اسے کھو دیا۔"

"اندرا! تم زیادہ عرصے تک مجھے دھوکے میں نہیں رکھ سکتیں۔ آخر حقیقت بتانی ہو گی!"

"تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

"کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ رومال تم نے ہرشن چندر کو دے دیا ہے؟"

ان الفاظ کے سنتے ہی اندرا پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ تڑپ کر کرسی سے اُٹھ بیٹھی۔

"افیم تو نہیں کھا آئے تم؟"

"افیم نہیں زہر کھا کر آ رہا ہوں! سنا تم نے؟؟"

"کچھ بھی مگر تم پر نشہ ضروری طاری ہے!"

"اگر نشہ طاری نہ ہوتا تو تم ایسی مکّار عورت سے دھوکا کیوں کھاتا؟"

"کمار سوچ کر بات کرو۔ کیا کہہ رہے ہو مجھے؟"

"مکّار عورت"

"میں مکّار ہوں؟"

"بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور چیز ——"

"کمار! سوچو تم کیا کہہ رہے ہو، ایسا نہ ہو بعد میں تمہیں سخت نادم ہونا پڑے"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں۔ اور اس کا ثبوت بھی میرے پاس موجود ہے۔"

"ثبوت؟ کس بات کا ثبوت؟؟؟"

"یہی کہ تم مجھے دھوکے میں رکھ کر ہرلشن چندر کو چاہتی رہی ہو ——— اور ابتک چاہ رہی ہو۔"

"یہ نہایت ذلیل الزام ہے۔ ایسے الفاظ زبان سے نکالتے وقت تم کو شرم کرنی چاہئیے۔"

اور تمہیں دھوکا دیتے وقت شرم نہ کرنی چاہئیے۔ کیا تمہیں اس بات سے انکار ہے کہ میں نے جو رومال تمہیں گزشتہ سالگرہ کے موقعہ پر دیا تھا۔ وہ تم نے اپنے چاہنے والے ہرلشن چندر کو نہیں دیا؟؟

"نہایت بیہودہ الزام ہے۔"

"تو وہ رومال اس کے پاس پہنچا کیوں کر؟"

اتنی سی بات پر آپے سے باہر ہو گئے۔" اندرا نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔" میں نے تمہیں پرسوں بتایا تھا کہ کمپنی باغ میں سیر کرتے وقت وہ رومال کہیں گر پڑا۔ اسی وقت یا اس کے بعد کسی شخص نے اٹھا لیا۔ اب بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"تم جھوٹ بک رہی ہو۔ ہرلشن چندر نے مجھ سے خود کہا کہ رومال اُلی مجھ سے ملتی ہے۔ وہ میری محبوبہ ہے ——— تم سمجھتی تھیں کہ میں دھوکے ہی میں رہوں گا ———"

"کمار! دیکھو تم بڑھتے ہی جا رہے ہو۔ تمہارا یہ رویہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔" یہ کہہ کر اندرا دروازے کی طرف چلی۔ کمار نے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"میری آخری بات بھی سنتی جاؤ۔"

"میں تم سے کچھ سننا نہیں چاہتی۔ اس وقت تم حیوان بنے ہوئے ہو۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی مکار عورت ہو تو میں تمہارے پاس بھی نہ بھٹکتا۔ تم نے محبت کا جواب محبت میں دے کر مجھے ہمیشہ دھوکے میں رکھا۔"

"پھر وہی باتیں۔ معلوم ہوتا ہے تمام دنیا کی دیوانگی تمہارے سر میں سما گئی ہے۔"

"مجھے تم نے تباہ کر دیا ہے ——— افسوس ———" کچھ اور کہنے لگا تھا کہ اندرا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، اور مسترحمانہ نظروں سے اسے دیکھ کر کہنے لگی۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہے کمار! میں نے کسی کو رومال نہیں دیا۔ میں نہیں جانتی ہرلشن چندر کون بلا ہے؟ میں تمہاری اندرا ہوں، تمہاری ہی رہوں گی۔ سوچو آج تم نے مجھے کیا کچھ کہہ دیا ہے۔"

"نہیں اب میں دھوکے میں نہیں رہ سکتا۔ تم زہریلی ناگن ہو، خوبصورت ڈائن ہو ——— افسوس تم نے مجھے نہایت ذلیل دھوکا دیا۔"

"پرماتما کے لئے ہوش کرو کمار!"

"آئندہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ میں اس شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔"

"کمار! کیا کہہ رہے ہو۔ یہ دیوانگی اچھی نہیں۔"

"میں اب تمہارے سایے سے بھی بھاگتا ہوں۔ مکار عورت!"

"کمار! کمار!!"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" یہ کہتے ہوئے کمار دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ اندرا ایک کرسی میں دھنس گئی اور چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

(۴)

اندرا کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ کمار ایک بیہودہ وہم کے زیر اثر اسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کی باتوں سے اسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ چند دن کے بعد وہ خود بخود اس بیہودہ الزام دہی پر سخت پشیمانی کا اظہار کرے گا۔ اچانک سے برج کمار کی تحریر ملی جس میں لکھا تھا "میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں تم جو چاہو کر سکتی ہو۔" ان الفاظ کے پڑھتے ہی اس کا دل غم و غصہ میں ڈوب گیا۔ حالات نے اس طرح پلٹا کھایا تھا کہ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد کلکتے سے تار آیا کہ برج کمار موٹر کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ اس روح فرسا و جانگداز خبر کے سنتے ہی اس کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ شدتِ صدمہ نے اس کے حواس پر سخت حملہ کیا۔ چند دن تو وہ مجنونانہ حالت ہی میں رہی۔ آخر امتدادِ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا زخم بھی مندمل ہونے لگا۔ متذکرہ بالا واقعے کے پورے چار سال بعد اس کی شادی کے لئے بر تلاش کیا جانے لگا۔ والدین کی نظر انتخاب مصور ہرلشن چندر پر پڑی۔ اور چند دن کے بعد وہ مصور کے پہلو میں پہنچ گئی۔ ہرلشن چندر کا ذہن ہر وقت ایک تخیلی نسوانی پیکر کی رعنائیوں میں غرق رہتا تھا۔ مگر جب اس نے اندرا کو دیکھا اسے محسوس ہوا کہ یہ غمگین چہرے والی عورت، اس کے خوابوں کی ملکہ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اور بعض اوقات تو اس کے دل میں خیال پیدا ہو جاتا کہ شاید یہی وہ عورت ہے جس کی عالم تخیل میں وہ پرستش کرتا رہا ہے ——— جس کی اب تک وہ پرستش کئے جا رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور بے اختیارانہ رومال کو چوم لیتا۔

آج اندرا کی سالگرہ کا دن تھا - اس کی شادی کو پورا ایک سال گزر چکا تھا - عزیزوں کی طرف سے اُسے تحفے وصول ہو رہے تھے - ہریش چندر اسے اپنی عزیز ترین چیز دینا چاہتا تھا - وہ چیز کیا ہو سکتی تھی - سوچتے سوچتے آخر اس کی آنکھیں امید کی روشنی سے چمک اُٹھیں -

اندرا کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی، ہریش کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کروٹیں لینے لگی -

"تم حیران ہو گی کہ میں نے اب تک تمہیں سالگرہ کے موقعہ پر کیوں تحفہ نہیں دیا؟"

"شاید"

"بات یہ ہے اندرا! میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں اپنی عزیز ترین چیز دوں"

"تو وہ عزیز ترین چیز کب ملے گی -"

"جب تم چاہو -"

"سالگرہ کا دن تو آج ہے -"

"بہتر ہے آج ہی لے لو -" ہریش چندر نے مسکرا کر کہا -

اُس نے جیب سے ایک ریشمی رومال نکالا - اور اندرا کے سامنے رکھ دیا - "اندرا! یہ میری عزیز ترین چیز ہے - اگرچہ یہ ایک رومال ہے - مگر اس کی قدر و قیمت صرف میں ہی جان سکتا ہوں -"

"بہت بہت شکریہ" اندرا کے لبوں سے نکلا - اس نے رومال ہاتھ میں لیا - اچانک اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک نہایت اونچی جگہ سے نیچے گر پڑی ہے - ہریش چندر سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا - "چار سال ہوئے یہ رومال مجھے کمپنی باغ میں ملا تھا اور اسے حاصل کر کے مجھے اتنی مسرت ہوئی تھی جتنی آج تک کبھی بھی نہیں ہوئی - اندرا! میں نہیں جانتا اس پیارے رومال کا مالک یا مالکہ کون ہے؟ مگر میں اسے ایک ایسی عورت سے منسوب کرتا رہا ہوں جو میرے "خوابوں کی ملکہ" ہے - تم آئیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری خوابوں کی ملکہ اور تم میں بہت مشابہت ہے ـــــ اب اندرا! تمہیں میرے لئے سب کچھ ہو"

وہ یہ الفاظ سنتی جا رہی تھی اور رومال کے ایک کونے کو، جہاں ب. ک کے حروف کاڑھے ہوئے تھے، دیکھتی جا رہی تھی - وہ اس وقت بجس خاموش اور افسردگی میں ڈوبی بیٹھی تھی -

"تم سمجھ سکتی ہو اندرا! اس سے بڑھ کر مجھے کوئی چیز عزیز نہیں ہے"

اندرا نے رومال ایک طرف رکھ دیا - اور اپنے پہلو میں پڑے ہوئے پھولوں کے گلدستے کو دیکھنے لگی - ہریش چندر باہر چلا گیا - "وہی رومال ـــــ میری مصیبتوں کا منبع ـــــ" اس کے دل میں خیال پیدا ہوا - گزشتہ واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے - یہی رومال سالگرہ کے موقعہ پر اس کے محبوب نے اسے دیا تھا پھر ـــــ یہی منحوس رومال اس کا خاوند سالگرہ کے دن اسے دے رہا تھا - وہ پھٹی پھٹی نظروں سے رومال کو دیکھ رہی تھی اور سینے کے زخم سے، جس پر فراموشی کا پردہ پڑ چکا تھا خون بہ رہا تھا - وفورِ صدمہ نے اسے نڈھال کر دیا تھا -

شام کو جب ہریش چندر گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اندرا بیمار ہے - وہ اس کی تیمارداری میں مصروف ہو گیا - دو دن بعد، صبح کے وقت ہریش چندر اس کے کمرے میں گیا - اس نے دیکھا کہ اندرا، بے حس و حرکت پڑی ہے - ریشمی رومال اس کے سینے پر پڑا ہوا ہے - اس نے جسم کو ہاتھ لگایا - افسوس وہ دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی تھی -

کسی کو بھی اس کی اچانک موت کی وجہ معلوم نہ تھی - آہ کسے خبر تھی کہ سالگرہ کا تحفہ اس کے لئے "موت کا تحفہ" ثابت ہوا تھا ـــــ

میرزا ادیب بی - اے

رباعی

ویرانیٔ دشت کو گلستاں کر دے فطرت کی تجلیوں کو ارزاں کر دے
چاہے تو محبت کی طرب ریز شراب ہر ذرۂ ہستی کو غزلخواں کر دے

سراج الدین ظفر بی - اے

غزل

دل مرا بے زباں ہے پیارے
مجھ سے کیوں بدگمان ہے پیارے

خیر تیری جواں اُمنگوں کی
ساری دُنیا جوان ہے پیارے

مجھ سے اب شرح آرزو مت پوچھ
ہر نفس داستان ہے پیارے

میری بربادیاں ہیں مدِ نظر
یا فقط امتحان ہے پیارے

سہل کچھ راہ جستجو کر دے
ذرّہ ذرّہ جہان ہے پیارے

تجھ کو بے اعتنائیوں کی قسم
کیا کوئی اور دھیان ہے پیارے

ہو رہا ہوں جو صرفِ راہِ عمل
کیا یہی امتحان ہے پیارے!

نعمتِ درد سے نہ کر محروم
درد ہی دل کی جان ہے پیارے

ہے زمانے پہ حکمراں حرماںؔ
تُو اگر مہربان ہے پیارے

حرماںؔ خیرآبادی

غزل

کوئی حدیثِ جنوں آفریں بیاں کر دے
مرے خیال کی دُنیا کو شادماں کر دے

فریبِ لطف سے پھر ایک بار اے کافر
مری فسردہ تمنّاؤں کو جواں کر دے

زہے نصیب کہ میرا وفورِ شوق مجھے
تری شریر نظر کا مزاج داں کر دے

رموزِ زیست ہر اک گام پہ ہیں بکھرے ہوئے
تو اپنے ذوقِ تجسّس کو بیکراں کر دے

جہانِ عقل میں اک انقلاب آ جائے
اثرؔ جو عشق کے احوال کچھ بیاں کر دے

اثرؔ چکوالی

مشاہیرِ عالم

ٹالسٹائی

کوئی گروہ، کوئی مذہب، کوئی جماعت، کوئی قوم، اس صفحۂ عالم پر ایسی نظر نہیں آتی جس میں فطرت نے قابلِ ستائش اور واجب الاحترام ہستیاں پیدا نہ کی ہوں۔ سرزمین روس کا یہ مایہ نازہ فرزند، جس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہم آج ایک طائرانہ نظر ڈال رہے ہیں۔ تاریخ عالم میں نمایاں طور پر ممتاز ہے۔ اس کی تعلیمات سے آج دنیا کا ہر ملک استفادہ کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں گاندھی جی کی تحریک "ستیہ گرہ" روس کے اس نامور لیڈر ہی کی رہینِ فکر ہے۔

اگر ایسے افراد کے سوانح حیات کو دلچسپ اور لطیف پیرایہ بیان اور سلیس و عام فہم زبان میں لکھا جائے تو بہت کچھ سرمایہ بصیرت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کے واقعات بجید سبق آموز ہوتے ہیں۔ اور ہمارے لئے بہترین رہنما کا کام دے سکتے ہیں۔

پیدائش

ٹالسٹائی ۲۰ اگست ۱۸۲۸ء میں روس کے ایک غیر معروف قصبہ "پاسنا پولیانا" میں پیدا ہوا۔ شہزادی میری اور کونٹ نکولس آج دنیا میں قابلِ قدر والدین سمجھے جاتے ہیں۔ جن کے آغوشِ شفقت میں ٹالسٹائی نے عہدِ طفلی کا ایک حصہ گزارا۔ بدقسمتی سے وہ ابھی نو سال کا بھی نہ تھا کہ اپنے شفیق والدین کے سایۂ عاطفت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ والدین کے انتقال کے بعد اس کے بڑے بھائی نکولس نے اس کی نگہداشت اور تعلیم تربیت کے فرائض انجام دئے۔ ٹالسٹائی ابتدائی عمر میں کوئی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت کا بچہ نہ تھا۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بھولا بھالا بچہ مستقبل میں روس کا نامور ہیرو ہوگا۔ مگر ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ "بعض ہستیاں سنورتی ہیں بگڑنے کے بعد، اور زمانہ انہیں بگاڑتا ہے بنانے کے لئے۔"

ٹالسٹائی بچپن ہی سے از حد عزلت نشیں واقع ہوا تھا۔ کئی کئی دن تک وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا تھا۔

تعلیم

قصبۂ مذکورہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ۱۸۴۴ء میں "کازان" یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ مگر ایک سال کے بعد ہی جب اس کا بھائی نکولس تحصیلِ علوم سے فارغ ہو کر مکان کی طرف واپس جا رہا تھا تو وہ اسے بھی اپنے ہمراہ لیتا گیا۔ کچھ دن بعد، پھر اس نے یونیورسٹی کے امتحانات پاس کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ مگر ملکی فضا سے متاثر ہو کر خاموش ہو گیا۔

فوجی تعلیم

تعلیم حاصل کرنے کے بعد ٹالسٹائی کا بڑا بھائی فوج میں ایک ممتاز عہدہ پر مامور ہو گیا تھا۔ اس کی صحبت نے ٹالسٹائی کے دل میں بھی فوجی خدمات کا شوق پیدا کر دیا۔ اپنے بھائی سے اجازت لے کر وہ باقاعدہ طور پر طفلس کے ایک فوجی کالج میں داخل ہو گیا اور کچھ مدت بعد وہاں سے کامیاب ہو کر نکلا۔"

حیرت انگیز انقلابات

جس وقت وہ "کازان" یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اس وقت کازان روس کا پیرس بن رہا تھا۔ اسبابِ تعیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم تھیں۔ جامِ شراب کا دور تھا۔ اور ماحول اس درجہ کیف آفریں تھا کہ ٹالسٹائی جیسا نوجوان مرتاض بھی اسے نظر انداز نہ کر سکا۔ وہ متاثر ہوا اور خوب ہوا۔ یونیورسٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد پھر ایک مرتبہ "لینن گریڈ" میں اس کے جذبات شباب میں انتشار پیدا ہوا۔ اس وقت کوئی ایسا کھیل نہ تھا جو اس نے نہ کھیلا ہو۔ رات دن شراب اور جوا میں مصروف رہتا۔ یہ عظیم الشان واقعہ ہے جو اس کے طالبِ علمی کے زمانے میں پیش آیا۔ اس کے بعد اس نے خود اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ اور آئندہ ان فواحشات سے محترز رہنے کا حتمی عہد کیا جسے اس نے دمِ واپسیں تک نبھایا۔

ادبی زندگی اور حب الوطنی

یونیورسٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد اس نے غریب و نادار مزدوروں اور کسانوں کی ہمدردی میں ایک کتاب بطرز ناول تصنیف کی جس کا نام "زمینداروں کی صبح" تھا۔ اس کے بعد اس نے فوجی کالج میں ایک طویل افسانہ "لڑکپن" کے عنوان سے لکھا۔ اور "پیٹرو گریڈ" کے ایک موقر ادبی رسالہ میں بغرض اشاعت روانہ کیا۔ اڈیٹر نے اس کے اس افسانے کو نہایت اہتمام کے ساتھ بالاقساط شائع کیا۔ ادبی دنیا میں یہ اس کی پہلی آمد تھی۔ لیدانل

اس نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اس کی زندگی صرف ادبی .... ہوگی۔ چند دن کے بعد اس کا ایک اور افسانہ "جنگ و امن" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں اس نے زیادہ تر جنگ کریمیا سے متعلق واقعات قلمبند کئے تھے۔ چونکہ ٹالسٹائی بذاتِ خود اس معرکہ میں شریک تھا۔ اس نے تمام واقعات کو بہترین طریقہ پر ترتیب دیا۔ ملک کے مشہور جرائد و رسائل اور اخبارات میں اس کے ادبی مضامین اور افسانے انتہائی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ اور ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ اس کے افسانوں کو قصے کہانی وغیرہ کا رتبہ نہ دیتا تھا۔ بلکہ اس کی قیمتی تصانیف کا مطالعہ فرائضِ زندگی میں شمار کرتا تھا۔ اس کا سب سے مشہور افسانہ "دینا کورین" ہے۔ جو عصرِ حاضر کی بہترین تصانیف میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے کئی رسالے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے متعلق بھی شائع کئے۔

ایک ادیب کی حیثیت میں ٹالسٹائی نے بہت جلد وقعت و شہرت حاصل کر لی اور بالآخر ادبی کانفرنس کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ جو اہلِ ملک کے بڑے سے بڑے شخص کے لئے انتہائی اعزاز تھا۔ اچانک اس کے بھائی نکولس کا انتقال ہو گیا۔ ٹالسٹائی کے لئے یہ روحانی صدمہ تھا۔ اسے اپنے بھائی سے انتہائی محبت تھی۔ اور وہ اس کی بہت توقیر کرتا تھا۔ ابھی اسے بھائی کے سوگوارانہ مراسم سے فرصت نہ ملی تھی کہ روس کے ہر دلعزیز بادشاہ زار نکولس نے وفات پائی۔ اس نے ان صدموں کو صبر و استقلال سے برداشت کیا۔

ٹالسٹائی میدانِ عمل میں

جنگ کریمیا کی وجہ سے ملک کی حالت سقیم تھی۔ ہر طرف سے "اصلاح اور آزادی" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسانوں کی کثیر جماعت غلامی اور ذلت کی بیڑیاں اپنے پاؤں سے اتار ڈالنا چاہتی تھی۔ کسان مکمل آزادی کے لئے سرفروشانہ میدان میں آنے کو تیار تھے۔ آخر کار تین سال کی مسلسل کوششوں اور متعدد انسانی قربانیاں دینے کے بعد کسانوں کو زمینداروں کے آہنی چنگل سے رہائی ملی۔ ہر جگہ پنچایتی کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ متعدد چھوٹی چھوٹی انجمنوں کا تعین عمل میں لایا گیا۔ اس تمام جدوجہد میں ٹالسٹائی نے کسانوں کی رہبری کے فرائض انجام دیئے۔

پنچایت کا نظام مستحکم کرنے کے بعد ٹالسٹائی نے ان انجمنوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور تعلیمی معاملات کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس نے اپنے قصبہ میں ان تجربات کی بنا پر جو اس نے سفرِ یورپ کے دوران میں حاصل کئے تھے، ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس نے اس مدرسہ میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی۔ وہ طلبہ پر دباؤ ڈالنے کے خلاف تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "طلبہ سے بالکل آزادانہ برتاؤ کرو تاکہ وہ بذاتِ خود ہر ایک معاملہ میں اچھائی اور برائی کا معیار قائم کر سکیں۔"

ایک مدت تک یہ مدرسہ فرزندانِ وطن کی قومی اور ملّی خدمات انجام دیتا رہا اور اس عرصہ میں اس مدرسہ سے عملی زندگی کے کئی رہبر فارغ التعلیم ہو کر نکلے۔

ٹالسٹائی کی بڑھتی ہوئی عزت و توقیر دیکھ کر روسی گورنمنٹ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ملک کے لئے بدامنی کا باعث ہے۔ اس کا لٹریچر اس وقت تک افسانے اور مضامین کی حدود سے آگے نہ بڑھا تھا۔ مگر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ وہ ہر قسم کے خیالات اور تحریکات کا اظہار انہیں کے ذریعہ سے کرتا تھا۔ جو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر اپنا اثر کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ اسی بنا پر روسی گورنمنٹ نے ٹالسٹائی کی سب تصانیف غیر قانونی اور ممنوع الاشاعت قرار دے کر ان کی تمام کاپیاں ضبط کرنا شروع کر دیں۔ روسی گورنمنٹ کے حکم سے ایک مرتبہ جب وہ مکان پر موجود نہ تھا۔ خانہ تلاشی لی گئی۔ گورنمنٹ کے اس ناعاقبت اندیشانہ فعل پر ہر جگہ نکتہ چینی کی گئی۔ اخبارات نے حکومت کے خلاف پُرزور الفاظ میں صدائے احتجاج بلند کی اور تمام ملک ٹالسٹائی کا طرفدار ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر روسی حکومت نے ٹالسٹائی کو اپنے دربار میں بلایا۔ اس کی بہت عزت کی۔ اور اس کی تمام تصنیفات کو قانون کی دسترس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ٹالسٹائی باقاعدہ طور پر کسانوں اور نوجوانوں کا معتبر لیڈر بن گیا۔ اس نے ایک سوسائٹی قائم کر کے ملک کے لئے اصلاحی مطالبات زار کی حکومت کے سامنے پیش کئے۔ لیکن حکومت نے انہیں ٹھکرا دیا۔ ٹالسٹائی نے اس کی مخالفت کے لئے ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا۔ اب اس کے جھنڈے کے نیچے لاکھوں سرفروش جمع ہو گئے۔ وہ اس وقت ادبی انسان نہ تھا۔ بلکہ قابل سیاسی لیڈر کی حیثیت میں سرگرمِ عمل تھا۔ بالآخر حکومت نے مجبور ہو کر سوسائٹی کے قریب قریب تمام مطالبات کو قبول کر لیا۔ یہ پہلی فتح تھی جو ٹالسٹائی کی جدید تحریک "خاموش مقابلہ" کے بدولت حاصل ہوئی۔

ٹالسٹائی اور مذہب

اسی زمانے میں اس نے ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام "ازیکشن" تھا۔ جس میں اس نے عیسائی مذہب اور روسی حکومت کے پرزور اور ناقدانہ انداز میں بحث کی تھی۔ یہ کتاب ابھی پورے طور پر شائع بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پادریوں نے اس پر تکفیر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اور اس کو خدا اور عیسیٰ ...... کی ہستی سے منکر ثابت کر کے مذہب سے علیحدہ کر دینے کا پبلک میں اعلان کر دیا۔ ٹالسٹائی نے پادریوں کے فتویٰ کے جواب میں ایک طویل مضمون روسی اخبارات میں شائع کیا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ میرا مذہب اور مسلک کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ میں ببانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تقدس مآب پادریوں نے مذہب کو اپنی سہل پسندیوں سے برباد کر دیا ہے اور اب مذہب فطرت کے مطابق نہیں

میں حقیقت اور صداقت کے راستے پر گامزن ہوں اور صداقت و راستگوئی کی دنیا میرے لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔

سیرت اور شادی ۲۴ سال کی عمر میں اس نے شاہی خاندان کے طبیب کی لڑکی سے شادی کرلی۔ وہ نہایت کامیاب ادیب اور افسانہ نگار تھا۔ ملک کا ہر طبقہ اس کی یکساں عزت کرتا تھا۔ اس کی عزت صرف افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی نہ کی جاتی تھی بلکہ ایک لائق اور بہترین رہنما کی طرح اس کی پرستش ہوتی تھی۔ روس کے ہر کہ و مہ سے اس کا برتاؤ یکساں تھا۔ وہ اپاہجوں، غریبوں، ناداروں، لاوارثوں اور یتیموں کا ہمدرد اور شریکِ غم تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اسے تمام روس میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

ٹالسٹائی شاہی خاندان کا مقتدر شہزادہ ہونے کے باوجود عجز و انکساری کا مجسمہ تھا۔ ہر شخص اسے دل سے چاہتا تھا اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

کئی مرتبہ اس نے دنیا ترک کر دینے کا ارادہ کیا، مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ آخر کار وہ مصمم ارادہ کر کے گھر سے نکل گیا۔ مگر صحت خراب تھی راستہ میں بخار نے آلیا اور ۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو ۸۲ سال کی عمر میں اس نے جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

ٹالسٹائی ان مشاہیر میں سے نہ تھا جنکو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کرنے کے لئے موت کے دروازے سے گزرنا پڑا تھا اسے اس زندگی ہی میں شہرت دوام حاصل ہو گئی تھی۔

احسان اللہ خاں مضطر

محبّت

پوچھتا ہے مجھ سے کیا اے ہمنشیں اسکی صفات　　ہے محبت ہی سے قائم انتظامِ روزگار

بزمِ سرو و یاسمن میں ارتباطِ اُلفت سے ہے　　دہر کے ذرّے ہیں اس سے حاملِ نقش و نگار

ہے محبت ہی کے آب و رنگ سے اسکی نمود　　صبحِ لالہ زار ہو وہ یا ہو شامِ کوہسار

کارفرما ہے مصوّر کے تخیّل میں یہی　　ذہنِ شاعر میں بھی ہوتی ہے یہی الہام بار

نغمۂ نَے کی صدا میں ہے اسی سے دلکشی　　سازِ احساسات اس سے رُوح پرور کیف بار

رُوح میں جس سے تڑپ پیدا ہو یہ بجلی ہے وہ　　گرم ہیں قلب و جگر جس سے یہی ہے وہ شرار

اک متاعِ جاوداں جنسِ گرانمایہ ہے یہ　　لیکن اِس دولت سے عاری ہو دلِ سرمایہ دار

بخشتی ہے حُسن کو یہ طاقتِ تجدیدِ عہد　　عشق بنتا ہے اِسی سے دلکشی کا شاہکار

"ہے محبت ہی سے پردہ دارئ رازِ حیات"
"یعنی قائم ہے محبت پر اساسِ کائنات"

یزدانی (جالندھری)

مزدور کی بیوہ

رات آدھی آچکی سارا جہاں خاموش ہے — ہر بلند و پست تاریکی سے ہم آغوش ہے
سر جھکائے فکر میں بیٹھی ہے اک عورت نڈھال — جس کے شوہر کا ہوا ہے شام ہی کو انتقال
اوڑھ کر کمّل اندھیرے کا کھڑے ہیں بام و در — جیسے اس مظلوم ہستی پہ جما دی ہو نظر
بھونک پڑتا ہے کوئی کتا جو گھر سے متصل — اس پریشاں حال بیوہ کا دہل جاتا ہے دل
لے رہا ہے سسکیاں اک ٹمٹماتا سا چراغ — جس سے روشن ہو رہے ہیں سینۂ سوزاں کے داغ
پاس تھا زیور جو پیتل کے چھڑے چاندی کا ہار — لگ چکا ہے مرنے والے کے کفن میں تار تار
پھر بھی سر پہ دین داری کا ابھی کچھ بار ہے — اب یہ برتن بیچ دینے کے لئے تیار ہے
کہہ رہی ہے کس سے مانگوں گی کہاں ہے آسرا — بیوگی کی رسم آخر کس طرح ہوگی ادا
ایک بچی عمر ہے مشکل سے جس کی پانچ سال — اپنی دکھیا ماں سے رو رو کر یہ کرتی ہے سوال
تم نے ابا کو کہاں بھیجا ہے آئے کیوں نہیں — چیز لانے کے لئے کہتے تھے لائے کیوں نہیں
اچھی اماں آؤ، میں آواز دوں دہلیز سے — آؤ ابا! آؤ باز آئی میں ایسی چیز سے
رات ہے ایسی بھیانک، کچھ نظر آتا نہیں — دل دہلتا ہے، یہاں تنہا رہا جاتا نہیں
سنتی ہے بیوہ جو بچی کا بیانِ دل فگار — مضمحل آنکھوں سے چل پڑتی ہے اشکوں کی قطار
پھیر کر منہ، پونچھ کر آنسو، طبیعت روک کر — کہتی ہے، قربان ماں کی جان اے نورِ نظر!
رات آدھی جا چکی، سو جا، عبث ہلکان ہے — تیرا ابا آج حوروں کے وہاں مہمان ہے
صبح کو جس وقت سورج روشنی برسائے گا — تیرا ابا چیز لے کر مسکراتا آئے گا

(۲)

حادثہ یہ اور نہیں ہمسایوں کے دل پر اثر — اس طرف سے اُس طرف تک سو رہے ہیں بے خبر

کیسے خاکِ بے ثباتی پر ہیں گُل پھولے ہوئے
زندگی کے نشے میں ہیں موت کو بھولے ہوئے

یہ یقین ان کو نہیں شاید کہ دُنیا کا قیام
یہ مسرّت کا سراچہ، یہ تبسّم کا مقام

خواب ہے، اور خواب بھی وقتِ سحر کا خواب ہے
پھر نہ یہ مطرب، نہ یہ بربط، نہ یہ مضراب ہے

زندگانی کا سفینہ گھاٹ پر رُک جائے گا
آدمی کیا، منچلے گردوں کا سر جھک جائے گا

یک بیک جھنجلا کے جب شانہ لڑائے گی اجل
ناک رگڑیں گے منارے خاک چاٹیں گے محل

دولت و جاہ و حشم کا رنگ فق ہو جائے گا
قوّت و مردانگی کا قلب شق ہو جائے گا

احسانؔ دانش (کاندھلوی)

جذبات

اُس کی نظروں میں ہے اب حال پریشاں میرا
حاصلِ عشق ہوا چاکِ گریباں میرا

ذرہ ذرہ میں بپا حشر کے ہنگامے ہیں
ہر بیاباں سے کچھ آگے ہے بیاباں میرا

سیر ہوتی نہیں رعنائیٔ دلکش سے نظر
جانے پہنچا ہے کہاں دیدۂ حیراں میرا

سوچتا یہ ہوں کہوں بھی تو کہوں کیا اے دل
پوچھتی ہے وہ نظر حالِ پریشاں میرا

رُخِ منزل کا بھی احساس اُٹھا جاتا ہے
ہوش میں آنے دے مجھ کو دلِ حیراں میرا

ہاتھ اُٹھتے ہی زمانہ کی نگاہیں اُٹھیں
ایک افسانہ ہوا چاکِ گریباں میرا

خلشِ شوقِ اسیری بھی ہے اِک پردۂ راز
کس نے رُخ پھیر دیا جانبِ زنداں میرا

عشق میں کاوشِ جاں سوز ہوئی وجہِ سکوں
درد سمجھا تھا جسے ہے وہی درماں میرا

دیر و کعبہ میں بھی نظروں کو تسلّی نہ ہوئی
رازِ سربستہ رہا حاصلِ ایماں میرا

دامنِ وحشت جہاں سامنے آتا ہے رتنؔ
میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ہے گریباں میرا

رتنؔ (پنڈوی)

جذبِ دل

ایک تاریک رات تھی —— کسی تیرہ بخت کے بختِ سیاہ کی طرح تاریک اور بھیانک۔

خاموش فضا میں تند آندھی ارتعاش پیدا کر رہی تھی، آسمان پر سیاہ بادل محیط تھے، کبھی کبھی بجلی بادلوں کے گھونگٹ سے منہ نکال کر زمین کو ایک آنکھ دیکھ لیتی اور پھر منہ چھپا لیتی تھی، ہر طرف کالی گھٹائیں جھوم رہی تھیں، اور گردوپیش تھا صرفِ شورشِ جنگِ عناصری۔"

ایسے وحشتناک وقت میں جبکہ پتّہ پتّہ خوف سے مرتعش تھا، وادیٔ کوہسار میں ایک غمگین و درماندہ نوعمر راہرو جو سارے دن کی دشت پیمائی سے تھک کر نیم جاں سا ہو رہا تھا، چل رہا تھا۔

ناتوانی اور تکان غلبہ پا رہی تھی، لحظہ بہ لحظہ اس کی چال دھیمی پڑتی جاتی تھی - اس کی نظریں دور کے ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ پر جو اپنی دھندلی اور مدھم ضیا کی وجہ سے اس کے لئے سامانِ امید بن رہا تھا مرکوز تھیں، وہ بے اختیار اس کی طرف چل رہا تھا - لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا ہوا۔

(۲)

دفعتاً اس نے اپنی نظروں کے سامنے ایک خوشرو شخص کو کھڑے دیکھا، جو راہبانہ لباس پہنے ہوئے تھا۔

راہب نے اس طرح قفلِ خاموشی کو توڑا:-

"میرے بچّے! کہاں کا قصد ہے؟"

"؟" —— رہرو کے لبوں پر خاموشی مسلط تھی۔

"جانِ پدر! یہ سنگلاخ وادی آلام و مصائب کا مسکن اور خطرات کا گھر ہے، اندھیرے میں یہاں اس طرح بھٹکتے پھرنا موت کو دعوت دینا ہے - میرا فرض ہے کہ تجھے اس پُرخطر سفر سے روکوں - میری کٹیا یہاں پاس ہی ہے - وہ جس کا چراغ تجھے شب بسر کرنے کی دعوت دے رہا ہے - آ — میرے ساتھ چل اور یہ ہولناک رات میرے ہاں بسر کر۔"

نوجوان نے راہب کی دعوت قبول کر لی۔

اپنی کٹیا میں پہنچ کر راہب نے اپنے مہمان کو بنظرِ غور دیکھا، —— ایک خوش پوش جوان جس کے چہرے سے غم و الم کے جذبات مترشح تھے۔ —— جس کے چہرے کی پژمردگی اس کی دلی افسردگی اور قلبی انقباض کا راز فاش کر رہی تھی ——؛

میزبان نے اپنے مہمان کو خوش کرنے کے لئے لاکھوں جتن کئے، مگر بے سود —— اس نے اپنی حقیر سی کٹیا کو بزمِ نشاط اور محفلِ عیش بنا کر غم نصیب مہمان کے لئے دلچسپی و شگفتگی کا سامان پیدا کرنا چاہا - مگر وائے ناکامی —— اس نے بربطِ پر دجو برسوں سے اس کی بے التفاتی کا گلہ کر رہا تھا عشق و محبت کے آتشیں نغمے گا کر نوجواں کے دل میں عیش و سرور کی آگ لگا دینی چاہی لیکن اس کا چہرہ غمگین سے غمگین تر ہوتا گیا۔

(۳)

اپنی کوششوں سے اُکتا کر راہب یوں گویا ہوا:-

"میرے بچّے! تیری غمگین صورت اور سرد آہیں تیرے دلی اندوہ کی آئینہ دار ہیں، تیرے افسردہ اطوار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تیری کتابِ زندگی کا صفحہ صفحہ غم و الم کی داستان سے لبریز ہے، میرے بچّے! اپنے دردِ دل کو مجھ سے نہ چھپا، مجھے بتا دے کہ کون سے درد کی کسک تیرے دل میں چٹکیاں لیتی ہے کون سا غم تجھے بیقرار کئے دیتا ہے؟ کیا دوستوں کی بے وفائی کی یاد دل و جگر پر تیر و نشتر کا کام کر رہی ہے یا بے مہریٔ زمانہ کا تصور تیرے جامۂ صبر و شکیب کو تار تار کر رہا ہے - سچ سچ کہہ دے کہیں تُو عشق کی غارتگری کا شکار تو نہیں - کیا کسی حسنِ سرکش نے تیرے عشق کو ٹھکرا دیا ہے جو تُو یوں اندوہگیں ہے؟

میرے بچّے! قیدِ حیات و بندِ غم دونوں اصل میں ایک ہیں، یہ دنیا دارالمحن اور یہ زندگی ایک الم بیز افسانہ —— بیتے ہوئے عیش کے دنوں اور گزری ہوئی دلچسپیوں پر غمناک ہونے سے کیا فائدہ؟ عیشِ رفتہ اور راحتِ ماضی کی یاد میں دل کو ہدفِ غم بنانا لاحاصل ہے، یہ تو گردشِ فلک کے وار ہیں، گردشِ فلک کے — جو کسی کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔

"بس جانِ پدر! اب گذشتہ رنج و ملال صفحۂ دل سے دھو ڈال - یہ کٹیا غموں اور گناہوں سے ملوث دنیا کی ہاؤ ہو اور شورشوں سے بہت دور ہے یہاں اپنا جامۂ غم اُتار کر پھینک دے۔"

(۴)

راہب نے اس پند و وعظ کے اختتام پر اپنے مہمان پر ایک نظر ڈالی، بہ "تحریض الانسان علی النشاط" (انسان کو خوشی پر اُبھارنا) کی کوشش

یقیناً بے اثر ثابت نہ ہوئی تھی، حیا اور شرم سے نوجوان کا چہرہ تمتما رہا تھا، راہب کی تعجب سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، نوجوان کے خدوخال بالکل صنفِ نازک کے سے تھے۔

—— ایک عورت؟ —— کیا اس کا افسردہ مہمان ایک عورت تھی؟۔

"بیٹی! . . . . . . سچ . . . . . بتا ——"

نوجوان ٹھٹکا۔

"ٹھیک ہے، مقدس باپ!" نوجوان کا چہرہ مختلف النوع جذبات کا آئینہ دار تھا۔ "میں —— آپ کا حرماں نصیب مہمان —— مرد نہیں بلکہ ایک بدبخت عورت ہوں —— آپ کے تسکین کدہ میں میرا یوں مخل ہونا یقیناً آپ کو ناگوار گزرے گا۔ مگر آہ دینی باپ! میری سرگزشت یاس و حرماں کا ایک دردناک مرقع ہے۔ اپنی پُر درد داستان . . . . میں آپ کو سنائے دیتی ہوں۔" راہب ہمہ تن گوش تھا۔

(۵)

"مقدس باپ! میرے والد مرحوم ٹائن کی وادی میں بڑے بھاری جاگیردار تھے" —— ٹائن کے نام پر راہب ٹھٹکا —— "ان کے زر و دولت کے انبار گنجِ قارون پر چشمک زنی کرتے تھے —— آہ دینی باپ! میں کیا کہوں اور کیونکر کہوں —— میرے حسنِ تاباں کی چمک سے ایک عالم کی نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔ ہزاروں دل میری زلف کے اسیر تھے۔ اور لاکھوں نوجوان میری چتون کے شہید! میرے حلقۂ عشاق میں ایسے امیر آدمی تھے جن کے خزانے شمار کرنے کے لئے عمرِ خضر درکار ہے۔ اور ایسے بھی جن کی شیریں زبانیاں شہد کو شرماتی تھیں، مگر آہ! ان کے خزانوں میں سچی محبت اور دلی اُلفت کا دُرِ بے بہا جس پہ ساری دنیا کے خزانے نثار کئے جا سکتے ہیں، نہ تھا، اُن کی "شہد زبانیوں" کے ذخیرے اس قطرۂ انگبیں سے یکسر خالی تھے۔

"ہاں میرے زمرۂ عشاق میں ایک عاشقِ صادق بھی تھا، مقدس باپ! اس کی محبت کوثر کی موجوں کی طرح پاکیزہ تھی، اس کا دل صفائی میں آئینے کو آب دیا کرتا تھا، وہ امیر نہ تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سچی محبت کا جوہرِ نایاب ہی اس کا سارا سرمایہ تھا، آہ! جب وہ باغ میں میرے ساتھ محوِ خرام ہوتا، تو اس کے ہاتھ آتشِ محبت سے آگ کی طرح شعلہ بار ہوتے، وہ میرے لئے پھولوں کا ایک گلدستہ بناتا۔ گلدستۂ محبت —— مگر میں آہ میں —— اسے غرورِ حُسن سے پاؤں تلے مسل دیتی —— وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ میری بے رُخی اور فرعونیت سے اس کے دل کے ہزار ٹکڑے ہو جاتے! —— مجھے خوب معلوم تھا، کہ میری یہ بے اعتنائی اور بے رُخی اس کے دل پہ کیا اثر کرتی ہے —— مگر میں . . . پندارِ حُسن کے نشہ میں چُور تھی، میں نے اس کی الفت کو ٹھکرا دیا —— آخر ایک دن جب اُس کا شیشۂ دل چُور چُور ہو چکا تھا —— وہ اپنے دلِ صد چاک کو لئے مجھے چھوڑ کر کہیں چل دیا —— آہ اب میں نادم ہوں —— مجھے اس کی تلاش ہے۔ مجھے اس کی جستجو ہے۔ غمِ فرقت کے صدمے اب مجھ سے اٹھائے نہیں اُٹھتے، مقدس باپ! اب تو میں "درد کے گھُل رہی ہوں۔ غمِ غمگسار میں" —— آہ! میرا ایڈون! میرا ایڈون!!"

کٹیا کی ساکت و ساکن فضا میں ایک نعرۂ مستانہ گونجا!

"میری انجیلنا!"

مدھم چراغ اور کمرے کی دوسری چیزوں نے دیکھا، کہ راہب اور انجیلنا بغلگیر تھے!

راہب انجیلنا کا پیارا ایڈون ہی تو تھا، جس کے پاس انجیلنا کو اس کا جذبِ دل کھینچ لایا تھا۔ باہر بادل چھٹ چکے تھے، طوفان کی شورش خیزیاں ختم ہو چکیں تھیں، اور دُور اُفق پہ ایک اخترِ تاباں چمک رہا تھا۔ اسی طرح دو محبت بھرے دلوں سے یاس کی گھٹائیں دُور ہو چکی تھیں اور محبت کے آسمان پہ کامرانی اور امید کا درخشندہ ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔

(گولڈسمتھ)

حمید احمد
"گورنمنٹ کالج لاہور"

شعر

جینے کی یوں تو آس نہیں لیکن یہ گماں ہے لوگوں کا
تم آؤ تو شاید جی اٹھوں، تم آؤ تو شاید جی جاؤں

عدم

تاریخِ پرواز

پرواز کا ابتدائی دور

ہوا میں پرواز کرنے کا تخیل اور عالمِ بالا کی تسخیر کا جنون بھی انسان کے دیگر مہماتی مشاغل میں سے ایک شوق پرور اور دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ اور ازمنۂ قدیم کی تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تحقیقات اور ایجادات کے ہر دور میں انسان نے پرواز کی کچھ نہ کچھ سعی ضرور کی ہے۔ قرون قبل المیلاد کے قصوں میں سے کیکاؤس اور نمرود کے واقعات اِس معاملے پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب انہوں نے خداوندِ باجبروت سے معاندت آزمائی اور رزم آرائی کی ٹھان لی۔ تو اس مطلب کے حصول کے لئے انہیں بجز اِس کے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ کہ کسی صورت وہ پرواز کریں اور (خاکم بدہن) خداوند تعالیٰ کے قریب پہنچ کر اس سے نبرد آزما ہوں۔ عقل و فکر کی انتہائی سوچ بچار کے بعد ایک تجویز اُن کے ذہنِ نارسا میں آئی اور وہ یہ تھی کہ چند عقابوں کی وساطت سے وہ اس نیلگوں آسمان کی لامحدود وسعتوں کو عبور کر سکتے ہیں۔

انہوں نے چند قوی الجثہ عقاب انتہائی تجسس کے بعد منتخب کئے۔ ان پر محمل باندھا اور محمل کے بلند ترین گوشوں پر گوشت کے لوتھڑے لٹکا دئے۔ تاکہ گوشت تک پہنچنے کے لئے عقاب منزلِ بالا کی جانب پرواز کریں اور اس خندہ آفریں اور قہقہہ پرور انداز میں مطلب برآری کر سکیں۔ لیکن اگر کوئی ان دلائل کو محض الف لیلہ کی کہانیوں میں سے ایک لطیف حکایت خیال کرے یا اس کی عقل کی نارسائی اور ذہن کی فرومایگی اپنے فہم کے افلاس کے باعث اسے نہ سمجھ سکے۔ تو میں مندرجہ ذیل دلائل سے بھی ثابت کر سکتا ہوں۔

آج سے ڈھائی ہزار سال قبل مصریوں نے اپنے افسانوں اور تصاویر میں ایسے کرداروں اور ایسی شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو بال و پر کے سہارے عالمِ بالا میں پرواز کیا کرتے تھے۔ نیز اُسی زمانے میں بھارت ورش اور چین کے باشندوں کا عقیدہ تھا کہ مخصوص خصائص کے لوگ مختلف مشینوں کی وساطت سے جو جادو سے حرکت کرتی تھیں آسمان کی جانب پرواز کرتے تھے۔ چنانچہ ان مشینوں کے نقشے قدیم ہندوؤں اور چینیوں کی کتابوں میں موجود ہیں۔

بہت قدیم زمانے میں ہند چینی کے باشندے ہلکے ہلکے اوراق کو کعب کی صورت میں متشکل کرتے تھے۔ اور اُن کے درمیان دئے جلا کر ہوا میں اُڑاتے تھے۔ قرنِ اولے کے یورپین شیطان کو بھی پروں والا تصور کرتے تھے۔ غرضیکہ بہت قدیم زمانے سے انسانی دماغ اس گتھی کو سلجھانے میں سرگرداں تھا۔ ہر قوم اپنے اقتدار و تموّل کے زمانے میں اس طلسمی اور عجیب و غریب کشمکش میں اسیر تھی۔ چنانچہ اس طلسماتی شوق و اضطراب نے ہی اُن کے قوائے تجسس و عمل کو بیدار کیا اور خاص خاص زمانوں میں انہوں نے تحقیقات کر کے ایجادیں کیں۔ یہی ایجادیں اُن کے اعتقادِ پرواز کا اظہار اور ہمارے دعوے کا ناقابلِ تردید استدلال ہیں۔

۸۰۰ھ میں عبدالرحمٰن ثانی کے عہد میں اُندلس کے ایک مسلمان نے مدینۃ الزہرا میں اپنے لئے پر بنائے۔ اور ایک بلند ترین پہاڑ سے کود پڑا۔ اور ان کی مدد سے صحیح و سلامت زمین پر پہنچا۔ یہ پہلا تجربہ تھا۔ جو عمل میں آیا۔ لیکن ان تمام کوششوں میں سے اٹلی کے احیائے علوم کے عہد کے مشہور صناع اور فلسفی لیونارڈ ڈی ونسی (Leonard de Venci) کی مسلسل اور عظیم الشان مساعی نتیجہ خیز۔ تعمیری اور عظیم المرتب کارنامے کی حیثیت سے پیش کی جا سکتی ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ حاضر کے انسان کی تمام تر ترقیاں اور کامرانیاں اسی عظیم ترین انسان کے افکار و تصورات کا معقول ثمرہ ہیں۔

دورِ احیائے علوم اطالیہ کے اس شہسوار نے جو لیونارڈو ڈی ونسی کے نام سے امتیازی شہرت کا مالک تھا۔ اور فزیک دانی و نقاشی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اپنے فکر و تجسس کی تمام کوششوں کو انسان کی پرواز کے امکان پر مرکوز کر دیا تھا۔ علم الطیور۔ علم الحشرات۔ مختلف النوع اجسام کی بناوٹوں کے عمیق و مسلسل مطالعہ کے بعد اُس نے اپنی عمر کا معتدبہ حصہ اس امر کی دریافت پر صرف کیا۔ کہ وہ کون سے آلات ہیں یا پرندوں کے اجسام کے وہ کون سے اعضا ہیں۔ جن کی مدد سے وہ فضا کی بلند و بسیط پہنائیوں میں اڑتے پھرتے

ہیں۔ آخر کار ۱۷۰۷ء میں اس نے "ہوا میں پرواز" کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں بالتفصیل بیان کیا کہ انسان ہوا میں کیونکر پرواز کر سکتا ہے اور ساتھ ہی بعض آلات کی تشریح بھی کی۔

کتاب کے آغاز میں لیونارڈو ڈی ونسی نے (تعبیۂ بالہائی) کو جو انسان کے دست و پا کی قوت سے حرکت پذیر ہوتے ہیں پیشِ نظر رکھا ہے۔ لیکن کتاب کے آخری ابواب میں خود بھی اس نظریہ سے بے نیاز ہو گیا ہے اور صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہ انسان فنری مشینوں کے سہارے کرۂ ہوا میں پرواز کر سکتا ہے۔ اس کے نظریات اور نقشہ جات کی معقولیت و اکملیت کا یہ عالم ہے کہ زمانۂ مابعد کے محققین نے بھی اسی کے افکار کے چراغ سے اپنا راستہ تلاش کیا اور اسی کے نظریات کو اپنے معمولات کی اساس صحیح قرار دیا۔ حتیٰ کہ تین سو سال بعد کسی نے طیارہ بھی ایجاد کیا اور لیونارڈو کے افکار کے مطالعہ کے بعد اسی کی تحقیقات اور تدقیقات کی راہوں پر گامزن ہو کر اپنے نظریات کی تکمیل کی۔

بعد ازاں ۱۷۷۰ء میں ایک شخص زز وبیت المعروف بہ فرانسو نے برسیا کے شہر واقع اٹلی میں لیونارڈو کے نظریات اور نقشہ جات کے مطالعہ و اتباع کی روشنی میں ایک کشتی نما طیارہ ایجاد کیا۔

یہ کشتی نما طیارہ بادبانی سفینے سے مماثلت رکھتا تھا۔ اور اس کے اوپر ایک بادبان نصب تھا۔ تاکہ نیچے اترنے میں آسانی ہو۔ اس کے دونو* طرف جست کے گولے تیار کر کے لگائے ہوئے تھے اور اس امر کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ کہ اگر پہلے بالائی سوراخوں میں پانی ڈال کر انہیں پُر کر دیا جائے۔ تو بالائی سوراخوں کو بند کر کے نیچے سے پانی بہ جائے اور اس طرح سے گولوں کے بطون خالی رہیں۔ تاکہ ہوا آسانی سے کشید کی جا سکے۔ اور کشتی ہلکی ہو کر بادبانوں اور پار چات کی مدد سے بلندی کی طرف پرواز کرے۔ اگرچہ یہ نقشہ کاغذ میں اور مخترع کے دماغ میں مدفون ہونے کے باعث جامۂ عمل نہ پہن سکا تھا۔ تاہم وہ بصیرت کیش فلسفی جس نے ایسے ہزاروں نقوش کی تخلیق کی تھی اس پر زیادہ قدرت رکھتا تھا۔

بیسنر (Besnzer) فرانسیسی نے انسان کے اڑنے کے لئے ایک اور آلہ بنایا۔ جو "دو میل چوبی" پر مشتمل تھا۔ اس کے دونوں طرف کپڑے کے عمدہ بڑے بڑے پر لٹکے ہوئے تھے۔ اور بیسنر کا خیال تھا۔ کہ انسان ان میں سے جو اس کی کمر کے ساتھ ربڑ کی نالیوں کی وساطت بندھے ہوئے ہونے چاہئیں۔ سامنے والے شاہ پر کو ہاتھوں سے سامنے تھامے رکھے اور عقب والے شاہ پر کو رسیوں کی وساطت سے جو اس کے پاؤں میں بندھی ہوئی ہوں۔ پاؤں سے ہلاتا رہے۔ یہ خیال بھی مخترع کی زندگی میں تجربہ نہ ہو سکا۔ اور اس وقت تک بادشاہوں اور عوام الناس نے بھی ایجاد کنندگان کے ان تخیلات و نظریات کو قابلِ التفات نہ سمجھا۔ کیونکہ وہ اس راستے میں کامیابی کی راہیں مسدود پاتے تھے۔

۱۷۰۹ء میں ایک پرتگالی گوسماؤ نے ایک اور طیارہ ایجاد کیا۔ اور شاہ پرتگال کے روبرو تجربہ کے لئے پیش کیا۔

یہ طیارہ ایک سبد۔ دو پروں اور ایک بادبان پر مشتمل تھا۔ اسے حرکت دینے کے لئے زمین پر سے رسیاں ہلائی جاتی تھیں اور اسی طرح صبر آزما وقت کے بعد آہستہ آہستہ وہ آسمان کی جانب صعود کرتا تھا۔ چنانچہ جب والیٔ پرتگال اور مفکرین کے روبرو اس کا تجربہ کیا گیا۔ تو زمین سے چند فرلانگ بلند ہو کر نیچے آ رہا۔ اس ناکامی پر پرتگالی مفکر نہ صرف بادشاہ کی نظروں سے گر گیا۔ بلکہ اس کی تمام تر مساعی عامۃ الناس کے لئے بھی سامانِ تضحیک و تفنن بن کر رہ گئی۔ اس کے بعد نصف صدی تک کسی کو طیارہ ایجاد کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور اگر بعض مفکرین نے خفیہ طور پر اس عجیب و غریب مسئلے کو حل کرنے کی کوشش بھی کی۔ تو ان کی کوششیں ناکامی کے خوف سے منصۂ شہود پر آنے کی جسارت نہ کر سکیں۔

منصور طارق

قطعہ

(از منصور طارق)

ابر ہے چرخ پہ اور رُت ہے سہانی ساقی!   وجد انگیز ہے جہلم کی روانی ساقی!

سخت کافر ہے جو کہتا ہے کہ دے آج شراب   بڑھ کے بادہ سے ہے یہ سادہ سا پانی ساقی!

* کپڑے کے دو ٹکڑے بمنزلہ ہاتھ پاؤں حرکت دینے کیلئے نصب تھے جس کے علاوہ [illegible]

"اعجازِ فصاحت"

خاندانِ بنو امیہ کی حکومت کا دَور دورہ تھا۔ حجاج بن یوسف بصرہ کا گورنر تھا۔ وہ فطرتاً تشدد پسند تھا۔ اسی تشدد پسندی کی وجہ سے اس نے یہ حکم دے رکھا تھا۔ کہ جو شخص رات کو نشہ کی حالت میں بازار میں پھرتا ہوا پایا جائے اس کا سر قلم کر دیا جائے۔

موسمِ بہار کی ایک رات کا ذکر ہے۔ کوتوالِ شہر گورنر کے حکم کی تعمیل میں شہر کے بازاروں میں گشت کر رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند کرنوں کی بارش برسا رہا تھا۔ چاندنی کی سفید چادر میں تمام عالم محوِ خواب تھا۔ نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ نیند کا عالم تھا۔ سوائے کوتوال اور اس کے چند دیگر ساتھیوں کے کوئی بیدار نہ تھا۔ اچانک کوتوال کی نظر تین آدمیوں پر پڑی۔ جو کوتوال کی آمد سے بالکل بے خبر بے خودی کی حالت میں جھومتے ہوئے آ رہے تھے۔ کوتوال کو مشبہ گزرا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر لو۔ چنانچہ سپاہی ان کو گرفتار کر کے کوتوال کے پاس لے آئے۔ کوتوال نے پوچھا:۔

تم کون ہو؟ جو حاکمِ شہر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس حالت میں پھر رہے ہو۔ ان تینوں میں سے ایک نے جواب دیا:۔

أَنَا ابْنُ مَنْ دَانَتِ الرِّقَابُ لَهُ
مَا بَيْنَ مَخْزُومِهَا وَهَاشِمِهَا
تَأْتِيهِ بِالرَّغْمِ وَهِيَ صَاغِرَةٌ
يَأْخُذُ مِنْ مَالِهَا وَمِنْ دَمِهَا

یعنی میں اس شخص کا فرزند ہوں۔ جس کے لئے قبیلۂ مخزوم و ہاشم کے تمام لوگوں کی گردنیں جھکی رہتی ہیں۔ وہ سب لوگ اس کے پاس خلافِ مرضی آتے ہیں اور وہ مجبور ہوتے ہیں اور میرا باپ ان کے مال اور خون سے حسبِ خواہش لے لیتا ہے۔

کوتوال نے خیال کیا۔ کہ شاید مقربینِ امیر المومنین میں سے کسی کا فرزند ہوگا۔ اس لئے اس کو قتل کرنا مصلحت کے خلاف جانا اور قید کر لیا۔

پھر دوسرے سے وہی سوال کیا۔ جو پہلے کیا تھا۔ اس نے جواب دیا:۔

أَنَا ابْنُ مَنْ لَا تَنْزِلُ الدَّهْرَ قِدْرُهُ
وَإِنْ نَزَلَتْ يَوْماً فَسَوْفَ تَعُودُ

تَرَى النَّاسَ أَفْوَاجاً إِلَى ضَوْءِ نَارِهِ
فَمِنْهُمْ قِيَامٌ حَوْلَهَا وَقُعُودُ

یعنی میں اس کا فرزند ہوں۔ جس کی ہانڈی زمانے میں کبھی نہیں اتری۔ اور بالفرض اگر اتری۔ تو پھر چڑھا دی گئی۔ عوام الناس میرے باپ کی جلتی ہوئی آگ کی طرف فوج در فوج دیکھتے رہتے ہیں۔ بعض اس کے گرد کھڑے ہوتے ہیں اور بعض بیٹھے ہوتے ہیں۔

کوتوال نے سمجھا۔ کہ شاید اشرافِ عرب میں سے کسی کا فرزندِ ارجمند ہوگا۔ اس لئے اس کو بھی محبوس کرنا ہی مناسب سمجھا۔

اور تم کون ہو؟ کوتوال نے تیسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب دیا:۔

أَنَا ابْنُ مَنْ خَاضَ الصُّفُوفَ بِعَزْمِهِ ❋ وَقَوَّمَهَا بِالسَّيْفِ حَتَّى اسْتَقَامَتِ
رِكَابَاهُ لَا تَنْفَكُّ رِجْلَاهُ مِنْهُمَا ❋ إِذَا الْخَيْلُ فِي يَوْمِ الْكَرِيهَةِ وَلَّتِ

یعنی میں اس کا فرزند ہوں۔ جو اپنے ارادے سے صفوف کو چیرتا اور ان کو تلوار سے سیدھا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ درست ہو جاتی ہیں۔ اس کے پاؤں ہمیشہ رکابوں میں رہتے ہیں۔ اس دن جب کہ جنگ ہو رہی ہو اور گھوڑے بھی پیٹھ پھیر دیں۔

کوتوال نے خیال کیا کہ یہ شاید شجاعانِ عرب میں سے کسی کا فرزند ہوگا۔ چنانچہ اسے بھی گرفتار کر لیا۔ اور تینوں کو زنداں میں بھیج دیا۔

دوسرے دن کوتوال گھبرایا ہوا دربارِ حجاج میں حاضر ہوا۔ اور رات کا سارا واقعہ گوش گزار کیا۔ حجاج نے تینوں قیدیوں کے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ان کو دربار میں لایا گیا تو حجاج نے ان سے ان کا حسب نسب پوچھا۔ یہ معلوم کر کے حجاج کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ ان میں سے پہلا حجام کا بیٹا تھا۔ دوسرا نانبائی کا اور تیسرا جلاہے کا۔

حجاج نے حاضرینِ دربار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ تم بھی اپنی اولاد کو ادب سکھاؤ۔ خدا کی قسم اگر ان میں یہ فصاحت نہ ہوتی۔ تو میں ان کی گردنیں اڑا دیتا۔

حجاج نے ان تینوں کی رہائی کا حکم دیدیا۔ اور خلعتِ فاخرہ سے بھی سرفراز فرمایا۔

(ترجمہ عربی)

محمد فاضل (کراچی کیمپ)

دوست

میں گاڑی کے جس ڈبہ میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اُسی میں داخل ہوا۔ اُس کے جسم پر ایک دھاریدار کوٹ تھا۔ اور ہاتھ میں ایک سُوٹ کیس جسے اُس نے اپنی نشست کے اوپر تختے پر رکھ دیا۔ اور میری طرف متوجہ ہوا۔ یکایک اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ اور وہ بولا۔

"آہا۔ آپ ہیں؟"

میں نے بھی خندہ پیشانی سے کہا۔ "ہاں۔ میں ہوں۔"

اُس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ "واللہ آج خوبیٔ قسمت سے ملاقات ہوگئی کسے خیال تھا کہ ہم گاڑی میں ملیں گے۔"

میں خاموش ہو رہا۔ اُس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا "خوب! تمہاری صورت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔" میں نے بھی مُسکراتے ہوئے کہا۔ "واہ! آپ کی قطع وضع بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی۔" "تمہیں زیادہ مضبوط و توانا ہونا چاہیئے تھا۔" اُس نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب دیا۔ "ہاں۔ لیکن آپ بھی تو پہلے کی نسبت زیادہ فربہ نہیں۔"

میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون حضرت ہیں۔ کیونکہ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق تھا۔ میں نے انہیں آج پہلی ہی دفعہ دیکھا تھا۔ بہت غور و فکر کیا۔ تمام دوستوں کا ذہنی طور پر جائزہ لیا۔ مگر وہ ان میں سے نہ تھا۔ میرا حافظہ کمزور نہیں تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے اپنے تمام دوستوں کے نام یاد نہ ہوں۔ یا جب میں پچھلی بار اُن سے ملا ہوں تو وہ لباس یاد نہ رہے ہوں جن میں ملبس تھے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کہ جب کوئی آشنا مجھے ملنے آیا ہو تو میں نے اسے پہچانا نہ ہو۔ میں کبھی آج تک کسی دوست کو نہیں بھُولا۔ تاہم میں نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ کہ میں اسے نہیں جانتا۔ طبیعت پر قابو رکھا۔ اور کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی۔ میرا آشنا بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا۔ "عرصہ ہوا کہ ہم ایک دوسرے سے ملے تھے۔" میں نے کچھ افسردگی سے جواب دیا۔ "ہاں بہت مدت گزر گئی ہے۔" میں اُس پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کہ مجھے اس کا صدمہ ہوا ہے۔ پھر اُس نے کہا۔ "لیکن یہ زمانہ بہت جلدی گزر گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "آناً فاناً"

اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "عجیب بات ہے زمانہ گزر رہا ہے اور وہ دوست جو ہر وقت پاس رہتے تھے اب دکھائی نہیں دیتے۔ میں اکثر اس بات پر غور کر کے حیران ہوتا ہوں کہ وہ عہدِ شباب کے تمام دوست اب کہاں گئے۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی اکثر غور کرتا رہتا ہوں۔"

درحقیقت میں اُس وقت اس سوچ میں تھا کہ ایسے موقعوں پر انسان جلدی یا دیر کے بعد اپنے قدیم رُفقا یا بچوں یا دیگر خویش و اقارب کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔

اُس نے کہا۔ "کیا تم اُس مقام پر جاتے ہو جہاں ہم اکثر ملا کرتے تھے۔"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں۔ کبھی اتفاق نہیں ہوا۔" میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کونسا مقام ہے۔ تب اُس نے کہا۔ "نہیں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ تم ضرور کبھی جاؤ گے۔"

میں نے دبی زبان میں کہا "اجی نہیں۔"

اُس نے جواباً کہا۔ "میں سمجھا۔ مجھے معاف کیجئے۔" کچھ دیر تک ہم خاموش رہے۔ پھر اُس نے سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں مجھے یاد آیا۔ مجھے اکثر احباب ملتے رہتے ہیں اور وہ آپ کے متعلق اکثر پوچھتے ہیں۔ کہ آپ کیا کام کرتے ہیں۔" "لغو۔ بیہودہ" میں نے دل میں خیال کیا۔ تاہم میں نے بہتر سمجھا۔ کہ کچھ زور سے کہوں۔ چنانچہ میں نے بلند آواز سے دریافت کیا۔ "کچھ پتہ ہے۔ آج کل نذیر کہاں ہے۔ کبھی تم نے اس کے متعلق سُنا؟"

میں نے جان بوجھ کر نذیر کا نام لیا۔ کیونکہ یہ نام عام طور پر مستعمل ہے اور اُس کے کسی نہ کسی دوست کا نام ضرور ہوگا۔

میرے دوست نے جواب دیا۔ "ہاں پچھلے موقع میں نے نذیر کو میدان میں دیکھا تھا۔ اب اُس کی صحت بہت اچھی ہے۔ دو سو پونڈ وزن ہے۔ تم اُس کو پہچان نہ سکو گے۔"

میں نے دل میں خیال کیا۔ ہاں میں نہیں پہچان سکوں گا۔ پھر میں نے دریافت کیا۔ "رشید کہاں ہے۔ کیا کام کرتا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "آپ کا مطلب نذیر کے بھائی سے ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ ہاں۔ نذیر کا بھائی۔ میں اکثر اسے یاد کرتا ہوں۔"

اس نے جواب دیا۔ "رشید تو اب بالکل بدل گیا ہے۔ وہ اب کاروبار میں مشغول ہے۔" اس پر وہ مُسکرایا اور کہا۔ "رشید کی اب شادی بھی ہو گئی ہے۔" میں بھی ہنسنے لگا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب تک گاڑی نہ ٹھہرے میں ہنستا رہوں۔ ...... ابھی پچاس میل کا سفر باقی تھا۔ اور پچاس میل کے سفر کو طے کرنے تک

ہنستے رہنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے۔ کہ کس طرح بگر میرا دوست اس کو کب گوارا کر سکتا تھا۔ اُس کی گفتگو ختم نہ ہونے پاتی تھی۔"

وہ پھر کہنے لگا۔" میں نے بارہا خیال کیا کہ آپ کو خط لکھوں خصوصاً جب میں نے اُس نقصانِ عظیم کے متعلق سُنا جو آپ کو اُٹھانا پڑا۔" کیا میں کہیں روپیہ کھو بیٹھا۔ اگر ایسا ہوا تو کتنا روپیہ تھا۔ اور کس طرح ضائع کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کون سا صدمہ ہوا۔ اور کتنا؟ میں مصلحتاً خاموش رہ کر منتظر رہا۔ کہ دیکھوں اب میرا دوست کیا کہتا ہے۔ وہ پھر ہمکلام ہوا" موت سے ہمیشہ صدمہ ہوتا ہے"۔ میں زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ اور غم کے آثار میرے چہرے سے نمایاں ہونے لگے۔ میں نے آہستگی سے کہا۔" ہاں یہ رنج بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا دوسرا پہلو بھی ہے۔" اس نے ہمدردی سے کہا" ہاں، خصوصاً اس عمر میں۔ مرحومہ کی زندگی بہت پاکیزہ تھی"۔

میں نے بھی بات بناتے ہوئے کہا" ہاں اخیر عمر تک صحت اچھی رہی۔ کوئی بیماری نہ تھی۔ لیکن دفعتہً سیڑھی سے گرنے کی وجہ سے چوٹ لگی اور وہ جاں بحق ہوئیں۔" اُس نے افسوس کیا اور گھبراہٹ سے پوچھا" کیا تمہاری دادی صاحبہ سیڑھی سے گری تھیں"۔" میری دادی"۔ اب مجھے معلوم ہوا۔ کہ میرا کون سا نقصانِ عظیم تھا۔ اِس اثناءمیں ٹرین دو تین اسٹیشن چھوڑ آئی تھی۔ اور ہم نے باہر جھانک کر بھی نہ دیکھا۔ اب پھر اس کی رفتار کم ہوئی۔ میرے دوست نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی تھی۔" اوہو۔ یہ تو جنکشن ہے۔ مجھے پچھلے اسٹیشن پر اُترنا تھا۔ جب ٹرین ٹھہری تو اُس نے کھڑکی سے جھانک کر ایک مزدور سے پوچھا" ہم یہاں کتنی دیر ٹھہریں گے۔ اُس نے کہا" صرف دس منٹ۔ یہ پہلے ہی دیر سے پہنچی ہے۔" میرا دوست اپنی نشست سے اٹھا۔ کنجیوں کا ایک گچھا نکالا۔ لیکن گھبراہٹ میں کنجی کا پتہ نہ لگا۔ اور سوٹ کیس نہ کھول سکا۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولا" مجھے ٹیلیگرام گھر بھیجنا ہے۔ لیکن روپیہ سوٹ کیس میں ہے۔ مجھے تشویش ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے جیب سے کچھ رقم نکالتے ہوئے کہا" آپ گھبرائیں نہ۔ یہ رقم مجھ سے لیں سوٹ کیس پھر کسی وقت کھول لیں۔" اُس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا" آپ کی بہت نوازش ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ میں جتنے پیسے تھے اُٹھا لئے۔ غالباً پانچ روپے کی ریزگاری ہو گی۔ لپک کر گاڑی سے نیچے اترا۔ اور جلدی میں سوٹ کیس بھی چھوڑ گیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ وہ ویٹنگ روم میں جا رہا ہے۔ اور وہ زیادہ تیزی سے نہیں جا رہا تھا۔ میں اس کی واپسی کا منتظر رہا۔ تمام مسافر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گھنٹی بجی۔ گارڈ نے جھنڈی دکھائی اور گاڑی چلدی۔ میں اُس شخص کا انتظار کرتا رہا۔ پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر میں نے ایک قُلی کی آواز سنی جو کسی کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اور وہ شخص پکار رہا تھا۔ کہ میرا سوٹ کیس کسی ڈبے میں رہ گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے قریب پہنچے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس شخص کا چہرہ پھول کی طرح کھلا۔ وہ مجھے ملنے کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اپنے سوٹ کیس کے لئے۔ وہ اپنا سوٹ کیس لے کر چلدیا۔

.... مجھے اپنی رقم کا خیال نہ رہا۔ اور نہ اُس نے ہی ادا کرنے کا ارادہ کیا۔

اُس کے چلے جانے کے بعد میں خیالات میں کھو گیا۔ کبھی اُن دوستوں کا خیال آتا جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ کبھی رشید کی شادی کے متعلق غور کرتا اور کبھی اپنی دادی مرحومہ کی موت یاد آتی۔ جس کا اُس نے تذکرہ کیا تھا۔ اور زیادہ پریشانی مجھے اپنی رقم کے کھو جانے کی تھی۔ میں تو مفت میں لٹ گیا۔ آئندہ جب کبھی گاڑی میں مجھے کوئی اجنبی ملے گا تو اتنا ہوشیار رہ نہ ہوں گا۔

شریف انور گیلانی

رباعی

ہر آہ کو طوفانِ ترنم پایا
ہر سانس کو بے تابِ تکلم پایا
کیفیتِ دنیائے محبت توبہ
ذرّوں کے بھی ہونٹوں پہ تبسم پایا

سراج الدین ظفر

تنویرات

سائنس کی رفتارِ ترقّی

نئی نئی ایجادات واختراعات کے باعث موجودہ دور صحیح طور پر سائنس کے ارتقا کا دور کہلانے کا مستحق ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ لیلائے سائنس کے دیوانوں نے ایسے ایسے رازہائے سربستہ کا انکشاف کیا ہے۔ کہ آج سے کچھ سال پہلے انسانی دماغ اُن کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہوائی جہاز آبدوز کشتیاں، وائرلیس، آلاتِ تفتیش جرائم اور اسی نوع کی ہزاروں چیزیں سائنس کی وسیع اور مضبوط دسترس کا ناقابلِ تردید اور روشن ثبوت ہیں۔

مندرجہ بالا نوعیت کی اشیار کی تحقیق وافشا کے بعد ماہرینِ سائنس نے اپنی توجہ قدرتی عناصر کی جانب مبذول کی۔ انہوں نے دیکھا، کہ سورج کی روشنی جہاں بے شمار مضرت رساں کیڑوں کے لئے پیغامِ ہلاکت ہے، وہاں نوخیز پودوں انسانوں اور دوسرے جانداروں کے لئے سامان بقا و نویدِ حیات بھی ہے۔ انہوں نے انسانی زندگی کی طوالت اور اختصار کے اسباب پر غور کیا۔ اور آخر کار انتہائی جانفشانی کے بعد معلوم کر ہی لیا، کہ انسان کے جسم میں مختلف قسم کی حیاتین اور وٹامن پائے جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص بیمار ہو تو سمجھ لینا چاہیئے، کہ کوئی وٹامن اُس کے جسم سے کم ہو گیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اُسے صحت مند بنانے کے لئے وہ وٹامن کیونکر حاصل کیا جائے۔

وٹامن کی دریافت ایک معمولی شے نہیں ہے اور نہ ہر شخص چند کیمیاوی اجزار کے تجزیے اور علم نباتات کے محدود صحیفے پڑھنے سے اس قابل ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اِن ارضی جڑی بوٹیوں یا اِن دنیاوی اشیاء میں سے مطلوبہ وٹامن تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ وٹامن کی تلاش انسانی دماغ وادراک کی سخت ترین آزمائش ہے۔ بڑے بڑے ماہرینِ کیمیا اس صبر آزما تجسّس سے اکتا جاتے ہیں۔ اور انتہائی محنت شاقہ کے بعد اگر وہ اس بیش قیمت شے کو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ تو صحتِ تحقیق کا یقین کرنے کے لئے حیوانات پر آزماتے ہیں۔ اتنی دشوار گزار راہیں طے کرنے کے بعد انسانوں پر آزمانے کی نوبت آتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک آدمی "عدم انجمادِ خون" کا مریض ہے۔ "عدم انجماد خون" سے مراد خون کا بہتے رہنا ہے۔ بعض اشخاص کا لہو رگوں سے نکل کر منجمد نہیں ہوتا یا اگر کسی جگہ چوٹ لگ جانے کے باعث خون نکلنے لگے تو بند ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات زیادہ خون بہہ جانے کے باعث موت واقع ہو جاتی ہے۔ محققین کے نظریات کے مطابق اس خرابی کے دیگر اسباب میں سے وٹامن "ک" کی کمی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں یہ وٹامن صبر آزما تجربات کے بعد معلوم کیا گیا ہے۔ ڈنمارک بائیوکیمیکل انسٹیٹیوٹ کے محققین کے وہ دو مکتوب جو انہوں نے سائنس کے لندنی جریدہ "نیچر" کو کچھ عرصہ ہوا، لکھے تھے۔ مظہر ہیں، کہ سب سے پہلے مرغی کے بچّوں کی ایسی غذاؤں سے پرورش کی گئی، جن میں وٹامن "ک" مفقود تھا۔ تو اُن میں عدم انجماد خون" کی بیماری کے نشانات نمایاں ہونے شروع ہو گئے۔ اب اُن کی غذا میں ٹماٹر اور اسی قسم کی دیگر ترکاریاں بڑھا دی گئیں، تو ان کی تمام شکایات رفع ہو گئیں۔

اِس وقت تک یہ وٹامن سور کی کلیجی میں سے زیادہ مقدار میں ملا ہے۔ اس کلیجی میں سے متذکرہ وٹامن علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تا حال اس قسم کی کوئی تجرباتی کوشش بروئے کار نہیں لائی گئی۔ اپنی متعدد خصوصیات کے باعث یہ وٹامن اس شہرۂ آفاق وٹامن سے بہت ملتا جلتا ہے۔ جو جانداروں میں بقائے نسل کے لئے لابدی ہے۔ اور وٹامن "ای" کے نام سے مشہور ہے۔ گندم وٹامن "ای" کا صحیح طور پر مخزن ومولد کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے اور چونکہ گندم میں وٹامن "ک" نہیں ہوتا۔ اور سور کی کلیجی میں وٹامن "ای" برائے نام ہوتا ہے۔ اس لئے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ ان دونوں وٹامنوں میں ظاہری مشابہت کے علاوہ کیفیتی واساسی اختلاف ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ کہ یہ تو دریافت وٹامن "عدم انجمادِ خون" کے مرض کے انسداد کے لئے کس حد تک مفید ثابت ہوا ہے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ وٹامن کی اس ایجاد نے متعدد انسانی عوارض کے قلع قمع کرنے میں کافی حد تک آسانیاں بہم پہنچائی ہیں

ان امور سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے زمین، چاند، سیاروں، ستاروں، سورج اور دیگر اجرامِ فلکی و ارضی کی ساخت، فوائد اور نقصانات پر غور کرنا شروع کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنی عجیب و غریب ایجادات سے ایک دنیا کو محوِ حیرت کر دیا۔ سائنس دانوں کی جانب سے شروع شروع میں جو چیزیں پیش کی گئیں۔ وہ اس درجہ اہم اور مافوق الفطرت نہ تھیں۔ لیکن توہم پرست ہندوستانیوں نے اپنے دماغی افلاس اور کوتاہیٔ عقل کے باعث اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور غریب سائنس والوں کی تمام تر مساعی کو سراپائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ یہ صحیح ہے، کہ وہ بعض بعض اختراعات میں بہت کامیاب رہے، مگر اکثر معاملات میں انہوں نے منہ کی کھائی۔

نیویارک کے ایک نمائندہ اجلاس میں ڈاکٹر کولن فنک پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی نے تقریر کرتے ہوئے موجودہ سائنسدانوں کے روبرو ایک نئی چیز پیش کی۔ آپ نے کہا "میں اس بات پر پورا ایمان رکھتا ہوں۔ کہ عنقریب دنیا سے کوئلے اور تیل کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس چیز سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ کہ پانی کی تنہا طاقت نظامِ عالم کے قیام کی کفیل ہو سکے گی۔ آپ نے ثابت کیا۔ کہ پانی کی طاقت دنیا کی ضروریات کو دس فیصدی بھی پورا نہیں کر سکتی —

سائنس کے اس ہنگامہ افروز اور سنسنی خیز مسئلے پر بحث کرتے ہوئے آپ نے کہا۔ کہ اس مشکل کا واحد حل یہی ہے۔ کہ ہم آفتاب کی روشنی سے براہِ راست طاقت حاصل کریں۔ آپ نے تجربات سے ثابت کیا کہ آفتاب کی روشنی سے بجلی پیدا کرنے کا آلہ بنایا جا سکتا ہے۔

کولن فنک کا یہ حیرت انگیز انکشاف علمائے سائنس کے دماغوں کے لئے بیداری اور تجسس کا مؤثر تازیانہ ثابت ہوا۔ وہ اپنی جملہ مصروفیات بھول گئے۔ اور شبانہ روز اسی فکر میں رہنے لگے کہ کسی طرح اُن چیزوں کا بدل پیدا کرنا چاہیئے جن کے بل بوتے پر کارگاہِ عالم کے تمام نظام کا انحصار ہے۔ کئی سال کی عرق ریز مساعی کے بعد انہوں نے ایک ایسا لیمپ ایجاد کیا جس کی روشنی ترکیب میں سورج کی شعاعوں سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ لیمپ معمولی پارے کے مرکب سے روشن ہوتا ہے۔ پہلے اس مرکب میں قدرے پوٹاسیم بھی ملا دیا جاتا تھا۔ تاکہ اس کی روشنی ترکیبی طور پر سورج کی روشنی سے مشابہ ہو سکے۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ پوٹاسیم سے لیمپ خراب ہو جاتا ہے۔ اس میں روبیدیم نامی عنصر بلے ڈرام شامل ہے۔ روبیدیم نامی عنصر نادر و کمیاب ہونے کے باوصف انتہائی گراں ہے۔ لیمپ مذکور شعاعوں سے علاج کرنے والے ڈاکٹروں کے ہاں عام استعمال ہوتا ہے اور سورج کی شعاعوں کا بہترین بدل ثابت ہوتا ہے۔

اپریشن کی جانگسل تکالیف اور درد کی شدت سے تنگ آکر لاکھوں انسانوں نے اپنی جانیں دے دیں۔ مگر اپریشن گوارا نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپریشن کے متعلق عوام کے خیالات اچھے نہ رہے۔ اُن کے دلوں اور دماغوں پر ایک تشویشناک خوف کے علاوہ مایوسی اور پریشانی مسلط ہو گئی۔ ہر شخص اپریشن سے خائف رہنے لگا۔ اس ہمہ گیر پریشانی کے اندفاع کے لئے کلوروفارم استعمال کیا گیا لیکن تجربے نے بہت جلد اس کو بھی ناقابلِ رواج قرار دیا۔ کلوروفارم کے استعمال سے مریضوں پر ایک ناخوشگوار سا اثر طاری ہو جاتا تھا۔ اور بعض اوقات مضبوط و تنومند اجسام کے اشخاص پوری طرح بیہوش کبھی نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات کامیاب اپریشن بھی ... ... بھی ناکامیاب اپریشن ہو جاتے تھے۔ اور مریض کی زندگی خطرے میں محصور ہو جاتی تھی۔

اب ایک جرمن ڈاکٹر نے ایک جدید دوا تیار کی ہے۔ جو کلوروفارم کی نسبت بدرجہا مفید پائی گئی ہے۔ اس کی پچکاری سے مریض پندرہ سیکنڈ کے قلیل عرصے میں بیہوش ہو جاتا ہے۔ اور ایسا محسوس کرتا ہے۔ گویا قدرتی نیند کے مزے لے رہا ہے۔ مشہور امریکن ڈاکٹر سیلڈر برنیڈ کا بیان ہے۔ کہ یہ جدید دوا بے ضرر ہے۔ اور کلوروفارم کی مانند ناخوشگوار اثرات تخلیق کرنے کی بجائے سکون و طمانیت پیدا کرتی ہے۔ امریکہ میں ۱۹۰۰ مریضوں پر نہایت کامیابی سے آزمائی جا چکی ہے۔

اکثر ماہرینِ طبیعات اِن دنوں ریڈیم کی شعاعوں کا بدل ڈھونڈنے میں سرگرم ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں۔ جو ریڈیم کی شعاعوں کو دوسرے طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مؤخر الذکر حضرات میں سے مادام کیوری کی دخترِ مادام آئرین جولیٹ کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے۔ یہ خاتون اپنے خاوند کے ساتھ اس تحقیق میں شریک ہے۔ ماہرینِ طبیعات کی جو کانفرنس لندن میں انعقاد پذیر ہوئی تھی۔ اُس میں میاں بیوی دونوں نے شمولیت کی، اور ایک تقریر کے دوران میں کہا۔ کہ انہوں نے ریڈیم سے خارج ہونے والی شعاعیں دوسرے طریقوں سے بھی پیدا کر لی ہیں۔

ایک امریکن ڈاکٹر نے انسانی سماعت کا بدل ایک آلہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس آلے کو کان کے پیچھے لگانے سے ہوا ہڈیوں کے راستے اندر داخل ہوتی ہے۔ جن کی وساطت سے آواز کی لہریں اندر داخل ہو کر دہنِ گوش سے متصادم ہوتی ہیں۔ اور اس طرح بہرے بھی آسانی سے سُن سکتے ہیں۔

منصور طارق

اقبال کے نغمات

ہوتا ہے نشہ تیز مرا پیر خرابات — میخانۂ تقدیر ہیں اقبال کے نغمات
حاصل ہو خودی کا اگر انداز حُدی کو — طے ہوتے ہیں ناقہ کے بہت جلد مقامات
کہتا ہے پتے کی جو کوئی مردِ سخن سنج ہو — اِک پل میں نکل جاتے ہیں صدیوں کے توہمات
پیتا ہے جو اقبال کے مینائے صفا سے — ممکن نہیں وہ رند رہے محوِ خرافات

تب جانوں کہ تاثیر ہے میری بھی نوا میں
زاہد کی کرامات کا ٹوٹے جو طلسمات

کچھ غازۂ تفسیر کی حاجت نہیں واعظ! — رخشندہ و تابندہ ہیں اللہ کے آیات
تنویر کے آداب نہیں سیکھتا خورشید — خود اس کی کرن چیرتی ہے سینۂ ظلمات

عارف نہیں، جو اپنی خودی کا نہیں عارف
یا قسمِ نباتات ہے یا قسمِ جمادات

اِک زاہد مرتاض سے کہتا تھا کوئی بُوم — دن آپ کی خاطر ہے تو ہے میرے لئے رات
گو آپ کی صحبت کا شرف ہوتا ہے حاصل — آپ ایسے بزرگوں کی غنیمت ہے ملاقات
کیا دن کو شکار آپ کو کافی نہیں ملتا؟ — انسان پہ کیا ہو نہیں سکتی بسر اوقات
یزداں کو بھی اب ہضم ہے کرنے کا ارادہ — پھیلایا جو ہے رات کو یہ دامِ مناجات
فرمایا مناجات سے مطلب نہیں کچھ اور — کرتا ہوں فقط تیز میں اس سان پہ آلات

شبخوں تو نہیں مارتا کچھ ملک پہ تیری
ہم پیشہ و ہم فن سے دغا ایسی بھی کیا بات

روشن دین وکیل

آفتاب

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

ایک حسین نوجوان لڑکی گھٹنوں کے بل دریا کے نزدیک ایک تختہ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک نوجوان "روپہلی نشان" (Badge) پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ اور اس کی جھالر کو ٹٹول رہا ہے۔ لڑکی کے ابرو تنے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھیں اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ نوجوان کی نگاہیں لڑکی کے چہرہ پر گڑی ہوئی ہیں۔ اس کا سنجیدہ اور متفکر چہرہ آفتاب اپنی روشنی سے منور کر رہا ہے۔ دریا خاموشی سے رواں ہے۔ کوئل کی آواز آرہی ہے۔ کنول اپنی بہاریں لہلہا رہا ہے۔

لڑکی:۔ خدا جانتا ہے وہ کیا کہتا ہوگا؟ جم!

نوجوان:۔ کہنے دو۔ اسے بہت دیر ہوگئی ہے ——— بس!

لڑکی:۔ وہ ابتدائی لمحات کھو چکا ہے۔ مجھے خوف ہے۔۔۔ آہ! وہ مجھے چاہتا ہے!

نوجوان:۔ اور کیا میں تمہیں نہیں چاہتا؟

لڑکی:۔ نہیں نہیں! مجھے انتظار کرنا چاہیئے ——— میں جنگ میں اس کے ساتھ۔۔۔۔۔۔

نوجوان:۔ اور میرے متعلق؟ کیا میں جنگ میں نہیں تھا؟ اپنی بساط کے مطابق جو کچھ میں حاصل کر سکا، میں نے حاصل کیا۔

لڑکی:۔ ۔۔۔۔۔ آہ!۔۔۔۔۔

نوجوان:۔ کیا تم۔۔۔۔۔۔۔۔؟

لڑکی:۔ نہیں نہیں! تمہاری طرح نہیں، جم!۔۔۔ تمہاری طرح نہیں۔۔۔۔۔ وہ خاموشی پسند ہے ——— وہ نہیں بولے گا۔۔۔

نوجوان:۔ جرأت سے کام لو۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ چلو۔

لڑکی:۔ نہیں! میں نے اس سے وعدہ کیا ہے!

نوجوان:۔ وعدہ؟ ایک آدمی کی تقدیر، دوسرے آدمی کے لئے زہرِ قاتل ہے۔۔۔۔ سوچو!

لڑکی:۔ مجھے منتظر رہنا چاہیئے۔ جم! مجھے خیال نہ تھا۔ کہ وہ جنگ سے صحیح سلامت واپس آئے گا۔۔۔۔

نوجوان:۔ ممکن ہے۔۔۔۔۔ وہ نہ آئے!

لڑکی:۔ (پیچھے مڑ کر راستہ کی طرف دیکھتے ہوئے) وہ کیسا انسان ہے؟ ——— میں حیران ہوں ——— !

نوجوان:۔ (لڑکی کا کندھا دباتے ہوئے) رنگین پھول! کیا تم میرے ساتھ وفا نہ کرو گی۔۔۔۔۔؟ (جوش سے) اچھا! اگر ایسا ہے، تو میں تم دونوں کو قتل کردوں گا

(لڑکی اس پر نگاہ ڈالتی ہے اور کانپ جاتی ہے، اور اپنے لب اس کے لبوں سے پیوست کر دیتی ہے)

لڑکی:۔ نہیں! میں کبھی ایسا نہیں کروں گی! میں تمہاری ہوں!!

نوجوان:۔ کیا تم میرے ہمراہ بھاگ چلو گی؟۔۔۔۔۔ وہ ہمیں کہیں نہیں پا سکے گا؟

لڑکی:۔ ۔۔۔۔۔۔۔

نوجوان:۔ یہاں ٹھہرنے سے فائدہ؟ ملکِ خدا ہمارے لئے تنگ نہیں ہے۔

لڑکی:۔ نہیں! مجھے ایسے خیال سے دور رہنا چاہیئے۔۔۔۔

نوجوان (اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے) قدرت کا عکس کیسا نگاریں ہے، آہ!

لڑکی:۔ کیا وقت ہوگا؟ جم!

نوجوان:۔ (سورج کی طرف دیکھتے ہوئے) تقریباً ساڑھے چار!

لڑکی:۔ (راستے کی طرف دیکھتے ہوئے) اس کا چار بجے کا وعدہ تھا!۔۔۔ اچھا! آپ تشریف لے جا سکتے ہیں!

نوجوان:۔ میں نہیں جا سکتا۔۔۔۔ میرا مقصد ابھی نامکمل ہے، ——— میں نے اس سے زیادہ خوفناک انسان دیکھے ہیں۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟

لڑکی:۔ (مایوسی سے) میں اس سے ضرور ملوں گی۔ جم! تین سال کے طویل عرصہ کے بعد، پھر اس سے ایکبار مل رہی ہوں۔

نوجوان:- وہ نوجوان ہے یا معصوم۔ . مضبوط ہے یا کمزور....؟

لڑکی:- تمہاری عمر میں ــــ اوہ! جاؤ.......جم!......چلے جاؤ۔

نوجوان:- کچھ فکر نہیں - اس کی کیا حقیقت ہے؟ کیا جنگ میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی کھوپڑیوں سے بھی زیادہ تباہی؟ جب دشمن ہم پر حملہ آور ہو رہے تھے، ہم ایک قدم بھی وہاں سے نہیں ہٹے تھے....!

لڑکی:- جم! تم اس پر ہاتھ نہ اٹھانا! وعدہ!!

نوجوان:- یہ حالات و واقعات پر منحصر ہے!

لڑکی:- وعدہ!

نوجوان:- اگر وہ خاموش رہا، تو میں ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن میرا جوابدہ ہونا ضروری نہیں! ہرگز نہیں، میں تمہیں صاف صاف کہے دیتا ہوں!!

لڑکی:- (کانپ کر) نہیں! شاید وہ ایسا نہیں کرے گا۔

نوجوان:- انکار کی صورت میں تکلیف وہ کانٹا، اسی طرح دور ہو جانا چاہیئے.....میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔

لڑکی:- خدا ہمارا حامی ہو!

نوجوان:- (مایوسی سے) آہ! ہم نے اکثر دعائیں مانگی ہیں، جس چیز کی ہم آرزو رکھتے ہیں، ہم اسے خود ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں اس وسیع دنیا میں کوئی دوسرا ہمیں دینے والا نہیں.....اور کوئی خوف مجھے تمنا سے حاصل کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔...... میں نے واقعات کی گہرائیاں دیکھی ہیں!

لڑکی:- شاید وہ بھی یہی کچھ کہے گا.....جو تم اب کہہ رہے ہو!

نوجوان:- تب ایسا کہنے والا، وہ ہو گا یا میں!

لڑکی:- میں خوف محسوس کرتی ہوں۔

نوجوان:- (نرمی سے) نہیں! رنگین پھول!! دنیا پایاب نہیں ــــ کوئی آدمی کم و بیش تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور نہ مجھے ہی۔

(وہ اپنا تیز چاقو کمربند سے نکالتا ہے)

لڑکی:- (اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) اوہ نہیں! جم!! یہ مجھے دے دو۔

نوجوان:- (مسکراتے ہوئے) کوئی خوف نہیں (وہ چاقو پھینک دیتا ہے) فی الحال ہمیں اس کی قطعاً ضرورت نہیں.....اچھا! معصوم پھول!! امید نہیں کہ جو کچھ ہم اب کہہ رہے ہیں، تم مستقبل میں بھی سنو...... زندگی بہر حال کیا ہے؟ میں نے ہزاروں زندگیاں چند منٹ میں تباہ کی ہوئی دیکھی ہیں۔ میں نے میدانوں میں بے جان لاشے مکھیوں کی طرح پڑے ہوئے دیکھے ہیں۔ میں نے خود سینکڑوں دفعہ موت کے چنگل سے نجات حاصل کی ہے۔ میں نے خود درجنوں انسان قتل کئے ہیں ــــ یہ سب کچھ بھی نہیں ــــ وہ محفوظ ہے، اگر اس نے میرے خون کو جوش آور نہ کیا۔ اگر اس نے ایسا کیا، تو کسی کی سلامتی نہیں ہے، نہ اس کی، اور نہ کسی دوسرے کی۔ بلکہ تمہاری بھی نہیں ــــ ہاں! میں حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔

لڑکی:- (نرمی سے) جم! تم سورج کی اس وسیع روشنی میں ــــ جبکہ تمام پرندے خوشی سے گا رہے ہوں ــــ جنگ پر نہیں اترو گے۔

نوجوان:- یہ اس پر منحصر ہے، مجھے جنگ کی خاص ضرورت نہیں ــــ حسینہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے بالوں سے پیار کرتا ہوں۔ میں تمہاری آنکھوں کو دیکھنا چاہتا ہوں.....

لڑکی:- اور میں تم سے محبت کرتی ہوں، جم! میں تمام کائنات میں تمہارے سوا اور کسی کو نہیں چاہتی.....

نوجوان:- میری پیاری! میں لبیک کہتا ہوں۔ مجھ سے وابستہ ہو کر، تم ایک مسرت انگیز زندگی بسر کرو گی!

جب وہ آپس میں گلے ملتے ہیں، ایک نغمے کی آواز سنائی دیتی ہے، لڑکی اس کے بازوؤں سے الگ ہو جاتی ہے۔ اور اپنے پیچھے اس پیچیدہ راستے کی طرف دیکھتی ہے نوجوان باڑھ کی اوٹ میں اس جگہ کے سامنے جہاں چاقو پڑا ہوا ہے، چھپ جاتا ہے، نغمہ نزدیک تر آ جاتا ہے۔

جہاں میدان برفیلی ہواؤں سے معطر ہیں ٭ جہاں تاریکیاں کچھ خاموشی میں سکتی ہیں
جہاں دنیا حسین معلوم ہوتی ہے ترانوں میں ٭ جہاں جوشِ جنوں پرستیاں چھائی ہیں
وہاں پہنچوں گا میں انجامِ صبر و بیکسی لے کر

لڑکی:- یہ وہی ہے!

نوجوان:- مت گھبراؤ حسینہ! میں یہیں ہوں!!

نغمہ ختم ہو جاتا ہے، ایک آواز کہتی ہے۔ "خدایا! یہ ڈیزی ہے، کیا یہ بذاتِ خود ڈیزی ہے۔" لڑکی بت بن کر کھڑی رہتی ہے، ایک سپاہی کی صورت منڈھے کی دوسری طرف سے نمودار ہوتی ہے، اس کی ٹوپی اس کی پیٹی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ اس کے بال سورج کی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ وہ ایک پتلا، کھویا ہوا، بھورے رنگ کا خوش مذاق انسان ہے۔

سپاہی:- ڈیزی!! او میری حسین لڑکی!!

لڑکی کوئی حرکت نہیں کرتی، اور جس طرح راستہ روکے ہوئے کھڑی ہے، کھڑی رہتی ہے ——

لڑکی:- آئیے جیک! (نرمی سے) مجھے تم سے کچھ کہنا ہے.....

سپاہی:- کیا کہنا ہے ایسے پر بہار دن میں؟ میرے دل میں اتنے گہرے راز پوشیدہ ہیں۔ جن کے اظہار کے لئے سالہا سال درکار ہیں.... لیکن میں خاموش ہوں ... کیا ڈیزی! تو مجھے بھول گئی ہے؟

لڑکی:- تم اتنی مدت غیر حاضر رہے؟!

سپاہی:- واقعی میری دیوی! یہ ایک دستور ہے، جس کا فوج میں رواج ہے۔ میں کہا کرتا تھا، کہ جب اس سے الگ ہو جاؤں گا۔ تو ایسے دستور کا مذاق اڑاؤں گا —— آفتاب کی طرح تمہارا تصور میرے دل میں جاگزیں تھا —— ڈیزی! جب آندھیوں میں خوشگوار مستی تھی... کیا وہ جنگل میں گزری ہوئی رات تمہیں یاد ہے؟ "جیک جلد واپس آنا اور مجھ سے شادی کرنا"... اچھا! اب میں تمہاری بارگاہ میں ہوں، مجھے بہشت بریں میں پہنچا دو، اب کوئی جنگ باقی نہیں... صف آرائیاں ختم ہو جائیں گی، خشک نیندیں تمام ہو جائیں گی۔ ہم ابھی ایک دوسرے کو محبت کے رشتوں میں منسلک کر سکتے ہیں اور ہم پُرسکون و خوشحال زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مجھے پیار کرنے دو —— ڈیزی!

لڑکی:- (پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں!

سپاہی:- (سادگی سے) کس لئے؟

وہ نوجوان ایک تیز حرکت کے ساتھ باڑھ سے نکل کر، لڑکی کے پہلو میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

نوجوان:- اس لئے سپاہی صاحب!

سپاہی:- (اچھل کر ایک بیندھ پر کھڑے ہوتے ہوئے) اوہ! تم ہو؟ آہ! آفتاب تمہارے دامن میں نہیں چمکتا.... اوہ! یہ ڈیزی ہے؟

لڑکی:- (نوجوان سے) میرا پیارا!

سپاہی:- یہ تمہارا —— پیارا ہے! بے عقل!! "یقیناً ایک ویلینمین تھا، یقیناً ایک چور تھا۔ وہ اس کا باپ تھا".... اچھا! دوست تم بھی اس کی محبت کے زمرے میں شامل تھے؟ اچھا! جیسا تقدیر کو منظور ہے، میں آج ہنسنا چاہتا ہوں.... آہ! میں تمہارا چاقو دیکھ رہا ہوں!

نوجوان:- (جس نے اپنا چاقو آدھا نکال لیا ہے) مجھ پر مت ہنسو، میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں۔

سپاہی:- تم پر نہیں... تم پر نہیں، (وہ ایک دوسرے پر نگاہ ڈالتے ہیں) میں واقعات کی عمومیت پر ہنس رہا ہوں...... تم نے یہ چاقو کہاں سے حاصل کیا؟

نوجوان:- (ہوشیاری سے) بھیڑیے سے۔

سپاہی:- اس کے متعلق سوچو! مجھے کسی نے آج تک چھوا تک نہیں۔ ...... چار سال... اور اس طرح آزاد...... ہاں! اب بھی آزاد ...... —— آہ! اب تم آئے ہو، اور میری روح کا آرام مجھ سے چھین لیا ہے..... بالکل بے سود!... آہ! بالکل بے سود!! (پہلے وہ نوجوان کی طرف اور پھر دور دیکھتا ہے) اچھا! یہ وسیع دنیا میرے سامنے ہے۔ (وہ ہنستا ہے) ڈیزی! میں تمہیں بھیڑیے کا محافظ دیتا ہوں۔

نوجوان:- (سختی سے) بیوقوف! تم نے یہ لڑکی میرے حوالے نہیں کی۔ بلکہ میں نے زور بازو سے لی ہے!!

سپاہی:- تب یہ سب کچھ صحیح ہے، تم اسے اپنے پاس رکھو۔ میرے سینے کی گہرائیوں میں ایک ہنسی ہے —— جس کو تم نظر انداز نہیں کر سکتے —— تاریک جیسے کہ تم ہو...... الوداع! معصوم ڈیزی الوداع!!

(لڑکی اس کی طرف بڑھنے کی حرکت کرتی ہے)

نوجوان:- اس کو مت چھوؤ!

(لڑکی کشمکش و پیچ میں کھڑی رہتی ہے۔ اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

سپاہی:- ادھر دیکھو دوست! ہاتھ ملاؤ!! آج کے دن جبکہ تمام کائنات منور ہے، میں ایک حسینہ کو چلاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا..... میں نے دنیا میں بہت زیادہ ناکامیاں دیکھی ہیں۔ لیکن تم اور میں دونوں اس کی پشت پر ہیں..... اچھا! اب ہم نے اپنی اپنی چوٹ کھا لی ہے۔ بس!... ہاتھ ملاؤ! دوست! ہاتھ ملاؤ۔

نوجوان:- تم کون ہوتے ہو؟ بیوقوف! تم نے کبھی اس سے محبت نہیں کی!

سپاہی:- (ایک طویل خاموشی کے بعد) اوہو! میرا خیال ہے... میں نے محبت کی ہے۔

نوجوان:- لیکن میں اس کی خاطر تم سے جنگ کروں گا۔

(وہ اپنا چاقو پھینک دیتا ہے)

سپاہی:- (آہستہ سے) دوست! اس سے فائدہ؟ تم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے..... اگرچہ ہم دونوں نے مختلف شاہراہیں اختیار کیں..

لڑکی:۔ (ملتجیانہ انداز سے) جم!

نوجوان:۔ (مٹھیاں بند کر کے) میں تم سے خیرات نہیں مانگتا ۔ ۔ ۔ میں ہمیشہ اسی چیز کی آرزو کرتا ہوں، جو میں حاصل کر سکتا ہوں۔

سپاہی:۔ ڈیزی! ہم میں سے کون تمہیں حاصل کرے گا؟

لڑکی:۔ (اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے) آہ! یہ (نوجوان کی طرف اشارہ کرتی ہے)

سپاہی:۔ دیکھو دوست! اپنا ہاتھ ڈال دو ۔ ۔ ۔ یہاں میرے پاس سوائے ایک افسردہ ہنسی کے اور کچھ نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تم اور میں اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہنسو! دوست ہنسو!!

نوجوان:۔ تم کمینے ——!

(لڑکی اچھل کر اس کا منہ بند کر دیتی ہے)

سپاہی:۔ یہ سب بے سود ہے دوست! میں لڑائی پہ آمادہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا ہے کہ میں آج ہنسوں گا۔ اور ہنستا رہوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ میں محبت اور اس کے بُرے نتائج دیکھ چکا ہوں۔ میں تباہیوں کے طوفان سے گزر چکا ہوں۔ مگر پھر کبھی نہیں —— ہنسو! دوست!! آفتاب چمک رہا ہے۔

(وہ پلٹتا ہے)

لڑکی:۔ جیک! مجھے ظالم یا تنگ دل خیال نہ کرنا!!

سپاہی:۔ (پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے) کچھ خوف نہیں میری پیاری! اپنی ترنگ میں مست ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ خدا تم دونوں پہ مہربان ہو۔

وہ گھماتا ہے، اور اسی راستہ پہ واپس چلا جاتا ہے۔ اور نغمہ ——

۵

جہاں میدان برفیلی ہواؤں سے معطر ہیں، جہاں تاریکیاں کچھ خاموشی میں سکراتی ہیں
جہاں دنیا حسین معلوم ہوتی ہے ترانوں میں، جہاں جوشِ جنوں پرستیاں ہی چھائی جاتی ہیں
وہاں پہنچوں گا میں انجام صبر و بیکسی لے کر

—— فضا میں لہرا کر گم ہو جاتا ہے۔

نوجوان:۔ وہ پاگل ہے۔

لڑکی:۔ (راستے کی طرف دیکھتے ہوئے) آفتاب کا اس پہ اثر ہو گیا ہے۔ جم!

(پردہ گرتا ہے)

(گالز وردی)

امین حزیں بہاولپور

دنیائے محبّت

(۱)

پُر ہے مئے عشق سے ایاغِ ہستی
سرشار ہے اس شے سے دماغِ ہستی
ہر پیکرِ خاکی میں محبت سے ہے نور
اس تیل سے جلتا ہے چراغِ ہستی

(۲)

بیگانۂ محبت سے کوئی شخص نہیں
اس مے سے کسے آرزوئے رقص نہیں
بنیادِ جہاں میں ہے کوئی نقص، تو ہو
بنیادِ محبت میں کوئی نقص نہیں

(۳)

اک طرفہ طلسم ہے متاعِ غمِ عشق
گویا ہے وداعِ جاں وداعِ غمِ عشق
ہو جائے تپاں شعلۂ ایمن کی طرح
جس ذرّے پہ پڑ جائے شعاعِ غمِ عشق

سراج الدین ظفر۔ بی۔ اے

رازِ ارتقا

اب تک کھُل نہ سکا یہ راز
کیوں ہے یہ عالم سوز و گداز
کیوں قدرت نے
کیوں فطرت نے
ہر ذرّہ سے چھیڑ دیا ہے درد بھرا یہ نغمۂ ساز
بیحس و بیجان
سی تغیّر
خواب پریشاں
کی تصویر
بیخبر اس سے کہ ہے کس حال میں فی احساس ہر اک دلگیر
کیا ہو گی نہ یہ ظلمت دور
کیا ہو گی نہ یہ غفلت دور
رفتہ رفتہ
درجہ بدرجہ

کیا نہ دلِ فطرت بدلے گا ہو کے محبّت سے مجبور
اور جو حالت
یونہی رہی
جو یہ مصیبت
کٹ نہ سکی
مٹ کے فنا ہو جائے تو اچھا ہر چلتی پھرتی ہستی
لیکن کچھ ہے فضا لرزاں
رنگِ تموّج سی ہے عیاں
ساری بلائیں
غم کی صدائیں
مٹ جائینگی اور نہ چلیں گے دکھتے دلوں پر پھر پیکاں
فطرت کو ہوش آئے گا دنیا ہو جائے گی رشکِ جناں

فراق گورکھپوری

"جب کسی کو محبّت ہو تو"

جوآن بچپن ہی سے مصوری کا شیدا تھا۔ چھ برس کی عمر میں جب اس نے ایک . . . . تصویر تیار کی تھی تو سب نے اس کے فن کی داد دی تھی۔ وہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ آرٹ کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔ اور جب بیس برس کا ہوا تو اسے نیویارک جانے کا شوق چرآیا۔ مصوری کا جذبہ ایک مدت تک اس کے دل و دماغ پر مستولی رہا تھا اور یہی جذبہ تھا جو اسے وہاں کے تعلیمی مراکز کی جانب کھینچے لئے جاتا تھا۔ سب کی دلی خواہش تھی کہ جوآن نیویارک جاکر مصوری میں کمال حاصل کرے۔ لیکن سرمایہ کا سوال سدِ راہ تھا۔

جولیا کار تھروس اپنے گاؤں بھر میں خوش الحان لڑکی تھی اور اس کے والدین و اقربا کا خیال تھا کہ اگر وہ موسیقی کی طرف مائل ہو تو نہایت کامیاب زندگی بسر کرے۔ اُسے خود بھی گانے کا بےحد شوق تھا۔ اس کے رشتہ داروں نے مشورہ دیا کہ وہ نیویارک چلی جائے۔ اور کسی ماہرِ فن سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرے۔

نیویارک پہنچ کر دونوں اتفاق سے ایک ہی سکول میں داخل ہوئے۔ اس درسگاہ میں طلبہ کے درمیان اکثر فنونِ لطیفہ پر بحث و تمحیص ہوتی رہتی تھی۔ اور باہمی اتحاد و مودت بےتکلفی اور خلوص کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن جوآن اور جولیا کے درمیان کچھ ایسی گہری وابستگی پیدا ہو گئی تھی کہ رفتہ رفتہ محبت کے درجہ تک جا پہنچی۔

طالب علمی کے زمانہ میں ایسے تعلقات قائم کرنا اور نبھانا یقیناً دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خانہ داری کے طریق پر ایک بورڈنگ جاری کر دیا۔ جس سے ان کے بسر اوقات کی سبیل نکل آئی۔ اور وہ دونوں اکٹھے خوش و خرم رہنے لگے۔ "اُن کو اپنے فن سے محبت تھی۔ اور جب کسی کو محبت ہو اپنے فن سے تو وہ اُس کی خاطر سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

ان کے بورڈنگ میں قیام کرنے والے طلبہ بہت خوش قسمت تھے۔ ان کے درمیان عشق اور حسن کے دیوتاؤں کا بسیرا تھا۔ وہاں موسیقی تھی ــــــ اور آرٹ تھا ــــــ "محبت میں دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی پرِ کاہ نظر آتی ہے۔" جوآن اور جولیا ہر حال میں خوش تھے۔

جوآن مصوری کا دلدادہ شیدا تھا۔ اُس نے ماہر مصور پروفیسر میجسٹر کی زیر نگرانی کام شروع کیا۔ وہاں فیس بہت تھی اور کام کم کرایا جاتا تھا۔ لیکن اس "کمی وبیشی" کے باوجود پروفیسر مذکور دنیائے مصوری کی پُر وقار شخصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اُدھر جولیا کا استاد روزن سٹاک بھی فنِ موسیقی میں یکتائے زمانہ تھا اور اس کی فیس بھی بہت گراں تھی۔

اگرچہ اخراجات کے مقابلہ میں جوآن اور جولیا کی آمدنی بہت کم تھی۔ پھر بھی وہ بہت خوش تھے۔ جب دن بھر کے تعلیمی مشاغل کے بعد وہ شام کو مل کر اکٹھے کھانا کھانے بیٹھتے تو اُن پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوتی کہ وہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتے۔

کچھ مدت بعد ان کے آرٹ پر پژمردگی چھانے لگی۔ اُن کا سرمایہ ختم ہونے لگا۔ میجسٹر اور روزن سٹاک کی فیس ادا کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ "لیکن جب کسی کو محبت ہو اپنے فن سے تو وہ اس کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔" اس لئے . . . .

جولیا نے کہا کہ میں ایک پرائیویٹ ٹیوشن لے لیتی ہوں۔ اس طرح اخراجات کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جائے گا۔ مگر وہ صرف فنِ موسیقی ہی سکھانا جانتی تھی۔ وہ دو تین دن لگاتار شہر میں چکر لگاتی رہی۔ آخر ایک شام اس نے جوآن سے کہا۔ "آج نہایت مسرت انگیز خبر لائی ہوں۔ مجھے ایک شاگرد مل گئی ہے۔ وہ مجھ سے گانا سیکھے گی۔ کیا تم جنرل پنیکے کو جانتے ہو؟ وہ اس کی لڑکی ہے۔ پیاری پیاری باتیں کرتی وہ نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے اور مجھے تو اس سے دلی محبت ہو گئی ہے۔ وہ نہایت خوبصورت ہے۔ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتی ہے۔ اور اس کے اخلاق و اطوار بےحد دلپسند ہیں۔ گفتگو کرتے وقت اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔"

"تو کیا تم نے ٹیوشن ڈھونڈھ لی؟" جوآن نے سراسیمہ ہو کر دریافت کیا۔

"لیکن سنو تو!" جولیا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کے ساتھ ہفتہ بھر میں تین سبق مقرر کئے ہیں۔ اور مجھے ہر سبق کا معاوضہ پانچ ڈالر ملا کریں گے۔ اس طرح ہفتہ میں پندرہ ڈالر آجایا کریں گے۔ شاید ایک دو جگہ اور بھی انتظام ہو جائے۔ تو میری فیس بھی نکل آیا کرے گی اور گھر کا خرچ بھی۔"

"یہ تو بجا ہے۔" جوآن نے کہا۔ "مگر دیکھو نا! مجھے بھی تو آخر کچھ کرنا چاہیے ــــــ میرا ارادہ ہے کہ میں اخبار ہی بیچا کروں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ تم مزدوری

کرو اور میں تصویر کشی میں لگا رہوں ـــــ اس ترکیب سے بھی ایک دو ڈالر روزانہ بچت ہو سکتی ہے۔"

جولیا نے اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔ "مگر جون تم کوئی خیال نہ کرو۔ آخر میں کس لئے ہوں؟ کیا تمہاری خاطر اتنی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ کہ تم سہولت سے مصوری کا کورس پورا کر سکو۔ ہرگز نہیں ـــ مجھے اس سے تکلیف ہوگی۔ میں تو موسیقی سیکھتی ہوں۔ موسیقی ہی سکھاؤں گی اور مجھے اس میں امداد بھی ملے گی۔ لیکن تم کوئی اور کام شروع کر کے اپنی ترقی کی راہ میں کیوں مشکلات پیدا کرتے ہو۔ کیا ہفتہ بھر کے لئے پندرہ ڈالر ہمیں کافی نہ ہوں گے؟ اس سے تو ہم امیرانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔"

"بہت اچھا!" جون نے لقمہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں ہرگز ایسا نہ کروں گا۔ لیکن یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ تم دربدر ماری ماری پھرو۔ کیا آرٹ کا یہی تقاضا ہے کہ تم ایسی لڑکی اس طرح پریشان ہو!"

"لیکن جب کسی کو محبت ہو۔ اپنے فن سے، تو وہ اس کی خاطر سب کچھ کر گزرتا ہے۔" جولیا نے ہنس کر جواب دیا۔

"جب میں یہ تصویر مکمل کر رہا تھا۔" جون نے کہا۔ "تو میجسٹر نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ اور ٹنکل نے اسے اپنی آرٹ گیلری میں لٹکانے کی اجازت دیدی ہے۔ اور جب بھی کوئی اچھا خریدار آئے گا تو کافی قیمت دے جائے گی۔"

"ضرور! کیوں نہیں؟" جولیا نے فوراً جواب دیا۔ "مجھے پوری امید ہے لیکن جون! جنرل پنکے کا بھلا ہو آؤ اس کی صحت کا جام نوش کریں۔ اس نے ٹیوشن دے کر فی الواقع ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔"

دوسرا ہفتہ کچھ عجیب مصروفیات میں گزرا۔ صبح دونوں خوش و خرم اُٹھتے جون ناشتہ کرتے ہی باہر چلا جاتا۔ شام اُسے اکثر باہر ہو جایا کرتی ـــ اور وہ کہتا۔ "آرٹ، آرٹ ہی ہے۔ ایسا لطیف فن جو انسان کو اپنے اندر جذب کرے کسقدر عمدہ ہے۔ اور میں تو اس میں اتنا محو ہو جاتا ہوں کہ وقت کا بھی ہوش نہیں رہتا۔"

اتوار کی شام جب وہ دسترخوان پر بیٹھے تو جولیا نے نہایت خوشی سے ہفتہ بھر کی کمائی ـــ پندرہ ڈالر ـــ میز پر اچھال دی۔ وہ بہت مسرور نظر آتی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کی گہرائی میں تکان و افسردگی کے آثار پنہاں تھے۔

"بعض اوقات۔" جولیا نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔ "کلیمنٹشیا میری آزمائش کرتی ہے۔ وہ بہت بے پروا ہے۔ اکثر پچھلی بتائی ہوئی باتیں مجھے دوبارہ بتانی پڑتی ہیں۔ لیکن جنرل پنکے نہایت شریف آدمی ہے۔ جب میں کلیمنٹشیا کو پیانو پر بٹھاتی ہوں تو وہ ہمارے پاس آ بیٹھتا ہے۔ اور اکثر اس کو غور سے سیکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس کو میری تکلیف اور محنت کا احساس ہے۔ میں تمہیں کسی دن ملاقات کے لئے چلوں گی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے کلیمنٹشیا سے یک گونہ دلبستگی ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد جون نے فیاضانہ انداز میں دس ڈالر کا نوٹ جیب سے نکال کر جولیا کی آمدنی کے پاس رکھ دیا۔ "میں نے آبی رنگوں کی ایک تصویر بیچی تھی۔ پیوریا کا ایک امیر خریدنے آگیا تھا۔" جون نے گھبراتے ہوئے بیان کیا۔

"نہیں تم مجھ سے دل لگی کر رہے ہو پیوریا سے گاہک کب آیا تھا؟" جولیا نے کہا۔

"نہیں تو ـــــ پیوریا ہی سے آیا تھا۔ نہایت شریف آدمی، لمبی لمبی مونچھیں غرض کچھ عجیب سی شکل کا تھا۔ اس نے مجھے ایک اور تصویر تیار کرنے کو کہا ہے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ آبی رنگوں کی بجائے روغنی رنگ استعمال کئے جائیں۔ تم اگر گانا سکھاتی ہو تو میں نے بھی آرٹ ہی سے کمایا ہے۔" جون نے کہا۔

"مگر کیسی مسرت انگیز بات ہے۔" جولیا نے کہا۔ "تمہاری محنت بہت جلد پھل لائی۔ خدا کرے اسی طرح گاہک پیدا ہونے جائیں۔ شاید تین ڈالر کی رقم اور مل جائے۔ آہا ـــ ہم تو بہت جلد امیر بن سکتے ہیں!"

اس دن انہوں نے نہایت عمدہ کھانے تیار کئے اور بیحد مسرور نظر آتے تھے۔

دوسرے اتوار جون پہلے گھر پہنچ گیا اور الان کی سامنے والی میز پر اٹھارہ ڈالر رکھ دئے۔ اس کے ہاتھوں پر کچھ سیاہی لگی ہوئی تھی۔ جو اُس نے آتے ہی دھو ڈالی کہ کوئی اسے مجرم سمجھ کر نہ پکڑ لے۔ نصف گھنٹہ بعد جولیا بھی آ گئی۔ اس کے داہنے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"ہیں! یہ کیا ہوا؟" جون نے گھبرا کر سوال کیا۔ جولیا ذرا مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ میں مایوسی نمایاں تھی۔

"آج جب میں کلیمنٹشیا کو پیانو پر بٹھانے لگی۔" جولیا نے بیان کیا۔ "جنرل پنکے بھی ہمارے پاس ہی آ گیا اور دونوں نے اصرار کیا کہ ہمارے ہاں جنگلی خرگوش کا گوشت تیار ہوا ہے تم بھی دسترخوان پر ہمارے ساتھ بیٹھو۔ مجبوراً مجھے بیٹھنا پڑا . . . لیکن کلیمنٹشیا کو ایک خاص مرض ہے وہ ایسے موقعوں پر اکثر گھبرا جاتی ہے۔ میں اور وہ ایک ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔ وہ گوشت کی گرم گرم پلیٹ اُٹھا کر میرے آگے رکھنے لگی۔ لیکن گھبراہٹ میں پلیٹ چھوٹ کر میرے ہاتھ پر گر پڑی اور میرا تمام ہاتھ جل گیا۔ جنرل پنکے دوڑ کر نیچے گیا اور خود ہی چند پٹیاں اور دوا لے آیا۔ وہ بیحد متاسف تھا۔ لڑکی کے تو ہوش ہی جاتے رہے تھے۔ اب مجھے بہت آرام ہے۔"

"مگر یہ سُوت کیسا ہے؟" جوآن نے پٹی کے نیچے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ان کے پاس روئی نہیں تھی۔ یہی پڑا تھا شاید ملازمہ نے آگ جلانے کے لئے لاکر رکھا ہو۔ اسی پر دوا لگا کر انہوں نے پٹی باندھ دی۔" جولیا بیان کرتے ہوئے ایسا محسوس کر رہی تھی گویا کسی بڑی مہم سے سبکدوشی حاصل کر رہی ہے ——"کیا دوسری تصویر بھی بک گئی؟" اس کی نظر میز پر پڑی۔

"آج پائیوریا کا گاہک پھر آیا تھا" جوآن نے کہا۔ "جو تصویر اس نے تیار کرنے کو کہا تھا وہ لے گیا ہے۔ وہ ہر اتوار یہاں آیا کرتا ہے۔ آج کہتا تھا۔ کہ میرے لئے مناظر کی تصویر بھی تیار کرنا ...... ہاں تو تمہارا ہاتھ کس وقت جلا تھا؟"

"شائد پانچ بجے تھے" جولیا نے غم آلود لہجے میں جواب دیا "کہ لوہا آخاہ لوہے کے چولھے پر سے وہ پلیٹ اُٹھا کر رکھنے لگی۔ (جو چولھے پر گرم کر رہی تھی نا) کہ اس نے میرے ہاتھ پر گرا دی —— اور میرا ہاتھ جل گیا ..... جوآن کیا تم کبھی جنرل پینکے کے ہاں نہیں چلو گے؟"

"ذرا بیٹھو تو" جوآن نے اس کو دونوں شانوں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔

"جولیا! سچ سچ بتاؤ تم دو ہفتے سے کیا کر رہی ہو؟"

پہلے تو جولیا نے نہایت ضبط سے کام لیا اور پیار کے لہجے میں جنرل پینکے کے متعلق دو ایک مہمل فقرے کہنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ یہ اس کے بس کی بات نہ تھی اس نے آنکھیں نیچے کرلیں مگر آنسو برابر چلے آرہے تھے جنہوں نے اس کا راز فاش کر دیا۔

"میں تین چار روز تک کسی شاگرد کی تلاش میں پھرتی رہی" اس نے بیان کیا "لیکن آخر مایوس ہونا پڑا۔ میں برداشت نہ کر سکتی تھی کہ تم فیس نہ ہونے کی وجہ سے اپنا کام چھوڑ دو۔ آخر میں نے ۲۴ کی لانڈری میں کپڑے استری کرنے کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور تمہیں جنرل پینکے اور کلیمینٹینا کی فرضی داستانیں سناتی رہی۔ آج لانڈری میں میرے ساتھ کی ملازمہ نے گرم گرم لوہا میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور میرا ہاتھ جل گیا۔ گھر آتے ہوئے راستہ میں میں جنگلی خرگوش کے گوشت کا قصہ تیار کرتی رہی —— لیکن پیارے! تم مجھ سے ناراض نہ ہونا ..... اگر میں وہاں ملازم نہ ہوتی تو تمہاری تصاویر کس طرح بکتیں۔"

"مگر وہ گاہک پیوریا کا رہنے والا نہیں تھا۔" جوآن نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا کہیں کا ہو ..... کیا حرج ہے ..... مگر جوآن تم غضب کے ذہین ہو تمہیں اس بات کا شک کیوں کر گزرا؟"

"مجھے ابھی ابھی یہ خیال ہوا۔" جوآن نے کہا "مجھے کبھی بھی شک نہ گزرتا۔ لیکن آج پانچ بجے کے قریب میرے پاس نیچے ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی۔ میں نے اُسے یہ انجن صاف کرنے کا سُوت تیل میں ڈبو کر دے دیا۔ وہ کہتی تھی اوپر ایک ملازمہ کا ہاتھ جل گیا ہے ..... میں گزشتہ دو ہفتے سے اسی لانڈری میں ملازم ہوں۔ انجن میں آگ جلانے کا کام میرے سپرد ہے۔"

"تو تب تم نے ——"

"ہاں پیوریا کا گاہک اور جنرل پینکے دونوں ہی آرٹ کی تخلیق ہیں۔ مگر جولیا تم اس آرٹ کو مصوری یا موسیقی سے تعبیر نہیں کر سکتیں۔"

دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔ جوآن نے کہا "جب کسی کو محبت ہو اپنے فن سے، تو وہ اس کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔" جولیا نے بات کاٹ کر کہا:

"صرف، جب کسی کو محبت ہو تو ——"

(او۔ ہنری)

مترجمہ:- "فدائے ادب"

مطلع و مقطع

رات دن کام ہمیں نالۂ شبگیر سے ہے ۔۔۔ کچھ دلِ زار کو تسکین اِسی تدبیر سے ہے

مضطرب تُو ہی نہیں ہے شبِ فرقت احساںؔ ۔۔۔ وہ بھی بیتاب تری آہ کی تاثیر سے ہے

احسانؔ بی۔ اے

قطعہ

مانتا ہوں میں کہ تو ہے شاعرِ رنگیں نوا — توڑتی ہے تان موسیقی تری آواز پر

کام لے "ایجاز" سے پیغامِ تحت اللفظ میں — گٹکری کے زور سے الفاظ میں جادو نہ بھر

غزل

سنبھالنے پر ڈھلک رہی ہے کسی کے سر سے ردائے دلکش — ادا کی دلچسپ کشمکش سے گزر رہی ہے حیائے دلکش

نظر بھری ہے، خفا خفا ہیں جبیں پہ بل ہیں کھچے ہوئے ہیں — سزائیں اُلفت میں مل رہی ہیں مجھے، مگر انتہائے دلکش

نظامِ فطرت میں فرق آتا نہیں کسی غمزدہ کی خاطر — وہی فضائیں، وہی بہاریں، وہی ہیں نظارہائے دلکش

یہ دیکھتا ہوں کہ دید اُن کی نہیں ہے مجھ کو نصیب لیکن — صبا کے نازک ترین نغموں میں سُن رہا ہوں صدائے دلکش

بتوں کی اُلفت مجاز ٹھہری تو پھر حقیقت سے واسطہ کیا — یہ کیسے رستے سے اوج پر مجھ کو لائے ہیں رہنمائے دلکش

نہیں ہے فرہاد کی درشتی پہ ابتدا کا سا وہ تعرّض — وہ دن بھی نزدیک ہیں کہ ہو جائیگی مری ہائے ہائے دلکش

جو تلخیِ جامِ زہرِ اُلفت پہ جان دیتے ہیں، مانتے ہیں — فنا کی پُرہول وادیوں میں ہے کار فرما بقائے دلکش

میں شادؔ اشعار نظم کرتا ہوں، سامنے اُس کے آئینہ ہے

کسی کو طبع رسائی ملی ہے کسی نے انداز پائے دلکش

شادؔ عارفی

تادیب

(شام کا وقت ہے، چراغ جلنے میں کسی قدر دیر ہے، ابھی آسمان پر شفق کی سرخی موجود ہے۔ شہر کے باہر ایک طویل باغ ہے، اس کے درمیان سے چاروں طرف سڑکیں نکلی ہیں۔ ایک جانب دُور سر سبز میدان پھیلا ہوا ہے۔ اسی کے ایک گوشے میں، جہاں عام طور پر لوگوں کی آمد و رفت نہیں رہتی۔ اختر آسمان کی طرف رُخ کئے چت پڑا ہے۔ اگر اختر بالکل جوان نہیں ہے تو جوانی سے یکسر محروم بھی نہیں ہے۔ وہ زیادہ تنومند نہ ہونے کے باوجود تندرست ہے، آنکھیں تقریباً بند ہیں۔ پاؤں کی حرکت سے کبھی کبھی اس کا سفید پاجامہ بھی ہل جاتا ہے قمیص کے دو بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ اس سے سینہ نظر آ رہا ہے۔

حامد آتا ہے، اس کی عمر تیس سال کے قریب ہے، بلند قامت، گورا رنگ، چھریرا بدن، سر کے بال پیچھے کی جانب مڑے ہوئے، آنکھوں میں شوخی اور چمک، وہ ایکبار نگاہ بھر کر اختر کو دیکھتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سارا جسم ہل جاتا ہے، وہ آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتا ہے اور اختر کے پائنتی طرف کھڑا ہو کر بغور اس کی صورت دیکھتا ہے)

حامد:۔ خواب کی جنّت اور خیالی مسرت .... (اختر چونک کر اُٹھ بیٹھتا ہے، اور حامد کی جانب دیکھنے لگتا ہے) محض لغو اور بے حقیقت ہے.....

اختر:۔ تم.....

حامد:۔ شاید تمہیں شک ہے اور تم متعجب ہو رہے ہو، اس کا سبب بھی ہے۔ غالباً تم خواب دیکھ رہے تھے،

اختر:۔ کیسا؟

حامد:۔ ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو، تمہاری آنکھیں خود تمہاری غمّازی کر رہی ہیں۔ تمہیں خواب دیکھنے سے انکار ہے، مگر مجھے کیسے اعتبار آئے۔ میں خود تمہاری ہوس پرستی.....

اختر:۔ ہاں ہاں، تم میری ہوس پرستی سے واقف ہو، لیکن میں تو تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہیں ناصح مشفق بننے کی ضرورت نہیں۔

حامد:۔ مجھے تو یاد نہیں، تاہم سمجھتا ہوں کہ بحالت موجودہ میری فہمائش تمہیں پسند نہ آئے گی۔ لیکن میں ہلاکت سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس لئے.....

اختر:۔ اس لئے تم خدائی فوجدار بن کر مجھے سرزنش ضرور کرو گے لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہاری تعبیر ہوس پرستی سے مجھے انکار ہے۔ خدا نے میرے لئے ایک راہ......

حامد:۔ خدا کا نام نہ لو، اپنی ہوائے نفس کو خدا کی جانب کیوں منسوب کرتے ہو؟ اسے خدا کا نام لینے کا حق نہیں ہے جو بندۂ ہوا و ہوس ہو۔ خدا کا نام تو وہ لے سکتے ہیں جو نفس کو زیر کر چکے ہوں۔

اختر:۔ اپنے اور خدا کے معاملے کو میں تم سے بہتر سمجھ سکتا ہوں۔

حامد:۔ غلط ہے، تم نفسانی تحریکات کو خدائی اشارات قرار دیتے ہو۔ تمہاری سمجھ ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ تمہیں پر موقوف نہیں ہے۔ آجکل کے تمام بندگانِ نفس کا یہی شیوہ ہے، وہ اپنی ساری نالائقیوں کو انتہائی جسارت سے خدا کے سر تھوپ دینے کے عادی ہو گئے ہیں۔

اختر:۔ (غصّے میں) ہوں!

حامد:۔ (مُسکرا کر) معلوم ہوتا ہے خدا کا سارا غیظ و غضب تمہاری آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔ کس طرح بات کی بات میں آنکھیں چشم کبوتر بن گئیں، تم تو اسٹیج پہ پارٹ خوب کر سکتے ہو، لیکن افسوس کہ تمہارا کیرکٹر مضبوط نہیں ہے۔

اختر:۔ ہاں میرا کیرکٹر کمزور ہے۔ تم اسے قوی کرنے آئے ہو؟

حامد:۔ درست ہے، تم آج بھی نہیں گئے؟

اختر: نہیں.....

حامد:۔ غالباً کل بھی نہ جاؤ گے۔ آجکل میں وہ غریب ضرور مر جائے گی۔ اس کے بعد جو کام تمہیں کرنا چاہیئے تھا۔ وہ تمہارا چھ سال کا بچّہ کرے گا....

اختر:۔ کیا کرے گا؟

حامد:۔ گور و کفن، اور اس سلسلے کے سارے دوسرے کام.....

اختر:۔ فضول ہے یہ سب۔

حامد:۔ تمہارے خیال کے مطابق فضول سہی، لغو سہی، پھر بھی اس کی لاش تمہارے گھر میں پڑی سڑے گی تو نہیں۔ یا کتّے بلی کی غذا تو بنے گی نہیں اسے دو گز زمین کے اندر تو بہرحال دبانا ہی ہوگا۔ کیا تم نے کوئی اور صورت سوچ رکھی ہے؟

اختر:۔ (برافروختہ ہو کر) مت بکو، کیا میں بیوی کو گلے باندھے پھروں؟

حامد:۔ بیوی؟ خوب! اس کے متعلق بیوی کا لفظ کیسے تمہاری زبان پر آگیا؟ تم نے اس کے ساتھ جوانی کے دس سال گزارے، دو بچّے پیدا ہوئے۔ اگر تم

اسے بیوی سمجھتے ہو تو اس کے متعلق تمہیں کچھ اپنا فرض بھی محسوس کرنا چاہیئے، تمہیں لازم تھا کہ اس وقت اس کے پاس ہوتے، اور نہیں تو جس وقت تار آیا تھا بے تامل گھر روانہ ہو جاتے معلوم نہیں تمہارا دل کس سخت دھات سے بنا ہے جس عورت کے ساتھ تم نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ کیف آور اور نشاط آگیں ایام گزارے وہ حالت کس مپرسی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہی ہے، اور تمہاری صورت کو ترستی ہوئی دنیا سے ہمیشہ کے لئے نامراد رخصت ہو رہی ہے اور تم یہاں مس رشیدہ کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو۔ لیکن تمہیں جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ اسے نہ چاہنے والے کی ضرورت ہے نہ شوہر کی، وہ تو اپنے کاروبار اور اپنی شہرت کے لئے تمہیں ذریعہ بنانا چاہتی ہے، وہ جس روز دراصل شادی کرنے پر آمادہ ہو گی اسے تم سے کہیں زیادہ حسین، دولتمند اور معزز نوجوان مل جائیں گے، پھر وہ تمہاری طرف رُخ بھی نہ کرے گی۔ دیکھ لینا۔

اختر:۔ تمہیں یہ سب کہاں سے الہام ہو گیا کہ میں اس پر مرتا ہوں۔ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تو صرف کاروبار میں اس سے شرکت کی ہے، تمہیں کیا خبر کہ نئے سند یافتہ ڈاکٹر کو کام شروع کرنے میں کن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ میں ہی ایک سال سے دواخانہ کھولے پڑا رہا۔ دو ہزار تو محض کرائے اور دوسری معمولی ضروریات میں صرف ہو گئے، تمہیں معلوم ہے گذشتہ ششماہی بالکل دیوالیئے پن کی حالت میں گزری؟ اس جدید صورت کے جو نتائج ہیں انہیں میں جانتا ہوں۔ پہلے آٹھ گھنٹوں میں بھی ایک مریض نہ آتا تھا۔ اب ایک گھنٹے میں آٹھ مریض کی اوسط پڑ جاتی ہے، مجھے تو امید تھی کہ پہلے ہی سال گذشتہ نقصانات کی تلافی ہو جائے گی۔

حامد:۔ اگر ایسا ہے تو اپنے دواخانے کی کرسی پر بیٹھنے ..... کے بجائے اس گھاس پر پڑے رہنے کے کیا معنی ہیں؟ میں نے خود دیکھا کہ دواخانہ بند دیکھ کر کتنے آدمی لوٹے جا رہے تھے اُن کے ہاتھوں میں دوا کے نسخے تھے۔

اختر:۔ یوں ہی، جی اچاٹ ہو رہا تھا، کچھ طبیعت بھی بدمزہ تھی۔

حامد:۔ جی اُچاٹ ہونے کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک مس رشیدہ کی عدم موجودگی، اور دوسرا شاید بیوی کی علالت۔ کاروبار سے تو اس کا تعلق ہو نہیں سکتا۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تم ایک رنگین خواب دیکھ رہے ہو۔ دوکان اور کاروبار تو اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کی ایک سعئ لاحاصل ہے۔ اور بس، افسوس، تم اپنی نئی دنیا آباد کرنے کی فکر میں ہو۔ اور جس بے چاری کی دنیا صرف تمہاری ذات سے آباد تھی وہ کس مپرسی کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔

اختر:۔ تو چلوں دواخانہ کھولنے .....

حامد:۔ مس رشیدہ کھڑی تھیں وہاں.....

اختر:۔ (بیساختہ) کہاں؟ (وحشت زدوں کی طرح حامد کی طرف دیکھتا ہے)

حامد:۔ وہیں دواخانے کے زینے پر تمہیں پوچھ رہی تھیں، میں نے کہا مجھے نہیں معلوم۔

اختر:۔ کچھ اور بھی کہا انہوں نے؟.....

حامد:۔ ہاں کہتی تھیں کہ انہیں ڈاکٹر کے بجائے شاعر، مغنی یا مصور ہونا چاہیئے تھا۔ بڑے وارفتہ مزاج آدمی ہیں۔ ڈاکٹری کے لئے تو نہایت متین اور سنجیدہ طبیعت کی ضرورت ہے۔

اختر:۔ (کچھ سوچتے ہوئے۔) مگر اس وقت کانپور سے کون سی گاڑی آتی ہے؟

حامد:۔ ممکن ہے کانپور نہ گئی ہوں بنارس چلی گئی ہوں، یا اسی طرف کہیں اور......

اختر:۔ لیکن انہوں نے تو......

حامد:۔ ہاں ہاں تم سے کانپور جانے کو کہا ہو گا، لیکن کیا ضرور ہے۔ کہ وہ تم سے ہمیشہ سچ ہی بولیں؟

اختر:۔ تم نے ان سے اور کچھ تو نہیں کہا؟

حامد:۔ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔

اختر:۔ اچھا پھر......

حامد:۔ آخر تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ یہی نا کہ تمہارے شادی شدہ ہونے کے بارے میں اور تمہاری بیوی بچوں کے متعلق میں نے ان سے کچھ کہا یا نہیں؟

اختر:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں، یہی....

حامد:۔ کہہ تو دیا، میں جھوٹ نہیں بولتا، تم تو کہتے تھے تمہاری تعبیر ہوس پرستی سے مجھے انکار ہے۔ پھر تمہیں اسقدر بدحواس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ سنو، جب انسان سوسائٹی کے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اپنی ہوس رانی اور تحریک نفسانی کے سامنے سوسائٹی کے مفاد و مصالح کو نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ اپنی کمزوریوں اور کجرویوں کی عجیب عجیب تاویلیں کرنے پر آتر آتا ہے لیکن جو لوگ سوسائٹی کے آئین و ضوابط کے پابند ہوتے ہیں، ذاتی و انفرادی اغراض و مقاصد کی خاطر سوسائٹی اور جماعت کے حدود کو منہدم کرنا پسند نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ بیوی بچوں کے بھی حقوق ہیں۔ عزیز و آشنا بھی کچھ حقوق رکھتے ہیں۔ سوسائٹی کا ہر فرد حتیٰ کہ سوسائٹی کا رکن ہونے کی حیثیت سے دشمن

... بھی کچھ حقوق رکھتا ہے - اسی لئے وہ کسی غلطی اور کجروی کی بے جا تاویل نہیں کر سکتے - لہٰذا تمہاری خاطر میں بھی تمہاری ناروا طرزِ عمل کی غلط تاویل کرنے سے قاصر ہوں - میں تم سے بھی کہتا ہوں کہ اگر تم نے اب تک مس رشیدہ کو اپنی صحیح پوزیشن کی طرف سے تاریکی میں رکھا ہے تو شدید غلطی کی ہے، تمہیں جلد از جلد اس کی تلافی کر دینی چاہیئے۔

اختر: ۔ بھائی جان، میں تم سے معافی خواہ ہوں - کسی طرح میری حفاظت ...... "

حامد: میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہوں لیکن مجھ سے اس کی توقع نہ رکھو کہ میں تمہاری بدکرداریوں کی پردہ پوشی کروں گا - اگر تم اپنی حفاظت کے طالب ہو تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ مس رشیدہ کا خیال دل سے دور کر کے سیدھے مکان روانہ ہو جاؤ۔

اختر: ۔ کیوں کیا؟ (اس کی سانس تیز ہو جاتی ہے)

حامد: ۔ تباہی کے غار کے کنارے پہنچ چکے ہو - گرنے کی دیر ہے آگے قدم بڑھایا کہ خیر نہیں - (آگے بڑھ کر باہر سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے) آ رہی ہیں، ان درختوں کی آڑ سے نکل جاؤ - عقل سے کام لو۔

(اختر تھوڑی دور چل کر پھر گھاس پر بیٹھ جاتا ہے - مس رشیدہ آتی ... ہے اور حامد کی طرف بڑھتی ہے -)

مس رشیدہ: ۔ (ہنستی ہوئی) آپ یہاں ہیں، میں آپ کے مکان پر گئی تھی - آپ سے ملاقات نہ ہونے پر کیا کہوں کہ کیا کیا جاسوسی کرنی پڑی - (اختر کی طرف دیکھتی ہوئی) وہ کون ہے؟ ......

مسٹر اختر ... وہی تو ..... (حامد کو چھوڑ کر اختر کے پاس پہنچتی ہے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے) معلوم ہوتا ہے آپ سو رہے ہیں۔

(مس رشیدہ ایک نوجوان حسینہ ہے - اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور جاذبِ توجہ ہیں - کنارے دار ریشمی ساری اور کامدار ریشمی جوتہ پہنے ہے)

(حامد چلا جاتا ہے)

اختر: ۔ نہیں ...... میں .....

مس رشیدہ: ۔ (سامنے کھڑی ہو کر) آپ نے دواخانہ بند کر رکھا ہے، اس طرح بھی کہیں کاروبار ہوتا ہے، جو گاہک آج واپس چلے گئے وہ مہینوں دواخانے کا رُخ نہ کریں گے -

اختر: ۔ آپ کانپور نہیں گئی تھیں ....

رشیدہ: ۔ (ہنستی ہوئی) تو اسی غصے میں آپ نے دواخانہ بند کر دیا - آپ کو معلوم ہے میں کہاں گئی تھی؟ آپ کے گھر گئی تھی - دو دن اور دو رات وہاں رہ کر واپس آ رہی ہوں - کل دو بجے شب میں ان کا انتقال ہو گیا - میں نے وہاں لوگوں سے کہہ دیا کہ میں آپ کے حکم سے آئی ہوں - کاروبار کی مصروفیتوں میں آپ نہ آ سکے، اس لئے آپ کی جانب سے لوگوں کے خیالات خراب نہیں ہوئے۔ آپ کی بیوی میری جانب یاس و حسرت سے دیکھتی رہیں - وہ میری طرف سے اتنا خطرہ محسوس کرتی تھیں کہ انہوں نے دلجمعی سے میری دوا بھی استعمال نہیں کی -

اختر: ۔ ناشائستگی سے بھی تو پیش آئی ہونگی آپ کے ساتھ -

مس رشیدہ: ۔ اتنے پر بھی آپ نادم اور متاسف نہیں ہیں، میں دو روز برابر دیکھتی رہی - وہ بار بار آپ کی تصویر دیکھتی تھیں اور اسے کبھی آنکھوں سے اور کبھی پیشانی سے لگاتی تھیں - اس غریب نے تو مجھے ایک لفظ نہیں کہا لیکن میرا دل خود مجھے ملامت کر رہا تھا - اپنے فرض کو پامال کیا - آپ نے اور اس کا خمیازہ اٹھانا پڑا مجھے، لیکن مجھے کیا معلوم کہ نصف جوانی گزر جانے پر بھی آپ طفلی کے خواب دیکھ رہے ہیں - سعدی کا مصرع

"مرا ج تو از حال طفلی نگشت"

آپ پر یہ حرف بحرف صادق آتا ہے - آپ نے مجھ سے ہمیشہ اس حقیقت کو مخفی رکھا۔ کہ آپ شادی شدہ اور دو بچوں کے والد بزرگوار ہیں - آپ کی حالت میرے لئے ہمیشہ ایک رازِ سربستہ رہی، میں تو سمجھتی تھی آپ محض ڈاکٹر ہی نہیں، فلسفی بھی ہیں -

(اختر اُٹھ کر ایک طرف چلتا ہے، رشیدہ بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے)

اختر: ۔ مجھے معاف کر دیجئے۔

رشیدہ: میں تو آپ کو معاف کر دوں، لیکن کیا آپ کا ضمیر بھی آپ کو معاف کر سکتا ہے؟ آپ جیسے لوگ تو اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ گناہ کریں - اور معافی مانگیں، اس میں آپ کا قصور ہی کیا ہے، آپ تو ہر کام میں خدا کی مرضی کا مشاہدہ کرتے ہیں، یہ بھی جو کچھ ہوا شاید اسی کی مرضی سے ہوا ہو گا -

اختر: ۔ میں اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتا۔

رشیدہ: ۔ بحث کیا کرو گے؟ اس کے لئے قابلیت مطلوب ہے - پھر بحث کا موقع کون سا ہے، تمہیں تو ضرورت ہے تلافیٔ مافات اور روح کو سبکبار کرنے کی -

اختر: ۔ وہ کیوں کر؟ ....

رشیدہ: ۔ انسانیت سے کام لے کر، بیوی تو رخصت ہو چکی، دو بچے ہیں - ان کا حق ادا کرو - میں تمہاری امداد کو تیار ہوں - خواب و خیال کی دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدو - سمجھے؟

اختر:- خواب وخیال کی دنیا سے آپ کی مراد کیا ہے؟

رشیدہ:- جناب والا، آپ بھی ڈاکٹر ہیں، میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ آپ نے ڈاکٹری کے پیشے کی ترقی کے لئے میری رفاقت حاصل.... کی تھی۔ نہ آپ کا مقصد اس کاروبار سے مالی فائدہ حاصل کرنا تھا۔ آپ کے دل میں تو ایک طرح کا مرض تھا، آپ ہوائے نفس میں مبتلا تھے، آپ اور کچھ نہیں صرف مجھے چاہتے تھے۔ آپ کے ہر عمل کے اندر یہی روح کارفرما تھی۔ کیا آپ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ میں آپ سے شادی کر لوں؟ (اختر زمین کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔) بندۂ نفس مرد! حرص وہوا کے غلام! اگر تم مرد ہوتے، سچے مرد تو معافی اٹھتے، نہیں، ہرگز نہیں، اب شادی سے زیادہ شرمناک اور رسواکن تمہارے لئے کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ مرنے والی کی یاس انگیز اور حسرت آلود نگاہیں اب بھی میرے سینے میں پیوست ہوتی جا رہی ہیں، (علیحدہ ہٹ کر) میں نے طے کر لیا ہے کہ دواخانے کا کاروبار اور ڈاکٹری کا پیشہ ترک کر دوں گی۔

اختر:- پھر کیا کرو گی؟

رشیدہ:- وہی جو تمہاری بیوی کیا کرتی تھی۔ میرے گناہ کے کفارے کی یہی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ دواخانے کی ساکھ قائم ہو چکی ہے۔ اگر تم نے قاعدے سے کام کیا تو ایک روز شہر کے مشہور ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ (کنجیوں کا گچھا بڑھاتے ہوئے) یہ لو آج سے تم دواخانے کے تنہا مالک ہو، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اختر:- (کنجیوں کا گچھا لیکر) تمہیں بھی تو کچھ کرنا چاہیئے۔ ورنہ.....

رشیدہ:- (مسکراتی ہوئی) مجھے کیوں کچھ کرنا چاہیئے، تمہاری بیوی کیا کرتی تھی؟ میں بھی شادی کروں گی اور تمہیں دعوت دوں گی، بس اب دواخانے جاؤ، اس سے زیادہ ایک لفظ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

(اختر جاتا ہے۔ مس رشیدہ گھوم کر ادھر دیکھتی ہے جہاں حامد کھڑا تھا۔ حامد وہاں موجود نہیں ہے۔ رشیدہ قدم آگے بڑھاتی ہے اور جہاں حامد کھڑا تھا جا کر بیٹھ جاتی ہے اور ایک لفافہ نکال کر پڑھنے لگتی ہے۔ ایک طرف حامد آتا ہے۔ اور رشیدہ کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

حامد:- یہ تو شاید کسی کا محبت نامہ ہے؟

رشیدہ:- آپ غائب کہاں ہو گئے تھے حضرت؟

حامد:- (سنجیدگی کے ساتھ) لفافے کے اوپر رنگین پھول ہے اور کاغذ کے کنارے پر بھی...... اسی لئے میں نے کہا یہ کوئی محبت نامہ..

رشیدہ:- (اسی طرح گردن گھما کر اس کی جانب دیکھتی ہوئی) تو شاید آپ نے بھی ان رنگین پھولوں کا استعمال کیا ہے، کیوں؟.....

حامد:- اس کے لئے حلف لینے کو تو نہ کہا جائے گا...

رشیدہ:- اگر کہا جائے؟

حامد:- تو کہہ دوں گا۔ کیا ہے۔

رشیدہ:- (بیساختہ چونک کر) کیا ہے؟ ایں؟

حامد:- (رشیدہ کو پکڑ کر جلدی سے اٹھتے ہوئے) کیا ہے؟ کوئی جانور تو نہیں ہے؟ اٹھو— اٹھو—

رشیدہ:- (جلدی سے الگ ہٹ کر) کہاں جانور ہے؟ تم نے کچھ دیکھا؟

حامد:- میں نے کچھ نہیں دیکھا، آخر تم اس طرح کیوں چونک پڑیں؟

(رشیدہ کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑتا ہے)

رشیدہ:- تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

حامد:- مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا، تم اپنی بتاؤ؟ مجھے تسلیم ہے کہ میں نے محبت کے خطوط لکھے ہیں، لیکن وہ سب ایک رنگین خواب تھا۔ (مسکراتے ہوئے) زندگی میں وہ زمانہ بھی تو آتا ہے جب رات، دن، سوتے جاگتے، ہر وقت اور ہر حال میں خواب ہی نظر آتا رہتا ہے۔ رنگین و دلکش خواب، لیکن میری زندگی کے وہ ایام گزرے برسوں ہو گئے۔ اختر کی تو بات ہی جدا ہے، وہ تینس برس کے ہو کر بھی اپنے کو بائیس ہی کا سمجھتے رہے۔ اسی سے ان کے خوابوں کا سلسلہ بھی شکست نہیں ہوا تھا۔

رشیدہ:- (مسکرا کر) اوہو! تو اختر ہی نہیں، دوسرے لوگوں کو بھی رنگین خواب نظر آتے ہیں۔

حامد:- یقیناً، یہ تو فطری چیز ہے، اور فطرت میں تبدیلی نہیں ہوتی (متانت آمیز لہجے میں) رنگین خواب میں نے بھی دیکھے، اور تمہیں بھی نظر آتے رہے ہوں گے۔

رشیدہ:- ہش! ——

حامد:- اپنے کو دستورِ فطرت سے بالاتر ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو۔ رنگین خوابوں سے انکار تو اپنے وجود کی تکذیب کے ہم معنی ہے، لیکن یہ کوئی معیوب بات.... نہیں، اگر ہم سمجھ سے کام لیں تو ہمارے خواب ایک خاص قیمت رکھتے ہیں۔

رشیدہ:- قیمت یا پشیمانی؟

حامد:- کیا پشیمانی کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے؟ لیکن میرے نزدیک تو اس میں پشیمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

رشیدہ:- کوئی وجہ نہیں؟

حامد :۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں، وہ تو ہماری فطرت کا صحیح تقاضا تھا۔ قدرت کچھ اس طرح ہمارے اندر اس کی تخم ریزی کر دیتی ہے کہ اپنے وقت پر اس کا پھوٹ آنا لازمی ہے۔

رشیدہ :۔ (حامد کی طرف خط بڑھاتی ہوئی) اسے پڑھو تو۔

حامد :۔ (خط کو بغور پڑھنے کے بعد) واہ، یہی تھا؟

رشیدہ :۔ نہیں۔

حامد :۔ پھر؟ اس پہ تاریخ تو آج ہی کی ہے۔

رشیدہ :۔ دواخانہ بند تھا آج دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی میز پہ یہ لفافہ نظر آیا۔ تاریخ تو میں نے پڑھ لی۔ یہ بھی سمجھ لیا کہ اس میں کیا ہوگا۔ مجھے اس نامراد عورت کی آنکھیں یاد آگئیں جن میں رشک و رقابت اور فکر و تشویش کی جھلک موجود تھی۔ میں نے اس وقت ایک قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔

حامد :۔ (جو ابھی تک خط کی طرف دیکھ رہا ہے) میرے دل اور میری روح میں جو آگ شعلہ زن ہے۔ کیا تمہیں ابھی تک اس کی خبر نہیں؟ کیا واقعی تمہارے پہلو میں دل کی بجائے پتھر ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو تم ایک آن میں یہ آگ بجھا سکتی ہو۔

(رشیدہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے) تو کیوں نہیں تم اس آگ کو بجھا دیتیں؟

رشیدہ :۔ بجھا تو دیا۔

حامد :۔ واقعی؟۔

رشیدہ :۔ واقعی اب تو وہ دواخانے کے تنہا مالک ہیں، ان کا رنگین خواب شکست ہو گیا، شاید اب ان کی یہ آگ بھی سرد پڑ چکی ہو۔

حامد :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) کیا تم دوسرا دواخانہ کھولو گی؟

رشیدہ :۔ نہیں، میں نے ان دنوں غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ عورت کا آزاد پیشہ یا علیحدہ کاروبار نہ تھا۔ اس کی وجہ سے اسے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا، وہ اپنا سب کچھ اپنے ساتھ لیتی گئی۔ (حامد کا ہاتھ پکڑ کر) کچھ سوچ رہے ہو؟

حامد :۔ (رشیدہ کو بغور دیکھ کر) تم نے اپنا حصہ بھی اختر کو دے دیا۔

رشیدہ :۔ ہاں مجھے اسی میں فلاح معلوم ہوئی۔ پھر میں دواخانے میں بیٹھ کر گاہکوں سے سودا کروں۔ تم اسے گوارا کر سکتے ہو؟

حامد :۔ (خوشی سے اچھلتے ہوئے) نہیں ہرگز نہیں، (اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر) دوا فروشی کے لئے میں بنایا گیا ہوں۔ تم اس کے لئے نہیں ہو۔

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔)

ابو محمد امام الدین

رادھا کے گیت

(۱)

رادھا کا پیتم گوپیوں کا متوالا ہے۔
آہ! سکھی رادھا کا پریم کتنا باؤلا ہے!!
سنسار کتنا سہاگی ہوتا اگر جھوٹے پیتم اس میں جنم نہ لیتے!
پریم کتنا سپھل ہوتا، اگر ہرجائی پیتم پیت کرنا جان لیتے!
رادھا کا پیتم گوپیوں کا متوالا ہے۔
آہ! سکھی، رادھا کا پریم کتنا باؤلا ہے!!

(۲)

سکھی رادھا کا پیتم مورتی ہے!
اور رادھا مندر!
مندر میں رادھا بسے اور مورتی میں پیتم۔
سکھی رادھا کا من کیوں نہ ڈولے ایسے سمے۔
مندر میں رادھا ہنسے اور مورتی میں پیتم۔
سکھی رادھا کا من کیوں نہ ناچے ایسے سمے۔
سکھی رادھا کا پیتم مورتی ہے!
اور رادھا مندر!!

عظیم قریشی

ممالک عالم میں ڈرامہ کا آغاز

ڈراما ترقی یافتہ انسانی تمدن کا ایک خاص نشان ہے، ہندوستان تمدن کا قدیم ترین گہوارہ ہے۔ اس لئے اس فن کے آغاز کے لحاظ سے بھی دوسرے ممالک کے مقابلے میں وہ پیش پیش نظر آتا ہے۔

ہندوستان کے فنِ تمثیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سال مسیحی سے دو سو برس قبل ہندوستانی ڈرامے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر چکے تھے، اگر یہ سچ ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان میں فنِ تمثیل کا آغاز اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔

گیارہویں صدی مسیحی ہندوستانی ڈرامے کی خاص ترقی کا خاص عہد سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس دور کے اہلِ قلم کے اسماء میں بڑے بڑے ماہرِ فن ڈراما نویسوں کے نام موجود ہیں۔ اس کے بعد ہندوستانی ڈراما نویسی کا انحطاط شروع ہو گیا۔

اشوگھوش بدھ فرقے کا معلم تھا جو دوسری صدی مسیحی میں گزرا ہے اس کے بعض ڈراموں کے اجزاء اب بھی موجود ہیں۔ جو وسط ایشیا کے ترفان نامی مقام میں پائے گئے۔ ان ڈراموں میں سے ایک کا نام "سری پُترپرکرن" بتایا جاتا ہے۔

کالی داس، بھوبھوتی، شودرک اور ہرش وید ہندوستان کے وہ بلند مرتبہ ڈراما نگار ہیں جن کے کمال کے اہلِ مغرب بھی مداح ہیں، اوّل اوّل ۱۷۸۹ء میں ولیم جانس نے کالی داس کے شہرۂ آفاق ڈراما "شکنتلا" کا ترجمہ کیا۔ اسی ترجمہ کے ذریعے اہلِ مغرب ہندوستانی ڈراما نویسی سے روشناس ہوئے۔ اور انہیں ہندوستانی ڈراموں سے دلچسپی پیدا ہوئی، شکنتلا کے بعد جس ہندوستانی ڈرامے کو یورپ میں قبولیت حاصل ہوئی وہ "بکرم... اُروشی" ہے، یہ دونوں ڈرامے یورپ کی متعدد زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔

ہندوستان کی طرح چین بھی دنیا کا بہت قدیم تہذیب یافتہ ملک ہے اہلِ چین کو بھی اپنے فنِ تمثیل کی قدامت کا دعویٰ ہے۔ چینی شہنشاہ وان ٹیمنے کو فنِ تمثیل کا بانی قرار دیتے ہیں۔ اور وہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے پانسو اسّی برس قبل گزرا ہے۔ لیکن اکثریت کا بیان یہ ہے کہ "یورین ٹسنگ" پہلا چینی ڈراما نویس تھا۔ جو آٹھویں صدی مسیحی کا ایک اہلِ قلم تھا۔

انگریز محققین نے چینی ڈراموں کے چار دور قرار دئے ہیں:۔

(۱) ۷۲۰ء سے ۹۰۷ء تک پہلا دور، یہ ڈرامے رزمیہ عنوانات پر لکھے گئے تھے۔

(۲) ۹۶۰ء سے ۱۱۱۹ء تک دوسرا دور۔

(۳) ۱۱۲۵ء سے ۱۳۶۷ء تک، تیسرا دور، چینی ڈراما نویسی کا سب سے ترقی یافتہ دور یہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس دور کے ڈرامے "یورین ین" اور "ٹسکی" کہلاتے ہیں۔ انہی ڈراموں کے ذریعے انگریز چینی فنِ تمثیل سے متعارف ہوئے۔

ایک مسیحی مشنری نے جس کا نام پریمیر تھا۔ ۱۷۳۵ء میں ایک چینی ڈرامے سے اہلِ مغرب کو روشناس کیا تھا۔ یہ ایک حزنیہ ڈراما تھا۔ اس کا چینی نام "ٹیواچ چی کیو یول" ہے جس کے معنی ہیں "ٹیواچ خاندان کا چھوٹا یتیم"۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ڈراما چودہویں صدی میں لکھا گیا تھا۔

(۴) ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک چوتھا دور، یہ چینی ڈراما نویسی کے زوال کا دور ہے۔ اس میں کوئی بلند پایہ ڈراما تصنیف نہیں کیا گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ تخئیل کے اعتبار سے چینی ڈرامے بہت بلند ہیں۔ لیکن چینی اہلِ قلم سے تخئیل کی بلندی کا حق ادا نہیں ہو سکا ہے۔ ہندوستانی ڈراموں کی طرح چینی ڈراموں میں بھی فرمانبردار اولاد کی تعریف و تحسین ہوتی ہے۔ پاکباز اور متقی فقراء کے کردار کو نمایاں کیا جاتا ہے، سوسائٹی کے معائب و مفاسد طشت از بام کئے جاتے ہیں۔ پہلے تمثیل نگار ذلت و خفاست کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن اب پبلک کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہو رہی ہے۔

فنِ تمثیل کے اعتبار سے جاپان کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، جاپانی ڈرامے چینی ڈرامے کی بالکل نقل معلوم ہوتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کبھی چینی اثر سے آزاد کرانے کی کوشش نہیں کی گئی، جاپانی ڈرامے کے آغاز کے متعلق مختلف بیانات ہیں، ایک بیان یہ ہے کہ ایک جاپانی اہلِ قلم کو جس کا نام ہاڈاکواسٹے تھا حکم دیا گیا کہ وہ جاپانی پبلک کی دلچسپی کی کوئی چیز تصنیف کرے۔ چنانچہ سب سے پہلے اسی نے ڈرامے لکھے، یہ شخص چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں گزرا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے جاپانی ڈرامے کی ابتدا ایک عورت نے

کی جس کا نام "اسونزیجی" تھا - یہ عورت ۱۱۸۰ء میں موجود تھی جو مردانے کپڑے پہن کر ناچا کرتی تھی - تیسرا قول یہ ہے کہ . . . . . جاپانی ڈرامے کا بانی "کنزاوبد" تھا اور اس نے ۱۶۲۴ء میں ڈراما کھیلا تھا - جاپانی ڈراموں کا موضوع عموماً مذہبی ہوتا ہے، زبان بالکل بھونڈی ہوتی ہے - پبلک کی دلچسپی کے سوا جاپانی ڈراموں کا کچھ اور مقصد نہیں ہوتا۔

جزائر ملایا، سماٹرا اور سیام کے ڈراموں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں کے ڈرامے ہندوستانی ڈراموں کی ایک شاخ ہیں۔

انگلستان کی طرح اسپین میں بھی ڈراما لکھنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۹۹ء میں وہاں ڈرامانویسی کا آغاز ہوا - ایک پرتگالی نے جس کا نام گل بینسنٹی تھا - تقریباً سولہویں صدی کے ربع اوّل میں ایک ڈراما لکھا تھا جس میں پرتگالی اور اسپینی دونوں زبانوں کا استعمال کیا تھا - اسپینی زبان کے ہر خوش انجام افسانے کو ڈراما کہتے ہیں - ایک پرتگالی اہلِ قلم نے جس کا نام السنومائی سینیو تھا بہت سے ڈرامے لکھے تھے - بیسویں صدی کا سب سے بڑا اسپینی ڈرامانویس ڈینیاس تھا۔

ایک ماہرِ فن مصنف کا بیان ہے کہ ابھی تک اسپین میں ڈرامے کو ادبیات کی حیثیت سے کوئی ممتاز درجہ حاصل نہیں ہے۔

فرانس میں ۱۵۳۱ء سے ڈرامہ نویسی کی ابتدا ہوئی - اور جن تصانیف پر دراصل ڈرامے کا اطلاق ہوسکتا ہے وہ ۱۵۴۰ء میں معرضِ وجود میں آئیں - فرانس کے خوش انجام ڈراموں پر اطالوی ادبیات کا رنگ غالب تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں خوش انجام منظومات کا سب سے بڑا فرانسیسی شاعر اطالوی ہی تھا - دورِ جدید میں فرانسیسی اہلِ قلم نے مقالہ نگاری اور ناول نویسی میں جو کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ ڈراما لکھنے میں انہیں حاصل نہیں ہے۔

انگلستان میں پندرہویں صدی میں ڈرامہ نویسی کا آغاز ہوا شکسپیر سے پہلے وہاں کے متعدد اہلِ قلم نے لوگوں کے مذاق کے مطابق ڈرامے لکھے تھے۔ لیکن جو مقبولیت و ہردلعزیزی شیکسپیر کو حاصل ہوئی وہ کسی انگریز اہلِ قلم کے حصے میں نہیں آئی - کہا جاتا ہے کہ شکسپیر کے بعد انگلستان کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار برنارڈ شا ہے۔

ہالینڈ میں چودہویں صدی کے آخر اور پندرہویں صدی کے شروع سے ڈرامانویسی کا پتہ چلتا ہے، پہلے ہالینڈ میں مذہبی عنوانات پر ڈرامے لکھے جاتے تھے - پھر مزاحیہ ڈرامے لکھے جانے لگے - ان ڈراموں میں سوسائٹی کی روزانہ زندگی کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔

جرمنی میں پہلے غیر ملکی ڈراموں کی نقل کی جاتی تھی - پھر اٹھارہویں صدی سے قومی ڈرامے لکھے جانے لگے - جس طرح شکسپیر نے انگریزی ڈرامانویسی کو درجہ کمال تک پہنچایا - اسی طرح گوئٹے نے جرمنی ڈرامانگاری کی تکمیل کی۔

سوئٹزرلینڈ میں سترہویں صدی سے ڈرامانویسی شروع ہوئی، ڈنمارک اور سویڈن میں سولہویں صدی سے ناروے میں انیسویں صدی سے ڈرامے کا آغاز ہوا!

احسان الحق بی۔اے

موسمِ گرما کا آخری پھول

یہ موسمِ گرما کا آخری پھول ہے - آخری پھول - جسے شگفتہ ہونے اور اپنی مہک سے دنیا کو معطر کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے . . . . اس کے تمام رفقائے سفر - پیارے پیارے پھول - دنیا کی بے وفائی سے آزردہ خاطر ہوکر پژمردہ ہو چکے ہیں - اور اس سرد مہری کی دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں - اب چمن میں کوئی کلی، کوئی غنچہ موجود نہیں - جو اس کی ہنسی - اُس کی خندہ زنی —— سے شگفتگی حاصل کرے - اس کے درد میں شریک ہو - اے تنہا پھول! —— محبت کے متوالے —— میں تجھے گلبن پر ہی مرجھا جانے کے لئے تنہا نہیں چھوڑ سکتا - چونکہ تیرے ساتھی —— دوسرے پھول —— محبت کی نرم و نازک آغوش میں محوِ خواب ہیں - تو بھی ان کے ساتھ سو جا —— اے نشۂ محبت سے سرشار پھول! تیری پنکھڑیوں کو —— جو نرم و نازک ہیں —— چاندنی کی کرنوں سے بھی زیادہ نازک —— بستر پر منتشر کر دوں گا - جہاں تیرے رفیقانِ چمن خوشبو سے معرا اور پژمردہ پڑے ہیں - اے محبت کے دیوتا! جب الفت کا دم بھرنے والے —— میری محبت کی دنیا آباد کرنے والے —— اس دنیا سے کوچ کر جائیں —— تو میں بھی اس دنیا —— محبت سے خالی دنیا —— کو خیرباد کہہ جاؤں جب صادق دل پژمردہ ہو جائیں - اور احباب کوچ کر جائیں - تو پھر اس سرد دنیا میں —— زمستان کی شمالی ہواؤں سے بھی زیادہ سرد دنیا میں تنہا کون رہ سکتا ہے؟ (ٹامس مور)

عبدالرشید صدیقی - گورنمنٹ کالج لاہور

ساغرِ معرفت

ہجومِ محشر میں کل سنا ہے کہ عام دیدارِ یار ہوگا
چمک کے آئین پہ چھپ گیا تھا وہ جلوہ پھر آشکار ہوگا

رہِ طلب میں جو مٹ مٹا کر رہِ طلب کا غبار ہوگا
وہ سرمۂ چشمِ شوق ہوگا وہ غازۂ روئے یار ہوگا

تو دل سے ان پر نثار ہو جا زمانہ تجھ پر نثار ہوگا
رہِ محبت کا ذرّہ ذرّہ ترے لئے بے قرار ہوگا

عجیب اُلٹی ہے چال اس کی عجب محبت کا سلسلہ ہے
کہ جتنا سرشار کوئی ہوگا اسی قدر ہوشیار ہوگا

تو ہی تو اے ساقیٔ محبت خمارِ دل ہے سرورِ جاں ہے
کہ تیری آنکھوں سے جس نے پی لی وہی ترا بادہ خوار ہوگا

تمہیں کہو اس حسین صورت کو دیکھ کر آئینے کے اندر
جو دل تمہارا ابھی جا رہا ہو، تمہیں بھی کچھ اختیار ہوگا!

نہ پھر سنبھلتے بنے گی تجھ سے ابھی سے اے باغباں سنبھل جا
کبھی جو آ نکلے وہ چمن میں چمن چمن شعلہ زار ہوگا

نہ پوچھو حیرت کا کچھ ٹھکانہ وہ اپنی حیرانیوں میں گم ہے
کسی کے در پہ پڑا ہوا وہ بحالِ زار و نزار ہوگا

فقیر حیرت شاہ وارثی
بی۔ اے

غزل

تو اگر بخش دے۔ رحمت سے کوئی دور نہیں
میں ہوں مجبور۔ ترا رحم تو مجبور نہیں

پردۂ راز کریں چاک۔ یہ منظور نہیں
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

میں تو ہر زخم پہ قاتل کو دعا دیتا ہوں
گو کہ اس عہد میں تسلیم کا دستور نہیں

عالمِ غیب سہے تو۔ سہل بھی اب مشکل ہے
سختیاں سہنے کے قابل تنِ رنجور نہیں

چشمِ مشتاق سے تیری میں بہت ہوں محجوب
ایک دل تھا وہ دیا۔ اور تو مقدور نہیں

تم تو دیکھے ہوئے ہو شیخ! حرم کے جلوے
یہ غریبوں کا صنم خانہ بھی کچھ دور نہیں

آغا شاعر قزلباش
دہلوی

تعلیمی ادارات

الفنٹ کونسل سکول لورپول

الفنٹ کونسل سکول لورپول کشادہ اور پُرشکوہ ماحول کی بجائے تنگ و تاریک اور عُسرت زدہ گلیوں میں واقع ہے۔ اُن افلاس قسمت گلیوں میں جہاں والدین کے پریشان دماغوں پر فکرِ معاش کا بھوت ہر لحظہ سوار رہتا ہے۔ اور جہاں کمسن بچے اپنی کمسنی کی حدود پھاندنے سے پہلے ہی شکم پروری کے تفکرات کے جاں کاہ سمندر میں کودنے کیلئے مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن آزاد ممالک کے افلاس زدہ والدین بھی غلام آباد ہندوستان کے والدین سے بدرجہا خوشحال اور خوش بخت واقع ہوئے ہیں۔ زندگی کے تحفظ کے سامان کی فراہمی کے بعد بھی انہیں اتنا وقت میسر ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیمی اخلاقی اور معاشری کیفیات پر غور کر سکیں اور اُنکی بہتری و فلاح کیلئے مفید تجاویز سوچ سکیں۔ چنانچہ آج سے چھ سال پہلے جب نرسری کلاسز کا افتتاح کیا گیا۔ تو اسکے ساتھ ساتھ "مدر فیلوشپ" کی تاسیس بھی کی گئی۔

"مدر فیلوشپ" کی تاسیس سے ماؤں کی دُنیا میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا آپ حیران ہونگے کہ اسکے پہلے اجلاس میں ۸۰ ماؤں نے شرکت کی اور جلد ہی انکی تعداد ۱۷۰ سے متجاوز ہو گئی۔ مدر فیلوشپ کی اراکین کو یونین کیطرف سے خوبصورت اور نفیس کارڈ ملتے ہیں جنہیں وہ اپنے گھروں میں برائے اعزاز آویزاں رکھتی ہیں یونین کے گیارہ عہدہ دار ہیں۔ جو ہر سال مجلس عامہ کیطرف سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ سالانہ چندہ صرف دو شلنگ ہے۔

یونین کے ماہوار جلسے ہوتے ہیں۔ جن میں دماغ افروز تقاریر کے علاوہ نصیحت آمیز ڈرامے اور مسرت خیز گانے بھی گائے جاتے ہیں۔ تاکہ زندگی کی تلخیوں میں سرود و رقص کی شادمانیوں سے معتدبہ کمی کی جاسکے۔

موسمِ سرما کی ایک خوشگوار شام کو جب کہ سورج کی نازک اور روپہلی کرنیں کائنات کو وداعی پیغام دے رہی تھیں۔ اور والدین کے تھکے ہوئے دماغ اور افسردہ روحیں زندگی اور مسرت کی تشنگی محسوس کر رہی تھیں۔ یونین کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس میں ۲۴۰ ماؤں نے مِل کر مسرت اور بے فکری کے حیات افروز نغمات بلند کئے اور فضا کو ایک دفعہ پھر "عیش کن" "عافیت بردوش" کے طلسمی اثرات سے معمور کر دیا۔ انہوں نے باہم ملکر رقص کیا۔ اور دُنیا پر بیخودی چھا گئی۔ اس پرلطف صحبت کے بعد اُنکی چائے کیک اور بسکٹوں سے تواضع کی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب اُس حلقے کی ماؤں نے زندہ رہنے کی فکر کے جانگسل بوجھ کو اپنے کمزور و خمیدہ کندھوں سے اُتار کر ایکدفعہ پھر جہانِ طمانیت میں سانس لیا۔

موسم گرما میں ایک دفعہ پھر ایک ایسی ہی نشاط بیز محفل کا اہتمام کیا گیا۔ اور زندگی سے اُکتائی ہوئی ماؤں کو تجدیدِ حیات کی دعوت دی گئی۔

یونین کے عہدہ دار ہندوستانی انجمنوں کے عہدہ داروں کی مانند مکھیاں مارنے یا زبانی جمع خرچ کرنے پر مامور نہیں ــ بلکہ اُنکے ذمے بڑے بھاری فرائض ہیں۔ جنہیں وہ انتہائی جانفشانی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ یونین کے عہدہ داروں کے دیگر فرائض میں سے مندرجہ ذیل خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ یونین کے نصب العین کی نشر و اشاعت۔

۲۔ نصب العین کو مؤثر اور کارآمد بنانے کیلئے تجاویز سوچنا۔

۳۔ ماہوار چائے کا اہتمام اور اُسکی تقسیم۔

۴۔ سکول کے اوقات میں غُسل خانوں کی نگرانی۔

یونین کے اراکین میں تجربہ کار، سِن رسیدہ اور خوش اخلاق خواتین کو شوق سے شامل کیا جاتا ہے۔ یکجہتی اور مساوات کے اصولوں کو عملی طور پر رواج دینے کیلئے یہ تمام عورتیں نیلا لباس پہنتی ہیں۔ اُنکے ملبوسات پر M. F. C یہ تین حروف لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن سے لوگوں کو اُنکی اعلیٰ شخصیت اور خدماتی جذبات کا پتہ چلتا ہے اور یہی تین حروف اُنکو عوام کی نگاہوں میں نہ صرف امتیاز بخشتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کے قلوب اُنکی عقیدت اور محبت و احترام سے ہمیشہ مملو رہتے ہیں۔ ان تجربہ کار خواتین کی وجہ سے بہت سی لاعلم مائیں بھی یونین کی ممبر بنگئی ہیں۔ اور ہر روز سکول میں آکر اُنکے تجربے اور حُسنِ عمل سے مستفید ہوتی ہیں۔ سکول میں غسل خانے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں تولیہ، صابن اور نہانے کی دیگر ضروری اشیا تیار رہتی ہیں۔ بچوں کے لئے اجازت ہے کہ وہ اپنی سستی اور کسلمندی کو نہا کر دور کریں۔ مدر فیلوشپ کی اراکین غسلخانوں کی نگہداشت اور بچوں کی خدمت و تربیت کیلئے وہاں موجود رہتی ہیں۔ اکثر بچوں کی مائیں نہانے کے اوقات پر مدرسے جا پہنچتی ہیں۔ اور اپنے بچوں کو

خود نہلاتی ہیں۔ کھانے پینے اور نرسری کلاسز کے متعلق ۔ ۔ ۔ ۔ کپڑے دوپہر کے کھانے کے بعد بلاناغہ دھوئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہی کپڑے مختلف گھروں میں بھیجدیئے جاتے ہیں۔ جہاں سے دھوکر فوراً واپس پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اس تجویز کے نتائج خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اتنا ضرور ہُوا۔ کہ اس مجلسِ تعاون سے جو ماؤں اور ارباب سکول میں قائم ہے۔ تنگ وافسردہ مکانوں میں رہنے والی ماؤں کی ظاہری شباہت واطوار میں ایک نمایاں انقلاب کا باب افتتاح ہوا ہے مسرت اور بے اعتنا مائیں چست اور حساس مائیں بنگئی ہیں۔ رنجیدہ خاطر۔ چڑچڑی اور جھگڑالو عورتیں، خوش باش۔ خندہ مزاج اور متحمل خواتین میں بدل گئی ہیں۔ اور اُن میں یہ احساس روز بروز روبہ ترقی ہے کہ بچوں کو صاف ستھرا لباس پہنا کر سکول بھیجنا چاہیئے۔

بچونکی حسین اور مسرور زندگی کے مشاہدے سے انہیں خود بھی صفائی اور خوش سلیقگی کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس علقے کے مکانات میں گندگی اور افسردگی کی جگہ مسرت اور صفائی نے لے لی ہے۔

بچوں کی عادات کی تربیت اسقدر بوجوہ احسن ہوتی ہے۔ کہ اُنہیں مارنے پیٹنے۔ ڈانٹنے ڈپٹنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ اپنا ہر کام نہایت شائستگی اور باقاعدگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور والدین اور اُستادوں کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیتے۔

کریڈل بینڈ بچوں کے اُس طبقے کا نام ہے جو مدر فیلوشپ کی اراکین کے بچے ہیں۔ بچونکو کریڈل بینڈ میں شامل کرنے سے پہلے ایک قسم کی استقبالیہ رسم ادا کرنا پڑتی۔ اس موقع پہ اُنہیں نظرفریب اور خوشنما سرٹیفکیٹ دیئے جاتے ہیں۔ جب بچے نرسری سکول میں آنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تو وہ تعلیمی سکول میں بھی آتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اُنکی یہ عادت اُنکی فطرت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اور سکول آنے میں اُنہیں کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔

ماہوار صحبتوں میں بچے بھی شریک ہوتے ہیں اور کبھی دامتنان کی اس نمائش میں اُنکی خودداری اور شان کے جذبات کی خاطر خواہ تربیت ہوتی ہے یونین کے جلسوں نے ماؤں کے بوجھ کو کافی حد تک ہلکا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مائیں دن بدن یونین کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ اور یہ خیال غیر محسوس طور پہ اُنکی روحوں کے امکانی عمق میں جاگزیں ہو رہا ہے۔ کہ ان روح نواز اجتماعات میں اُن کی زندگی بڑھانے اور بچوں میں اپنی قدرو قیمت اور عزت کے احساسات کی نشو ونما کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

عورتوں کے ایک اجلاس میں ایک دفعہ یہ تجویز پیش ہو کر متفقہ طور پہ پاس ہوئی کہ ماؤں کی طرح والدوں کو بھی ان دلچسپیوں میں شریک ہونا چاہیئے۔ بس پھر کیا تھا۔ والدوں کی ایک یونین کی بنیاد رکھدی گئی اور پہلے اجلاس میں ۵۰ مرد شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں ایک لائق مقرر نے تقریر کی۔ بعد ازاں گانے اور کچھ کھانے پینے کے بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔

مردوں کی محفلیں سردیوں میں چار بار منعقد ہوتی ہیں۔ جن میں تفریح کے علاوہ اس تحریک کو منظم اور مضبوط تر بنانے کے لئے مفید ترین تجاویز پیش ہوتی ہیں۔ اور اُن پہ عمل کیا جاتا ہے۔ دن بدن مرد اس تحریک کو تقویت بخش رہے ہیں۔ عورتوں کی کمیٹی کیطرح ان کی کمیٹی بھی گیارہ عہدہ داروں پر مشتمل ہے۔ جن میں تجربہ کار اساتذہ، سن رسیدہ عوام اور کم معروف لوگوں کی اکثریت ہے۔ اس مجلس کا صدر ایک مقامی انسپکٹر ہے۔

کمیٹی کے تمام اراکین دوڑنے۔ کودنے دعوتیں تیار کرنے اور تقسیم کرنے میں کافی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک اور بات جو مردوں اور عورتوں کی کمیٹیوں کے ارکان میں مشترک ہے۔ یہ ہے کہ فارغ اوقات میں دونوں گروہوں کے افراد، اساتذہ اور اُستانیوں سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں اور بچونکی زندگی کو بہتر اور مسرور بنانے کیلئے تجاویز سوچتے ہیں۔

بچوں کی خدمت کا جذبہ اسقدر ترقی کر گیا ہے کہ اگر بچوں کے کھلونے ٹوٹ جائیں۔ تو درجنوں رضاکار فوراً آموجود ہوتے ہیں۔ بہرحال اس تحریک سے سکول کی زندگی میں ایک خوش گوار انقلاب آگیا ہے۔ اور امید ہے کہ اساتذہ اور عوام کے اس مجلسی تعاون سے قوم اور ملک دونوں کے بہتری کے کافی امکانات پیدا ہو سکینگے۔ کاش غلام آباد ہند میں بھی ایسے سکول قائم کئے جا سکیں۔

رشید یزدانی

موازنہ

جہاں میں قابلِ تقلید تھی طرزِ فغاں میری
پپیہے نے بالآخر یاد کرلی "پی کہاں" میری

ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام جہاں ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے از شرق تا غرب مشہور ہے۔ وہاں اُنکا الہامی کلام بھی تمام فضائے عالم میں چھایا ہوا ہے۔ اسیطرح جہاں اُنکی نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ہر ہندوستانی بچے کی زبان زد ہے۔ وہاں اُنکی مشہور غزل "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں" ہر صاحب فہم و فراست کے قلوب پے نقش کالحجر ہے۔ کوئی نوجوان ایسا نہیں جو اس غیر فانی غزل کا حافظ نہ ہو۔ کوئی ادیب ایسا نہیں جسے اس لاثانی غزل کے محاسن کا قرار واقعی اعتراف نہ ہو۔ اور کوئی شاعر ایسا نہیں۔ جسکے دل میں اس مقبولِ عام غزل کی تقلید کا خیال نہ ہو۔

ٹینسن Originality کے حامی اور "استفادہ" کے دشمنوں کا خیال ہے کہ تقلید ایک فضول فعل اور نقل ایک شرمناک حرکت ہے اور اسلئے موجودہ دور میں اسے بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا جاتا۔ مگر دُنیائے ادب میں بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ کسی ادیب نے کسی ایک نامور شاعر کی کسی ایک نظم یا اُسکے کسی ایک کارنامہ کو دیکھکر اُسکی تقلید کی ہے۔ اور پھر یہی نہیں کہ اُس میں ایک گونہ نمایاں خصوصیت پیدا کرلی ہو بلکہ خاطرخواہ کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ اسپنسر کی مشہور نظم Faerie Queene جب شائع ہوئی تو اُسے دیکھکر جان کیٹس ایسا متاثر ہوا کہ اُسکی تقلید کا کلیتاً ارادہ کرلیا۔ اور اس نے اپنے پیشے کو چھوڑکر شعر و شاعری کو مقصدِ حیات تصور کرلیا۔ اسیطرح فردوسی نے جب دقیقی کے شاہنامہ کو دیکھا تو اسقدر اثر پذیر ہوا کہ اسکی تتبع اور شاہنامہ کی تکمیل میں اپنی زندگی ختم کرڈالی۔ اور اسقدر مقبولیت حاصل کی کہ آج تک ضرب المثل ہے بالکل اسیطرح میر انیس نے جب ہوش سنبھالا تو وہ میر خلیق کے مراثی کو دیکھکر اسطرح گرویدہ ہوئے کہ اپنی ساری زندگی مرثیہ گوئی کیلئے وقف کردی اور اس صنف میں وہ شہرت حاصل کی جو فقید المثال ہے۔ اسلئے اگر اقبال کی اس غزل کو دیکھکر شعرائے عصر گرویدہ ہوئے اور انہوں نے اقبال کی تقلید میں اسی بحر و قوافی میں غزلیں کہیں تو کوئی نئی بات نہیں کی۔ اسوقت بھی انیس کی تقلید میں مراثی کہے جارہے ہیں۔ آجکل بھی میر حسن اور مولانا روم کی تقلید میں مثنویاں لکھی جارہی ہیں۔ اور اس زمانہ میں بھی میر کا تتبع میں غزلیں کہی جارہی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا "مقلد ہوا اللہ" کا جواب ممکن ہے؟ اگر ہے تو آئیے اور چند مشاہیر کی کاوشیں ملاحظہ کیجئے اور یہ فیصلہ کیجئے کہ آیا یہ حضرت سعیٔ لاحاصل کے مرتکب ہوئے یا واقعی انہوں نے کسی حد تک کامیابی حاصل کی؟

میں اس سلسلے میں صرف تین مشاہیر جناب مولانا شبیر حسین جوش ملیح آبادی، جناب مولانا عاشق حسین سیماب اکبرآبادی اور جناب اکبر حسین اکبر اجمیری[1] کی غزلیں پیش کرونگا۔ مگر اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ صرف اس ہم قافیہ اور ہم ردیف غزل کو دیکھکر انکی تمامتر ادبی صلاحیت کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جائے بلکہ صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ان شعراء نے خیالات کے اظہار اور قوافی کے استعمال میں کیا جودت اور جدت دکھائی ہے۔ کیونکہ "ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است"۔ ممکن ہے ان حضرات کے علاوہ بھی اور کسی شاعر نے ...... تقلید کی کوشش کی ہو مگر نہ تو مجھے اسکا علم ہے اور نہ میں ان حضرات کے مقابلے میں اُسے قابلِ اعتنا سمجھتا ہوں۔ اسلئے اسکی تلاش بے سود اور تحقیق ...... سعیٔ لاحاصل ہے۔

اقبال، جوش اور سیماب محتاجِ تعارف نہیں اور شاید یہ بھی بتانیکی ضرورت نہیں کہ ان شعراء کا نام بحیثیت "غزل گو شاعر" نہیں بلکہ بحیثیت "ناظم" مشہور ہے۔ پھر ایسی صورت میں ان حضرات کی غزل گوئی اور اسمیں کامیابی کے حصول کی اُمید اک حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے۔ بہرکیف جو کچھ ہے وہ حاضر ہے اور اس جگہ شعراء کے ناموں کی قید کیساتھ انکے اشعار بلحاظ قافیہ درج ہیں اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ کون کس جگہ کیسا رہا۔ جہانتک میری ذات میری پسند اور میری رائے کا تعلق ہے میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ اول تو اہلِ نظر اصحاب کسی کے اشارہ کے محتاج نہیں۔ ثانیاً میں دورِ حاضرہ کی باریک بین نگاہوں میں اسوقت اقبال کے اس شعر کی کہ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

[1] جناب اکبر اجمیری کی غزل موازنہ میں درج نہیں کی جاسکی (م)

زندہ مثال بنا ہوا ہوں۔ ثالثاً کسی مضمون کیلئے مضمون نگار کی رائے کا اظہار قطعاً ضروری نہیں۔ مگر اس سلسلے میں دو باتیں کہدینی ضروری ہیں۔ اولاً یہ کہ شعراء کے نام کی ترتیب بلا لحاظِ عمر، حسنِ کلام اور شہرت و ناموری کے عمل میں آئی ہے۔ ثانیاً یہ کہ جس شاعر نے جس قافیے کو موزوں نہیں کیا ہے۔ اس جگہ میں نے کراس مارک دیدیا ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ان کی طبیعتیں عاجز تھیں۔

~~~~~~

قافیہ "جبینِ نیاز" ملاحظہ ہو۔

اقبال:- کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

جوش:- ترے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزار طور جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

سیماب:- مرا داغِ سجدہ مٹائے کیوں، فلک اسکو چاند بنائے کیوں
کہ یہ داغ حاصلِ عاشقی ہے مری جبینِ نیاز میں

~~~~~~

قافیہ "ساز" ملاحظہ ہو۔

اقبال:- طرب آشنائے خروش ہو تو نوائے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

جوش:- ×

سیماب:- ترا نغمہ موجِ شگفتگی، مرا نالہ شعلۂ زندگی
ہے یہی تو فرق مغنّیہ! مرے سوز میں ترے ساز میں

~~~~~~

قافیہ "آئینہ ساز" ملاحظہ ہو۔

اقبال:- تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

جوش:- ×

سیماب:- نہیں آشنا مرے حال سے کوئی آنکھ بزمِ مجاز میں
ہوں وہ آئینہ جو ہے ناتمام ابھی ذہنِ آئینہ ساز میں

~~~~~~

قافیہ "گداز" ملاحظہ ہو۔

اقبال:- دمِ طوفِ کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

جوش:- ×

سیماب:- ×

~~~~~~

قافیہ "نواز" ملاحظہ ہو۔

اقبال:- نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

جوش:- ×

سیماب:- مجھے خوئے توبہ نہیں تو کیا مرے جرم بخشے نہ جائینگے؟
ابھی اور چاہئیں وسعتیں کرمِ بہانہ نواز میں

~~~~~~

قافیہ "ایاز" ملاحظہ ہو

اقبال:- نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جوش:- جو بہارِ عشق ہو دیکھنا کبھی غزنوی پہ نگاہ کر
کہ شمیمِ گلشنِ خسروی ہے تباہ کوئے ایاز میں

سیماب:- یہی راز تھا کہ حقیقتیں رہیں راز بزمِ مجاز میں
وہ ہی غزنوی کی نظر میں تھی جو گرہ تھی زلفِ ایاز میں

قافیہ "نماز" ملاحظہ ہو۔

اقبال:- جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

جوش:- جو صنم کدوں میں بیاں کروں تو صنم بھی سجدوں میں گر پڑیں
وہ مزا ہے پہلے پہر مزہ مرے دلکو جوشِ نماز میں

سیماب:- یہ رکوع کیا یہ قیام کیا یہ سجود کیا یہ سلام کیا
فقط اک فریبِ نیاز ہے۔ جو نہ محویت ہو نماز میں

~~~~~~

اقبال کے ان اشعار کے علاوہ جوش اور سیماب نے چند اشعار اور بھی کہے ہیں۔ مگر انکا اظہار ضروری نہیں تاہم جوش کا ایک شعر نقل کئے دیتا ہوں جو اقبال کے مطلع کے جواب میں ہے۔ فرماتے ہیں ؎ چمک اے حقیقتِ دلستاں، مجھے تازہ سانچے میں ڈھال دے ؛ میں وہ شمع ہوں جو پگھل چکی ہے تمام بزمِ مجاز میں۔

عطاء اللہ پالوی
~~~~~~

پنجاب کا ایک غریب الوطن شاعر

شیخ مصحفی امروہی مرحوم کے اُن تلامذہ میں جنہوں نے لکھنؤ میں رہ کر شرف تلمذ حاصل کیا ایک صاحب غلام حسین بھی تھے جو مظلوم تخلص کرتے تھے۔ اور عوام میں اپنے تخلص کی مناسبت سے مظلوم شاہ کے نام سے معروف تھے۔

تذکرہ نویسوں نے مظلوم شاہ کے متوطن پنجاب ہونے کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن یہ بات کسی تذکرے سے معلوم نہیں ہوتی کہ اُن کا تعلق پنجاب کے کون سے ضلع سے تھا۔ سخن شعرا میں درج ہے۔

"مظلوم تخلص غلام حسین معروف بہ مظلوم شاہ باشندہ پنجاب شاگرد مصحفی۔"

شوکتِ نادری کے مصنف کا بیان ہے۔

"نام نامیش غلام حسن ملقب و معروف مظلوم شاہ اصل وطنش منصل ملکِ پنجاب است"

مظلوم شاہ مدتِ مدید تک لکھنؤ میں رہے اور اپنے اُستاد سے استفادہ کیا۔ آخر میں غالباً شیخ مصحفی کے انتقال کے بعد الہ آباد چلے گئے چنانچہ شوکتِ نادری کا مصنف لکھتا ہے۔

"مدّتے ممتد در لکھنؤ بخدمت میاں مصحفی بودہ و در تلمذ ایشاں گوئے سبقت ربودہ از عرصہ یازدہ سال دریں شہر (الہ آباد) رسیدہ باعث فروغ فن شعر گردید۔"

تذکرہ نویسوں نے ان کے اخلاق و عادات اور خصائل و شمائل کی کافی تشریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت آزاد مزاج متوکل فقیر منش اور صلح کل مسلک رکھنے والے تھے۔ بلکہ نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی نے تو اپنے (قلمی) تذکرہ مدائح الشعرا میں انکے نام سے پہلے مندرجہ ذیل الفاظ درج کئے ہیں۔

"قدوۃ الفقرا زبدۃ الکملا سر حلقۂ شاعران رنگین بیاں و سر منشائے رنگیں بیانان عذب اللساں معارف کیش، حق آگاہ میاں مظلوم شاہ صاحب مرحوم و مغفور۔"

مدائح الشعرا میں مظلوم شاہ کے تلمذ سے متعلق ایک نئی بات ملتی ہے

"در ابتدا شاگرد رشید میاں مصحفی بود و در دورِ آخر چوں استاد حضرت شیخ امام بخش ناسخ مغفور وارد بلدۂ الہ آباد گشت بہ تلامذگی آں

وحید الزّماں سرِ مباہات بہ فلک الافلاک برافراخت"

لیکن ہمارے نزدیک یہ اندراج بوجوہ چند غیر صحیح ہے

اوّل تو یہ کہ اگر مظلوم شاہ شیخ مصحفی مرحوم کے . . . . بعد شیخ ناسخ سے تلمذ ہوتا تو نواب کلب حسین خان نادر بنارسی جو خود ناسخ کے مخلص شاگرد تھے اپنے تذکرہ شوکت نادری میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اس کا ذکر ضرور کرتے یہ تذکرہ انہوں نے الہ آباد ہی میں لکھا تھا۔

دوسرے یہ کہ میر محسن علی محسن لکھنوی کا سراپائے سخن جس میں شیخ ناسخ کے تقریباً تمام شاگردوں کا ذکر آ گیا ہے مظلوم شاہ کے تلمذ ناسخ سے خالی نظر آتا۔

تیسرے یہ کہ سخن شعرا کے صفحات میں جو دس بارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب ہوا تھا یہ امر ضرور بیان کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب عنایت حسین خاں سے تسامح ہوا۔ اور بغیر تحقیق ایک چیز اُن سے درج ہو گئی۔

مظلوم نے ماہ ذیقعد ۱۲۵۶ھ میں ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا اور سید علی اوسط رشک لکھنوی نے تاریخ انتقال لکھی۔ یہ تاریخ اُنکے دیوان میں موجود ہے ؎

در الہ آباد چوں مظلوم شاہ از ہیضہ مُرد — شاعر شیریں زباں خوش طبع با اخلاق ہائے
حیف ماہِ انتقال او مہ ذی قعدہ بود — بودہ ہجری سال پنجاہ و ششم افسوس ہائے
رشک تاریخش ہمیں مصرع بعینہ یافتہ — بودہ ہجری سال پنجاہ و ششم افسوس ہائے

۱۲ ھ ۵۶

خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی نے اپنے تذکرہ آب بقا میں ایک مادہ تاریخ اور بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے ع

ہائے افسوس وائے مظلوم است

مظلوم شاہ الہ آباد میں استادانہ مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں ایک تو حکیم سید باسط علی محوی الہ آبادی تھے۔ جن کا تذکرہ سخن شعرا میں آیا ہے اور دوسرے شاہ محمد کبیر قدسی الہ آبادی ہے انہوں نے آخر میں خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ (خازن الشعرا)

مختلف تذکروں سے مظلوم شاہ کا جس قدر کلام دستیاب ہوا۔ اُس میں سے چند گزیدہ اشعار قارئین شاہکار کے تفنن طبع کی خاطر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

کب عشق میں پڑتا ہے قدم اہلِ ہوس کا — شعلہ کے مقابل ہو یہ زہرہ نہیں خس کا
چلاتا ہوں ازبس ہیں شبِ ہجر ہیں مظلوم — دم بند کیا ہے مرے نالوں نے جرس کا

رہا دل کو خیالِ ساقی و میخانہ تربت میں — فرشتوں سے کیا میں نے طلب پیمانہ تربت میں
ذرا خوابِ عدم سے چونک اٹھتا تب تماشا تھا — اڑا دیتا کفن کی دھجیاں دیوانہ تربت میں
اگا تو ایک دم کا گر خمارِ مرگ سے ملتا — خدا سے مانگتا ساغر ترا مستانہ تربت میں
طرف معبود کی سجدہ کیا مظلوم عاشق نے — نہ پایا جب نشانِ کعبہ و بت خانہ تربت میں

کشتہ ہے جہاں دفن تری فندقِ پا کا — سبزہ کی جگہ اگتا ہے واں نخل حنا کا

آتش میں لن ترانیوں کی مت جلا مجھے — اے سوزِ برقِ طور، تجلّے دکھا مجھے
وہ استخوانِ سوختۂ سوزِ غم ہوں میں — سونگھے سگِ گرسنہ، نہ کھائے ہما مجھے
واماندہ مثلِ گردِ پسِ کارواں ہوں میں — آوازِ شورِ حشر ہے صوتِ درا مجھے
آہوئے دشتِ وحشتِ یا دِ عذار ہوں — دامِ بلا ہے حلقۂ زلفِ دوتا مجھے
مظلوم مثلِ برگِ خزاں دیدہ بار ہوں — ننگِ چمن سمجھتی ہے بادِ صبا مجھے

نظر افگن ہے کس کے عارضِ پُر نور پہ بجلی — کرے ہے قصد گرنے کا چراغِ طور پر بجلی

علامہ افسر صدیقی (امروہی)

رودِ جہلم

چھیڑ رکھا ہے جو یہ تو نے عراقِ دلنشیں
گا رہی ہے زندگی کا راگ اپنے ساز پر
ڈوبتے سورج کی وہ رنگیں شعاعِ آخریں
گھول جاتی ہے مگر سونا جبینِ آب پر
کیا کہوں شورش تیری زیرِ سکوتِ کوہسار
ابتدائے شام کا ہلکا سا وہ رنگِ شفق
رات کو اُف تیرے پانی میں ستاروں کی بہار
دیدنی ہے چاندنی راتوں میں نظّارہ تیرا
گونج اُٹھتا ہے تیری آواز سے یوں کوہسار

میرا دل تڑپا رہے ہیں تیرے نغماتِ حسیں
نوجوانی رقص کرتی ہے تیری آواز پر
جذب ہو جاتی ہے آ کر تیرے دامن میں کہیں
جیسے موتی پیس کر رکھ دے کوئی سیماب پر
جیسے آدھی رات میں کوئی بجاتا ہو ستار
شرم سے جیسے کسی معشوق کے رخسار فق
جیسے دیوالی میں رخشندہ چراغوں کی قطار
چاندنی کے پھول جیسے کھل رہے ہوں جا بجا
جیسے جنگل میں کسی گم کردہ منزل کی پکار

(سید ضمیر جعفری)

عورت اور کتاب

کتاب اور عورت میں بہت سی مشترک خصوصیات ہیں۔ مگر دونوں میں ایک صفت بہت نمایاں نظر آتی ہے کتاب اور عورت دونوں کی کوئی قیمت نہیں۔ کوئی کا لفظ یہاں ذو معنی واقع ہوا ہے۔ غرض یہ کہ دونوں کی قیمت نہ چاہنے والے کی نظر میں ایک کوڑی سے زائد نہیں۔ مگر مشتاق نگاہوں کے پیچھے جو دل ہے۔ اس میں دونوں کی منزلت ایسی ہے۔ کہ تمام مال ومنال اور زر وجواہر کے ساتھ ساری دُنیا کو نثار کر دیا جائے۔ تو بھی اس کی قیمت کا کوئی حصہ ادا نہیں ہوتا۔ ان کی قیمت بے پایان ہے۔

لیلیٰ را از چشم مجنوں باید دید۔ ہر ایک کی نظر اپنی۔ ہر ایک کی پسند اپنی ممکن ہے۔ ایک انتخاب دوسرے کو ناپسند ہو۔ کتاب کی حالت میں بھی کوئی ایک کا فریفتہ۔ کوئی دوسری کا دیوانہ۔ مگر ایک ادبی معیار مقرر ہے۔ پانی ہمیشہ ڈھلوان کی طرف بہتا ہے۔ پھول ہمیشہ موسم بہار میں ہی مسکرا مسکرا اپنی نکہت سے عالم کو دیوانہ بناتے ہیں۔ اور عشق حُسن کی تمنا میں مستانہ وار جھومتا ہے۔ حُسن سے غرض یہ ہے کہ دل میں شادمانی اور سُرور پیدا ہو نشاط کی کیفیت دماغ پر چھا جائے۔ اس کے بدن کا ہر ذرہ خُوشی سے تڑپ اُٹھے۔ خیال سے ہی مستی کا عالم پیدا ہو جائے۔ یہ نشاط وسرور دل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اور دل جذبات کے ماتحت ہے۔ جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کیلئے حُسن کی ضرورت تو ضرور ہے مگر اس کا کوئی نپا تُلا ہُوا پیمانہ مقرر یا موجود نہیں۔ ہر رنگ ہر آن۔ ہر موقع کے طریقے مختلف ہیں ؎

سودا جو ترا حال ہے اِتنا تو نہیں وہ ؎ کیا جانیئے تُو نے اسے کس آن میں دیکھا

جو چیز دل کو بھا جائے وہی حُسن ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے۔ کہ وہ چیز بدصُورت یا بدنُما یا نفرت انگیز نہیں ہوتی اس میں کوئی نہ کوئی خُوبی ضرور موجود ہوتی ہے۔ اور یہ خُوبی صاحب دل کے جذبات پر قابُو پا جاتی ہے۔

اس فانی دُنیا میں افکار وحوادث عالم سے بچنے کیلئے سب سے مضبُوط قلعہ مرد کا دل ہے۔ کبھی کسی وقت میں دونوں کی جگہ اس قلعہ کے کنج عافیت میں بن جاتی ہے۔ اور پھر ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ امتدادِ زمانہ کیسا تھ پتھر پر بنے ہُوئے نقوش گھستے جاتے ہیں۔ مگر محبت کی نگاہوں سے دل پر بنے ہوئے نقوش زیادہ گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تعلقات زیادہ پُرانے ہوتے ہیں۔ تو محبت بڑھ جاتی ہے نہ کتاب کو نظروں سے اوجھل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نہ عورت کو۔ ایک غیر فانی تعلق۔ قید وبند سے آزاد رابطہ، صفحۂ ہستی سے کبھی محو نہ ہونے والی پیوستگی، ازل سے ابد تک جُدا نہ ہونے والا رشتۂ اتحاد۔

طالب دونوں کا محافظ ہے۔ اگر کہیں عورت کے پاؤں میں کانٹا چُبھتا ہے تو خُون مرد کے جگر سے نکلتا ہے۔ درد وہاں ہوتا ہے ٹیس یہاں اُٹھتی ہے۔ عورت اس بات کو خُوب سمجھتی ہے۔ وہ کبھی کبھی امتحاناً تنتی بھی ہے کہ طالب کے انتہائے جذبات کا اندازہ کر سکے۔ کتاب کا طالب بھی اسے بڑی حفاظت سے رکھتا ہے۔ اگر کسی ورق کا کونا دوہرا ہو جائے تو گویا اس کے جگر میں زخم پڑ گیا۔ کہیں بلندی سے گر پڑے تو اس کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ کہ ایسی عزیز چیز کے ساتھ اس بے دردی کا سلوک کیا جائے۔

دُنیا کی ہر عزیز چیز حفاظت سے رکھی جاتی ہے۔ کتاب کو غلاف چڑھا کر الماریوں میں بند رکھا جاتا ہے تو عورت کو گھر کی چار دیواری کے اندر جگہ دی جاتی ہے مُشتاقوں کے دل اس قدر از خُود رفتہ ہوتے ہیں کہ غیروں کی نگاہ تک پڑنے کے روادار نہیں ہوتے۔ اپنے خیالات سے ہی رشک کیا حسد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ کتاب تو کہتے ہیں۔ ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔ اور عورت جب گھر سے باہر آتی ہے تو سو پردوں میں۔

دُنیا کو دونوں سے محبت ہے۔ سجانے اور سنوارنے کی تمنا دیکھنے والوں کے دلوں میں دونوں کیلئے موجُود ہے۔ ایک کو زیور پہنائے جاتے ہیں۔ مرصع اور مزین لباس سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ دُوسری کو مطلا کیا جاتا ہے غلاف چڑھائے جاتے ہیں۔ خُوبصورت جلدوں سے سجایا جاتا ہے۔

مگر ہاں اے عورت تجھے کتاب پر کئی طرق سے فوقیت حاصل ہے۔ تیری صفات بیان کرنے سے سمجھائی نہیں جاسکتیں۔ الفاظ بیان سے قاصر ہیں قلم نے اسی لئے ابتدا سے ہی روسیاہی اختیار کی تھی۔ کہ جب تیرے صفات بیان کرنے کیلئے کہا جائے۔ تو یہ عُذر پیش کر دے۔ تیری خوبیوں کا تعلق دل سے ہے انہیں صرف محسُوس کیا جا سکتا ہے۔ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مگر صفات کا فرق کچھ ایسا ہی ہے۔ جیسے کاغذ کے بنے ہُوئے گلاب کے پھُول اور قُدرت

کے بنائے ہوئے شگفتہ گلاب کے پھول میں ہوتا ہے۔ اگرچہ کاغذ کو عطر میں اتنا بسایا گیا ہو۔ کہ اس کی خوشبو اصلی گلاب سے کئی گنا بڑھ جائے۔

تیری محبت کی نگاہ سے دل معمور ہو جاتا ہے۔ اور اس میں خوشی کا سمندر موجیں مارنے لگتا ہے جس طرح یاسمن کی کلی کی خوشبو سے خوشی اور انبساط کی محفل قائم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک حسین چہرہ انجمن کی انجمن کو سرور و انبساط کا پیغام دینے کے لئے کافی ہے۔

عورت محبت کے مکتب میں مرد کی اُستاد ہے۔ وہ صرف اس سے ہی محبت نہیں کرتی بلکہ اسے محبت کرنا بھی سکھاتی ہے۔ اور اسے بدنام کرنے کیلئے دُنیا میں یہ مشہور کر دیتی ہے۔ کہ مرد مجھ سے محبت کرتا ہے۔

کتاب ہرجائی ہے جس کے پاس جاتی ہے۔ اسی کی ہو رہتی ہے۔ مگر عورت صاحب دل ہے وہ دل جو محبت کی مے سے لبریز اور جذبات کی شراب سے پُر ہے جس میں حسیات کی دُنیا، مردوں کی بستی سے کئی ہزار گنا زیادہ بیدار ہے۔ وہ اس دل کی دولت کو نہایت حفاظت سے رکھتی ہے۔ مگر جس کے حوالے ایک دفعہ کر دیتی ہے۔ اس سے واپس نہیں مانگتی۔ اس کو اپنا سرتاج بنا لیتی ہے۔ خود اس دیوتا کی پجارن بن جاتی ہے۔ ساری عمر کے لئے اسی کی ہو رہتی ہے۔

کتاب میں قدیم زمانے کی فہم و فراست کا ذخیرہ موجود ہے۔ اور عورت کی ذات میں تمام کائنات کی خوبصورتی کا جوہر بند ہے۔ وہ تمام فنون لطیفہ کا ایک قوت مظاہرہ ہے۔ ایک دلآویز شعر۔ ایک مست کن مرقع۔ ایک حسین نغمہ۔

کاغذوں کے بیجان اوراق کو مرد نے پڑھا اور سمجھا ہے مگر اُسے دُنیا و مافیہا کے حسن کے مرکز تو مرد کیلئے ہمیشہ ایک عقدۂ لاینحل رہا ہے۔ ایک مسئلہ جو سمجھ میں نہ آسکا۔ ایک کتاب جو ہمیشہ بند رہی۔ اے دل تجھے دونوں چیزوں سے محبت ہے۔ کیا تو اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ ترجیح کس کو دی جائے۔ مگر یہ دل، غریب دل، حسرت کا مارا ہوا دل، تم اس سے کیا پوچھتے ہو۔ اس کی آہوں سے فیصلہ کر لو۔

خواجہ شجاع منعمی

مضمون نگار حضرات کی خدمت میں گذارش

رسالہ شاہکار ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کی تاریخ اشاعت یکم کر دی جائے لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مضمون وقت پر پہنچ جائیں۔ لہٰذا قلمی معاونین کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ تک مضمون بھیجدیا کریں تاکہ مناسب ترتیب و کتابت کے بعد پرچہ شائع ہو سکے۔

مارچ نمبر کے لئے مضمون جلد ارسال فرمائیں اس کے بعد اپریل کے لئے ۲۵ فروری تک اور مئی کے لئے ۲۵ مارچ تک مضمون نظم و نثر ارسال فرما کر ممنون احسان فرمائیں۔

(مدیر معاون)

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

(۱) رسالہ شاہکار ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں پوسٹ کر دیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔ ورنہ اس کے بعد تعمیل نہ ہو سکے گی۔

(۲) خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے ار کا ٹکٹ آنا لازمی ہے۔

(مینیجر)

The world is a stage where man and women plays his part according to the direction of the God.

سوال و جواب

سوالات

(۱) عام طور سے اہلِ زبان ندی کو بہ تشدید حرف دال نظم کرتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ میرے خیال میں ندی بہ تخفیف حرف دال ہونا چاہیئے۔

نسیم۔ توسط لائڈز بینک راولپنڈی

(۲) (الف) چار یوم۔ پانچ ماہ لکھنا صحیح ہے یا غلط؟

(ب) یوپی کے ایک استاد کی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار بیان کے اہلِ ذوق میں زیرِ بحث ہیں۔ اپنی رائے سے مطلع فرمایئے!

شبِ عیش ختم ہے بلبلو چلو جا کے پھولوں میں سو رہو
کہیں رازِ دوش نہ فاش ہو کہ قریب صبحِ بہار ہے

اعتراض یہ ہے کہ شبِ عیش کے بعد اگر صبحِ بہار آنے والی ہے تو رازِ دوش کے افشا کا کیا خطرہ ہے۔ کیا شبِ عیش خزاں میں آئی تھی اور کیا شبِ عیش کو ہم رازِ دوش بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا شعر یہ ہے۔

ہم اسیرِ باغ میں ہو گئے نہ کہا کسی نے زباں سے یہ
نہ کرو جدا اسے باغ سے یہ ادا شناسِ بہار ہے

اس شعر میں شتر گربہ کا عیب نظر آتا ہے۔

(۳) آٹھویں جماعت کے لئے جو اردو کورس مؤلفہ سر اقبال ہے اُس میں منشی ونایک پرشاد طالب مرحوم کی نظم "سرورِ قناعت" بھی درج ہے۔ نظم کے حسبِ ذیل اشعار کا مطلب حل نہیں ہوتا۔

وہاں چاپلوسی، تملق، خوشامد
خوشامد برآمد سے بنتا سر آمد
دورنگی دل دوستاں کی شد آمد
وفا کی جدا مد جفا کی جدا مد

ہیڈ ماسٹر لوئر مڈل اسکول بیگم پور جنڈ

(یہ سوال کئی اور استادوں کی جانب سے بھی آیا ہے)

(۴) حضرت جوش ملیح آبادی نے ایک مضمون بہ عنوانِ جوانی لکھا ہے۔ اس میں یہ فقرہ سمجھ میں نہیں آیا۔

"چھالوں کی تنک تلوؤں سے آنکھیں ملتی ہے"۔ ——

—— محمد صدیق عیش فیروز پوری۔

(۵) (الف) عصرِ حاضرہ کے کئی شعراء نے لفظ "تک" اور "گر" کو ترک کر دیا ہے۔ کیا یہ واقعی قابلِ ترک ہیں؟

(ب) زندگی کرنا۔ یہ محاورہ اردو میں کہاں تک درست ہے؟

(ج) ہندوستان کی اصلی زبان کونسی ہے؟

(سربھگوان رشاد)

(۶) مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ مفصل تحریر فرمائیں۔ (عبدالغنی شیدا)

(۷) (الف) لفظ "دوش" بمعنی کندھا گرامر میں مؤنث ہے یا مذکر؟ مولانا سیماب اکبرآبادی نے مؤنث لکھا ہے۔ ع

دوشِ مشرق قابلِ گیسوئے مغرب ہو گئی

کیا یہ صحیح ہے۔ جواب بااسناد مرحمت فرمائیں۔

(ب) "مرحمت" کا تلفظ کیا ہے۔ مَرحمت (بہ فتح را و سکونِ حائے حطی) یا مرحمت (بہ سکونِ را و فتح حائے حطی) یا دونوں طرح درست ہے؟ کیا یہ مصرع صحیح ہے۔

نگاہِ لطف سے اتنی اجازت تو مرحمت ہو

(حسن محمد احسن)

(۸) دل کو کسی غریب کے خاک میں کیا ملا دیا
نورِ جہاں سے آپ نے نقشِ وفا مٹا دیا
رات کو خوابِ ناز میں وہ بھی یہ کہہ کے چونک اُٹھے
ہائے یہ کسی کی آہ تھی جس نے مجھے جگا دیا
اُن کے گنہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف
آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دُکھا دیا
سب ہیں تمہاری بزم میں دورِ شراب کے شریک
غالبِ خستہ دل کو کیوں تم نے ادب سکھا دیا

ان اشعار کے مقطع میں غالب تخلص سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار غالب کی کسی غزل کے ہیں لیکن مجھے باوجود سخت کوشش کے غالب کے کسی دیوان کے نسخہ میں یہ اشعار نہیں ملے۔ ازراہِ کرم بذریعہ شاہکار جواب دیں کہ یہ اشعار واقعی غالب

کے ہیں - یا نہیں - میرے خیال میں یہ اشعار کسی اور شاعر کے ہیں اور اگر آپ ان کو غالب کے اشعار سمجھتے ہوں تو مکمل غزل شائع فرمادیں اور بتائیں کہ یہ کسی نسخہ میں موجود ہیں؟

(خانصاحب) وحیدالدین ڈی - ایم کالج موگا

جوابات

(۱) اصل لفظ ندّی بہ تشدید حرف دال ہے - اسی لئے جمع میں دال کی تشدید ضروری ہے - "ندیاں" بغیر تشدید دال درست نہیں - البتہ ندی بصورت واحد بغیر تشدید حرف دال بھی غلط نہیں -

(۲) (ا) درست ہے -

(ب) پہلا اعتراض صحیح ہے - دوسرے اعتراض میں تاویل کی گنجائش ہے - پہلا شعر غلط ہے اور دوسرا کمزور -

(۳) شعر کا مطلب حسب ذیل ہے -

وہاں خوشامد اور چاپلوسی سے عزت حاصل کی جاتی ہے -

دوستوں کے دل کا آنا اور جانا ایک دورنگی ہے اصلیت سے دور -

وفاداری اور جفاکاری کی مدیں جدا جدا ہیں -

الفاظ سے تو یہی مطلب نکلتا ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ دونوں شعر بحیثیت مجموعی صنعتوں کا گورکھ دھندا ہیں - کوہ کندن وکاہ برآوردن - پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں "خوشامد برامد" کی بجائے "خوشامد درامد" ہونا چاہیئے

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ بے معنی سا ہے اور دوسرے مصرعے میں "جدآمد" کے تکرار سے شاعر نے یہ مغالطہ دینا چاہا ہے کہ جدآمد شد آمد کی طرح فعل مرکب ہے - حالانکہ جدا - اور مد - الگ الگ ہیں -

(۴) صحرانوردی سے پاؤں کے تلووں میں چھالے پڑ جاتے ہیں اور ان میں ٹیس پیدا ہو جاتی ہے - اسی درد اور ٹیس کو تپک کہتے ہیں -

مضمون کے پہلے فقروں کو ملا کر پڑھنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے -

(۵) داغ مرحوم کے متروکات میں تلک بھی شامل ہے - داغ کے سلسلے کے اساتذہ اسے اب تک بھی استعمال نہیں کرتے -

مولینا حسرت موہانی اور اکثر اساتذہ تک اور تلک دونوں کا استعمال جائز خیال کرتے ہیں - جدید طبقۂ شعراء جن میں اہل الرائے حضرات کی کمی نہیں تلک کو بے تکلف استعمال کرتا ہے - میں نے تو ابتدائے شاعری سے آج تک اسے متروک الاستعمال نہیں سمجھا - میرے خیال میں تک اور تلک میں ایک نازک سا فرق ہے - وہ یہ کہ تک کی بہ نسبت تلک میں انتہا کا مفہوم زیادہ ہے - اور مجھے تو اس میں ترنم بھی محسوس ہوتا ہے -

(ب) متقدمین شعراء نے فارسی مصدر زندگی کردن کا ترجمہ کرکے زندگی کرنا کو زبان میں داخل کر لیا ہے - مرزا جان جاناں علیہ الرحمۃ کے کلام میں یہ مصدر موجود ہے اور مرزا صاحب سے زیادہ اردو زبان کا مستند شاعر کون ہو سکتا ہے -

اگرچہ محاورۂ عام اب تک اس سے مانوس نہیں ہو سکا لیکن اب بھی سلیقے سے کوئی نظم کر دے تو اسے غلط تو کیا غیر فصیح بھی نہیں کہہ سکتے -

(ج) تقریباً ڈیڑھ صدی سے تو ہندوستان کی اصلی زبان اردو ہی ہے جسے مغربی سیاح اپنے سفرناموں میں ہندوستانی" یا لنگویج آف انڈیا" کے نام سے قلم بند کرتے ہیں اور عہد قدیم میں سنسکرت سے پہلے ہندوستان کی کوئی ایک زبان نہ تھی بلکہ خطّے خطّے میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں جیسے کہ آج بھی پنجاب کی پنجابی، بنگال کی بنگالی، سندھ کی سندھی اور گجرات کی گجراتی ہے -

لیکن چونکہ اس وقت کا ہندوستان آج کے ہندوستان کی طرح ایک ملک نہیں تھا بلکہ مختلف اقوام کے زیر حکومت اس کے مختلف رقبے تھے - ایک گوشے کے باشندے دوسرے گوشے کے رہنے والوں سے کسی قسم کا ربط و ضبط بھی نہ رکھتے تھے - اس لئے کوئی ایک زبان جسے سارے ملک کے لئے لنگوا فرینکا کہا جا سکے نہ تھی - عہد قدیم کی اتنی بات تو اب تک بھی باقی ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں میں رہنے والی قومیں اپنے اپنے دائرہ حیات کی مخصوص زبانیں بولتی ہیں لیکن چونکہ جدید دور زندگی میں جدید اسباب ترقی نے پشاور سے پانڈیچری کے ڈانڈے ملا کر سارے ملک کو ایک بستی بنا دیا ہے - اس لئے ایک زبان معاشرتی ضرورت نے ایسی بھی بنا ڈالی جس کے ذریعہ دور و دراز خطہ ہائے ملک کے ہندوستانی آپس میں تبادلۂ خیالات کر سکتے ہیں اور وہ زبان ایک ہی ہے جسے مسلمان اردو، ہندو ہندی اور یورپین ... ہندوستانی کہتے ہیں -

(۶) مولینا ظفر علیخاں کی شاعری زیادہ تر ہنگامی نظموں پر مشتمل ہے - یہ نظمیں ارتجالاً لکھی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود ندرت، جدت اور سلاست، کے اوصاف کی حامل ہیں - مشکل سے مشکل زمین کو بھی ظفر علی کی عجوبہ کار شاعرانہ جولانی سرسبز کر دیتی ہے

(۷) (ا) کندھے کے معنی میں دوش مذکر ہے اور گزشتہ کل کے مفہوم میں بھی دوش مذکر ہے -

(ب) مرمت بروزن مکرمت بہ سکون رائے وفتحۂ حائے حطی ہے - البتہ گفتگو میں بہ فتحہ را ...... بولنے والوں کو ٹوکنا مناسب نہیں کہ یہ تلفظ بھی خاص و عام میں رائج ہو گیا ہے -

(۸) دیوان غالب کے جتنے نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں یہ غزل درج نہیں - اس کا انداز نگارش بھی مرزا کے اسلوب بیان سے بہت مختلف ہے اور پست بھی -

تاجور

بزمِ انتخاب

غزل

شہرتِ بے چارگی، ناکام تھی ناکام ہے! منہ ہوا لے سچ بتا اس موت کا کیا نام ہے
صبح کا کچھ ہوش ہے مجھ کو نہ فکرِ شام ہے۔ بے کسی کی زندگی میں یہ بڑا آرام ہے!
سوچ میں کیوں پڑ گئے، تم میری حالت دیکھ کر مسکرا دو۔ مسکرانا ہی تمہارا کام ہے
عشق کی روشن خیالی کو کوئی کہتا نہیں، حسن کی جادو نگاہی مفت میں بدنام ہے
دیکھنا چاروں طرف حیرت سے خاموشی کیساتھ عشق کی پُرہول وادی میں یہ پہلا کام ہے
موت سے بڑھ کر بھیانک، قبر سے بڑھ کر اداس ہجر کی یہ شام بھی اللہ کیسی شام ہے
دل مرا اس کو چرا لایا ہے بزمِ حسن سے موت جس کی اک ادائے برمحل کا نام ہے
لمحہ لمحہ اک نئی اُفتاد کا منت پذیر! زندگی شاید انہیں بے کیفیوں کا نام ہے
اک ذرا سی ہم نے کیا پی لی قیامت آ گئی آج ساقی کی زباں وقفِ صلائے عام ہے
مضمحل کر دے جو نظمِ زندگی کی بندشیں موت اُسی ٹوٹی ہوئی اُمید ہی کا نام ہے
سوچتا ہوں کیا کہوں گا اُن سے بزمِ ناز میں پوچھ بیٹھے وہ اگر کیا نام ہے کیا کام ہے
نفس کی مذموم حیرت کوشیوں کا کیا اثر حسن پھر اک معجزہ ہے، عشق پھر الہام ہے
یہ تغافل کا نتیجہ، یہ تلوّن کا مآل! ذرہ ذرہ آج تصویرِ دلِ ناکام ہے

پھر ساقی کیوں ہوا اے سرشار دل ناگوار
خون کی ہر بوند مے، ہر آبلہ اک جام ہے

(کنول) سرشار کسمنڈوی

آئینِ جہانگیری

مندرجہ بالا تخصیصاتِ شاہی میں سے اکثر کی تائید جہانگیر کے ایک فرمان سے بھی ہوتی ہے۔ جو تاریخ میں آئینِ جہانگیری کے نام سے مشہور ہے یہ فرمان اس وقت جاری ہوا تھا جب سرحد کے بعض امیر سینہ زوری سے کام لیکر بعض شاہی مخصوصات کو اپنے لئے اختیار کر رہے تھے۔ جہانگیر نے بخشیوں کو حکم دیا کہ وہ امرائے سرحد کو ان بے اعتدالیوں کی طرف سختی سے توجہ دلائیں اور اس بات پر زور دیں۔ کہ وہ امور جو خاصہ بادشاہی ہیں۔ دوسروں کو اختیار نہیں کرنے چاہئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے :-

۱ - وہ جھروکہ میں نہ بیٹھیں۔ امیروں اور ملکی سرداروں کو یہ تکلیف نہ دیں کہ وُہ ان کی سلامی اتاریں۔

۲ - جنگِ فیلاں میں حصّہ نہ لیں۔

۳ - کسی کو سزا دیتے وقت اس کی آنکھ نہ نکالیں۔ کان اور ناک نہ کٹوائیں۔

۴ - اپنے ملازمین کو خطاب نہ دیا کریں۔

۵ - دربار داری کے وقت نوبت اور نقارے نہ بجوائیں۔

۶ - جب کسی شاہی ملازم یا اپنے کسی نوکر کو ہاتھی یا گھوڑا بخشیں۔ تو اس کیساتھ لگام یا کجک (آنکس) نہ دیں۔

۷ - اپنے جلوس کے موقعہ پر شاہی ملازمین کو پیدل چلنے کا حکم نہ دیں۔

۸ - اگر کسی ماتحت کو کوئی فرمان لکھیں تو اس پر مہر نہ لگائیں۔

علم الدین سالک (سالنامہ ادب لطیف)

غزل گو

اِن غزل گویوں کا ہے معشوق ایسا نازنین
نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں
یہ فقط رسمی مقلد وامق و فرہاد کے
مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
اِن کی سیرت ہے انوکھی اِن کی غیرت ہے عجیب
گڑ نہیں جاتے حیا سے یہ اب و جد کے رقیب
آج تک غالب ہے اُن پر وہ رقیب روسیاہ
کر چکا ہے زندگی جو میر و مومن کی تباہ
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر نئے ہر صدا
ان کے لب پر بھی وہی ہے جو وکی کے لب پہ تھا
اِن کی حالت وہ ہے جیسے کوئی بزدل خواب سے
"چور آیا" "چور آیا" کہہ رہا ہو چونک کے
اور گھر کے جس قدر پیر و جواں ہیں زور زور
اپنے اپنے بستروں پہ چیختے ہوں "چور" "چور"
اُن کے دل میں شعر کی روشن ہو کس صورت سے آگ
قافیے کے ہات میں رہتی ہو جن لوگوں کی باگ
کس طرح معنی کے انگاروں سے آنچ اُٹھے وہاں
جس جگہ لفظوں کی سیلی لکڑیوں کا ہو دُھواں
شعر اِن کے محض ذرّے ہیں، کبھی تارے کبھی
تین کانے ہیں کسی موقع پر، پَو بارے کبھی
شاعری اِن کی نہیں ہمرشتۂ پیغمبری
دیر تک چلتی نہیں الفاظ کی بازیگری
سلسلہ اِن کے سخن کا دُور تک ہوتا نہیں!
کون ہے اِن میں جو بالآخر "کُڑک" ہوتا نہیں؟
سر سے پا تک بے سُرے ہیں سر بسر بے تال ہیں
یہ حقیقی شاعروں کے اصل میں نقال ہیں
قلب اِن کا قطرۂ شبنم تو ہے، چھالا نہیں
کوئی اِن میں زندگی کا دیکھنے والا نہیں

جوش (کلیم)

لطافتِ زُبان

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کئی زبانوں کی آمیزش سے بنی ہے لیکن جن الفاظ کو خواہ وُہ کسی زبان کے ہوں اُردو نے اپنا بنا لیا ہے، وہ فصیح مانے جاتے ہیں، اسی کا نام ٹکسالی زُبان ہے جس کو پرکھنے کے لئے دہلی اور لکھنؤ کی زبان مستند مانی جاتی ہے۔ روزمرہ اور محاورات اُردو زُبان کے خاص ہیں جن کو شاید دوسری زُبان سے تعلق نہیں ہے۔ اُردو نے اپنے زمانہ طفولیت میں بھاشا فارسی اور عربی زبان کے الفاظ سے پرورش پائی۔ ابتدا میں اِن زبانوں سے اُردو جس قدر الفاظ لے سکی، اُن کو لے لیا۔ یہاں تک کہ بالکل مملوّ ہوگئی اور ان زبانوں کے الفاظ کی اب اس میں گنجائش باقی نہیں رہی۔ ہمارے شعراء نے فارسی شاعری کو اپنا ماخذ قرار دیا اور گل خیالات، تشبیہہ اور استعاروں کا اُردو میں کچھ ایسا چربہ اُتارا کہ وُہ مالا مال ہوگئی۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ زمانے نے پلٹا کھایا اور حکومت بدلی۔ انگریزی عملداری کا دَور دورہ

شروع ہوا اور اس طرح نئی زبان کا ایک گراں بہا خزانہ ہاتھ آگیا۔ انگریزی زبان کے الفاظ اُردو میں نہایت تیزی سے داخل ہونا شروع ہوئے۔ اور اُس نے ہزاروں الفاظ کو اپنا لیا۔ اور جس لفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اُس کو اپنا بناتی چلی گئی، اس طرح اصُولِ ارتقا نے اپنا کام جاری رکھا۔ الفاظ بنا شروع ہوئے جس لفظ کی ثقالت زُبان کو گراں گذری اُس پر اُس نے پُورا تصرف کیا اور کچھ اس طرح کی تراش خراش کی کہ اُن کی صُورت بالکل نئی ہوگئی مثلاً لالٹین۔ رپٹ۔ کارتوس نیکلاٹ، چھینٹ، گدام، بوتل، بوتام وغیرہ اور جہاں ضرورت نہیں پائی گئی ایک ذرا سا ردّ و بدل کرکے داخل زُبان کر لیا۔ شلاً گون۔ پتلون، واسکوٹ۔ توس۔ بسکٹ۔ کونین۔ ڈپٹی۔ بیل۔ کالج۔ ڈگری۔ انجن۔ آرڈر۔ وغیرہ لیکن زیادہ تر الفاظ اس طرح کے ہیں کہ اُن میں کوئی تصرف نہیں پایا جاتا ہے۔ مثلاً اپیل اسکول۔ ہائیکورٹ۔ گراموفون۔ پوس۔ کمپنی۔ کرکیٹ۔ مل۔ کارڈ۔ ناول ڈراما۔ پبلک وغیرہ غرض اس طرح کے ہزاروں الفاظ ہیں جو اُردو میں داخل ہوکر جزوِ زبان بن گئے۔ اُن کا لکھنا یا بولنا فصحا کے نزدیک جائز ہے لیکن اس بنا پر بہن کو سسٹر۔ باپ کو فادر، چھری کو نائف۔ بیوی کو وائف۔ نسیمِ سحری کو مورننگ بریز۔ مخمل کو ولوٹ۔ بلبل کو نائٹنگیل۔ بادل کو کلاوڈ۔ وقت کو ٹائم۔ شبنم کو ڈیو۔ ناک کو نوز۔ گُلاب کو روز وغیرہ لکھنا یا بولنا محض غلط اور غیر فصیح ہی نہیں بلکہ اپنی زُبان پر ظلم کرنا ہے۔ یہ ایک طرح کی بدعت ہے جس کی بدمزگی کی تاب زُبان کی لطافت و فصاحت نہیں لا سکتی ؎

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے
اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرزِ نظر ہے

موجُودہ زمانے میں نوجوان تعلیم یافتہ جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ اخبار، رسالے اور ناولوں میں بے ضرورت انگریزی الفاظ بھرے جاتے ہیں جن کو پڑھ کر گھن آتی ہے۔ زُبان کی پاکیزگی مٹ رہی ہے اور غلاظت بڑھتی جاتی ہے۔ اُن کا یہ خیال کہ اس سے زُبان کی وسعت ہوگی اور اُردو ترقی کریگی غلط ہے۔ وہ ایک ترقیٔ معکوس کر رہے ہیں۔ گویا گھڑی کی سوئی اُلٹی گھمائی جا رہی ہے جس سے آئے دِن زُبان کی لطافت مکدر ہو رہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب دُوسری زبان کے الفاظ کے مرادف اُردو میں خوُد فصیح الفاظ موجُود ہیں تو غیر مانُوس دُوسری زُبان کے الفاظ کا بار ہماری زُبان نہیں اُٹھا سکتی۔ اور نہ وہ ہضم ہو سکتے ہیں۔ انگریزی تو ایک اجنبی زُبان ہے۔ فارسی اور عربی کہ جن سے اُردو بنی ہے اُن کے غیر مانُوس الفاظ کانوں کو گراں گذرتے ہیں اور فصحا و ادبا بغیر ضرورت اِس طرح کے الفاظ کا استعمال ناجائز سمجھتے ہیں۔ یہاں پر کسی عربی داں شاعر کا ایک مصرعہ ملاحظہ ہو۔

یہ کالے کالے بادل جو نیں جو ہیں برستے

جناب نے سمجھا کہ یہ جو کیا چیز ہے؟ معروف غلہ نہیں بلکہ کھُلی ہوئی فضائے آسمانی مراد ہے۔ خیر یہاں پر تو شاعر نے عربی کو شاید اپنی مادری زُبان سمجھ کر ایک غیر مانُوس لفظ تحریر فرمایا ہے۔ لیکن اُردو جو ہماری مادری زبان ہے اُس کی فصاحت "جو میں جو" کے تنافر سے نمایاں ہے۔ غرض اس طرح کی ہزاروں مثالیں موجُود ہیں۔ جن کو نظرانداز کرتا ہُوں۔ جب عربی اور فارسی زبان کے غیر مانوس الفاظ کا یہ حال ہے کہ زُبان کی فصاحت اُن کی تاب نہیں لا سکتی تو انگریزی جو ایک اجنبی زُبان ہے اُس کے الفاظ کو جس کی زُبان کو مُطلق ضرورت نہیں ہے استعمال کرنا کسی طرح جائز و ممدوح نہیں ہے۔ جس طرح دُنیا کی کُل چیزیں اصوُلِ ارتقا پر کاربند ہیں۔ اُسی طرح زبان بھی اُس کی محکوم ہے۔ جس اصول نے انگریزی زبان کے الفاظ کو توڑ موڑ کر لالٹین، کارتوس، بوتل وغیرہ بنا لیا اور ایک نامعلُوم طریقے سے یہ نئے الفاظ جزوِ زبان بن گئے وہ اس وقت بھی اپنا کام کر رہا ہے جس لفظ کی زُبان کو ضرُورت ہوگی وہ خوُد بخود اپنا لے گی۔ یہ کام میرے یا آپ کے بس کا نہیں ہے۔

جناب نے شاید سُنا ہو۔ بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا جن کو قدرت نے مذاقِ سلیم عطا نہیں کیا ہے۔ یہ قول کہ زبان اپنی ہے۔ جس طرح چاہیں بول سکتے ہیں۔ اس میں کسی کا اجارہ کیا۔ اگر چلنے کو واک کرنا، باتیں کرنے کو ٹوک کرنا، آنکھ سے دیکھنے کو چشم سے دیکھنا اور کان سے سُننے کو اذان سے سُننا کسی نے لکھدیا تو تمہارا کیا۔ اس سے زُبان میں کونسی خرابی آگئی جو صاحب اِس خیال کے ہیں ان کو جاننا چاہئے کہ دُنیا کی ہر چیز میں ایک قانُون اور نظم کارفرما ہے۔ اگر نظم اور ضابطہ نہ ہو تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے۔ اِسی طرح زُبان بھی اپنے قانون و نظم کی محکوم ہے جس کی پابندی لازم ہے۔ اگر قوم کا ہر فرد ایک شترِ بے مُہار کی طرح زُبان کو پامال کرتا ہوُا جدھر چاہے نکل جائے۔ جس طرح چاہے بولے یا لکھے۔ تو اُس کی زُبان میں کوئی نظم یا اصول قائم نہیں رہ سکتا۔ اُس کا دفترِ علم و ادب پریشان اور تباہ ہو جائے گا اور وہ قوم جس کی زُبان میں کوئی اصُول نہ ہو دُنیا میں ہرگز ترقی نہیں کر سکتی۔ زُبان کی تباہی قوم کی بربادی ہے، جس طرح سیاسیات میں طائف الملوکی مُلک کی بربادی کی ایک کھُلی ہوئی نشانی ہے، اسی طرح کسی قوم کی زُبان کا بے اصُول ہو جانا اور اُس کے شیرازے کا بکھر جانا اُس کی ہلاکت اور بربادی کی خبر دیتا ہے ؎

سید رضا قاسم مختار (کلیم)

صفحۂ اطفال

"ایک جھوٹ کو سچ ظاہر کرنے کیلئے دس جھوٹ"

باپ: ۔ نذیر تم کہاں تھے؟

نذیر: ۔ ابا جان اسکول سے آرہا ہوں۔

باپ: ۔ مجھے تو تمہارے اُستاد نے بتایا ہے کہ آج اسکول نہیں گئے۔

نذیر: ۔ ابا جان اسکول تو میں گیا تھا۔ اس وقت ماسٹر صاحب کلاس میں نہ تھے[۲]۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے انعامی جلسے کے انتظام کا مشورہ کرنے گئے تھے۔ اس لئے میں نانی جان کے پاس چلا گیا۔ اُن سے کہنا تھا کہ امی جان نے بلایا ہے[۳]۔

ماں: ۔ مگر وہ تو تیرے کہے بغیر آئیں۔ اور آکر چلی بھی گئیں۔ ابھی تو گئی ہیں۔

نذیر: ۔ جی ہاں۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ہاں تشریف لے گئی ہیں۔ اس لئے میں جغرافیے کا نقشہ[۴] دیکھنے بشیر بھائی کے گھر چلا گیا[۵]۔

باپ: ۔ بشیر تو تم سے یہاں ملنے آیا تھا۔

نذیر: ۔ ہاں ابا جان وہاں اُن کے والد سے معلوم ہوا[۶] کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے کہا اب اتنی دور تو آیا ہوں ثریا آپا کی خیریت ہی معلوم کرتا چلوں[۷]۔

ماں: ۔ کیا ثریا؟ ثریا تو امرتسر اپنے خاوند کے ساتھ شادی میں گئی ہوئی ہے۔

نذیر: ۔ جی۔ یہ بات مجھے اُن کے گھر جاکر معلوم ہوئی کہ وہ امرتسر گئی ہیں۔ ان کی ساس نے مجھے[۸] باتوں میں لگا لیا۔ یوں[۹] دیر ہو گئی۔

ماں: ۔ جان ہار۔ لگاتار جھوٹ بولے جاتا ہے۔ ارے وہ بھی تو ثریا کے ساتھ شادی میں گئی ہیں؟

نذیر: ۔ آپ ان کی کونسی ساس کو سمجھ رہی ہیں[۱۰]۔ میں تو ان کی خلیا ساس کا ذکر کر رہا ہوں۔

ماں: ۔ خلیا ساس کونسی ہے نگوڑے!

نذیر: ۔ اختر بھائی کی اماں اور کونسی خلیا ساس۔ آپ جانتی نہیں اُنہیں؟

ماں: ۔ انہیں کی سگی بھانجی کی تو امرتسر میں شادی رچائی جارہی ہے۔ اور وہ تجھے باتوں میں لگانے کے لئے نہیں

بیٹھی رہیں - یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ اپنی سگی بہن سے ان کی لڑائی تو نہیں ہوگئی؟

نذیر: - وہ بھی تو رام کہانی مجھے سُنا رہی تھیں - اپنی بہن سے انہیں اس شادی کے سبب بہت سی شکائتیں پیدا ہو گئی ہیں - اس وجہ سے انہوں نے شادی میں جانے سے انکار کر دیا۔

باپ: - دیکھو یہ ذرا سا فتنہ کیسا ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے - ایک اسکول نہ جانے کا بہانہ بنانے کے لئے اس نے ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے دس جھوٹ اور بولے - اگر پہلے ہی سچ بات بتا کر اپنی غلطی مان لیتا تو سچا بھی رہتا اور میں اسے معاف بھی کر دیتا - لیکن یہ بے تحاشا جھوٹ بولتا رہا - خدا کا بھی گنہگار بنا اور اب میرے ہاتھ سے جی بھر کر مار بھی کھائے گا - لاؤ تو میرا بیت اسے جھوٹ بولنے کا مزا چکھاؤں کبھی یاد تو کرے گا - کہ جھوٹ بولنے کا کیا نتیجہ ہے؟

نذیر: - ابا جان اب معاف کر دیں - آگے میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا - آج آپ کے ڈر سے جھوٹ بولنا پڑا -

باپ: - نامعقول! تجھے میرا تو ڈر ہے - خدا کا ڈر نہیں - اچھا پھر خدا بھی تجھے میری مار سے نہیں بچائے گا۔ لاؤ جی میرا بیت او گل بہار! سُن رہی ہے - بیت ڈھونڈھ کر نہیں لاتی؟

گل بہار: - (ملازمہ) حضور وہ بیت تو چھوٹے میاں نے ایک کتے کو مار مار کر توڑ بھی دیا تھا -

باپ: - اچھا وہ نہ سہی - سُتلی لاؤ! اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر چھت کے کڑے سے اسے لٹکاؤں - آخر جھوٹ بولنے کا کچھ تو انعام انہیں ملنا چاہیئے - ایسے باکمال لڑکے کی حوصلہ افزائی کی بڑی ضرورت ہے - دیکھتی نہیں ہو ایک سانس میں لگا تار جھوٹ بولے چلا گیا - اسے خدا کا خوف نہ آیا - لاؤ سُتلی لاؤ! پھرتی کرو!

نذیر: - (رو رو کر) ابا جان! پہلی غلطی ہے اسے معاف فرما دیجئے - اب آپ مجھے کبھی جھوٹ بولتے دیکھیں تو میری کھال اُتار دیں - میں عہد کرتا ہوں کہ زندگی بھر جھوٹ نہیں بولوں گا -

باپ: - اور اگر تم کبھی پھر جھوٹ بولے -

نذیر: - انشاء اللہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا - خدا سے توبہ کرتا ہوں - اور آپ سے اس غلطی کی دل سے معافی مانگتا ہوں - واقعی مجھ سے خدا کا بڑا گناہ ہوا ہے -

باپ: - اچھا تم ایک تحریر لکھ کر دو کہ آئندہ کبھی او کسی حال میں کسی سے بھی جھوٹ نہ بولو گے -

نذیر: - بہت بہتر - ابھی لکھے دیتا ہوں - کاپی میں سے ایک کاغذ لے کر نذیر نے حسب ذیل تحریر لکھی:-

× × × ×

"میں آج جھوٹ بول کر بڑا شرمندہ ہوا ہوں۔ مجھے ایک جھوٹ کو سچ بنانے کے لئے دس جھوٹ اور بولنے پڑے۔ میں خدا سے اس گناہ کی معافی مانگتا ہوں۔ اور ہمیشہ کے لئے عہد کرتا ہوں کہ سچ بولا کروں گا۔ جھوٹ کسی حال میں نہ بولوں گا۔ آئندہ خدا نہ کرے۔ میرے منہ سے کوئی جھوٹی بات کبھی نکلے۔ اگر کبھی پھر میرا کوئی جھوٹ ثابت ہو تو ابا جان میرے لئے جو سخت سے سخت سزا تجویز کریں گے۔ میں اپنے آپ کو اس کا مستحق اور سزاوار سمجھوں گا۔"

راقم۔ محمد نذیر ۱۵

باپ نے یہ تحریر پڑھی اور یہ کہہ کر اپنے اٹیچی کیس میں رکھ لی۔

"ہاں درست ہے۔ ایسی تحریر کی ضرورت تھی۔"

نذیر دیکھو! خدا ہمیں ہر وقت دیکھتا ہے۔ ہم انسانوں سے کوئی گناہ چھپا لیں۔ مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے۔ خدا جھوٹے آدمی کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور خدا جسے ناپسند کرے اس کا دین و دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں! دیکھو! تم نے جھوٹ بول کر کیسی رسوائی اٹھائی۔ اور اگر پشیمان ہو کر توبہ نہ کرتے۔ تو خدا بھی تمہیں اس گناہ کی سزا دیتا۔ تمہیں میرے ڈر سے زیادہ خدا کا ڈر چاہیئے۔ جو آدمی خدا سے ڈرتا ہے۔ وہ گناہوں سے بچا رہتا ہے۔ آئندہ میں نے خدانخواستہ تمہیں جھوٹ بولتے سنا۔ تو یاد رکھنا ایسی سزا دوں گا۔ کہ دیکھنے والے بھی اس سے سبق لینگے بس سمجھ دار آدمی کو ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔

جاؤ نماز کا وقت آگیا۔ مسجد میں نماز پڑھو۔ میں بھی آرہا ہوں۔ اور نماز کے بعد گڑگڑا کر خدا سے آج کے گناہ کی معافی مانگو اور توبہ کرو!

نذیر:۔ ابا جان انشاء اللہ آپ مجھے جھوٹ بولتے ہوئے کبھی نہ دیکھیں گے۔ میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے عہد پر بھروسا کر کے آج مجھے معاف کر دیا۔

تاجور

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور

آنریری ایڈیٹر:- میرزا ادیب بی۔ اے

ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
سید عبدالرشید یزدانی

شاہکار

بابت ماہ مارچ ۱۹۳۷ء

جلد ۴ نمبر ۶

فہرست

تصاویر:- سہ رنگی:- مزار شوہر پہ
یک رنگی:- سلطان دکن - احسان دانش - تصور

چندہ سالانہ:- چھ روپے - ششماہی:- ساڑھے تین روپے

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

(عنایت کریم کاتب سیالکوٹی)

مختصرات

سیاست اور مذہب

جب مسلم رہنما اور اخبارات یہ دعوے کرتے ہیں کہ مذہب اسلام اور سیاستِ اسلام دو چیزیں نہیں، بلکہ ایک مسمی کے دو نام ہیں - اُس وقت وہ اسلام کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں - یقیناً اسلام مذہب بھی ہے اور سیاست بھی۔ الحق کہ ہمارے سیاسیات ہمارے مذہب سے جُداگانہ نہیں اور ایک سچا مسلمان کبھی اُن مغرب زدہ لوگوں کا ہم نوا نہیں بن سکتا جو یہ کہتے ہیں کہ "مذہب کو پالٹیکس سے کوئی واسطہ نہیں"۔ لیکن اس صغریٰ کے ساتھ یہ کُبریٰ ملانا کہ ہمارا موجودہ پالٹیکس اسلام کے مطابق ہے اس سے مَیں انکار کرتا ہوں -

اسلام سچائی اور راستی کو کہیں اور کسی حال میں ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن دوسروں کی طرح بعض مسلم رہنماؤں کا موجودہ پالٹیکس اکثر وقت ترک راستی وصداقت کو ضروری خیال کرتا ہے - روحی فداہ حضرت نبی کریمؐ نے اظہارِ حق وصداقت میں بہت پاش اذیتیں برداشت کیں مگر صداقت کے اظہار کو کبھی نہ چھوڑا - یہ تھی اسلام کی سیاست، لیکن ہمارا موجودہ پالٹیکس اُس صداقت کے اظہار کو جو دوسروں کے ساتھ انصاف کرنا ہو جُرم ملی تصور کرتا ہے -

خیر القرون میں سچا مسلمان وہ سمجھا جاتا تھا جو بے امتیازِ مذہب وملت سب کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرے کہ "خیر الناس من ینفع الناس" نبی کریم علیہ السلام کا ارشاد ہے -

مگر ہمارے موجودہ پالٹیکس میں پکّے اور سچے مسلمان کی حدِ تام (مکمل تعریف) صرف یہ رہ گئی ہے کہ وہ توحید ورسالت کا معترف ہو یا نہ ہو ہندو کا دشمن ضرور ہو!

اصلی اسلام جس کی تبلیغ کے لئے خدا کے برگزیدہ بندوں نے اپنی پاک زندگیاں قربان کر دیں ، یہ تھا کہ کسی گناہ کا مرتکب مسلم ہو یا غیر مسلم دونوں کو ملامت کرو! اور دونوں سے کنارہ کشی اختیار کرو!

لیکن ہمارے نام نہاد اسلامی پالٹیکس کا حکم یہ ہے کہ جس گناہ میں کوئی ہندو ملوث ہے اگر اُس کا ارتکاب مسلمان نے بھی کیا ہو تو ہندو کی رسوائی پر تمام فصاحت وبلاغت ختم کر دی جائے اور اُسی گناہ پر مسلمان کی نہ صرف پردہ پوشی بلکہ متفقہ بلند آہنگی کے ساتھ مدح وستائش بھی شروع کر دو! -

پھر یہ کہ رسول کریم علیہ السلام کے اسلام کا حکم تو یہ تھا کہ

"سچ بولو! خواہ تمہارے خلاف جائے اور سچ بولو!
چاہے تمہارے مخالف کا اس میں فائدہ ہو - اور سچ کو کسی
مصلحت کے پردے میں مت چھپاؤ!"

لیکن ہمارے صوبے کے مسلم پالٹیکس کی تعزیرات کی ایک دفعہ یہ بھی ہے -

کہ جو صداقت ہمارے خلاف جائے ؟ اور جو راستی غیر مسلموں
کے ساتھ انصاف کرے -

اُس کا اعلان واظہار کرنے والا مسلمان گردن زدنی ہے اُس کا بائیکاٹ کرو! اُس کے خلاف متفقہ اظہار ملامت کو ضروری سمجھو - وہ غدارِ ملت ہے - مسلمانوں کی اسی غیر اسلامی روش کو دیکھ کر کہا گیا تھا کہ

"مسلماناں در گور ومسلمانی در کتاب"

ہماری پستی، غلامی اور بدحالی کا صرف ایک سبب ہے اور وہ یہ کہ ہم نے سچے اور اصلی اسلام کی پیروی چھوڑ دی ہے اور ایک پولٹیکل مذہب گڑھ کر اس کا نام اسلام رکھ دیا ہے - غیر مسلم جب ہمارے اس مصنوعی پولٹیکل مشرب کو دیکھتے ہیں جسے ہم اسلام کا نام دے کر پیش کرتے ہیں - . . . . تو وہ ملکۂ تمیز سے محروم ہونے کے سبب اصلی اسلام پر آوازے کستے ہیں - مجھ سے کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ ہندو سکھ اور دوسرے غیر مسلموں کا طرزِ عمل بھی یہی ہے - پھر انہیں چھوڑ کر مسلمانوں کے سر کیوں ہو رہے ہو ؟ ؟

مَیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے یہ جواب دوں گا کہ مَیں فرض کرتا ہوں کہ دوسری قومیں پولٹیکل مسلمانوں سے بھی زیادہ ان جرائم کی مرتکب ہیں - لیکن اسلام کی صداقتوں کے لئے یہ کب ضروری ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیرو بھی اپنی مذہبی سچائیوں کے پابند ہوں - اسلامی فقہ کی کتابیں اُٹھا کر دیکھ لو اُن میں صاف لکھا ہے کہ اگر کسی ہمسایہ غیر مسلم سلطنت میں مسلمان رعایا پر ظلم وستم توڑے جا رہے ہوں تو اسلامی سلطنت میں غیر مسلم رعایا سے اس کا انتقام لینے کی ہرگز اجازت نہیں ، کیونکہ ظلم بہرحال قابلِ ملامت ہے -

خواہ غیر مسلم سے سرزد ہو رہا ہو یا مسلمان سے - میں جانتا ہوں، دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے ہندو بھائیوں کا طرزِ عمل بھی سخت غیر مذہبی اور غیر انسانی ہے۔ لیکن اُن کے طرزِ عمل کی پیروی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہو سکتی۔ میں سپاسِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اسلامی تعلیم کی رُوح یہی ہے اور مجھے حق ہے کہ میں اُن نام نہاد مولاناؤں کے مقابلے میں جو علمِ دین سے نابلد مگر جن کی مولانائیت کی بنیاد دو چار ماہ کی جیل کی سیر، یا کسی نام نہاد مسلم اخبار کی ادارت، یا ایک ہنگامۂ فساد پیدا کر کے ایک جتھے کی تخلیق اور اس کی لیڈری۔ یا کسی اسلامی انجمن کی سیکرٹری شپ پر ہے - میں نے علمِ دین کی تحصیل پر زندگی کے بہترین ۱۴ سال صرف کئے ہیں اور الحمد للہ تعالےٰ میں اسلام اور اسلامیات سے ذاتی طور پر اور تفصیلی حیثیت سے آگاہ ہوں - اور اسلام خیر القرون کے اسلام، حضرت محمد رسول اللہ علیہ السلام کے اسلام کی صحیح اور مقدس تعلیم سے باخبر اور اُسے دُنیا کے سامنے پیش کرنے کی اہلیت اور حق رکھتا ہوں - اس حق کی بنا پر اس صداقت کا اظہار میرا اسلامی فرض ہے کہ اکثر حالات میں ہمارے موجودہ سیاسیات کو صحیح اسلامی سیاست کا نام دینا الفاظ کا غلط اور ناروا استعمال ہے -

اتحاد پارٹی:-

پنجاب کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اتحاد پارٹی میدانِ انتخاب میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی ہے -

اتحاد پارٹی کی یہ شاندار اور فاتحانہ کامرانی غیر متوقع نہیں - ہر دوربین شخص اس کی جمہوریت نواز پالیسی اور اہلِ پنجاب میں اس کی عام ہر دلعزیزی دیکھتے ہوئے یہی پیشگوئی کر رہا تھا -

افسوس ہے کہ پارٹی کا بانی سر فضل حسین اپنی جماعت کی اس قابلِ رشک کامیابی کو دیکھنے کے لئے آج زندہ نہیں ہے - بہر حال فضل حسین مرحوم کے قابلِ قدر جانشین مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اپنے اور بیگانہ مخالفین و معاندین کے ہجوم کو چیرتے ہوئے اپنے خلاف بہتان بندیوں اور فحش گفتاریوں کی جانب سے کان بند کر کے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے -

مخالف جماعتوں کے طوفان شور و غوغا سے فضائیں گونج رہی تھیں "ملت، جاتی بیبتھ اور حریت" کے نام نہاد علم برداروں کے ایک ناقابلِ شکست محاذ قائم کر کے اتحاد پارٹی کے راستے روک دئے تھے - بظاہر آثارِ حال بے حال اور مستقبل غیر یقینی نظر آتا تھا - مخالفت شرافت و اصول کے تمام حدود توڑ کر فسق و فجور میں تبدیل ہو رہی تھی کہ قدرت نے کروٹ لی اور "یکبیک گردش چرخِ نیلوفری" کا پانسہ پلٹ گئی - انتخاب کے نتائج بے اصول مخالفین کے لئے درسِ عبرت بن کر شائع ہوئے - غوغا پرست جماعتوں کے صرف ایک ایک دو دو امیدوار اپنی اپنی جماعتوں کے سوگوار کی حیثیت میں صوبے کی اسمبلی کے لئے منتخب ہو سکے اور صوبے کی حکومت کے اصلی حقدار بے نیاز اکثریت کے ساتھ اس غوغائے بے ہنگام کو شکست دے کر میدانِ انتخاب سے سرخرو نکلے -

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد پارٹی کی سیزدہ سالہ زرّیں خدمات نے اُنہیں سارے صوبے کی سیادت کا جائز طور پر مستحق بنا دیا تھا - اُس کا یہ استحقاق معاندانہ بہتان طرازیوں اور نعرہ ہائے سبّ و شتم سے چھینا نہ جا سکتا تھا - سچ ہے کہ قدرت اپنے اصول حق رسانی کو بے جا ہنگامہ آرائیوں کے دباؤ سے بدل نہیں سکتی -

اب مخالف جماعتوں کا یہ شورِ ناروا اُن کے اعترافِ شکست کو عُریاں انداز میں رسوا کر رہا ہے کہ "اتحاد پارٹی سرکاری پارٹی ہے، اہلِ پنجاب کی نمائندگی کا اسے حق ہی حاصل نہیں - اس کی بنیاد جمہوریت کے اصول پر نہیں" وغیرہ وغیرہ - ان عقلمندوں سے کوئی پوچھے کہ اگر خدا نخواستہ تم لوگ اسی حیثیت میں کامیابی حاصل کر سکتے تو کیا اپنے متعلق بھی اسی رائے کا اظہار کرتے؟ پھر ایک غیر اہم اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی تم تو اہلِ پنجاب کے اصلی نمائندے ہو گئے - اور جن میں صوبے کے ووٹروں نے سب سے زیادہ نمائندگی کا حقدار سمجھ کر سب حریف جماعتوں کی مجموعی تعداد سے دو چند تعداد میں اپنی رایوں سے انتخاب کیا وہ تمہارے زعم میں اہلِ پنجاب کے نمائندے نہیں تو کیا انگلستان کے ووٹر انہیں رائے دینے آ گئے تھے؟ - یا پنجابی رائے دہندوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا؟

رہی جمہوریت . . . . اگر ملک کے ہر طبقے ہر فرقے اور ہر مذہب کے منتخب نمائندوں کی جماعت جمہوری جماعت کہلا سکتی ہے - تو اتحاد پارٹی کے ممبروں کی نوعیت اور اُن کے ناموں پر انصاف کی نگاہ ڈالو - ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یورپین، اینگلو انڈین، زمیندار، شہری، اچھوت، سرمایہ دار، مزدور، مختصر یہ کہ ہر طبقے اور ہر مذہب کے نمائندے اتحاد پارٹی میں شریک ہیں - پھر بھی اتحاد پارٹی جمہوری پارٹی نہیں - آخر آپ کی وہ خانہ ساز جمہوریت جس کے سینگ اور پر ہوتے ہیں اُسے خدا کے لئے نمائش پر تو لائیے! اصل یہ ہے کہ

ناکامی بصیرت کے ساتھ بصارت سے بھی محروم کر دیتی ہے -

اتحاد پارٹی کے بانی سر فضل حسین مرحوم نے جن جمہوری اصول پر پارٹی

کی بنیاد رکھی تھی انہیں اصول پر کار بند جماعت صوبے کی اصلی نمائندہ جماعت کہلا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد پارٹی اپنی جمہوری پالیسی اور تیرہ سال کی حُسنِ خدمات کے سبب برسرِ اقتدار آئی ہے۔

سر فضل حسین کے قابلِ احترام جانشینوں کی جماعت کو (جن میں پارٹی لیڈر سر سکندر حیات خاں، سر شہاب الدین، سر ظفر اللہ خاں، راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام، خان بہادر نواب دولتانہ، نواب مظفر خاں، وغیرہم شامل ہیں) سارے صوبے کا بجا طور پر اعتماد حاصل ہے اور اہلِ پنجاب نے اُن پر اعتماد کر کے اپنی محسن نوازی اور قدرشناسی کا قابلِ ستائش ثبوت دیا ہے۔

اس سلسلے میں راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام اور خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ خاص طور پر تحسین و ستائش کے مستحق ہیں کہ اوّل الذکر نے سر فضل حسین و سر سکندر حیات کی غیر موجودگی میں ایک اوالعزم رہنما کی طرح اپنے تدبر، لیاقت اور ایثار سے پارٹی کے مختلف الطبائع ممبران پر کئی سال تک ساحرانہ ضبط قائم رکھا اور ثانی الذکر نے جنرل سیکرٹری کی حیثیت میں وقت، دماغ، ایثار اور بے شمار مالی قربانیوں سے پارٹی کو غیر معمولی طور پر منظم و متحد رکھتے ہوئے اس کے ممبران میں تفرق و نشتت پیدا نہیں ہونے دیا۔

میاں عبدالحی ایم ایل اے:- اتحاد پارٹی میں میاں عبدالحی صاحب ایڈوکیٹ کی شمولیت سے ایک قابل، کاردان اور مخلص سیاسی کارکن کا اضافہ ہوا ہے۔

میاں صاحب صوبے کے نہایت کامیاب وکیل اور قابل ترین قانون دانوں میں سے ہیں۔ سالہا سال تک لدھیانہ میونسپلٹی کے چیئرمین رہے اور لیجسلیٹو اسمبلی میں بہت مدت تک ملک و ملّت کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اتحاد پارٹی چونکہ صوبے کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے والی ہے۔ اِدھر حکومت کی مخالف پارٹی میں چونکہ بعض بڑے بڑے جغادری حضرات شامل ہیں جنہیں قانون دانی، قابلیت، تجربے اور تقریر و تحریر میں امتیازِ خاص حاصل ہے۔ اس نقطۂ خیال سے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ میاں صاحب موصوف سے اتحاد پارٹی میں ایک کام کے آدمی کا اضافہ ہوا ہے۔

ابتدائی تعلیم کے اساتذہ:- ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم جس رفتار سے وسعت اور ہمہ گیری حاصل کر رہی ہے۔ اسی مناسب سے ابتدائی تعلیم کے استادوں کی حالت اور حیثیت بھی گرتی چلی جاتی ہے۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ پرائمری اور مڈل بلکہ اکثر مقامات میں ہائی کلاسوں کے استاد بھی ہر سرکاری تقریب کی آرائش و انتظام کے لئے بیگار میں دھر لئے جاتے ہیں۔ تحصیلدار سے لے کر لاٹ صاحب کی آمد تک کے نمائشی استقبال کے ہر چھوٹے بڑے انتظام میں بے بس استادوں کی ڈیوٹیاں مقرر ہو جاتی ہیں۔ ٹڈی دل آئے تو کھیتی باڑی سے زیادہ بے چارے مدرسین پر نزولِ آفات ہونے لگتا ہے۔ ٹڈیوں (مکڑی) کے انڈے بچّوں کے انبار سمیٹ کر انہیں فنا کرنا بھی استادوں کے فرائض میں داخل ہو گیا ہے۔ دیہات سُدھار کے ہر شعبے میں استادوں کو آنریری خدمت گار کی حیثیت میں شب و روز کام کرنا پڑتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نت نئی بیگاروں کے سبب اپنے اصل فرض (تعلیم و تدریس) کی انجام دہی بھی دشوار بن جاتی ہے۔ اُن کے قیمتی وقت کا زیادہ تر حصہ اسکول اور اسکول کی تقریبات کے انتظام میں ضائع ہو جاتا ہے۔

اس مصروفیت کے نتیجے کے طور پر اگر اُن کی جماعت کا نتیجہ اچھا نہ نکلے تو اس کا ذمہ دار ان کی غفلت و بے پروائی کو گردانا جاتا ہے۔ اُن سے باز پُرس ہوتی ہے، ترقی بند کر دی جاتی ہے، تنزل اور تبادلے کی مصیبت میں گرفتار کئے جاتے ہیں۔

بعض مقامات میں بعض افسرانِ تعلیم اے، ڈی، آئی سے لے کر ڈویژنل انسپکٹر تک استادوں کو اپنی رعیت تصوّر کر کے انہیں ذرا سی کوتاہی یا غفلت پر اُسی پست قسم کی سرزنش کرتے رہتے ہیں جو پہلے زمانے کے مطلق العنان حکمران اپنی رعیت کے عام افراد سے کیا کرتے تھے۔

بعض اوقات کلاس کے سامنے استاد کو جھڑک دیا جاتا ہے اور اس طرح استاد شاگردوں کی نظروں میں سبک ہو جانے کے سبب ڈسپلن قائم رکھنے میں دشواری محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بعض ہیڈ ماسٹروں کے خلاف بھی اس قسم کے ناروا روّیے کی شکایات سننے میں آتی رہتی ہیں۔ پھر ان سب مصیبتوں، ذلتوں اور بدحالیوں پر ان کی تنخواہیں اسقدر قلیل ہیں کہ غریب اپنے اہل و عیال کو کسی قسم کی راحت نہیں پہنچا سکتے۔

مزید برآں اُن سے محکمہ توقع یہ رکھتا ہے کہ وہ عیالدار ہوتے ہوئے بھی اچھے لباس میں اسکول میں آئیں۔ کہیں کوئی ٹیوشن مل جائے تو اجازت کے بغیر (جو عموماً نہیں ملا کرتی) ٹیوشن پڑھا کر اپنی خانگی پریشانیوں کو دُور نہ کریں۔ افسرانِ تعلیم جن کی تنخواہیں پانسو سے لے کر ڈھائی ہزار تک ہوتی ہیں دیوتاؤں کا رُوپ دھارن کر کے اپنی اکاش باتی (آسمانی زبان) میں یہ نصیحت فرماتے رہتے ہیں کہ آپ کسی معاوضے کی امید کے بغیر تعلیم دیا کریں۔ تعلیم کا اعلیٰ مشن معاوضے اور حق الخدمت کے تصوّر سے ناقص اور برباد ہو جاتا ہے۔" وغیرہ۔

اُن سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ کھانے پینے، رہنے سہنے کے پہلو میں دیوتا بن جائیں۔

اس سرمن کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ اُستاد کے بال بچے فاقہ کشی کی عادت نہ ڈال سکیں تو اُنہیں سنکھیا دے کر سُلا دیں اور خود سنیاسی بن کر درختوں کی پتیوں اور نرجل پانی پر زندگی بسر کیا کریں۔

سوچنے کی بات ہے کہ افسران کی جھڑکیوں اور ٹھوکروں اور ہیڈ ماسٹروں کی ناز برداریوں کے پامال استاد اپنے شاگردوں کی ذہنیت کیسے بلند کر سکتے ہیں؟ خود پست حیثیت میں بسر کرتے ہوئے قوم کے نونہالوں میں بلند زندگی کس منتر کے زور پر پیدا کر سکتے ہیں۔

خاص ذہنیت کے افسرانِ تعلیم اور بعض حکومت پرست ہیڈ ماسٹروں کو اس حقیقت کو بھلا دینا نہ چاہیئے کہ وہ بھی کبھی استاد تھے اور انہوں نے بھی کبھی استادوں ہی سے پڑھ کر یہ بلند حیثیت حاصل کی ہے۔

مغربی تعلیم کی لعنتوں میں سے یہ زحمت بھی تعلیمی رفعت پر براہ راست ایک حملہ بن گئی ہے کہ استاد جو عزت درفعت میں باپ سے بھی زیادہ تعظیم وتکریم اور امداد و اعانت کا مستحق ہے۔ سب سے زیادہ پست و پامال زندگی بسر کر رہا ہے۔

یادش بخیر ایک وہ زرّین زمانہ بھی تھا کہ علامہ تاج الدین سُبکی نے عید کے موقع پر عید گاہ جانے کے لئے یہ شرط پیش کی تھی کہ میری پینس کو بادشاہ اور اس کے شاہزادے کندھے پہ اُٹھا کر لے چلیں گے تو عید گاہ جا کر نماز پڑھاؤں گا۔ اور بادشاہ کو یہ شرط ماننی پڑی تھی۔ جب عید گاہ سے علامہ موصوف کی پینس بادشاہ اور شاہزادے اپنے کندھوں پہ اُٹھا کر واپس ہوئے ہیں تو علامہ نے بادشاہ سے کہا تھا کہ یہ سب میں اپنی عزت نفس کے لئے نہیں کیا، بلکہ علم وتعلیم کے احترام کے لئے کیا ہے۔ کیونکہ جب عام لوگ ایک عالم اور استاد کی یہ توقیر وتکریم دیکھیں گے تو علم کو ذریعۂ سربلندی پا کر اپنی اولاد کو تعلیم دلانا ضروری خیال کریں گے۔

ریلوے ممبر کی احمدّیت نوازی :- یوں تو احمدیوں کے خلاف

ہنگامہ آرائی کئی سال سے پنجاب کی سیاسیات کا مرکزی عنصر بن چکی ہے۔ حتیٰ کہ بعض سیاسی پارٹیوں نے اپنے اغراض و مقاصد اور نظام کار میں احمدیت اور احمدی جماعت کا استیصال اہم مقصد کی حیثیت سے داخل کر لیا ہے۔

اِن پارٹیوں کے اخبارات پارٹیوں کے نقیب بن کر یہ بانگ دہل اپنے قارئین کو "فتنۂ مرزائیت" سے الگ تھلگ رہنے اور احمدیوں کے معاشری مقاطعہ پر اُبھارتے ہی رہتے ہیں اور اِس انہماک میں شمہ بھر کمی پیدا گوارا نہیں کرتے۔ لیکن پچھلے دو تین ہفتوں سے تو انہیں اِس ہنگامے کو طوفان بنانے کا موقعہ ہاتھ لگ گیا ہے۔

اخبار پائلاٹ امرتسر نے سر ظفراللہ خاں کے بھائی چودھری اسداللہ خاں بار ایٹ لا ایم ایل سی کا ایک خط شائع کیا ہے۔ یہ خط جیسا کہ "پائلاٹ" کا ادعا ہے چودھری صاحب نے کسی ریلوے مسلمان افسر کو لکھا تھا اور اس میں مکتوب الیہ سے دو تین احمدیوں کو اپنے دفتر میں ملازم رکھنے کی سفارش کی تھی۔ ساتھ ہی اُسے ترغیب دی گئی تھی کہ تمہاری ترقی کے لئے بھی سر ظفراللہ خاں آمادہ ہیں۔" (ملخص)

اِس خط کو "پائلاٹ" سے بعض اردو اخبارات نے نقل کیا اور اُسے بنیاد بنا کر اس پر جدید طوفان کی تعمیر کی جا رہی ہے۔

مذکورہ بالا اخبارات یقین کی روشنی میں پبلک کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ سر ظفراللہ خاں اپنے رفیع منصب کے رسوخ اور وسیع اقتدار سے کام لے کر ریلوے میں احمدیوں کو بھرتی کر رہے ہیں اور غیر احمدی مسلمانوں کے حقوق پر اپنی مرزائی جماعت کے افراد کو مسلط فرما رہے ہیں۔

میں اِس سلسلے میں کچھ گفتنی باتیں عرض کرنے پر مجبور ہوا اور ایک مختصر سا مضمون ایک مقامی معاصر میں جو اس ہنگامہ آرائی میں پیش پیش ہے شائع کرنے کے لئے بھیجا، مگر اُس معاصر نے آجکل کے مخصوص صحافتی اصول کے پیشِ نظر اُسے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔

بنا بریں اُس مضمون کو "شاہکار" میں درج کر رہا ہوں تاکہ متین اور غیر جانبدار طبقے کے حضرات اس ہنگامۂ حق وفجور پر جو مذہب کے نام پر مذہبی تعلیم کے خلاف بپا کیا جا رہا ہے منصفانہ نظر سے کوئی رائے قائم کریں۔

نقل مضمون :-

ریلوے ممبر کی احمدیت نوازی

محترم مدیر روزنامہ .. .... سلام مسنون۔

آپ کے معزز روزنامہ میں چودھری اسداللہ خاں بار ایٹ لا کے ایک خط کی اشاعت ہو رہی ہے جس کے متعلق اخبار پائلاٹ کی رائے یا انکشاف ہے کہ چودھری اسداللہ خاں نے کسی ریلوے افسر کو لکھا ہے۔

اس خط کے متعلق کچھ گزارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، کرم فرما کر سطور عریضہ اپنے جریدے کے کسی گوشے میں شائع فرما کر ممنون فرمائیے!

تمہید گزارش کے طور پہ یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں احمدی نہیں ہوں، نہ لاہوری پارٹی سے وابستہ ہوں نہ قادیانی جماعت سے

اہل السنت والجماعت سے متعلق ہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ میرا کوئی عزیز
یا دوست ریلوے کی ملازمت کا اُمیدوار نہیں، نہ ریلوے کی ملازمت سے منسلک ہے۔

اس کے بعد خط کے متعلق میری رائے حسب ذیل ہے:۔

(۱) یہ خط مجھے مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ چودھری اسداللہ خاں ایک اچھے
قانون دان اور پنجاب کونسل کے ممبر ہونے کی حیثیت میں ایک ذمہ دار شخصیت
کے مالک ہیں میرا دل کسی طرح نہیں قبول کرتا کہ اس حیثیت کا آدمی ایسی بے احتیاطی
سے کام لے خصوصاً اس ماحول میں کہ احمدیوں کے لئے زندگی کا حق بھی تسلیم نہیں
کیا جاتا کہ وہ "مرتد ہیں اور اُن کے لئے شرعی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں۔"

(۲) اگر بالفرض یہ خط اُنہیں کا ہے تو پھر "لا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ" قرآن
کریم کا ارشاد ہے۔ سر ظفراللہ خاں کا کوئی عزیز یا دوست اگر ایسا بے سروپا خط کسی
کو ممنون کرنے یا کسی پر اپنا رُعب جمانے کی خاطر لکھ دے تو وہ خود اُس کا ذمہ دار
ہوسکتا ہے۔ سر ظفراللہ خاں پر اُس خط کی ذمہ داری مطلقاً عائد نہیں ہوسکتی۔

(۳) یہ تیسری وجہ ایسی ہے کہ اس پر آپ کو انصاف سے زیادہ غور و
تامل کی ضرورت ہے۔

قانون معاشرت کے لئے بنایا جاتا ہے۔ معاشرت کلی طور پر قانون کی
پابند نہیں ہوا کرتی نہ ہوسکتی ہے۔ اگر آپ معاشرت انسانی کو قانون کے پیچ در
پیچ سانچے میں ڈھالنے پر اصرار فرمائیں گے تو یا قانون ٹوٹ جائے گا اور یا پھر
معاشرت کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ قانون کی کارروائی ورکارروائی لطافتوں
کے حدود میں انسانی معاشرت کو نظر بند کر دیا جائے تو معاشرت انسانی چیخ اٹھیگی۔
اس امر واقع پر غور و تامل کے بعد آپ اس معاملے پر نظر ڈالیں گے تو اسے اسقدر
خطرناک نہ پائیں گے جتنا اب محسوس فرما رہے ہے۔ دن رات آپ ملاحظہ فرماتے
ہیں کہ قانون کی پیچیدگیوں کی ذمہ دار سے ذمہ دار حکومت بھی پابند نہیں رہ سکتی۔
بارہا آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی منصب کے لئے ایک آدمی پہلے سے تجویز کر
لیا جاتا ہے اور پھر ضابطے کی خانہ پری کے لئے اُس جگہ کے واسطے موزوں
امیدواروں سے درخواستیں طلب کی جایا کرتی ہیں۔ ان درخواستوں کا انجام
ردی کی ٹوکری بن جاتا ہے اور خواہ درخواستوں میں ایسے امیدواروں کی بھی
درخواستیں ہوں جو مجوزہ امیدوار کا تقرر کر دیا جاتا ہے۔ آپ کو ہزاروں واقعات
کا علم ہوگا اور علم کیا آپ اب بھی دن رات دیکھتے ہوں گے کہ کسی ذمہ دار افسر
سے اُس کے ماتحت کے لئے کوئی شخص سفارش لینے چلا جاتا ہے۔ وہ افسر
پرائیویٹ گفتگو میں اُس سے ایسی ذاتی حیثیت کی باتیں بھی اُس سلسلے میں کہہ
جاتا ہے کہ اگر وہ باتیں اخبار نویسوں کے ہاتھ لگ جائیں تو اُن سے روز
رنگین سے رنگین تر افسانے اخبارات کے کالموں کی زینت بننے لگیں۔

قانون کے نقطۂ نظر سے مجوزہ امیدوار کی قبل از وقت تقرری کی تجویز
اور ذمہ دار افسر کی سفارش یا پرائیویٹ گفتگو میں اس کے ذاتی خیالات ناروا
نہیں لیکن یہ واقعات جنہیں قانون ناروا گردانتا ہے۔ دن رات ہوتے رہتے
ہیں اور ان سے ہندوستانی افسر تو درکنار گورنر وائسرائے اور وزیر ہند بھی
احتیاط نہیں برت سکتے۔ بلکہ کوئی انسان من وعن تمام قوانین کی تعمیل نہیں کر سکتا۔

ہم اور آپ یا آپ نہ سہی آپ کے حلقۂ تعارف کے متعدد احباب
وزراء کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں، اُن سے اپنے کسی دوست یا عزیز
کے لئے سفارش طلب کرتے ہیں یا اُن کی امداد چاہتے ہیں وہ سفارش مان لیتے
ہیں۔ بعض اوقات اپنے حدود سے بڑھ کر امداد بھی کر دیا کرتے ہیں۔ یہ سب
امور قانون کی نظر میں قابل گرفت اور اخبارات کی تعزیرات میں خصوصاً گردن
زدنی ہیں۔ لیکن کیا کبھی آپ نے خیال فرمایا ہے کہ قانون کی غیر قدرتی ہمہ گیری
ان واقعات کو جو انسانی معاشرت کا لازمہ ہیں روک سکی ہے۔ کبھی نہیں۔ یہ جو
کچھ ہوتا ہے قدرتی ہے اور قانون عام طور پر اس پہلو سے غیر قدرتی حیثیت رکھتا
ہے۔ اس گزارش کے بعد آپ خیال فرمائیں گے تو یہ خط کا واقعہ بالکل ایک
عامۃ الوقوع اور غیر اہم واقعہ بن جاتا ہے۔ ہمارے غیر احمدی اور پکّے مسلمان
افسران کو دن رات ان واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور وہ قانونی
لطافتوں اور پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر ایسے واقعات کا انصرام کرتے رہتے
ہیں لیکن بقول شخصے کہ گنہگار تو سب ہیں مگر جو پکڑا جائے وہ مجرم گردان
لیا جاتا ہے۔

سر ظفراللہ خاں ریلوے ممبر نہ سہی وائسرائے بھی بنا دئے جائیں آخر
انسان ہیں، دوست احباب عزیز و اقارب، ہم وطن و ہم مذہب احباب دوسروں
کی طرح رکھتے ہیں پھر اگر وہ انفرادی حیثیت میں بالفرض کسی دوست، عزیز، ہم
مذہب یا ہم وطن کی اپنے خیال میں جائز سفارش کر دیتے ہیں تو کیا مضائقہ ہے
جب کہ

"ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

ہاں اگر وہ کوئی خفیہ یا ظاہر سرکلر ایسا جاری کر دیں کہ ماتحت محکمے جدید
تقرریوں کے وقت احمدیوں کو ترجیح دیا کریں تو بے شک اُن کا ایسا کرنا ساری پبلک
کے لئے موجب ہیجان ہوسکتا ہے۔ آپ اُن کے سرکلر جو ایجنٹ این ڈبلیو ریلوے
کے آفس میں موجود ہیں جاکر ملاحظہ فرمائیے۔ اُن میں بار بار یہی تاکید اور ہدایت پائیں گے
کہ جدید تقرریوں کے وقت حکومت کے سرکلر کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو
مقررہ تعداد کو پورا کیا جائے۔

یہی نہیں بلکہ اسمبلی کے گزشتہ اجلاس میں انہوں نے ایک مہاسبھائی

ممبر کے اعتراض پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ہندوستان کی دوسری تمام اقوام سے پورا پورا انصاف کرتے ہوئے مسلمانوں کے جائز اور مقررہ حقوق کی حفاظت کروں گا اور اس بارے میں حکومت کی بھی پرواہ نہیں کروں گا۔"

ملاحظہ فرمائیے۔ اسمبلی کے ۱۹۳۵ء کے سرمائی اجلاس کی تقریریں۔ خود آپ کے معزز پرچے میں بھی اُن کی یہ تقریر شائع ہوئی ہوگی۔ ہندو پریس نے تو اُن کی ساری تقریر چھاپ دی تھی۔ میں سر ظفر اللہ خاں کا مجدہ وسعتِ نگر نہیں کہ اُن کی خوشامد میرے لئے جائز ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیس سال سے انہیں جانتا ہوں اور اُن سے اختلاف مذہب کے باوجود میری ایماندارانہ یہ رائے ہے کہ سر ظفر اللہ خاں بہت دیانتدار، خدا ترس اور انصاف پسند آدمی ہیں۔ وہ معقولیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاتے۔ انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا میں رہتے ہوئے بعض ایسی جرأت و پامردی کے کام کئے ہیں کہ سر فضل حسین بھی نہ کر سکے تھے۔ میں نے اپنے ضمیر کی گرفت سے مجبور ہو کر یہ سطور قلم بند کرنی ضروری سمجھیں حالانکہ جانتا ہوں کہ اس مسموم فضا میں کسی احمدی کے متعلق کوئی جائز کلمۂ خیر کہنا بھی اپنی عافیت کے لئے مضر ہے۔ والسلام

تاجور۔ ڈی، ایس کالج لاہور
ایڈیٹر شاہکار لاہور

لاریوں کے حادثات:-

اخبارات میں لاریوں کے تصادم کے متعلق آئے دن ہولناک حادثات پڑھ پڑھ کر لاری کے ذریعہ سفر کے تصور سے جی کانپنے لگتا ہے۔ اب ان حادثات کی اسقدر کثرت ہو رہی ہے کہ دور اندیش حضرات لاری کے ذریعے سفر کرنے سے اجتناب کرنے لگے ہیں اور یہ اجتناب کچھ بیجا نہیں ہے۔ لاریوں کے ڈرائیور ایسے بے پرواہ غیر محتاط اور اپنے فرائض سے بے خبر ہو گئے ہیں کہ وہ نہ اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھتے ہیں نہ غریب مسافروں کی زندگیوں کا انہیں احترام ہے۔

ساری ساری رات قمار بازی، سینما، اوباشی میں جاگتے بسر کرتے ہیں اور دن کو لاری چلاتے چلاتے اونگھنے لگتے ہیں اور بعض وقت سو بھی جاتے ہیں۔ ان کی اس غفلت کیشی کا نتیجہ کسی لاری، موٹر یا کسی درخت سے تصادم کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ تصادم کے حادثات اب ہر جگہ عام ہو گئے ہیں۔ زندگی کا بیمہ کرائے بغیر لاری میں سفر کرنا دور اندیشی کے خلاف ہو گیا ہے۔

ہماری رائے میں کیسا ہی ضروری کام ہو، کتنا ہی عجلت کا ہو، لوگوں کو لاری کے ذریعہ سفر ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ ۴۴

(بقیہ سوال و جواب)

جاتے ہیں۔ نہ شاعر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں شاعری کی آڑ میں خوش لحانی کی داد پا رہا ہوں نہ سننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم شاعر کے دماغ کی بجائے اُس کے گلے کی داد دے رہے ہیں۔

حالت اب یہ ہو گئی ہے کہ بڑے سے بڑا نغز بیان شاعر بلند سے بلند نظم تحت اللفظ پڑھ کر سنائے تو عموماً سرسبز ہی نہیں ہوتی اور کچھ سخن فہموں کی طرف سے داد بھی ملتی ہے تو ترنم نواز جن کی اکثریت ہوتی ہے جمائیاں لینے لگتے ہیں اور کوئی کور ذوق تو یہ بھی کہہ اُٹھتا ہے کہ "مقطع پڑھیے۔" پنجاب میں تو بے ذوقی اور کج سوادی کی بیماری میں ننانوے فی صدی تعلیم یافتہ مبتلا ہیں۔ یہاں کی مجلسوں میں تو تحت اللفظ پڑھنے والا شاعر شاذ و نادر ہی پوری نظم پڑھنے کا موقعہ پاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ گذشتہ دس بارہ سال میں جو یہاں اردو شاعری کا ذخیرہ فراہم ہوا ہے اُس میں جاندار عنصر بہت ہی کم ہے۔ اس سارے ذخیرے میں فن شکن شاعرانہ غلطیاں دیمک کی طرح پھیل گئی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خرابی کی اصلاح کیوں کر کی جائے۔ اس کا جواب دینا آسان نہیں ہے کیونکہ جن شاعروں نے اپنی شاعرانہ شہرت کی تعمیر سرود و غنا کے سیمنٹ سے کی ہے وہ تحت اللفظ پڑھنے پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ اُن کی بنی بنائی سربلند عمارت دھڑام سے نیچے آ رہے گی۔ اور جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں وہ دماغ کو گلا بنانے کی پستی اختیار کرنا پسند نہیں کریں گے۔

البتہ ایک صورت اور بھی ہے۔ اُسے اختیار کیا جائے تو ذوق شعر فہمی کی کچھ نہ کچھ اصلاح ہو سکتی ہے

وہ صورت یہ ہے کہ مشاعرے کی دو نشستیں کر دی جائیں۔ ایک نشست صرف تحت اللفظ پڑھنے والوں کے لئے مخصوص کر دی جائے اور اس نشست میں گلوکاروں کو زحمت سرود نہ دی جائے بلکہ ممکن ہو تو اُن میں سے کچھ نفوس کو تحت اللفظ پڑھنے کے ایثار پر آمادہ کیا جائے اور دوسری نشست نغمہ سراؤں کے لئے خاص ہو جایا کرے۔ اور اگر مشاعرے کی ایک نشست ہو تو اُسے دو وقفوں پر تقسیم کر کے دونوں فریقوں کو ایک ایک وقفہ دیدیا جائے۔

اس طریقے سے ذوق شعر گوئی و شعر فہمی کو نشو و نما کا موقعہ میسر آ سکے گا۔ ورنہ موجودہ صورت تو اردو شاعری کو ابتذال و پست نوائی کی جانب کشاں کشاں لئے جا رہی ہے۔

تاجور

سوال و جواب

سوالات

(۱) قومی شاعری میں جوشؔ اور اقبالؔ میں سے کس کا مرتبہ بلند ہے؟"

غلام احمد سلیم (لالہ موسیٰ)

(۲) اکثر باوقار رسالوں اور کتابوں میں لفظ "مُحبت" بضم میم - عروس بضم عین - بشرہ بضم اول - وصعت بفتح اول - عصمت بفتح عین - مشاعرہ بفتح میم و بکسر عین - اور خلوت بکسر اول مرقوم ہوتے ہیں۔

کیا میں انہیں صحیح سمجھوں؟ اور اسی طرح بولوں اور لکھوں؟ جبکہ مندرجہ بالا الفاظ کے اعراب لغات میں یوں درج ہوتے ہیں۔

۱- مَحبّت ــــ غیاث، از تحقیقات میر نور اللہ احراری
۲- عَرُوس ــــ مدار، کشف، منتخب، صراح، بہار عجم، مزیل و لطائف۔
۳- بَشَرَہ ــــ کشف، منتخب و کنز۔
۴- وُسعَت ــــ غیاث و منتخب۔
۵- عِصمَت ــــ بحر الجواہر و مزیل۔
۶- مُشَاعَرَہ ــــ غیاث۔
۷- خَلوَت ــــ مؤید، مدار، کشف، منتخب، مزیل و بہار عجم۔

قیصر عثمانی

(۳) عدمؔ، اخترؔ شیرانی، احسانؔ دانش کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ ان میں سے کس کو زیادہ کامیاب شاعر کہہ سکتے ہیں؟

(۴) کیا "ہنستی" کے مقابلے میں "برستی" یا "پستی" کے قوافی آسکتے ہیں؟ آپ قوافی کی پابندیوں کو کہاں تک جائز سمجھتے ہیں؟

اثر چکوالی

(۵) (ا) صحیح لفظ "روح و رواں" ہے یا "روحِ رواں"۔ بڑے بڑے سحر القلم ادیب بلا امتیاز لکھتے ہیں۔

(ب) انگریزی لفظ کیریکٹر (Charactor) اردو میں بہت زیادہ رائج ہے اگر اس کی بجائے اردو لفظ "رویّہ" کو رواج دیا جائے تو کیا یہ اس کے مطلب کو ادا نہ کر سکے گا؟ میرے خیال میں لفظ "رویّہ" اس سے کم وسیع المعانی نہیں۔

(ج) ماہ اکتوبر کے شاہکار کے سوال وجواب میں سوال نمبر ۵ میں ایک فقرے کی تصحیح اس طرح ہوئی ہے کہ "زخم رڑکتا رہتا ہے"۔ کی بجائے "زخم رِستا رہتا ہے" صحیح ہے لیکن زخم کا رِسنا زخم کے رڑکنے کے مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا۔ رڑکنا پنجابی کا لفظ ہے اردو میں اس کے مقابلہ کا لفظ "کھٹکنا" ہے لہذا مذکورہ صدر فقرے کی تصحیح اس طرح ہونی چاہیئے کہ "زخم کھٹکتا رہتا ہے۔"

محمدؐ علی کلدانی مدحیوری (ایوبر)

(۶) ترنم میں پڑھنے والے شعراء کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

سادھو رام شاد بی۔ اے ہندو مسلم ہائی اسکول ہریانہ

جوابات

(۱) قومی شاعری سے اگر ملکی شاعری مراد ہے تو اقبالؔ نے ادھر بہت کم توجہ کی ہے۔ صرف "نیا شوالہ" اور "ہندوستان ہمارا" دو نظمیں ان کے کلام میں ملتی ہیں اور جوشؔ صاحب کی ملکی شاعری اردو ادب کا ایک سرمایہ ہے۔ اور اگر اس سے ملّی شاعری مراد ہے تو اقبالؔ ہمارا ملّی شاعر ہی ہے۔ اُس کی ملّی شاعری ادب و شعر کی متاع بے بہا ہے اور اس رنگ میں اُس کا کوئی حریف نہیں۔ بہرصورت موازنے کی گنجائش نہیں۔

(۲) محبّت بہ فتحہ میم صحیح ہے اور فصحا میں اس کا اصلی تلفظ ہی رائج ہے۔ مگر بہ ضمّہ میم کو بھی میں غلط قرار نہیں دے سکتا کہ یہ تلفظ بھی عام و خاص میں ترویج پا چکا ہے۔

عروس:- بہ فتحہ عین اردو میں غیر مانوس ہے۔ عربی میں اس کا تلفظ کچھ ہی ہو اردو کے مستند اہل قلم جس طرح بولتے ہیں وہی تلفظ اردو میں صحیح ہوگا۔

بشرہ:- کا اردو تلفظ ہی صحیح ہے بہ فتحہ با اردو میں مستعمل نہیں۔

مُشاعرہ:- بہ کسر عین اردو تلفظ ہے۔ بہ فتحہ عین اردو میں صحیح نہ ہوگا۔

خلوت:- کا اردو تلفظ جو فصحا میں رائج ہے بہ فتحہ خا ہے بہ کسر خا مستند لوگ نہیں بولتے۔

عصمت:- کا اردو تلفظ بہ کسر عین ہے اور یہی صحیح ہے۔ بہ فتحہ

عین عوام کا تلفظ ہے مستند نہیں۔

وصعت :- یہ تو نہ عربی لفظ ہے نہ اردو۔ غالباً وسعت کے متعلق آپ کا سوال ہے۔ اس کا فصیح تلفظ بفتحہ واو ہے۔

مختصر یہ کہ خواہ کسی زبان کا لفظ ہو اور اُس کا تلفظ اُس زبان میں کچھ ہی ہو اردو میں اُس کا وہی تلفظ فصیح اور صحیح مانا جائے گا جو فصحائے اردو کی زبان پر دائر و سائر ہوگا۔

(۳) عدمؔ کے کلام میں پاکیزگی، تخیّل میں رفعت اور خیالات میں رہنمائی ہے۔ عدمؔ نفسیات کو نظر انداز نہیں کرتا، اظہار جذبات میں گداز سے کام لیتا ہے۔

اخترؔ شیرانی کا کلام تغزل کی رنگینی سے شرابور ہے۔ خیالات میں شبابی رسوائیاں جھلکتی ہیں۔ اس شباب آرائی کے رستے سے الگ ہوکر کوئی نظم کہتا ہے تو اپنی پستی سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔

احسانؔ ابن دانش منظر آرائی میں امتیاز خاص کا مالک ہے۔ اس کی منظر آرائی میں فلسفیانہ رنگ بھی نمایاں ہے۔ منظر کے کسی ضروری پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ ایسی عام چیزوں کے ذکر سے جنہیں نگاہ کم بین حریف توجہ نہیں بناتی اپنی نظم کو زیادہ موثر بنا دیتا ہے۔

ہر سہ شعراء جدید دور شاعری کے تازہ ترین نمائندے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ مشق بھی بڑھتی گئی تو تخیل، انداز نگارش اور فن کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی۔

(۴) قافیہ نگاری کی رو سے ہنستی کا قافیہ پھنستی ہوگا۔ برستی، یا پستی ہنستی کے ہم قافیہ نہیں۔ لیکن میری رائے میں صوتی اتحاد کو اصل قرار دے کر ہنستی کے قافیے میں برستی، اور پستی کو قافیہ بنانا جائز ہونا چاہئیے۔ قافیے کے قدیم قواعد ترمیم کے سزاوار ہو چکے ہیں۔

(۵) (ا) صحیح لفظ روح و رواں ہے۔ مرکب عطفی ہے، توصیفی نہیں یعنی روحِ رواں صحیح نہ ہوگا۔

(ب) کیریکٹر کے مفہوم کو رویّہ کا لفظ پورے طور پر ادا نہیں کرتا۔ میری رائے میں تو کیریکٹر کا لفظ کثرتِ استعمال سے اردو بن چکا ہے۔ اس لئے اس کا ہم معنی دوسرا لفظ بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔

(ج) "زخم رڑکتا ہے" کی تصحیح زخم رستا ہے یہ سمجھ کر کی گئی تھی کہ شائد پنجابی میں رسنا کو رڑکنا کہتے ہیں۔ آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رڑکنا کے وہ معنی نہیں جو میں نے خیال کئے تھے۔ لیکن "زخم کھٹکتا ہے" اردو محاورے کے خلاف ہے۔ زخم میں تپک پیدا ہے۔ زخم میں ٹیس ہو رہی ہے۔ محاورہ ہے۔

(۶) ترنم میں پڑھنے والے جو اچھے شعراء ہیں وہ اچھے ہی ہیں اور جو پست نوا ہیں انہیں ترنم بلند نہیں بنا سکتا۔

عربی زبان کے شعراء ترنم میں پڑھتے تھے، انشاد کے معنی ہی ترنم سے شعر پڑھنے کے ہیں۔ مقامات حریری میں ابوزید کے متعلق ایک جگہ آتا ہے فانشد مُترنماً۔ اُس نے ترنم سے شعر پڑھے۔ البتہ ایک فرق ضرور ہے کہ موسیقی کے قاعدوں کو پیش نظر رکھ کر مشاعروں میں گانا ہرگز روا نہیں ہونا چاہیئے! تاکہ مغنی اور شاعر کے حدود الگ الگ رہیں۔

اور خوش آوازی سے شعر پڑھنا اس سے مختلف ہے۔ اس میں کچھ حرج نہ تھا کہ ترنم اچھے شعر کے اثر کو دوبالا، سہ بالا اور بعض اوقات پست بالا کر دیتا ہے۔ لیکن اردو شاعری کے موجودہ دور بے مذاقی میں ترنم ہو یا موسیقی مشاعرے یا اسٹیج پر شاعر کے لئے مناسب نہیں کیونکہ:-

(۱) ترنم آرائی اور موسیقی شاعر کی فنی خامیوں کی پردہ دار بن جاتی ہیں۔ سامعین شاعر کی خوش آوازی سے متاثر ہو کر اُس کے شعر کے حُسن و قبح سے توجہ ہٹا لیتے ہیں اور اُسے داد دے کر ایک طرف تو اپنی خامیوں کو دور کرنے کے مواقع سے اُسے محروم کر دیتے ہیں۔ دوسری جانب خود بھی ذوق شعر فہمی سے غیر محسوس طور پر ناآشنا بنتے چلے جاتے ہیں۔

خود شاعر بھی شاعری کے پردے میں موسیقی کی داد پا کر اس زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میرا کلام لغزشوں سے پاک اور ضرورتِ اصلاح سے بے نیاز ہے۔

(۲) بدمشق مگر خوش گلو متشاعروں کو ایک اصلی اور مستحق شاعر کی شہرت مل جاتی ہے اور معیار استناد خوش گوئی کی بجائے خوش گلوئی رہ جاتی ہے۔

(۳) پختہ مشق اور نغز گو شعراء تحت اللفظ پڑھنے کے سبب اہلِ بزم کی داد سے ناروا طور پر محروم ہو جاتے ہیں اور ہجوم بے ذوقی سے گھبرا کر شاعری سے دست برداری کو ضروری سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح شاعری کی ترقی رُک جاتی ہے۔

(۴) خوش گلو تک بند گلے بازی کے طفیل قبولیت عامہ حاصل کر کے شاعری میں ابتذال پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں اور اپنی ہر دل عزیزی کے باعث نگاہ عام و خاص میں مستند سمجھے جاتے ہیں۔ اور اس راستے شاعری میں زبان و بیان کی غلطیاں داخل ہو کر ادب کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ نغمہ سرا شاعر اور ترنم پسند سامعین بے امتیازی میں مبتلا ہو

(بقیہ صفحہ ۷ پر دیکھیں)

دو قبریں

شہرِ خموشاں

میرے جوانامرگ بچوں کی موت پر بہت سے احباب نے مرثیے لکھے تھے، لیکن میں نے اُن کی اشاعت کو اپنے پرچے میں مناسب خیال نہیں کیا۔ ذیل کی خونچکاں نظم جس دردناک تاثر سے کہی گئی ہے اس کے پیشِ نظر میں اسے شائع کرنے پر مجبور ہوں۔ یوں تو منظر نگاری میں آج احسان کا کوئی حریف نہیں مگر اس نظم میں "شہرِ خموشاں" کی تصویر میں سحرکار شاعر نے خونِ دل سے رنگ بھرا ہے۔ یہ نظم اسقدر اثرانگیز ہوگئی ہے کہ کسی شاہانہ بزمِ عشرت میں بھی پڑھ دی جائے تو اہلِ بزم لطفِ زندگی سے دست بردار ہو جائیں۔ تاجور

یہ شامِ گورِ غریباں یہ رات کا آغاز
فضا میں نرم دھندلکا ہے مائلِ پرواز

بچھی ہوئی ہے زمیں پر ردا اندھیرے کی
پہن رہی ہیں ضیائیں قبا اندھیرے کی

شفق کا رنگ غم انگیز، بیقرار ہوا
الم فروش، جنوں کوش، سوگوار ہوا

سڑک پہ ابر کی صورت غبار گلوں کا
مچل رہا ہے چھتوں پر دھواں محلّوں کا

خموشیوں میں پرافشاں صدا اذانوں کی
لگن غریب پرندوں کو آشیانوں کی

خراج خوف کا لینے کو راہگیروں سے
صدائیں بُوم کی آتی ہوئی جزیروں سے

زمین گنگ، فلک چُپ، فضائیں آزُردہ
پُرانے خستہ مزاروں کی جھاڑیاں مُردہ

مویشیوں کے کھُروں کے نشان راہوں میں
مآلِ ہستیٔ پُر آرزو نگاہوں میں

شفق ہے نزع میں، پیڑوں کے سائے گہرے ہیں
نظر کی راہ میں تاریکیوں کے پہرے ہیں

خموش شمعیں ہیں ذرّوں کے روئے روشن کی
ہے سبز گھاس میں بُوٹیوں کے روغن کی

ہے سایہ خاک سے لپٹا ہوا بگولوں کا
سیاہ رنگ کٹھلی کے زرد پھُولوں کا

شرابِ نُور سے خالی ہے آسماں کا ایاغ
کہیں کہیں نظر آتا ہے کوئی کوئی چراغ

ہیں محوِ خواب مزاروں میں صاحبانِ مزار
نہ جانے اور بھی کتنے ہیں بے نشانِ مزار

نصب کسی کی لحد پر ہے مرمریں کتبہ
سیہ حروف کا اندوہ آفریں کتبہ

کسی کی قبر پہ پژمردہ پھُول روتے ہیں
کسی کی خاک سے کانٹے لپٹ کے سوتے ہیں

کوئی مغنئ دوراں ہے، کوئی شاعر ہے — کوئی ہے راہنما اور کوئی مسافر ہے
کوئی سخی، کوئی محتاج، پاسباں کوئی — امیرِ بحر کوئی، میرِ کارواں کوئی
کوئی مصورِ صد رشکِ مانی و بہزاد — کہ جس کے خامہ کا ہر نقش پرچمِ ایجاد
کوئی گدا ہے کوئی بادشاہِ ہفت اقلیم — کوئی نیاز نشاں، کوئی واجب التعظیم
کوئی حسین اور ایسا حسین جس کا جمال — خدا کے دل میں بھی پیدا کرے خدا کا خیال
یہاں ہیں غیرتِ سہراب و سام خاک بسر — نہ جانے ٹھوکریں کھاتے ہیں کتنے کاسۂ سر
مگر یہ بزم ہے پابندِ فطرتِ خاموش — نہ اس میں نطق کا چارہ نہ اس میں ہوش کو ہوش
غلام و خواجہ یہاں ایک صف میں شامل ہیں — یہاں کے ذرّوں میں آنکھیں ہیں، خاک میں دل ہیں
گھٹا ہوا ہے یہاں دم سخن طرازی کا — چراغ گُل ہے حسینوں کی عشوہ سازی کا
یہاں ہیں فلسفیوں کی فراستیں عاری — یہاں کی گرد میں اُڑتا ہے زعمِ خودداری
یہاں غرور قدم خاک کے پکڑتا ہے — جنونِ عشق ادب سے جبیں رگڑتا ہے
یہاں کی دوب کے ریشوں میں رس ہے لاشوں کا — یہ اک ہجوم ہے سہمے ہوئے تماشوں کا
یہاں نہ ماؤں کو بچوں کی یاد آتی ہے — نہ کمسنوں کو یہاں تیرگی ڈراتی ہے
یہاں سکوت ہے بانگ ہزار سے پیدا — یہ اِک خزاں ہے جہاں کی بہار سے پیدا
سراغ کچھ نہیں لگتا یہاں کے رازوں کا — یہ کاروبار ہے خاموش خاکبانذوں کا
ہیں تند و تیز بگولے یہاں کے ہرکارے — یہاں گھٹائیں بجاتی ہیں آ کے نقّارے
عروسِ صبح نکلتی ہے بے نقاب یہاں — نظر کا فرش بچھاتا ہے آفتاب یہاں
یہاں چراغ دکھاتا ہے چاند راتوں کو — یہاں کے لوگ ہی جانیں یہاں کی باتوں کو
عجب ہے خاک نشینوں کی سلطنت کا نظام — یہاں گدا نہیں کرتے ہیں بادشہ کو سلام
عوام اِن کی محبت کی قدر کیا جانیں — یہاں ہیں ایک ہی قالب میں سینکڑوں جانیں

ہیں اشک دیدۂ نم گیر میں بہاروں پر
کھڑا ہوں دیر سے دو تازہ تر مزاروں پر

کہ تاجور کے جواں سال تاجدار ہیں یہ — خزاں نصیب جوانی کی یادگار ہیں یہ
یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکے — کھلے ضرور، مگر کھُل کے مُسکرا نہ سکے

ہے سینہ چاک جُدائی میں گلستاں اِن کا
شبوں کو رونا ہے اُٹھ اُٹھ کے باغباں اِن کا

کتابیں میز پہ جب اِن کی دیکھ پاتی ہے
تو ماں الم کے سمندر میں ڈُوب جاتی ہے

لباس اِن کا ٹرنکوں سے جب نکلتا ہے
غرورِ حسرت و ارمان جُھک کے چلتا ہے

قریبِ شام جو چھٹی کا وقت ہوتا ہے
غریب باپ جُدائی میں خُون روتا ہے

ہوا اُکھڑتی ہے اُمید کے سفینے کی
مچلنے لگتی ہے سانسوں میں آنچ سینے کی

اُٹھاتا ہے کوئی بائیسکل جو دفتر سے
چھلک کے اشک نکلتے ہیں دیدۂ تر سے

خموشیوں کو رلاتی ہیں اِن کی تحریریں
نگاہ میں ہیں کفن پوشیوں کی تصویریں

مگر یہ سوئے ہیں ایسے کہ کچھ خبر ہی نہیں
خراب حال پہ ماں باپ کے نظر ہی نہیں

ہیں چُپ کہ جیسے یہ ناراض ہو کے آئے ہیں
عدو سمجھ کے عزیزوں نے دل دکھائے ہیں

وہ باپ نام سے جو موت کے دہلتا تھا
فدا سے ذکر پہ رُخ بات کا بدلتا تھا

نظر میں اس کی معظم ہے موت جینے سے
وہ دل شکستہ ہے دُنیا کے ہر قرینے سے

اگرچہ اس کو خبر ہے کہ ہستیٔ فانی
نہیں ہے کچھ بھی بجز آفت و پریشانی

مسرتوں کا نتیجہ ہے محوِ غم ہونا
جگر کا بیٹھنا، چشمِ حزیں کا نم ہونا

طلوعِ صبح کی قسمت میں شام ہونا ہے
جو نام ہے اُسے محرومِ نام ہونا ہے

نشاط جاتی ہے تشویش بھر کے سینوں میں
نہاں ہیں اشک تبسم کی آستینوں میں

چمن کی پُشت پہ ویرانیوں کا مسکن ہے
مآلِ صدرنشینی کا کُنج مدفن ہے

ہر اک بہار کو مقصود ہے خزاں یابی
ہر ایک موج کے مقسوم میں ہے غرقابی

نمودِ موج بقا ہے بقا نہیں ہے مگر
فنا کا نام فنا ہے فنا نہیں ہے مگر

یہ مختصر سا خلاصہ ہے اس کہانی کا
بھرا ہے موت نے بہروپ زندگانی کا

تعیّنات کی توضیح میں اندھیرا ہے
یہ تیرا میرا، نہ تیرا ہے اور نہ میرا ہے

یہ سب درست مگر پھر بھی قلبِ انسانی
حصولِ صبر میں کرتا ہے اشک افشانی

ہجومِ درد سے تارے چھلک ہی پڑتے ہیں
جگر کی چوٹ سے آنسو ٹپک ہی پڑتے ہیں

احسان دانش

خمریاتِ غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

میرزا غالب علیہ الرحمۃ کا تخیل فلسفۂ عرفان میں ڈوب کر الفاظ کی محفل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں جہاں جدت و ابداع کی فراوانی ہے۔ وہاں شمعِ قدامت بھی نئے فانوس میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ غالب کا دماغ صرف ان خیالات کی ایجاد و پرورش کا ذمہ دار رہا ہے جن میں حقائق و بصائر اور فلسفہ و معارف کی روح مرتعش ہو۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب شاعری کی قدیم روایات و اصناف کا محافظ ہی نہیں بلکہ قدیم رنگ کے حُسن کو طرزِ جدید کی روشنی میں سج دھج کے ساتھ پیش کرنے کا موجب تھا۔ میں اس مضمون میں میرزائے مغفور کے خصوصیاتِ کلام یا آپ کی فاضلانہ طرزِ سخن پر جس کا ظہور رنگِ قدیم و طرزِ جدید کے امتزاج سے ہوا بحث کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس بحرِ بیکراں کی وسعت چند قطروں کا لباس اختیار نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر خمریات کو لیجئے۔ یہ مضمون شعرائے قدیم سے غالب اور آپ کے معاصرین کو ورثہ میں ملا ہے۔ لیکن غالب نے اپنے معاصرین کی طرح شراب کو پیمانۂ تصوف سے ناپنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ یہ ایک ایسا قدیم شیوہ ہے۔ جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے فرسودہ ہو چکا ہے۔ غالب صرف بزرگوں کی ہڈیوں کے آگے سجدے کرنے والے تو تھے نہیں کہ جو کچھ آبا سے ملتا اسی پر قناعت کر لیتے۔ آپ نے خمریات کو جس سادگی اور حقیقت آمیز ابداع کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نے اس پرانی چیز کو بھی نئی خلعت عطا کر دی ہے۔

عمیق اور فلسفیانہ خیالات و نظریات کی نمائش، کلامِ غالب کا امتیازِ خصوصی ہے۔ لیکن خمریات میں یہ اغلاق نہیں اسی شراب کی حقیقت اور نتائج کیف و سرور پر تصوف و طریقت کے پردے ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ ماہرِ نفسیات کی طرح فطرت بیخودی اور اس کے اختیاری و اضطراری افعال و نتائج کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

خمریاتِ غالب میں اگرچہ خیام کی معصیت نمائی اور حافظ کی روحانیت جلوہ فرما نہیں۔ لیکن نفسیاتی حقیقت ضرور پوشیدہ ہے جس کی روشنی حافظ و خیام کے میخانوں میں نہیں۔

غالب ایک عام شرابی ہے جو میخانۂ الست سے جرعہ کشی کا مدعی نہیں بایں ہمہ وہ سطح بین بھی نہیں۔ کہ صرف شراب کے خمریاتی پہلو کی تصویر کشی جانتا ہو۔ اس کی نظریں ایک طرف تو شراب میں ڈوب کر اس کے سینے میں نشہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔ دوسری طرف وہ دماغ کی ان اضطراری کیفیات کا محققانہ انداز سے مطالعہ کرتا ہے۔ جو سرخوشی کا نتیجہ خیال کی جاتی ہیں۔ اسی باعث خمریاتِ غالب میں جہاں حقیقی عنصر زیادہ ہے۔ وہاں حکمت و بصیرت کی بھی کمی نہیں۔ البتہ وہ حقیقت و مجاز کے امتزاج سے ایک ایسی مہمل طرز ایجاد کرنا نہیں جانتا۔ جس پر "آدھا تیتر آدھا بٹیر" کی کہاوت راست آسکے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ ؎

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

تشنہ کام آنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ میں نے توبہ کی ہوئی تھی لیکن ساقی کو کیا ہوا تھا کہ اس نے اخلاص دوستی کے لئے نہیں تو کم از کم رسمِ زمانہ اور فرائضِ میزبانی کے مطابق ہی کہہ دیا ہوتا کہ

"پی خدا کے واسطے تھوڑی سی پی میرے لئے"

اس کے بعد شکستِ توبہ کی وجہ جواز بھی میسر آجاتی اور تشنہ کامی کا بھی رنج نہ رہتا۔ اس اجمال کی تفصیل ایک اور شعر میں یہ ہے ؎

حریفِ جوششِ دریا نہیں خود داریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

پہلے مصرعہ میں تمثیلاً بتایا گیا ہے کہ ساحل اپنی تشنہ لبی کے باعث کتنا

ہی ساکن وجامد ہو۔ لیکن اس کی یہ خودداری دریا کے جوش کا مقابلہ نہیں کر سکتی
اُٹھتی ہوئی موجوں کا ایک ہی ریلا ٹکرا کر اس کو مضطرب کر دیتا ہے۔ اسی طرح
جہاں تو ساقی ہو وہاں کوئی پئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر پینے سے احتراز بھی کرے
تو تیری مست نگاہی سے کسب نشہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے تیرے
سامنے ہوشیاری کا دعویٰ باطل ہے۔

یہ خمریاتی حقیقت اور شعراء کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے لیکن غالب
نے اس تمثیل وثبوت کے ساتھ اس کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اس سے
دوسرے شعراء محروم ہیں۔ ساقی کی بے اعتنائی کا گلہ ایک اور شعر میں کتنے
دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

یہ شعر بظاہر ایک عامیانہ امر کا حامل ہے۔ لیکن حسن بیان اور تکلم الفاظ
نے اس عمومیت میں جو خصوصیت پیدا کر دی ہے وہ تکلم والفاظ سے ظاہر
نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں شعر کی سب سے بڑی خوبی وہ اثر ہے جو
شعر پڑھتے یا سنتے وقت دل ودماغ پر چھا جاتا ہے، جس کے اظہار کے
لئے نہ الفاظ کام دے سکتے ہیں نہ تمثیلی کنائے۔ یہ اثر اس شعر سے نکل نکل کر
دل ودماغ کو اپنے آغوش میں لے رہا ہے۔

شعر میں ساقی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر تو ہم سے نفرت
کے سبب ہم کو پیالہ نہیں دیتا تو اوک ہی سے پلا دے۔ کیونکہ شراب دینا تو
فرض ہے، جس کی ادائیگی میں نفرت مخل نہیں ہو سکتی۔

ساقی کی نفرت کا خیال رفتہ رفتہ بدگمانی کی صورت اختیار کر جاتا ہے
اور غالب کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب ساقی کا کرم بھی ستم سے خالی نہ ہوگا۔
چنانچہ وہ اس حقیقت کا اظہار اس شعر میں کرتا ہے ؎

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

یہ شعر مایوسی اور اس کے نتائج کا کس درجہ دلپذیر مرقع ہے۔
یعنی ساقی کی بے اعتنائی سے میری امیدوں کی روشنی ظلمتِ یاس میں
دفن ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس نے مجھے شراب سے محروم رکھنے کا فیصلہ کر
لیا تھا۔ اب جو دورِ جام مجھ تک آیا ہے تو شراب میں زہر یا دارو ئے بیہوشی
ضرور ملا ہوگا۔ تاکہ میں پی کر مر جاؤں۔ اگر زندہ رہوں تو انتہائے بیخودی
کے باعث رقیبوں کی کامیابی پر صدائے احتجاج نہ بلند کر سکوں۔

سبحان اللہ کتنا سلجھا ہوا خیال ہے۔ بدگمانی ومایوسی کا کیف و
سرور میں ڈوبا ہوا نظریہ اس سے زیادہ لطیف وسادہ انداز میں کون پیش
کر سکتا ہے۔ یہ وہ شراب ہے جس سے خیام وحافظ کے میخانے بھی محروم ہیں

غالب نفسیاتِ نشہ اور اس کے لوازم وعلل کی تصریح کتنے پیارے
انداز میں پیش کرتا ہے ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

سبحان اللہ نفسیاتی حقیقت کو تصوف وعرفانیت میں ڈبونے کی
بجائے کیا عام فہم سادگی سے پیش کر دیا ہے۔ یہ چیز تقلیدی نہیں کہ اس میں
متقدمین کا انداز جلوہ فرما ہو بلکہ تخلیقی ہے، جو اپنے فطری تاثرات میں محصور ہے۔

شعر کا مضمون سادہ عام فہم ہے، یعنی شراب پینے کے وقت ہم سے
بے تکلف ہو جاؤ۔ ورنہ ہم مستی کی آڑ لے کر چھیڑیں گے۔ کتنی لطیف اور مدلل
دھمکی ہے "عذرِ مستی" کی لطافت ومعقولیت ملاحظہ فرمائیے کہ شراب پینے
کے بعد جو چھیڑ چھاڑ کی جائے وہ کتنی ہی گستاخانہ جسارت پر مبنی ہو لیکن جرم نہیں
خیال کی جاتی، کیونکہ شرابی کا ہر فعل اختیاری نہیں۔ بلکہ نشہ بیخودی کا اضطراری
نتیجہ ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر غالب کی طرف سے معشوق کو دھمکی
دینا "دیوانہ بکارِ خویش ہشیار است" کی کس درجہ بلند تصویر کشی ہے۔

معشوق سے متعلق ایک اور خمریاتی نظریہ کا یوں اظہار ہوتا ہے ؎

میں اُنہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پئے ہوتے

یہ شعر باعتبارِ مضمون پہلے شعر کی نیابت کرتا ہے۔ دونوں شعروں
میں نفسیاتی حقیقت مشترک ہے۔

شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ میرے چھیڑنے پر ان کا برہم ہونا لازمی
تھا لیکن وہ ہوش میں تھے۔ انہوں نے میری چھیڑ چھاڑ کا جواب دینے
کے بجائے یہ خیال کیا کہ بات بڑھ جائے گی دیکھنے والے کیا کہیں گے۔
باہمی تکرار اظہارِ تعلق کا موجب ہوگی۔ اگر انہوں نے پی ہوتی تو نشہ میں اس
قسم کے عاقبت شناس اندیشوں سے بے نیاز ہو کر مجھ سے لڑائی کرتے
کیونکہ کیفیتِ شراب میں انسان سود وزیاں اور اپنے اقوال وافعال کے
نتائج سے مطمئن ہوتا ہے۔

ایک اور جگہ معشوق سے متعلق ایک خمریاتی تمنا کا اظہار بجد وجد
انگیز انداز میں کرتے ہیں ؎

رات کے وقت مے پئے، ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

یعنی معشوق رات کے وقت شراب پی کر میرے پاس آئے کیونکہ
اس نے میرے پاس بقیامِ ہوش آنا تو ترک ہی کر دیا ہے۔شاید نشہ
میں قطعِ تعلق بھول جائے۔لیکن انتہائی نشہ کی حالت میں جب انسان دوستی
و دشمنی کے امتیاز سے بالاتر ہو جاتا ہے۔اکیلا نہیں چل سکتا۔قدم قدم پر
لغزشوں کا ہجوم ہوتا ہے۔اس لئے غالب سوچتا ہے۔کہ کس کو اس کے
ساتھ آنا چاہئیے۔اس کے خیال میں رقیب ہی سائے کی طرح ساتھ لگے رہنے
کے باعث یہ خدمت انجام دے سکتا ہے۔لیکن اس خیال کے ساتھ ہی
آتشِ رقابت بھڑک اٹھتی ہے۔لہذا مجبوراً وہ ایک مصرعہ میں "آئے
وہ خدا کرے" کہنے کے بعد فوراً اپنی غلطی محسوس کر لیتا ہے اور چونک
کر کہتا ہے "پر نہ کرے خدا کہ یوں" متضاد و تردید کا وصال جو غالب
نے پیش کیا ہے وہ ان شاعروں کے لئے چراغِ تعلیم ہے جو جذبات
کی خاموش آوازوں کو نغمۂ شعری کا لباس پہنانا چاہتے ہیں۔

شبِ مہتاب و روزِ ابر سے غالب کو خاص محبت ہے اور بادہ
نوشی ایسے روز و شب میں ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی قرار دیتا ہے۔چنانچہ ؎

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

"شبِ مہتاب و روزِ ابر" کی تخصیص ہی غالب کی صحیح الذوقی کی
ناقابلِ تردید دلیل ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نقطۂ نگاہ کی پرورش
نفسیات و حقیقت کے آغوش میں ہوئی ہے اور اس کا نظریہ عقل و تجربہ
کا تربیت یافتہ ہے۔

عید سے متعلق خیام کے خمریات افروز فلسفہ نے مقتضیاتِ
رندی پر خوب روشنی ڈالی ہے۔لیکن غالب اس مسئلہ میں اپنی جدت طرازی
کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہا۔چنانچہ ؎

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

یعنی میرے لئے تو عید کی سب سے بڑی خوشی یہ ہو سکتی ہے کہ
اس دن ماہِ صیام کی وجہ سے جو میخانوں پر پابندیاں ہیں اٹھالی جائیں گی۔
اور شراب میسر آئے گی لیکن مجھے تو ماہ صیام میں ہر روز پینے کو مل جاتی
ہے۔کوچۂ میخانہ کا گدا کبھی نامراد نہیں رہتا۔اس لئے عید کی خوشی امتیازی
حیثیت نہیں رکھتی۔عام خمریاتی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں اور
ان کے نفسیاتی نقوش ان شعروں میں دیکھئے ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہ جام بہت ہے

قرض کی پیتے تھے مے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ہے دورِ قدح وجہ پریشانیٔ صہبا
یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

غالب کے ہاں خیام کی طرح رندانہ سرکشی اور معصیت آمیز شوخی
کی بھی جھلک پائی جاتی ہے۔چنانچہ ذیل کے اشعار صہبائے خیام میں سرتاپا
غرق ہیں ؎

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا کام حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

رات پی زمزم پہ مے، اور صبحدم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

میں اپنے فرائض سے کوتاہی کروں گا - اگر کلامِ غالب کو صرف نفسیاتِ عمومی کی ترجمانی کا ذریعہ قرار دینے کے بعد اس مضمون کو ختم کر دوں - کیونکہ غالب ایک جامع الشروط شاعر ہے وہ فقط مشاہدہ و نظر کے تاثرات میں ڈوب کر ان کی کیفیاتِ باطنی کا اظہار کرنا نہیں جانتا - بلکہ وہ ان رموز و حقائق کا عکس بھی اپنے آئینۂ خیال میں کھینچ لانے کی قابلیت رکھتا ہے - جن کی خلوتِ راز میں انسانی بصارت و بصیرت کی رسائی نہیں - اس کے یہاں نفسیاتِ عمومی کی نقاب کشائی ضروری تو ہے - لیکن ان جلوؤں کو بھی جامۂ الفاظ پہنانے سے دریغ نہیں کیا گیا جو ذوق و وجدان کے بغیر کسی کو دعوتِ نظارہ نہیں دے سکتے -

غالب ہر موج میں ایک جنبش، ہر نقاب میں ایک جلوہ، ہر خلوت میں ایک ہی راز کی سکوت سامانی دیکھتا ہے - وہ جہاں ایک عام شرابی کی طرح نفسیاتِ نشہ و خمار کو سادہ اور واضح انداز میں پیش کر سکتا ہے - وہاں خیام کی طرح حد سے بڑھی ہوئی معصیت آمیز رندی کی خواہش پوری کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتا - بایں ہمہ وہ حافظ کی طرح تصوف و الٰہیات کے حقائق و معارف اور حکمت و بصیرت کے جواہر ریزے بھی خمریات کے پردہ میں ظاہر کرنے کی پوری طرح صلاحیت رکھتا ہے - حکمت و الٰہیات کو خمریات کے رنگ میں بیان کرنے کی حافظ بوجوہِ تمام صلاحیت رکھتا ہے لیکن کلامِ حافظ سے اگر کیفیتِ بیان علیحدہ کر دی جائے - تو وہ کسی عمیق فلسفہ کا ترجمان نہیں رہ سکے گا، بلکہ صوفیانہ تغزل کا آئینہ دار بن کر رہ جائے گا - غالب کے فلسفہ کی بنا فکرِ عمیق اور تربیت یافتہ خیالات پر ہے - اس لئے وہ عام فہم الفاظ اور سادگی و حسنِ بیان کا قائل نہیں - اس کے نزدیک شمع کی خوبصورتی فانوس کے عیوب چھپا سکتی ہے - تاہم وہ زیرِ بحث مسئلہ (یعنی خمریات) میں حافظ کا مقلد ضرور ہے - چنانچہ اس کا مشہور شعر ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

یعنی الٰہیات و حقانیت کے رموز لباسِ استعارہ و تشبیہ ہی میں پیش کئے جا سکتے ہیں - اب میں غالب کے ان اشعار میں سے چند شعر پیش کرتا ہوں، جن کے ساغرِ معنی میں حکمت و تصوف کی شراب موجزن ہے - چنانچہ ایک مشہور شعر ہے ؎

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

غالب نے اس شعر میں جذبۂ حرص کی وسعت جس خوبی سے بیان کی ہے اس سے ذوقِ سلیم پر وجد طاری ہوتا ہے - شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "ساقی میری تشنہ کامی کا خمار بھی تیرے ظرف یعنی حوصلہ کے مطابق ہے - اگر تو دریائے مے ہے تو میں ساحل کی انگڑائی ہوں" انگڑائی عموماً نشہ اترتے وقت یا شراب پینے کے وقت آتی ہے -

شعر کا حقیقی مطلب یہ ہوا کہ اے معشوقِ حقیقی تو کرم و بخشش میں جس قدر دریا دل ہے - اسی قدر تیرے بندوں کا دامنِ حرص و طمع وسیع ہے - یعنی تیری بخشش و عطا میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے - اتنا ہی سائلوں کا جوشِ طلب بڑھ رہا ہے - شاید اسی شعر کی تشریح کے لئے یہ شعر لکھا گیا ہے -

سعدیؒ ؎

گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

بیدلؒ ؎

حرصِ قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں
ہر چہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

محویتِ صادقہ سے متعلق یہ شعر کتنا معنی آفرین ہے ؎

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

مفہومِ شعر یہ ہے کہ "میری سانس (جس پر مدارِ زندگی ہے) بیخودی (بیہوشیٔ کامل) کی گہری اور وسیع موج ہے یعنی میں عشق و محویت کی گہرائیوں میں کچھ ایسا ڈوب چکا ہوں - کہ میری زندگی بھی بیہوشی کے ماتحت ہو کر رہ گئی ہے - ایسی حالت میں ساقی کی غفلتوں کا گلہ فضول ہے -

غالب نے اس چھوٹے سے شعر میں فلسفۂ فنا فی اللّٰہی کے جو حقائق پیش کئے ہیں - ان کی وسعت ہزاروں بلکہ لاکھوں شعروں میں نہیں سما سکتی - یہ وہ راز ہے جس کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے ؏

بر دار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

وہ محویتِ عمیق جس کی ترجمانی مرقومہ بالا شعر سے کی گئی ہے - اس کی ابتدائی حالت میں جنون و عشق کو پختہ کرنے کی تعلیم اس شعر میں دی گئی ہے ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

یہ حقیقت محتاجِ توضیح نہیں کہ انسانی نفسیات کی بنا آرزو پر ہے - اور زندگی آرزوؤں کے تسلسل کا نام ہے جو موت کے بغیر ٹوٹ نہیں سکتا ہے - اس شعر میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی سانس آرزوئے دیدارِ الٰہی

کے بغیر نہیں ہونی چاہیئے۔ چونکہ سانس کے آنے کا نام زندگی ہے - لہٰذا غالب کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی بنا آرزوئے صادق پر ہونی چاہیئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جلوہ دیکھا ہی نہیں تو آرزو کس کی کیجائے یعنی تجلیاتِ ربانی پر تو ہزاروں پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا جواب "اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ" سے دیا گیا ہے یعنی جلوہ نہیں تو اسبابِ دیدارِ جلوہ کی آرزو تو ترک نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقئ کوثر کے باب میں

یہاں "کل" سے مراد قیامت ہے۔ اہلِ شریعت کا ارشاد ہے کہ دنیا میں شراب پینے والا آبِ کوثر سے محروم رہے گا۔ غالب اس نظریہ کی تاویلی دلیل سے تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قیامت کے خوف سے شراب ترک نہ کر۔ یہ کارِ ثواب نہیں بلکہ ساقئ کوثر سے متعلق بدگمانی ہے، کہ وہ گنہگار شرابیوں کو اپنے لطف وکرم سے محروم کر دیں گے۔ کیونکہ فیاضی و بخشش کے حقدار گنہگار ہی تو ہیں۔ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں کو قریباً تمام شاعروں نے پیش کیا ہے۔ مگر ان کے یہاں غالب کی سی جامعیت نہیں۔

ناثباتئ دنیا پر غالب نے جس انداز کے ماتحت اشکِ حسرت بہائے ہیں اس کی مکمل جھلک اس شعر میں ہے ؎

بزمِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

یہاں بزمِ قدح سے مراد دنیا ہے۔ یعنی دنیا سے عیش کی تمنا نہ رکھ "رنگ" بزم کے تلازمہ سے ہے (یعنی رنگ جمنا) شعر کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ دنیا سے عیش کی امید نہ رکھ کیونکہ رنگ یعنی رونقِ محفل تو اس دام گاہ سے بھاگا ہوا شکار ہے۔ دنیا کے متعلق "دام گاہ" کا استعارہ کس درجہ لطیف ہے۔

غالب نے بعض جگہ خمریاتی رنگ کو ذریعۂ نصیحت بھی بنانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ؎

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

تمثیلی استعارہ کا خورشید ارتقا اس شعر میں روشن ہے ؎

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

میں طوالت کے خوف سے اس مضمون کو یہیں ختم کرتا ہوں اور مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ غالب کی شاعری کے جس تفوق کو نمایاں اور مدلل بنانے کی میں نے کوشش کی ہے۔ اس میں اگرچہ کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن ناکامی کا منہ بھی نہیں دیکھنا پڑا۔ کیونکہ صانع کے خیال وعمل کی بہترین دلیل مصنوع ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میں نے غالب کے شراب آلودہ شعروں کا انتخاب کر کے غالب کی "خمریاتی قابلیت" سے دماغِ عالم کو متعارف کرا دیا ہے۔ ورنہ یہ موضوع ہر لحاظ سے تشنۂ تکمیل رہا ہے۔ کیونکہ غالب کی شاعری کا تفوق شعرائے متقدمین سے موازنہ و تقابل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ اقدام شخصیت پرستوں کے نزدیک گستاخانہ جسارت اور سوءِ ادب کا بدترین مظاہرہ ہوگا۔ اگر آج کوئی آزادیٔ رائے کے حقوق کا استعمال کرتے ہوئے کہہ دے کہ خیام کی خمریات میں عیش پسندی، الحاد کوشی اور تعلیمِ بے ثباتی کے بغیر کوئی مستقبل فلسفہ یا نظریہ نہیں، لیکن غالب کا شراب آلودہ کلام اس طرزِ خاص کا حامل ہے، جو فلسفیانہ خیالات و جذباتِ صادقہ کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے تو کیا دنیائے ادب اس نظریہ کو ناقابلِ تلافی گناہ سے تعبیر نہ کرے گی؟ لیکن ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے ونغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

اظہر امرتسری مدیر زمیندار لاہور

"شمعِ محبت"

جب تو اپنا چراغ آسمان میں اُٹھائے رکھتا ہے تو اس کی روشنی میرے چہرہ پر آکر پڑتی ہے اور تجھ پر اس کا سایہ۔

جب میں اپنے دل میں شمعِ محبت فروزاں رکھتا ہوں تو اس کا پرتو تجھ پر معکوس ہوتا ہے اور میں اس کے سایہ میں کھڑا رہ جاتا ہوں۔ (ٹیگور)

قیصر عثمانی

تعارف

ہنسنے والے! عظمتِ شاعر سے تُو واقف نہیں
تیری آنکھوں میں جبھی یہ تمکنت ہے بایقیں

آسمانوں پر یہ مہر و ماہ ہیں ضو ریز جو
چشمِ شاعر ہی کے ٹپکائے ہوئے آنسو ہیں دو

قبر کی جانب ہو شاعر کا اگر روئے سخن
نعشِ صد سالہ بھی چہرے سے اُلٹ ڈالے کفن

نظمِ عالم رہ نہیں سکتا ہے جس دم برقرار
عرش پر ہوتا ہے میرے مشوروں کا انتظار

آسماں بوسہ عقیدت کا مری چوکھٹ پہ دیں
میں اگر چاہوں فرشتوں کو قدم لینے پڑیں

گنگنا کر فرحتیں بھر دوں دلِ غمناک میں
زندگی کی لہر دوڑا دوں خس و خاشاک میں

میری تانوں میں وہ خونیں بجلیاں ہیں بیقرار
تھرتھرا اُٹھتا ہے جن سے اہلِ دولت کا وقار

گر قلم کے لب سے ٹپکاؤں جگر کا اضطراب
کروٹیں لینے لگے پیری کی رگ رگ میں شباب

میں اگر چاہوں تو ذرّے کو ضیائے مہر دوں
موت کی آنکھوں سے بینائی کی قوت چھین لوں

میرے نغموں کی تجلی کا ہے وہ کافر شباب
جس کی اِک جنبش سے پیدا ہو جہاں میں انقلاب

میں اگر چاہوں تو پتھر میں لچک پیدا کروں
نو شگفتہ پھول کے لب سے سسک پیدا کروں

شب کو چھا جاتی ہیں جب نیندیں فضا پر چار سُو
خُلد والوں سے کیا کرتا ہوں اکثر گفتگو

طُور کا جوبن مرے افکار کی قندیل میں
قدسیوں کا رقص میری محفلِ تخئیل میں

شاعری میں میری ایسی قوّتیں مستور ہیں
جن کے دامن پر وطن کی قسمتیں مسطور ہیں

معصیت زادے! تکبّر کو ترے توڑوں گا میں
ٹھوکروں سے سیم و زر کے بُت کا سر پھوڑوں گا میں

الطاف مشہدی

"شمع و پروانہ"

کچھ اِس میں جوشِ عاشقِ حُسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور یہ، وہ ذرا سا کلیم ہے
(اقبال)

طبقاتِ علوی کا متبرک دیوتا اپالو ہر سال کسی دیوتا کو طبقہ خاکی کے حالات دریافت کرنے کے لئے زمین پر بھیجا کرتا - دیویاں اُس کی ناانصافی پر باہم نکتہ چینی کرتیں - ایک سال جب زمین پر کسی دیوتا کو بھیجنے کا وقت آیا تو دیویوں نے مِل کر مشورہ کیا کہ وہ فریادی ہوں کہ اس بار کسی دیوی کو بنی نوع انسان کی بستی میں بھیجا جائے - انہوں نے اپالو کے دربار میں اِس امر کی التجا کی ..... مگر جواب ملا کہ "صنفِ لطیف" کا دل کمزور و نازک ہوتا ہے - طبقہ خاکی کے انسان ...... حیلہ ساز .... دغاباز ..... مکار و عیار ہوتے ہیں - کہیں ایسا نہ ہو کوئی دیوی اُن کے دامِ فریب میں پھنس جائے - اور ہماری قوم پر بدنامی کا دھبا لگے "۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا "ایسا نہ ہوگا"۔ مجبوراً اپالو نے اُن کی دل شکنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جونو حکمت کی دیوی کو منتخب کیا - اور چند ضروری ہدایات دے کر اُسے زمین پر اُترنے کا حکم صادر فرمایا - جونو بے پایاں خوش تھی - اُس نے اپنا مسکن کسی خاص جگہ نہ بنایا - وہ کبھی دریائی موجوں میں ..... کبھی شفق کی سُرخی میں رہا کرتی اور کبھی پھولوں کی نکہت ..... یا کسی چھلکتے چشمے کے متحرک پانی کو اپنا مسکن قرار دیتی اور کبھی پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں پر جاگزیں ہوتی - غرض وہ مسرور کن و لطیف دن بسر کرنے لگی - وہ کبھی کبھی روحانیت کو چھوڑ کر مادی اجسام میں بھی ظہور پذیر ہو جاتی -

(۲)

ایک دن جب وہ ایک سنہری جھیل کے کنارے بیٹھی فطرت کے رنگین مناظر کا مطالعہ کر رہی تھی - اُسے دُور سے ایک سوار آتا نظر پڑا ..... وہ اُسے دیکھتی رہی - اب وہ بہت قریب آگیا - مگر جونو کسی نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر اُسے گھورتی رہی - "آہ کسقدر بھولا بھالا" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا - جوان کے چہرے پر جوش و خروش سے سُرخی دوڑ رہی تھی - جیسے کسی شکار کے تعاقب میں بیاباں آنکلا ہو - اس کی بلند پیشانی پر پسینے کے قطرات اِس طرح چمک رہے تھے، جیسے گلاب کے پھول پر شبنم - "تم کون ہو؟" نوجوان نے استفسار کیا - جونو نے اپنے سیاہ چمکتے ہوئے بالوں کو اپنے مرمریں نازک ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا - "میں حقیقت ہوں ......" ... "اے دیوی کیا میں تمہاری جھیل سے پانی پی سکتا ہوں"۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا - جوان نے گھوڑے سے اُتر کر خود پانی پیا اور گھوڑے کو پلایا - اُس کی سفید کلغی بھیگ گئی تھی - وہ اُس کے پاس استراحت کے لئے بیٹھ گیا - "تم حقیقت نہیں - ..... بلکہ دیوانہ بنا دینے والی ساحرہ ہو"۔ نوجوان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا -

"تم انسان نہیں ..... دیوتا ہو"۔ جونو نے جواب میں کہا -

...... یہ محبت کا آغاز تھا -

نوجوان اب سنہری جھیل کے کنارے رہنے لگا -

سہانی رات کو جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی، اور چاند کی سیمیں کرنیں جھیل کے شفاف پانی پر نُور کی بارش برسائیں - تو جوان جونو کا سر گود میں لئے اُس کے ریشمی مشکبار بالوں سے کھیلا کرتا - اس نے اُس کا دل موہ لیا تھا - جونو اس کی تسکین دہ گود میں گایا کرتی، اپنی میٹھی آواز ..... بنسری سے بڑھ کر سریلی آواز سے نوجوان کی محبت کے مدہوش کُن نغمے چھیڑا کرتی - اور جب گانا ختم ہوتا - تو کائنات کی فضا سُن ہو جاتی ہر طرف ابدی خامشی چھا جاتی - اُس وقت نوجوان اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہتا -

ہرے ہرے پتوں سے چاند کا نُور چھن چھن کر ضو فشانی کرتا اور

اُس کی سیمیں کرنیں جوَلو کے چہرے پر نچھاور ہوا کرتیں - وہ اپنا سر جھکاتا، دونوں کے لب متصل ہوتے - اور یک دم ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے - درختوں کے قہقہے ...... اردگرد کے پہاڑوں سے ٹکراتے - اور دونوں مدہوش ہو جاتے - جوَلو اُس کی محبت میں وارفتہ ہو گئی تھی -

ایک صبح جب پرندے چہچہا رہے تھے - نسیمِ سحری کے بھیگے ہوئے جھونکے جھیل کے اردگرد اُگے ہوئے پھولوں سے اٹکھیلیاں کرتے تھے - ایک طرف حدِ نگاہ پر سُرخ سی لکیر نظر آ رہی تھی، جو آہستہ آہستہ ایک سفید مدوّر حلقے میں منتبدل ہو گئی - اور سورج دیوتا اپنی پوری آب و تاب سے نکلا - نوجوان نے جوَلو سے کہا - "ہم بہت مدّت تک یہاں رہے - بادشاہ میری راہ دیکھتے ہوں گے - چلو وہاں چل کر رہیں گے -"

(۳)

ملک بھر میں شہزادہ اور دیوی کی خبر پھیل گئی - متواتر کئی ہفتے جشن منائے گئے - مگر اس دن جب شہزادے کی شادی کا دن تھا سال ختم ہو چکا تھا - جوَلو کے نہ لوٹنے پر آسمان پر تھلکہ مچ گیا - کرۂ ارض پر مخبر روانہ کئے گئے - جنہوں نے اپالو کو جوَلو کی شادی کی خبر سنائی - آسمانی دیوتا کے چہرے پر لالہ گوں لہر دوڑ گئی - آنکھیں غصّہ سے سُرخ ہو گئیں - بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی - اُس نے اپنے سحر سے جوَلو اور شہزادہ کو ہمیشہ جلتے رہنے کی بد دُعا دی -

ساتویں کا چاند نیلگوں آسمان پر جلوہ افروز تھا - کہیں کہیں ستارے جھلملاتے تھے - شادیانوں کی صدا سے فضائے زمانہ گونج رہی تھی -

شہزادہ دُلہن سے ملنے کے لئے بیتاب تھا - خلوت ہوئی ..... وہ خواب گاہ میں پہنچا - مگر اُس نے اپنی بیوی کو نہ پایا - چاند کی نقرئی کرن دریچہ سے گزر کر نورانی رختِ خواب پر پڑ رہی تھی - کمرے کے ایک کونے میں سفید لمبی شمع جل رہی تھی - شہزادہ گھبرا پڑا - معلوم نہیں کیا ہوا - مگر ایک تاریک سا سایہ اُٹھا اور کمرے کا چکّر کاٹتے ہوئے شمع کے گرد پھر کر عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا - یہ تھی وہ بد دُعا جو آسمانی دیوتا اپالو نے جوَلو اور اُس کے عاشق کو دی - اب دونوں سدا جلتے ہیں

شہزادہ بار بار پروانے کی صورت میں وصل میسّر نہ ہونے پر جلتا ہے ...... اور جوَلو کی آہیں سیاہ دھوئیں کی صورت بن کر مدوّر حلقے بناتی ہیں ...... وہ شرمندگی کے آنسو بہاتی ہے - مگر اُسے اپنے عاشقِ زار کے جلنے پر رونا بھی آتا ہے -

اس کے بعد کوئی دیوی زمین پر نہیں بھیجی گئی -

(ماخوذ)

گُل سعید (جالندھر)

غزل

کائناتِ ضبط میں حشرِ خلل پیدا نہ کر　　اے جنونِ عشق! شوقِ بے محل پیدا نہ کر

درگذر دیوانگی میں مُدعائے شوق سے　　کش مکش ہائے غمِ طولِ امل پیدا نہ کر

اے تصوّر خاک میں مل جائے گا ذوقِ تپش　　عقدۂ دشوار دردِ غم کا حل پیدا نہ کر

او تغافل آشنا موجِ خرامِ ناز سے　　دلفریبی ہائے اندازِ اجل پیدا نہ کر

ہے جہادِ زندگی میں جذبۂ ایثار اشک
کون کہتا ہے تجھے ذوقِ عمل پیدا نہ کر

اشک صحرائی چکوالی

مرزا جہانگیر اور اُن کا مدفن

تیمور گورکان کی آخری نسلوں میں ایک تاجدار گزرا ہے۔ ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی جس سے ملک اور تاج دونوں رخصت ہو چکے تھے۔ لیکن رہنے سہنے کے لئے شاہجہانِ صاحبقران کا لال قلعہ اور بیٹھنے کے لئے چغتائی باپ دادا کا تخت باقی تھا اور اقلیم سخن پر حکمرانی۔ باپ شاہ عالم ثانی "آفتاب" تھا تو بیٹا "شعاع" ہوا۔ شاعری کی دُنیا میں اسی نام یا تخلص سے چمکا۔ یہ محض بے اختیار خطابی بادشاہ تھا نہایت رحیم و کریم۔ اور جیسا کہ مفتی غلام سرور لکھتے ہیں، انگریز اس کی عزت و حرمت کا بیحد پاس کرتے تھے[1]۔ اس کا برائے نام عہد سلطنت ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) سے ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) تک یعنی تیس سال شمار ہوتا ہے۔ اسّی برس عمر پائی۔ اس کی اولاد میں دو شاہزادوں کے نام اوراق تاریخ پر روشن نظر آتے ہیں۔ ایک ابو ظفر بہادر شاہ ثانی، جس کو ۱۸۵۷ء کے ملکی انقلابات اور لشکری شورشوں کے طفیل برائے نام بادشاہی کے نام کو بھی خیرباد کہنا پڑا تھا۔ یہ لعل بائی کے بطن سے تھا۔ دوسرا جہانگیر مرزا، ممتاز محل سے۔ مجھے اسی دوسرے شاہزادہ کی نسبت عرض کرنا ہے۔

مشہور مؤرخ ولیم طامس بیل نے "اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری" میں مرزا جہانگیر کو بڑا بیٹا لکھ دیا ہے[2]۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو تیموری آئین بلکہ دنیا کے پُرانے معمول و دستور کے مطابق اس کو خود ولی عہد سلطنت قرار پاجانا چاہیئے تھا۔ اس طرح ساری بنائے منازعت ختم ہو جاتی ہے اور قصّہ پاک ہو جاتا ہے۔ مگر یقیناً یہ موصوف کا سہو ہے۔ ان کی غلطی مستند معاصرین کی تحریرات سے آشکارا ہو جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مرزا جہانگیر نے ۱۸۰۸ء میں مسٹر سیٹن (Seton) ریزیڈنٹ متعین دہلی پر طپنچہ (پستول) کا فیر کیا تھا، تو اسیر سلطانی کی حیثیت سے الہ آباد بھیج دئے گئے تھے۔ جہاں خسرو باغ میں کئی سال رہے۔ انہوں نے اکتیس سال کی عمر میں ۱۸۲۱ء (۱۲۳۶ھ) میں وفات پائی ؏

کہتا تھا خود شباب کہ مرنے کے دن نہ تھے

شاہزادہ کے سالہائے عمر کے حساب سے دفن کے وقت قلعۂ الہ آباد کی فصیل سے اکتیس ضرب توپ کی ماتمی شلک سر کی گئی۔ وہ اسی باغ میں سُپردِ خاک کئے گئے۔ مگر بعد کو معمر بادشاہ کی خواہش و اصرار پر ۱۸۳۲ء میں لاش نکال کر دہلی منتقل کر دی گئی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے صحن میں دفن ہوئی[1]۔

نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے
ہوئی ہے ختم میعاد آج پابندِ سلاسل کی

سر ولیم سلی مَین نے ۱۸۱۶ء میں شاہزادہ کو یہاں دیکھا تھا۔ وہ مسٹر بیل کی طرح اُس کو ولی عہد اور اکبر دوم کا فرزند اکبر (اول) نہیں بتاتے۔ لیکن اپنے سیاحت نامہ و تذکرہ میں لکھتے ہیں[2] کہ "یہ شاہزادہ الہ آباد میں اسیر و حبس کی حالت میں نہ تھا۔ صرف دہلی واپس جانے کی ممانعت تھی۔ اس کا مکان شاندار تھا۔ آمدنی معقول تھی۔ اور اس کے مرتبہ و شان کے حسبِ حال تمام اعزاز برقرار تھے۔"

شاہزادہ کے متعلق مختلف حالات مختلف تاریخوں اور بعض اور کتابوں میں جستہ جستہ ملتے ہیں۔ ان کو گزرے ہوئے بھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ اس لئے بہت سی روائتیں اور حکائتیں پچھلوں سے سُنی سنائی یا اِدھر اُدھر لکھی ہوئی اب تک زبانوں پر ہیں ؎

عالم زماتہی و زافغان ما پُرست
شد عندلیب خاک و چمن از نوا پُرست

ان حالات کی بہ تفصیل نقل و تحریر یا مجبورانہ تطویل کا عفو خواہ ہوں۔ ہوش مند و ذی فہم حضرات تکرار و اعادہ واقعات سے قطع نظر فرما کر سلسلۂ حالات کو مربوط کر لیں۔

مسٹر سیٹن (Seton) ۱۸۰۵ء (۱۲۲۰ھ)[3] میں شاہجہان آباد کے عہدۂ ریزیڈنسی پر مامور ہوئے۔ ان سے اور مرزا سے شدید ناچاقی ہو گئی تھی۔ ۱۸۰۹ء یا بقول سلی مین ۱۸۰۸ء[4] میں مرزا نے طپنچہ تفنگچہ[5] پستول کا فیر کیا۔ وہ بچ گئے اور مرزا نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دئے گئے۔ گیارہ بارہ سال خسرو باغ میں رہے[6]۔ الزام تو ان پر سخت تھا۔ لیکن یا تو ان کی عظمتِ مرتبت

---

[1] گنجینۂ سروری یا گنج تاریخ صفحہ ۱۸۰ حاشیہ اول [2] صفحہ ۱۲۸

---

[1] بیلیس ڈکشنری، صفحہ ۱۲۸ - و قاموس المشاہیر، صفحہ ۱۸۳ [2] جلد دوم، صفحہ ۱۶۷

[3] تاریخ حدولیہ، صفحہ ۳۴۳ [4] سیاحت نامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۶۷ نوٹ ذیلی [5] اوریانٹل مغل، صفحہ ۶۸۸ [6] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۰

وشاہزادگی کی بدولت، یاکسی اور مصلحت ہنگامی وملکی کے لحاظ سے یا شاید اُن وقتوں کے رعائتی آئین وقوانین کے رُو سے یا حسبِ تحریر راجہ درگا پرشاد سندیلوی عفو تقصیرات کے بعد، ان کی نگرانی اور دیکھ بھال میں چنداں جبر وسختی کو راہ نہیں رہی تھی - انہوں نے ۱۸۲۱ء (۱۲۳۶ھ) میں اس زندان آب وگل سے رہائی پائی تو اسی خسرو باغ میں ان کو اپنے دادا سلطان خسرو کی قبر کے پاس جگہ دی۔[۱] کچھ دن بعد (یا حسبِ تحریر سر ولیم سلی مَین ۱۸۳۲ء میں[۲]) انگریزوں سے اجازت ملنے پر ان کی لاش یہاں سے نکال کر دہلی بھیجی گئی - نواب ممتاز محل، ان کی ماں کو مرنے کا بڑا قلق تھا ...... وہ اس حالت میں بھی اپنے لختِ جگر کا اپنے سے دُور رہنا برداشت نہ کر سکیں - اُن کی اُلفت اس پیکرِ بے جان کی کشش کا باعث ہوئی - نواب مختار الدولہ خواجہ وحید الدین احمد خاں اس خدمت یعنی لاش کی ہمراہی اور لے آنے پر تعینات کئے گئے - یہ اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ[۳] کے رشید خلف اور جواد الدولہ سر سیّد احمد خاں بہادر عارف جنگ کے ماموں تھے - لاش کے دہلی پہنچنے پر بڑا ماتم ہوا - وہ لاش جو خسرو باغ میں ایک سادے سے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دبا دی گئی تھی، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے صحن میں محمد شاہ بادشاہ کے مجحر کے پاس شاہانہ مراسم واہتمامات کے ساتھ دفن کی گئی - اس پر ایک شایانِ شان مجحر سرتاپا سنگ مرمر کا تیار ہوا۔[۴] اہل نظر کہتے ہیں کہ مرزا کا مجحر بعینہٖ محمد شاہ کے مجحر کی نقل ہے - اس کی جالیاں بھی بہت باریک ونازک ہیں - سیّد صاحب اس سے بھی نفیس تر و پُر تکلف بتاتے ہیں "البتہ سنگ مرمر ویسا آبدار وشفاف اور بے جرم خوش رنگ اور خوشنما نہیں پایا - تاہم اپنی جگہ یہ بھی عجائبِ روزگار سے ہے - یہ مجحر ۱۲۴۸ء کی تعمیر ہے[۵]" تحفۃ الابرار یعنی کلیات صدولیہ[۶] میں بھی یہی سال ۱۲۴۸ء لکھا ہے - تاہم شبہ ہو سکتا ہے کہ ۱۲۴۸ء کتابت کی غلطی ہو اور اور صحیح طور پر سال تعمیر ۱۲۳۸ھ یعنی ۱۸۲۳ء رہا ہو - اس مختصر تعمیر میں بارہ برس کی مدت نہ لگی ہو لیکن اس مسئلہ پر بحث وتحقیق کی یہاں ضرورت نہیں، نہ موقع ہے - آشکار ہے کہ ایک تنگ حال شخص کے لئے جو خود دوسروں کا دست نگر ہو - اس چیز کے لئے بھی سرمایہ فراہم کر لینا آسان نہ تھا - میرا مقصود بے خطا، خطابی شہنشاہ اکبر ثانی سے ہے - جس نے لال قلعہ دہلی کی موتی مسجد سے سنگ مرمر کے کواڑ اُتروا کر اس مقبرہ میں چڑھائے تھے[۷] ورنہ کون نہیں جانتا کہ بقول "وہیچ وڈ" ہیتھ شاہان مغلیہ فن تعمیر کے امام تھے - یہ مجحر اب تک بہت اچھی حالت میں ہے - اس پر کوئی کتبہ یا قطعۂ تاریخ کندہ نہیں ہے -

فرخ آباد کے دلچسپ کارنامۂ وقائع "لوحِ تاریخ" سے پایا جاتا ہے کہ ملکہ ممتاز محل کو مرزا جہانگیر کا غم والم مدتوں رہا تھا - حتےٰ کہ جب ۱۸۳۴ء (۱۲۳۹ھ) میں، نواب خادم حسین خاں شوکت جنگ رئیس فرخ آباد نے دہلی میں وفات پائی اور اُن کی نعش چند روزہ تدفین وتفویض کے لئے قلعہ دہلی کے نیچے سے ہو کر گزری تو بیگمات میں ایک شور ماتم اور فریاد کا برپا ہوا - علے الخصوص مادرِ جہانگیر کو نہایت قلق ہوا اور اُس حالت میں اُن کی زبان سے نکلا کہ "آج غم اپنے جہانگیر شہزادے کے مرنے کا پھر مجھ کو تازہ ہوا کہ جیسے وہ پردیس میں جا کر مرے تھے ویسے ہی یہ بھی غریب الوطن ہو کر بے یار وغمگسار فوت ہوئے۔"[۸]

سر ولیم سلی مَین نے اپنے سفرنامہ میں مرزا کی نسبت دوستانہ رنگ میں کچھ لکھا ہے - اس کو پڑھ کر بے اختیار غالبؔ مرحوم کا ایک شعر یاد آ جاتا ہے:

بہ من چنداں گنہ از بدگمانی می کند نسبت
کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

وہ ذاتی شناسائی اور مشاہدۂ حال کے مدعی ہیں، اس لئے مجھے اُن کی تحریر کے نقل کر دینے سے چارہ نہیں - اس سے دہلی کے سنگین خطیرے کی تعمیر کا صحیح سال اور انگریزوں کی نگاہ میں اس کی خوبی وشان کا بھی پتہ چل جائے گا -

"مرزا جہانگیر دہلی میں سنگ مرمر کے ایک روضہ میں دفن ہیں جس پر نہایت عمدہ نقاشی کی گئی ہے (ملاحظہ ہو نوٹ) مرزا جہانگیر، اکبر ثانی بادشاہ حال کے بیٹے تھے - مرزا جہانگیر کو میں الہ آباد سے اچھی طرح سے جانتا تھا - نیپال کی لڑائی کے ختم ہونے کے بعد اپنی رجمنٹ کے ساتھ میرا قیام الہ آباد میں رہا تھا - یہ ۱۸۱۶ء کی بات ہے - ان کو ہاف مَین کی چیری برانڈی (Hoffmann Cherry brandy) کا بحد شوق تھا اور جلد سے جلد اپنے کو اس کے نشہ میں ختم کر رہے تھے - مجھ سے کہنے لگے کہ "صرف یہی تو ایک شراب ہے جو واقعی تم انگریزوں کے یہاں پینے کے قابل ہے اور اس میں صرف ایک ہی عیب ہے کہ انسان اس کو جلد سے جلد پی جاتا ہے"

۱؎ مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۰ - بیلیس ڈکشنری، صفحہ ۱۲۸

۲؎ جلد دوم، صفحہ ۱۲۷ نوٹ - مگر یہ ختم تعمیر مقبرہ کا سال معلوم ہوتا ہے، مطابق ۱۲۴۸ھ

۳؎ جن کے حالات میں سر سیّد نے سیرت فریدیہ لکھی ہے، مطبوعہ مفید عام آگرہ - خواجہ صاحب بڑے محقق ومصنف گزرے ہیں فن پیکار سازی پر فارسی میں ایک عالمانہ رسالہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار یادگار چھوڑا تھا - ۴؎ مفتاح صفحہ ۲۰ - ۵؎ آثار الصنادید، صفحہ ۴۰ ۶؎ صفحہ ۵۵

۷؎ رسالہ شاہکار، لاہور، اکتوبر ۳۵ء صفحہ ۱۸

۸؎ تالیف ۱۸۴۰ء - صفحہ ۲۷۶ قلمی، کتاب خانہ صمدنی -

وہ اپنا لطف قائم رکھنے کے لئے ہر گھنٹہ ایک بڑا گلاس پی لیتے تھے، یہاں تک کہ سرشار و مدہوش رہتے - اِس اثنا میں باجا بجانے والوں اور ناچنے والیوں کے دو تین طائفے اُن کے لطف و تفریح کے لئے باری باری مشغول خدمت رہتے تھے - مرزا کی موت جلد آ گئی - اُن کی ماں بادشاہ بیگم، جن کو معمر بادشاہ بہت محبوب رکھتا تھا، بادشاہ کو یہ یقین دلاتی رہیں کہ انگریزوں کا برتاؤ اُس کے ساتھ اچھا نہ تھا - وہ رنج و آہ کرتے کرتے رخصت ہو گیا - انگریز اس کو دہلی میں نہیں رہنے دیتے تھے کیونکہ وہ برابر اسی فکر و تدبیر میں لگا رہتا تھا کہ اپنے بڑے بھائی شاہزادہ ولی عہد کو مروا ڈالے - وہ رعایا میں شورشیں برپا کرنے کی کوششیں کیا کرتا تھا - وہ الہ آباد میں اسیر و حبس کی حالت میں نہ تھا - صرف اُس کو دہلی واپس جانے کی ممانعت تھی - اُس کا مکان شاندار تھا - آمدنی معقول تھی اور اُس کے مرتبہ و شان کے مطابق تمام اعزاز برقرار تھے -"

لفٹینینٹ ہار کورٹ اپنی تاریخ کے صفحہ ۱۰۹ میں صحیح لکھتے ہیں کہ یہ قبر دستکاری کا ایک بے مثل، صد درجہ کا مکمل، نمونہ ہے - خود قبر زمین سے کئی فیٹ بلندی پر ہے - اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں - اس کے گرد نہایت خوبصورت تراشا ہوا سنگ مرمر کا پردہ (حظیرہ) ہے - تابوت پر اعلےٰ درجہ کی دستکاری کی گئی ہے - پھول پتے سنگ مرمر کے بنے ہوئے اس کو اپنے اندر ڈھانپے ہوئے ہیں - قبر ۱۸۳۲ء میں تیار ہوئی تھی"۔[1]

راجہ درگا پرشاد نے گلستان ہند میں مرزا جہانگیر کے ذاتی حالات اور بعض واقعات، تحریرات بالا کے سوا لکھے ہیں اس لئے اُن کا اعادہ ضروری نظر آتا ہے -

شاہ عالم کی وفات بہ تاریخ ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھے، تو حسب معمول فرامین جاری کئے - عہدے تقسیم فرمائے - خلعتیں دیں - صاحب رزیڈنٹ بہادر کو ناظم الدولہ دوستدار خاں شہامت جنگ صوبہ دار دہلی و مدار المہام مقدمات مالی و ملکی و خالصہ، کا خطاب ملا - مرزا ابو ظفر فرزند اکبر کو حسب تجویز رزیڈنٹ صاحب ولی عہدی میں لیا - سید وصی الدین خاں کو خطاب سیف الدولہ اور وکالت رزیڈنٹی پر ممتاز کیا - لیکن بادشاہ کا تعلق خاطر مرزا جہانگیر فرزند دوم کی طرف تھا - اور اس کی ماں سے پیشتر ہی اس امر خطیر کا وعدہ کر چکے تھے، اس لئے سب کے سب اس انتظام کی تغییر فکر میں ہوئے - راجہ جے سکھ رائے بقال تحفوں اور ہدیوں کے ساتھ مرزا ابو ظفر کی ولی عہدی کی تنسیخ اور مرزا جہانگیر کو بہ منصب جلیل دلانے کے لئے کلکتہ بھیجے گئے - مگر ناکامی ہوئی - رزیڈنٹ صاحب سے کدورت پیدا کر لی - اسی زمانہ میں ایک روز بادشاہ نشاط و تفریح کے لئے شکار کھیلنے کوٹلہ فیروز شاہ کی طرف تشریف لے گئے تھے کہ رزیڈنٹ صاحب نے چند ضرب توپ در دولت پر حاضر کیں، تاکہ بادشاہ کی واپسی پر مراتب سلامی بجا لائیں - ان بے عقلوں نے توہمات گوناگوں پیدا کر لئے اور کچھ اور معنی لگائے - بادشاہ کو خبر کی گئی - تلاطم عظیم پڑ گیا اور اردوئے بادشاہی میں قیامت برپا ہو گئی - رزیڈنٹ صاحب نے انواع استمالت و اظہار امور اطاعت سے بادشاہ کو مطمئن کر کے قلعہ میں پہنچا دیا - اس روز سے قطعی ممانعت ہو گئی کہ بادشاہ قلعہ سے باہر کبھی نہ نکلنے پائیں - مقربان خدمت کی نافہمی اور بادشاہ وقت کی سادہ لوحی سے یہ صورت بھی باقی نہ رہی - یہ کدورت ابھی دلوں سے رفع نہیں ہونے پائی تھی کہ تازہ گل کھلا - مرزا جہانگیر کثرت شراب سے ہر وقت مخمور رہتے تھے میخواری کی زیادتی سے بڑی بدنامی ہو رہی تھی - رزیڈنٹ نے خیر اندیشی نیز انسداد باب فساد کے لئے ترک مے خواری کا انتظام جس جس طور سے مناسب تھا، کیا لیکن جہانگیر مرزا تو بادۂ گل رنگ کے دلدادہ اور ہوائے دختر رز کے ہاں باختہ تھے، اس سد باب سے مغموم و مکدر ہو گئے - رزیڈنٹ صاحب سے انتقام لینے کے لئے کمین گاہ میں بیٹھے - ایک روز صبح کو رزیڈنٹ صاحب ہوا خوری نیز ملاحظہ امور ضروری کے لئے تن تنہا سیر کرتے ہوئے قلعہ میں آ نکلے تو مرزا نے بے اختیار . . . . اُن پر طپنچہ سر کیا - ان کا نشانہ غلط پڑا - رزیڈنٹ صاحب بھاگ کر رزیڈنسی میں چلے آئے - اپنی فوج جمع کر کے قلعہ کے اندر گئے اور زد و داشت اور گیر و دار شروع کی - نواب شاہ نواز خاں جو امور خانگی کے مختار کل تھے، امیر الدولہ سلطان تھا، جلدی سے رزیڈنٹ صاحب کے پاس پہنچے - اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ کیا غلام قادر خاں پھر زندہ ہو گیا ہے؟ خدا کے لئے رحم فرمایئے - رزیڈنٹ صاحب نے فرمایا کہ جب تک جہانگیر مرزا ہاتھ نہ آ جائے گا - ہاتھ سے کام اور کام سے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا - شاہ نواز خاں نے مرزا کو لے جا کر رزیڈنٹ صاحب کے سپرد کر دیا - تو وہ فتنہ و فساد بند ہوا - امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی - جہانگیر مرزا محبوس کر کے الہ آباد بھیج دیئے گئے - کچھ دن بعد بادشاہ نے رزیڈنٹ سے صفائی کر کے اپنے پر مہربان کر لیا - ایک لاکھ روپیہ ماہوار مواجب مقرر ہوا - جہانگیر مرزا نے بھی قید سے رہائی پائی اور حضور شاہی میں پہنچ گئے -

مرزا کو سیر و شکار کی ہوا سر میں سمائی، اودھ جانے کی رخصت مانگی - اجازت ملی اور رزیڈنٹ کی عنایت سے بڑے شکوہ اور جلوس کے ساتھ اودھ پہنچے - نواب سعادت علیخاں فرمانروائے اودھ مراسم مہمانداری اور مراتب اطاعت و فرماں گزاری بجا لائے - اظہار اخلاص کیا - لیکن مرزا کے اطوار اچھے نہ تھے - ہنجار درست نہ تھا - عشرت پسند ندیموں اور کم فطرت مصاحبوں کی صحبت میں

[1] جلد دوم - صفحہ ۱۶۷

بُرے بُرے کام کرگزرتے تھے - اپنی وقعت اور خاندان شاہی کی عزت برباد کردی - اکثر اوقات عصمت سرشت پردہ نشینوں کو گھر سے زبردستی باہر کھینچ لاتے - بے حُرمتی کرتے، اُن کی عصمت وعفت اور اپنے علو منزلت میں داغ لگاتے تھے - جبر و تعدی سے طلب کرکے رنڈیوں سے وہ سب کچھ کرڈالتے جو اُن کو نہ کرنا چاہیئے تھا - اِس لئے نواب سعادت علیخاں کی استدعا پر ان کا اخراج لکھنؤ سے ہوا - الہ آباد میں قیام قرار پایا،[1] اُس وقت کے خسرو باغ میں -

وہ تفرج گاہ، وہ ہمسایۂ خلد بریں
گل بداماں، گُل فشاں، گل ریز، گلشن آفریں

خواجہ حسن نظامی دہلوی فرماتے ہیں کہ مرزا جہانگیر نہایت حسین جوان تھے مگر شراب پیتے تھے - 'متوالا' ان کا لقب ہوگیا تھا - ان کی اور بیویوں اور حرموں کا حال کہیں نظر سے نہیں گزرا - البتہ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ایک محبوبہ بیگم حسینی بیگم نام تھیں - ان سے اور بہادر شاہ سے دو مشہور باغوں کی نسبت تنازع تھا - بیگم نے دہلی کی دیوانی عدالت میں دعویٰ کرکے کامیابی حاصل کی - آگرہ کی صدر عدالت سے اپیل میں فیصلہ بحال رہا - حسینی بیگم نے دوسرا نکاح شاہزادہ مرزا جمیا سے کرلیا تھا - اور سنہ ستاون کی بغاوت سے پہلے مرگئی تھیں - حسینی بیگم کی ایک لڑکی مرزا جہانگیر سے تھیں - حسن آرا بیگم نام تھا - اور واقعی حسینہ و حسن آرا تھیں - زندگی بھر معقول پنشن سرکار سے پاتی رہیں - شوہر نے بالزام بغاوت پھانسی پائی - بیگم نے مرنے والے کی یاد میں جل جل کر باقی عمر بیوگی میں کاٹ دی[2]

اب وہ روائتیں مرقوم ہوں گی جو ثقہ اور قابل استناد بزرگوں سے سُنی ہیں -

بابر سے لے کر بہادر شاہ تک تمام مغل شہنشاہ اپنا روزنامچہ رکھتے تھے، جس میں اپنے اور اپنی حکومت کے واقعات قلمبند کرتے اور محفوظ رکھتے جاتے تھے - بابر اور جہانگیر کے تزک مطبوع و عام ہیں ترجمے بھی عام ہوچکے ہیں - اکبر شاہ ثانی کا قلمی روزنامچہ دہلی کے لال قلعہ کے میوزیم میں موجود ہے - اور اس میں بھی بہت سے حالات مرزا جہانگیر کے مندرج ہیں - بہادر شاہ کا روزنامچہ خواجہ حسن نظامی کی توجہ سے چھپ چکا ہے - مرزا جہانگیر کا روزنامچہ بھی الہ آباد تک رہا تھا - جس میں اُن کے اس عالم اسیری اور اُن کے متوسلین کے واقعات روزانہ لکھے جاتے تھے - کسی وقت اس کے بعض دلچسپ و پُر لطف حصے میرے محترم بزرگ مولانا حاجی سید محمد سعید صاحب کے متروکات آبائی میں موجود تھے - راقم احوال ان کے لئے نگاہ التفات کا برسوں متوقع رہا تھا - لیکن آخر کار میری حرماں نصیبی ان کی دستیابی میں مانع آئی -

واہ رے ہمت کرم! آتشِ شوق پھونک کر
مَیں نے کہا خطا ہوئی، دل نے کہا معاف ہے

موصوف کو اس میں کی بعض باتیں یاد ہیں - جن سے معلوم ہوتا ہے - کہ مرزا کی سرکار میں نجومیوں اور جوتشیوں کی بھی بڑی پُرسش و قدر تھی - اور اُن کی صوابدید و تلقین پر عمل ہوتا تھا - سنیچر کے دن تیل، کالی ماش اور لوہا خیرات کیا جاتا تھا - یوں بھی خسرو باغ میں داد و دہش اور خیر خیرات کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا -

باوجودیکہ یہاں کے قیام کا زمانہ دس گیارہ سال سے متجاوز نہیں ہوا، اطراف الہ آباد میں بعض مستقل باتیں اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے -

عید کے دوسرے دن موضع مرزا وارہ میں "ٹڑ" کا میلہ منایا جاتا تھا - اطراف و جوانب کے شرفا و رؤسا جوق جوق آتے اور لطف و محبت سے باہم ملتے تھے - خود شاہزادہ بھی اُن کی بزم سُرور و سرور میں شریک ہوتا - میلے کی رونق اور چہل پہل روز افزوں ہوتی جاتی تھی - مرزا کے انتقال کے بعد بھی کچھ مدت تک یہ اجتماع باقی و جاری رہا - لیکن وہ کیفیت و جمعیت نہیں تھی -

موضع لسوناں (پرگنہ چاپل) کے اُتر سمت ایک موضع ڈاہی ہے جہاں ان دنوں تنبولیوں کی آبادی ہے - تعلقہ داران اسراوے کلاں کی ملک ہے - اس کے شمال جانب ایک باغ ہے - جس کی چار دیواری اور دکھن طرف کا پھاٹک بالکل مغلیہ طرز تعمیر کا نہایت شاندار تھا - کہا جاتا ہے کہ زمانہ قیام الہ آباد یعنی اپنی شاہزادگی میں شہنشاہ جہانگیر یہاں ٹھہر کر شکار کھیلا کرتا تھا - وسط باغ میں ایک گنبددار عمارت بھی اُس طرز کی تھی جیسی اہل دولت وسط ایشیا میں بنایا کرتے تھے - آس پاس میدان ہے اور آبادی کے ٹیلے سے ملحق، دکن کو، ایک طویل و عریض جھیل جو مقامی طور پر تال سے معروف ہے - پانچ چھ پشت بعد مرزا جہانگیر یہاں پہنچے اور اپنے ہمنام سلف، کی یادگار کو از سر نو آباد کیا - تازہ رونق دی - اپنا شکارگاہ بنایا - اس وسیع میدان یا رمنہ میں ہرن اور جنگلی جانور رہتے تھے - باقیات میں وہ تمرغہ یا اُس کے آثار ابھی قائم ہیں، جن کا عام طور پر ان اطراف کے باشندے اور دہقان حوالہ یا نشان دیتے ہیں - مرزا جہانگیر یہاں اپنے خیمہ و خرگاہ کے ساتھ تشریف لاتے اور قیام و تفریح فرماتے تھے - ان کی شہسواری و چابکدستی کے متعلق اب تک بہت سی باتیں زبانوں پر ہیں - ممکن ہے کہ

---

[1] گلستان ہند، دفتر دوم، صفحات ۲۷۳ لغایت ۲۷۵

[2] رسالہ شاہکار لاہور، اکتوبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۸ خواجہ صاحب نے انہیں حالات کا اعادہ اپنے گرامی نامہ میں بھی فرمایا ہے -

آپ ان کو افسانہ سمجھیں ۔ مَیں کہوں گا کہ تذکروں میں اس قسم کی داستانوں اور قصّوں کے سوا ہوتا ہی کیا ہے ۔ کوئی مدعیِ دانش و ادراک تو ان کو باور ہی نہیں کرتا، اور کوئی سادہ دل حُسنِ عقیدت کی ڈالی نذر لاتا ہے ۔ نیاز پرستاری پیش کرتا ہے ۔ بہرکیف، مَیں تو ان روایات یا تاریخی حکایات کو اس اندیشہ سے حوالۂ قلم کر رہا ہوں کہ جس طرح لکھے ہوئے واقعات کا بتانے والا (مرزا کارروز نامچہ) ضائع یا غائب یا کم سے کم ہماری دسترس سے دُور ہو گیا ہے کسی دن ان احوال و اقوال زبانی کا سنانے والا بھی صفحۂ دہر سے ناپید ہو جائے گا

خلش اے خارِ جنوں کوئی نہ باقی رکھنا
پھر نہ آئے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

کہتے ہیں کہ مرزا جہانگیر گھوڑے پر سوار ہو کر کوڑے کی ایک ہی ضرب سے گوزن و آہو کو گرا دیتے تھے ۔ ان کے شکار کو جانے اور وہاں پہنچنے کا غلغلہ جب بلند ہوتا تو دُور و دراز مواضع سے لوگ سیر و تفریح کے لئے آتے اور دُور دُور کنارے کنارے بیٹھ کر تماشا دیکھتے تھے۔

ان کے گھوڑے کی سواری کی نسبت عجیب و غریب قصّے سننے میں آتے ہیں ۔ خسرو باغ کی بلند دیواریں پھندا کر گھوڑا دوسری طرف کُودا لاتے تھے ۔ سڑک اعظم پر جس وقت سواری نکلتی ہو اور بھوسہ، چارہ وغیرہ کی لدی ہوئی بیل گاڑیاں گزر رہی ہوں جو خوب بھری ہوئی اور اونچی ہوتی ہیں تو حکم تھا کہ راہ سے گاڑیاں ہٹائی نہ جائیں بلکہ تھوڑا تھوڑا فاصلہ دے کر کھڑی ہو جائیں ۔ مرزا اپنے مرکبِ باد رفتار پر سوار ان گاڑیوں کے اوپر سے گھوڑا کُداتے پھُندتے نکل جاتے تھے ۔

شاہانہ فیاضی اور مہمان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی تنہا نہیں کھاتے تھے ۔ صلائے کرم عام تھی اور خوانِ نعما وسیع ۔ ہمراہی و تماشائی خواہ کسی مرتبہ و حیثیت کے اور کسی تعداد میں ہوں سب کو وہی کھانا پہنچتا تھا ۔ جو شاہزادہ کے سامنے رکھا جاتا تھا ۔ مرزا اُس وقت تک خاصہ تناول نہیں فرماتے تھے جب تک یہ اطلاع نہیں مِل جاتی تھی کہ ہر رفیق و متنفس کو کھانا پہنچ گیا ہے۔ اگر اُس وقت شاہی دسترخوان پر کھچڑی ہو گی تو وہی چیز اُسی اہتمام و تکلّف کی ہر ایک کو پیش کی جائے گی ۔

شاہزادہ کی ہیبت و جبروت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے دل گُردے والے ڈرتے اور گھبراتے تھے ۔ ایک روز کوئی انگریز شہزادہ کی اطلاع و اجازت بغیر اسی شکار گاہ میں شکار کھیلنے چلا آیا ۔ دریائے جمن کے کنارے اپنا خیمہ نصب کرایا ۔ کوئی شریف زمیندار اتفاقاً اُدھر سے گزرا تو صاحب کو اُس کا آنا ناگوار ہوا ۔ اُس کو پکڑوا کر خیمہ کی طنابوں اور میخوں سے بندھوا دیا ۔ اِدھر سزا دینے کے لئے ہنٹر لانے کو خیمہ کے اندر گئے، اُدھر شاہزادہ کے جلوس کے نقارہ پر چوب پڑی ۔ (شاہی آداب و آئین کے مطابق ان کے آگے آگے اونٹ پر نقارہ چلتا اور زور زور سے بجایا جاتا تھا) صاحب توفی العوزر بہ نفسِ نفیس جمنا کی طرف رواں ہو گئے اور ملازمان خدمت و ہمراہیان کو حکم دے گئے کہ خیمہ ابھی توڑ کر گھسیٹ لاؤ ۔ اور دریا کنارے پہنچاؤ ۔ اتنا وقت نہیں ہے نہ فرصت کہ تہہ کر کے اٹھایا جائے ۔

پُر تکلف و خوش رنگ لباس کے دلدادہ تھے ۔ ایک رنگریز مزاج شناس تھا، جو انعامات و بخشش سے مالا مال رہتا تھا ۔ فرمائش ہوتی تھی کہ ایسا کپڑا رنگ لاؤ ۔ جو بظاہر سفید ہو لیکن اگر اتنی تہیں کر دی جائیں تو فلاں رنگ پیدا ہو، اور اتنی تہیں ہوں تو فلاں رنگ معلوم ہوں ۔ یہ ہنرمند اگر پسند کے قابل چیز تیار کر سکا تو اُس کی قدردانی، زربخشی و زرپاشی کا کیا ٹھکانا ہوتا، ورنہ خلاف مرضی ہونے پر اتنی ہی قمچیاں عنایت ہوتی تھیں ۔

الٰہ آباد والوں نے شاہزادے کے مرنے کا بڑا ماتم کیا اور رنج و اندوہ کے ساتھ تاریخیں کہی تھیں ۔ اویماق مغل اور مفتاح التواریخ سے چند قطعے نقل کئے جاتے ہیں ۔

(۱)

چوں جہاندار ابن اکبر بادشاہ — در جہاں با دانش و با داد گشت
از قدوم آں دُرِ بحرِ کرم — رونقِ شہرِ الٰہ آباد گشت
آں چناں بنہاد خوانِ فیض را — ہر یک از فکرِ معاش آزاد گشت
چوں زسی یک سال عمرش شد فزوں — طبعِ او از زندگی ناشاد گشت
خیمہ زد در منزلِ جنّت سرا — ایں چہ از دورِ فلک بیداد گشت
عالمے شد در غمش چنداں اسیر — نامِ شادی از جہاں برباد گشت
ابر آمد در عزا گریہ کناں — بر فلک ہم ماتمے ایجاد گشت
از پے تاریخِ فوت اُو دلم — ہر طرف با نالہ و فریاد گشت
شد عیاں ایں مصرع از ترکیبِ آہ — حیف بے رونق الٰہ آباد گشت

۱۲۲۰ = ۱۲۳۶ھ

(۲)

چوں از جہاں برفت جہانگیر میرزا — نورِ نگاہِ اکبرِ دسالار دوسرا
شد خانہ عزا ز غمش دارِ سلطنت — محزوں شد از وفات وے آں ظلِ کبریا
تاریخِ فوتِ او بظہور آمد چنیں — از کانِ شاہ رفت زہے لعلِ بے بہا

۱۲۳۷

(۳)

جہانگیر شہزادہ چوں از جہاں — بشہزادگی دل بہ بر داشتہ
بسطحِ فنا اشہبِ عزم راند — بگلگشتِ جنت عناں تاختہ

چہ شورِ قیامت فغاں زِ غمش　　بروئے زماں آہ برخاستہ
بہ ہاتف بگفتم کہ کلکِ سعید　　چہ تاریخ فوتش رقم ساختہ
بدیں گونہ گفتہ کہ بے پائے صید　　بملکِ بقا سلطنت یافتہ
۴　　۱۲۴۰
　　-۴
　　۱۲۳۶

(۴)

از گردشِ چرخِ ستم ایجاد چرا شد　　کان فخر زمانی
افسوس کہ عازم سوئے فردوس سرا شد　　در عینِ جوانی
تاریخ وے از کلکِ قضا منشیِ تقدیر　　بر لوحۂ محفوظ
بنوشت " جہانگیر جہاندار بقا شد　　از منزلِ فانی
۹۶۰　　۱۲۳۶ = ۲۷۶

مرزا جہانگیر کا عارضی مدفن خسرو باغ میں ایک چبوترہ کی شکل میں ہنوز محفوظ و موجود ہے - چار گز دو فٹ لمبا ساڑھے تین گز چوڑا، کچھ کم ایک بالشت اونچا - اس پر ایک مختصر سا نشانِ تعویذ بھی ہے - یہی چبوترہ عوام الناس میں " خسرو کے گھوڑے کی قبر" کے نام سے شہرت رکھتا ہے - اس شہرت و نام کے بارہ میں کوئی تحریر یا سند نہیں ملتی -

یہ تسلیم ہے کہ کسی زمانہ میں مانوس و محبوب جانوروں کی یادگاریں بنا دینا ایشیا کے اہلِ دولت و مقدرت کا شیوہ تھا - ہندو اور مسلمان دونوں کی متعدد مثالیں پیشِ نظر ہیں - چند پر قناعت کروں گا -

اودے پور میواڑ کے رانا پرتاب کا نام کس نے سنا نہ ہو، جس نے اکبر کے دل بادل لشکر کا مقابلہ بڑی شجاعت و دلاوری سے کیا تھا - چیتک نام گھوڑا اس کے زیرِ ران تھا - شکست کھائی تو اسی پر بھاگا - مغلوں نے پیچھا کیا - چیتک گھایل تھا اور ایک ندی حائل - پھر بھی بے جھجک ہرن کی طرح چاروں تیدیاں جھاڑ کر پانی پر سے اڑ گیا - شام ہو گئی تھی - اس کے نعل پتھروں پر پڑتے ، ٹکراتے اور چنگاریاں اڑاتے چلے جاتے تھے - ایک موقع پر پہنچ کر چیتک بیدم ہو کر ہمیشہ کے لئے رہ گیا - وہاں اس کی یادگار میں ایک عمارت بنوائی گئی - اودے پور کی آبادی میں آدھے گھر ایسے ہوں گے جن کی دیواروں پر یہ تصویریں کھنچی ہیں۔[۱]

مولوی سعید احمد مارہروی تاریخ آگرہ[۲] میں لکھتے ہیں:-

" مغلوں اور ان کے امرا کو مقابر کی تعمیر کا شوق اس درجہ تھا کہ انسان تو انسان گھوڑوں، کتوں اور ہرنوں وغیرہ حیوانات کی یادگاریں بڑی بڑی عمارات یا مورتیں اس ملک میں تعمیر کی گئیں - چنانچہ آگرہ میں اکبر بادشاہ کے ایک وفادار کتے کا عالی شان مقبرہ باہتمام دربار خان تعمیر کیا گیا تھا - دربار خاں بھی اپنی وصیت کے بموجب اسی مقبرہ میں دفن ہوا -"

میر غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام[۵] میں تحریر فرماتے ہیں کہ سید محب اللہ بلگرامی شاہزادہ محمد اعظم کے متوسل و معتمد منصب دار تھے - شاہزادہ جب اوجین کا صوبہ دار مقرر ہوا تو میر بھی اوجین چلے گئے اور وہیں رہتے تھے - ایک مرتبہ فوج سے الگ ہو گئے اور سرائے سیسی[۲] کے قریب پہنچے - سرائے کے دروازہ کے سامنے سایہ دار درختوں کے نیچے گھوڑے سے اترے - زین پوش بچھا کر بیٹھے، وردی اتار دی، سفید لباس پہنا، شربت پیا، تلاوت میں مشغول ہوئے - پھر چادر اوڑھ کر لیٹے اور دنیا سے رخصت ہو گئے - وہاں کے حاکم نے قبر مع چبوترہ اینٹ اور گچ سے پختہ بنوا دی - ان کے گھوڑے نے بھی دانہ گھانس چھوڑ دیا تھا - رات دن آنکھوں سے آنسو جاری تھے - لوگوں سے اس بے زبان غمگسار کی حالتِ زار دیکھی نہ گئی - تو گھوڑے کو ذبح کر کے ان کے مزار کے پائیں دفن کر دیا - گھوڑے کی قبر مربع پختہ و مضبوط تعمیر کرائی گئی تھی - دستور کے مطابق ساتھ ساتھ کنواں بھی بنا دیا گیا تھا[۳]۔

شاہزادہ خسرو کے مرنے کے بعد اس کے کسی گھوڑے کے الہ آباد پہنچنے اور دفن ہونے کا پتہ نہیں چلتا ہے - اوراقِ تاریخ اس بارہ میں یکسر خاموش ہیں - جب حرماں نصیب شاہزادے کا درد رس و غمگسار کوئی نہ تھا تو اس کے کسی بے زبان رفیق کا پرسانِ حال کون ہوتا اور کیوں اتنا اہتمام کرتا - پھر بادشاہ زادہ (خسرو) کی قبر ہی کے پاس ہی، اس نزہت گاہ سلطانی میں، جہاں شاہزادوں امرا اور بیگمات کی آمد و رفت بلکہ سکونت بھی رہتی تھی، کسی حیوان کا دفن کیا جانا قیاس سے بعید اور شاہانہ اداب و شان سے دور ہے - رنگینیٔ خیال کو رعنائی کیجئے - خسرو کا توسنِ راہوار اگر یہاں دفن ہوتا تو اس پر تمام عمارت، شاہانہ اہتمام و حوصلہ کے ساتھ سنگین و مرمریں، جہانگیری عمارات کے نمونہ پر بنائی جاتی گنبد بھی اسی رفعت و شان کا تیار کیا جاتا جس پر قدامت و کہنہ سالی خود بخود نثار ہوتی - آج یہ اینٹ چونے کا معمولی چبوترہ بہ اول نظر کہہ دیتا ہے کہ وہ کوئی پرانی چیز یا نشانی پیش نہیں کر سکتا -

(سید مقبول احمد صمدنی)

---

[۱] اوسیاق مغل، مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۱

[۲] دربار اکبری، صفحہ ۵۴۸　[۳] صفحہ ۸

پہلی عید

ایک افسانہ ← تین مصنّف

(۱)

"عشق و محبّت، لطف و مسرّت، شباب و شعریت، شراب اور عورت، سب گناہ۔ سرود و نغمہ، حُسن و رنگ، بیخودی و سرمستی، سب جُرم و معاصی۔ دُنیا کی تمام مسرّتیں، عیش و آرام، لطف اور رنگینیاں سب خطا۔ اور تمام پابندیاں، گوشہ نشینیاں اور خاموشیاں، ثواب.... خوب! کتنے دلچسپ ارشادات ہیں، انسانی مسرّتوں کو کس کس رنگ میں پابند کیا گیا ہے، شباب کی رنگینیوں کو کیسے قید خانوں میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ داڑھی ثواب، لمبا چغہ اور تسبیح ثواب، فقر و فاقہ ثواب، بیڑ ثواب، بلکہ مسجد کے کوزے ثواب اور پھر کس مقصد کے لئے؟ حُور و غلمان کے لئے، کوثر و تسنیم کے لئے، طوبیٰ و سلسبیل کے لئے، محلات اور نہروں کے لئے۔ واللہ خدا بھی ان ہوس پرستوں کی فطرت سے کتنا واقف تھا، اور ان کی للچائی ہوئی سرشتوں کا اسے کتنا اندازہ تھا۔ دُنیا کی تمام نکہتوں کو بند کر کے وعدۂ فردا پر ٹالا۔ حُسن جب اپنی تمام رعنائیوں اور مستیوں کے ساتھ سامنے کھڑا خمار آلود نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہا ہو، شباب جب اپنے پورے جوش سے ایک انگڑائی میں غرق ہو کر رہ گیا ہو تو کیا اس سے بہتر حور رضوان کے قید خانے میں مل سکتی ہے؟ اس سے بڑھ کر نظر نوازی کا منظر بہشت کی حسین سے حسین حُور پیش کر سکتی ہے؟ جس میں ان ستم کیش و نشتر بدار اداؤں کی بجائے فرمانبرداری کی اتنی زیادتی ہوگی کہ وہ ایک حکم پر چلنے والے سپاہی سے زیادہ جاذبیت نہیں رکھتی۔"

یہ تھے میرے خیالات، شباب کی سرکشی اور بے لگامی کے وہ جذبات جو اس عمر میں عموماً حملہ کرتے ہیں، مجھ پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے، جوانی، عیش، نغمہ، شراب اور پھر عورت، یہ سب کچھ مل کر وہ آگ پیدا کرتے ہیں کہ جس کے بجھتے بجھتے گھر بکسر خاکستر ہو چکا ہوتا ہے، ماضی و مستقبل شباب کے لئے ایک لغو چیز ہیں۔ وہ صرف حال کی سرمست گھڑیوں میں کیفِ برنائی کا متلاشی ہے۔

میرا دل، دماغ، جسم اور رُوح سب بغاوت پر آمادہ تھے، میں چاہتا تھا کہ میری زندگی سکرِ دوام کی صورت میں تبدیل ہو جائے۔ رات کی تاریکیاں بھی ایک نئی مدہوشی کا پیغام بن کر چھا جائیں، دن کی روشنیاں نغمہ کی ایک لَے میں گُم ہو جائیں۔ حُسن اور حُسن کی تمام نزاکتیں، شراب اور شراب کی تمام مدہوشیاں ایک دوامی رقص کی صورت میں میرے دماغ پر مسلّط ہو جائیں زندگی کی تمام لطافتیں جمع ہو کر ایک شراب کا عصیاں آلودہ خمستان بن جائیں۔ جس کے ہر جام پر میں .... نئے نئے راگ گاتا جاؤں عورت کی تخلیق کا واحد مقصد میرے نزدیک یہ تھا کہ وہ مرد سے محبّت کرے، وہ حُسن و شعریت کا مکمّل نمونہ ہو، وہ ایسی موسیقی ہو جو آنکھوں سے سنی جائے اور ایسی حلاوت ہو جو ہاتھوں سے چکھی جائے۔

یہی میری زندگی تھی اور اسی کو مقصدِ حیات سمجھے ہوئے تھا۔ دوستوں کے مجمع میں بلند بانگ قہقہے فردوس گوش تھے۔ رات کو حُسن کے بازار میں جہاں عزّت لٹائی جاتی تھی اور عصمت فروخت ہوتی تھی میرا معبد خانہ تھا۔

قوسِ قزح کی رنگینیاں، چاند کی سیم افشانیاں، پھولوں کی نکہتیں، بہار کی طلعتیں، بلبل کی نوا پیرائی، غرض وہ تمام حسن جو فطرت ہمارے سامنے پیش کرتی ہے میرے لئے بے وقعت تھا۔ مجھے حسن کی تلاش تھی مگر کہاں؟ زرق برق کپڑوں میں، رنگین ساڑھیوں میں، سیاہ آنکھوں اور گھنگریالے بالوں میں، گفتگو کی نزاکتوں اور آواز کے لوچ میں اور نسائیت کی ہر ادا میں

ظفرالحق خالد قریشی

(۲)

آج زہرہ کے ہاں رات بسر کرنے کا ارادہ تھا اور اس نشاط انگیز وقت کے تصوّر میں جب میں زہرہ کے پہلو میں بیٹھ کر اس کی نازک انگلیوں سے کھیلوں گا اور وہ مجھے دھیمے سروں میں شعر سنائے گی، مست اور بیخود ہوا جاتا تھا۔ میرے تمام خیالات سمٹ کر زہرہ کے

خلوت کدہ کی تصویریں بن چکے تھے۔ میرے دماغ کی تمام قوتیں زہرہ کے متبسم لبوں کی شکل میں منتقل ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں تنگ و تاریک گلیوں میں سے ہوتا ہوا جا رہا تھا۔ میں ان گلیوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ باوجود سخت اندھیرے کے میرے پاؤں خود بخود درست راہ پر جا رہے تھے۔ یہ شہر کا غریب ترین محلّہ تھا جس کی راہیں حُسن کے خریداروں کی پردہ پوشی کا .... بہترین ذریعہ تھیں۔

دولت کے نشے میں، زور و طاقت کے غرور میں عشق آہ! عشق نہیں بلکہ ہوس پرستی کے شوق میں، شراب کی مدہوشی میں، اس آبادی پر حقارت آمیز نگاہیں ڈالتا ہوا جا رہا تھا۔ میری جیبیں روپوں اور نوٹوں سے پُر تھیں اور میرے خیالات فرعونیت کی اس فضا میں پرواز کر رہے تھے جہاں خدا سے بغاوت شروع ہوتی ہے۔ میں خدا کو صرف اس لئے مانتا تھا کہ وہ ایک حسین عورت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایک خاک کے پتلے کا پارہ اور نُور کی آمیزش سے ایک لطیف ترین مجسمہ تیار کرتا ہے جو کبھی زہرہ بن کر اور کبھی گوہر کی شکل میں میرے پہلو کی زینت بنتا ہے۔ میں تیزی سے قدم اُٹھائے جا رہا تھا کہ عین موڑ پر جہاں گندی نالی کا پانی پھیل کر ایک تالاب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایک چھوٹے سے بچے سے ٹکر ہوئی جس کی بغل میں غالباً کپڑوں کی پوٹلی تھی میری ٹکر سے وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کے تمام کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو گئے۔ وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر اُٹھا اور پُر خوف نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے گرنے سے میرے پاجامے اور قیمتی بوٹوں پر چند چھینٹیں پڑ گئیں۔ اور میرے غصّے کا پارہ ایک سو دس ڈگری سے بھی اوپر چلا گیا، اور زور سے ایک چانٹا اس کے رسید کیا کہ بچارا لڑکھڑا گیا۔ اور روتا ہوا آہستہ آہستہ روانہ ہو گیا۔

اُف! انسان دولت اور طاقت کے غرور میں کتنا مست ہو جاتا ہے۔ اُسے اپنے زورِ بازو اور جوانی پر کتنا گھمنڈ ہوتا ہے۔ اسے اپنی عزت و شہرت پر کتنا ناز ہوتا ہے۔ قدرت کے قوانین کتنے عجیب ہیں۔ مزدور کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر سرمایہ دار عیش کرتے ہیں۔ کسان کے لہو پر زمیندار سونا بناتے ہیں۔ غریب کے لہو سے ہم عشرت کے محل تیار کرتے ہیں۔

مجھے اپنے کپڑوں پر چند چھینٹوں کا خیال تھا اور اپنے ولایتی بوٹوں کی صفائی پر دھبے پڑ جانے پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر اس کے تمام کپڑوں کی جو کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے۔ کوئی پرواہ نہ تھی۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ میں دولتمند تھا، امیر تھا۔ طاقت اور زور والا تھا۔ اور وہ بچارا معمولی غریب آدمی کا لڑکا تھا۔

میں زہرہ کے عشرت کدہ پر پہنچا۔ مجلس میرا انتظار کر رہی تھی، میری راہ کی روداد پر میری بلائیں لی گئیں۔ میری خاطرداری میں حُسن، اُف، صناعی سے قیامت بنتے ہوئے حُسن نے اپنی تمام ادائیں صَرف کر دیں۔ مگر کیوں؟ کیا اسے مجھ سے محبّت تھی؟ کیا اس کی روح کے ساتھ میرا کوئی حقیقی لگاؤ تھا؟ نہیں، بلکہ یہ سب میری دولت کی خاطر، میری جیب کے چند کاغذوں اور ذلیل زر کی بدولت۔

مرد شباب کی سرزمین میں قدم رکھنے کے بعد کتنا بیوقوف ہو جاتا ہے، اس کے دماغ میں کسقدر فرعونیت اور تکبّر و غرور بھر جاتے ہیں، اس کی رُوح پر کتنی طاغوتی طاقتیں مسلّط ہو جاتی ہیں، جب وہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح حسن و عشق اور محبّت و الفت کو بھی خریدنا چاہتا ہے۔ عشق، محبّت، الفت کیا خوش آئیند نام رکھ دئے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ہوس پرستی کے دوسرے نام ہیں۔ مرد کا عشق عورت کے آغوش میں آ جانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک جوش ہے، جو دودھ کے اُبال کی طرح عارضی اور دریا کی لہروں کی طرح ناپائدار ہوتا ہے۔ اس کی للچائی ہوئی نگاہیں ہر حسن کو عصیاں آلود کرنے پر تُلی رہتی ہیں۔ اس کی ہوسناک فطرت ہر مجسمۂ عفت و عصمت کو اپنے پہلو میں بٹھانے کی آرزومند رہتی ہے، اور ایک کو برباد کرنے کے بعد نئے شکار میں محو ہو جاتی ہے ؂

خواہش کا نام عشق نمائش کا نام حُسن

میں زہرہ کی صحبت سے لطف اندوز ہو کر واپس ہوا۔ میری جیبیں خالی تھیں۔ منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ آج میں وقت سے پہلے اُٹھ آیا تھا۔ خدا جانے کیوں۔ طبیعت میں ایک اضطراب تھا، بے چینی اور بے قراری تھی۔ میرے دوست گھر کے نزدیک تک میرے ہمراہ آئے اور پھر رخصت ہو کر چلے گئے۔ میں نے نوکر کو چار بجے صبح اُٹھ کر صدر دروازہ کھولنے کے لئے کہا تھا۔ اور اب میں پورے دو گھنٹے پہلے پہنچ گیا تھا۔ اس وقت بلانا ناممکن تھا، کچھ دیر سوچتا رہا کہ اب کیا کروں لیکن دماغ کام کرنے سے قاصر تھا۔ آخر زنانہ ڈیوڑھی کی طرف روانہ ہوا کہ شاید وہاں رسائی ہو جائے۔ آج چھ ماہ کے بعد میں اُدھر کا رُخ کر رہا تھا۔ نسیمہ جس کے حُسن کا شہرہ سُن کر میں نے شادی کی تھی۔ چھ ماہ سے اس کا مُنہ نہ دیکھا تھا، مگر مجھے اپنی غلطی یا قصور کا اعتراف تو کیا خیال تک نہ تھا۔ مرد ہمیشہ اپنی بیوی کو حسن و عشق کے احساسات اور محبّت و اُلفت کے جذبات سے یکسر عاری سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں

بیوی کا مقصد محض خانہ داری کا انتظام کرنا ہے - گھر کی دیکھ بھال اور بڑے چھوٹے کا خیال رکھنا ہے - میں بھی نسیمہ کے ذمّے یہی فرائض سمجھ چکا تھا - جنہیں وہ اس خوبی سے ادا کر رہی تھی کہ تلاش تجسس کے باوجود مجھے آج تک نقص نکالنے کا بہانہ نہ مل سکا - تمام اختیارات نسیمہ کے سپرد کر کے میں سمجھ چکا تھا کہ میں اپنے شوہری فرائض سے پورے طور پر سبکدوش ہو چکا ہوں ؛

چودھری احسان الحق بی۔ اے

(۳)

میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ زنانہ دروازہ کھلا ہوا ہے، شکوک وشبہات کے شعلہ انگیز خیالات میرے دماغ میں دوڑ گئے - "دروازہ اس وقت کس مقصد کے لئے کھلا ہے؟ اس کا کھلنا علّت سے خالی نہیں " میں نے دبے پاؤں اپنی بیوی کے کمرے کا رُخ کیا، بتی جل رہی تھی - کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا - سلیقہ سے سجا ہوا کمرہ بیرونی شیشوں میں سے پُرلطف منظر پیش کر رہا تھا - میں نے آہستہ سے کھڑکی سے لگ کر دیکھنا شروع کیا - اُف - ایک عجیب منظر تھا، ایک نرالا نقشہ تھا جسے یاد کر کے میں ہمیشہ کانپ اٹھتا ہوں -

دُنیا کے انقلاب اکثر ایک معمولی واقعہ سے شروع ہوتے ہیں اور ایک عظیم الشان صورت اختیار کر لیتے ہیں - نپولین کے ایک جرنیل کی صرف پانچ منٹ کی دیر سے واٹرلو کے میدانِ جنگ کی حالت بدل گئی، ایک شخص کے قتل سے سات سال تک بنی نوعِ انسان کا خون بہایا گیا - یہی نہیں بلکہ روزمرّہ کے مشاہدات ہی کو لے لیجئے، کوہ ہمالہ کی ایک چوٹی پر بارش ہو رہی ہے - جس کے ایک طرف کا پانی خلیج بنگال میں اور دوسری جانب کا بحیرۂ عرب میں جاتا ہے - بارش کا ایک قطرہ جسے مغرب کی طرف گرنا تھا ہوا کے ذرا سے جھونکے سے مشرق کی جانب گرتا ہے، مگر اس ذرا سی تبدیلی نے اس کی تمام زندگی بدل دی - اس کی زندگی کی تمام شاہراہیں اور نشیب و فراز بدل دئے - اب وہ وادیٔ سندھ کو سیراب کرنے کی بجائے گنگا کا مقدس پانی بن گیا - فطرتِ انسانی بھی اسی طرح بہت معمولی اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے بدل جاتی ہے، میری زندگی کی تبدیلی بھی اسی ایک رات کے عبرت آموز واقعات سے وابستہ تھی - واقعہ نہایت معمولی تھا اور اس سے پیشتر ہزاروں ایسے مواقع پیش آئے - مگر آج کی رات ایک مبارک رات تھی - میں نے دیکھا نسیمہ مصلّے پر بیٹھی دعا مانگ رہی ہے - مگر آنکھوں سے، اُف اُن آنکھوں سے جو جادو سے پُر تھیں جن میں لاکھوں دلوں کو شکار کر لینے کی طاقت پنہاں تھی، آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی - سیاہ پلکوں سے آنسو اس طرح گر رہے تھے جیسے آسمان سے موتی - روشنی کی چمک میں وہ سچ مچ موتی معلوم ہو رہے تھے، میں اس وقت اس کے آنسوؤں کی وجہ نہیں سوچ رہا تھا - بلکہ میرے خیالات ابھی تک حُسن پرستی پر تُلے ہوئے تھے - میں سوچ رہا تھا کہ گھر کی عورت میں بھی حُسن پایا جا سکتا ہے؟ اس کی سادگی اور بے اختیاری میں ہزاروں ادائیں مضطرب تھیں اور میری حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی - ایک عجیب افسردہ ادا سے اس نے مصلّا اٹھایا اور ایک طرف رکھ کر اپنے پلنگ کی طرف بڑھی - کرسی نزدیک سرکاتے ہوئے ایک دلکش ادا سے ساری کا کونا سنبھالا اور کرسی پر بیٹھ کر ایک کھدر کا میلا سا کرتا سینے لگی - اچانک نزدیک کی چارپائی پر میری نظر پڑی جس پر کوئی شخص سو رہا تھا، اس نظارے نے میری رگوں میں شعلے بھڑکا دئے - غیرت وعزّت کے سوال نے دماغ میں جنون پیدا کر دیا - سوچنے کی تمام طاقتیں سلب ہو کر غصّہ اور جوش کی صورت بن گئیں - کوئی غیر مرد اور میری بیوی کے کمرے میں؟ میں اس سے زیادہ دیکھ نہ سکا اور دروازے پر جا کر زور سے دھکا دیا - دروازہ کھُل گیا - اور نسیمہ میری حالت کو دیکھ کر تعجب اور خوف سے گھبرا گئی - میرے اس اچانک اور خوفناک انداز میں داخل ہونے پر وہ چیخ مارنا چاہتی تھی لیکن خاموش رہی - اس کے چہرے پر زردی چھا گئی - اور ایک مرمریں مجسمہ معلوم ہونے لگی کسی بت تراش کا شاہکار جس کے نیچے "خوف اور تعجب" کے لفظ لکھے ہوں -

پیشتر اس کے کہ وہ مجھے کچھ کہے میں نے جھپٹ کر چارپائی پر حملہ کیا اور لحاف اٹھا کر اس زور سے پھینکا کہ کھڑکی کے شیشے پر لگ کر اسے بھی گراتا ہوا نیچے آ رہا - مگر دوسرے لمحے میں میں انگشت بدنداں کھڑا تھا - میلے کپڑے پہنے ہوئے غریب لڑکا ایک معصومانہ مسکراہٹ سے محوِ خواب تھا - اس کے کپڑے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے -

میں نے ایک متحیّر نگاہ نسیمہ پر ڈالی جو خوف سے تھرتھرا رہی تھی - "یہ کون ہے؟ میں نے بمشکل آواز نکالتے ہوئے پوچھا، میری آواز پر نسیمہ چونکی اور میرے بیٹھنے کے لئے کرسی آگے کر کے کہا - "آپ کو تکلیف ہو رہی ہے بیٹھ جائیں" میں نے بیٹھتے ہی پھر وہی سوال کیا - "یہ ایک یتیم لڑکا ہے - کل عید ہے، اس کے کپڑے نہیں سلے تھے

میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ رات کو سی دوں گی یہ لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں کسی کی ٹھوکر سے گندے پانی میں گر گیا اور تمام کپڑے خراب ہو گئے، ان کو دھو کر سکھانے اور سینے میں دیر ہو گئی اور یہ یہیں سو گیا، مگر۔ ۔ ۔ ۔" وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ میرے دماغ میں راستے کا منظر پھر گیا۔ اپنی عصیاں آلود و گناہ پرور زندگی اور ادھر مجسمۂ نیکی کا تصوّر کر کے میں کانپ اٹھا، میرا رواں رواں تھرا گیا جسم میں ایک سرد رو دوڑ گئی۔ روح خوف اور اضطراب سے تڑپ اٹھی۔

اپنی بداعمالی اور نسیمہ کی نیکی اور مظلوم پروری کا تصوّر ایک تازیانہ بن کر میری روح کو لگا، تادیب بن کر دل میں اتر گیا اور ایک سزا بن کر دماغ کو بتا گیا کہ دنیا صرف عیش و عشرت کا ہی نام نہیں بلکہ مقاصد تخلیق اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں۔ شراب و کباب سے بڑھ کر بھی لذتیں ہیں۔ سرود و رقص سے کہیں بہتر عشرتیں بھی ہیں۔ شباب و عورت سے بالاتر کئی مسرتیں ہیں۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر میرے دماغ نے میرے تمام گزشتہ اعمال نگاہوں کے سامنے رکھ دیئے۔ تصوّر نے متحرک تصاویر کی طرح ہر عمل پر خوفناک رنگ چڑھا کر مہیب صورت میں پیش کیا۔ اور میں کانپ گیا۔ نسیمہ ابھی تک خاموش کھڑی تھی۔ میں اٹھا وہ سمجھی کہ میں لڑکھڑانا چاہتا ہوں شاید نشہ میں ہوں۔ مجھے سنبھالنے کے لئے بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ میں اس کے پاؤں پر گرا وہ "ہیں!" کہہ کر پیچھے ہٹی۔ میں نے اس کا دامن پکڑ لیا اور وہ مجھے آغوش میں لیتے ہوئے حیرت سے دیکھنے لگی۔

مجھے یقین ہے کہ اس سے زیادہ میں اپنی عمر میں کبھی نہ رویا ہوں گا اور نہ رو سکوں گا۔ یہاں سے میری زندگی کی نئی کتاب نئے ورق سے شروع ہوئی۔ اب میں اپنے نوکر عبداللہ کو جس وقت دیکھتا ہوں جو وہی غریب لڑکا تھا تو مجھے وہ وقت یاد آ جاتا ہے اور میں کانپ جاتا ہوں۔ اس عید کے بعد کئی عیدیں آئیں مگر اب زہرہ کے رقص و سرود اور شراب و رنگ کے بغیر بھی وہی لطف و مسرت بلکہ اس سے بھی زیادہ سرور حاصل کرتا ہوں، جو مجھے ان دنوں حاصل تھا۔ یہی میری "پہلی اور حقیقی عید" تھی جب میں تمام خرابات سے نسیمہ کی گود میں توبہ کر رہا تھا اور خدا سے گرم گرم آنسوؤں کے ساتھ معافی مانگ رہا تھا۔

یزدانی جالندھری

غزل

تسکین کے تصدّق، پوچھا تو بیکسی میں
مایوس ہو چکا تھا ورنہ میں اپنے جی میں

یہ حدِ ارتقا ہے میری عبودیت کی
اب میں الوہیت سی پاتا ہوں بندگی میں

تیرے کرم کے صدقے، ٹھکرا دیا مرا دل
اک جان پڑ گئی ہے روندی ہوئی کلی میں

رنگِ شفق سمٹ کر رقصاں تیرے لبوں پر
غنچوں کی ہر لطافت پنہاں تری ہنسی میں

اس آرزو کو دیکھو اِن حسرتوں کو سمجھو
ناکام رہ گئیں ہیں جو میرے جی کی جی میں

اندوہناکیوں میں تسکین کی کرن ہے
تم یاد آ رہے ہو فرقت کی بیکسی میں

کس کی صدائے دلکش میں سن رہا ہوں قلبی
یہ کس نے آ کے پوچھا ہے مجھ کو بیکسی میں

قلبی رامپوری

طلسمِ گفتار

کیا فائدہ جو قلبِ حزیں صبر کوش ہے
بیداریٔ شعور کو نقصاں کا ہوش ہے

میں اور زندگی کے حوادث کی روئداد!
یہ بھی ہے مغتنم کہ مجھے اپنا ہوش ہے

شمعیں فسردہ، جام شکستہ، رباب چُپ
ہنگامِ صبحِ میکدہ کیا بے خروش ہے

میخانے کی سرشت تو ہے کیف و رنگ و نور
یہ کیسا حادثہ ہے کہ حسرت فروش ہے

شیشے کو توڑیئے! کہ ہو نغمہ کوئی بلند
ہو، گر ہے مے کا قحط، فضا کیوں خموش ہے

میخانۂ حیات ہے اور ساقیٔ شباب
ہر سانس شرحِ معنیٔ طوفان و جوش ہے

ناصح! ادب کہ بارگہِ بے خودی ہے یہ
اے عقل چپ کہ موسمِ تردیدِ ہوش ہے

کھِلتے ہیں پھول ذہن میں جس مے کے کیف سے
اس مے کا کیفِ رُوح فزا، رو بہ جوش ہے

ہے خود بخود محیطِ سماعت زبانِ غیب
گرمِ سخن، عدم سے نوائے سروش ہے

عدمؔ

ہندوستان میں بیکاری

آجکل جبکہ تہذیب و تمدن میں فوری ترقی اور تبدیلی کے باعث پیچیدگیاں بڑھ چکی ہیں۔ ہم حالات کا آسانی سے تجزیہ کر کے بیکاری کے اسباب اور اس کا علاج معلوم نہیں کر سکتے۔ اسباب بے شمار ہیں اور ان کے اثرات اس طرح باہم پیوست ہو چکے ہیں، کہ اُن کی نوعیت صرف باریک بین نگاہیں معلوم کر سکتی ہیں۔

سٹیم کو قبضۂ اختیار میں لانے کے وقت ہی سے دُنیا میں بیکاری شروع ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے ایجادات اور اختراعات میں اضافہ ہوتا گیا بیکاری بھی ہمہ گیر ہوتی چلی گئی۔ کارخانجات کے آمروں اور سرمایہ داروں کی سخت گیری نے سے اور بھی المناک بنا دیا۔ دُنیا میں سیاسی بےچینی، ذہنی کشمکش اور روحانی اضطراب کا باعث زیادہ تر یہی ہیں۔ جن ممالک میں ایجادات مقامی تھیں اور آہستہ آہستہ وقتاً فوقتاً ہوئیں وہاں حالات نے قدرتی نشو و نما اختیار کی۔ لوگ اپنی سیاست، اور تمدن و معاشرت کو تازہ حالات کے مطابق تبدیل کرتے رہے۔ اس لئے وہاں صورت حالات اتنی پریشان کن نہیں۔ لیکن ہندوستان جیسے ملکوں میں جہاں تمام ایجادات کی یک لخت اور اچانک درآمد ہوئی وہاں کے باشندے سنبھل نہ سکے، اور اپنے ذہنی قوے اور معاشرت کو حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ممالک میں زندگی انتہائی تلخ ہے۔

آجکل نوجوان بڑے سرگشتہ اور حیران پھر رہے ہیں۔ اس کی وجہ تو کچھ یہ ہے، کہ تعلیم کے عام ہونے سے ان کے ارادوں میں بلندی اور آرزوؤں میں وسعت پیدا ہو چکی ہے۔ دورانِ تعلیم میں ذہن نے جو مثالی دنیا تخلیق کی، ہر نوجوان اُسے اس عالم آب و گِل میں موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن دُنیا کے تلخ حقائق اسے بلندیوں سے پستیوں میں اُترنے کو کہتے ہیں۔ ضمیر، اصول پروری، اور آرزوئیں اس طرف مائل نہیں ہونے دیتیں۔ ایک ایسے عزیز نفسیاتی ماحول کی قربانی آسان نہیں۔

علاوہ بریں جو تعلیم نوجوانوں کو دی گئی ہے۔ وہ بڑی ناقص ہے، یہ ضروری ہے کہ وسیع الخیال بنانے کے لئے قدیم و جدید ثقافت سے نوجوانوں کو بخوبی آگاہ کیا جائے۔ لیکن یہ انتہائی نادانی ہے۔ کہ انہیں صرف پیشۂ ملازمت اختیار کرنے کے قابل بنا دیا جائے۔ ہم اپنے نظام تعلیم کو غیر مختتم طور پر ترقی نہیں دے سکتے۔ جب تک اُن پیشوں کو مساوی طور پر وسیع نہ کر دیا جائے۔ جن کی طرف ہماری تعلیم ہمیں لے جاتی ہے۔ موجودہ تعلیم جن پیشوں کے اختیار کرنے کے قابل ہمیں بناتی ہے، ان میں مزید ترقی کی بہت تھوڑی گنجائش ہے۔ اس لئے لہٰذا اب تعلیم میں اور پیشوں کا داخل کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ برطانیہ میں امریکہ کے نمونہ پر روایتی تعلیم کی بجائے زمانہ کی ضروریات کے مطابق تعلیم کا انتظام ہو چکا ہے۔ وہاں یونیورسٹیوں کے سند یافتہ نوجوانوں میں سے پچاس فی صدی تجارت کے مختلف شعبوں میں کاروبار شروع کرتے ہیں۔ ہزاروں گریجویٹ کیمیاوی دستکاری، روغن کشی، پارچہ بافی، جہازرانی وغیرہ وغیرہ کاموں کو اختیار کر کے کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طلبہ میں اس ماحول پر قابو پانے کی اہلیت پیدا کرنی چاہیئے۔ جس میں انہیں زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ اس قدر قابلیت رکھتے ہوں کہ اسی ماحول کو مناسب اور معقول انجام کی طرف لے جاسکیں۔ جو کام پہلے پیشہ ور باپ کرتے رہے ہیں۔ وہ اب یونیورسٹیوں کو کرنا چاہیئے۔ بنی نوع انسان اب ایک ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ ہر کام کے انصرام کا ذمہ دار سماج کو ہونا چاہیئے۔ یہ خیال غلط ہے کہ بعض پیشوں کو اور وسعت نہیں دی جا سکتی۔ جب تک دُنیا قائم ہے، ہر پیشہ اور شعبۂ زندگی میں غیر محدود ترقی اور توسیع کی گنجائش رہے گی۔

لیکن ان انقلاب در آغوش خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ ہمیں موجودہ نسل کے نان و نفقہ کا کچھ فکر کرنا چاہیئے۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ تقریباً نصف، زراعت پیشہ خاندانوں کے فرزندوں پر مشتمل ہے۔ انہیں اپنے آبائی پیشہ کو جدید اصول اور تازہ ضروریات کے مطابق وسعت اور فروغ دینا چاہیئے۔ ساتھ ہی ابھی بڑے وسیع رقبے غیر مزروعہ پڑے ہیں۔ جو نوجوانوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ تجارت میں ہر ایک راک فیلر اور ٹاٹا نہیں ہو سکتا۔ اور میرا ذاتی تجربہ ہے، کہ معمولی تجارت کے لئے اتنے بڑے سرمائے

کی بھی ضرورت نہیں - سو ڈیڑھ سو روپے کا مناسب استعمال کم از کم محتاجی سے ضرور بے نیاز کر دیتا ہے - نوجوانوں کو صرف حقائق کے مقابلہ کے لئے آہنی ارادہ اور تعمیری ذہنیت کی ضرورت ہے - موجودہ اعلےٰ تعلیم ہر نوجوان کے خیالات کو کسی حد تک نسوانی سہل انگاری کا آئینہ دار بنا دیتی ہے - اور تقریباً ہر ایک یہی توقع رکھتا ہے کہ کالج چھوڑنے کے بعد زندگی اس کے لئے پھولوں کی سیج کی طرح جسمانی راحت اور روحانی کیفیت کا سامان پیدا کرے گی - لیکن یہ تو کسی زمانہ میں بھی ممکن نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے - نوجوانوں کو چاہیئے کہ جہاں کہیں اُن کے سینگ سما سکیں، جائیں - ملازمت کا دائرہ نہایت تنگ ہے - پبلک سروس کمیشن معدودے چند نوجوانوں کو باروزگار بنا سکتا ہے - اس لئے بھاری اکثریت کو کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا ہوگا - لیکن یہ خیال کہ جو پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں ناکام رہ جاتے ہیں نا اہل ہوتے ہیں، حقیقت پر مبنی نہیں اوّل تو اسامیاں گنتی کی ہوتی ہیں - جو یقیناً گنتی کے آدمیوں کو ملنی چاہئیں - دوسرے اس میں اتفاق کا بڑا دخل ہے اکثر ناکام رہنے والوں کی ممکنات کار حیران کن ہوتی ہیں - اور وہ ہر عہدے کے سرانجام دینے کی پوری پوری اہلیت رکھتے ہیں -

لیکن ہندوستان میں بیکاری اتنی تعلیم یافتہ طبقہ میں نہیں جتنی اَن پڑھ لوگوں میں ہے - ہماری نگاہوں میں ہر وقت تعلیم یافتہ لوگ سمائے رہتے ہیں - اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی آواز ہمارے کانوں تک پہنچا سکتے ہیں - ہندوستان کی بے زبان اکثریت کا ہمیں کبھی خیال تک نہیں آیا - اگر ہمارے رہنما اور مصلحین، جرنلسٹ اور اخبار نویس کبھی اُن جھونپڑیوں میں آ جھانکیں جو سینۂ وطن پر ناسور کی طرح موجود ہیں - تو وہ پھر کبھی تعلیم یافتہ طبقہ کا بھولے سے بھی نام نہ لیں - بیچارے دستکاروں اور کسانوں کو غیر ملکی مصنوعات کی درآمد، کساد بازاری، اور بھاری ٹیکسوں نے بالکل مفلوک الحال بنا دیا ہے - بچے بھوک سے بلکتے رہتے ہیں - اور مردوں کو تجہیز و تکفین یا کریا کرم تک کی توفیق نہیں رہی - یہ ایک حقیقت ہے کہ کارخانے مصنوعات سے اٹے پڑے ہیں - اور دُنیا کی منڈیوں میں اناج کی بہتات ہے - لیکن اگر کسی طرح یہ تمام ذخیرے ان لوگوں میں تقسیم ہو سکیں - تو پھر بھی یہ ننگے اور بھوکے لاکھوں کی تعداد میں بے نصیب رہ جائیں -

اس عالمگیر اور زہرہ گداز بیکاری کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ہماری سوسائٹی تقسیم دولت کا کوئی کامیاب نظام قائم نہیں کر سکی - ہم انقلاب انگیز اور جاں سوز ایجادات کر سکتے ہیں - لیکن ایثار پیشگی سے سوسائٹی میں معقول اور حیات بخش اصولوں کی ترویج نہیں کر سکتے -

ڈارون کے نظریہ البقاء للاصلح نے بھی اہل عالم کو بڑے مغالطہ میں ڈال رکھا ہے - انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ جو لوگ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر بآرام اور باعزت زندگی کے مستحق ہیں، انہیں کو ایسی زندگی نصیب ہے اور آئندہ ہوگی - اس نظریہ نے ان کے دل سے جذبۂ ہمدردی مٹا دیا ہے اور وہ غیر متزلزل ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو اصلح ثابت کرنے کی دھن میں لگے ہیں - یہ نظریہ دُنیا کو ایک اور مگر زیادہ تباہی خیز جنگ کی طرف لے جا رہا ہے -

سچ تو یہ ہے کہ بآرام اور باعزت زندگی کی وجہ بڑی حد تک مساعدت حالات ہے - مواقع میں عدم مساوات نا اہل کے ستارہ اقبال کو ثریا سے بھی بلند کر دیتی ہے - اور اچھی اچھی قابل ہستیوں کو قعر مذلت میں دھکیل دیتی ہے - گمنام لوگوں میں ایسے اشخاص کی کمی نہیں جنہیں اگر موقع ملتا تو اپنے وقت کے لینن یا نپولین بن جاتے - علاوہ بریں جو مردانہ صفات لقائے دولم کے انداز رکھتی ہیں، وہ تو صرف مشکل پسند غربا ہی میں موجود ہوا کرتی ہیں -

میری غرض یہ تھی کہ حالات کو صرف سرسری نگاہ سے نہ دیکھنا چاہیئے - اور جو چیزیں ممیز ہیں اُن پر توجہات مرکوز کر کے غیر معروف مگر اہم ترین باتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے -

لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں قنوطیت کا شکار نہیں ہونا چاہیئے - مشکلات ضرور درپیش ہیں مگر ایسی کوئی مشکل نہیں جس کا حل موجود نہ ہو - بیکاری کا علاج ناممکن نہیں، اگر علاج کی تلاش مقصود ہو - صرف عجلت پسند طبائع اور قوت تخلیق سے محروم دماغ ہی مایوس ہو سکتے ہیں -

حکومت اس ضمن میں بہت کچھ کر سکتی ہے اور اگر اسے اپنے استحکام کی ضرورت ہے تو اسے کرنا چاہیئے - بیکاری کا علاج کرنا حکومت جمہور کا اہم ترین فرض ہے - موجودہ پیچیدہ زندگی میں رہنمائی کی ہر طرف ضرورت نظر آتی ہے - ایک ایسا ہمدرد، باخبر، منظم، اور وسیع ادارہ قائم ہو جانا چاہیئے جو تلاش روزگار میں ممد و معاون ہو - ایک آدھ دن کی ہنگامی رپورٹ پر اکتفا کرنا اپنے حقیقی فرائض سے چشم پوشی کرتا ہے - اس ادارے کا فرض ہونا چاہیئے کہ بیکاروں کے صحیح اعداد و شمار حاصل کرے ہر محکمہ اور ہر پیشہ کی ضروریات سے مطلع رہے - معمولی معمولی تفصیلات پر بڑی توجہ دے، کیونکہ اکثر اوقات یہی تفصیلات اپنے اندر

وسعتوں کی ایک دُنیا رکھتی ہیں۔ لیکن حکومت کے عطا کردہ اختیارات اور اس ادارے کے کاروبار میں فیاضی اور انسانیت کبریٰ سے صحیح جذبۂ ہمدردی کا کار فرما ہونا ضروری ہے۔ اس ادارے کی شاخیں قابلِ قدر درسگاہوں میں بھی ہونی چاہئیں۔ ان شاخوں میں کام کرنے والے تجزیہ نفس اور عملی نفسیات میں مہارت تامہ رکھتے ہوں تاکہ وہ نوجوانوں کے رجحانِ طبع کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ یہ شاخیں مغربی یونیورسٹیوں کے ملازمتی بورڈوں کا کام بھی کر سکتی ہیں۔ اگر بین الاقوامی تجارت ہندوستان کے سونے چاندی کی کانوں، اور اس کے چائے اور پٹ سن کے کھیتوں۔ محکمہ جات اور کارخانجات میں مفادِ عامہ کو مقدم سمجھا جائے تو حالات اتنے اندوہناک نہ ہوں۔

عبد الغنی بی۔اے

گائے جا!

آخری چھینٹا ہے یہ برسات کا — واہ! کیا کہنا برستی رات کا
بھیگے بھیگے زمزمے برسائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

جھومتی ہے آسمانوں پر گھٹا — ناچتی ہے مست ہو ہو کر ہوا
وجد میں دونوں جہاں کو لائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

چھپ گئے ہیں چاند تارے ابر میں — ہیں فضاؤں پر مسلط ظلمتیں
ظلمتوں پر نور بن کر چھائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

راگ تیرا جیسے نشتر کی کھٹک — تیری تانیں جیسے کوندے کی لپک
بجلیاں سی ہر طرف تڑپائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

تیرا لحنِ یاسمینی نشہ زا — تیری نغمہ آفرینی نشہ زا
مستیوں کی تند مے چھلکائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

ہائے یہ آواز کی دوشیزگی — کیف، رنگینی، طرب، پاکیزگی
رس، رسیلے حسن کا ٹپکائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

گونجتی ہیں رُوح کی گہرائیاں — لے رہی ہے آرزو انگڑائیاں
شعلۂ احساس کو بھڑکائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

تجھ کو وجد انگیز نغموں کی قسم — ان قیامت خیز نغموں کی قسم
دل کی دُنیا پر قیامت ڈھائے جا
گائے جا، اے گانے والی! گائے جا

اختر انصاری بی۔اے

کاش ایسا نہ ہوتا!

جب کبھی مجھے اس تُند مزاج مسافر کا خیال آتا ہے، ملال ہوتا ہے۔ بلاشک میں اپنی تکلیف اور پریشانی کے متعلق شکایت کر سکتا ہوں اور یہ جائز شکایت ہو گی۔ لیکن اس مسافر کی اس وقت کی خفت اور بیکسی جب یاد آتی ہے یہی آرزو ہوتی ہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا! ایسا ہو جاتا ہے، ایسا ہو جانے کا ہر وقت امکان ہے آخر انسان ہے۔ گھر میں بیٹھے ایسا ہو جاتا ہے اور سفر میں تو زیادہ ممکن ہے۔ پھر بھی جب یہ واقعہ یاد آ جاتا ہے جی یہی چاہتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔

ہندوستان میں سفر ایک دلچسپ ہنگامہ ہے۔ بڑی رونق میں وقت کٹتا ہے۔ مگر ہمارے حالات سفر کو سقر بنا دیتے ہیں۔ ایک مسافر، گھر والی کا ساتھ ہمراہ نانی اماں، خالہ اماں، منجھلی اماں، ایک آدھ ہمسائی، پھر حفیظن، تمیزن اور ان سب کے علاوہ آدھی درجن کے قریب بچے۔ ہر ایک تین برس سے کم۔ ٹکٹ بابو کی حیرانی کہ ایسے "فری" بچے سب ایک دو جھول کے انڈے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ خیال نہیں کرتا کہ چھ عدد مستورات، برقعوں میں ملبوس۔ ان میں سے تین تو مائیں ہو سکتی ہیں۔ اسباب، کاٹھ کباڑ، لے دے، قیل قال، ہٹو بچو۔ غرض خدا خدا کر کے گاڑی تک پہنچتا ہے۔

پھر عورتیں عورتوں میں، مرد مردوں میں اور بچے؟ آدھے ادھر آدھے اُدھر، ایک آدمی کدھر کدھر جائے۔ کس کس کو دیکھے۔ پریشان ہو جاتا ہے۔ گاڑی چلتی ہے۔ تو جان میں جان آتی ہے۔ ہاں اس سے پہلے جس ڈبہ کی طرف لپکو۔ مسافر کہتے ہیں "جگہ نہیں"۔ جس کھڑکی میں جھانکو آوازیں آتی ہیں "جگہ نہیں"۔ جہاں نگاہ ڈالو، کہتے ہیں "آگے جائیے"۔ ادھر انجن ہے کہ اب چلا۔ غرض ہمارے مسافروں کی سرد مہری قانون اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ سارے ڈبہ پر چھا جاتی ہے۔ لیکن جہاں نووارد بیٹھا، یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے۔ جگہ ہوتی ہے مگر یہ مسافروں کا خاصہ ہے۔ لمبے سفر کی ٹرین میں مختلف مقامات کی گاڑیوں پر بورڈ لگے ہوتے ہیں جو اپنے اپنے سٹیشن پر کاٹ چھانٹ دی جاتی ہیں۔ مثلاً لاہور سے دہلی، دہرہ دون، لکھنؤ، مغل سرائے، ہوڑہ، وغیرہ اور عموماً مسافر اپنے اپنے ٹھکانے کی گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں اور یوں رستے میں گاڑی بدلنے کے تردد سے بچ جاتے ہیں۔ یہ کچھ اتفاق کہئے یا ریلوے والوں کی قدامت پسندی اور تناسب نوازی کا نتیجہ سمجھئے۔ کہ ایسی گاڑیاں بسا اوقات تنگئ صورت اور اندر باہر، رنگ روپ میں ایک ہی طرز کی ہوتی ہیں اور مسافر کے لئے ان میں تمیز کرنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ اور زیادہ تر یہی وجہ تھی کہ جو کچھ ہوا، ہو گیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا!

سہارنپور سٹیشن پر ایکسپرس پہنچا۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ کچھ مسافر اُترے، کچھ سوار ہوئے۔ میں نے سواریوں کو لکھنؤ کی گاڑی کے زنانہ ڈبہ میں بٹھایا۔ کچھ اسباب سپرد کیا۔ کچھ بچے حوالے کئے، اور کچھ بچے، اسباب ہمراہ لے کر اپنے لئے جگہ کی تلاش میں بڑھا۔ ساتھ ہی مردانہ ڈبہ تھا۔ مسافروں کے انکار اور اپنے اصرار سے ڈبہ میں داخل ہو گیا۔ بچوں کو کھینچا، اسباب پکڑا۔ دونوں کو مناسب ٹھکانے لگایا۔ قلیوں کو دام دے اطمینان کا سانس لیا۔ جگہ کافی تھی۔ مسافروں کا انکار بیجا تھا۔ مگر ایسا کرنا ڈبہ پر قبضہ رکھنے والے مسافروں کی رسم ہے اور اس کی تعمیل کرنا نووارد مسافر کا اختیار رہے۔ خیر اس کے بعد ذرا مسافروں سے تعارف حاصل کیا۔ کوئی مراد آباد کا تھا۔ کوئی بریلی کا کسی کو سہارنپور جانا تھا کسی کو لکھنؤ۔ ایک دو مسافر پرتاپ گڈھ اور بنارس کے بھی تھے۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم لکھنؤ کی گاڑی کے ڈبہ میں سوار ہیں۔ سہارنپور پر ایکسپرس کا قیام کافی ہوتا ہے۔ اتنے میں ہلکا سا دھکا لگا معلوم ہوا کہ انجن دہلی والی گاڑی کاٹ کر لے چلا ہے۔ سامنے دہلی کی ٹرین تیار تھی۔ ایکسپرس والی گاڑی کا انتظار تھا۔ یہ لگی اور ٹرین دہلی کو روانہ ہو گئی۔ اب ایکسپرس بھی تیار تھا۔ میں نے لپک کر ننھے کی ماں کو پان دیا۔ اسباب اور جگہ کے متعلق اطمینان کر کے اپنے ڈبہ میں آ بیٹھا۔ ادھر بچوں کو دیکھا کہ ایک خطرے کی زنجیر سے الجھا ہے اسے منع کیا زنجیر سے بغیر ضرورت چھیڑ چھاڑ پر پچاس روپے جرمانہ کا خوف دلایا۔ دوسرا بولا "اماں کے پاس جائیں گے"۔ تیسرا چلایا کہ "گنڈیری کھائیں گے"۔ یہ تماشا دیکھ کر برابر سے ایک مسافر نے کہا۔ "اب انہیں پیار سے سمجھائیے۔" دوسرا سامنے سے بولا "ہم نے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ "یہاں جگہ نہیں" تیسرے صاحب بھی گنگنائے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجائی۔ بچے چپ ہو گئے۔ میں نے اپنی سیٹ پر بستر جمایا۔ پان کھایا اور اس تھوڑے سے عرصے کی حملہ کامیابیوں پر غور کرنے لگا بلکہ یوں کہئے کہ ریلوے سفر کی راحتوں کا اعتراف کرنے کو تھا کہ ڈبہ کا دروازہ کھلا اور بلند قامت شخص داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جھٹکا سا لگا اور ٹرین روانہ ہو گئی۔ میں نے اس

تازہ وارد کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ گاڑی کی روانگی پر بچوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ کیا ہونے کو ہے۔

ٹرین کا سٹیشن سے گزرنا تھا کہ ایکسپرس اپنی پوری رفتار سے چلنے لگا۔

اسی اثنا میں جبکہ میری نگاہ سامان پر تھی میں نے محسوس کیا کہ نیا مسافر میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اور فوراً ہی آواز آئی "یہ جگہ خالی کرو" میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا کہ ایک لمبا چوڑا آدمی مجھے خشمبار آنکھوں کا نشانہ بنائے ہے۔ اونچا قد، بڑا سر، موٹی گردن، چوڑی چھاتی، بھاری پنڈلیاں۔ بڑے بڑے پاؤں، بھاری بھاری بوٹ۔ سر پر ٹوپی، تن پر چست فراک کوٹ، جودھپوری برجس، اس کے علاوہ ہاتھ میں دونالی، کمر میں پستول، گلے میں کارتوس کی پیٹی، بڑی بڑی مونچھیں بلکہ گلمچھے، آواز میں تحکم۔ بلکہ سرتاپا حکومت مجسم۔

میں نے اس ہیبتناک مسافر سے معصومانہ تعجب سے پوچھا:۔

میں:۔ کیا مجھ سے ارشاد ہے۔ کونسی جگہ خالی کردوں؟

مسافر:۔ بیشک تم سے۔ ارشاد۔ جلدی اٹھو اور چلتے بنو۔

میں:۔ مگر آپ یہاں نہ تھے۔ اور یہ ٹرین تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں فقرہ ختم نہ کرسکا۔

مسافر:۔ (کڑک کر) ٹرین مدین کی خیر ہے۔ تمہیں میری جگہ سنبھالنے کی کیسے جرأت ہوئی؟ کھڑے ہوجاؤ۔ جگہ چھوڑدو۔ زیادہ گفتگو مت کرو۔ اپنی جگہ بناؤ۔ دوسروں کی سیٹ پر مت قبضہ جماؤ۔ واہ رے شوخی، باہر قدم نہیں رکھا کہ آ دھمکے۔ ہم کہتے ہیں استر بستر اٹھاؤ۔

اپنی طبیعت کمبخت بہت نرم ہے۔ پھر بچوں کا ساتھ، سفر کی حالت، جی ہنگامہ پر آمادہ نہ ہوتا تھا تاہم سمجھانے کی لاکھ کوشش کی۔ مگر اس ظالم نے ایک نہ مانی۔ اس کے برعکس کہنے لگا۔

مسافر:۔ تم جانتے نہیں ہم اسی ڈبہ میں بیٹھے جالندھر سے چلے آرہے ہیں۔ اگر بھلا چاہتے ہو فوراً اپنا ٹھکانا بناؤ۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں فوراً اپنا اسباب اٹھا ایک اور سیٹ پر سہارا لے بیٹھا۔ بچے بیچارے حیران تھے کہ کیا ماجرا ہے۔ ایک مسافر بولا "آپ کو تو کہا تھا کہ یہاں جگہ نہیں" یہ دخل ایک اور تازیانہ تھا۔ بہرحال کچھ نادم کچھ برہم خاموش بیٹھا رہا۔ اور موقعہ کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن افسوس جو کچھ ہوا۔ کاش ایسا نہ ہوتا!

میں اسی کشمکش میں تھا کہ ایک اور ہولناک مطالبہ ہوا۔

مسافر:۔ ابھی سنتے ہو۔ وہ ہمارا بیگ کدھر اٹھا لے گئے؟

میں:۔ (سکیتی سے) میرے پاس نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔

مسافر:۔ (گرج کر) تم نے نہیں دیکھا تو شیطان لے گیا؟

مگر ٹھیک اس موقع پر رڑکی پر ٹرین آ ٹھہری اور ساتھ ہی ایک "ٹکٹ چیکر" آوارد ہوئے۔ اس نے آتے ہی ان میاں کا ٹکٹ دیکھا۔ مسافر نے اپنا معاملہ پیش کیا اور برملا مجھے اپنے بیگ کے گم ہوجانے کا ذمہ دار گردانا۔

"ٹکٹ چیکر" شکل سے ہی تلخ رو تھا۔ اور فرائض اور تنگی وقت کی وجہ سے خستہ کلام تھا۔ اس نے مسافر کا معاملہ کچھ سنا کچھ نہ سنا مسکرا کر صرف اتنا کہا "آپ غلط گاڑی میں سوار ہوگئے۔ لکسر پر اتر جائیے گا۔ یہ ٹرین مرادآباد جائے گی۔"

اب تو مسافر کی شکل دیکھنے کی قابل تھی۔

مسافر:۔ مگر مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ گاڑی سیدھی دہلی جائے گی۔

چیکر:۔ بیشک گاڑیاں سیدھی دہلی جاتی ہیں۔ ذرا ٹکٹ ایک بار اور دکھائیے (بغور ٹکٹ دیکھ کر) واقعی آپ غلط گاڑی میں ہیں۔ آپ کی گاڑی سہارنپور سے دہلی کے راستے میں ہے اور شاید آپ کا بیگ بھی مظفرنگر کے آس پاس ہوگا۔ آپ لکسر اتر کر دوسری گاڑی میں لوٹیے۔

مسافر:۔ سہارنپور کے لئے گاڑی کب آئے گی؟

چیکر:۔ صبح آٹھ بجے۔

میں دوسرے مسافر اور بچے اس ڈراما کے تماشائی تھے۔ اب مسافر کے چہرے پر نہ ہیبت تھی نہ آواز میں تحکم تھا۔ اس نے وہیں سے میری طرف دیکھا۔ مگر میں اس کی شکست سے یکدم افسردہ خاطر سا ہوگیا۔ اور آنکھیں چار نہ کرسکا۔

مسافر:۔ آپ تنگ بیٹھے ہیں۔ ادھر تشریف لے آئیں۔

میں:۔ شکریہ! ۔ آپ تکلیف نہ فرمائیں۔

میں بچوں سے بات کرنے لگا۔ ذرا لوٹ کر دیکھا تو ٹکٹ چیکر مسافر سے اس غلطی کا کرایہ وصول کر رہا تھا۔

لکسر آیا۔ مسافر رخصت ہونے لگا۔ میرے دل میں ہمدردی تھی اور اس کے چہرے پر معذرت۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ رخصت ہوا۔ دوسرے مسافر چپ تھے۔ مجھے جب اس بیچارے مسافر کا خیال آجاتا ہے یہی جی چاہتا ہے۔ کہ کاش ایسا نہ ہوتا!

(شیخ) عباداللہ بی۔اے
(ریلوے پبلسٹی آفس لاہور)

سینما
رنگین فلم اور اُن کی تیاری

موجودہ تمدن کی گوناگوں دلچسپیوں میں سے جس سرعت کے ساتھ صنعت فلم ترقی کر رہی ہے۔ اس سے کوئی ذی علم ناواقف نہیں۔ کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ ماہرین فلم نے ڈاکٹر ایڈیسن کی ایجاد "آلۂ صدا بندی" کے ذریعے انسان کی دلبستگی کا ایک سامان پیدا کر دیا۔ دلنواز موسیقی، جادو اثر مکالمے اور دلفریب رقص کی مسحور کن جھنکار فلم کے ذریعے ہر کان تک پہنچا دی گئی۔

لیکن انسانی دماغ اس پر بھی قانع نہ رہا۔ اس نے کہا فلم کو ہر پہلو میں مکمل ہونا چاہیئے۔ آواز کے ساتھ رنگ بھی لازمی ہے۔ تاکہ ہم انسانی چہرے کی رنگت و ملاحت، اور لباس کی زیب و زینت سے بھی لطف اندوز ہو سکیں۔ چنانچہ فلم کو رنگین کرنے کی مسلسل مساعی شروع کی گئیں، جن کا کامیاب نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

فلم کو رنگین کرنے کا ایک طریقہ تو خاموش فلموں کے زمانہ سے رائج ہے۔ یہ طریقہ ہاتھ سے رنگ بھرنے کا ہے، جو بے حد محنت طلب ہونے کے علاوہ گراں قیمت بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بہت کم مفید۔ متکلم فلموں کے بعض مناظر بھی اس طریق سے رنگین کئے جا چکے ہیں۔ چنانچہ ساگر کی فلم مہابھارت اور امپیریل کی فلم سلوچنا کے چند منظر رنگین پیش کئے گئے تھے۔

اس کے بعد فلموں کو کیمیائی طور سے رنگنے کا رواج شروع ہوا۔ لیکن یہ خاموش فلموں تک ہی محدود رہا۔

حال ہی میں مشین کے ذریعے فلم کو رنگین کرنے کا طریقہ دریافت کیا گیا ہے۔ آج سے تقریباً تین سال پیشتر پربھات کمپنی نے اپنا فلم سیرندھری اسی طریق سے تیار کر کے جرمنی سے رنگین بنوایا تھا۔ لیکن چونکہ عکاسی کے وقت اس چیز کا خیال نہ رکھا گیا تھا کہ عکس ہلکا لیا جائے اور وہ عام فلموں کی طرح خوب گہرا تھا۔ اس لئے جب فلم پر رنگ کیا گیا تو مناظر میں تاریکی پیدا ہو گئی اور فلم کا حُسن زائل ہو کر رہ گیا۔

اس کے علاوہ فلم رنگنے کے چند اور طریقے بھی مروج ہیں:-

پہلا طریق تو "کینما کلر" کے نام سے معروف ہے۔ اس میں فلم اُتارتے وقت سبز اور سُرخ جیسے ٹین کے سٹر لگا دیئے جاتے ہیں۔ اور پروجیکٹ کے وقت بھی یہی کیا جاتا ہے۔

دوسرے طریقے کو "پرزم" کہتے ہیں۔ اس میں فلم کی ایک جانب سرخ رنگ کا اور دوسری جانب سبز رنگ کا مسالہ لگا ہوتا ہے۔ لیکن اس عمل میں یہ نقص ہے کہ عکس لیتے وقت پروجیکٹر سے فلم کی ایک جانب کی سطح کھرچی جاتی ہے۔

تیسرا اور سب سے آخری، ترقی یافتہ عمل "ٹیکنی کلر" ہے۔ جس کی ایجاد کا سہرا ڈاکٹر ہربرٹ ٹی کالمس کے سر ہے۔ یہ ایجاد اگرچہ آج سے چودہ برس پیشتر دریافت کی جا چکی تھی۔ لیکن اس کا استعمال حال ہی میں شروع ہوا ہے۔

اس موضوع پر مفصل بحث کے لئے بعید وقت درکار ہے۔ یہاں مختصراً اس کے اصول پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس کے تعمیری اصول سمجھ میں آ جائیں۔

قدرتی رنگ آمیزی کے لئے دو باتیں ہر وقت مدِ نظر رکھنی پڑتی ہیں۔ اوّل یہ کہ سورج کی روشنی لاتعداد شعاعوں کے اشتراک و امتزاج کا نتیجہ ہے اور ہر ایک شعاع سات رنگوں سے مرکب ہوتی ہے۔ اور مسٹر کلارک میکسول نے ثابت کر دیا ہے کہ قدرت کے تمام رنگ، کیمیائی مرکب کی طرح سات رنگوں کی صورت میں علیحدہ علیحدہ کئے جا سکتے ہیں۔ اگر تجربتہً ایک شعاع کو مثلث شیشے سے گزارا جائے تو ساتوں رنگ صاف عیاں ہو جائیں گے۔

دوم یہ کہ اصولاً انسانی آنکھ کی ساخت بالکل دُوربین کی ساخت سے مشابہ ہے۔ آنکھ کی پتلی، لینس (camera) کا کام دیتی ہے اور دُنیا کی ہر چیز کو مرکز میں لے کر دماغ کے پردوں پر پھینکتی ہے اور دماغی ریشوں کی قوت احساس اس کا امتیاز کرتی ہے۔ ساتوں رنگ، انسانی دماغ الگ الگ قبول کر لیتا ہے۔ اگر دماغی ریشوں میں کسی وجہ سے کوئی فرق واقع ہو گیا

ہو تو رنگوں کا یہ امتیاز باطل ہو جاتا ہے -

رنگین فلم کے کیمرے کا لینس (Lense) بالکل انسانی آنکھ کی طرح تصور کیا جا سکتا ہے، جس میں تینوں بنیادی رنگ . . . . الگ الگ نظر آتے ہیں -

متحرک فلموں کی عکاسی کو ذہن نشین کرنے کے لئے ایک اور بات کا بیان ضروری ہے - تمام اندرونی مناظر دو طرح لئے جاتے ہیں - ایک تو قدرتی روشنی میں اور دوسرے مصنوعی برقی روشنی کے ذریعے - سورج کی روشنی تو آئینوں اور بڑے بڑے عکسی تختوں کے ذریعے اداکاروں اور مناظر پر پھینکی جاتی ہے اور بالکل قدرتی روشنی بنا کر کیمرہ چلایا جاتا ہے -

بند نگار خانوں میں یہی کام برقی لیمپوں سے لیا جاتا - آپ نے تصاویر میں رات کے مناظر دیکھے ہوں گے - ایسے منظر دکھانے کے لئے موقع کے مطابق ایک آدھ موم بتی یا لیمپ جلا دینا ہی کافی ہے - اگر فلمبندی (عکاسی) دن کے وقت کھلے نگار خانہ میں کی گئی ہو یا کوئی بیرونی منظروں کے وقت لیا گیا ہو تو کیمرہ میں لینس کے ساتھ ایک زرد رنگ کا شیشہ لگا دیا جاتا ہے، جس کو فلٹر کہتے ہیں - چونکہ زرد رنگ، نیلے رنگ کو جذب کر لیتا ہے - اس لئے بیرونی مناظر میں آسمان کی تیز نیلاہٹ جذب ہو جاتی ہے اور درخت، پہاڑ، قدرتی مناظر، اور اداکار زیادہ صاف نظر آتے ہیں - اسی طرح گہرے زرد رنگ کا شیشہ لگانے سے فاضل روشنی جذب کر کے مکمل رات دکھائی جا سکتی ہے -

رنگین فلموں کے کیمرے کا لینس بھی اسی اصول پر رکھا جاتا ہے، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اس کیمرے میں "پرزم" استعمال کیا جاتا ہے - اور منظر کے مختلف رنگوں کی شعاعیں اس سے گزر کر فلم تک پہنچتی ہیں - موجودہ کیمروں کے برعکس اس کیمرہ میں ایک ہی وقت تین فلم چلتے ہیں، جو خاص رنگین تصاویر بنانے کے لئے ایجاد کئے گئے ہیں - منظر کے رنگ کی شعاع سیدھی "پرزم" پر عکس ڈالتی ہے، جو اس شعاع کو دو شعاعوں میں منقسم کر دیتی ہے - ایک شعاع سیدھی سبز رنگ کے شیشے سے داخل ہو کر سبز رنگ سے مخصوص فلم پر اثر کرتی ہے - دوسری شعاع پہلے نیلے فلٹر سے گزر کر زرد رنگ کی مخصوص فلم پر اثر کرتی ہے اور سرخ فلٹر سے گزر کر سرخ رنگ کی مخصوص فلم پر اثر ڈالتی ہے - اسی طرح ہر چیز کی عکاسی تین فلموں پر سیاہ و سفید صورت میں عکس چھاپ دیتی ہے - ان تین فلموں کو نیگیٹو (Negatives) کہتے ہیں - دوسرا مرحلہ یعنی ان تینوں فلموں کا عکس پازیٹو (Positives) فلم پر اتارنا اس سے زیادہ محنت طلب ہے -

مندرجہ بالا طریقہ سے تیار شدہ تینوں فلموں کو الگ الگ کیمیائی اجزا سے دھونے پر ایک چیز یا منظر کے تین الگ الگ عکس رہ جاتے ہیں - مگر ابھی تک کسی فلم میں رنگ نہیں ہوتا اور تینوں فلمیں سیاہ و سفید ہی ہوتی ہیں -

اب کیمیائی رنگ استعمال کئے جاتے ہیں یعنی ان میں سے جس پر سرخ رنگ کا اثر ہے اُسے ایسے رنگ سے دھویا جاتا ہے - جس میں سرخ رنگ شامل نہ ہو - سبز عکس والی فلم کو دوسرے ایسے رنگ سے جس میں سبز نہ ہو - تیسرے میں نیلے کے علاوہ دوسرے رنگ استعمال کئے جاتے ہیں - اب ان تیار شدہ فلموں کو ایک ہی پازیٹو (Positive) فلم پر چھاپا جاتا ہے - یہ چھپائی بالکل سہ رنگ بلاکوں کی چھپائی سے مشابہ ہوتی ہے - اس پازیٹو کو کیمرے کے باقی پلیٹوں کی طرح دھویا جاتا ہے - اور یہ فلم مکمل قدرتی رنگوں میں سینما میں دکھانے کے قابل ہو جاتی ہے جہاں پروجیکٹر (Projector) کی روشنی اس میں سے گزر کر پردہ سیمیں پر ہر رنگ کو واضح طور پر ظاہر کر دیتی ہے -

اس رنگین فلم پر یک رنگی فلم کے مقابلہ میں تین گنا خرچ ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ابھی یہ اسقدر رائج نہیں ہو سکی -

مذکورہ بالا عمل (ٹیکنی کلر) کے ذریعے اس کے موجد ڈاکٹر ہربرٹ ٹی کالومس نے سب سے پہلے . . . . اپنی بیوی کا فلم تیار کیا اور اس کے بعد یہ عام رائج ہو گیا - ڈاکٹر موصوف نے "ٹیکنی کلر" کیمرا بنانے میں ایک سال کی مدت اور تقریباً چھ لاکھ روپیہ صرف کیا - فی الحال اس قسم کے کیمرے تقریباً نصف صد ہیں، جن کی زیادہ تعداد ہالی وڈ میں ہے - "ٹیکنی کلر" کے علاوہ اور عمل بھی زیر تجربہ ہیں - لیکن ابھی رنگین فلمسازی کا عمل اسقدر گراں ہے کہ ہر فلم کو رنگین بنانا ناممکن ہے -

"امپیریل فلم کمپنی بمبئی" نے جس نے ہندوستان میں سب سے پہلا متکلم فلم تیار کیا تھا اپنے نگار خانہ میں رنگین فلم تیار کرنے کا سامان بہم پہنچا لیا ہے اور تازہ اطلاعات مظہر ہیں کہ ہندوستان کا پہلا "رنگین متکلم فلم" قریب الاختتام ہے -

"تماشائی"

ترانۂ شجاعت

(زمانۂ جاہلیت کے مشہور عرب قطری کی نظم کا ترجمہ)

مَیں اپنے دل سے کہتا ہوں وہ جب ہانوں اُچھلتا ہے — مجھے افسوس ہے دشمن رعائت کر نہیں سکتا
سوال اک دن بھی رہنے کا غلط ہے وقت ٹلتا ہے — فرشتہ موت کا تیری اطاعت کر نہیں سکتا

لہٰذا صبر بہتر ہے کہ یہ جنگِ حمیّت ہے — دوامی زندگی پر بھی کوئی قبضہ نہیں اپنا
لباسِ زندگی بھی کیا نہ جس میں کوئی عزّت ہے — اُتر والیں جو بزدل سے تو وہ کچھ کر نہیں سکتا

ہر اِک زندہ کا رستہ ہے عدم کی سمت کو گویا — زمیں والوں کو کہتا ہے فرشتہ موت کا آؤ
جواں مرگی سے گر نکلا تو بس پھر ہو گیا بوڑھا — کہے گی موت بھی اس سے مصیبت کی ہوا کھاؤ

شمار اپنا ہو مُردوں میں تو پھر کیا خاک ہے جینا
خدا بس دُور ہی رکھے بڑھاپا تو نہیں اچھا

عبید اللہ قدسی

غزل

پھر آرزُو کے دام میں کیوں آ گیا ہوں میَں؟ — یہ کیا ہوا ہے، ادھر کیسے پا گیا ہوں میَں؟
جلووں سے پوچھ میری نظر لاجواب ہے — پھر گرتے گرتے ہوش میں کیوں آ گیا ہوں میَں
کیا زندگی کی کوششِ پیہم ہوئی تمام؟ — کیوں بندگی کے نام پہ لوٹا گیا ہوں مَیں
کشتی ڈبو دوں یا اسے ساحل پہ لے چلوں؟ — موجوں کے پیچ و تاب سے گھبرا گیا ہوں میَں
اِس منزلِ حیات میں اے رہروانِ عشق! — ہے کون سا مقام جہاں آ گیا ہوں مَیں

بے تاب ہو رہی تھی حزینؔ میری زندگی
ہاں! اس لئے دعاؤں سے اُکتا گیا ہوں میَں

امین حزین (بہاولپور)

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

حال ہی میں جناب عاشق بٹالوی کے بہترین افسانوں کا مجموعہ "سوزِ ناتمام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل افسانہ اُسی سے منتخب کیا گیا ہے۔ کردار نگاری اور جذبات کے لحاظ سے یہ افسانہ عاشق صاحب کے بہترین افسانوں میں سے ہے۔ (ایڈیٹر)

وہ آج بھی حسبِ معمول بہت دیر سے اُٹھی۔ سُورج کبھی کا طلوع ہو چکا تھا۔ اُس کی نرم اور روپہلی کرنیں مسہری کے پردوں پر رقص کر رہی تھیں۔ نسیمِ سحری کے سرد و معطّر جھونکے جو تھکے ہوئے اعصاب کے لئے پیامِ راحت لاتے تھے۔ دم بدم بڑھنے والی حرارت کے سامنے اپنی لطافت زائل کر چکے تھے۔ اُس نے بائیں طرف کروٹ لیتے ہوئے، نیم وا آنکھوں کے اندر سے، لمبی گھنی پلکوں کو چیرتی ہوئی، ایک بے پروا نگاہ جانبِ مشرق ڈالی جہاں سے دھوپ کی سنہری شعاعیں (چلمن) کی جالیوں میں سے چھن چھن کر اس کے یاسمیں بدن پر پڑنے لگی تھیں۔ روزمرہ کی طرح آج بھی اُس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی کہ شہسوارِ مشرق کے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اس کا جسم دُکھ رہا تھا اور وہ تمام اعضا میں ایک ناقابلِ بیان شکستگی، ایک بعید از فہم اضمحلال محسوس کر رہی تھی۔ موتیا کے باسی ہاروں کو گردن سے اُتار کر اُس نے پرے پھینک دیا۔ اس کے لئے اپنا وجود ایک بارِ گراں بن رہا تھا۔ روغن اور عطریات میں بسے ہوئے بالوں کی ترتیب، جو گزشتہ شام کی ایک پُر از احتیاط مصروفیت کا نتیجہ تھی، اب برہم ہو گئی تھی اور جوڑا اکھل جانے سے سیاہ کاکلیں بے ترتیبی سے کندنی پیشانی اور گلگوں رخساروں پر بکھر گئی تھیں۔ اُس کے شکن آلود ریشمیں لباس سے ہلکی ہلکی خوشبو، جو لطیفۂ اناث سے خاص ہے، نکل نکل کر، فضا کے محدود حلقے میں تعطّر کی ایک لہر دوڑا رہی تھی۔ وہ بالوں کی برہمی سے بے خبر، لباسِ حریری کی پریشانی سے بے نیاز، نرم و گداز بستر کی بغاوت سے غافل آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی تھی۔ تمازتِ آفتاب کی تیزی اب اُسے اُٹھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ لیکن وہ حرکت کرنے سے ڈرتی تھی کہ مبادا اس کا بند بند ٹوٹ جائے۔ ضعف و انحطاط کسی پُر اسرار طاقت کی طرح اُس کی روح پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، شبِ گزشتہ کے واقعات ایک ایک کر کے اس کے دماغ میں آ رہے تھے۔ تسلسل، تنوع اور جدّت سے محروم، شگفتگی و ندرت سے معرّا تسلسل، یہ تھی اُس کی زندگی۔ دُنیا کی نگاہ میں اس کے ایّامِ حیات رنگینیوں سے بھرپور اور ارمانوں سے معمور تھے۔ اس کی راتیں افسانہ ہائے عشق سے منوّر اور دن نغمہ ہائے عشرت سے لبریز تھے۔ وہ خود بھی شروع شروع میں ایسا ہی محسوس کرتی تھی۔ نوجوان، انجان، ناتجربہ کار لڑکی، زندگی کے وسیع و بے پایاں سمندر میں غوطہ لگا کر انمول موتی ڈھونڈھ نکالنا چاہتی تھی، اُس کی سیماب آسا بے قرار طبیعت، اُس کے عنفوانِ شباب کا بے تاب خون، اسے محض ساکن سطحِ آب کے نظّارے پر قانع نہ رکھ سکتے تھے۔ بچپن کا اختتام تھا اور جوانی کے آغاز نے اُس کے کان میں افسوں پھونک دیا تھا کہ اُس کی خواہشات کی تکمیل کے لئے ارض و سما کے خزانے اُس پر نچھاور ہونے کو تیار ہیں۔ وہ محض آرزو کرے گی اور حصولِ آرزو کے لئے بیسیوں جانیں آمادۂ کار ہو جائیں گی۔ اُس کی نظریں، مقناطیسی قوّت کی حامل نظریں، ہر جاندار و بے جان چیز کو اپنی جانب کھینچ لائیں گی۔ اُس نے قصرِ حیات کی چار دیواری میں اس طرح قدم رکھا گویا وہ نشاط باغ و شالامار کے رُوح افزا مرغزاروں میں گلگشت کے لئے داخل ہو رہی ہے۔ وہ ہر ہر قدم پر پھُولوں کی بارش اور عطر بیز ہواؤں کے سرُور کی متوقع تھی۔ متحرک تصاویر کے مضطرب تماشائی کی طرح وہ واقعاتِ مستقبل کو ایک ہی نظر میں دیکھ لینا چاہتی تھی۔ جواہرات سے بھری ہوئی تھیلی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اُس کی بے چینی اس طولِ امل کی متحمل نہ ہو سکتی تھی کہ وہ اُس میں سے ایک ایک ہیرا نکال کر اپنے لئے سامانِ انبساط مہیا کرے۔ وہ فوراً سب کو الٹ کر اپنے ذوقِ تماشا کو مطمئن کر لینا چاہتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس عالمِ رنگ و بو میں بہت کم اشیاء سونگھنے، چکھنے اور مس کئے جانے کے بعد اپنی دلکشی برقرار رکھ سکتی ہیں۔ جب کوئی بدبخت انسان دیوتاؤں کو ناراض کر کے غیر معمولی عجلت کے ساتھ زندگی کے بھیدوں کو پا لینے کی کوشش کرتا ہے تو ساحر

وباصرہ نواز لذّات کا ذخیرہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بقیہ ایام سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ چند سال کے اندر ہی اندر اُس نے سب کچھ دیکھ لیا جسے دیکھنے کے محبوب خواب عرصے سے اُس کے دماغ میں جاگزیں ہو چکے تھے۔ اس نے وہ تمام ذائقے چکھ لئے جن کے خیال ہی سے اس کے کام ودہن میں پانی بھر آتا تھا۔ دنیا وہی تھی، اُس کے ہنگامے وہی تھے، گردشِ لیل ونہار بھی وہی تھی۔ لیکن اس کی زندگی بے آب ورنگ ہو چکی تھی۔ اُس کی ہر جدّت فرسودگی اور ہر شیرینی تلخی میں تبدیل ہو گئی۔ اُسے آج معلوم ہوا کہ جس محور کے گرد وہ حرکت کر رہی تھی وہ ایک نقطہ سے بھی زیادہ مختصر تھا۔ اس کے حسّیات وجذبات پر قبل از وقت بڑھاپا چھا رہا تھا۔ عشرت کا سمندر جسے اُس نے بحرِ ناپیدا کنار تصور کر لیا تھا۔ ایک جلوۂ سراب سے زیادہ نہ نکلا۔ اُس کا سفینۂ حیات یاس والم کی آندھیوں سے گھبرا کر کسی نئے مستقر کی تلاش میں آوارہ وسرگرداں تھا۔ لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امن کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ جس طرح روشنی کی شدّت آنکھوں کو چندھیا کر ادراکِ نُور کو ضائع کر دیتی ہے۔ اسی طرح عشرت کی فراوانی اُس حسِ لطیف کو فنا کر دیتی ہے جس سے لوگ غم وشادی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ وہ تنگ آ گئی تھی۔ اس طرزِ زندگی سے تنگ آ گئی تھی جس میں اس کے ایام ولیالی گزر رہے تھے۔ رات کو دیر تک جاگنے اور دن کو دیر تک سوتے رہنے سے اُس کی صحت جسمانی کی بنیادیں متزلزل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کا دل خون ہو رہا ہو، لیکن وہ ہر تماش بین کا متبسم چہرے کے ساتھ خیر مقدم کرنے پر مجبور تھی۔ ہر آنے والے کو اُس کے وقت پر، اُس کی مسّرت پر، اس کی صحت پر مقدم حق حاصل تھا۔ وہ خود نہیں بلکہ دنیا اس کی مالک تھی۔ آلامِ حیات کے ستائے ہوئے لوگ، زندگی کے بکھیڑوں کو موسیقی کے دل نواز سُروں میں کھو دینے اور اپنے ٹھٹھرے ہوئے قلوب کو آتشِ سیّال کے ایک گھونٹ سے گرما دینے کے لئے ہر شام اُس کے ہاں جمع ہوتے تھے لیکن خود اُس کی رُوح برف سے زیادہ سرد اور پتھر سے زیادہ سخت ہوتی جا رہی تھی جس پر نہ آتشِ سیّال کا اثر ممکن تھا اور نہ نغمۂ ساز کا۔ وہ کوہِ نور جس کی شعاعوں سے تاریک سے تاریک دل جگ مگ جگ مگ کرنے لگ جاتے تھے اپنے کنجِ سیاہ کو منوّر کرنے سے عاجز تھا۔ لوگ اس کے رقص وسرود کی تعریف میں لغت کے تمام حسین الفاظ ختم کئے دیتے تھے، لیکن وہ ان کلماتِ تحسین کے پردے میں خلوص وصداقت کی بجائے حرص وہوا اور ہوس وگناہ کے خوفناک نقوش دیکھتی تھی ہر چیز اپنا مصنوعی لبادہ اتار کر اصلی صورت میں نمودار ہو رہی تھی۔ اور اس کی فریب خوردہ توقعات مجروح ہو ہو کر اس کے قلب وجگر پر نمک پاشی کر رہی تھیں۔

بس یہی تھی عشرت کی زندگی! چشمکِ برق سے زیادہ بے حقیقت اور تبسّمِ شرار سے زیادہ ناپائیدار۔ وہ اس معصومیت کا گلا گھونٹنے والی فضا سے نکل کر بھاگنا چاہتی تھی لیکن منشّیات کے استعمال کی طرح کثرتِ عشرت نے اس کے اعصاب میں بے حسی وجمود پیدا کر کے اُسے مردہ ونیم جاں بنا رکھا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا اور وہ خیالات کی بھول بھلیاں میں گرفتار یوں ہی بے حس وحرکت پڑی رہی۔ چند لمحوں کی ریاضتِ ذہنی وکشمکشِ دماغی سے وہ تزکیۂ نفس کے کئی مراحل طے کر گئی تھی۔ ایک اضطراری جنبش کے ساتھ وہ پلنگ سے علیحدہ ہو گئی۔ اس عزمِ صمیم کے ساتھ علیحدہ ہو گئی کہ اب کبھی بھی اپنے جسم کو اس داغ ہائے عصیاں سے ملوّث بستر کی آغوش میں نہ دے گی۔ زینے پر سے اُترتی ہوئی وہ سیدھی گول کمرے میں آئی اور بے اختیار ہو کر اُس نے اپنے آپ کو ایک آرام کرسی پر گرا دیا۔ کمرہ بہترین سامانِ آسائش سے مزیّن تھا۔ ریشمیں وزرنگار پردے، مخملیں صوفے جن کا نظارہ ہی ہارے تھکے مزدور کے لئے خواب آفریں ثابت ہو سکتا تھا، ایرانی قالین جن کے اندر پاؤں دھنسے چلے جاتے تھے، کشمیر کی منقّش چادریں جنہوں نے جا بجا دیواروں کو ڈھانک کر کمرے کو تصویر خانہ بنا رکھا تھا، تازہ پھولوں کی آوارہ خوشبو! لیکن یہ تمام چیزیں اس کے دماغ میں کوئی خوشگوار اثر پیدا نہ کر سکیں۔ عیش وتنعم اپنی جاذبیت کھو چکے تھے، اظہارِ تموّل میں اب اس کے لئے قطعاً کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ امارت، دولت، شان وشوکت، سب کچھ اُس کے لئے مردہ ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اُس پرتکلف سازوسامان پر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا ـــ

"چھوڑ دوں گی، مَیں تمام لوازمِ عشرت کو چھوڑ دوں گی۔ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں گی۔ کسی نامعلوم سرزمین کو چلی جاؤں گی جہاں نہ سازندوں کی آوازیں پہنچ سکیں اور نہ ہوسناک مداحوں کی تعریفیں رسائی پا سکیں۔"

خادمہ اپنی مالکہ کی آمد کی اطلاع پا کر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ناشتہ تیار ہو چکا ہے۔ لیکن اس نے ہاتھ کے زوردار اشارے سے اُسے واپس بھیج دیا۔ اُس کی حسّیاتِ نازک پیہم غور وفکر سے اُس انتہائی نقطے پر پہنچ گئی تھیں جہاں ذرا سی

ٹھیس سے کانچ کے پیالے کی طرح اُن کے پاش پاش ہو جانے کا خطرہ تھا۔ وہ اس خطرناک لیکن محبوب تخلیہ میں خفیف سے خفیف مداخلت کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ کرسی پر لیٹی تھی لیکن دماغ خیالات کے اُسی تانے بانے میں مصروف تھا۔ دیواروں پر مختلف عکسی تصاویر آویزاں تھیں جن پر دفع الوقتی کے لئے اُس کی پژمردہ نگاہیں آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھیں۔ ایک تصویر پر پہنچ کر اُس کی نظریں رُک گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں رونق سی آ گئی۔ منتشر خیالات کا شیرازہ بندھنے لگا۔ وہ سنبھل کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی تبدیل شدہ رنگت سے معلوم ہوتا تھا کہ حسیاتِ خفتہ میں ہلچل مچ گئی ہے۔ وہ پانچ منٹ تک بغور اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر دفعتہً ایک سرد آہ کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ عہدِ ماضی کے بھولے بسرے خواب مجسّم صورت اختیار کر کے اُس کے حافظے میں آ موجود ہوئے تھے۔ ان کی بے پناہ یورش سے اس کے دل و دماغ کے تار تھرتھرانے لگے۔ افعی کے سحر کے مسحور کی طرح وہ اس تصویر کے ساتھ آنکھیں ملانے پر مجبور تھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے چہرے پر سے ہاتھ اُٹھائے تصویر حد درجہ تلطف آمیز اور ترحم انگیز نظروں سے اُسے گھور رہی تھی، لیکن بدقسمت عورت گناہ کے دھندلے شیشے میں سے اُسے دیکھ دیکھ کر خود بخود کانپ رہی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا اُس کی معصیت آلود ہستی اس تصویر کی نفاست، پاکیزگی اور دلربائی کے سامنے قطرۂ شبنم کی طرح پگھلتی جا رہی ہے۔ وہ یکایک کھڑی ہو گئی، لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھی اور اس تصویر کو چوم لیا۔ وفورِ محبّت سے اُس نے کئی بار چوما اور نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی۔ ان بوسوں نے اس کے تلاطمِ جذبات میں طغیانی کی نئی لہر پیدا کر دی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ غم کے جس طوفان کو وہ اب تک روکے ہوئے تھی، آخر اُس نے آنکھوں کی راہ بہنا شروع کیا۔ جوشِ گریہ سے متاثر ہو کر، منہ اونچا کر کے دونوں ہاتھ تصویر کی جانب پھیلا کر، وہ کہنے لگی "للّٰہ مجھے معاف کر دے، میری خطاؤں پر خطِ عفو کھینچ دے، اے مجھ سے خفا ہو کر جانے والے آ دیکھ کہ میرا دل تیری یاد میں کتنا بے قرار ہے۔ میرا جگر تیری محبت میں کیونکر خون ہوا جا رہا ہے۔ میری راتیں سوگوار ہیں، میرے دن بیزار ہیں، تو نے ایک دفعہ جا کر پھر میری خبر نہ لی۔ سچ ہے میں نادان تھی، تیری محبت کی قدر نہ پہچان سکی، لیکن تُو تو سچے دل سے مجھے چاہتا تھا، تیری الفت کیوں نفرت میں تبدیل ہو گئی۔"

فراموش شدہ ماضی کے دھندلکے میں سے پُرانی صورتیں نئے نئے لباسوں میں نمودار ہونے لگیں۔ اُسے یاد آ گیا کہ ابھی وہ بچی ہی تھی کہ اس گھر کے ہنگاموں، یہاں کی رونقوں اور دلآویزیوں کو کس قدر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔ مجالسِ رقص میں جب اُس کی ماں زرلفت کی پشواز پہن کر تماشائیوں کی نظروں کو خیرہ کر کے اپنے مدہوش کُن گانے سے اُن کے دماغوں پر جادو سا کر دیتی تھی تو وہ دل ہی دل میں آرزو کیا کرتی کہ خدا یا مجھے ایک رات ہی میں میری اماں کے برابر کر دے تاکہ میں بھی اچھے اچھے کپڑے پہن کر ان لوگوں کے درمیان بیٹھ سکوں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ جوان ہوتی گئی۔ اُس گھر میں آنے والوں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں۔ اب اُسے تعلیم کے لئے اُستادوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس پر پابندیاں عائد ہونے لگیں۔ اُسے آزادانہ ہر شخص کے ساتھ ملنے سے منع کیا گیا۔ اس کی نشست و برخاست میں سلیقہ پیدا کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ وہ قد و قامت میں، ڈیل ڈول میں بڑھتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں لوچ، آنکھ میں جادو اور لب پر مسیحائی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ اسرارِ شباب ایک ایک کر کے منکشف ہونے لگے اس کی رگوں میں گرم گرم خون تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگا۔ بعض دفعہ گاتے گاتے اس پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ جوان تھی اور جوانی کی بے پناہ حدت کے باوجود کبھی کبھی اپنے آپ میں سخت کسل مندی محسوس کرتی تھی۔ وہ ان عجیب و غریب جذبات کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھی۔ وہ سر بفلک، شاندار طلسمی محل کی دہلیز پر کھڑی تھی جہاں صرف ایک قدم اُٹھانے کی دیر تھی کہ زندگی کے سربستہ رموز خود بخود بے نقاب ہو سکتے تھے۔

اب وہ اپنے عروج پر تھی۔ حُسن و شباب کی ملکہ، رعنائی و جمال کی مجسمہ، موسیقی کی دیوی، وہ سبھی کچھ تھی۔ دُنیا اُس کی پرستار تھی۔ لوگ دُور دُور سے آ کر اُس کے حضور ہدایائے نیاز پیش کرتے تھے۔ اُسے سب چاہتے تھے لیکن وہ سنگ دل حسینہ کسی کی نہ تھی۔ سیم و زر کی طلائی دیواروں کے اندر محصور وہ کیوپڈ کے تیروں کی زد سے بالکل مامون و محفوظ تھی۔ مال و دولت کی فراوانی نے اُس کے دل کو محبّت کی حسِ لطیف سے معرّا کر دیا تھا۔ شوقِ خود نمائی و جذبۂ خود پسندی کی شدّت اُسے دوسروں کے احساسات سمجھنے سے مانع آتی تھی۔ اظہارِ جمال و اظہارِ کمال کی خواہش میں سرشار وہ خود بینی و خود فراموشی کے مخلوط جوئباروں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ اُسے شب و روز لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ کبھی اُن کے ارمان بھرے دلوں کو ایک نگاہِ التفات سے فریب

الفت میں گرفتار کر دیتی کبھی انہیں شوقِ وصال و کاہشِ فراق کی الجھنوں میں مبتلا کر کے اُن کی بڑھتی ہوئی آرزوؤں کا جائزہ لیتی رہتی اور پھر یکایک چشمِ سحرکار کی ایک جنبشِ احتراز سے تمام حسین و جمیل امیدوں کو ملیامیٹ کر ڈالتی تھی - چاہنے والوں کی ہجومِ شوق سے لبریز اور شعلۂ عشق سے فروزاں نگاہیں کمزور تیروں کی طرح جو قلعہ کی سنگین دیوار سے ٹکرا کر واپس آجائیں، اُس کے جسمِ مرمریں کو چھُو چھُو کر لوٹ آتی تھیں - اُس کے تہ در تہ لپٹے ہوئے پُراسرار دل تک رسائی ناممکن تھی -

ایک شام جب حسبِ معمول محفلِ غنا منعقد تھی اور وہ تماشائیوں کی حریص نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی بیک وقت جنتِ نگاہ و فردوسِ گوش کا سامان مہیا کر رہی تھی دو شخص اس کے ہاں وارد ہوئے - ایک ذرا پختہ عمر اور گندمی رنگ کا، دوسرا بالکل نوجوان، باغِ حیات کا نوشگفتہ پھول اور حد درجہ حسین و رعنا - اس قتالہ کی مردم شناس آنکھوں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ دوسرا نوجوان جو شرمائی ہوئی نگاہوں سے، دائیں بائیں دیکھ دیکھ کے، گھبرا گھبرا کے قدم اٹھا رہا تھا، جو مجمع کو کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا اپنی زندگی میں شاید پہلی مرتبہ ایسی جگہ داخل ہو رہا ہے - اس نے سروقد کھڑے ہو کر تعظیم دی اور رسمی مزاج پرسی کے بعد پان الائچی سے تواضع کی - پھر سنبھل کر، کاندھے سے سرک جانے والے دوپٹے کو بائیں ہاتھ سے سمیٹ کر، اپنی ترنم آگیں آواز کو دل ہی دل میں تول کر اور غزالیں آنکھوں کو پھرا پھرا کر اُس نے غالب کی مرصع غزل شروع کی -

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا"

خوبصورت نوجوان چند لمحے مبہوت و خاموش بیٹھا رہا - وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ایک انسان کو اپنے گلے پر اسقدر اختیار ہو سکتا ہے - انسانی آواز اس درجہ ہوشربا اور فرحت افزا ہو سکتی ہے - وہ حیران تھا کہ جس ہستی کے کمالِ فن کا وہ مشاہدہ کر رہا ہے وہ عالمِ غیر مرئی سے تعلق رکھتی ہے یا خود اس کی مانند گوشت پوست سے مرکب ایک فانی پیکر ہے - وہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا جاتا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو پیکرِ صد بہار بہ ہزار ناز و رعنائی اس کے روبرو جلوہ ریز تھا نغمۂ پرّاں میں تحلیل ہوا جاتا ہے یا نوائے ازل نے متشکل ہو کر اُس رشکِ آفتاب کی صورت اختیار کر لی ہے - موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ اُس کی رُوح وجد میں آ رہی تھی - وہ گانے والی ساحرہ کے انتہائے کمال کی جی کھول کر داد دینا چاہتا تھا لیکن ماحول کی اجنبیت، حاضرین کی عقابی نگاہیں اور بڑی عمر والے ہمراہی کی موجودگی اُسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی -

جب وہ اس شعر پر پہنچی ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تو وہ بیتاب ہو گیا - سب شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اور مجسم عجز و فتادگی بن کر اس نے دو بار "سبحان اللہ" "سبحان اللہ" پکارا - حسین مغنیہ نے نشۂ کامیابی سے مخمور نگاہیں اوپر اٹھائیں اور سر کو خفیف سا خم دے کر گویا زبانِ حال سے اس کی قدردانی کا شکریہ ادا کیا اور ایک دلپذیر تبسم کے ساتھ وہ شعر دوبارہ گا دیا -

ایک ہفتے کے بعد وہ نوجوان پھر اس کے مکان پر آیا - لیکن تنہا - شام کو نہیں بلکہ سہ پہر کے وقت - وہ تخلیہ میں اس سے باتیں کرنے کا خواہاں تھا، اُس نے نہایت ادب و تکریم کے ساتھ اُسے لے جا کر مسند پر بٹھا دیا - جذبات گوناگوں کی آمیزش نے دونوں کے ہونٹوں پر مہرِ خاموشی لگا دی - بہرحال وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اُس کا تیر خالی نہیں گیا - نوجوان کے دل میں دفتر کے دفتر بھرے ہوئے تھے - لیکن اس کی قوتِ گویائی جواب دے بیٹھی تھی - وہ بات کرنا چاہتا تھا لیکن الفاظ زبان تک پہنچنے سے قبل ہی موت کے سے سکوت میں تبدیل ہو جاتے تھے - آخر اُس نے دل کڑا کر کے کہا -

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"آپ کو ایک مرتبہ دیکھ کر بھول جانا ممکن نہیں"

وہ جھینپ سا گیا "لیکن آپ کے یہاں تو بہت بڑے بڑے آدمی آتے ہیں - ہم کس قطار و شمار میں ہیں -"

اس نے جواب دیا - "عجز و انکسار اسی کو زیبا ہے جو اس کا اہل ہو - آپ تو ہر تعریف سے مستغنی اور ہر ستائش سے بے نیاز ہیں - شمع رات بھر جلتی ہے لیکن صرف چند گز زمین کو روشن کر سکتی ہے - اور بجلی ایک لمحے کے لئے چمکتی ہے تو زمان و مکان کو پُرنور کر جاتی ہے -"

وہ حیران تھا کہ کتنی حاضر جواب اور کیسے ذوقِ سلیم کی مالکہ سے واسطہ پڑا ہے - اُس کا اب تک یہی خیال تھا کہ اس طبقے کی عورتیں نفسانیت سے لبریز اور مذاقِ صحیح سے کلیتہً عاری ہوتی ہیں - لیکن اب اس کا نظریہ بُری طرح باطل ہو رہا تھا - اتنی دیر میں ملازم برف میں لگا ہوا لیمونیڈ لے آیا - اس نے اس تکلفِ بے جا پر چند رسمی جملے کہہ کر گلاس تھام لیا - آبِ یخ نے اُس کے نظامِ عصبی میں سکون و سرور کی ایک لہر دوڑا دی - اب اس کی زبان رواں تھی اور خیالات اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح

جاری - غرض ایک گھنٹہ تک بہت لطف کی صحبت رہی اور آئندہ ملاقات کے وعدے وعید کرکے وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے رخصت ہوا -

نوجوان چلا گیا تو وہ سربگریباں ہوکر بیٹھ گئی - آج اس کے مکان کی زمین ایک ایسے شخص کے قدموں سے مس ہوئی تھی جو ان تمام لوگوں سے مختلف تھا جو اس کے ہاں آنے کے عادی تھے - اس کے چہرے کی شگفتگی و تازگی شبنم سے دُھلے ہوئے گلاب کی مانند نظر افروز تھی - اُس کا بھولپن اور سیدھا سادا طرزِ کلام ظاہر کرتے تھے کہ ابھی اُسے ناجائز و پُرتصنع محبت کے کوچے کی ہوا نہیں لگی - آہ وہ اُس کے روبرو بیٹھی کتنی بے بضاعت اور کیسی بے حقیقت معلوم ہو رہی تھی - اُس کا غازے سے اٹا ہوا چہرہ، اُس کی سُرمے سے تیز کی ہوئی چشم ہائے فسوں ساز، اُس کے مصنوعی سرخی سے جلا پائے ہوئے رُخسار اُس نوجوان کے رُخِ روشن کے سامنے ماند ہوئے جا رہے تھے - آج اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی ملاوٹ اور بناوٹ کی باتیں، اُس کی دل لبھانے کی گھاتیں جن کی مدد سے وہ ایک جہان کو تہ و بالا کر چکی تھی - اس نووارد کی ایک بے پروا نگاہ کے سامنے بے کار تھیں - وہ اب تک اپنے تئیں آفتاب سمجھے ہوئے تھی - لیکن جب آفتاب طلوع ہوا تو ذرّہ بھی نہ رہ سکی - کیوپڈ، جس کے بے پناہ تیروں کی زد سے کوئی ذی روح محفوظ نہ تھا اب اُس کا ترکش خالی تھا اور وہ خود ایک نوعمر صیّاد کے تیر کا گھائل ——— لیکن وہ اُس کے مکان پر کیوں آیا تھا؟ شروع شروع میں اُس سے آنکھ تک نہ ملاتا تھا - فرش پر نظریں جمائے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے، وہ بار بار اُس کے گانے کی تعریف کرتا تھا - بات ٹکڑے ٹکڑے ہوکر اُس کے منہ سے نکلتی تھی - کوئی عامیانہ فقرہ کوئی سوقیانہ اصطلاح، کوئی نازیبا لفظ اُس کی زبان پر نہ آتا تھا - یہ اجنبیت زیادہ دیر طاری نہ رہ سکی - پھر وہ قدرے بے تکلف ہوگیا - لیکن اس کی تہذیب و متانت اب پہلے سے بھی بڑھ گئی - کیا وہ اس سے محبت کرتا تھا؟ آہ کتنا لطیف خیال اس کے دماغ میں آیا - کاش وہ اُس کے قابل ہوتی، وہ اس مسرور انگیز تصور سے تھوڑی دیر کے لئے مدہوش سی ہو گئی - لیکن نہیں نہیں - وہ اسے اپنے ساتھ محبت نہ کرنے دے گی، وہ گلشنِ حیات کی اس نودمیدہ کلی کو نذرِ صرصر ہونے سے بچا لے گی - وہ جو کسی عصمت شعار نازنین کا سرتاج بننے کے لئے پیدا ہوا تھا ہرگز بازاری محبت کے چنگل میں نہ پھنسنے پائے گا - وہ اپنے جذباتِ پرستش کو جو اُس کے سینے میں مچل رہے تھے چھپا لے گی، اپنی حسیّاتِ نازک کو جو اس کی ذات سے وابستہ تھیں ہرگز ظاہر نہ ہونے دے گی - وہ اپنے شباب کی مرغوب آرزوؤں کو، جو ہر عورت کے ساتھ خواہ وہ گناہ کی عمیق ترین گہرائیوں میں غرق ہو جائے متعلق رہتی ہیں اور جن میں وہ ایک خیالی محبوب کی پذیرائی کے خواب دیکھا کرتی ہے، اس سے پوشیدہ رکھے گی - آہ وہ اپنے دل کا خون کرلے گی، اپنی زندگی کو مسل ڈالے گی، اپنی نسوانی امیدوں کو جن وہ کبھی کبھی اپنے افقِ حیات پر ایک نادیدہ لیکن پُرخلوص محبوب کو طلوع ہوتے دیکھا کرتی تھی، فنا کر ڈالے گی - یہی نہیں، بلکہ وہ اُس کی محبت کو، اگر اُس نے پیش کرنے کی جرأت بھی کی، تو ٹھکرا دے گی - اُس کی طرف سے منہ موڑ لے گی، اُس کو محبت کی ناپاک راہوں سے آشنا نہ ہونے دے گی - اس کی شفاف و بے داغ جوانی کو ہوس کی شعلہ آشامیوں سے پرے ہی پرے رکھے گی - یہ خیال کرتے کرتے نایوسی و نامرادی کہر کی طرح اس کی رُوح پر چھانے لگی اور اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک پیدا ہوگئی -

---

"آہ زینت! تم مجسّم زینت ہو، زینتِ محفل ہی نہیں زینتِ گیتی ہو - تم جو ایک شریف گھرانے کی ملکہ اور ایک چاہنے والے شوہر کی آنکھ کا نور بننے کے لئے پیدا ہوئی تھیں آج کیسی زندگی بسر کر رہی ہو؟"

وہ نوجوان ایک ماہ بعد اُس کے مکان پر خلوت میں بیٹھا نہایت جوش سے گفتگو کر رہا تھا -

"ذرا اپنی شکل کی طرف دیکھو، اپنے نام اور پھر اپنے کام کو دیکھو میں حیران ہوں کہ تمہارا مذاقِ سلیم کیوں اس طرزِ زندگی کے خلاف بغاوت نہیں کرتا - تمہاری حسِ لطیف کیوں اس کثیف و متعفن ماحول کی سلاسل کو توڑ پھوڑ کر نہیں رکھ دیتی - تم حسین ہو، لاریب ایک بے بہا عطیہ ایزدی کی مالک ہو - تم خوش گلو ہو، بلاشبہ قدرت کی ایک بیش قیمت نعمت سے مالا مال ہو - لیکن فطرت کی اس فیاضی سے جو اُس نے تمہارے ساتھ روا رکھی ہے - یہ لازم تو نہیں آتا کہ ان انمول موتیوں کو نااہلوں کے سامنے مٹی میں رول ڈالو - یاد رکھو ہر چیز اسی وقت تک قیمتی ہے جب تک وہ غیر الحصول ہے - جوں ہی کسی شے کی بازار میں قیمت پڑی اس کا کمال فنا ہو جائے گا - اور اس کی دلفریبی خاک میں مل جائے گی - جتنی عام ہوتی جاؤ گی اتنی ہی اپنی قدر و وقعت کو زائل کرتی جاؤ گی - میں تو اس تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہوں کہ ہر بازاری آدمی، ہر آوارہ منش نوجوان، اور ہر اوباش مزاج شہدا، چاندی کی چند ٹکیاں جیب میں ڈال کر تمہارے کوٹھے پر بے باکی سے چڑھ سکتا ہے - کیا تم نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی سوچا کہ یہ راہ جس پر تم بے تکلفی سے گامزن ہو کہاں جا کر ختم ہوتی ہے؟

صحیح ہے کہ جوانی ایک ہی مرتبہ آتی ہے لیکن اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس نایاب جوہر کو بے حد حزم و احتیاط سے سنبھال کر رکھا جاتا۔ مگر حیرت ہے کہ تم اس محدود خزانے کو کس بے دردی سے لٹا رہی ہو۔ اپنے گرد و پیش ایک نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کیا نظر آتا ہے۔ ہوس کا انجام بڑا دردناک گناہ کا ردِ عمل بے حد عبرتناک اور قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ سخت خطرناک ہوتا ہے۔ موسمِ گل بہت مختصر اور عہدِ شباب چشم زدن میں ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ خزاں کی پائمالی اور بڑھاپے کی بے دردی کا کوئی مداوا نہیں۔ دانا وہی ہے جو بہار میں خزاں اور جوانی میں پیری کا سامان مہیا کرے۔ سنتی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں اپنی محبت پیش کرتا ہوں۔ جان و دل تم پر نثار کرتا ہوں، اپنی عزت و آبرو تمہارے حوالے کرتا ہوں، اپنا سرمایۂ حیات تم پر قربان کرتا ہوں۔ للہ ان کو قبول کرو اور میری بن جاؤ ؎

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انساں نہ رائگاں کاٹے

بولو! خدا کے لئے بولو! میری عزیز ترین خواہش کا جواب دو۔ بس پھر کہتا ہوں کہ اس طرزِ زندگی سے کنارہ کر لو۔ اس معصیت آلود روش کو چھوڑ دو اور میری محبت و خلوص سے لبریز آغوش میں آجاؤ۔"

وہ سن رہی تھی۔ الفاظ کانوں کی راہ دل میں اُترے جا رہے تھے۔ الفاظ نہیں بجلی کے تار تھے جنہوں نے اس کی رگوں میں قیامت کا ارتعاش اور روح میں بے پناہ آگ لگا دی تھی۔ وہ اس نوجوان سے آنکھیں نہیں ملا سکتی تھی۔ کسی نامعلوم طاقت نے اُس کا حوصلہ سلب اور اس کی ہمت ضبط کر لی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کرے۔ اس کے مقدس ارادے اور قابلِ تحسین عزائم جو اُس نے نوجوان کی آمد سے قبل باندھ رکھے تھے اب سیلاب خوردہ دیوار کی طرح آہستہ آہستہ بیٹھ رہے تھے۔ وہ منجدھار میں کھڑی دامن کو تر ہونے سے بچا رہی تھی۔ شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور وہ ان کے درمیان کھڑی ہوئی اپنے ہلکے پھلکے لباس کو آگ کی لپیٹ سے محفوظ رکھنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ اس کا محبوب جس کی ایک نگاہ اُسے عشق کی حقیقی چاشنی سے آشنا کر گئی تھی اب اس کے روبرو بیٹھا بہ صد عجز و انکسار اپنی محبت پیش کر رہا تھا۔ آہ حُسن خود عشق کے قدموں پر سر رکھ کر التجائے التفات میں مصروف تھا۔ وہ چپ سادھے رہی۔ وہ اس درد و محبت میں ڈوبی ہوئی تقریر کا جواب دینے سے عاجز تھی۔ وہ مرصع الفاظ، پُرجوش اندازِ بیان اور بلا کی فصاحتِ کلام کہاں سے لاتی۔ نوجوان نے اس سکوت سے گھبرا کر پھر کہا "زینت میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔"

"میں آپ کو کیا جواب دوں؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ مجھ سے ہمکلام ہو رہے ہیں۔ معاف فرمائیے، ایسے پاکیزہ خیالات کی مخاطب مجھے قرار دینے میں آپ نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ آپ ایک ذی عزت خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت اور دنیاوی وجاہت اس بات کی متقاضی ہے کہ آپ اپنے پائے کی لڑکی تلاش کریں۔ ہم لوگ آبرو باختہ ہیں عصمت فروش ہیں، ننگِ انسانیت ہیں۔ ہمارا آپ کا جوڑ ناممکن ہے۔ دنیا ہمیں جس نگاہ سے دیکھتی ہے۔ آپ اُس سے واقف ہیں۔ یقیناً مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ اس وقت ایک خاص جذبہ طاری ہے جس کے ماتحت آپ بے تکلفی سے سب کچھ کہہ گئے ہیں، لیکن جوں ہی آپ اس چار دیواری سے نکل کر اپنے گھر کی مصفا فضا میں پہنچے آپ اپنے طریقِ عمل پر افسوس کریں گے کہ کیوں ایسے گرانقدر خیالات ایک ادنیٰ درجے کی عورت پر ضائع کئے جو کسی لحاظ سے بھی آپ کے لائق نہ تھی۔ میری التجا ہے کہ آپ اپنے معزز والدین کی شاندار امیدوں کو جو وہ آپ سے لگائے بیٹھے ہیں، بطریقِ احسن پورا کرنے کا سامان پیدا کیجئے۔ آپ ابھی نوعمر ہیں، آپ نے زندگی کا دیکھا ہی کیا ہے چند روز میں جب آپ کو دنیا کے نشیب و فراز کا کچھ تجربہ ہو گیا تو آپ آج کی گفتگو کو یاد کر کے اپنی سادہ لوحی پر ہنسا کریں گے۔ مجھے آپ سے شرفِ نیاز مندی حاصل ہے اور میرے فخر کرنے کو ایک یہی بات کافی ہے کہ میرا غریب خانہ آپ ایسے یکتائے روزگار سے کسبِ انوار کر چکا ہے۔"

نوجوان کی امیدوں پر اوس سی پڑ گئی جواب بالکل خلافِ توقع تھا۔ اس کی خوبصورت پیشانی شکن آلود ہو گئی اور سُرخ و صبیح رخساروں پر زردی سی چھانے لگی۔ وہ جو اس وقت تک عیش و تنعم میں پل کر جوان ہوا تھا جس نے آج تک نہ کبھی دستِ سوال دراز کیا اور نہ کبھی حرفِ انکار سے اپنی خودداری کو پامال دیکھا تھا اب ایک رقاصہ کے ہاتھوں متاعِ صبر و قرار کو لٹا کر اپنی غیرت و عزتِ نفس کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ اس بھولے شہزادے کو کیا معلوم تھا کہ "عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا"۔ اس کے شاعرانہ دل و دماغ سے رنگین شعاعیں نکل نکل کر اُس کی محبوبہ پر پڑ رہی تھیں اور وہ اپنی شعریت سے لبریز فطرت کے اس انعکاس کو اس عورت کا طبعی حسنِ مذاق تصور کرتا تھا۔ اب کہ مایوس کن جواب نے اُس کی آرزوؤں کے قصرِ رفیع الشان کو پاش پاش کر دیا تو وہ یہ سمجھا کہ اُس کی مخاطب عمداً ان آلائشوں سے نکلنا نہیں چاہتی۔ اور بہانا مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کا بہانہ بنا کر اُسے ٹال دینا چاہتی ہے۔ وہ جذبات کے کوہِ آتش فشاں کو جو اس کے دماغ میں پھٹ پڑا تھا دبا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر عشق کی بے کسی نے اُسے مجبور کیا کہ رخصت ہونے سے

قبل آخری دو باتیں تو کرتا جائے۔ اس نے کہا "میں سمجھتا تھا کہ تم اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتی ہو۔ لیکن آج مجھے اپنے خیالِ خام کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ تم ابھی جوان ہو اور حسن و شباب کے نشے میں مآلِ زندگی سے بےخبر۔ شہرت نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور تم کھوٹے کھرے کی پہچان سے محروم ہو لیکن یاد رکھو وہ دن دور نہیں جب شمع گل ہو جائے گی اور پروانے ایک ایک کر کے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ جب پھول مرجھا جائے گا اور بھونرے خشک پتیوں کو چھوڑ کر اُڑ جائیں گے۔ اُس وقت تمہیں میرے الفاظ کی صداقت اور میری محبّت کی قدر کا احساس ہو گا ؎

ملاقی ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

تم اس بالاخانے میں بیٹھ کر ایک ایک حرف سے جو تمہاری زبان سے نکلتا ہے، ایک ایک حرکت سے جو تمہارے جسم سے ظاہر ہوتی ہے محبت کے جذبۂ پاک کی توہین کرتی ہو۔ لیکن سمجھ رکھو کہ اس محبّت کا، جو چوبیس گھنٹے تمہارے ہاں اپنی ذلّت و رسوائی کا دل خراش منظر دیکھتی ہے، انتقام بڑا خطرناک ہو گا۔ تمہیں وہ شام یاد ہے جب تم یہ غزل گا رہی تھیں؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں نے تو اُسی وقت کہا تھا کہ اگر وفا و مودّت کی پرکھ رکھتی ہو تو اس دل کو دیکھو جو روزِ ازل سے جذبۂ وفا سے سرشار ہو چکا ہے۔ لیکن آہ، نہ تمہیں وفا سے غرض ہے اور نہ خلوص و محبّت سے سروکار۔

زینت! سنتی ہو میں کیا کہتا ہوں؟ میں کل شام دہلی چلا جاؤں گا۔ میرا پتہ تو تمہیں معلوم ہے، اگر جی چاہے تو کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا ؎

کسی صورت سے دل کو شاد کرنا
ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا

فرش پر لیٹے لیٹے، ایک ایک کر کے، یہ سب باتیں حیرتناک ترتیب کے ساتھ اُس کے دماغ میں نمودار ہوتی رہیں۔ اُس نے اپنے قلبِ مجروح کے زخموں کو اس نوجوان سے اوجھل رکھ کر اپنے اوپر کذب و افترا کا الزام لینا منظور کر لیا۔ اُس نے اپنے اظہارِ شوق کو تصنّع اور اپنی الفت کو منافقت سے تعبیر کرنا پسند کر لیا، لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ وہ حسین و بےعیب شہزادہ اُسے چھُو کر اپنی پاکیزہ جوانی کو داغدار کر جائے۔ لیکن اب ــــ اب کہ وہ زندگی کے ہاؤ ہو سے بیزار ہو کر گوشۂ عافیت کی متلاشی تھی، اب کہ وہ محبّت کی گرم جوشی کے نیچے چھپی ہوئی طمع و خود غرضی کی سرد مہری دیکھ چکی تھی، اب کہ وہ اپنی خلوت و جلوت کے رنگین مشاغل کی بےحقیقتی و ناپائیداری کو چشمِ دوربیں سے بھانپ چکی تھی، وہ چاہتی تھی کہ اُس کے پر لگ جائیں اور وہ اُڑ کر اپنے محبوب کے پاس پہنچ جائے۔ کیا وہ اس طرح اپنی ناقدری تو نہ کرائے گی؟ بن بلائے اس کے ہاں چلے جانے میں اُس کی سُبکی تو نہ ہو گی؟ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ جب دنیا کی نظروں سے گر گئی، جب بوالہوسوں کی ہوس سیراب ہو گئی تو رسوائی کو ٹھکانے لگانے اس کے ہاں آ گئی؟ ــــ وہ سب طعنے سُن لے گی، سب طنزیہ باتیں برداشت کر لے گی۔ مگر موجودہ طرزِ زندگی کو ہرگز طول نہ دے گی۔ محبّت کا رستہ خاردار ہے تو ہو، اس کے پاؤں بھی کانٹوں سے چھلنی ہونے کو تیار تھے۔ اُس نے ہاتھ کے پُر زور جھٹکے سے قریب پڑی ہوئی تپائی کو پرے ہٹا دیا اور کھڑی ہو گئی، اُسی ایک جھٹکے سے گویا معصیت آلود عشرت کی نازک زنجیروں کو طرفۃ العین میں ریزہ ریزہ کر دیا، اور ــــ اور دل میں شوق و اضطراب کا ایک طوفان چھپائے، جس سے اس کے جسم کی رگ رگ کانپ رہی تھی، وہ شام کی گاڑی میں سوار ہو کر دہلی جا رہی تھی۔

عاشق بٹالوی

قلمی معاونین توجّہ فرمائیں

"شاہکار" کے قلمی معاونین کی خدمت میں التماس ہے کہ مضامین وقت پر ارسال فرما کر شکرگزار فرمائیں۔ اپریل کا پرچہ لکھا جا رہا ہے۔ اس کے لئے مضامین دس دن کے اندر پہنچ جانے چاہئیں۔ اور مئی نمبر کے لئے ۲۵ مارچ تک تمام مضمون بھیج دیئے جائیں تاکہ رسالہ وقت پر شائع ہو سکے۔

افسانہ نگار حضرات خصوصیت سے توجہ فرمائیں۔ (مدیر معاون)

شہر قدیم پومپیائی

دُنیا میں بعض ایسے نفائس موجود ہیں کہ ان کا تعلق کسی خاص قطعہ یا ملک سے نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً وہ تمام اہلِ دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جس شخص کو کچھ بھی علم یا آرٹ سے مس ہو، وہ ان کے خراب یا معدوم ہونے سے افسوس ظاہر کرتا ہے اور ان کے دیکھنے یا کم از کم ان کا حال نہایت شرح و بسط کے ساتھ سننے سے خوشی محسوس کرتا ہے۔ آج ہم ناظرین کو اٹلی کے ایک قدیم تاریخی شہر کی سیر کرائیں گے۔ اس شہر کا نام پومپیائی ہے، جو تقریباً سترہ سو برس خاک کے نیچے دبا رہا ہے۔ اس کے تمام ظاہری آثار مٹ گئے تھے۔ کہ اتفاق سے زمین کے نیچے سے اس کے چند نشانات ظاہر ہوئے اور اس طرح دُنیا کو اس شہر کا حال معلوم ہوا۔

پومپیائی ولادتِ مسیحؑ کے اوائل میں ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا اور اٹلی کے مغربی ساحل پر کوہ ویسیوویس کے جنوبی دامن میں مشہور شہر ناپل سے چار پانچ میل مشرق کی جانب واقع تھا۔ سلطنتِ روما کے اشراف و اعیان گرمی کا موسم اسی مقام پر گزارتے تھے۔ اس شہر کی آبادی بیس ہزار نفوس تھی۔ لوگ آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ اس پُر نشاط وادی کے نیچے شرربار آگ شعلہ زن ہے اور کسی دن سخت پتھروں کو پھاڑ کر آتش باری شروع کر دیگی۔ جدید کشفیاتِ علمی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ویسیوویس نہایت قدیم زمانے میں آتش فشاں رہا ہے۔ لیکن اُس زمانے میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں نہایت سرسبز اور دلکش پہاڑ تھا۔ اس کے جاں بخش اور روح افزا مناظر دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتے تھے۔ لیکن آتش فشانی کے کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ جغرافیائے عمومی، میں لکھا ہے کہ اس پہاڑ کے سرسبز دامن میں مغربی جانب ایک دریا بہتا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی تک تمام زمین مزروعہ تھی۔ اور کسی شخص کو بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ اس سرسبز اور پھولوں سے پُر سرزمین کے شکم میں آگ خوابیدہ ہے۔

۲۴ راگست ۷۹ء کی رات کو اچانک پہاڑ آتش فشاں ہوا۔ کوہ آتش فشاں جس کو یورپین زبانوں میں والکان[1] کہتے ہیں کی شکل ایک مخروطی مینار کی مانند ہوتی ہے۔ اِس کی چوٹی سے ہمیشہ دھواں اور بخارات خارج ہوتے رہتے ہیں۔ اور کبھی اِس طرح ہیجان میں آتا ہے کہ اُبلتا ہوا پانی، پتھر اور دوسرے پگھلے ہوئے مادے نہایت شدّت سے اس میں سے نکلتے ہیں اور بعض اس قسم کے پہاڑ ہیں کہ ہمیشہ حالتِ ہیجان میں رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں بہت سے پہاڑ آتش فشاں تھے۔ جو اب خاموش اور جامد ہو گئے ہیں۔ ان ہی سے دکن کی سطحِ مرتفع بھی ہے جو گذشتہ زمانے میں آتش فشاں تھی۔ اور اب بالکل خاموش ہے۔ اس وقت بھی روئے زمین پر تقریباً ۳۲۰ آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں۔ ان میں سے ۲۷۰ زیادہ اہم ہیں۔ ۱۰۰۰ سے بھی زیادہ ہیں کہ اس وقت خاموش ہو گئے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہیجان میں آنے سے پہلے ان سے بعض علامات ظاہر ہوتی ہیں اور دوسری یہ کہ بغیر کسی قسم کی علاماتِ پیشین کے ناگہانی طور پر آتش فشانی شروع کر دیتے ہیں۔ جو علامات قسم اوّل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بادل کی گرج کی مانند آوازیں ہوتی ہیں، جو اندرونِ زمین سے سنی جاتی ہیں۔ یا قرب و جوار کی زمین میں زلزلہ آتا ہے اور ہوا اتنی ساکن ہو جاتی ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے۔ چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس قدر بلند آواز اور تیزی سے آتش فشانی شروع ہوتی ہے جیسے یکدم کئی توپیں داغی جائیں۔ اس وقت اس کے دہانے سے بخارات اور غلیظ و کثیف دھواں باہر نکلتا ہے۔ بجلی کڑکتی ہے۔ اور زمین کا مواد لاوے کی صورت میں بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ باہر گرتا ہے۔ آخر کار مواد ذائبہ پگھلے ہوئے لوہے کی مانند ہوا میں ایک فوارے کی شکل میں اُچھلتا ہے اور زمین پر بہہ نکلتا ہے۔ اس ہیجان کے کچھ عرصہ بعد پہاڑ میں سکون ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر جلد ہی اسی طرح پہاڑ

---

[1] والکان لفظ ولکانوس سے جو آتش و فلزات کے دیوتا کا نام ہے، ماخوذ ہے اور قدیم یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ کہ اس دیوتا نے اپنی دھونکنی اور بھٹی کو اس پہاڑ کے نیچے رکھا ہوا ہے اور اسے دھونکتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ آتش فشانی ہوتی ہے۔

کے دہلنے سے دھواں اور بخارات بلند ہوتے ہیں - اور دوسرے ہیجان تک بلند ہوتے رہتے ہیں - آتش فشاں پہاڑوں کی پھٹنے کی قوت اور مادے کی مقدار جو ان کے دہلنے سے خارج ہوتا ہے اسقدر ہے کہ ایک جاہل شخص کو ان کے تسلیم کرنے سے تامل ہوگا.
چنانچہ جزیرۂ سسلی میں جو پہاڑ آتنا ہے وہ جب ہیجان میں آیا تو ایک ہی آتش فشانی میں اس نے قریباً تین ہزار مکعب میٹر مواد آتشین باہر نکال پھینکا - اور اسی کوہ ویسیوویس سے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں ایک موقع پر اتنا لاوا نکلا کہ جب وہ منجمد ہوگیا - تو اس کا حجم تقریباً دس ہزار مکعب میٹر تھا - اور یہاں تک کہ ایک دوسرے ہیجان میں مادہ ۱۴ ہزار مکعب میٹر تک پہنچ گیا - اور اسی طرح جزیرۂ آئیسلانڈ میں ایک پہاڑ سے ۱۷۸۳ء میں لاوے کے دو بڑے بڑے آتشیں دریا جاری ہوئے - ان میں سے ایک کا طول سات کوس اور عرض دو کوس اور دوسرے کا طول بارہ کوس اور عرض چار کوس تھا - ان کی گہرائی بیابانوں میں تین گز اور دروں میں قریباً بیس گز تھی - اور کبھی کبھی بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر کہ ان میں سے ایک ایک کا وزن بیس بیس من ہوتا ہے ، دو تین میل کے فاصلے پر پھینکا ہے یہاں تک کہ دیکھا گیا ہے کہ کوہ ویسیوویس نے بڑے بڑے پتھروں کو ہوا میں ۱۲۰۰ گز کی بلندی تک پھینکا ہے -

شہر پومپیائی جس کا ہم ذکر کر رہے تھے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے - میلادِ مسیحؑ کے ادائل میں بہت عمدہ اوصاف شہر تھا - ہر طرف سے روم کے اعیان واشراف تفریح اور عیش وعشرت کے لئے یہاں آتے تھے - چنانچہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ ۵۹ء میں یعنی اس شہر کے برباد ہونے سے بیس سال پہلے اس کے ایک تماشہ خانہ میں شہریوں اور ان تماشائیوں میں جو کہ اطرافِ شہر سے تماشہ دیکھنے کے لئے آتے تھے ایک جھگڑا پیدا ہوگیا - طرفین کے بہت سے آدمی مجروح ہوئے اور مارے گئے - حکومتِ روم نے اہلِ شہر کی تنبیہ کے لئے حکم دے دیا کہ شہر مذکور میں دس سال تک کوئی کھیل یا تماشہ نہ دکھایا جائے - آج جبکہ شہر کے کھنڈرات خاک اور خاکستر کے نیچے سے کھود دئے گئے ہیں - تو ایک مکان کی دیوار پر اس جھگڑے اور پکڑ دھکڑ کی تصویر منقوش ہے اور نہایت صاف دکھائی دیتی ہے -

۶۳ء میں اس شہر میں ایک سخت زلزلہ آیا - جس سے بہت سی عمارات اور مکانات منہدم ہو گئے اور لوگ اس ناگہانی تہلکہ سے اس قدر خوفزدہ اور سراسیمہ ہوئے کہ روم کی مجلس اعیان (سنا) نے مکانات کی دوبارہ تعمیر و ترمیم روک دی - لیکن شہر والوں نے آہستہ آہستہ اجازت حاصل کر لی -

اور جیسا کہ موجودہ کھنڈرات سے نتیجہ نکالا جاتا ہے - انہوں نے ویران شدہ عمارات کو تعمیر کرنے کا کام ابھی شروع کیا ہی تھا کہ ناگہاں ۲۴ اگست ۷۹ء کی رات کو کوہ ویسیوویس نے آتش فشانی کا آغاز کیا اور پومپیائی کو دو اور قریب کے شہروں کے ساتھ جن کا نام ہرکولانوم اور استابی تھا نہایت قلیل مدت میں مکمل طور پر منہدم اور ویران کر دیا - اور مٹی، راکھ اور مادے کے بلند طبقات کے نیچے پنہاں کر دیا -

اس وحشتناک واقع کی تفصیل یوں ہے کہ مذکورہ رات کو پہاڑ کی چوٹی سے دھواں نکلنا شروع ہوا - کبھی روشنی ہو جاتی تھی اور کبھی تاریکی - خاک اور پگھلا ہوا مادہ اس سے بلند ہوتا تھا اور ریت اور بڑے بڑے پتھروں کی بارش برستی تھی - جس نے شہر کو ایک گز کی گہرائی تک ڈھانپ لیا - بہت سے اہالیان شہر اسی ہنگامے میں ہلاک ہو گئے اور بعض جو بھاگ نکلے - انہیں موت نے راستے میں ہی جا لیا - بعض ایسے جسم خاک کے نیچے سے برآمد ہوئے ہیں جو اسی بھاگنے کی حالت میں ہاتھ میں نقدی کی تھیلیاں لئے صدیوں مٹی کے نیچے دبے رہے ہیں - اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی حالتِ فرار میں پنجۂ اجل میں گرفتار ہو گئے - خلاصہ احوال اسقدر پگھلا ہوا مادہ، مٹی، راکھ اور اُبلتا ہوا پانی شہر پر گرا کہ ان کے طبقات کی گہرائی سات گز تک پہنچ گئی اور شہر مکمل طور پر اس میں چھپ گیا اور روئے زمین سے ایک عرصہ کے لئے مفقود ہوگیا - ہرکولانوم میں بھی اس مادے کی گہرائی تین گز سے زیادہ تھی -

کوہ ویسیوویس کی آتش فشانی کی تفصیل پلینیوس خورد مشہور رومی ناثر نے اپنے دو خطوط میں جو اس نے اسی زمانے میں اپنے دوست اور مشہور رومی مؤرخ تاسیت کو لکھے تھے خوب وضاحت سے قلمبند کی ہے - لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کا چچا پلینیوس قدیم اس موقع پر شہر ناپل کے نزدیک ایک بندرگاہ میں ایک جہاز کے امیر البحر کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا تھا - اور ان تینوں شہروں میں سے وہ استابی شہر کے باشندوں کو بچانے کے لئے نہایت سرعت سے وہاں گیا تھا - اور اسی کوشش میں گندے بخارات کے اثر سے خود بھی مسموم ہوگیا . . . تھا - جب وہ کوہ ویسیوویس کی آتش فشانی کا ذکر کرتا ہے - تو پومپیائی، ہرکولانوم اور استابی کے متعلق ایک کلمہ بھی نہیں لکھتا - لیکن ایک دوسرے یونانی مؤرخ نے جس کا نام دیون کاسیوس تھا - اپنی مشہور تاریخ روم میں ان شہروں کی بربادی کا حال بھی لکھا ہے - یہ مؤرخ تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا ہے - اس کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں -

اس واقعہ کے پندرہ سو برس گزر جانے کے بعد جب یہ ہولناک سانحہ لوگوں کے دلوں سے مکمل طور پر فراموش ہو چکا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں اتفاقاً ایک مکان کی بنیاد کھودتے ہوئے دو کتبے برآمد ہوئے۔ لیکن یہ کتبے لوگوں کی توجہ اچھی طرح اپنی طرف منعطف نہ کرا سکے۔ اور کسی نے انہیں کوئی وقعت نہ دی۔ ۱۰۰۰ھ میں ایک کنواں کھودنے کے موقع پر پومپیائی کا اصلی مرکز معلوم ہو گیا۔ لیکن اس کے کھودنے کے لئے جو قدم اٹھایا گیا وہ ۱۱۶۱ھ میں تھا۔ لیکن پھر بھی کام کسی اصول یا نقشہ کے مطابق نہ تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں کھدائی ۱۲۲۳ھ میں شروع ہوئی۔ ۱۲۷۶ھ سے ایک منظم اسّی آدمیوں پر مشتمل عملہ سمجھدار اور قابل آثارِ قدیمہ کے ماہروں کے سختِ نظر کھدائی میں مشغول ہے۔ اس وقت تک انہوں نے شہر کا ⅔ حصہ خاک کے نیچے سے کھود لیا ہے۔ سب سے پہلے جو چیزیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر چار ڈھانچے ہیں۔ جو اسی حالت میں بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اس وقت تک پڑے ہوئے تھے۔ اور اب انہیں ناپلز کے عجائب گھر میں رکھا گیا ہے۔ ان چار ڈھانچوں میں سے ایک عورت کا ڈھانچہ ہے، جس کے پہلو میں اس وقت کے ۹۱ مختلف سکے، دو چاندی کے پیالے، ایک چابیوں کا گچھا اور جواہرات پائے گئے تھے۔ اور ظاہری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہیں اٹھایا ہوا تھا۔ تاکہ انہیں لے کر بھاگ جائے اور اسی حالت میں ہلاک ہو گئی۔ یہ عورت ڈھانچوں کے بائیں طرف پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر نقاب اور انگلیوں میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے پہلو میں ایک اور عورت، ایک لڑکی اور ایک مرد پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تدریجاً اور بہت سے انسانی جسم برآمد ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے آثارِ قدیمہ مجسموں، ستونوں، عمارات، محلات، عام مکانات، عبادت گاہوں، میدانوں، حماموں اور دکانوں کی صورت میں کھودے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایسی چیزیں جنہیں حمل و نقل کیا جا سکتا ہے اب ناپلز کے عجائب گھر میں پڑی ہیں۔

پومپیائی شہر کی سڑکیں اور گلیاں عموماً سیدھی اور مستقیم ہیں اور ان میں اور بہت سے پرانے شہروں کی گلیوں کی طرح کوئی پیچ و خم نہیں ..... ان کی چوڑائی ۲۸ سے ۹ فٹ تک ہے اور ان پر پتھر کا فرش لگا ہوا ہے۔ پیدل چلنے والوں کے لئے الگ پٹریاں بنی ہوئی ہیں۔ جو سڑک کی سطح سے قدرے اونچی ہیں اور چوڑائی میں دو فٹ سے زیادہ نہیں۔

ارکانِ سلطنت میں سے قابلِ ذکر وہ محل ہے جس کا نام ہے کازول فونو کا محل، اس کی دیواروں کی منڈیر پر نہایت عمدہ خاتم کاری سے بہت دلکش تصویریں منقش کی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور تصویر ہے۔ جو سکندر اعظم اور دارائے سوم بادشاہِ ایران کی جنگ کا نقشہ ظاہر کرتی ہے۔ اس تصویر کا انکشاف ۱۲۴۷ھ میں ہوا۔ اور تاریخی و علمی لحاظ سے بہت گراں بہا ہے کیونکہ اغلب ہے کہ یہ تصویر یا تو خود سکندر کے عہد میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد کندہ کی گئی ہے۔ اس تصویر کی تمام جزئیات لباس، گھوڑوں کے ساز و سامان، اسبابِ جنگ اور ہتھیاروں کی حیثیت سے بالکل واقعہ کے مطابق ہیں۔ اس تصویر کے بائیں طرف سکندر کے روبرو دارا سوم بادشاہِ ایران ایک جنگی رتھ پر بیٹھا ہے۔ اس کے ارد گرد ایرانی لشکر ہے۔ جو سکندر کے لشکر کے ہجوم کرنے کی وجہ سے بھاگ رہا ہے۔ دارا کے پیچھے ایک سوار درفشِ کاویانی ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ خاتم کاری کا یہی حصہ خاص طور پر شکستہ ہے۔ جس کی وجہ سے جھنڈا اچھی طرح ظاہر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جھنڈے کا بالائی حصہ اور نیزے کی نوک جس سے جھنڈا بندھا ہوا ہے اور اسی طرح وہ حصہ جہاں سجاوٹ کے لئے زنگا رنگ کی جھنڈیاں لٹکی ہوئی ہیں، خوب نمایاں ہیں۔

لارڈ لٹن مشہور انگریزی نثر نگار نے ایک ناول "لاسٹ ڈیز آف پومپی آئی" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ ناول پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ مصنفِ مذکور نے نہایت محنت اور کوشش سے معلوماتِ تاریخی اور انکشافاتِ تازہ کو جمع کر کے اس زمانے کی حیاتِ اجتماعی کو مجسم کرنے کی سعی کی ہے۔ اور حقیقت میں اس نے اپنے کام کی ذمہ داری کو پورا پورا ادا کیا ہے۔

(ترجمہ)

عبدالرشید صدیقی
(گورنمنٹ کالج لاہور)

تغیرِ حال

مختصر تمثیل

( )

افراد :-

جمال :- ——— باپ

زہرہ :- ——— بیٹی

شفیق :- ——— زہرہ کا معصوم بچّہ

اعظم ——— زہرہ کے شوہر کا دوست

منظرِ اوّل

(صوبہ کے زندانِ مرکزی کے پھاٹک کے سامنے ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی ہے - اُس کی آنکھیں کثرتِ گریہ سے بے رونق ہیں - اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال اِدھر اُدھر بکھرے اگرد ہیں اَٹے ہوئے ہیں - وہ اپنی نکیلی اور لطیف انگلیوں سے زمین پر کچھ بے معنی سی لکیریں کھینچتی ہے اور مٹا دیتی ہے -

اس کے دو قدم کے فاصلے پر ایک بچّہ درخت کے پتّوں سے کھیل رہا ہے - لڑکی کبھی کبھی اُس کی طرف دیکھتی ہے اور اُنگلی دانتوں میں دبا لیتی ہے -

لڑکی کا نام زہرہ ہے اور بچّے کا نام شفیق -

تھوڑی دیر کے بعد سڑک کے اُس پار سے ایک ضعیف العمر شخص نمودار ہوتا ہے - جسے دیکھ کر زہرہ بے اختیار رو دیتی ہے -

وہ ضعیف العمر شخص زہرہ کا باپ جمال ہے)

جمال :- بدنصیب بیٹی! صبر سے کام لو - اب جان ہلکان کرنے سے کیا حاصل! اُٹھو گھر چلیں -

زہرہ :- آبا! پیارے آبا! صبر سے کام لوں؟ نہیں، تم غلط کہہ رہے ہو - مجھے فریب دینے کی کوشش کر رہے ہو - خدا لگتی کہو - کیا اب مجھ سے صبر ہو سکتا ہے؟

جمال :- لیکن اِس کے سوا چارہ نہیں - خوش و ناخوش آخر تجھے ایسا کرنا ہوگا

زہرہ :- کیوں بھلا؟

جمال :- قدرت کے معاملات میں انسان کو کیا دخل - جیسا اُس نے چاہا ہو گیا -

زہرہ :- کس نے چاہا؟

جمال :- اللہ تعالےٰ نے - اُس کے حکم کے بغیر پتّا تک نہیں ہل سکتا -

زہرہ :- کیا تمہارا خدا قہار ہے - اُسے رحیم نہیں کہتے؟

جمال :- اُس کا قہر کبھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتا -

زہرہ :- ایک نوجوان لڑکی بیوہ ہو جائے - ایک معصوم بچّہ یتیم ہو جائے - اس سے بہتر مصلحت کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے - کیا تم اسے مصلحت کہو گے؟

جمال :- ہاں یقیناً اس میں کچھ مصلحت ہو گی - جسے انسانی عقل سمجھنے سے قاصر ہے -

زہرہ :- انہیں بے گناہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا - میں اُن کے غم میں گھُل گھُل کر ٹھکانے لگ جاؤں گی - شفیق اپنی نامراد ماں کو ڈھونڈتا عدم میں پہنچ جائے گا -

جمال :- اپنے معصوم بچّے کے لئے اپنی زندگی کی حفاظت کرو -

زہرہ :- میں اُسے ضرور ضائع کر دوں گی - تاکہ تم جسے مصلحت کہتے ہو وہ انسانی عقل کے لئے قابلِ ادراک ہو جائے -

(زہرہ لپک کر بچّے کو گود میں اُٹھا لیتی ہے - اور باپ کے

ہمراہ گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے - اثنائے راہ میں دونوں خاموش رہتے ہیں -

گھر پہنچ کر زہرہ زنانے میں چلی جاتی ہے - اور جمال مردانے میں بیٹھ جاتا ہے - لوگ اظہارِ افسوس کے لئے آنے شروع ہو جاتے ہیں -

زہرہ اپنے مرحوم شوہر کی تصویر کو سینے سے لگائے بیٹھی ہوتی ہے - اور بار بار شفیق کا منہ چومتی ہے)

شفیق :- امی! ابا کب آئیں گے - تم کیوں رو رہی ہو -

زہرہ :- ننھے مظلوم! اب ہمارے ابا کبھی نہیں آئیں گے - کیا تم اُن کے پاس چلو گے ؟

شفیق :- ہم اُن کے بغیر یہاں کیا کریں گے - یہاں ہمیں روز مٹھائی کون لاکے دے گا - پار سال وہ بیساکھی کے میلہ پر مجھے ساتھ لے گئے تھے - بہت سے کھلونے لے کر دئیے - لیکن سب ٹوٹ چکے ہیں - وہ مٹی کے بنے ہوئے تھے - اب کے تو میں لکڑی کے بنے ہوئے کھلونے لوں گا - کیوں امی وہ تو جلدی نہیں ٹوٹیں گے -

(معصوم شفیق کی بھولی بھولی باتیں زہرہ کے دُکھتے ہوئے دل پر ایسی کاری چوٹ لگاتی ہیں - کہ گریہ اُس کے حلق میں گرہ ہو جاتا ہے - شفیق زہرہ کی دگرگوں حالت دیکھتا ہے اور سہم جاتا ہے)

منظر دوم

(مردانے میں لوگ آتے ہیں - جمال سے اظہارِ افسوس کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں - لیکن سب سے بعد ایک نوجوان خوش پوشش آدمی آتا ہے - جمال بے تابی سے اُٹھ کر اُسے سینے سے لگا لیتا ہے - تھوڑی دیر دونوں خاموش ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے ہیں - پھر سلسلۂ گفتگو اس طرح شروع ہوتا ہے - وہ نوجوان آدمی مرحوم کا دوست اعظم ہے)

اعظم :- کیا سے کیا ہو گیا - گذشتہ زمانہ گویا مجسم بن کر آنکھوں میں پھر رہا ہے -

جمال :- کیا کیا جا سکتا ہے - انسان مجبور ہے - ورنہ ــــ کیا کہوں!

اعظم :- لوگوں کا خیال تھا کہ ارتکابِ قتل ثابت نہیں ہو سکے گا -

جمال :- لیکن نتیجہ دیکھ رہے ہو -

اعظم :- چونکہ میں اور مرحوم بچپن سے ساتھ ساتھ رہے ہیں - میں اس کی زندگی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف ہوں - وہ اور قتل ؟

جمال :- شاید تم الزام کی نوعیت نہیں جانتے ؟

اعظم :- نہیں - جتنے منہ اتنی باتیں - قیاس ہیں - کوئی کچھ کہہ رہا ہے اور کوئی کچھ کہہ رہا ہے -

جمال :- مقتول سے شفیق کے مرحوم ابا کے ...... دوستانہ مراسم تھے - وہ اکثر اُس کے ہاں جایا کرتا تھا - مراسم واضح تھے - اُن کے پردے میں کوئی خوفناک بات کارفرما نہ تھی -

اعظم :- گویا دوست نے دوست کو موت کے گھاٹ اُتار دیا - کون مانے!

جمال :- اب کوئی مانے یا نہ مانے، یکساں ہے -

اعظم :- پھر اُسے قاتل کیوں ٹھہرایا گیا!

جمال :- خودکشی! اعظم! انصاف ایک لفظ ہے - جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوا -

اعظم :- خودکشی ؟

جمال :- ہاں! اگر کہو تو اُس کی خودکشی کا واقعہ سناؤں - چونکہ مرحوم اُس وقت اُس کے پاس تھا - وہ قاتل ٹھہرایا گیا - اپنے تئیں بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کوئی بشری شہادت پیش نہ کر سکا - اور خدا پر کسی کو اعتبار نہ آیا - چونکہ وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا ایک خدا کی ذات تھی - اُس کی موجودگی کسی نے تسلیم نہ کی -

اعظم :- لیکن خودکشی کا سبب کیا تھا ؟

جمال :- اُس کی خودکشی کے متعلق مرحوم کی زبانی صرف اسقدر معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں بیٹھے بڑے اطمینان سے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے - اُس کی نشست گاہ میں بہت سی تصاویر آویزاں تھیں - یکایک اُس کی نگاہیں ایک غیر نمایاں سی تصویر پر پڑ گئیں - وہ تصویر اگرچہ غیر نمایاں سی تھی، لیکن اسے نہایت قیمتی فریم میں لگا رکھا تھا - جس سے اُس کی اہمیت ظاہر ہوتی تھی - اس کے بعد وہ بہت دیر تک خاموش رہا -

اُس نے میز کی دراز سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا - اور اُسے چاٹ لیا - جانے اُس پر کیا لگا ہوا تھا - معاً اُس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی - اور وہ سرد ہو گیا -

جب گھر والوں نے چیخ کی آواز سُنی تو وہ سب وہاں جمع ہو گئے۔ چونکہ وہ مر چکا تھا اور مرحوم بدقسمتی سے وہاں موجود تھا - اس لئے اُسے قاتل سمجھ لیا گیا - لیکن اعظم بیٹا! اس حقیقت کو علانیہ جھٹلا دیا گیا اور اُس کے بے گناہ گلے میں سزا کی مہلک رسی ڈال دی گئی -

(دونوں آبدیدہ ہو جاتے ہیں - اور مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں)

پردہ

لطیف انور گورداسپوری

شعورِ زندگی

مُسکراتا ہوں بُتوں کے جلوہ بے تاب میں،
خون بن کر دوڑتا ہوں نبضِ شیخ و شاب میں

مجھ کو پا سکتا نہیں انسان کا وہم و گماں
پھر بھی ہے معمور میری ذات سے کون و مکاں

آشکارا رنگ کی صورت فروغِ گُل میں ہوں
جلوہ آرا دل کی صورت نالۂ بُلبل میں ہوں

ہوں کبھی ابرِ بہاراں کی طرح کہسار میں
جلوہ افگن ہوں کبھی مَیں برق کی رفتار میں

میری خدمت پر کمربستہ زمین و آسماں
میری ہمّت کے کرشمے ہیں مکان و لامکاں

گرم بازاری ہے میرے دم سے آہِ سرد کی
میرے ہی ہاتھوں عطا ہوتی ہے دولت درد کی

زندہ قوموں کے لئے مَیں آفتابِ نُور ہوں
اور مُردوں کے لئے تاریکی و دیجور ہوں

نیم زندہ قوم کے سر پر ہوں مَیں تاجِ شہی
نیم مُردہ قوم کے سر پر ہجومِ گمرہی

الغرض اے ساکنانِ عالمِ کون و فساد
مَیں شعورِ زندگی ہوں، زندگانی کی مراد

ثمرۂ محنت سے اپنے جاوداں آرام ہوں
اپنا خود آغاز ہوں اور اپنا خود انجام ہوں

عرشؔ تیموری

مشاہیرِ عالم

"سعد زاغلول پاشا"

مصر کی یہ عظیم المرتبت شخصیت بلدیہ ابیانہ میں

ولادت :- ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئی۔

تعلیم :- سات سال کی عمر تھی کہ والدین نے ابیانہ مڈل سکول میں داخل کرا دیا - پانچ سال تک مبادیٔ قرأت وخطابت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دسوق پہنچے اور وہاں کے مشہور عالم و فاضل شیخ عبداللہ عبدالعظیم سے قرآن پاک کی تجوید کی - ازاں بعد مصر کی عظیم الشان درسگاہ جامعہ ازہر میں داخل ہوئے پانچ سال تک تعلیم پانے کے بعد سیر وسیاحت میں مشغول ہو گئے - انہی دنوں سید جمال الدین افغانی قاہرہ میں تشریف فرما تھے - سعد زاغلول پاشا بھی پہنچے اور شرفِ نیاز حاصل کیا - ہر وقت علمی صحبتیں رہنے لگیں - اِسی دوران میں سید جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ سے آپ نے درسِ توحید کا استفادہ کیا۔

جریدہ "الوقائع المصریہ" کی ایڈیٹری :- سید جمال الدین افغانی کی صحبت اور سعد زاغلول پاشا جیسا غیر معمولی دماغ، تھوڑی ہی مدت میں وسعتِ معلومات، علمی قابلیت، سیاست دانی، طرزِ نگارش اور قادر الکلامی کا شہرہ اس قدر ہوا کہ جریدہ "الوقائع المصریہ" کے ایڈیٹر مقرر کئے گئے جس کو پندرہ ماہ تک نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کرتے رہے - استبداد کے خلاف آپ نے ہیجان افروز مقالے تحریر کئے اور مصری قوم پرستوں کو جگانے کے لئے اپنے قلم کی انتہائی کوششیں صرف کر دیں - انہی وجوہ سے آپ کی غیر معمولی ذہانت کا سکہ ہر فرد بشر پر بیٹھ گیا - عوام کی نظروں اور علمی، سیاسی حلقوں میں آپ ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے۔

ملکی خدمات :- تھوڑی مدت میں ہی آپ کو نظارت داخلیہ میں اسسٹنٹ مقرر کیا گیا اور خداداد ذہانت کی بدولت یہاں تک ترقی کی کہ محکمہ قضا کے وزیر نامزد ہو گئے۔ عہدۂ وزارت پر سرفراز ہوئے - ابھی دو ماہ کی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ ۱۸۸۲ء میں مشہور قوم پرست احمدی عربی پاشا نے تحریکِ وطنی کا آغاز کیا جنہیں گرفتار کر کے سیلون بھیج دیا گیا اور وہ وہیں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ سعد زاغلول پاشا پر بھی تحریکِ وطنی میں شمولیت کا الزام لگا کر انہیں وزارت سے علیحدہ کر دیا گیا - اس کے علاوہ اُن پر یہ الزام بھی عاید کیا گیا کہ وہ ایک خفیہ انجمن "جمعیۃ الانتقام" میں شریک ہیں - مگر تحقیق و تفتیش کے بعد بری قرار دئے گئے۔

قانونی و تعلیمی خدمات :- ۱۸۸۴ء میں جب مختلف محکموں کا آغاز ہوا تو آپ کو ایڈووکیٹ کے عہدہ پر فائز کیا گیا - ۱۸۹۱ء تک آپ یہی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں محکمۂ اپیل میں نائب قاضی مقرر ہوئے اور پھر ترقی کرتے کرتے مفتی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کئے گئے - آپ کی علمی قابلیت کا اعتراف بڑے بڑے علماء و ادباء کر چکے تھے - اِس لئے حکومت کی خاص سفارش پر آپ کو وزیرِ تعلیم مقرر کیا گیا - گوناگوں مصروفیت، کثرتِ مشاغل، کے باوجود وسعتِ خیالات، سرفروشانہ جذبات، اصلاح وتنقید، اور خودداری' کا مادہ اس قدر کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ ان سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوئے - سرکاری ملازمت کو احسن طریقہ سے انجام دینے کے باوجود لوگوں میں حریت، آزادی، اور مجاہدانہ جذبہ کی رُوح پھونکتے رہے - میدانِ صحافت میں قدم رکھا تو زبان میں بلاغت وسلاست پیدا کی اور تنقید و اجتہادات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا - آزاد نگاری، تدبّر وسیاست، سے ملک میں ہیجان برپا کر دیا - جب ایڈوکیٹ ہوئے تو اس پیشہ کو آپ کی شخصیت پر ناز تھا - آپ کی ذاتی قابلیت نے ایڈوکیٹ کے نام کو تابندہ ستارے کی طرح چمکا دیا - ججی کے زمانے میں ان کے فیصلوں سے رحم، کرم، انصاف اور محبت کی بُو آتی تھی اور وہ عہدِ حاضرہ کے اُن ججوں میں سے تھے جو اپنے احکام کی بنا صحیح ذہنی غور و پرداخت پر رکھتے ہیں - یہی حال آپ کی وزارت میں رہا - اور تمام خصوصیات جو آپ کا حصہ تھیں ہمراہ رہیں - لارڈ کرومر نے جب مصر کو خیرباد کہا تو اپنے ایک لیکچر میں سعد زاغلول پاشا کے متعلق حسب ذیل ارشادات کا اظہار فرمایا :-

"سعد زاغلول پاشا سے میری ملاقات زیادہ دیر کی نہیں لیکن اس قلیل مدت کے رابطہ نے مجھ پر منکشف کر دیا ہے کہ مجھے ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ان کے سامنے ایسا مستقبل ہے جو عام ملک کے لئے بڑا منفعت بخش ہوگا۔ کیونکہ خدمتِ وطن کی تمام صفات ان میں موجود ہیں۔ آپ صادق، شجاع، اور مستقل مزاج ہیں اور ایسے لوگوں کے طعن و تشنیع برداشت کر چکے ہیں جو ان کے مرتبہ سے بہت کم حیثیت کے ہیں۔ جملہ صفات کا متصف اپنے مقاصد میں کبھی ناکام نہیں ہوتا۔"

جب ۱۹۱۳ء میں محمد سعید پاشا کی وزارت کی اسامی تخفیف میں لائی گئی اس وقت سعد زاغلول پاشا وزیر شعبۂ قانون تھے۔ آپ نے یکلخت سرکاری خدمت سے دست کشی کر لی اور مصر کی آزادی کے لئے سرفروشانہ جد و جہد شروع کی۔

سعد زاغلول پاشا کی صحیح قومی زندگی کا دور اُس وقت شروع ہوتا ہے جب آپ "مجلس قوانین" کے صدر منتخب ہوئے۔ مجلس کے جلسوں میں تقریریں، تقریروں میں فصاحت و بلاغت، براہین و دلائل، ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے ان کے دوست دشمن تعریف میں یکساں رطب اللسان تھے۔

جنگِ یورپ:- ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ سرویا اور آسٹریلیا کی باہمی آویزش نے یورپ کے تمام حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۸۹۲ء سے موجودہ وقت تک برطانیہ کا مصر پر برائے نام قبضہ تھا۔ مگر ترکی کے اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی انگریزوں نے مصر کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ عباس حلمی پاشا خدیو مصر، ترکوں کا زبردست حامی تھا۔ انگریزوں کی سختیوں اور جا و بے جا مداخلت سے تنگ آ کر ترکی چلا گیا۔ زاغلول پاشا نے حالات پر پُرجوش تقریریں کیں اور ہیجان افروز مقالے لکھے جس کی وجہ سے ملک میں شورش پیدا ہو گئی۔ مگر اخبارات پر محکمہ احتساب کی پابندی نے انہیں خاموش کر دیا۔

حکومتِ برطانیہ نے حسینی پاشا کو بادشاہ اور رشدی پاشا کو وزیر بنانے کے بعد اعلان کیا کہ اگر برطانیہ کی فوجی نقل و حرکت میں مصری مزاحم نہ ہوئے تو جنگ کے خاتمہ پر انہیں آزادی دے دی جائے گی۔ چنانچہ مصر نے اس اعلان پر بھروسہ کرتے ہوئے انگریزوں کی ہر طرح امداد کی اور دس لاکھ آدمی فوج میں بھیجے۔ مگر افسوس حکومتِ برطانیہ نے جنگ کے بعد اپنے تمام مواعید کو پس پشت ڈال دیا۔

لندن کو روانگی:- ۱۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو سعد زاغلول پاشا چند جانبازانِ حریت کو ہمراہ لے کر عازم لندن ہوئے۔ اس وفد کی غرض یہ تھی کہ وہ مصری مطالبات کو حکومتِ برطانیہ کے ارباب حل و عقد کے کانوں تک پہنچائیں اور ان کے حصول کے بعد سارے یورپ کا سفر کیا جائے اور بڑے سے بڑے مدبرین کے سامنے مسئلہ مصر پر گفتگو کی جائے مگر حکومتِ برطانیہ نے ان مطالبات کو قطعی طور پر نامنظور کر دیا جس سے تمام مصر میں ہیجان و اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ عظیم الشان مظاہرے، ہڑتال، احتجاجی جلسے، مقاطعہ کی تحریک غرض ہر طریقہ سے حکومت برطانیہ کی پالیسی کے خلاف اظہارِ نفرت کیا گیا۔

سعد زاغلول پاشا کی جلاوطنی:- ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو سعد زاغلول پاشا، اسمٰعیل صدقی پاشا، احمد آلباس پاشا کو جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ اس حکم نے عوام کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ جذباتِ نفرت و حقارت ملک میں بہت زیادہ پھیل گئے۔ ہنگاموں، شورشوں، مظاہروں کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ حکومت نے مظاہروں کو دبانے کی بے حد کوشش کی مگر بے سود۔ آخر ۷ اپریل ۱۹۱۹ء کو سعد زاغلول پاشا اور اس کے ہمراہیوں کو رہا کر دیا گیا۔

عیسائیوں اور مسلمانوں میں اتحاد:- سعد زاغلول پاشا نے اپنی پیہم کوششوں سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں اتحاد کی صورت قائم کر دی اور یہ رابطۂ اتحاد، وطن کے لئے بیحد مفید ثابت ہوا۔

مصری خواتین میں جوشِ آزادی:- سعد زاغلول پاشا کی ہر دلعزیز شخصیت نے عورتوں کو بھی میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا۔ چنانچہ لارڈ ملنر کا وفد آنے سے پیشتر مصر کی حالت بیحد مخدوش ہو چکی تھی۔ مصری عورتیں حُبِ وطن کے جوش میں گھروں سے باہر نکل کر ٹولیوں کی صورت میں پھرتیں اور آزادی وطن کے نعرے لگاتیں۔ جو لوگ مارے جاتے اُن کے جنازوں کے ساتھ ہزار ہا عورتیں ماتم کرتی ہوئی جاتیں۔

سعد زاغلول پاشا کے اخبار کی بندش:-

یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو عدلی پاشا جو اعتدال پسند پارٹی کے ہمنوا تھے۔ ایک سرکاری وفد لے کر اپنے مطالبات منوانے کے لئے انگلستان

روانہ ہوئے۔ جس کی وجہ سے ملک میں مختلف قسم کے مظاہرے کئے گئے۔ اور اُن کے متعلق عدم اعتماد کا ووٹ پاس کیا گیا۔ سعد زاغلول پاشا نے اپنے اخبار میں ان حالات پر بے باکانہ رائے زنی کی۔ چنانچہ وزارت کے حکم سے چھ ماہ کے لئے اخبار بند کر دیا گیا۔

ترکِ موالات:۔ سعد زاغلول پاشا کی سرفروشانہ خدمات سے ہر طبقہ کے لوگ متاثر تھے اور وہ اپنے ممتاز و بلند لیڈر کے حضور میں نذرانۂ جان و دل پیش کرنے کے لئے تیار رہتے۔ چنانچہ پچاس مشہور علماء نے ایک پوسٹر کے ذریعے سے لوگوں کو انگریزی مال کا مقاطعہ کرنے کی پُرجوش الفاظ میں تلقین کی۔ اِس پوسٹر اور سعد زاغلول پاشا کی تقریروں کا اسقدر اثر ہوا کہ لوگوں نے مکمل طور پر ترکِ موالات کا اعلان کر دیا۔

سعد زاغلول پاشا کی نظربندی:۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو سعد زاغلول پاشا گرفتار کر کے سویز پہنچا دئے گئے۔ ملک میں مارشل لا کا نفاذ کر دیا گیا۔ اور اسکندریہ کے تمام اخبارات کو اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود ملک میں آزادی کے بے تابانہ جذبات رونما ہو رہے تھے۔ آزادی و حریت کے پروانے اپنی سرفروشانہ کوششوں سے واضح کرتے رہے کہ سعد زاغلول پاشا کے جذبات ہر باشندۂ ملک کے ایک ادنیٰ بچے کے دماغ سے بھی زائل نہیں ہوا۔ سعد زاغلول پاشا کی بیگم صفیہ خانم نے اپنے شوہر کی نظر بندی کے بعد وہ جانفشانیاں کیں کہ دنیائے مصر میں ایک تھلکہ مچا دیا، لوگوں نے سعد زاغلول پاشا کی جگہ انہیں اپنا حقیقی قائد مانا۔

جلاوطنی سیلون:۔ ۲۷ر دسمبر کو سعد زاغلول پاشا کو عدن بھیجا گیا۔ جہاں سے ایک جہاز کے ذریعے آپ کو سیلون پہنچا دیا گیا۔ پھر ایک ماہ بعد جنوری کے آخر میں آپ کے جزیرہ شیلز بھیج دیا گیا، وہاں ۳۰ر مارچ تک نظر بند رہے ایک سال کی مدت کے بعد حکومت نے آپ کو خود بخود رہا کر دیا۔ اس قید و بند کے دوران میں حکومت نے آپ کی ہر طرح عزت و تکریم کی۔

وفات:۔ ابھی مصر کی خدمت کے لئے اس سر بکف جرنیل اور حُریت نواز بہادر انسان کی اشد ضرورت تھی کہ اچانک پیغام اجل نے آ دبایا۔ اس طرح . . . یہ قوم کا صحیح ترجمان، ہمیشہ کے لئے اپنی جاں نثار قوم کو داغِ مفارقت دے گیا۔ اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون

سیّد نذیر حسن ترمذی ایڈیٹر روزنامہ ایثار لاہور

غزل

جب مرے دل کی تمنّائیں جواں ہونے لگیں
وہ نگاہیں خود بخود نامہرباں ہونے لگیں

میری توبہ تھی خزاں میں ایک وقتی احتیاط
پھر بہار آئی، وہی گلبازیاں ہونے لگیں

فصلِ گُل کا رنگ پھر نظروں میں لہرانے لگا
سبز پھر میرے قفس کی تیلیاں ہونے لگیں

وقتِ آخر جب صدائے کارواں مدّھم ہوئی
ہچکیاں جزوِ درائے کارواں ہونے لگیں

پھر ہے کوئی دردِ نو شاید میری تقدیر میں
پھر وہ نظریں چارہ سازِ قلب و جاں ہونے لگیں

پھر اُٹھی دریائے دل میں اضطرابِ غم کی موج
غرق امیدوں کی شاید کشتیاں ہونے لگیں

دل ہوا جاتا ہے خنداں مائلِ ذوقِ گناہ
عمر بھر کی نیکیاں اب رائیگاں ہونے لگیں

پنڈت رام جوایا خنداںؔ جہلم

ہولی

ماگھ سے کترا کے پھاگن کا مہینہ آ گیا
چیت کے ماتھے پہ ہلکا سا پسینہ آ گیا

جا چھپے زچ ہو کے صندوقوں میں سرمائی لباس
انجمن میں آ گئے خلوت سے گرمائی لباس

آ گیا پنکھوں کی سوکھی پتیوں پر روپ بھی
نکلی ہے بازار میں چھاتا لگا کر دھوپ بھی

چلتے ہیں رہ کار کے سایہ میں سوداوی مزاج
برف و فالودہ قلفی پہ گرتے ہیں مریض الاختلاج

وسطِ راہِ عام سے بیزار عورت مرد ہیں
شاہراہوں کے جگر تپتے ہیں پہلو سرد ہیں

سلسبیلِ خلد سے ملتے ہیں اندازِ سبیل
پیاؤ کے امرت اثر پانی میں گنگا جل قبیل

ٹھیکیاں کھاتا ہوا مزدور بولایا ہوا
خون پانی ہو کے سر سے پاؤں تک آیا ہوا

شیروانی کے بٹن کھولے ہوئے ہندی جواں
مغربی افراد کو نیکر وبالِ جسم و جاں

ڈوریاں پردے کی مغرب کے ہرن توڑے ہوئے
مشرقی سروِ چمن گھونگٹ سے جی چھوڑے ہوئے

چادرِ "آبِ رواں" میں مشرقی کوندے خموش
مغربی سایوں میں مضطر حسنِ نظارہ فروش

فصل نے یک کر صدائے دعوتِ شیراز دی
رُت پھری، پھر کر بہارِ باغ کو آواز دی

فیضِ رنگ و بو سے جب اک اک کلی گدرا گئی
مسکرائے پھول، مطلب یہ کہ ہولی آ گئی

کچھ دنوں تک روئے صبح و شام پر پھولی بسنت
سوم رس پی پی کے زحمت سے رہی دنیا نچنت

آخرش بھولا ہوا منظر دکھانے کے لئے | رات وہ آئی جو تھی ہولی جلانے کے لئے
وقت سے پہلے، کشادہ چوک میں مندر کے پاس | لا کے رکھّے "ہار" بر گلیوں کے" سب نے بے قیاس
پھر کوئی اُپلے اُٹھا لایا تو کوئی لکڑیاں | پھینک دیں گھبرا کے جلدی میں یہاں کچھ، کچھ وہاں
ہو گیا مقدار سے جب جمع ایندھن دوگنا | اِک ہری لکڑی کے گرداگرد مل جُل کر چنا
ایک نے منتر پڑھا کچھ اور بڑھ کر آگ دی | آگ دم بھر میں بھڑک اُٹھی کچھ ایسی لاگ دی
پیچ و خم کھا کر چلے شُعلے جو اُٹھ کر آگ سے | سب نے کھینچا "شاخ معلومہ" کو باہر آگ سے
آتشِ نمرود سے پہنچی وہ ہولی کو گزند | ہو گیا گلزارِ ابراہیمؑ کا جھنڈا بلند
رات سر شوری پہ جس جا شعلۂ بیتاب تھا | صبح کو دیکھا تو "چوپٹ" سوختن کا باب تھا

اب شفق مشرق سی دوڑی مل کے چہرے پر گُلال | صبح کے نیچر نے بدلے رنگ گرگٹ کی مثال
اپنی بیرنگی میں یکساں ہو گیا جسم غفنبر | ایک نے ابرک اوڑا دی ایک نے ڈالا عبیر
ٹین کی پچکاریاں منہ سے اُگلتی تھیں شراب | عطر پاشی میں تھے پیتل کے ہزارے کامیاب
بالٹی، کلسے، گھڑے غافل نہ تھے اس جنگ میں | بانس کے ٹکڑے ڈبوئے جا رہے تھے رنگ میں
اِک طرف کچھ ساریاں ڈوبی تھیں آفتاب میں | "مختلف پھولوں کی دُنیا بہہ رہی تھی آب میں"
اِس نے اُس کے عارضِ گلفام پر صندل ملا | اُس نے اِس کے خالِ مشکیں کام پر کاجل ملا
دو نے مل کر گت بنائی ایک کی اس شان پر (قطعہ) بدر کے چہرے پہ ظاہر ہو گئی چیچک مگر

حُسن سے[1] بدرنگیوں کے قلب ہو جاتے ہیں شق | "تھا بیاضِ صبح پر "شہ کار" کا پہلا ورق"

میری جانب آئی پھر اُن میں سے اِک "مستانہ چال" | جس پہ ظاہر تھا مری چشمِ تماشائی کا حال
آ گئی نزدیک جب وہ شوخ و چنچل شریر | مل لیا مجھ کو دکھا کر اپنے ماتھے پر عبیر

طبقۂ ادنیٰ میں ہولی کی ہوئی کِریا خراب | عقل کو ٹھگنے میں لے آیا مسرّت کا عذاب
جھونپڑوں سے اپنے نکلے دشمنِ ناموس و ننگ | چار جانب رنگ میں پیدا ہوئے آثارِ جنگ
کوئی "بیجا" شکل ناہنجار پر باندھے ہوئے | کوئی سر کے گرد ناہموار "پَر" باندھے ہوئے
داڑھیاں سن کی لگا کر کچھ "خداوندِ لقا" | عورتوں کے بھیس میں کچھ "بجتیارک" سے سوا
پی کے ٹھرّا، بن کے پاگل، ناچ میں مشغول سب | اپنے پیروں سے اُڑا کر پھانکتے تھے دھول سب
سخت بدبُو سے حصارِ شور و شر باندھے ہوئے | بیخودی میں بیحیائی پر کمر باندھے ہوئے
تا کجا بدمستیوں پر یہ محاکاتی نظام | شادؔ اِس "نقد و نظر" کو فکرِ شاعر ناتمام

یہ سیاہی ہند کے چہرے سے دھونی چاہیئے
اِس نکمّی رسم کی اصلاح ہونی چاہیئے

شادؔ عارفی

[1] "شاہکار" کا ٹائیٹل پیج۔

تنویرات

سائنس اور فنونِ لطیفہ

بعض لوگوں کا یہ خیال کہ سائنس فنونِ لطیفہ کے سراسر منافی ہے، اُن کی سائنس سے بے خبری پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ سائنس ہماری نظروں میں ایک ایسی دلکشا و فرحت بخش دُنیا کو بے نقاب کرتا ہے، جو عام لوگوں کی نگاہوں میں ایک چٹیل میدان سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ لوئیس اپنی کتاب "سی سائڈ سٹڈیز" میں لکھتا ہے کہ سائنس فنونِ لطیفہ کے جوش کو سرد نہیں کرتا، بلکہ اور بھی تیز کرتا ہے۔ سائنس نہ صرف ہمیں گرد و پیش کے واقعات سے روشناس کراتا ہے، بلکہ اُن رموز سے بھی آگاہ کرتا ہے، جن کا جاننا فنونِ لطیفہ کی جان ہے۔ مثلاً ایک شخص جس نے معدنی اشیاء کی کبھی تلاش و تجسس نہیں کی، اُن شاعرانہ خیالات کو ہرگز تصور میں نہیں لا سکتا، جو اُن مقامات کی سیر و سیاحت اور اُس تلاش و تجسس سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں یہ اشیاء مدفون ہوتی ہیں۔ سائنس ہمیں ایسے مظاہرِ قدرت سے واقف کراتا ہے، جن کی آگاہی فنونِ لطیفہ کا جزوِ لاینفک ہے، اور یہ بالکل درست ہے، کہ کسی فن کی تنقید یا اس کے حُسن و خوبی کی حقیقی ماہیت کو جاننے کے لئے ہم کو سائنس کا جاننا نہایت لابدی و ضروری ہے۔ سائنس کے علم کے بغیر نہ تو کوئی فن مکمل کہلایا جا سکتا ہے اور نہ اُس کی حقیقی قدر کی جا سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض کامیاب صناعوں کو سائنس کی واقفیت اُن محدود اصطلاحی معنوں میں حاصل نہ ہو، لیکن ہر صنّاع ہر شے کو دقیق نظروں سے مشاہدہ کرتا ہے، اس لئے اُن عملی نتائجِ عامّہ کا ذخیرہ ہمیشہ اُس کے قبضے میں رہتا ہے، جو سائنس کی معمولی واقفیت کا آئینہ دار ہے اور چونکہ فنونِ لطیفہ بھی ہر چیز کے دقیق مطالعے پر مبنی ہیں، اس لئے سائنس اور فنونِ لطیفہ کا تعلق ہرگز غیر قدرتی نہیں ہے۔

سائنس کا تعلق فنونِ لطیفہ کے ساتھ زیادہ واضح کرنے کے لئے اب ہم فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالتے ہیں۔

بُت تراشی:۔ کوئی شخص ہرگز کامیاب بُت تراش نہیں کہلایا جا سکتا، جب تک وہ انسانی جسم سے کما حقہ واقف نہ ہو، یعنی ہر بُت ساز کے لئے یہ ضروری ہوگا، کہ وہ انسانی جسم کی ہر رگ، ہر پٹھے ان کی تقسیم اور اُن کے باہمی تعلق اور اُن کی حرکات و سکنات سے اچھی طرح واقف ہو، اور یہ علم سائنس کا ایک حصّہ ہے، جس کو "علم الحیات" کہتے ہیں، گویا اس کا جاننا... بہت سی غلطیوں کا ازالہ ہے، جو اکثر بُت تراشوں سے وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔

مصوّری:۔ مصوّری میں بھی سائنس کا جاننا ضروری ہے، گو وہ عقلی نہ سہی، عملی ہی سہی، ہم جب چینیوں کی تصاویر کو دیکھتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے بیشتر تصاویر بے ڈول اور بے ہنگم سی ہوتی ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصوّر صورتوں کے نظام کا بالکل لحاظ نہیں رکھتا، وہ تصویر بناتے وقت مختلف چیزوں کے فاصلوں اور ان کی کمی بیشی کا خیال نہیں کرتا، اور اس کے ساتھ ہی وہ تصویر کے روشن و تاریک پہلوؤں کو دیکھنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوتا اور اس کی سب سے بڑی وجہ مصوّری سے وہ ناواقفیت ہے، جس کے مطابق مختلف چیزوں کی صورتیں مختلف حالتوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی مصوّر ہرگز کامیاب نہیں کہلا سکتا۔ (چاہے وہ کتنی ہی وسعتِ نظر کا مالک کیوں نہ ہو) جب تک اُس کو اس بات کا علم نہ ہو، کہ قدرتی امور کے نتائج کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور خاص خاص حالتوں میں کون کون سی صورتیں پیدا ہونی چاہئیں۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ مصوّر سائنس کے علم کو جانتا ہو۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض کامیاب مصوّر جنہیں سائنس سے تھوڑی بہت واقفیت ہوتی ہے، بہت بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مصوّر تصویر بناتے وقت جالی دار کھڑکی کے سایہ کو سامنے کی دیوار پر تیز لکیروں میں ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہئیے، کیونکہ یہ "سایہ کے اصول" کے سراسر منافی ہے اور سائنس سے لاعلمی کا نتیجہ ہے، وہ نہیں

جانتا کہ سایہ روشنی کے ساتھ نامعلوم طور پر کس طرح گھل مل جاتا ہے۔

موسیقی:۔ موسیقی بھی ایک حد تک سائنس کی محتاج ہے، گو یہ بات نہایت حیرت و استعجاب کا باعث ہو۔ "موسیقی جذبات کے قدرتی بیان کی ہو بہو تصویر ہے۔" اس لئے جہاں تک موسیقی کو اس قدرتی زبان سے موافقت یا قربت ہوگی، اسی قدر موسیقی کا اچھا یا بُرا ہونا خیال کیا جاسکتا ہے۔ آواز کے مختلف زیر و بم جو مختلف قسم کے جذبات پیدا کرتے ہیں اور جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، علم موسیقی کی بنیاد ہیں، آواز کا اُتار چڑھاؤ اور سُر کا ہلکا یا مدھم ہونا محض اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ عام اور قوی الاثر اصُول پر منحصر ہے۔ نغمے کا سرور انگیز یا غم زا ہونا، اسی اصول کی پیروی کرتا ہے۔ اس لئے یہ درست ہوگا کہ نغمے کی تانیں اور لحن اسی وقت کسی خاص جذبے کی حامل ہوسکتی ہیں۔ جب وہ عام اصول کے مطابق ہوں، اور یہ سائنس کا زرّیں اصول ہے، کیونکہ کسی نغمے سے ہم اسی وقت متاثر ہوسکتے ہیں جب ہم اُس نغمے میں کوئی جذبہ اور اصلیت محسوس کرتے ہیں۔ بغیر کسی اصلیت کو محسوس کئے ہم ہرگز اثر پذیر نہیں ہوسکتے اور اگر اس میں کوئی اصلیت نہیں ہوگی، تو اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ وہ سائنس کے اصول کے خلاف ہے۔

شاعری:۔ موسیقی کی طرح شاعری میں بھی قدرتی جذبات کا لحاظ رکھنا لازم ہے، اپنی شاعری کو مؤثر اور پُرجوش بنانے کے لئے ہمیں ایک اصول پر چلنا پڑے گا، اور وہ "اصول تناسب" ہے، شاعری کو حد سے زیادہ مبالغہ آمیزی میں رنگنا اس اصول کے سراسر منافی ہوگا، اور وہ تحقیقی شاعری نہیں کہلائی جاسکتی۔ اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ جہاں ہم یہ محسوس کریں کہ ہمارے جذبات میں کوئی جوش یا کوئی جذبہ نہیں ہے، وہاں ہمیں ایسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں، جو ہمارے ایسے جذبات کے حقدار ہوسکتے ہیں۔ مگر جہاں خیالات و جذبات میں ایک جوش اور فراوانی ہو، وہاں اُسی قدر آزادی سے شاندار اسلوب بیان کو بھی اختیار کرنا چاہیئے اور اگر ہم ان اصولوں کی مخالفت کریں گے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری شاعری صرف الفاظ میں ہی گم ہو کر رہ جائے گی، اور ان اصولوں کی مخالفت کا ایک اَور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری شاعری ایسے رنگ کی آئینہ دار بن جائیں گی۔ جس کو "ناصحانہ" شاعری کہتے ہیں اور جو حقیقی شاعری سے بہت دور ہے۔

(ہربرٹ سپنسر)

اثر چکوالی

غزل

ہر گھڑی مجھ کو تصوّر میں ستاتے کیوں ہو
تم کو آنا نہیں منظور تو آتے کیوں ہو

ایک اِک ذرّہ ہے آئینۂ اسرارِ جمال
ایسے عالم میں نہیں تم نظر آتے کیوں ہو

بزمِ ہستی ہے، کہ سنسان نظر آتی ہے
رنگ اتنا کسی محفل میں جماتے کیوں ہو

کیا مری بے خبری ہی پہ ہے موقوف کرم؟
ہوش آتے ہی مجھے چھوڑ کے جاتے کیوں ہو

سارے عالم پہ تحیّر کا فسوں طاری ہے؟
روز اِک پردہ نگاہوں سے اُٹھاتے کیوں ہو

کون ہے جو پسِ پردہ نہیں واقف تم سے
صاف ظاہر ہو تو پھر شکل چھپاتے کیوں ہو

ایک دنیا غمِ اُلفت سے لرز جاتی ہے
دل سے نکلی ہوئی آواز سناتے کیوں ہو

جو تمہارے کسی انداز پہ مٹ جاتا ہے
تم اُسے صفحۂ ہستی سے مٹاتے کیوں ہو

کاش کُھلتا کبھی اس کشمکشِ عشق کا راز
نہیں آتے ہو تو پھر ربط بڑھاتے کیوں ہو

جو ادا خاص عطا کی ہے خدا نے حرماںؔ
اُس کو نظارہ گہ عام پہ لاتے کیوں ہو

حرماں (خیرآبادی)

میخانۂ یزدانی

(۱)

غم بس گیا دل میں نوکِ پیکاں بن کر
میں رہ گیا نقشِ یاس و حرماں بن کر
اُجڑی ہوئی بستی کو بسانا ہو اگر
آجاؤ مرے درد کا درماں بن کر

(۲)

بارش کی روانی میں سکوں بھی ہے وہی
فطرت کی تجلّی کا فسوں بھی ہے وہی
اِک تم جو نہیں، سکونِ دل ہے مفقود
میں بھی ہوں وہی، سوزِ دروں بھی ہے وہی

(۳)

پیکانِ جگر دوز سہے جاتا ہوں
ظالم کے تبسم میں بہے جاتا ہوں
کچھ ایسا فسوں پھونکا ہے اُن آنکھوں نے
رودادِ دلِ زار کہے جاتا ہوں

(۴)

ساقی رہِ اُلفت کے تباہوں کی قسم!
بیمارِ غمِ ہجر کی آہوں کی قسم!
پیمانۂ چشم سے پلا دے مجھ کو
میخانہ در آغوش نگاہوں کی قسم!

(۵)

زاہد کا یہ ارشاد کہ پینا بھی گناہ
میخانہ گناہ، جام و مینا بھی گناہ
اس قول میں گنجائشِ انکار نہیں
لیکن مری نظروں میں ہے جینا بھی گناہ

(۶)

کب تک غمِ روزگار سہتا جاؤں
موجِ بحرِ الم میں بہتا جاؤں
کب تک صفتِ چراغِ سوزاں یارب!
افسانۂ ہجرِ دوست کہتا جاؤں

(۷)

احباب سمجھتے ہیں کہ روتا ہوں میں
یونہی درِ نایاب کو کھوتا ہوں میں
ان بےخبروں کو کیا خبر یزدانی
داغوں کو کتابِ دل سے دھوتا ہوں میں

یزدانی (جالندھری)

لہ نہر لوئر باری دوآب

تبصرہ

سالنامہ ادبِ لطیف:- مجلۂ ادبِ لطیف" نے دو سال کی قلیل مدت میں جو وقعت و شہرت حاصل کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے - یوں تو اس کا ہر نمبر ترتیب و تہذیب اور تنوعِ مضامین کے اعتبار سے ادبِ اردو کا بیش قیمت ذخیرہ ہوتا ہے، لیکن زیرِ نظر سالنامہ ۱۹۳۷ء صوری و معنوی لحاظ سے واقعی اردو ادب کا مرقع ہے - ملک بھر کے مشہور اور مستند اہلِ قلم کے دماغ افروز مضامین اس کا بیّن ثبوت ہیں -

مضامین میں سے ہسپانیہ میں اسلام کے نقشِ قدم، ڈیڑھ سو برس پہلے کی ادبی صحبتیں، تیموری بادشاہوں کے امورِ خاصہ، دنیائے تذکرہ، اور عالمِ اسلام میں شفاخانوں کی ابتدا، تحقیقی مقالے ہیں -

افسانوں میں سے مختلف حضرات کے افسانوں کے علاوہ میرزا ادیب کا افسانہ "ملکۂ مصر" ایک خاص کیف، جذب اور حیرت کا سرمایہ دار ہے میرزا صاحب نے صحرانورد کے اس تیسرے خط میں انسانی نفسیات کی جس درجہ کامیاب عکاسی کی ہے قابلِ صد رشک و تحسین ہے -

احسان بن دانش کی نظم "مزدور کی عید" اور حضرت جوش ملیح آبادی کی "ظلمتیں اور روشنیاں" نہایت کامیاب نظمیں ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں داد سے مستغنی - اس کے علاوہ جناب عرشی امرتسری کی نظم "دل کا راز" اور اس کی طرزِ اخفا بہت خوب ہے -

تصاویر بھی جاذبِ ذوق و نظر ہیں - کاغذ، کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے - ہم سالنامہ کی کامیابی پر ادارہ چودھری برکت علی بی - اے و میرزا ادیب بی - اے کو مستحق داد سمجھتے ہیں - جن کی محنت شاقہ اور ادبی کاوش سے اسقدر شاندار سالنامہ تیار ہوا ہے - امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس پرخلوص کوشش کا نہایت قدر سے خیر مقدم کیا جائے گا - قیمت سالنامہ عہ چندہ سالانہ سے ر - ملنے کا پتہ : - مینجر ادبِ لطیف لوئر مال لاہور

سوزِ ناتمام:- اس نام سے جناب عاشق بٹالوی کے افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے -" ان افسانوں کی ایک اہم خصوصیت نفسیاتی تجزیہ ہے - عاشق صاحب زندگی کے اہم مسائل پر غور و فکر کے عادی ہیں - اس لئے ان کے افسانوں کے اکثر کردار ان کی طرح فلسفی واقع ہوئے ہیں - ان افسانوں کو پڑھ کر ہمارے سامنے انسانی زندگی کے بعض ایسے پہلو آجاتے ہیں جن پر غور کرنے کو جی چاہتا ہے -"

افسانے عریانی اور چھچھورپن سے منزا ہیں - اندازِ نگارش پختہ اور سلجھا ہوا ہے - کاغذ نہایت عمدہ، کتابت و طباعت اعلیٰ - سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۳۳۰ صفحات - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ : - مینجر رسالہ ادبی دنیا لاہور -

نورس:- جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی کے سولہ علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے - مشاعروں کی اصلاح، بابر ایک ادیب اور مورخ کی حیثیت سے، ناکامیابی، بعض اردو الفاظ کا املا، شعرِ جدید، میر کی شاعری، اردوئے جدید، ایک صوفی شاعر، اردو زبان کی ترویج و ترقی، اور مختارات وغیرہ مضامین نہایت دلچسپ، قابلِ مطالعہ اور دعوتِ غور و فکر ہیں - طرزِ تحریر پختہ اور دلکش ہے - کتاب کی لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - ضخامت عام کتابی سائز کے ۱۷۲ صفحات - قیمت عہ ر مصنف سے ۵۹ - نیا گاؤں لکھنؤ کے پتے سے مل سکتی ہے -

ہماری شاعری:- اس کتاب کی طبع سوم بغرضِ تبصرہ موصول ہوئی ہے - اردو کی کسی کتاب خصوصاً تنقیدی کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہونا اس کی مقبولیت و افادیت کا بیّن ثبوت ہے - دو مختلف دیباچوں کے بعد ۱۱۲ صفحات کا بسیط مقدمہ ہے جس میں شعر کی ضرورت، شعر کی حقیقت، معنوی و لفظی خوبیاں، ترجمہ، صنعتوں کا استعمال اور اشعار میں فرقِ مراتب وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے - اس میں ہماری شاعری پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں اُن کے مفصل جواب دئے گئے ہیں - مصنف نے جس تفصیل، شگفتگی اور خوش اسلوبی سے ہماری شاعری پر نظر ڈالی ہے وہ حد درجہ قابلِ تحسین ہے - اظہارِ مطلب کے لئے ایسا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے کہ الفاظ ختم ہونے سے پہلے مطلب کی صحیح تصویر ذہن میں آجاتی ہے -

سید مسعود حسن رضوی ادیب بی - اے یقیناً قدردانانِ اردو کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں اور یہ ادبی کارنامہ اس قابل ہے کہ ہر صاحبِ علم اسے پڑھے - کتاب $\frac{18 \times 22}{8}$ سائز کے اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ہے - کاغذ، کتابت اور طباعت نہایت اعلیٰ - قیمت مجلد بارچہ دو روپے - ملنے کا پتہ : - کتاب گھر - دین دیال روڈ - لکھنؤ -

محاورات نسواں:- محترمہ وزیر بیگم صاحبہ ضیاؔ (ادیب فاضل) کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ "آرائشِ جمال" لکھ کر آپ نے علمی و ادبی حلقوں میں خاص امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی آپ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں موصوفہ نے قدیم و جدید ماخذوں سے زنانہ محاورات کو جمع کیا ہے اور ان کا مطلب بیان کر کے توضیحی جملوں میں محلِ استعمال بھی بتایا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مستند کتبِ مضامین و لغت سے مدد لی گئی ہے۔

قارئین کی سہولت کے لئے محاورات پر اعراب دئے گئے ہیں۔ طلبہ و طالبات کے لئے خصوصیت سے مفید ہے۔ امید ہے کہ اردو دان حضرات اس ادبی خدمت کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

ملنے کا پتہ:- ایم فیروز الدین اینڈ سنز گورنمنٹ پرنٹرز اینڈ پبلشرز ۱۱۹ سرکلر روڈ لاہور۔

شاعر کے سو شعر:- آغا شاعر قزلباش دہلوی ملک کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ شاعر کے سو شعر آپ کے فرزند ارجمند آغا سرورؔ کے انتخاب کردہ ہیں۔ بقول حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی "آغا صاحب کی زبان میں وہ شیرینی ہے جیسے لعلِ نگار۔ وہ موج ہے جیسے شاخِ گل، اور وہ روانی ہے جیسے آبِ رکنا باد۔"

ناظرین کو ضرور اس مختصر سے مجموعے کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔ نگارستان ایجنسی کشمیری دروازہ دہلی سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

مثنوی سلطانہ رضیہ بیگم:- سلطانہ رضیہ بیگم تاریخ ہند میں خاص اہمیت و شہرت رکھتی ہے۔ چودھری صدر الدین صاحب ادیب فاضل نے سات ابواب میں اس کے عہدِ نیابت سے لیکر قتل تک کے واقعات کو مثنوی کی شکل میں منظوم کیا ہے۔ ہر باب ساقی نامہ سے شروع ہوتا ہے۔ نظم شگفتہ ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸۔ حجم ۱۲۸ صفحات۔ قیمت پانچ آنے۔ مؤلف سے کوٹ فتح الدین خاں قصور سے مل سکتی ہے۔

کتابچہ نمبر (۱):- آقا سید محمدؐ علی سابق پروفیسر نظام کالج کے چھ ریڈیو لکچروں کا مجموعہ ہے۔ جس میں چار تو "شعر شاعری اور فارسی شعراء" کے موضوع پر ہیں۔ ایک "ریختۂ زبان اردو" اور آخری "غالبؔ کی فارسی شاعری" کے عنوان پر۔ کتاب پُر مغز معلومات کی حامل ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۱۴۲ صفحات۔ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد (دکن)

عجائباتِ سائنس:- جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب موجودہ سائنس کے اہم مسائل پر قلمبند کی گئی ہے۔ فاضل مؤلف نے مادے کے اجزائے لا یتجزٰی۔ بجلی کے ذرات۔ ایتھر اور نادید لہریں۔ ریڈیم۔ نظریۂ اضافیت وغیرہ دس ابواب میں تمام ضروری مسائل کو بالوضاحت پیش کیا ہے۔ زبان نہایت سادہ ہے تاکہ ہر خاص و عام سائنس کی دلچسپیوں سے حظ اُٹھا سکے۔ مؤلفہ محمدؐ عبد الحق صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل سکول۔ لاہور۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۱۶ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ ایم محمدؐ ظفر پبلشر ۵۰ میکلوڈ روڈ لاہور کے پتے سے طلب کی جا سکتی ہے۔

عورت کی ہمت:- خواجہ عبد الکریم سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن لاہور و چودھری عبد المجید بی۔اے بی ٹی نے یہ ناول اصلاح دیہات کے لئے رقم فرمایا ہے۔ قصہ نہایت دلچسپ اور نصیحت آموز ہے۔ زبان اصلاح طلب ہے۔ اصلاح دیہات کے شائقین کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۶ صفحات۔ قیمت ۸ آنے۔

ملنے کا پتہ۔ پنجاب کتاب گھر موہن لعل روڈ۔ لاہور۔

بزمِ انتخاب

مظلوم بچہ

بحسرت مالکہ کے حکم سے اِک ناتواں بچہ
جھکا میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا

سحر کا وقت ہے، شادابیاں ہیں نرم جھونکوں میں
گلی سے آرہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں

پیاپے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے
ذرا سا سر اُٹھا کر مالکہ کو دیکھ لیتا ہے

صدائیں کھیل کی آ آ کے جب اوسان کھوتی ہیں
اُسے اپنے جگر پر ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں

تقاضا کمسنی کا دل میں جب دُھومیں مچاتا ہے
لرز اُٹھتا ہے، گردن موڑتا ہے، سر کھجاتا ہے

دَمادَم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رگِ طفلی پر اِک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

غریب افلاس! تجھ کو دھیان میں لاتی نہیں دُنیا
ترے معصوم بچوں تک کو بہلاتی نہیں دُنیا

(کلیم)　　　　جوشؔ

تجربہ

(۱) تجربہ بہت بڑا استاد ہے۔ عظیم ترین شخصیتوں کا معلم ہے یہ بغیر کچھ کھوئے حاصل نہیں ہوتا۔ تجربہ براہِ راست خود ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو تجربے سے دوچار ہوتے ڈرتے ہیں، کبھی کچھ سیکھ ہی نہیں سکتے۔

(۲) تجربہ، علم و تفکرِ محض سے بالا شے ہے، اور کبھی کبھی تو علم و تفکر کے قطعی خلاف واقع ہوتا ہے، تعلیم ہمیشہ تجربے کو ساتھ نہیں رکھا کرتی۔ اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ بعض اوقات احمق ترین انسان ہوتے ہیں۔

(۳) ہر منزل ایک وہم، اور ہر اُمید ایک فریب یا کمزوری ہے اور ہمیں اس حقیقت کا اُس وقت پتہ چلتا ہے جب منزل سامنے آجاتی، اور امید پوری ہوجاتی ہے۔

(۴) ہر انسان اُس وقت تک ایماندار ہے جب تک تمہیں اس کا موقع نہیں ملتا کہ تم اس کی بے ایمانی پر مطلع ہوجاؤ۔

(۵) خوشامدی کی زبان، جب تک کہ وہ تمہارے سامنے ہے، حریر و پرنیاں کی سی نرم ہوتی ہے، لیکن تمہارے پیچھے وہ سنگ و آہن سے بھی زیادہ سخت ہوجاتی ہے۔ تمہارے منہ پر تو وہ تمہارے محاسن کی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے، اور تمہاری غیبت میں وہ تمہاری کمزوریوں کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتا ہے۔

خوشامدی کی نظر میں دوست کا وہی درجہ ہوتا ہے جو کمہار کی نظروں میں مٹی کا۔

(۶) کھُلے دل سے ملنا شروع کرو گے تو بغیر جانے بوجھے، ہزاروں مرتبہ بھری محفلوں میں بیوقوف بنائے جاؤ گے اور ایک راست گفتار و راست کردار انسان کی طرح برتاؤ کرو گے تو بیشمار دشمنوں کے نرغے میں گھِر جاؤ گے۔ آج کتنے لاتعداد شریف افراد ایسے ہیں جو قلب کی صفائی اور راستبازی کی بدولت شکستہ حال حمقا کا خطاب پاچکے ہیں۔

(۷) ایک کھُلے ہوئے جھوٹے کے سامنے دلائل پیش کرنا قطعی بے نتیجہ فعل ہے، کیونکہ وہ ایک لمحے میں تو "ہاں" اور دوسرے میں "نہیں" کہہ دینے میں کوئی باک نہیں کرسکتا۔

(۸) تم ایک ایسے انسان کو خود اس کے وجود کے متعلق بھی قائل

نہیں کرسکتے، جو قائل نہ ہونے کی قسم کھا چکا ہو۔

(کلیم) جوش ملیح آبادی

عبدالرحمٰن الناصرالدین اللہ

"بنوامیہ کے ان حکمرانوں میں جو اندلس کے تخت پر جلوہ فگن ہوئے سب سے پہلا درجہ حقیقت میں عبدالرحمٰن الناصرالدین اللہ کو ملنا چاہئیے۔ اس نے اپنی حکومت ۳۰۰ - ۳۵۰ھ کے دوران میں جو کارنامے کئے وہ دراصل معجزے تھے، جس وقت اس نے سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی اس وقت تمام ملک فتنہ و فساد اور جنگ و جدل کے شعلوں سے بھڑک رہا تھا۔ فرقہ بندی کی باد سموم ہر طرف چل رہی تھی۔ طوائف الملوکی کی گرم بازاری تھی۔ شمالی عیسائیوں کے حملوں کے لئے تمام راستے کھلے تھے اور قریب تھا کہ افریقہ اور لیون کے باشندے اسے اپنا لقمۂ تر بنالیں لیکن عبدالرحمٰن نے تمام رکاوٹوں اور موانع کے باوجود نہ صرف اندلس کو بیرونی حملوں سے بچایا، بلکہ اندرونی فتنوں سے بھی پاک و صاف کر کے اسے پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم کر دیا۔ اس نے اندرون ملک میں امن و امان قائم کر کے بیرونی ممالک میں اس کی عظمت کا ڈنکا بجا دیا۔"

اس کے بادشاہ ہونے سے پیشتر خزانۂ عامرہ تقریباً خالی پڑا تھا، مگر اس کے وقت میں شاہی محاصل کی سالانہ مقدار ۶۲۴۵۰۰۰ سکۂ طلائی تھی۔ جس میں سے ایک تہائی خرچ کرتا تھا۔ ایک تہائی پس انداز اور باقی ماندہ رقم اپنی تعمیرات میں لگاتا تھا، حساب لگایا گیا ہے کہ سنہ ۳۴۰ھ میں اس کے خزانہ میں دو کروڑ سکۂ طلائی موجود تھے۔ چنانچہ ایک سیاح نے جو ماہر مالیات بھی تھا دنیا کو بتایا ہے کہ اس زمانہ میں ناصرالدین ہمدانی والئے الجزیرہ اور عبدالرحمٰن الناصرالدین اللہ دنیا کے مالدار ترین بادشاہ تھے۔"

"کاشتکاری، صنعت و حرفت اور علم و فنون سب عروج پر تھے ـــــ قرطبہ کی آبادی اس وقت پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ تین عظیم الشان مسجدیں کئی خوبصورت محلات۔ لاکھوں مکانات اور اٹھائیس باغ اس کی زیب و زینت کا باعث تھے۔ اگر وہ دنیا کے کسی شہر سے کسی بات میں کم تھا۔ تو وہ عروس البلاد بغداد تھا ـــــ عبدالرحمٰن کی طاقت بھی خوب بڑھی ہوئی تھی۔ ایک عظیم الشان بیڑے کے ذریعے وہ بحیرہ روم میں خلفائے فاطمیہ سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اور سبتہ پر قبضہ کر کے اس نے مراکش کی چابی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ایک زبردست فوج کے ذریعے جو غالباً اس زمانہ کی بہترین فوج تھی وہ شمالی عیسائیوں کی پیش دستیوں کو روکے ہوئے تھا۔ دنیا کے معزز ترین بادشاہ اس کی دوستی کے خواہاں تھے۔ قسطنطنیہ قیصر جرمنی۔ فرانس اور اٹلی کے بادشاہوں کے سفیر اس کے دربار میں حاضر رہا کرتے تھے۔"

"یہ کارنامے یقیناً نہایت شاندار ہیں۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ محیرالعقول ہے۔ وہ ان کارناموں کو انجام دینے والے کا اپنا وجود ہے۔ یہ ایسی عجیب و غریب آدمی کا کام تھا۔ کہ اس کی عالی نظری سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہ تھی، وہ ہر امر کی جزئیات تک سے واقف تھا اسی وجہ سے وہ سلطنت کے عقدہائے لاینحل چٹکیوں میں حل کر لیتا تھا، یہ ہوشیار اور قابل ترین شخص جس نے مرکزیت قائم کی۔ جس نے دوسری حکومتوں سے تعلقات پیدا کر کے سیاسی توازن برقرار رکھا اور جس نے اپنی رواداری اور آزاد خیالی سے دیگر مذاہب کے پیرووں کو بھی اپنا مشیر بنانے سے کبھی دریغ نہ کیا۔ اگر انصاف کی نظروں سے دیکھا جائے تو یہ زمانہ وسطی کا ایک مطلق العنان خلیفہ ہی نہیں۔ بلکہ دور حاضرہ کا ایک دستوری بادشاہ تھا۔"

محمد عبداللہ قریشی

(ادبِ لطیف)

نئے ادب کی ضرورت

"ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرایئے وہ طلینت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اُن کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔"

"ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو۔ حُسن کا جوہر ہو۔ تعمیر کی رُوح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہو گی۔"

پریم چند مرحوم

"دیکھو کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب کی نئی زندگی کو دیکھو وہاں کے تازہ ادب کو دیکھو۔ کیونکہ آزادی کی تنظیم کی، منصوبہ بندی کی، اشتراکیت کی، اور عدل و مساوات کی موجیں اس کے طوفانی سمندروں میں اُچھل رہی ہیں تم میں بھی نئی زندگی کا احساس پیدا ہو گا تو نئے سے نئے خیال پیدا ہوں گے اور وہ اپنے لئے خود بخود اظہار کے نئے طریقے ڈھونڈیں گے۔ اس طرح ایک نئی طرز تحریر، نئے الفاظ اور ایک نیا ادب پیدا ہو گا اور جو خیال ایک

صحیح قسم کی زندگی سے پیدا ہوگا جو اپنے لئے مشکل الفاظ نہ تلاش کرے گا وہ دل سے نکل کر دل میں آسانی سے جگہ پیدا کرلے گا۔ ہمارا مقصد ہونا چاہئیے عام لوگوں کی تعلیم و ترقی۔ اس کے لئے ضرورت ہے اصلاح شدہ مشاعروں کی، آسان فلمی ڈراموں کی، اور رسالوں خصوصاً روزانہ اخباروں میں آسان عام فہم زبان میں نئے اصلاحی و انقلابی خیالات کی۔ لمعات، کیفیات، ان مجہولات کی جگہ اگر دل سے دل کی باتیں ہوں، سیدھے سادے جذبات ہوں، دنیا کی تازہ تحریکوں کا نقشہ ہو، سائنس کی روز افزوں ترقی کا بیان ہو تو ہماری جاہل ناواقف قوم ادبیات سے کتنا فائدہ اٹھائے پھر ادب اُس کی بیداری کا ذریعہ بن جائے اور ایک نئی زندگی کی بنیاد پڑے۔ کہیں کہیں کوئی آواز بلند ہو رہی ہے۔ مغربی ادب کے مطالعہ اور اقبال کی حیرت انگیز شاعری نے ایک نئے دور کا آغاز ضرور کیا جس سے بعض نوجوان مصنف اور شعراء متاثر ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے نشاط پسندی اور ایک غلط قسم کی "ٹیگوریت" اور نام نہاد "رومانیت" نے پھر ہاتھ پاؤں شل کر دئے۔ "تو دوپٹہ چن رہی تھی اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔" یا "اے شاہد حقیقی! میں تیرے نور جمال سے بے اجر ہو کر افتاں و خیزاں آ رہا تھا۔" وغیرہ وغیرہ۔ اس دل کی دھڑکن اور اس اندھا دھند نام نہاد حقیقت پرستی کی روک تھام کی اشد ضرورت ہے۔ فطری خیالات کی اور آسان زبان کی حاجت محض اس لئے نہیں کہ ہماری زبان دوسری زبانوں کا مقابلہ کامیاب طور پر کر سکے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ وہ خود ہمارے لئے مفید ثابت ہو اور ہماری صحیح تعلیم و تربیت کی ضامن بنے۔ پھر کچھ شبہ نہیں کہ دوسرے لوگ اس سے ضرور متاثر ہوں اور دیکھیں کہ کیسے ہم نے اپنی زبان کو اور ہماری زبان نے ہمیں شاہراہ زندگی پر سیدھے رستے ڈال دیا ہے!"

میاں بشیر احمد بی۔ اے

ہمارا ملک ہر قسم کے مذہبی توہمات کا شکار ہے۔ مذہبی تعصب یا روحانیت نے جو گل ہندوستان میں کھلائے ہیں سب کو معلوم ہیں۔ روحانیت کے علاوہ ہمیں اپنے اخلاق پر بھی ناز ہے، ممکن ہے کہ ناز بجا ہو، مجھے اس سے بحث نہیں۔ رونا اس بات کا ہے کہ مذہب، روحانیت اور اخلاق ادبی دنیا میں بھی گھس گئے ہیں، اور اس بُری طرح کہ نکالے نہیں نکلتے۔ ادبی فن کو مذہب، روحانیت اور اخلاق کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ جب میں اپنے تعلیم یافتہ دوستوں کی زبانی سنتا ہوں کہ فلاں کہانی، فلاں ڈراما یا فلم دھارمک ہے یا اخلاق اور روحانیت سے پُر ہے تو مجھے یہ خیال کر کے رنج ہوتا ہے کہ سیاسی سوراج کی طرح ہمارا ادبی سوراج بھی ابھی کوسوں دُور ہے۔ ہر ایک ملک اور زمانہ کا اخلاق مختلف ہے، بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا مگر خوبصورتی ایک اٹل چیز ہے۔ خوبصورتی کے پروانے مذہب و ملت، رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایک غزل یا افسانہ کو اخلاقی یا روحانی یا مذہبی نظر سے دیکھنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ ایک پھول سے ہم پوچھیں کہ تیرا مذہب کیا ہے اور تیرے پیدا ہونے کا راز کیا ہے اور تو اپنی خوشبو اور خوبصورتی کو بے شرمی سے باغ میں کیوں بکھیر رہا ہے۔"

پروفیسر بھوپال سنگھ ایم۔ اے ڈی (لٹ)

اگر آج نئی پود اپنی فسانہ نگاری میں سے گل و بلبل نکال پھینکے اور سیدھی سادی وقائع نگاری پر آ جائے تو ناممکن کہ ہم یورپین افسانہ نگاروں سے بڑھ نہ جائیں۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ دلچسپ واقعات روس میں تو ہوتے ہوں مگر ہندوستان میں نہ ہوتے ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ چونکہ ہندوستان میں سینکڑوں مذاہب، رسمیں، قومیں، زبانیں اور روس اور فرانس سے کہیں زیادہ اقسام کی ذہنیتیں موجود ہیں قدم قدم پر طرح طرح کے قانون ہیں۔ لہٰذا بہ نسبت روس اور فرانس کے ہندوستان کی معاشرت ایسے ایسے تماشہ کے واقعات پیش کرتی ہے۔ جن کے عجیب و غریب پلاٹ دوسری جگہ مرتب ہونا ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ میرا قول ہے کہ "جو دیکھو وہ لکھو، اور جو دکھائی دے وہ لکھو۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی (ادبی دنیا)

صفحۂ اطفال

زبان کی کھیتی

کسان کھیت میں بیج ڈالتا ہے جیسا بیج بوتا ہے ویسی ہی کھیتی اُگ آتی ہے۔ گیہوں بوئے تو گیہوں کاٹے جَو بوئے تو جَو اُگیں۔ بیج اچھا ہے۔ تو کھیت میں اناج بھی اچھا ہوگا۔ بیج خراب ہے۔ تو ایسا ہی نکمّا غلّہ پیدا ہوگا۔ جَو بو کر کھیت سے گیہوں کی امید رکھے۔ تو یہ اس کی نادانی ہے۔ بُرا بیج بکھیر کر اچھے کی توقع کرے، تو اس کی سمجھ کا پھیر ہے۔

بس اسی طرح سمجھ لو کہ ہر انسان ایک کسان ہے، اس کی زبان بیج کا تھیلہ ہے۔ زبان کی باتیں بیج ہیں۔ اور دنیا کو کھیت خیال کر لو!

یہ کسان اپنی زبان کے تھیلے میں سے جیسا بیج کھیت میں بکھیرے گا۔ ویسا ہی کاٹے گا۔

زبان کو قابو میں رکھ کر اچھی باتیں کہے گا، تو دنیا اس کی عزت کرے گی۔ اسے امداد دے گی۔ اس کی زندگی کو کامیاب بنائے گی اور اگر زبان کو عقل کے کہنے میں نہ رکھے گا۔ آزاد چھوڑ دے گا۔ بے تکی ہانکنے لگے گا۔ اول فول بکے گا۔ تو دنیا کے کھیت سے کامیابی کا غلّہ لینے سے محروم ہو جائے گا۔ دُنیا سے ذلتیں اٹھائے گا۔ دُکھ جھیلے گا۔ زندگی بھر غموں سے نڈھال رہے گا۔

یاد رکھو۔ زبان کی پل بھر کی غلطی کبھی ساری عمر انسان کو مصیبتوں میں ڈال دیتی ہے۔

کالے پانی اور پھانسی کی کوٹھڑیوں میں سارے ڈاکو ہی نہیں رہتے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جنہوں نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی۔ ان میں اور کوئی بُرائی بھی نہیں۔ صرف اپنی زبان کے کارن دُکھ جھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔ زبان کو بے قابو کرنے کا مزہ بھوگ رہے ہیں۔ زبان کو کہنے میں رکھتے تو ان حالوں کو کبھی نہ پہنچتے۔

فارسی کی کہاوت ہے۔

"زبان شیری ملک گیری"

اس کا مطلب یہ ہے کہ میٹھی زبان آدمی کو ملکوں کا مالک بنا دیتی ہے اور یہ بات ہے بھی سچ، جو آدمی میٹھی زبان سے بات کرنے کی عادت ڈالتا ہے۔ اس کے سب دوست بن جاتے ہیں۔ کوئی اس کا دشمن نہیں رہتا۔ پھر جس کے سب دوست ہو جائیں وہ ملک کا مالک نہیں تو اور کیا ہے؟ ملک کے مالک کی طرح لوگ اس کا بھی کہنا مانتے ہیں۔ اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ وقت بے وقت : سے کسی کی

مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ تو اس کی ایک آواز پر سب دوڑے چلے آتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو میٹھی زبان کے آدمی کا مقابلہ کوئی ملک کا مالک بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مالک کا کام تو آدمی اکثر اس کے ڈر سے کیا کرتے ہیں۔ لیکن میٹھی زبان بولنے والے کا کہنا لوگ اس لئے مانتے ہیں کہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ دل سے اس کی خدمت کرنی چاہتے ہیں۔ اس کی خدمت کرنے سے خوش ہوتے ہیں۔ آدمی اگر سوچ سمجھ سے کام لے۔ تو زبان کو قابو میں رکھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ زبان پر جب کوئی ان کہنی بات آئے تو روک لے۔ زبان کوئی ایسی طاقت تو نہیں جسے روکا جائے تو وہ گلا دبا لے گی۔

جو زبان کو بُری بات کہنے سے نہیں روکتے۔ وہ زبان درازی کے ہاتھوں ہمیشہ مصیبتوں کے نرغے میں گھرے رہا کرتے ہیں۔

تم اپنے بیری دشمن سے بچ سکتے ہو کیوں کہ وہ تم سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ لیکن اگر زبان کو لگام نہ دو گے تو یہ میٹھی چھُری ہے۔ تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے۔ مگر زبان کا لگایا ہوا زخم ہمیشہ ہرا رہتا ہے۔ تمہارے بیرمنہ میں رہتے ہوئے تمہارے لئے آستین کا سانپ بن جائے گی۔

حضرت پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اسی لئے خدا سے دُعا کی ہے کہ:۔

"اے خدا میں زبان کی بُری کھینی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

ہمیں بھی چاہیئے کہ اپنی زبان کو عقل کے کہنے میں رکھیں اور اسے بے قابو نہ ہونے دیں۔ اسے میٹھی چھری بنانے کی بجائے میٹھی زبان بنا کر دُنیا میں عزّت و راحت پائیں اور یوں اپنی زندگی کو کامیاب بنائیں۔

(منقول از پریم لاہور)   تاجور

(بقیہ مختصرات)

اُردو پریس کانفرنس:۔ اردو صحیفہ نگاروں کا انتشار جہاں قومی وملکی ترقی کے لئے ضرر رساں ثابت ہوا ہے۔ وہاں اردو کے حق میں بھی خطرناک طور پر مضرت رساں ہے۔ آج اگر اردو صحیفہ نگاروں کے اندر نظم اور یکجہتی ہوتی تو زبان کا یہی مسئلہ جس نے ہندوستانیوں کے غریب الفکر دماغوں کو جانسوز کشمکش میں اسیر کر رکھا ہے۔ چشم زدن میں حل ہو سکتا تھا۔

ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم تعلیمی کانفرنس کے کارکنوں نے کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے اہم موقعہ پر "اردو پریس کانفرنس" کے انعقاد کا بھی انتظام کیا ہے اور اس طریق سے تمام ہندوستان کے اخبار نویسوں کو ایک بار اکٹھا مل بیٹھنے اور اپنے مفاد اور اردو زبان کی بہبودی پر متفقہ طور پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا زریں موقع بہم پہنچایا ہے۔

ان حالات میں جبکہ ہندوستانی اخبار نویسوں کی کوئی انجمن نہیں جو اُن کی گزشتہ ابتلاؤں اور موجودہ حوادث کے اندفاع کے لئے کوئی مفید لائحہ عمل وضع کر سکے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہندوستان کے ادیب اور اخبار نویس اس کانفرنس میں پورے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت فرمائیں اور اپنی تجاویز بھیجیں۔ تاکہ ان کے مفید مشوروں کی روشنی میں کوئی ٹھوس نصب العین مرتب کیا جا سکے۔ ہم کارکنان کانفرنس کی خدمت میں اس مبارک اقدام پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ وہ کوئی حقیقی وعملی پروگرام ترتیب دے کر وقت کے بہترین استعمال کا ثبوت دیں گے۔

یزدانی

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور
آنریری ایڈیٹر:- میرزا ادیب بی۔اے
ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔اے
(سید) عبدالرشید یزدانی

شاہکار

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۷ء
جلد (۵) نمبر (۱)

فہرست

تصاویر:- (سہ رنگی) (۱) بارہ سنگھا۔ (یک رنگی) وزرائے پنجاب۔

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ موہن لال روڈ بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

"شاہکار" کے متعلق

ارکانِ حکومت، عمائدِ ملک اور اہلِ علم و قلم حضرات کی رایوں کے چند اقتباسات

ہزایکسیلنسی سر ہربرٹ ولیم ایمرسن کے سی آئی ای، آئی سی ایس گورنر پنجاب:۔

"میں آپ کے اس اقدام سے دلچسپی رکھتا ہوں اور اس کی کامیابی کا متمنی ہوں۔"

آنریبل سر ملک فیروز خاں نون۔ ایم۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ سابق وزیر تعلیم پنجاب۔ حال کمشنر فار انڈیا (انگلینڈ):۔

میں "شاہکار" کے مضامین نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ "شاہکار" کا اہم ترین مقصد عوام کو غیر ممالک کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ ہمارے اکثر اردو رسائل و جرائد سیر و سیاحت، تاریخِ جدید اور روزانہ واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔

آنریبل ڈاکٹر میاں سر فضل حسین ایم۔ اے۔ ایل ایل ڈی۔ بارایٹ لا۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سابق ممبر تعلیمات حکومتِ ہند و وزیر تعلیم پنجاب:

شاہکار اعلیٰ پایہ کا ماہنامہ ہے۔ عمدہ اصولوں پر چلایا جا رہا ہے۔ اور زبانِ اردو و ملک کے لئے مفید ہے۔ مجھے رسالے کا خریدار بنالیں اور اس کا خیرخواہ معاون تصور کریں۔

آنریبل سر جوالا پرشاد سری واستو کے۔ ٹی۔ وزیر تعلیم صوبجات متحدہ:۔

میں اسے اوّل درجہ کی چیز سمجھتا ہوں اور آپکو مبارکباد دیتا ہوں میں اس کا خریدار بننا پسند کروں گا۔

رائٹ آنریبل نواب حیدر نواز جنگ بہادر سر اکبر حیدری صدر اعظم مملکت آصفیہ دکن:

مجھے "شاہکار" پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ میری رائے ہے کہ اس کا خیر مقدم اردو صحافت کی تاریخ میں ایک ممتاز نشانِ راہ کی حیثیت سے کرنا چاہیئے۔ دلچسپ اور ہا دیانہ مضامین کی اشاعت سے آپ کا مجلہ اردو دنیا کی جو خدمت بجا لاسکتا ہے۔ اسے اردو کے وہ تمام شیدائی بیحد پسند کریں گے جو اس زبان میں مختلف ترین موضوعات پر اظہارِ خیال دیکھنے کے متمنی ہیں۔

آنریبل جسٹس خواجہ سر محمد نور بی۔ اے، بی۔ ایل، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی جج ہائیکورٹ پٹنہ:۔

ترتیب و تہذیب اعلیٰ ہے اور مقالات قیمتی اور ہادیانہ ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ایل ایل ڈی ممبر اسمبلی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

میں نے رسالہ "شاہکار" کا مطالعہ کیا۔ اس کی ظاہری شان اور باطنی خوبیاں ناقابلِ انکار ہیں۔ اس کے علمی اور تعلیمی مضامین بہت بلند پایہ ہیں اور تعلیمات پر اس کی رائے قابلِ وقعت ہوتی ہے۔ ایسے بلند اور مفید علمی رسالے کی ادبِ اردو کو ضرورت تھی۔

مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ) سابق نائب معتمد تعلیمات حکومتِ ہند:۔

مضامین کا انتخاب و ترتیب، مطالب کا مفاد و تنوع۔ تصاویر کی زیبائش اردو صحافت کے لئے مایۂ ناز خیال کئے جاسکتے ہیں۔ یہ امر واقعی ہے کہ شاہکار سے بہتر رسالہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر لسانیات عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد دکن):۔

اس قسم کے دیدہ زیب رسالے کی اردو کو بہت سخت ضرورت تھی۔ اگرچہ پنجاب سے اس طرح کے اور بھی رسالے نکلتے رہے ہیں لیکن "شاہکار" اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سب پر سبقت لے گیا ہے۔ خاص کر تحقیقی اور تنقیدی مقالات و مضامین کی وجہ سے اردو کے سنجیدہ اور علمی رسائل میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہوچکی ہے۔ اس پایہ کے اعلیٰ علمی مقالات کے ساتھ ساتھ ظاہر بینوں اور عام دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے مذاق کا بھی خیال رکھنا نہایت مشکل امر ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے جب شاہکار میں دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ اڈیشنل پروفیسر پنجاب یونیورسٹی:۔

"شاہکار" درحقیقت شاہکارِ صحافت ہے۔ گذشتہ بیس سال میں پنجاب کی ادبی فضا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ آج اچھا کہنے والوں اور اچھی سمجھ رکھنے والوں کی تعداد درجنوں سے سینکڑوں ہوچکی ہے۔ اس حیرت افروز انقلاب کے محرکین میں سب سے ممتاز درجہ علامہ تاجور صاحب کا ہے۔ اللہ دے تو عروسِ ادب کو ایسے ہی جاں نثار و خدمت گزار دے۔ کیا نظم اور کیا نثر۔ دونوں میں اس صاحبِ کمال نے نہ صرف خود اعجازِ قلم دکھایا۔ بلکہ بیسیوں کو ادب کی سیدھی راہ پر بھی ڈالا! فقیر حقیر بھی ان لوگوں میں ہے جنہیں تاجور صاحب کی تحریر اپنے حلقۂ اثر میں لا کر ہی رہی۔ خدا وہ

مختصرات

آزاد پنجاب کی جدید حکومت

پنجاب کی اتحاد پارٹی اپنے جمہوری اصول و جمہوری ساخت اور سابقہ سیزدہ (۱۳) سالہ حسن خدمات کے سبب صوبے کے رائے دہندوں کا اعتماد حاصل کرنے میں قابلِ رشک حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ قدرتاً صوبے کی عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں آنی چاہیئے تھی اور آئی۔ سر سکندر حیات خاں صاحب پارٹی لیڈر نے ہر طبقے کی نمائندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے کابینۂ وزارت میں ایسے حضرات کو شامل کیا ہے جو اپنی اپنی جگہ اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر وزارت کے لئے سب سے موزوں خیال کئے جا سکتے ہیں۔

کابینۂ وزارت کی تشکیل:۔

چنانچہ جدید کابینۂ وزارت میں حسب ذیل حضرات شامل کئے گئے ہیں

(۱) سر سکندر حیات خاں صاحب۔ سابق گورنر پنجاب۔
(۲) سر سندر سنگھ مجیٹھیا سابق ریونیو ممبر پنجاب گورنمنٹ۔
(۳) راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام سابق وزیر تعلیم پنجاب۔
(۴) میاں عبدالحی صاحب ایڈوکیٹ سابق ایم۔ ایل۔ اے
(۵) میجر خضر حیات خانصاحب ٹوانہ (کالرہ اسٹیٹ)
(۶) مسٹر منوہر لال بار ایٹ لا سابق وزیر تعلیم پنجاب۔

موجودہ حالات میں اس سے موزوں ترکیبنٹ نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ ہمارے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں صاحب مدتوں پنجاب گورنمنٹ کے ریونیو ممبر، ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر رہ چکے ہیں۔ حکومتی معاملات میں اُن کا تجربہ بہت وسیع ہے۔ یوں بھی وہ تمام صوبے میں بے امتیاز مذہب و ملت ہر دلعزیز ہیں۔ اُن کے گورنر ہونے پر تمام ملک کے مسلم و غیر مسلم پریس اور سیاسی رہنماؤں نے اظہار مسرت و اطمینان کیا تھا۔

راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام ایڈوکیٹ ایک قابل قانون داں ہونے کے ساتھ رہتک ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین اور پنجاب گورنمنٹ کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

سر سندر سنگھ مجیٹھیا کئی سال تک گورنر کی ایگزیکٹو کونسل میں ریونیو ممبر کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

مسٹر منوہر لال بار ایٹ لا بہت بڑے ماہر اقتصادیات ہیں اور چار سال تک پنجاب کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

البتہ اس کابینے میں دو حضرات جدید نظر آتے ہیں۔

میاں عبدالحی ایڈوکیٹ اپنی قابل رشک قانونی قابلیت کی وجہ سے سارے صوبے سے روشناس ہیں۔ لدھیانہ میونسپل بورڈ کے سالہا سال تک چیرمین اور سات سال مجلس قانون ساز ہند (لیجسلیٹو اسمبلی) کے سرگرم کار ممبر کی حیثیت میں ملک و ملت کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ جدید حکومت میں ان کا انتخاب بہ حیثیت وزیر تعلیم بہت موزوں انتخاب ہے

میجر خضر حیات خاں ٹوانہ ہمارے صوبے کے جواں سال و جواں بخت و جواں کار وزیر ہیں۔ پنجاب کا سب سے بڑا تعلقہ کالرا اسٹیٹ ہے۔

میجر خضر حیات خاں صاحب اس اسٹیٹ کے مالک ہیں۔ کالرا اسٹیٹ کا نظم و نسق میجر صاحب کی بیدار مغزی اور حسن انتظام کے سبب برطانوی پنجاب کے بندوبست سے بہت بہتر حالت میں ہے۔ امید ہے اپنے ریاستی انتظام کے متعلق مفید تجربات سے وہ موجودہ وزارت میں کام لیں گے۔

مذکورہ کابینۂ وزارت اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب موجودہ حالات میں حقیقتہً بہت موزوں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت کی مخالف پارٹی بھی قابلیت و اہلیت میں اس کابینے سے کسی حیثیت میں کم نہیں اور اگر یہ پارٹی جدید دستور حکومت سے تعاون کر سکتی تو اس میں متعدد حضرات قلمدانِ وزارت کے مستحق تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اس جماعت نے جدید دستورِ حکومت کی تخریب کو اپنا نصب العین بنا لیا اور اس طرح صوبہ اُن کے بہترین افراد کی خدمت سے محروم ہو گیا۔ بہرحال مخالف حکومت جماعت کی قابلیت اور قابلانہ تنقید و محاسبے سے حکومت کے ارباب حل و عقد زیادہ احتیاط و حزم سے حکومتی نظام کو چلا سکیں گے۔

جدید حکومت سے پبلک کی توقعات:۔

اتحاد پارٹی نے اپنے مینوفیسٹو میں جن بلند اغراض و مقاصد کا اعلان کرکے پبلک سے اپنے لئے ووٹ طلب کئے تھے۔ پبلک اپنے اظہار اعتماد کے فرض سے سبکدوش ہو چکی ہے۔ اب جدید حکومت کی جانب سارے پنجاب کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ اہل پنجاب نئی حکومت سے بجا طور پر یہ امید رکھتے ہیں کہ

(۱) وہ حالات کی سازگاری کے ساتھ ساتھ اپنے زریں وعدوں کے ایفا میں تاخیر و تعطل کو جائز نہ سمجھے گی۔

(۲) اسی کے ساتھ یہ بھی توقع بے جا نہیں کہ صوبے کی موجودہ گورنمنٹ اقلیتوں کے جذبات و حقوق کا احترام کرتے ہوئے اپنی فراخ دلی و حق پژوہی کا ثبوت دیتی رہے گی۔

(۳) پنجاب کے ساہوکاروں اور زمینداروں، پھر زمینداروں اور کاشتکاروں کے باہمی خلفشار کو کسی ایسے منصفانہ طریق عمل کے ساتھ مٹائے گی جو ہر فریق کے لئے قابل قبول ہو سکے۔

(۴) یہ صوبہ فرقہ وارانہ مقاتلوں سے مفلوج ہو چکا ہے۔ فرقہ پرست اخبارات مذہب کے نام پر صوبے کے امن و امان کو خطرے میں ڈالنے کے لئے ہر وقت آمادۂ فسق و فجور رہتے ہیں۔ جدید حکومت اس صوبے کے لئے پریس ایکٹ میں اگر کچھ ایسے قوانین کا اضافہ کر سکی جن کے نفاذ سے فریقانہ اخبار نویسی مجال نشو و نما سے محروم ہو جائے تو حکومت کی یہ خدمت پنجاب بلکہ ہندوستان کی تاریخ حکومت میں زندگی جاوداں حاصل کرے گی۔

(۵) صوبے میں بے کاری اور بے روزگاری کے انسداد کی اشد ضرورت ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے کاری کے زیر اثر فاقہ کشی کی اٹل مصیبت خودکشی کی وارداتوں کو عام بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ عام بیکاری کے سبب سکہ سازی، رہزنی، جعل کاری کے جرائم کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ بربنا بریں حکومت کا یہ فرض ہے کہ لوگوں کے لئے کام اور کام نہ میسر ہو تو قوت لایموت کا انصرام کرے۔ حکومت پنجاب کو پہلی فرصت میں اس وحشت ناک بے کاری کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہو گی۔

(۶) اہل دیہات صحت و زندگی کے مبادیات سے بھی بے خبر ہیں۔ صحت بخش آب و ہوا کے باوجود ان میں اموات کا اوسط روبہ ترقی ہے۔ ضرورت ہے کہ امکان بھر دیہاتی شفاخانوں کا جال صوبے کی ساری آبادی میں پھیلا دیا جائے۔

(۷) زراعتی پیداوار کے متعلق میں زرعی لگان، مالکانہ اور آبیانے کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اراضی پر لگان وغیرہ لگانے کی بجائے پیداوار کی مقدار پر لگان لگانے کا سسٹم رائج کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

(۸) ابتدائی تعلیم اگرچہ اتحاد پارٹی کی مساعی سے روبہ ترقی ہے لیکن تعلیم حتی الامکان لازمی اور مفت ہونی چاہیئے۔ اور تعلیم کی نوعیت ادبی کی بجائے زرعی اور صنعتی ہونی ضروری ہے۔ ادبی تعلیم سے طالبعلم دھوبی کے کتے کی طرح گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ بے کاری کا انسداد بھی اسی طرح ہو سکتا ہے کہ صنعت و حرفت کے کارخانے جابجا قائم کئے جائیں۔ ہمیں بابوؤں اور کلرکوں کی ضرورت نہیں بلکہ پڑھے لکھے اور جدید زراعتی طریقوں سے واقف کسانوں اور تعلیم یافتہ پیشہ وروں کی ضرورت ہے۔

(۹) پنجاب میں تعلیم کی کمی نہیں لیکن تربیت کا فقدان افسوسناک حد تک پہنچ گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تعلیم بے تربیت سے جہالت ہزار درجہ بہتر ہے کہ کیرکٹر تو کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے۔

موجودہ طریقۂ تعلیم تو نوجوانوں کے اخلاق و عادات کو تباہ کرنے کا موجب بن رہا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں غنڈاپن خوفناک حد تک بڑھ گیا ہے۔

اس امر خاص میں محکمہ تعلیم کو جمہوری قوانین کو بروئے کار لانے کی بجائے ڈکٹیٹر بننے کی ضرورت ہے۔

ہمارے نئے وزیر تعلیم

جدید کابینۂ حکومت میں آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم مقرر ہوئے ہیں۔ ہم اس تقرر پر شاہکار اور اس کے قارئین کی جانب سے جن میں زیادہ تعداد تعلیمی کارکنوں کی ہے۔ میاں صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے نئے وزیر تعلیم کا عہد وزارت ہر حیثیت سے کامیاب ہوگا۔

آنریبل وزیر سے تعلیمی حلقوں کے حسب ذیل مطالبات، ضروریات اور مشکلات التفات طلب ہیں۔

(۱) ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے استادوں کی قلت مشاہرہ و کثرت کار کے سبب بہت زبوں حالت ہے۔

ان کے حقوق خدمت کی حمایت و حفاظت کا کوئی ذمہ دار نہیں بنتا۔ ان کو اچھی غذا میسر نہیں، وہ عیالداری کی ختم نہ ہونے والی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اپنے بچوں کی پرورش کے تفکرات کے سبب زندگی کے اطمینان سے محروم ہیں۔

آنریبل وزیر کو اس قابلِ رحم جماعت کے حالِ زار پر توجہ فرما کر ٹائم اسکیل سسٹم جاری فرمانا چاہیئے تاکہ ہر استاد کو اپنے وقت پر حسب استحقاق ترقی مل جایا کرے۔ اُنہیں گریڈ کے لئے افسران تعلیم کے آستانوں پر جبہ سائی نہ کرنی پڑے۔ صورت حال یہ ہے کہ اکثر اساتذہ ساری تعلیمی زندگی پہلے گریڈ ہی پر ختم کر دیتے ہیں کوئی اُن بیکسوں کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ پریشان خاطری، ناداری، فلاکت اور محرومیٔ استحقاق کے پامال استاد اپنے شاگردوں میں بلند نظری اور رفعت حوصلہ کیوں کر پیدا کر سکتے ہیں؟

(۲) اردو زبان اس صوبے کی تعلیمی زبان ہے اور یہی ملک کی لینگوا فرنیکا بھی ہے۔ لیکن اردو کا مستقبل اب صرف پنجاب سے وابستہ ہوگیا ہے کیونکہ دوسرے صوبوں میں اکثریت کا ظالمانہ اقتدار اس ہمہ رس وہمہ گیر زبان کو مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔

پنجاب میں بھی اگر اردو کو مجال نشوونما نہ ملی تو پھر اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

پنجاب یونیورسٹی (جو اس صوبے کا مرکزی تعلیمی ادارہ ہے) اردو کے حقوق کو ابتدائے قیام سے نقصان پہنچا رہی ہے۔

اِدھر محکمۂ تعلیمات میں اس کی اشاعت کچھ نہ کچھ ہو رہی ہے مگر اس کے حقوق کی جانب سے سب کی آنکھیں بند ہیں۔ آنریبل وزیر تعلیم سے یہ توقع بیجا نہیں کہ پنجابی اور ہندی کی حق تلفی کئے بغیر پنجاب یونیورسٹی اور محکمۂ تعلیمات کو اردو زبان کی حفاظت اور حق رسی پر مجبور کریں گے۔

(۳) محکمہ تعلیم اور پنجاب کا ایجوکیشنل ایڈوائزری بورڈ جسے پنجاب کی چند بڑی بڑی پبلشنگ فرموں کا تسلط نرغے میں لئے ہوئے ہے۔ وزیر تعلیم کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے۔

حالت یہ ہے کہ چند سرمایہ دار پبلشر سالہا سال سے سارے محکمۂ تعلیم کے شرائین میں خون زندگی بن کر پھر رہے ہیں۔

معمولی قابلیت کے لوگوں سے سستی اُجرتوں پر اغلاط و اسقام سے معمور درسی کتابیں تیار کرا کے اپنے ہمہ رس رسوخ کے بل پر منظور کرانے والے چند اجارہ دار پبلشروں نے قابل سے قابل مصنفین اور دیانتدار کارکن مگر بے رسوخ پبلشروں کے لئے یہ راستہ بند کر رکھا ہے۔

آنریبل وزیر تعلیم کا عہد وزارت بہت ہی مبارک ہوگا، اگر سرمایہ دار پبلشروں کی دائمی اجارہ داری سے محکمۂ تعلیم اور ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کو نجات دلا سکیں گے۔ تھرڈ ریٹ کی بے مایہ درسی کتابوں کی ترویج و اشاعت پنجاب کی تعلیمی عظمت و رفعت کے حق میں ہلاکت آفریں بن رہی ہے۔ صوبے کا تعلیمی مستقبل اس مردہ اور افسردہ لٹریچر کی اشاعت و ترویج سے تاریک ہو رہا ہے۔

(۴) ہماری مشرقی زبانیں محکمۂ تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی میں حفاظت حمایت اور حق رسی سے محروم ہو رہی ہیں۔

محکمۂ تعلیم پنجاب میں مولوی فاضل، منشی فاضل، شاستری پاس اورینٹل ٹیچروں کو ایس وی اور ڈرل ماسٹروں کے ساتھ ضمنی کر دیا گیا ہے۔ ان سب کا گریڈ ایک ہے ابتدائی تنخواہ اور تدریجی ترقی کی شرح بھی ایک ہی ہے۔ اس سے زیادہ ناشناسی، بے شناسی اور بے امتیازی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ایک ایس وی ٹیچر فارسی بلکہ صحیح معنی میں ہائی جماعتوں کو اردو بھی نہیں پڑھا سکتا۔ اس کے لئے موزوں مقام کار مڈل اسکول ہیں۔

مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل، شاستری، گیانی اور ہندی آنرز پاس کرنے والے اساتذہ ہی نویں اور دسویں جماعتوں کو مشرقی اور ملکی زبانوں کی تعلیم دینے کے مجاز ہو سکتے ہیں۔ ایس وی ٹیچر جائز طور پر اُن کے قائم مقام کسی طرح نہیں بنائے جا سکتے۔ مگر ہو یہی رہا ہے کہ نویں دسویں جماعتوں کی فارسی اور اردو کی تعلیم منشی فاضل اور ادیب فاضل کی بجائے ایس وی ٹیچروں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

آنریبل وزیر تعلیم کو اس بے امتیازی کو دُور کرنے کی جانب توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔

(۵) پنجاب کے دور دراز اضلاع میں بہت سے قابل کارکن، مستحق اور سینئر اساتذہ اور افسرانِ معائنہ "از دیدہ دُور از دل دُور" کا مصداق بن کر ترقیوں کے حق سے محروم رہنے کے سبب احساس تلخ کامی میں بیدلانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ محترم وزیر تعلیم کو نگاہ دوربین سے کام لے کر ان "دُورانِ باخبر" کی حق رسی کرنی چاہیئے!

ہمیں اپنے جدید وزیر تعلیم کی بیدار مغزی، حق رسانی اور قدرشناسی سے توقع ہے کہ وہ مذکورہ بالا عرضداشت کو پیشِ نظر رکھ کر ان حالات سے ذاتی واقفیت بہم پہنچائیں گے۔ اور جرأت و پامردی سے ان بدعنوانیوں، بے ضابطگیوں اور بے امتیازیوں کو تعلیمات کے دائرے میں زندہ رہنے اور پیدا ہونے کی اجازت نہ دیں گے۔

نواب احمد یار خاں دولتانہ

جدید کابینۂ وزارت میں خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ کا نام

نہ دیکھ کر اہلِ نظر کو متاسفانہ حیرت ہوئی ہے۔

نواب صاحب کے مسلسل ایثار، مسلسل جاں فشانی اور بے شمار زرپاشی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اتحاد پارٹی اپنے افراد کے باہمی اختلافِ طبائع کے باوجود آج تک متحد، منظم اور چٹان کی طرح اپنے مجوزہ اصول پر کاربند رہ سکی۔ اکثر مواقع ایسے درپیش ہوئے کہ نواب صاحب کی ذات ضبط کی نگراں نہ ہوتی تو پارٹی افتراق و تشتت کی نذر ہو جاتی۔ نواب دولتانہ نے تمام وقت، سرمائے، اور انرجی کو بے دریغ پارٹی کی تنظیم پر نثار کر دیا اور پھر اس قابلِ قدر ایثار کے ساتھ کہ کبھی نمایاں ہونے کی سعی نہیں کی یہ ہی نہیں بلکہ اپنی سربراہی کے جائز حقوق کو بھی پسِ پشت ڈالتے رہے۔

آپ نے پارٹی کے نصب العین، اصول اور مقاصد کا پروپیگنڈا ایسے منظم موثر، متین اور حاوی طریقے سے کیا کہ صوبے کے رائے دہندوں پر مخالف پارٹیوں کے غوغائے عام کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اور سارا پنجاب پارٹی کا حامی بن گیا۔

ایسے ایثار پیشہ، مخلص اور دیوانہ کار رہنما کا نام کابینۂ وزارت میں نہ دیکھ کر ہر سوجھ بوجھ رکھنے والے دماغ کو حیرت بھی ہے اور افسوس بھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ پارٹی کو تقسیم و تفریق سے بچانے کی خاطر نواب صاحب موصوف نے اپنے حقوقِ سرفرازی کو پھر نظرانداز کیا ہے یہ سچ ہے کہ وہ اپنے حقِ وزارت سے دست کش ہونے پر مجبور ہوئے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایثار و قربانی کی ایک قابلِ صد فخر و مباہات مثال قائم کر کے انہوں نے پنجاب کی تاریخ سیاسیات میں غیرفانی عزت حاصل کر لی ہے۔

انسپکٹران مدارس کے خلاف غوغائے بے ہنگام

خدا جانے اہلِ ملک کی یہ ذلیل ذہنیت کب تک فضائے امن کو مکدر بناتی رہے گی کہ وہ کسی اچھے سے اچھے سرکاری کارکن کو صرف اس وجہ سے کہ وہ مذہبی عقاید میں اُن کا ہمنوا نہیں ناقابلِ برداشت تصور کرنے لگتے ہیں آئے دن اخبارات کے کالم کے کالم اسی قسم کی بہتان طرازیوں سے سیاہ نظر آتے ہیں کہ فلاں افسر ہندوؤں کے حقوق پامال کر رہا ہے اور فلاں سرکاری عہدیدار مفادِ ملت کو تباہ کئے ڈالتا ہے۔

تعلیمی لائن میں تو یہ مرض وبائی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بوڑھی جگت سنگھ ایک مرنجاں مرنج طبیعت کے افسر تعلیم ہیں لیکن اُن کا سکھ ہونا اُن کو ہدف طعن و تشنیع بنائے ہوئے ہے۔ حالانکہ وہ بہت ہی غیر متعصب انسان ہیں۔ لیکن جس مدرس کو وہ ضبط قائم رکھنے کے سرزنش کر دیں اگر وہ سوء اتفاق سے ہندو یا مسلمان ہو تو اخبارات میں اُن کے تعصب کی فرضی داستانیں شائع کر کے ایک طوفان برپا کر دیا جاتا ہے

اب کچھ دنوں سے مولوی سیّد بشیر محمدؐ ترمذی افسر تعلیم منٹگمری کے خلاف ہندو پریس میں یورش ہو رہی ہے۔ سیّد صاحب کو متعصب کہنا حقیقتہً ظالمانہ بہتان آرائی ہے۔ اُن کے ہزاروں واقفانِ حال میں اپنے ضمیر سے جنگ کئے بغیر انہیں متعصب کوئی نہ کہہ سکے گا۔

اُن کے مفروضہ تعصب کے خلاف ہندو پریس کا پروپیگنڈا دیکھ کر منٹگمری ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیمی کمیٹی کے ذمہ دار چیئرمین کو جو سکھ قوم کے ایک معزز ممبر ہیں تردیدی اعلان کرنا پڑا۔

اس اعلان کو پڑھ کر ہر منصف مزاج آدمی بہتان تراشنے والوں کی کمینہ ذہنیت اور ہندو پریس کی غیر ذمہ داری کا اندازہ کر سکے گا۔ سردار صاحب کی حق پژوہی قابلِ صد ہزار تحسین ہے کہ انہوں نے آجکل کی ذلیل روش سے الگ ہو کر سیّد صاحب کے خلاف جو طوفان اٹھایا جا رہا تھا اس کی پردہ دری کی۔ سردار صاحب کا یہ بہادرانہ اقدام ہر ذمہ دار ہندو، مسلم اور سکھ کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

کسی فرقے کے شرپسند لوگ جب اپنے مذہبی تعصب کی انگیخت پر کسی دیانتدار افسر کے خلاف فرضی داستانیں تراش کر ہنگامہ برپا کرنے لگیں تو ہر ذمہ دار انسان کا فرض ہے کہ سردار صاحب کی پیروی کرتے ہوئے اس کی حمایت و حفاظت کرے۔

انسپکٹر مدارس اپنے حلقے کے مدارس، مدرسین اور تعلیم کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ سب کو خوش نہیں کر سکتا۔ اُسے اپنے تعلیمی ماحول پر ضبط قائم رکھنے کیلئے بعض اوقات بعض مدرسین کو الگ بھی کرنا پڑتا ہے۔ کسی کی ترقی بند کرنی پڑ جاتی ہے۔ کسی کا تنزل اُس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کسی کا تبادلہ مقامی مصلحت کا تقاضا بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ناخوشگوار کام ہے لیکن ایک فرض کے طور پر ان کا انجام دینا ضروری ہے۔ پھر اگر اس قسم کے فرائض کی انجام دہی پر اُسے کوچہ و بازار میں رسوا کیا جانے لگے تو وہ اپنے حلقے کے تعلیمی انتظام کو کیوں کر چلا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جو افسران تعصب کی لعنت میں واقعی طور پر مبتلا ہیں وہ ہرگز کبھی ہمدردی کے مستحق نہیں۔ اس لئے کہ کسی کو مذہبی اختلاف کی بنا پر سزا دینا انتہا درجے کی درندگی ہے، ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ اگر کسی افسر تعلیم کے تعصب کا ثبوت

مل جائے تو یقیناً محکمہ کے پلاسک وہپش اُسے بتا دینا چاہیئے کہ سینکڑوں بندگان خدا تمہارے رحم پر نہیں چھوڑے جا سکتے۔

لیکن ہر کس وناکس کی غیر ذمہ دارانہ شکایت پر کسی افسر کے خلاف تعصب کا فتوی لگا کر اُسے اخبارات میں بدنام کرنا بھی حد درجہ [illegible] ہے۔

یوپی کی صنعتی وزراعتی نمائش

تاجور

یوپی کی حکومت نے وسیع پیمانے پر ایک صنعتی وزراعتی نمائش منعقد کی تھی۔ یہ نمائش ۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو انعقاد پذیر ہوئی تھی اور ۴ر فروری ۱۹۳۷ء کو بکامیابی اختتام کو پہنچی۔

اس نمائش کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ لکھنؤ کی ۱۳۰ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی تھی اور مفصلہ ذیل شعبوں پر مشتمل تھی۔

(۱) پارچہ بافی	(۵) شکر سازی	(۹) فنون لطیفہ
(۲) تعلیم	(۶) کیمیا سازی	(۱۰) فوٹوگرافی
(۳) برقیات	(۷) آلات (انجینرنگ)	(۱۱) تفریحات
(۴) زراعت	(۸) دستکاری	

اس نمائش میں متعدد ریاستوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ چنانچہ حیدرآباد میسور، گوالیار، اندور وغیرہ کی مصنوعات اور زراعت سے تعلق رکھنے والی اشیاء بھی موجود تھیں۔ غرض یہ نمائش برطانوی ہند اور ریاستوں کی لبست دہفت سالہ صنعتی وزراعتی ترقی کی آئینہ دار تھی۔

پارچہ بافی کے شعبے نے حکومت صوبجات متحدہ کی تحریکِ اصلاح دیہات سے متعلق دستی کرگھے، چرخے، نیز بنائی اور کتائی کے دوسرے آلات کی نمائش کی تھی۔ پارچہ بافی سے متعلق مشینوں کا مقابلہ بھی ہوا تھا جس میں الموڑہ اور بہار نے انعام حاصل کئے۔ ریشم اور انڈی کے کیڑوں کی پرورش اور ان سے ریشم حاصل کرنے کے طریقے بھی دکھائی گئے تھے۔

شعبۂ زراعت میں شکر سازی، روغن سازی، اور دودھ دینے والے جانوروں کی پرورش کے طریقے پیش کئے گئے تھے۔ کھیت کی جتائی، تخم ریزی، کھیتی اور چارا کی کٹائی وغیرہ کے آلات کی نمائش کی گئی تھی، قدیم وجدید طریقوں سے کاشت کر کے واضح کیا گیا تھا کہ جدید طریقے سے کھیتی کی جائے تو پیداوار میں کسقدر اضافہ ہو سکتا ہے، فصلوں کو ٹڈیوں اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے طریقے بھی بتائے گئے تھے۔

انجینئری کے شعبے میں ہندوستانی سامان سے ہندوستانی انجینیروں کی ساختہ مشینیں دکھائی گئی تھیں۔ یہ مشینیں یا تو ہندوستانیوں کی ایجاد تھیں، یا ولائتی مشینوں کی نقل، یا ہندوستان کی پرانی مشینوں کی تجدید، ان میں سلائی کی مشین خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو "اوشا" کے نام سے پیش کی گئی تھی۔

کیمیکل کے سلسلے میں آیورویدک، یونانی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی دوائیں تھیں جو بنگال کیمیکل ورکس، ہندوستانی دواخانہ دہلی، انڈین میڈیکل سپلائی کمپنی وغیرہ کی پیش کردہ تھیں، ان چیزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا ہندوستان نے اس شعبے میں کہاں تک ترقی کی ہے۔

شعبۂ تعلیمات میں تاریخی اور جغرافیائی چیزیں پیش کی گئی تھیں اور بڑے بڑے چارٹوں اور تصویروں کے ذریعہ تعلیمی رفتار دکھائی گئی تھی یوپی کے ضلع اسکول کے طلبہ کی ورزشوں اور کسرتوں کی نمائش بھی کی گئی تھی۔ اگر بچوں کے ایسے ٹورنامنٹ ہر سال ہوا کریں تو ان میں ورزش کا شوق ترقی کر سکتا ہے جس سے ان کی صحت میں مدد مل سکتی ہے۔

نمائش کا شعبۂ فنون لطیفہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس میں مصوری اور فوٹوگرافی کے بہترین نمونے ہیں۔ عہد حاضرہ کے ۱۸۷ مصوروں نے ۵۰۱ تصویریں بھیجی تھیں۔ ان تصویروں میں ۸۴ تصویریں مغربی مذاق کی تھیں باقی مشرقی مذاق کی آئینہ دار تھیں۔ ان تصویروں کے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ ہندوستانی مصور مغربی مذاق کے ماتحت فن تصویر کی تحصیل کرنے کے باوجود اپنے مشرقی طرز کو عزیز رکھتے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں اس کی بقا وترقی کا جذبہ کارفرما ہے۔ کچھ تصویریں یورپ سے بھی آئی تھیں۔ ان کے دیکھنے سے مغربی فوٹوگرافی کا کمال ظاہر ہوتا تھا۔ جو مصوری کی حد تک پہنچ رہی ہے اونند اٹھاکر (بنگال ٹیگور اسکول) کی تصویریں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر تھیں۔

ہندوستانی اکاڈیمی کا سالانہ اجلاس

ہندوستانی اکاڈیمی کا پانچواں سالانہ اجلاس اس سال بمقام لکھنؤ نمائش کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا۔ سابق وزیر تعلیم رائے راجیشور بلی نے اجلاس کی صدارت کی تھی۔ اور سر سپرو نے اس کا افتتاح کیا تھا۔

سر سپرو نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس مسئلہ پر روشنی [illegible]لی کہ کسی ملک کی تعلیم غیر ملکی زبان میں نہیں ہونی چاہیئے۔ ہندی میں سنسکرت کی کثرت اور اردو میں عربی فارسی کی بھرمار کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ اگر اسی صورت حال کو جاری رہنے دیا گیا تو ۵۰ سال کے عرصے میں ہندو مسلمان نوجوان

کے بغیر آپس میں گفتگو بھی نہ کر سکیں گے۔

صدرِ جلسہ نے اپنی تقریر میں سر سپرو کے خیالات کی تائید کی اور مشورہ دیا کہ ہندی اور اردو کا ایک مشترکہ لغت تیار ہونا چاہیئے۔

اس اجلاس میں اردو ہندی میں ساتھ ساتھ اور علیحدہ علیحدہ متعدد مضامین پڑھے گئے۔ اکثر مضامین میں زور دیا گیا تھا کہ دونوں زبانیں باہم ملا دی جائیں۔ ایک مضمون اس موضوع پر تھا کہ دونوں زبانیں ایک کر دی جائیں اور رسم الخط رومن اختیار کیا جائے۔"

اس پر بحث و گفتگو کا دروازہ کھل گیا، بعض اصحاب نے مذاق میں ٹال دینا چاہا لیکن پرنسپل ہیرا لال کی تقریر نے بحث میں سنجیدگی پیدا کر دی۔ انہوں نے کہا "اب وقت آگیا ہے کہ ہم رسم الخط کے مسئلے پر بھی غور کریں۔" رائے بہادر پنڈت سکھدیو بہاری مصر نے بھی تقریر کی اور کہا کہ جب اقتضائے حال یہی ہے تو ہمیں طوعاً و کرہاً رومن کو قبول کر لینا چاہیئے۔

سر سپرو کا اندیشہ

سر سپرو کا یہ اندیشہ کہ اگر ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال اسی طرح ترقی پذیر رہا تو ۲۵ برس میں ہندو مسلمان کو ترجمان کے بغیر گفتگو کرنا ناممکن ہو جائے گا، شاید بعض حضرات کو مبالغہ آمیز معلوم ہو، لیکن درحقیقت انہوں نے بالکل درست فرمایا ہے۔ ہندی کا مشہور ماہنامہ "مادھوری" لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے، جو اردو کا مرکز ہے۔ اور "مادھوری" کے مالک اور مدیر کی زبان یقیناً اردو ہوگی، لیکن اسی رسالہ میں اسی اکاڈیمی کے اجلاس پر اڈیٹر نے جو شذرہ لکھا ہے اس کی زبان ملاحظہ فرمائیے:۔

"پرورتشنی کے سمبندھ میں ہی ہندوستانی اکاڈیمی کے پنچم ساہتیہ سمیلن کا ادھیویشن ہوا۔ اس اوسر پر ادھیکھ پد سے شری یت راے راجیشوربلی کا جو بھاشن ہوا تھا وہ وچارنیہ ہے۔ انہوں نے اس کٹھن کا پورنٹرروپ سے پرتیواد کیا کہ اکاڈیمی کا ادیش ایک نئی بھاشا نکالنے کا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہندی اردو کے سردوتم ہیتوں کو ہانی پہنچنے کی سمبھاونا ہے۔"

چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارا وچار ہے کہ اس پرکار کے پرتی دوندی وچار رکھنا اپنی دلویک مدھی کو بھلا دینا ہے۔ اج سے اج وچاروں کو پرکٹ کیا جائے اور بھاشا سوشٹھو اور لالستید میں کمی نہ آنے پائے۔ اس کے لئے اور لیشکتا ہوگی پر بھاشک شبدوں کی۔"

بتائیے قارئین شاہکار میں فیصدی کتنے ایسے اصحاب ہوں گے۔ جو "مادھوری" کی مذکورہ بالا سطروں کا صحیح مطلب سمجھ سکیں گے؟ یہاں تک تو نوبت پہنچ چکی ہے اور ہندی کے حامیوں میں روز بروز یہ جذبہ ترقی کرتا جا رہا ہے کہ عربی و فارسی کے جتنے الفاظ ہندی زبان کا جزو بن گئے ہیں سب کو خارج کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک بڑی تعداد نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کے وضع کرنے میں مصروف ہے اور ان کا استعمال سرعت سے ترقی کر رہا ہے۔

اردو کے مرکز میں ہندی کی ترقی

نمائش کے سلسلے میں باری باری سے دو روز اردو اور ہندی کا مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ ہندی مشاعرہ (کوی سمیلن) کے متعلق رسالہ مادھوری لکھتا ہے:۔

"کوی سمیلن (ہندی مشاعرہ) خاص طور پر کامیاب رہا اور اس کے لئے کارکن مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کامیابی کا معیار اس طرح اور زیادہ ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ صدیوں سے اردو کا مرکز رہا ہے اور سمیلن (ہندی مشاعرہ) کی تاریخ سے پہلے آل انڈیا مشاعرہ کا اجلاس ختم ہوا تھا۔ دونوں روز حاضری امید افزا تھی۔ اس سمیلن سے کئی قابلِ غور باتیں واضح صورت سے سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ ہندی کے متعلق لوگوں کا شوق ترقی کر رہا ہے، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہندی کی تعلیم کے باعث طلبہ ہندی کے اہلِ قلم اور شعراء کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے اور سننے کے خواہشمند ہیں۔" (ترجمہ)

"مادھوری" کے لکھنے کا مطلب ظاہر ہے، جو لوگ ہندی سے بے بہرہ تھے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں جن کی زبان اردو تھی وہ اب ہندی کی جانب مائل ہو چکے ہیں اور ہندی کے ساتھ ان کی دلچسپی ترقی پذیر ہے، کیا اردو خواں طبقے کے لئے یہ بات قابلِ لحاظ نہیں ہے؂

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

(ادارہ)

علی اکبرؑ

قدرت کا ہیں بے مثل کرشمہ علی اکبرؑ　　جنّ و ملک و حور میں یکتا علی اکبرؑ
رکھتے ہیں، عجب چاند سا چہرہ علی اکبرؑ　　ہمشکل محمدؐ ہیں سراپا علی اکبرؑ

اے صلِّ علیٰ آپ گزرتے ہیں جہاں سے
پڑھتے ہیں درود اہلِ نظر، دل کی زباں سے

وہ سر کہ جسے زانوئے شبیرؑ ہی بھائے　　پُر نور جبیں، ماہِ دو ہفتہ کو گھٹائے
اُن ابروؤں نے دو مہِ نو بنکے دکھائے　　دو آنکھوں میں دو ساغرِ کوثر نظر آئے

جادو نظری کے لئے سامان بڑے تھے
بدمست ہرن پلکوں کے جنگل میں کھڑے تھے

بل کھائے ہوئے گیسوؤں کی آہ وہ نکہت　　سونگھے جو پری اِن کو تو سنبھلے نہ طبیعت
ژولیدہ لٹوں میں وہ عیاں چاند سی صورت　　مہتاب نکل آیا ہو جیسے شبِ ظلمت

یا برق نے جلوے یہ سرِ طور دئے ہیں
یا موسیِ عمراں ورقِ مہر لئے ہیں

وہ سبزے کا آغاز، وہ لعلِ لبِ رنگیں　　یاقوت کو جس طرح زمرّد سے ہو تزئیں
یا لالے پہ چھائے ہوئے برگِ گلِ نسریں　　یا خضر نے غنچہ کوئی سونگھا پئے تسکیں

پیہم، جو تبسم کے اشارے نکل آئے
غل تھا وہ شفق پھول کے تارے نکل آئے

آغا شاعر قزلباش دہلوی

مصنف کا درجہ دیتی ہے۔

(۲) حیاتِ جاوید:۔ حالی کی قابلِ قدر تصنیف "حیات جاوید" ہے۔ اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہے۔ سرسید کی زندگی کے ہر قابلِ ذکر پہلو کا اس میں بیان ہے۔ سرسید کی ملکی، ملی، مذہبی، اصلاحی، علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی خدمات مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ درحقیقت سرسید بڑے خوش نصیب تھے کہ اُن کی سیرۃ حالی جیسے بلند مرتبہ سیرۃ نگار نے لکھی اور اپنی سحر نگاری سے سرسید کو زندہ جاوید بنا دیا۔

(۳) یادگارِ غالب:۔ اپنے استاد مرزا غالب سے حالی کو محبت نہیں عشق تھا۔ حالی نے غالب کی وفات پر جو دردناک مرثیہ لکھا ہے اُس کے ہر شعر سے حالی کا عشق ٹپکا پڑتا ہے۔ یادگارِ غالب میں خواجہ حالی نے مرزا غالب کے حالات، ان کے لطائف و ظرائف، ان کی نظم و نثر کے خصوصیات، اُن کے درجۂ شاعری و ادب اور اُن کی فارسی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

ان کے علاوہ تریاق مسموم، طبقات الارض، مجالس النساء، اور کچھ علمی، تنقیدی اور مذہبی مضامین بھی حالی کی تصنیف و تالیف میں شامل ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا تین کتابیں حالی کے تین تصنیفی شاہکار ہیں۔ جن سے خواجہ حالی کی تصنیفی و تنقیدی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حالی کی شاعری:۔

خواجہ حالی کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قدیم شاعری:۔ اس میں قدیم رنگ کی غزلیات، رباعیات کچھ قصیدے وغیرہ شامل ہیں۔

جدید شاعری:۔ اس میں جدید طرز کی نیچرل، قومی، اخلاقی، اصلاحی مسلسل نظمیں اور قطعات ہیں۔

دیوانِ حالی:۔ (مرتبہ ۱۸۹۳ء) قدیم غزلیات اور جدید طرز کی نظموں کا پہلا حصہ ہے جو حالی نے اپنی زندگی ہی میں ترتیب دیا تھا۔

مسدس حالی:۔ سرسید کے ایماء پر مدوجزر اسلام کے نام سے یہ طویل و لبسیط نظم لکھی گئی۔ یہ نظم مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قوم مسلم کو اس کے شاندار ماضی، بدنما حال اور تاریک مستقبل سے روشناس کیا ہے۔ مسلمان کیا تھے، کیا بن گئے اور اگر اسی روش پر قائم رہے تو ان کا انجام کیا ہوگا۔ یہ موضوع ہے اس یادگار زمانہ نظم کا۔

اس نظم کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گزر گئی۔ مگر اس انداز اعجاز سے لکھی گئی تھی کہ آج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی جب کہ اردو شاعری خاک سے اُٹھ کر افلاک سے چشمک زنی کر رہی ہے۔ اس نظم کے پائے کی کوئی اردو نظم نہیں لکھی گئی۔

مسدس حالی، جوش، اصلیت، سادگی، اور اعلیٰ شاعرانہ مصوری کے اعتبار سے اس قدر موثر ہو گئی ہے کہ آج بھی مسلمانوں کی قومی مجالس میں جب پڑھی جاتی ہے تو اہلِ جلسہ اشکبار ہو جاتے ہیں۔ حالی نے اس نظم کی مطبوعہ کاپی جب سرسید کے پاس علی گڑھ بھیجی تو سرسید نے اسے پڑھ کر کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے مولانا حالی کو لکھا کہ

"خدا قیامت میں جب مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے دنیا میں کون سا نیک کام کیا تو کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔"

سرسید جیسے بلند فطرت انشاپرداز اور رفیع القدر نقاد کی یہ قابلِ ناز رائے حالی کی شاعرانہ عظمت کی شاہد ناطق کہی جا سکتی ہے۔

مسدس حالی میں اگرچہ مسلمانوں کے زرین ماضی، بدترین حال اور وحشت انگیز مستقبل کی ساحرانہ مصوری کی گئی ہے اور اس کی تحریر کا مقصد امت مسلمہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا تھا۔ لیکن ہندوستان کی ہر قوم چونکہ مسلمانوں کی طرح اپنے ماضی سے بے خبر، حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے متذبذب حیثیت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس لئے ہندوستان کی تمام اقوام نے اپنی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ مسدس حالی کے آئینے میں دیکھ کر مسدس حالی کو اپنی ضرورت قومی سمجھا اور اس ملک کی ہر ہر قوم نے اپنی اپنی زبان میں اس کا منظوم ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔

اس کے علاوہ غیر ملکی مستشرقین نے انگریزی اور فرانسیسی میں بھی اس کا ترجمہ کر لیا۔ جاپانی زبان میں بھی مسدس حالی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آنریبل سر شہاب الدین صدر مجلس قانون ساز پنجاب نے پنجابی زبان میں اس مسدس کو منظوم سانچے میں ڈھالا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "مدوجزر اسلام" حالی کا غیر فانی شاہکار ہے اور اسی کی بدولت حالی خواجہ الطاف حسین سے حالی بنے بمسدس

حالی ۱۸۷۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

نظم حالی:- دیوان حالی کی اشاعت کے بعد خواجہ حالی نے جو نظمیں کہیں، ان کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین بی۔اے نے ان کو مرتب کر کے نظم حالی کے نام سے شائع کیا۔ ان نظموں کا اندازِ نگارش دیوان حالی کی جدید طرز کی نظموں ہی کا سا ہے۔

حالی کی شاعرانہ خصوصیت:- (۱) حالی کی قدیم شاعری جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ جذبات کی پاکیزگی، الفاظ کی موزونیت، اندازِ بیان کی طرفگی اور ندرت، تغزل کی رنگینی، خیال کی نفاست و متانت، قواعد فن کی رعایت، مشق تحریر کی پختگی میں معاصرانہ تفوق اور استادانہ امتیاز کی حامل ہے۔

اس کے اشعار مطالب کی پیچیدگی، خیالات کی ژولیدگی، زبان کی تعقید اور گنجلک، بیان کے اغلاق و اشکال، ابتذال، عریانی، ہوس آرائی اور چھچھورپن سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔

(۲) حالی کی جدید شاعری چونکہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں رکھتی اس لئے رنگِ تغزل قدرۃً پھیکا ہے اور بعض نظمیں تو جواب مضمون کی طرح ذوقِ سماعت کے لئے بار ہوگئی ہیں۔ واعظانہ ترغیب و ترہیب، ناصحانہ اندازِ تخاطب، پیشوایانہ اوامر ونواہی نے جدید طرز کی اکثر نظموں کو تعلیمی اور نصابی کتب میں درج کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ البتہ مسدس "مدوجزرِ اسلام" حالی کی ایک شاعرانہ کرامت ہے۔ حد درجہ مئوثر، دل گیر اور پُر جوش ہے اور جدید رنگ کی کئی مثنویاں بھی داخلی و خارجی عناصر کے اعتبار سے معیاری درجے کی ہیں۔

حالی کی نثر:- قانون کی زبان سب سے زیادہ احتیاط کی طلب گار ہوتی ہے۔ کیوں کہ قانون سے لوگوں کی موت و زندگی اور حقوق باہمی کا فیصلہ متعلق ہوتا ہے اس لئے قانون کی زبان فصاحت و بلاغت اور شاعرانہ لطافتوں کی متحمل نہیں ہوتی۔

قانون کے بعد تنقید اور پھر تاریخ کی زبان بڑی احتیاط چاہتی ہے۔ کسی کے کمال فن اور شخصیت پر تنقیدی نظر ڈالنا بڑی ذمہ داری اور احتیاط کا کام ہے۔ بے جا ستایش اور ناروا مذمت، تنقید اور اور تاریخ کو ساقط الاعتبار بنا دیتی ہے۔

خواجہ حالی کی تنقید نگاری اور تاریخ نویسی کی زبان بہت ہی محتاط ہے۔ وہ کسی کے محاسن و نقائص بیان کرتے ہوئے اس طرح دامن بچا کر گذر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ نقاد ان محاسن و معائب سے خود بھی متاثر ہوا ہے یا نہیں؟ یہیں سے حالی، آزاد و شبلی سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ آزاد کسی کے نقائص بھی اس لہجے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ وہ تعریف کر رہے ہیں یا تعریف کے پردے میں تنقیص۔ بخلاف علامہ شبلی کے کہ وہ اظہار محاسن و شمار معائب میں تنقید کے حدود کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ کسی کے محاسن بیان کرتے ہیں تو اپنے تاثر اور شمار معائب میں اپنی بیزاری کو چھپا نہیں سکتے۔ حالی کا اندازِ تنقید و بیانِ تاریخ ایک محتاط نقاد اور ایک مستند مورخ کی طرز کا ہوتا ہے۔ اسی طرح سیرت نگار آزاد بھی ہیں اور شبلی بھی لیکن اردو ادب کی سیرت نگاری صرف حالی کا حصہ تھی۔ وہ تنقید نگاری میں جس درجے کی محتاط زبان استعمال کرتے ہیں۔ سیرت نویسی میں بھی اُسی درجے کی احتیاط اور اس کے ساتھ اندازِ نگارش میں دلچسپی بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

اگرچہ حالی کا اندازِ بیان نہ آزاد کی طرح سہل الممتنع نہ شبلی کی طرح بلند و پُر زور کہ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔ مگر تنقید و تاریخ کو جس محتاط زبان و معتدل اندازِ بیان کی ضرورت ہے، وہ زبان و بیان آزاد کو میسر نہ شبلی کو نصیب۔ یہ امتیاز خاص صرف خواجہ حالی کو حاصل ہے۔

حالی کی "حیات سعدی"، اور "یادگار غالب" کے تنقیدی حصے کا مقابلہ آزاد کی "آبِ حیات" اور شبلی کی "شعر العجم" کے تنقیدی حصص سے کیا جائے تو مندرجہ بالا موازنے کی صداقت روشن ہو جاتی ہے۔

حالی کی نثر نگاری کی دوسری خصوصیت جو اُسے شبلی اور آزاد سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ حالی کی طرز نگارش کی بنیاد عموماً استدلال و عقلیت پر ہوتی ہے اور شبلی اور آزاد استدلال کی بجائے اکثر جذبات کی آمیزش سے کام لیتے ہیں۔ حالی اپنے قاری کو اپنی قوتِ استدلال سے ساتھ ساتھ ہمنوا بناتا چلا جاتا ہے اور آزاد و شبلی اُس کے جذبات سے اپیل کر کے اُسے ہم رائے بنانے کی سعی کرتے ہیں۔

حالی کے اندازِ تحریر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بے مثل ذہانت اور انتقالِ ذہنی سے مدد لے کر بات سے بات پیدا کرنے پر قدرت تام رکھتا ہے - اسی لئے وہ کسی تصنیفی موضوع کے متعلق تھوڑے سے معلومات سے بھی کام نکال کر اُس موضوع پر ایک مستند اور حاوی تصنیف تیار کر کے رکھ دیتا ہے - بخلاف شبلی کے کہ وہ جب تک کسی موضوعِ تصنیف سے متعلق تمام مسالہ اور مواد فراہم نہ ہو - اُس پر قلم اٹھانے کے عادی نہیں اور آزاد اگرچہ فراہمی مواد کی فکر نہیں کرتے - لیکن ان کی کوئی تصنیف کسی موضوع پر آخری تصنیف قرار نہیں دی جا سکتی -

تاجور

نوائے آتش

کئے جا کام ہاں اے گردشِ دورِ زماں اپنا
ہمیں بھی دیکھنا ہے کیسے مٹتا ہے نشاں اپنا

عدو ہیں بجلیاں اپنی نہ دشمن آسماں اپنا
ہمیں خود اپنے ہاتھوں پھونکتے ہیں آشیاں اپنا

جو ہم چاہیں تو زندانِ غلامی آج بہہ جائے
ابھی اتنا گیا گزرا نہیں سیلِ رواں اپنا

جو فقدانِ ہم آہنگی ہے خود ہی ہمصفیروں میں
زمانہ کس لئے ہونے لگا پھر ہمزباں اپنا

عروسِ منزلِ مقصود مل ہی جائیگی اک دن
یونہی چندے رہا گر جادہ پیما کارواں اپنا

بسانِ کوہکن راہِ طلب سے منہ نہ موڑوں گا
پڑھیں افسوں نہ میرے عزم پر ناکامیاں اپنا

چمن کے پتے پتے پر ہیں یارب بجلیاں قابض
کہاں لے جائیں مرغانِ چمن اب آشیاں اپنا

نہ کھودے سست گامی ہم کو بازی گاہِ ہستی میں
نہ گردِ کارواں رہ جائے بن کر کارواں اپنا

یہ غفلت دوستی ایسا نہ ہو برباد کر ڈالے
نہ خوابِ مرگ ثابت ہو کہیں خوابِ گراں اپنا

جلا دیں ہم قفس کی تیلیاں شعلہ نوائی سے
ہر اک مرغِ چمن آسی اگر ہو ہمزباں اپنا

آسی رامنگری

وجدانیات

وہ شوخ روزِ حشر بھی فتنہ خرام ہے
اے دیدہ! الوداع کہ ترکی تمام ہے

ہر چند میکدے میں دل و دیدہ دام ہے
ساقی کو التفات میں پھر بھی کلام ہے

واں حُسنِ بے نقاب کو تسخیرِ جاں کی دھن
یاں میکشانِ دید کو مستی سے کام ہے

وہ چاہتے ہیں عشق کا مضموں ہو دل پہ نقش
یاں درسِ ناظرہ بھی ابھی ناتمام ہے

واں بے طلب ہے مکرمتِ نعمتِ وصال
یاں سر بسجدہائے ریا عقل خام ہے

یاں شکل و رنگ و بو سے نہیں ایک دم فراغ
واں ہر نفس حضوریٔ دل کا پیام ہے

واں نامِ آرزو سے شکن بر جبیں ہیں وہ
یاں صبح و شام خواہش حال و مقام ہے

یاں نفس و حس کو لذتِ بہیم کی جستجو
واں حکم ہے کہ عشق میں جینا حرام ہے

ساقی سے ہے تغافلِ دیرینہ کا گلہ
اور تفرقے سے چُور خود اپنا ہی جام ہے

عشاق پیشہ ور میں خودی کا ہے اعتبار
اس کے سوا جو چاہو تو اللہ کا نام ہے

اپنے تاثرات کے ہاتھوں ہے عاشقی!
کوئی ہے شاد کام کوئی تلخ کام ہے

آزاد ہے نہ صوفیٔ صافی نہ رند مست!!
ہر اک کو اپنے ضبط میں حبس دوام ہے

ثابت ہوا لبیب! ترا عشق بے خلوص
بس ایسی عاشقی کو ہمارا اسلام ہے

لبیب تیموری

شعر العرب

مولینا عرشی نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے یہ خواہش عہد طالب علمی سے میری آرزو رہی ہے۔ مَیں نے اپنے استاد علامہ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے اس آرزو کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ "ادب العرب" کے نام سے عربی ادب کی ایک ضخیم تاریخ لکھی جانی ضروری ہے جس میں عہد بہ عہد کے شعراء و مصنفین پر عالمانہ انداز میں تنقید کی جائے اور مختلف ممالک میں جو عربی زبان کی خدمت ہو رہی ہے اس پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں مستشرقین مغرب کی جانکاہیوں پر بھی نظر ڈالی جائے۔ حضرت علامہ مرحوم نے اس ضرورت کو تسلیم کیا تھا۔ اِدھر بدقسمتی سے مجھ پر پنجاب میں اردو کے جنونِ خدمت کی لعنت طاری ہو گئی۔

یہ آرزو "لیتَ الشبابَ یَعُودُ" کی طرح کبھی کبھی اب بھی دل میں کھٹکنے لگتی ہے۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

یہ اہم خدمت کسی فرد واحد کے بس کی نہیں بلکہ اہلِ علم و فضل کی ایک منتخب جماعت اس مہم کو کم از کم پانچ سال لگا کر سرانجام دے سکتی ہے۔ پھر اس جماعت میں عربی ادب کے فضلاء کے علاوہ انگلش، فرینچ، بخصوصاً جرمن زبان کے اُن دکا ترہ علم کی شمولیت بھی ضروری ہے جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں رہ کر عربی ادب کے مطالعے پر کچھ سال صرف کر چکے ہیں۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی توجہ اِدھر مبذول ہو جائے تو یہ علمی و اسلامی خدمت کامیاب انجام تک پہنچ سکتی ہے۔ (تاجور)

(ادبائے عربی توجہ فرمائیں)

میرا خیال تھا کہ علامہ شبلی مرحوم شعر العجم سے فارغ ہو کر شعر العرب کی طرف متوجہ ہوں گے اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں تنہا وُہی اس امر اہم کے اہل تھے اور اس میں بھی شک نہیں کہ عجم کی نسبت عرب اُن کی توجہ کا زیادہ مستحق تھا۔ لیکن وقت اور عمر نے انہیں موقع نہ دیا۔ ع

اے بسا راز کہ ناگفتہ بماند

ان کے بعد ان کے صاحبِ کمال تلامذہ سے اس کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے "شعر الہند" لکھ کر تحصیل حاصل میں اپنی سعی گرانمایہ صرف فرمائی اور یہ قصر رفیع ویسے کا ویسا گنبد بے در بنا رہا۔

گذشتہ سال اجلاس ادارہ کے موقع پر لاہور میں ملک کے ارباب کمال جمع تھے، میرے بعض دوستوں نے مجھے شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن صاحب سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے متعارف کرایا، میں نے اپنی دیرینہ آرزو ان کے سامنے ظاہر کی اور اُنہیں اس مبارک کام کی ترغیب دلائی۔ تھوڑی مدت بعد ایک مکتوب کے ذریعے انہیں یاد دہانی بھی کرائی، لیکن صدائے برنخاست۔

آج مَیں "شاہکار" کے ذریعے مذاق عربیت کے لذت شناسوں کے کان تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں کہ اس وقت دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی زبان کی حفاظت و احیا کی آواز بلند ہو رہی ہے، لیکن مسلمان عربی کی اہمیت سے غافل ہیں۔ ایران و ترکی میں فارسی و ترکی کو عربی سے بے نیاز کیا جا رہا ہے۔ اسلامی ہند میں صرف ایک رسالہ (رضوان) عربی زبان میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے جس کی ادبیت پر مذہبیت غالب ہے۔ اردو رسائل میں انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمنی، بنگالی، مرہٹی، ناگری، بھاشا وغیرہ زبانوں کی نظم و نثر ترجمہ کر کے پیش کی جاتی ہے لیکن عربی جس کس مپرسی کی حالت میں ہے ظاہر ہے۔ حالانکہ قدیم و جدید کتب عربی کا سرمایۂ غرائب و نوادر کسی زبان سے کم نہیں۔ کوئی صاحبِ فرصت و استطاعت بزرگ تنہا اس کام کو اپنے ذمہ لیں یا کوئی علمی مجلس، بہرحال یہ کام کرنے کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر مجلس دار المصنفین اعظم گڈھ اس سعادت کے حصول میں سبقت کرے ——— اور اردو رسائل میں جہاں اردو فارسی وغیرہ زبانوں کے شعراء پر مضمون لکھوائے جاتے ہیں وہاں عرب شعرا کی طرف بھی توجہ کی جائے۔ عربی کے خزانہ میں بہت سے ایسے جواہر موجود ملیں گے جن سے ہماری مروجہ زبانوں کے دامن یکسر خالی ہیں۔

ذیل میں کسی خاص مضمون اور زمانہ کی قید کے بغیر چند اشعار پیش کرتا ہوں جو عربی ایرانی اور ہندی شاعروں نے عربی زبان میں لکھے ہیں۔ یہ اشعار مختلف علوم کی کتابوں سے دوران مطالعہ میں اخذ کئے گئے ہیں۔ اس وقت مجھے عموماً شعراء و کتب کے نام بھی مستحضر نہیں ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں عہدِ

جاہلیت سے لے کر زمانہ حال تک کے نمونے موجود ہیں اور ہر قسم کے مضمون پر حاوی ہیں۔

سورہ مزمل کی آیت قم اللیل (رات کو جاگ) کی تفسیر میں ایک مفسر نے ذیل کا شعر لکھا جو میرے دل پر نقش ہو گیا:-

اللیل للعاشقین ستر ٭ یالیت اوقاتہ تدوم

(مطلب) رات عاشقوں کے لئے پردہ ہے۔ اے کاش رات کبھی ختم نہ ہوتی۔

مجاز ہو یا حقیقت جو لوگ شب خیزی کی لذت سے واقف ہیں وہی اس کی قدر کر سکتے ہیں۔

شربنا، طربنا، سکرنا، لھونا ٭ الی ان بدا الفجر والنجم آفل

(مطلب) ہم نے شرابیں پیں، مزے اڑائے، مخمور ہوگئے اور خوب کھل کھیلے۔

صبح کے پھوٹنے اور ستاروں کے غروب ہونے تک یہی شغل جاری رہا۔

شعر کو پھر پڑھیں اور روانی، تموج اور بے ساختگی پر نظر کریں۔

ایک تصوف کے رسالہ کے حاشیہ پر ایک سندی صوفی کا یہ شعر دیکھا جس کا سرور مدتوں دل و دماغ پر چھایا رہا۔

لکل شیئ اذا فارقتہ عوض ٭ ولیس للہ ان فارقت من عوض

(مطلب) ہر اعلیٰ سے اعلیٰ چیز، ہر عزیز سے عزیز ہستی جس سے تمہیں جدا ہونا پڑے، اس دنیا میں کسی نہ کسی شکل میں اس کا عوض مل سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھو اگر اللہ سے جدا ہو جاؤ گے تو اس کا بدل کہیں نہیں پاؤ گے۔

ذیل کا قطعہ اور شعر بھی ایک تصوف کی کتاب کے دیباچہ میں دیکھا تھا۔

برح بی ان علوم الوریٰ ٭ اثنان ما فیہما من مزید
حقیقۃ یعجز تحصیلہا ٭ وباطل تحصیلہ ما یفید

(مطلب) شاعر کی تحقیق یہ ہے کہ تمام کائنات کے علوم صرف دو قسموں میں محدود کئے جا سکتے ہیں۔ حقیقت اور باطل — حقیقت کا سراغ لگانا محال ہے اور باطل کا حصول فضول ہے — کتنی بڑی صداقت کو دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

الشہرۃ آفۃ وکل یتمناھا ٭ والخمولۃ راحۃ وکل یاباھا

(مطلب) شہرت ایک آفت ہے اور ہر شخص اس کا آرزو مند ہے اور گمنامی سراسر راحت ہے لیکن کوئی اس کو پسند نہیں کرتا۔

نعت میں ایک بے نظیر شعر بھی کسی تصوف کی کتاب میں دیکھا تھا۔

ما ان مدحت محمداً بمقالتی ٭ لکن مدحت مقالتی بمحمد

اس کا مفہوم اسی وقت ایک شعر کی صورت میں بن گیا تھا۔

کب میں نے کی ہے مدح محمدؐ کلام سے
زینت ہوئی کلام کو اس پاک نام سے

متنبی اپنے ممدوح کے متعلق کہتا ہے:-

لیس علی اللہ بمستنکر ٭ ان یجمع العالم فی الواحد

"اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سارے جہان کو ایک شخص کی ذات میں جمع کر دے" کیسی شاندار مدح ہے۔ تمام دنیا کے قصائد ایک شعر میں سمیٹ لئے گئے ہیں۔

عشق و محبت کے بیان میں بھی زبان عرب کسی سے پیچھے نہیں۔

لیس الفواد محل شوقک وحدہ ٭ کل الجوارح فی ھواک فواد

اے محبوب تیرے شوق کا محل تنہا دل ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہر ہر عضو تیری محبت میں دل بنا ہوا ہے۔

کتنا پاکیزہ، کتنا سچا، اور کتنا عمیق جذبہ ہے۔ سبحان اللہ۔

تداویت من لیلی بلیلی عن الھویٰ ٭ کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

میری بیماری لیلیٰ سے تھی اور لیلیٰ ہی سے مجھے شفا حاصل ہوئی ٹھیک اس طرح جیسے رند شراب خوار خمار شراب کا چارہ شراب ہی سے کرتا ہے — یہ تشبیہ شاعر کی تلاش اور رسائی ذہن پر برہان قطعی ہے۔ غالب کا ایک شعر اسی مفہوم کا حامل ہے۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتا ہوں جس کافر پہ دم نکلے

علامہ جوزی نے تلبیس ابلیس میں شعر کی گمراہ کن تاثیر کے ثبوت میں ایک قطعہ لکھا ہے، جو شاعر کے کمال فن کا بھی بہترین ثبوت ہے:-

ذھبی اللون تحسب ٭ من وجنتیہ النار تقتدح
خوفنی من فضیحتہ ٭ لیتہ وافی وافتضح

طلائی رنگ محبوبہ کے رخساروں سے گویا شعلے برس رہے ہیں۔ وہ مجھے رسوائی سے ڈراتی ہے۔ کاش وہ مجھے مل جائے اور کاش میں رسوا ہو جاؤں۔

اسی کتاب میں ایک قطعہ ہے جو امام احمد بن حنبل کے سامنے

مستفسرانہ پیش کیا گیا کہ ایسے اشعار کے متعلق آپ کی شرعی رائے کیا ہے۔ آپ سنتے ہی اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ مستفسر کافی انتظار کے بعد دروازہ کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ امام صاحب رو رہے ہیں اور اس قطعہ کی تکرار کر رہے ہیں۔

اذا ما قال لی ربی اما استحییت تعصینی؟
وتخفی الذنب من خلقی وبالعصیان تاتینی

جب میرا رب مجھے کہے گا تجھ کو نافرمانی سے شرم نہ آئی تو میری مخلوق سے گناہ چھپاتا تھا اور میرے سامنے گناہ کرتا تھا۔

سعدیؒ کہتے ہیں:۔

ہلک الناس حولہٗ عطشاً ھو ساقٍ یری ولایسقی

لوگ اس محبوب کے گرد پیاس سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ وہ مجسمہ استغنا ساقی ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہے، لیکن نہیں پلاتا۔

لبیدؔ کا ایک شعر جو بارگاہِ نبوت سے سندِ قبول حاصل کر چکا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

الا کلُ شیئٍ ما خلا للہ باطل وکُلُ نعیم لا محالۃ زائل

یاد رکھو اللہ کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے اور ہر نعمت ناچار آمادۂ زوال ہے۔

اسی لبیدؔ کے ایک شعر پر مشہور شاعر فرزدقؔ نے سجدہ کر دیا تھا، لوگوں نے کہا یہ کیسا سجدہ ہے، اس نے کہا تم قرآن مجید کے سجدوں کو جانتے ہو۔ میں شعر کے سجدوں کو جانتا ہوں۔ شعر یہ ہے:۔

وجلا السیول عن الطلول کانہا زُبُرٌ تجدّ متونہا اقلامہا

شاعر نے تشبیہ کو اعجاز کی حد تک پہنچا دیا ہے یعنی سیلابوں کی آمد و رفت نے مسکن محبوب (محبوبہ کی اقامت گاہ کے کھنڈرات کو اس طرح نمایاں کر دیا ہے جیسے پرانے مخطوطات کو مکرر قلم پھیر کر روشن کیا جائے۔

ذیل کے بے نظیر قطعہ پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

کانت لنفسی اھواء مفرّقۃ فاستجمعت اذ رآک العین اھوائی
فصار یحسدنی من کنت احسدہٗ وصرتُ مولی الوری اذ صرتَ مولائی
ترکتُ للناس دنیاھم و دینھم شغلاً بحبک یا دینی و دنیائی

میرے دل میں بہت سی متفرق خواہشیں تھیں۔ جب تجھے دیکھا تو سب ایک مرکز پر جمع ہو گئیں۔ جو لوگ کبھی میرے محسود تھے میرے حاسد ہو گئے۔ جب تو میرا مالک بن گیا تو میں کائنات کا مالک بن گیا۔ میں نے لوگوں کے حوالے کر دیا ان کے دین و دنیا کو تیری محبت میں محو ہوتے ہوئے۔ اے میری دین و دنیا۔

اِن چند اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شعرِ عرب کس قدر جاذب توجہ ہے۔

عرشی امرتسری

غزل

زہے قسمت گلستانِ تمنا میں بہار آئی
مری اجڑی ہوئی راتوں میں سوزِ جانفزا لائی

کسی کے سرمئی گھونگھٹ میں جلوے تلملا اُٹھے
کسی کے دل کے ناسوروں پہ اک بجلی سی لہرائی

پسینہ آ گیا کالی گھٹاؤں کی جبینوں پر
جو اُن شانوں پہ لی زلفوں نے متوالی سی انگڑائی

مرے افکار کی قندیل سے کونین روشن ہیں
میری تخئیل سے شمس و قمر نے ہے ضیا پائی

سنبھل اے رونے والے! آہ تیری چھپ کے راتوں کو
فلک سے بربطِ ناہید کے نغمے چرا لائی

خدارا اس طرح نہ دیکھنا، پھر دیکھنے والے!
تیری تیکھی نظر الطاف کے دل میں اتر آئی

الطاف مشہدی

ہنگامۂ شوق

حشرِ حُسن و ناز اٹھا، لے کے خود آرائیاں　　محشرستاں بن گئیں آفاق کی پہنائیاں

اختلاطِ ظاہر و باطن ہے سامانِ وجود　　عشق میں پہنائیاں ہیں حُسن میں پیدائیاں

گلستانِ حُسن و خوبی ہے جہانِ رنگ و بو　　دید کے قابل ہیں حُسنِ دوست کی زیبائیاں

چشمۂ خورشید ہونے پر بھی ہیں ظلماتِ جہل　　کم سوادانِ کتابِ عشق کی بینائیاں

ہو گئیں کس واسطے یارب نصیبِ عاشقی　　خواریاں، ناکامیاں، بربادیاں، رسوائیاں

مَیں ہوں وہ شعلہ نوا مطرب جو آتش زن رہا　　محفلِ فطرت میں لے کر شوق کی شہنائیاں

میرے مٹنے پر نقوشِ حُسن بھی مٹنے لگے　　ہو گئیں بیکار اُلفت کی نگار آرائیاں

نالہ ساماں ہیں چمن زارِ محبت کے طیور　　کیا ہوئیں اس سروِ نازِ حُسن کی رعنائیاں

اضطراب، آشفتگی، وحشت، پریشانی، جنوں
کم نہیں ہیں تیری، تائبؔ پر کرم فرمائیاں

مراتب علی تائبؔ

درِ پیرِ مغاں ہے اور مَیں ہوں　　شرابِ ارغواں ہے اور مَیں ہوں

مجھے کیا واسطہ دیر و حرم سے　　کسی کا آستاں ہے اور مَیں ہوں

نہیں رُکتے شبِ فرقت میں آنسو　　زباں وقفِ فغاں ہے اور مَیں ہوں

شکایت دشمنوں سے ہو مجھے کیا　　جفائے دوستاں ہے اور مَیں ہوں

ہے رونق میکدے کی اپنے دم سے　　ہجومِ میکشاں ہے اور مَیں ہوں؟

ماں کا دل

عزیز کا دودھ بھی نہ چھوٹا تھا کہ اس کے باپ کی ناگہانی موت نے اس کو یتیم بنا دیا۔ ہرچند اس کی ماں سکینہ کوئی دولتمند عورت نہ تھی اور شوہر نے کوئی ایسی مستقل جائداد نہ چھوڑی تھی جس سے وہ آرام و اطمینان کے ساتھ عزیز کی پرورش کا کوئی معقول بندوبست کر سکتی، تاہم سکینہ ماں تھی جس کی یہ خصوصیت ہے کہ غربت، بیکسی، افلاس اور ہر قسم کے مصائب کا آسانی سے مقابلہ کر لیتی ہے مگر اولاد پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ پہلے پہلے تو اعزہ نے اس کو مشورہ دیا کہ اپنی جوانی اور عزیز کی پرورش کے خیال سے اُسے عقد ثانی کر لینا چاہیئے مگر وہ جانتی تھی کہ یہی چیز ہے جو عورت کو فریب دے کر بالآخر اس کی زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ اُس کو خوب معلوم تھا کہ دوسرا آدمی جس کے خون کو عزیز کے خون سے کوئی تعلق نہیں ہے کسی طرح بھی اس کی سرپرستی اور نگرانی نہیں کر سکتا، وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ جو چیز گم ہو چکی ہے وہ ملنے والی نہیں ایک شادی نہیں دس بھی کر لی جائیں تو وہ بات حاصل ہونے سے رہی ——— حفیظ کا وہ تنخواہ لاتے ہی میرے حوالے کر دینا اور میری ذرا سی غمگینیٔ خاطر کے لئے اُس کا بے چین ہو جانا اور گھڑی گھڑی محبت سے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھنا بیگم تم کیسی ہو تمہیں کیا تکلیف ہے؟ ہائے یہ وہ باتیں ہیں کہ دُنیا جب تک اپنی اصلی جگہ پر قائم ہے اور قدرت کا موجودہ قانون نہیں بدلتا، کبھی اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتیں خدا اپنی حکمت سے حفیظ ہی کو نئی زندگی عطا کر دے تو اور بات ہے ورنہ ان اوصاف کا دوسرا آدمی نہیں مل سکتا۔ اس کے عقیدے میں حفیظ کی عادات و خصائل اسی کے لئے مخصوص تھیں اور ان صفات کے ساتھ دنیا میں کسی دوسرے شخص کو متصف نہیں کیا گیا تھا کہ حفیظ کے مر جانے پر وہ اس کی ہو جاتی وہ اپنے شباب کی رعنائیوں کو تنہا حفیظ کی ملکیت جانتی تھی اور اس امر کو ناموسِ شباب کے منافی سمجھتی تھی کہ حفیظ کے بعد کسی اور ہستی کے جذبات اس سے آسودہ ہوں۔ اُس نے نہایت استقلال اور صبر و شکر کے ساتھ عمر کی خطرناک منزل کو اپنی عفت مآبی اور عصمت پژوہی کی رہنمائی میں طے کر لیا۔ اب اس کا عزیز جو اُس کی زندگی کا تنہا سہارا تھا تعلیم کے انتہائی مدارج پر پہنچ چکا تھا اور ملازمت کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا آخر لکھنؤ کے ایک سرکاری دفتر میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کی جگہ مل گئی

.. ..

اور اس طرح عزیز کو ایک بہت بڑی فکر سے نجات مِل گئی جو تعلیم سے فارغ ہوتے ہی پیدا ہو گئی تھی۔

سکینہ کو جب معلوم ہوا کہ عزیز ملازم ہو گیا تو جوشِ مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور دل جلدی جلدی حرکت کرنے لگا اُسے یہ تمنا تو نہ تھی کہ بیٹے کی کمائی سے اپنی بقیہ عمر عیش و آرام سے گذار دے بلکہ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ کسی اچھے خاندان میں عزیز کی شادی ہو جائے اور اس طرح وہ اپنے اُس پودے کو جسے اُس نے خونِ جگر سے سینچا تھا پھولتا پھلتا دیکھ لے۔

(۲)

سکینہ اسی خیال میں تھی کہ عزیز نے اس کو تار دے کر لکھنؤ بلا لیا، سکینہ وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ صاحبزادے خود ہی شادی کا انتظام کر چکے ہیں اور ایک اچھے گھرانے میں معاملہ طے ہو گیا ہے۔ سکینہ کو اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اوّل تو اب تک خاندان کی کسی لڑکی پر اس کی نگاہِ انتخاب قائم نہ ہوئی تھی، پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شادی کا مسئلہ جہاں تک ہو سکے خود شادی والا ہی طے کر لے تو زیادہ اچھا ہے۔ وہ اگر خود بھی اس کام کو کرتی، عزیز کی رائے اور اُس کے مشورے سے کرتی جب اُسے معلوم ہوا کہ عزیز لڑکی کو دیکھ چکا ہے اور جلد شادی کر لینے کی فکر میں ہے تو بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ اپنی ناراضی کا اظہار کرتی۔ سب سے بڑی چیز جو ایسے مواقع پر ضروری ہے لڑکے کی پسند ہے اور وہ حاصل تھی۔

سکینہ نے بہت عجلت سے تمام سامان درست کر لیا اور ایک مہینے کے اندر ہی عزیز کی دلفریب اور حسین بیوی اس کے گھر آ گئی۔

شادی سے پہلے عزیز ماں کا بہت احترام کرتا تھا اور کبھی اُسے یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ اس کی رائے سے اختلاف کرے مگر شادی کے دو تین مہینے بعد جب عزیز کی سسرال والوں نے اس کی بیوی کو بغیر سکینہ

کی اجازت کے اپنے یہاں بلالیا۔ تو یہ بات اس کو بہت ناگوار ہوئی، اُس نے عزیز کو بلا کر کہا ——— دیکھو بیٹا! ابھی سے بیوی کو اتنی آزادی نہ دو کہ بعد میں یہی چیز جو آج اچھی معلوم ہو رہی ہے تکلیف دہ ہو جائے۔ میں خواہ کیسی ہی محتاج اور لاچار سہی مگر تمہاری ماں ہوں اور مجھے دُنیا میں بالکل بے اختیار ہونے کے باوجود بھی تمہاری ذات پر کامل اختیار ہے۔ ایسی صورت میں بہو کو کم سے کم مجھ سے پوچھ لینا چاہیئے تھا کہ میں جا رہی ہوں، میں اُسے روک نہ لیتی مگر ذرا میری بات رہ جاتی اور اُسے معلوم ہو جاتا کہ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا ہے جو بُری بھلی بات پر اُس سے باز پُرس کر سکتا ہے۔

عزیز نے گردن جھٹکا کر کہا ——— اماں جانے بھی دو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل میلا کرنے سے کیا فائدہ؟

بیٹا یہی چھوٹی چھوٹی باتیں آگے چل کر بڑی بڑی باتیں پیدا کرینگی اور اس کو تم چھوٹی بات کہتے ہی کیوں ہو؟ یہی تو تمہاری سادہ لوحی اور سادگی کی علامت ہے۔ سکینہ نے ذرا زور سے کہا۔

اماں مجھ سے پوچھ لیا تھا انہوں نے۔ عزیز نے ذرا شرمندگی سے جواب دیا۔

کیا تم میری اجازت کے پابند نہ تھے۔ اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تمہاری کمزوری کا نتیجہ ہے۔ سکینہ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

جی ہاں یوں ہی سمجھ لیجئے، کہا تو میں نے ہی تھا، عزیز نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا۔

سکینہ بہت سمجھدار اور دُور اندیش عورت تھی، اُس نے عزیز کے لب ولہجہ سے سمجھ لیا کہ زیادہ حجت کرنا اُسے گستاخی پر آمادہ کرنا ہے۔ وہ اس معاملہ میں ذرا بھی نہ دبے گا یا تو بیوی کے کہنے سننے سے یا اور کسی خاص وجہ سے وہ اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان مجھے دخیل بنانا نہیں چاہتا۔ سکینہ خاموش ہو گئی اور اس کے بعد اس نے کبھی کچھ نہیں کہا۔

عزیز کی بیوی ریحانہ برابر اپنی منشا سے آتی جاتی رہی اور عزیز نے کبھی اُس سے نہیں کہا کہ میری ماں سے بھی دریافت کر لیا کرو، اس پر طرہ یہ کہ عزیز اب تنخواہ بھی ماں کو دینے کی جگہ بیوی کے حوالے کرنے لگا اور ماں سے کہہ دیا کہ شادی سے قبل یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ تنخواہ بیوی کو دی جایا کرے گی۔ سکینہ نے مسکرا کر اس کا جواب دیا کچھ حرج نہیں بیٹا، میرے پاس آئے یا ریحانہ کے پاس جائے۔ بہرحال ہے تو گھر ہی میں!

تھوڑے دنوں میں ریحانہ کو سکینہ کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگا۔ وہ اپنے اور شوہر کے محبت آفریں لمحات میں کسی کی شرکت پسند نہ کرتی تھی اور خلوت کے مفہوم کو اس نے اسقدر وسیع کر دیا تھا کہ سکینہ کی ذات بالآخر اس کی وسعت میں حائل ہونے لگی، ریحانہ کسی قیمت پر گوارا نہ کر سکتی تھی کہ عزیز اپنی جوان تمناؤں کے ناتجربہ کارانہ اقدام میں سکینہ کی مآل اندیشی اور دُور بینی کو شامل کر کے عروسی کی دلچسپ اور لطف انگیز گھڑیوں کی شیرینی کو تلخ بنائے، اس نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا ——— کہ میرے اور آپ کے جذبات کو اماں نہیں سمجھ سکتیں اور ان سے یہ توقع بیکار ہے کہ وہ ہماری حسین وجمیل زندگی کی اس اہمیت کا اندازہ کر سکیں جس کو صرف میرا اور آپ کا دل سمجھ سکتا ہے مگر کم سے کم اتنا تو ہونا چاہیئے کہ ان پر ہماری خوشی اور مسرت کی زندگی بار نہ ہو۔

بلاشبہ! عزیز نے ریحانہ کی طلائی چوڑی کو اس کی کلائی میں گھماتے ہوئے کہا ——— مگر ایسا ہوتا بھی تو نہیں!

ہوتا کیوں نہیں وہ کل ہی کہہ رہی تھیں کہ عزیز نے رات کو دفتر کا کام کرنا چھوڑ دیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جرمانہ ہو جائے ——— جرمانہ کا لفظ انہوں نے تو منہ بھر کر کہہ دیا مگر میرے بدن کا رواں رواں تک کھڑا ہو گیا۔ خدا نہ کرے جو یہ نوبت آئے۔ ریحانہ نے عزیز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:۔

چلو جانے بھی دو۔ ان باتوں کا خیال نہ کرو بوڑھے آدمیوں کی قوت واہمہ بڑھ جاتی ہے اور موہوم خطرات کا تصور کرنے کے علاوہ ان سے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ .. ..

.. .. واقعی میں نے کئی روز سے کچھ لکھا پڑھا بھی تو نہیں اور لکھوں کیا مجھے تو تمہاری کتابِ مصحف ہی کے پڑھنے سے مہلت نہیں ملتی اور اس الہامی صحیفہ کی تلاوت میں وہ لطف آتا ہے کہ میں گھر آتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہوں! عزیز نے ریحانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جبھی تو میرا دل بھی تمہاری عدم موجودگی میں ہر وقت کڑھتا رہتا ہے ——— ریحانہ نے پان بناتے ہوئے اور شرم سے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا۔

پھر میری وجہ سے اماں کی دو چار باتیں بھی سُن لیا کرو۔ عزیز بولا۔

سُن تو لیا کروں مگر تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں، اماں کو مجھ سے خواہ مخواہ کا بیر سا ہو گیا ہے۔ ریحانہ نے نسوانی بیچارگی کو لہجہ میں مجتمع کر کے کہا۔

نہیں جی! عزیز بولا ایسا وہم نہ کرو وہ تم پر دل وجاں سے فدا ہیں۔

بس رہنے بھی دو دل وجاں سے فدا ہوتی تو چوبیس گھنٹے یہی رونا روتیں کہ بہو نے آتے ہی گھر پر قبضہ کر لیا میری کوئی سنتا تک نہیں۔ مجھے تو دودھ کی مکھی بنا دیا۔ اس نے آتے ہی ــــ ذرا ادھر دیکھو میری طرف یہی باتیں دل وجان سے فدا ہونے کا ثبوت ہیں۔ ریحانہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا میں کوئی اپنے آپ تو آ نہیں گئی اور جب آ گئی ہوں تو میں بھی کچھ حق رکھتی ہوں اس گھر پر منہ سے کچھ نہ کہوں تو اور بات ہے، ورنہ سچ پوچھو تو جو کچھ ہے سب میرا ہی ہے جب تم میرے ہو تو اور کسی چیز کی کیا حقیقت ہے؟

(۳)

تھوڑے ہی دنوں میں ساس بہو کا اختلاف بڑھ گیا اور ریحانہ نے ازدواجی سہولتوں کا اتنا غلط استعمال کیا کہ رات کی تنہائی اور دن کی معیت میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جس میں اس نے عزیز سے سکینہ کی دو چار شکائیتیں نہ کی ہوں۔ اور اس کے دل کو ماں کی طرف سے پھیرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

عزیز آخر انسان تھا اور پھر نوجوان جس کے سامنے محبت کے گہرے اور متلاطم دریا کے علاوہ اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ جوانی کی سرشاریوں میں صرف محبت کرنا اور محبت کرانا جانتا ہے اور مرد کے مقابلہ میں عورت کا اظہار عشق ایسی بے پناہ چیز ہے کہ اس کا یقین ہو جانے کے بعد کہ عورت محبت کرتی ہے مرد کے ہوش وحواس پر ایک خمار سا طاری ہو جاتا ہے۔ اور اس نشہ میں وہ کائنات کو ٹھکرا دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ عزیز جانتا تھا کہ اس کی بیوی اتنی شدید شیفتگی رکھتی ہے کہ اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی اور پھر ہے بھی نہایت معصوم، بے زبان اور صابر وشاکر عورت وہ جو کچھ کہتی ہے بالکل سچ کہتی ہے اور جسقدر سنتی ہے اس سے بدرجہا کم کہتی ہے ــــ سکینہ اپنی جگہ مطمئن اور اس سازش سے قطعی بے خبر تھی۔ اُسے خیال بھی نہ تھا کہ عزیز بیوی کے مقابلہ میں ماں کے احترام کو نظر انداز کر دے گا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے کوئی بات اپنی طرف سے ایسی نہ ہونے دی جو ریحانہ کو گراں گزرتی ــــ وہ روٹی کی محتاج نہ تھی، اُسے بڑھاپے میں حکومت کا شوق بھی نہ تھا نہ وہ آرام کرنا چاہتی تھی اس نے عمر بھر سے محنت اور مصروفیت کو اپنا مقصد زندگی قرار دے رکھا تھا اور اسی پر اب بھی عامل تھی البتہ وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ عزیز تندرست اور سلامت رہے اور جب تک اس کی سوکھی ہوئی رگوں میں خون کا دوران اور بے طاقت دل میں تڑپ باقی ہے عزیز اس کی آنکھوں کے سامنے رہے، جس طرح زیادہ محتاط دولتمند اپنے سرمائے کو ہر وقت پاس رکھنا چاہتا ہے اُسی طرح ایک شفیق ماں اپنی اولاد کو جو دنیا میں اس کے نزدیک سب سے بڑی دولت ہے ہر آن چھاتی سے لگائے رکھنے کی تمنا رکھتی ہے، عزیز سکینہ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ اس نے بڑی مصیبتوں سے اس کو پرورش کیا تھا اور بہت سی قیمتی اشیاء کو فدا کر کے عزیز کو اس قابل بنایا تھا کہ آج وہ ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ پاتا تھا اور ریحانہ ایسی ــــ یکسر شباب ورعنائی ــــ بیوی کا شوہر تھا۔ تعلیم ختم ہونے پر جب عزیز تلاش ملازمت کے لئے نکلا ہے تو اس نے اپنی عزیز ترین متاع اپنے مرحوم شوہر کی پہلی اور آخری نشانی یعنی شادی کی انگشتری فروخت کر کے اس کے زادِ راہ کا انتظام کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ عزیز اور اس کی کامیابی بہرحال اس انگشتری سے زیادہ ضروری ہے۔ ایسی قیمتی اور گراں مایہ ہستی کو جس کی ذات سے اس کی زندگی اور موت وابستہ تھی سکینہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرنا چاہتی تھی مگر اسی کے ساتھ میاں بیوی کے تعلقات کو بھی وہ خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ اُس نے کبھی بیٹے کی خلوتوں کو بے کیف اور اس کے عیش وآرام کو مکدر نہیں کیا۔

عزیز بیوی کی محبت میں اندھا ہو گیا تھا اور ان حقوق کو آہستہ آہستہ نظر انداز کرتا جا رہا تھا جو قدرت نے بیٹا ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کئے تھے۔ آج اپنی دانست میں وہ سکینہ کا بیٹا نہ تھا بلکہ صرف ریحانہ کا ناز بردار شوہر تھا اور حقوقِ زوجیت کی نگہداشت کو دین ودنیا کے تمام فرائض سے زیادہ ضروری خیال کرتا تھا، اندر ہی اندر وہ اپنی بوڑھی ماں سے کھنچتا جا رہا تھا آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے ماں سے بولنا بھی چھوڑ دیا۔

سکینہ ان سب باتوں کو محسوس کر رہی تھی مگر جانتی تھی کہ زندگی کتنے دن کی ہے جب تک زندہ ہے عزیز نگاہوں کے سامنے ہی رہے تو اچھا ہے اگر اُسے تنگ کیا گیا تو ممکن ہے وہ کوئی اور صورت اختیار کرے جو میرے لئے موجودہ حالت سے زیادہ تکلیف دہ ہو۔ ان وجوہ سے وہ خاموش تھی۔ مگر ایک دن مجبور ہو کر جب بیٹے کی بے اعتنائی سے اس کا خون، پانی ہو گیا تو اُس نے عزیز کو بلا کر اس کے ہاتھ کو مادرانہ شفقت سے چومتے ہوئے پوچھا ــــ بیٹا عزیز کیا میری طرف سے کچھ سرگراں ہو؟

عزیز نے جواب دینے کی جگہ ہاتھ کو جھٹکا دے کر چھڑا لیا اور

بے چین ہو کر کہنے لگا —— اماں میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں!
سکینہ نے ہنس کر سوال کیا۔ پھر کس کے ہو؟
کس کا بتاؤں؟
آخر!
اماں میرا دل لپکا پھوڑا ہو رہا ہے اسے نہ چھیڑو ورنہ پھوٹ بہے گا!
خدا نہ کرے عزیز ایسی بات نہ کہو، نصیب دشمناں تیرا دل کیوں لپکا پھوڑا ہو گیا۔
اماں بڑھاپے کی خشکی نے تمہارے دماغ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے اور تم اپنی بزرگی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔
بیٹا! میرا دماغ ممکن ہے بڑھاپے نے خراب کر دیا ہو مگر یہ تجھے کیا ہوا؟
اماں یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے لئے میں ریحانہ کو چھوڑ دوں۔
اب سکینہ کو غصہ آ گیا اور عزیز کی بیہودگی پر اس کی زبان حرکت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے طیش میں آ کر کہا —— توبہ کر عزیز توبہ! میں نے تجھے کب اس کے لئے مجبور کیا ہے؟
منہ سے نہیں کہا آپ نے تو کیا ہوا منشاء تو یہی معلوم ہوتا ہے
سکینہ نے ہاتھ بڑھا کر عزیز کا منہ بند کر دیا اور بولی چپ رہو نہیں تو آسمان ٹوٹ پڑے گا۔
ٹوٹنے دو اماں! آسمان کو ٹوٹنے دو اور زمین کو پھٹ جانے دو یہ مصائب میرے نزدیک کچھ حقیقت نہیں رکھتے، لیکن ریحانہ کو چھوڑ دینا جیتے جی ممکن نہیں!
خدا نہ کرے عزیز کہ تو ان مصیبتوں سے دوچار ہو —— اور دیوانے تو بکتا کیا ہے بار بار، ریحانہ کا یہاں کیا ذکر ہے؟
اماں ان باتوں کو یوں ہی ڈھکا چھپا رہنے دو تمہیں میری زندگی پیاری ہے تو کچھ دنوں کے لئے گھر چلی جاؤ میں وہیں جو کچھ ہو سکا کرے گا تمہیں بھیج دیا کروں گا۔
یہ سنتے ہی سکینہ کو گویا سانپ سونگھ گیا ایسا معلوم ہوا کسی نے بہت سا سیسہ گرم کر کے اس کے کانوں میں ڈال دیا جو وہاں سے چل کر تمام رگوں میں ہوتا ہوا دل میں جا کر بھر گیا اور قلب اتنا بوجھل ہو گیا کہ سکینہ اس کا وزن اٹھانے سے مجبور ہو گئی اور زمین کے اندر کو دھنسنے لگی۔ وہ ابھی اسی روحانی اذیت میں مبتلا تھی کہ عزیز اٹھ کر چلنے لگا اور چلتے چلتے اس نے کہا۔ اماں اگر جاؤ تو مجھ سے کہہ دو میں تار دے کر ماموں جان کو بلا لوں گا۔
بلا لو عزیز آج ہی تار دے دو —— میں جلدی جانا چاہتی ہوں!

(۴)

سکینہ کو بھائی کے یہاں رہتے ہوئے دو سال کے قریب ہو گئے چھ سات مہینے تک عزیز اُسے دس روپے ماہوار بھیجتا رہا، اس کے بعد نہ معلوم کیوں یہ امداد منقطع ہو گئی۔ سکینہ کو اس کی ضرورت تو نہ تھی مگر وہ بیٹے کی خیریت کے لئے اکثر بے چین رہا کرتی تھی، بار بار بھائی سے خط لکھاتی جواب میں دیر ہوتی تو رو رو کر دعائیں مانگتی —— اللہ میرے عزیز کو سلامت رکھیو! جب معلوم ہو جاتا عزیز اچھا ہے تو اس کے دل کو سکون ہو جاتا۔ اس کی زندگی نہایت تکلیف سے بسر ہو رہی تھی۔ بھائی میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ پورے خاندان کی خبر گیری کرنے کے ساتھ ہی وہ بہن کی حسب دلخواہ خدمت کر سکتا۔ روٹی تو خیر سب کے ساتھ اس کو بھی ملے جا رہی تھی مگر سکینہ کو اس عمر میں جس آرام کی ضرورت تھی وہ میسر نہ تھا۔ تاہم موت کے انتظار میں اس کو ان عارضی تکالیف کی زیادہ پروا نہ تھی، وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے عزیز کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھی اور خدا سے التجائیں کیا کرتی تھی کہ عزیز کو کہیں میری وجہ سے مبتلائے عذاب نہ کر دینا، میں اپنے حقوق اس کو بخش چکی ہوں۔ میرے لئے اس کے رزق، عمر اور آرام میں کمی نہ ہو!

عزیز اور ریحانہ کی ازدواجی زندگی ہر چند ابتداءً خوشگوار رہی مگر ریحانہ کی خود پسند طبیعت اور متکبرانہ افتادِ مزاج سے عزیز جلد ہی تنگ آ گیا۔ اکثر ایسا ہوا کہ عزیز اسے گھر چھوڑ کر دفتر گیا اور آیا تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ میکہ گئی ہیں، وہاں پہنچا تو اطلاع ملی خالہ کے یہاں ہیں، خالہ کے یہاں گیا تو پتہ چلا ابھی ابھی بڑی اماں کو سلام کرنے چلی گئی ہیں۔ وہ اس آزادی سے بیزار ہو گیا اس نے ریحانہ سے کہا —— ریحانہ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنے اُس اقتدار سے کسی طرح دست بردار نہیں ہو سکتا، جو بحیثیت شوہر کے مجھے تمہاری ذات پر حاصل ہے۔ میری اجازت کے بغیر تمہیں گھر سے باہر قدم نہ رکھنا چاہیئے۔ اگر آئندہ تم نے اس طرزِ عمل کو ترک نہ کیا تو میرے اور تمہارے تعلقات اس قدر تلخ ہو جائیں گے ہم ایک دوسرے سے پناہ مانگنے لگیں گے۔
عزیز نے اس وقت اپنی خودداری کے آبگینہ کو ریحانہ کی آزادی

کے پتھر سے بچانے کی کوشش کی جب وہ ٹوٹ کر چور چور ہو چکا تھا اور اس کے ریزے کبھی ڈھونڈے سے نہ مل سکتے تھے - ایسی صورت میں اس کا یہ احساس بعد از وقت تھا - چنانچہ ریحانہ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ شوہر کی تعظیم و تکریم مسلم، مگر یہ بالکل ناقابل تسلیم بات ہے کہ میں آپ کے گھر میں قید ہو کر رہوں، جس وقت آپ چاہیں مجھے رہا کر دیں، اور جب چاہیں پنجرے کا دروازہ بند کر دیں، میں عورت نہ ہوئی ایک بلبل اسیر ہو گئی، میں اس مجبوری اور غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہوں - رفتہ رفتہ بات اتنی بڑھ گئی کہ عزیز نے غصہ میں آ کر ریحانہ کے منہ پر زور سے ایک طمانچہ رسید کر دیا - ریحانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - اور باپ سے لکھ بھیجا کہ فوراً میری خبر نہ لی گئی تو عزیز کے ہاتھ سے میرا زندہ بچ جانا مشکل ہے۔

اس اطلاع کے پہنچتے ہی تمام اعزہ ٹوٹ پڑے - عورتیں بھی ڈولیوں میں بیٹھ بیٹھ کر پہنچ گئیں اور سب نے عزیز کو لعنت ملامت کی، اس کے قدیم اور جاہلانہ خیالات پر سرزنش کی اور ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم نے شریف اور تعلیم یافتہ سمجھ کر تمہیں لڑکی دے دی تھی، یہ کیا خبر تھی کہ تم آدمی کے بھیس میں حیوان ہو۔ اب تو خیر رشتہ ہو چکا ہے شریفوں میں جو پیوند لگ جاتا ہے خواہ کتنا ہی بدنما اور بے جوڑ کیوں نہ ہو حتی الامکان اُسے الگ نہیں کیا جاتا مگر ہم اس کے لئے بھی مجبور نہیں ہیں - بہرصورت لڑکی اور اس کی سلامتی مقصود ہے، وہ جس طرح بھی حاصل ہو گی ہمیں دریغ نہ ہو گا - فی الحال ایک دو سال کے لئے ریحانہ کو تم سے الگ رکھا جانا نہایت ضروری ہے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ان بہیمانہ خیالات اور سنگدلانہ طرز عمل کی پاداش کیا ہے؟

(۵)

ریحانہ کو میکہ گئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے - اس عرصہ میں نہ تو عزیز نے اس کی خبر لی اور نہ وہ عزیز کے یہاں آئی، دونوں لکھنؤ میں تھے مگر ایک کو دوسرے کے حالات کی اطلاع تک نہ تھی - اسی دوران میں طاعون پھیلا اور تمام ذی استطاعت لوگ شہر کو چھوڑ کر باہر چلے گئے - ریحانہ کا خاندان بھی قریب کے ایک موضع میں منتقل ہو گیا، عزیز کا دفتر اگرچہ ایک مہینہ کے لئے بند ہو گیا تھا مگر وہ شہر چھوڑ کر کہاں جاتا، سکینہ کی محبت کو ٹھکرا کر وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ اُسے منہ دکھا سکے اور ریحانہ ——— ظالم و سنگدل ریحانہ کی دلکش جدائی میں سب کچھ تھا مگر شوہر پرستی اور وفاداری نام کو نہ تھی - اُس کے پاس جانا گویا حمیت اور خودداری کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا اور وقار کو پیروں سے کچلنا تھا، اس کی طبیعت بالکل بجھ گئی تھی اور وہ یہ کبھی نہ چاہتا تھا کہ دُنیا کی فریب آمیز رنگینیوں کا دوبارہ تجربہ کرے ورنہ بہت سی چنگاریاں تھیں - جو اس کے دامن صبر و استقلال کو جلا ڈالنے کے لئے صرف ذرا سی توجہ کی منتظر تھیں مگر عزیز کا دامن خلوص پہلے ہی نذر آتش ہو چکا تھا اور ریحانہ کی جھوٹی محبت کے شعلوں نے اُسے خاکستر بنا دیا تھا -

ایک دن شام کو عزیز ٹہلنے باہر گیا اور واپس آتے آتے اُس کو بخار آ گیا، رات ہی رات میں طاعون کی تمام علامات نمودار ہو گئیں شہر میں اس ظالم بیماری کے ہاتھوں جو تباہی و بربادی ہوتی تھی عزیز اس سے ناواقف نہ تھا - اِس لئے یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ یہ مرض، مرض الموت ہے، اس فیصلہ نے اس کے پہلے فیصلوں کو منسوخ کر دیا - چنانچہ اس نے ایک دستی خط ریحانہ کے پاس بھیجکر لکھا کہ وہ وقت قریب ہے جب موت کا زبردست ہاتھ درمیان میں آ کر میرے اور تمہارے تعلقات کو بالکل منقطع کر دے - اگر ہو سکے تو اپنی آئندہ زندگی کے لئے آ کر مجھ سے مشورہ کر لو - اسی کے ساتھ سکینہ کو تار سے اطلاع دی کہ مجھے طاعون ہو گیا ہے آپ کو بلاتا نہیں صرف دُعا چاہتا ہوں!

شام کو چھ بجے ریحانہ نے زبانی پیام بھیجا کہ ابا جان شکار کو گئے ہیں وہ آ جائیں تو آپ کا خط ان کو دکھا کر اجازت لوں گی اور جو ان کا حکم ہو گا اس کی تعمیل کر دوں گی -

اس جواب کے دو گھنٹہ بعد ایک معمولی ساٹانگہ عزیز کے دروازہ پر رُکا اور ایک بوڑھی عورت سفید چادر اوڑھے ہوئے اس میں سے اُتر کر عزیز کے مکان میں داخل ہوئی - اُس وقت عزیز بالکل بیہوش تھا - اور اس کے چند مخلص احباب قریب بیٹھے ہوئے اس کی بیکسی و تنہائی کی عبرت انگیز مصیبت کو نم آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے - کہ سکینہ نہایت اضطراب اور بیتابی کے عالم میں گرتی پڑتی پردہ کے خیال سے غافل بیہوش عزیز کے پاس پہنچی اور عزیز! ——— میرے چاند! تیرا کیا حال ہے؟ کہہ کر اس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی - پھر عزیز کے منہ پر منہ رکھ کر بولی ——— بیٹا مرنے کے لئے میں ہوں تو نہیں ہے

فرشتوں نے ایک بوڑھی ماں کے زخمی دل کی دنیا کو زیر و زبر دیکھ کر ہیبت سے آنکھیں پھیر لیں - آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی روشنی سکینہ کی دردناک آہوں کی سیاہی میں ماند پڑ گئی اور قضا و قدر کے

احکام یک لرزتے ہوئے بے چین دل کی دعاؤں کے اثر سے بدل گئے۔ ضعیف ناتواں "ماں کا دل" اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود زمین و آسمان کو ہلائے دیتا تھا۔ صبح کو عزیزؔ نے آنکھیں کھولیں تو اس کی پیشانی پر سکینہ کے گرم گرم آنسو ٹپک رہے تھے، اس نے پست آواز میں کہا ——

اماں! تم آگئیں مجھے گود میں لے لو، میں موت سے ڈر رہا ہوں! مگر اس کے ساتھ کسی نے عزیزؔ کے کان میں کہا۔ جس خوش نصیب انسان کے سرہانے یوں رات بھر ماں سجدہ ریز رہی ہو کہ عرشِ اعظم بھی اتنی دیر سرنگوں رہا ہو موت کیوں کر اس کے قریب آسکتی ہے؟

کوثرؔ چاندپوری

غزل

کسی کی آرزو دل میں نہاں معلوم ہوتی ہے
محبت دیدۂ تر سے عیاں معلوم ہوتی ہے

تمہاری جس ادا نے دل اُڑایا ہم غریبوں کا
وہی بن کر قضا پھر جانستاں معلوم ہوتی ہے

میں حیراں ہوں کہ اُلفت کا چھپاؤں راز کس کس سے
مجھے تو ساری دُنیا رازداں معلوم ہوتی ہے

ہزاروں وعدے کر کے وہ مکر جاتے ہیں وعدوں سے
زباں اُن کی رقیبوں کی زباں معلوم ہوتی ہے

ہوا جو بخت برگشتہ زمانہ بھی ہوا دشمن
تمہاری بے رُخی جانِ جہاں معلوم ہوتی ہے

اجل کو موت آتی ہے شبِ فرقت میں آنے سے
مجھے تیری طرح وہ بدگماں معلوم ہوتی ہے

سراسر عشق کا ہنگامہ ہے یہ عالمِ امکاں
جبھی تو زندگی آہ و فغاں معلوم ہوتی ہے

کسی کا ہو کے مرجانا فنا ہو کر بقا پانا
ممات ایسی حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

رُخِ پُرنور کی زینت نے وہ رونق دکھائی ہے
بہارِ جانفزا ہم کو خزاں معلوم ہوتی ہے

غزل سرورؔ کی سُن کر سب کلیجہ تھام بیٹھے ہیں
یہ دردِ دل کی پُرغم داستاں معلوم ہوتی ہے

سرورؔ افغان

خطوط

سلام اے مجھے پھر یاد کرنے والے سلام　　ترے خطوط ہیں محفوظ میرے پاس تمام

ہے محض وہم، تری بدگماں طبیعت کا　　کہ مجھ کو پاس نہیں اب تری محبّت کا

ہر ایک اُنس، ہر اک ربط گو تمام ہُوا　　تعلّقات کا ہر چند اختتام ہُوا

ہے واقعاتِ گزشتہ کا احترام ہنوز　　کہ میرے دل میں بسے ہیں وہ صبح و شام ہنوز

وہ نامہ ہائے محبّت، امینِ راز و نیاز　　وہ تیرے دستِ نگاریں کے نقشِ سحر طراز

تجھے یہ ڈر ہے کسی کو دکھا دیے ہونگے　　وہ راز میں نے فسانے بنا دیے ہونگے

نہیں! نہیں! مرے دیرینہ دوست، آہ! نہیں　　درست تیرا یہ دلچسپ اشتباہ نہیں

خطوط پاس ہیں پڑھنے کا پر خیال کہاں　　مجھے مطالعۂ احوال کی مجال کہاں

کہ اُن کو پڑھنے سے اب میری جان جاتی ہے　　گزشتہ عہدِ محبّت کی یاد آتی ہے

ہیں اُن خطوط میں پنہاں جو واقعاتِ جمیل　　لکھی پڑی ہے جو اُلفت کی داستانِ طویل

جو اتفاق ہوا تو کبھی سناؤں گا
ترے خطوط فقط تجھ کو ہی دکھاؤں گا

عدم

کرنول کے آخری تاجدار

کی حکومت سے بیدخلی کے اسباب

کرنول کے شاہی خاندان کا بانی داؤد خاں نامی شخص تھا جس کو شہنشاہ دلی بہادر شاہ یا شاہ عالم اول نے ۱۷۱۰ء میں دکن کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ ادھونی، پاکوڑہ، نلدرگ، تمونی اور موجودہ ضلع کرنول کا پورا علاقہ صوبہ دار موصوف کی ذاتی جاگیر میں داخل تھا۔ داؤد خاں کے انتقال کے بعد جاگیرات کا یہ پورا علاقہ ایک چھوٹی سی حکومت میں تبدیل ہوگیا۔ جس کی نگرانی مرحوم کے حقیقی بھائی ابراہیم کے ذمہ تھی۔ ابراہیم کا خاندان قریب ڈیڑھ سو صدی کے اس علاقہ پر حکمراں رہا اور آخری نواب غلام رسول خاں سے حکومت چھین کر حکومت برطانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

اس خاندان سے حکومت کے چھن جانے کی تاریخ عجیب و غریب ہے اور ایک نقاد کی توجہ اپنی طرف خاص طور پر مبذول کراتی ہے۔ جاگیر یا حکومت مذکورہ کے الحاق کے واقعات کچھ اس طرح کے واقع ہوئے ہیں کہ ایک مورخ ان کے یاد رکھنے پر مجبور ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ حکومت برطانیہ کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ دیسی ریاستوں کے ساتھ اپنے معاملات کو نہایت صبر و استقلال کے ساتھ، رحم اور عام پسند صلح کے پیرایہ میں ختم کر دے۔ لیکن کرنول کے آخری حاکم کے ساتھ برطانوی حکومت کا سلوک روادارانہ نہیں بلکہ ان کی عام پالیسی کے بالکل برعکس تھا یعنے اس سلسلے میں جو بھی کارروائی کی گئی نہایت ہی عجلت اور سرسری انصاف کے ساتھ۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ جب کسی کو اہم ترین معاملات سے سابقہ پڑتا ہے تو ان پر غور کرنے یا اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس شخص کا فرض ہے کہ واقعات متعلقہ سے پوری طور پر واقفیت حاصل کرلے ورنہ اس کا فیصلہ کسی عنوان فیصلہ کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ حسب ذیل بحث کا مقصد اصل موضوع کو ان تمام الجھنوں سے آزاد کرانا ہے۔ جو متعدد قسم کے مختلف الرائے بیانات اور خود غرضانہ نمائندگی کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام حالات کو باریک بین حضرات کے روبرو پیش کر دیں اور دیکھیں کہ ان حقائق کے ظاہر کر دینے سے ہماری موجودہ مہربان حکومت کس حد تک اپنے پچھلے کارناموں سے متاثر ہوتی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ۱۸۳۸ء میں حکومت برطانیہ کے خلاف "وہابی فرقہ" کی ایک سرگرم سازش کی خبریں گشت لگا رہی تھیں۔ اس سازشی جماعت کے خلاف ایک اور جماعت تھی جس کی سرکردگی نواب کرنول کا بھائی احمد خاں کر رہا تھا۔ اس شخص نے نواب سے متعلق کئی ایک جھوٹی خبریں حکومت تک پہنچا دیں، تاریخ کرنول میں انقلاب پیدا کرنے والی دراصل یہی ایک تحریک تھی، اس وقت کی مدراس کی حکومت بلا سوچے سمجھے اور بغیر اس امر کے دریافت کئے کہ مخبر کے اخلاق و عادات کیسے ہیں اور نواب کی سنی سنائی بدراہی کی حقیقت کیا ہے، انصاف کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اپنے طرز عمل کو نبھانے کے لئے حکومت نے نواب پر چند مکروہ الزامات عائد کئے اور انہیں اس امر کا ملزم قرار دیا کہ وہ چند ایسی اسکیمیں تیار کر رہے تھے جو برطانوی قوت کے مقابلے کے لئے تصور کی جا سکتی تھیں، مثلاً فوجی ساز و سامان کا ضرورت سے زیادہ مہیا کرنا اور برطانوی رعایا مقیم کرنول کے ساتھ نواب کی بدسلوکی اور انہیں تکالیف پہنچانا۔ تیسرے یہ کہ حکومت برطانیہ نے کرنول کی حکومت سے متعلق چند اصلاحات کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ لیکن حکومت کرنول نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

نواب پر ایک یہ بھی جرم عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بہت زیادہ مظالم کئے ہیں اور عیاشی میں پڑ کر حکومت کا نظم و نسق خراب کر دیا ہے۔ الحاصل حکومت برطانیہ نے نواب کو ان تمام بدتمیزیوں کا مرتکب پایا جس کا حوالہ لارڈ ولزلی کے خط بنام نواب الف خاں

مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۰۲ میں موجود ہے۔

"مختصر یہ کہ ان واقعات اور مخبریوں کی جانچ پڑتال کے لئے حکومت کی جانب سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ارکان مسٹر بلین (Mr. Blane) سیولین اور مسٹر اسٹیل (Mr. Steel) معتمد افواج حکومت سندھ تھے۔ اس کمیشن کا اہم کام یہ تھا کہ مذکورہ بالا واقعات کی صداقت کی تحقیق کرے اور ان مختلف خبروں کے ثبوت میں کافی شہادتیں فراہم کرے۔ اس کمیشن کی امداد اور نواب کو خوف زدہ کرنے کے لئے ملادی سے فوج کا ایک دستہ کرنل ڈائس کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا۔ کمیشن کو حکومت نے یہ اختیار دے رکھا تھا کہ نواب کی سلطنت کو عارضی طور پر اپنے قبضہ میں کرلے، اگر نواب نے اطاعت سے انکار کیا یا قلعہ حوالہ کرنے میں تساہل برتا یا حقیقی واقعات کی تحقیقات میں مدد نہیں دی یا کمیشن اور فوج کو قلعہ میں داخل ہونے سے باز رکھا تو کمشنروں کو پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ کمپنی کی جانب سے نواب کی پوری جائداد ضبط کرلیں۔"

ان حالات اور ان ارادوں کے ساتھ شاہی کمیشن کرنول کو روانہ ہوا، ہم کمیشن ہی کی رپورٹوں سے معلوم کرسکتے ہیں کہ نواب نے کس حد تک دوستانہ تعلقات کا خیال رکھا تھا۔ گویا موجودہ نواب نے اپنے آباء اجداد کی ان روایات کو قائم رکھا جو معزز کمپنی اور حکمرانان کرنول کے مابین خوشگوار دوستانہ تعلقات پر مبنی تھے، انہیں رپورٹوں سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ نواب نے بحیثیت ایک نائب حکمران کے کس حد تک ان شرائط کا پاس و لحاظ رکھا اور اس کو کس حد تک اپنے مفاد کا خیال تھا یا یہ کہ برطانوی حکومت کے کمشنروں کا نواب نے جس طرح استقبال کیا ہے۔ اس کی کیفیت خود کمیشن کی رپورٹ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۸۳۹ء ۱۲۴ میں حسب ذیل طریقہ پر درج ہے:-

"قلعہ کے دروازہ سے نواب کے محل تک دو طرفہ رستے مختلف قسم کی فوجوں سے آراستہ تھے، ان رستوں سے جیسے جیسے ہمارا گزر ہو رہا تھا فوجیں سلامی دے رہی تھیں۔ جب ہم دیوان خانہ کے قریب پہنچے تو خود نواب ہمارے استقبال کے لئے کچھ دور تک چل کر آگے آگئے، اور ہم دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہماری مقررہ نشستوں تک لے گئے۔ رسمی تعارف کے کچھ دیر بعد ہم نے حکومت برطانیہ کا خریطہ نواب کی خدمت میں پیش کیا جس کو نواب نے بڑے ادب واحترام کے ساتھ قبول کیا۔ وہ یہ محسوس کررہے تھے کہ خریطہ بھیج کر گورنر بہادر نے ان کی عزت افزائی کی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہم سے لارڈ صاحب کی مزاج پرسی کی ہمارے قیام کے دوران میں مختلف موقعوں پر نواب نے کمپنی سے اپنی وفاداری اور ماتحتی کا اقرار کیا اور اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ وہ بچپن سے عہدہ داران کمپنی ہی کی نگرانی میں پلے پھولے ہیں اس اعتبار سے بھی کمپنی کی فرماں برداری ان کا اہم ترین فرض ہے۔ جب ہم وہاں سے چلے ہیں تو نواب نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جیسا کہ ہمارا استقبال کیا گیا تھا۔ ہمارے قیام کے دوران میں ہر وقت ہم نے یہ محسوس کیا کہ نواب بظاہر بھی کمپنی سے بہت خوفزدہ ہیں اور ہر موقعہ پر ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ ہم کو پورے احترام کے ساتھ دیکھیں اور ہماری نظروں میں نیک نام ٹھہریں۔"

کمیشن کی آمد کے دوسرے ہی دن نامدار خاں نے کمشنروں سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ نواب کے احکام کی تعمیل میں یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ نواب نے گورنر کا خط مورخہ ۱۲ راگست ۱۸۹۳ء بنام خود بہ غور اور پوری احتیاط کے ساتھ پڑھا اور اس کے مفہوم کو بخوبی سمجھا ہے اور وہ کمپنی کے ہر مطالبہ کی تعمیل کے لئے تیار ہیں، جس کی تصدیق کمیشن کی رپورٹ نمبر ۱۲۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۳۹ء ضمن ۳ اور ضمن ۷ رپورٹ نمبر ۱۲۶ مورخہ ۲ راکتوبر ۱۸۳۹ء سے ہوسکتی ہے۔

"نواب نے حکومت برطانیہ پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے بغیر کسی شش وپنج کے اپنی پوری جائداد کے ساتھ پایہ تخت کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے ڈیرے شہر کرنول اور قلعہ سے باہر زوراپور میں ڈالے گویا انہوں نے خود بخود قلعہ اور پورے ضلع کرنول کا قبضہ اٹھا دیا، محض اس امید پر کہ حکومت برطانیہ منصف مزاج ہے۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہی تھا کہ گورنر کی خواہش کے مطابق تحقیقات ہونے تک وہ شہر کے باہر رہیں گے۔ ان کے ہٹتے ہی حکومت برطانیہ نے قلعہ کرنول پر اپنا قبضہ جمالیا۔"

چنانچہ اس طرح کمشنروں نے بلا کسی دقت کے قلعہ پر اپنا قبضہ جمالیا، اس کے بعد انہوں نے کمپنی کے حکم کے مطابق نواب پر عائد کردہ الزامات کی تحقیقات شروع کی، اور آخر میں اپنے کارنامہ کی ایک رپورٹ لکھی جس کے نتیجہ کی بنا پر نواب کو ان تمام ذمہ داریوں اور الزامات سے بری کردیا گیا جو ان پر عائد کئے گئے تھے، سرکار کمپنی نے نواب پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا تھا کہ وہ حکومت کمپنی کے خلاف سازش کرنے کے خیال سے بارود گولی اور اسلحہ جمع کر رہے ہیں لیکن کمیشن اس

بات کے ثابت کرنے سے قاصر رہا اور اپنی رپورٹ میں لکھ دیا کہ نواب نے اسلحہ کا ذخیرہ جمع تو کیا ہے لیکن اس کا مقصد کسی قسم کی سازش وغیرہ نہیں تھا بلکہ نواب کو ان چیزوں کے فراہم کرنے کا شوق ہے جو جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے اس کے استدلال کے طور پر کمیشن نے بعض اور چیزوں کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا کہ اسلحہ کی طرح نواب کو دوسری چیزوں کے بھی جمع کرنے کا ویسا ہی شوق ہے، کمیشن کی رپورٹ کے چند جملے نمونہ کے طور پر ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

"ہمارے کرنول جانے سے پیشتر نواب کے دماغ کی جو کیفیت بیان کی گئی تھی۔ اس کی پوری پوری تصدیق نواب سے ملاقات کرنے پر ہو گئی۔ اس کی عادات و حرکات بالکل ان واقعات کے مطابق ہیں جو پہلے ہم سے بیان کئے گئے تھے۔"

"ہم نے یوں تو بہت سے خود غرضوں کو دیکھا ہے لیکن نواب کے جیسا خود غرض شخص شاید ہی دیکھنے میں آیا ہو، جس کے چہرہ سے سراسر خود غرضی ٹپکتی تھی اور اس کے ہر فعل سے خود غرضی کی بو آتی تھی، تحقیق کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ خود غرضی اور پگلاپن اس کے خاندان کی دو خصوصیتیں ہیں جو ورثہ میں چلی آ رہی ہیں۔"

"جنگ کی غیر معمولی تیاری جس کے لئے اس نے اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کر رکھا تھا محض پگلے پن کی دلیل ہیں، اس لئے کہ جنگ کب اور کس سے ہوگی اس کا جواب خود نواب کا ضمیر تک نہیں جانتا۔"

"نواب کے متعلق جو بیانات پہلے دئے گئے ہیں اور ہماری ملاقات کے دوران میں ہم نے اس کی عادات و اطوار کا جس قدر بھی غائر مطالعہ کیا ہے اگر یہ سب کچھ واقعیت پر مبنی ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ نواب کی ذات پر کسی قسم کی بداخلاقی کا جرم عائد نہیں کیا جا سکتا، بالفاظ دیگر اس کی ہر حرکت کو معصومیت پر محمول کرنا چاہیئے۔"

"نواب نے اس امر کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی فوج کا ایک بیڑا بحر ہند سے بحیرہ اٹک کو روانہ کیا جائے اور پوری فوج کا آب دوانہ ساتھ کر دیا جائے لیکن خود اس کے فوجی عہدہ داروں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ ایک ایسے خبطی النسان کے ارادہ کا کیا حشر ہوگا جس کے منصوبوں میں کسی قسم کا استقلال نہ ہو چنانچہ نواب کا یہ خیال ایک ہوائی قلعہ سے زیادہ ثابت نہ ہوا۔"

بعض ذرائع سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ نواب بازی کے مرغوں کو جواہر کے گہنے پہناتا تھا اور ان کے پنجرے اس کے بستر کے بازو اور اطراف دہرے رہتے تھے، اور پیسے کو پانی کی طرح اس لئے بہاتا تھا کہ ایک فقیر نے اس کو کیمیا کی کامیابی کے دھوکے میں رکھا تھا۔ ایک دفعہ اس کے سر میں یہ بھی سودا سما گیا تھا کہ نبوّت کا دعویٰ کر بیٹھے لیکن یہ دیوانہ پن دیرپا ثابت نہ ہوا۔ اس کے بعد اس کو خیال پیدا ہو گیا کہ وہ بہت بڑا حکمران ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک شبیہہ خاص طور پر تیار کروائی۔ جس کے چہرہ کے اطراف سورج کی کرنیں تھیں۔ اس فعل سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ یا شہنشاہ ہے گویا یہ تمام افعال اس کے پاگل پن کی دلیل تھے۔"

اس تحقیق میں سب سے اہم چیز نواب کا ظلم و ستم اور بداخلاقی تھی جس کا کمیشن کو کوئی ثبوت نہ مل سکا اور اس میں وہ ناکام رہا۔ برطانوی حکومت کے مقابل میں نواب نے نہ کبھی جنگ کی اور نہ وہ اس قسم کا ارادہ ہی رکھتا تھا اس رپورٹ سے ہمیں نواب کی جو بھی برائی کا پتہ چلتا ہے صرف یہی کہ وہ ایک مستقل مزاج، اپنی دُھن کا پکا اور تلوّن مزاج آدمی تھا، حکومت کی لگام بعض نااہل اور خود غرض عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھی جو اپنی ناعاقبت اندیشی سے رعایا پر آئے دن ظلم کرتے رہتے تھے، اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نواب کی عیاشی اور طمطراق کے باعث سلطنت کا نظم و نسق بہت بُری حالت میں تھا اور یہ بدنظمیاں اس وقت روا ہیں جب خود حکمران مجنون صفت النسان ہو۔ یہ امر بلاشبہ حقیقت پر مبنی ہے کہ نواب غلام رسول خاں حکومت کرنے کے قابل ہرگز نہیں تھا وہ سلطنت سے بے تعلق کر دیا گیا تھا اور اس کا گدّی سے اُتار دیا جانا بالکل واجبی تھا، اس وقت کی حکومت کا یہ فعل اگر محض اسی نقطۂ نظر سے ہوتا تو کسی کو اعتراض کی کبھی گنجائش نہ پیدا ہوتی۔ لیکن اس کی آڑ میں کئی ایک خود غرضیاں بھی پوشیدہ تھیں جن کو حکومت برطانیہ نے بڑی پالسی کے ساتھ نبھایا۔ بہرحال ان جھوٹ سچ واقعات کی بنا پر نواب کو تخت سے ہٹا کر ترچناپلی روانہ کر دیا گیا۔ جہاں حکومت برطانیہ کی سخت ترین نگرانی میں رہنے کے باوجود وہ اپنے ہی آدمیوں میں سے ایک کے ذریعہ قتل کر دیا گیا۔ نواب کے انتقال کے بعد اس کے ورثار کے نام وظیفے جاری ہوئے جن کی جملہ مقدار رقم ۲ لاکھ ۲۲ ہزار ۶ سو ۵۱ روپے سالانہ تھی جس میں صرف ۸۱ ہزار روپے نواب کے بالکل قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کئے گئے جن میں نواب کے چار لڑکے، پانچ لڑکیاں، چار بیوہ بیگمات، اور ۶۳ بیسوائیں تھیں۔ الحاصل نواب کرنول کے واقعات اور ان کا فیصلہ نہایت ہی بے رحمی پر مبنی ہے۔

اس لئے کہ نواب کو ناکردہ گناہوں کی سزا جبریہ طور پر بھگتنی پڑی اور آخر وقت تک اس کو سختیوں اور مختلف قسم کے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تکالیف صرف اس پر ختم نہ ہوئیں بلکہ اس کے اثرات مرحوم نواب کی آئندہ نسلوں پر بھی مترتب ہوتے رہے۔

اس طریقہ کار کی بجائے حکومت برطانیہ کے لئے فیصلہ کی بہتر صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ نواب کے ساتھ یہ سلوک روا رکھتی کہ اس نے برطانوی حکومت کے لئے جو امدادی فوج رکھی تھی اس کو برخاست کرکے نواب کی فوجی قوت کو توڑ دیا جاتا جس سے نواب کے اختیارات اور عمل میں ایک بڑی حد تک کمی واقع ہوجاتی، یا اس کو ایک معمولی زمیندار یا جاگیردار کی حیثیت سے رکھا جاتا یا بطور جرمانہ کے اس کی سالانہ پیش کش میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا جاتا۔ ان امور کے علاوہ ایک اور صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ نواب کو تخت سے اُتار کر اس کے لڑکے یا خاندان کے کسی اور قابل فرد کو تخت پر بٹھا دیا جاتا۔ حکومت یہ بھی کرسکتی تھی کہ ایسے شخص کو اس شرط کے ساتھ گدّی پر بٹھائے کہ وہ بعد میں چل کر اپنے آپ کو سلطنت کا اہل ثابت کرے، حکومت کے اس طرز عمل سے کم از کم یہ ہوتا کہ رعایا میں حکومت سے متعلق عام طور پر بدظنی نہ پھیلتی، ہماری نظر میں حکومت کے لئے یہ آخری طریقہ بہترین تھا۔ چنانچہ حکومت نے حال میں بیگن پلی اسٹیٹ کے ساتھ وہی آخری طریقہ کار اختیار کیا جو فی الواقع انصاف پر مبنی ہے لیکن نواب کرنول کے ساتھ حکومت برطانیہ کا جو برتاؤ رہا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ .. .. وہ برطانوی پالیسی اور ہندوستانی مفاد کے بالکل خلاف تھا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ حکومت ہر کام کو بہت تیزی کے ساتھ انجام دینا چاہتی تھی جس سے اس کا اصل مقصد مرکزی حکومت سے دیسی ریاستوں کا الحاق تھا۔ ایک کم زور رئیس کو دیکھ کر اس نے اپنی کارروائی کی ابتدا کرنول ہی سے کی۔ کرنول کی حکومت اگرچہ مقامی حکومت تھی لیکن وہ بجائے ... خود ایک خود مختارانہ حیثیت رکھتی تھی، والی کرنول کے ساتھ حکومت کا سلوک کسی عنوان نظر استحسان سے نہیں دیکھا گیا۔ معزز ارکان کمپنی ڈائرکٹرس، فوجی بورڈ اور کمشنروں کی سفارش کو اس وقت کی برطانوی حکومت نے بالائے طاق رکھ دیا۔ اور نواب کے معاملات میں ذرّہ برابر رعایت سے کام نہ لیا۔ ان تمام سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے معزز ارکان نے مراسلہ نشان ۱۵ ضمن ۴۲ مورخہ ۹ ۱۸۳۹ء کے ذریعہ حکومت وقت کے فیصلہ کو مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

" اگر وہ واقعی پاگل ہے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی کہ اس کی بدبختی کے سبب اس کی آئندہ نسلوں کو بھی سزا دی جائے اور اگر وہ دیوانہ نہیں ہے جیسا کہ ہم اب تک سمجھے ہیں تو پھر یہ بات قابل ثبوت رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس سزا کا مستحق ہے جیسا برتاؤ اس کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔"

اس مراسلہ میں آگے چل کر لکھا ہے کہ :-

"اب کسی قسم کی مزید سختی اس پر نہ ہونی چاہئیے۔ سوائے اس کے کہ نواب کا کوئی معقول گناہ ثابت نہ کیا جائے یا کسی اہم ضرورت کے مدّنظر جب تک کہ اس قسم کے مقدمہ کو بروئے کار نہ لایا جائے۔"

یہ امر خود کمشنروں کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ نواب ایک کم زور دماغ کا آدمی تھا اسی وجہ سے اس کا ہر فعل پاگل پن کی دلیل تھا۔ لیکن اس کے باوجود کمیشن یہ ثابت نہ کرسکا، کہ آیا نواب نے سابقہ رپورٹوں کے مطابق اپنی رعایا اور رشتہ داروں کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ اور یہ کہ اس کا چال چلن اخلاقی حالت سے بہت ہی گرا ہوا تھا۔ نہ ہی یہ بات کہ اس نے کبھی کوئی جنگ نہیں کی اور نہ اس کا ارادہ ہی تھا۔ کہ اپنے حلیف یعنے برطانوی حکومت کے ساتھ کوئی جھگڑا کرے چنانچہ یہ بات کمیشن کی مندرجہ ذیل رپورٹ نمبر ۱۲۳ ضمن ۳۲ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۳۹ء سے بخوبی واضح ہو جائے گی۔

"اس تحقیقات کے آخری حل طلب مسئلہ کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ نواب نے حکومت برطانیہ یا اس کی حلیف سلطنتوں کے مقابل میں جنگ یا اس قسم کی کوئی چھیڑ چھاڑ کرنے کا ارادہ تک نہیں کیا تھا۔ اس واقعہ سے متعلق سرکار کمپنی کو جو بھی رپورٹیں ملی ہیں سب کی سب جھوٹ اور بالکل غلط ہیں، اس لئے کہ نواب کے احکامات کے پورے کاغذات ہمارے دیکھنے میں آئے لیکن کسی تحریر سے بھی اس قسم کا شائبہ تک نہیں گزرا۔ حضور نظام کے علاتی بھائی مبارزالدولہ (جو آجکل نظر بند ہیں) سے نواب کے اکثر خط و کتابت رہا کی ہے۔ لیکن مبارزالدولہ کے خانگی خطوط سے بھی اس قسم کا گمان تک نہیں ہوتا کہ نواب نے انہیں کوئی سازشی خط لکھا ہے یا کسی قسم کی امداد طلب کی ہے یا حکومت برطانیہ یا اور کسی دوسری سلطنت سے جنگ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جوابی خطوط میں ان کی روزمرّہ زندگی کے حالات اور آپس کے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اعتبار

سے ہم پورے یقین کے ساتھ اس سازشی خط کی تردید کر سکتے ہیں کہ رزیڈنٹ مقیم حیدرآباد نے نواب کا جو خط مبارز الدولہ کے نام تھا اس کو حکومت برطانیہ کے پاس بھجوایا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ فعل ایک خاص سازشی جماعت کی کارگزاریوں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ نواب نے اس مضمون کا کوئی خط مبارز الدولہ یا کسی اور کے نام ہرگز روانہ نہیں کیا۔"

اس کے بعد بھی کمیشن نے ۱۸ر دسمبر ۱۸۳۹ء اور ۷ر فروری ۱۸۴۰ء نمبر ۱۶۳ کے حوالہ سے دو رپورٹیں حکومت برطانیہ کے پاس پیش کی ہیں۔ ان رپورٹوں کے ضمن میں بھی اس واقعہ کی تردید کی ہے کہ نواب نے کسی قسم کی سازشی تحریر کسی شخص کے نام بھی روانہ کی تھی۔ (بحوالہ کرنول اسے مونوگراف صفحات ۲۶ و ۲۷)۔

ہمارے خیال میں اس وقت کی حکومت کو نواب کرنول سے متعلق جو بھی شبہات پیدا ہوئے شاید "وہابی بغاوت" کا نتیجہ ہوں۔ ان باغیوں کا کوئی مستقل مزاج سردار موجود نہیں تھا۔ حکومت ایسی کمزور تو نہیں تھی کہ اس بغاوت کی شورش کو نہ مٹا سکے اور سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ خود نواب کرنول کا اس ہنگامہ میں کوئی ہاتھ نہ تھا اس طرح باغیوں کی حالت بہت ہی نازک تھی جن کا سر نہایت ہی آسانی سے کچل دیا جا سکتا تھا۔ آگے چل کر نواب کو جو بے جا سزائیں بھگتنی پڑیں اس کا سبب شاید یہ ہو کہ بغاوت نواب کے ملک میں ہوئی تھی اس لئے حکومت نے غلام رسول خاں اور اس کے ورثا کو جلا وطن کر کے پوری جائداد سے محروم کر دیا۔ مشرقی ممالک میں یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اس لئے کہ اس سے پیشتر بھی مختلف ممالک میں بالکل اس قسم کے ناجائز واقعات عمل میں آ چکے تھے۔ چنانچہ اسی قسم کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علاقہ کرناٹک میں امن و امان قائم کرنے اور وہاں کے محاصل حاصل کرنے میں معزز سرکار کمپنی کو کن کن دقتوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ نواب غلام رسول خاں کے بعد رعایا نے عہدہ داران کمپنی کو کیا کیا تکلیفیں نہیں پہنچائیں، کمپنی یا عوام نے نواب غلام رسول خاں کے دور حکومت میں وہابیوں کی گڑبڑ کو جو بغاوت کے نام سے تعبیر کیا ہے اگر وہ حقیقت میں بغاوت تھی تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بغاوت بہت ہی معمولی ہنگامہ کا نام ہے۔ اگر اس شورش کو بغاوت کا نام دیا جائے تو اودھ، ماکجو یا اس قسم کے اور ہنگاموں کو کس نام سے یاد کیا جائے گا ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت کمپنی کرنول کے الحاق کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہی تھی اس کو یہ موقع اتفاق سے ہاتھ آگیا اور اس نے اپنے دل کی مراد نکال لی۔

کمیشن نے نواب کو ان تمام الزاموں سے بری کر دیا جو بلاوجہ نواب پر عائد کئے گئے تھے۔ اسلحہ اور بارود گولی کی خفیہ فراہمی کا ایک ایسا الزام تھا جس سے نواب کسی طرح نہ بچ سکا۔ اس الزام کی اصلیت پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ایک معاہدہ کی رو سے نواب پر ضروری تھا کہ اپنے ملک کی حفاظت اور وقت ضرورت کمپنی کو مدد دینے کے لئے سوار اور پیادوں کی ایک معیّن فوج ہر وقت تیار رکھے، لارڈ ولزلی کے خط مورخہ ۲۲ر جولائی ۱۸۰۲ء سے واضح ہو جائے گا کہ کمپنی نے کس حد تک فوج جمع کرنے کے لئے نواب کو مجبور کیا تھا۔ ذیل میں ہم اس خط کا اقتباس درج کرتے ہیں :۔

علاقہ دکن کے حالات حاضرہ کے مدِّنظر میں
آپ کو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ اپنی نگرانی میں
ایک ایسی فوج ہر وقت تیار رکھیں جو ضرورت کے وقت
انگریزی حکومت کی مدد کرے گی اور ہماری ہدایات کے
مطابق اس فوج کا ساتھ دینا ہوگا۔ مجھے کامل اطمینان
ہے کہ آپ کی فوج ہر طرح سے مسلح رہے گی۔"

(باقی آئندہ)

غلام محمد خاں (عثمانیہ)
حیدرآباد دکن

رباعی

دشوار ہے دہر میں مظفر ہونا　　اسبابِ دلاوری میسر ہونا
اک جامِ شرابِ ارغوانی پی لے　　وہ شخص جو چاہتا ہو خاور ہونا

(ترجمہ)　　**یزدانی**

نوبادۂ ساغر

ساقی نہیں، ساغر نہیں وہ جام نہیں ہے
میخانے کی اگلی سحر و شام نہیں ہے

مرنا رہِ الفت میں کوئی کام نہیں ہے
آغاز ہے آغاز یہ انجام نہیں ہے

اک کیفِ مسلسل ہے تری نیم نگاہی
آغاز یہ شرمندۂ انجام نہیں ہے

اس کارگہِ شوق کے آئین نہ پوچھو
وہ پختہ نہیں ہے جو یہاں خام نہیں ہے

کیا حُسن سے اب رشتۂ باقی بھی ہُوا قطع
کیوں سلسلۂ نامہ و پیغام نہیں ہے

یہ حُسن کی ضد دیکھ کہ اوراقِ کرم کیا؟
فہرستِ ستم میں بھی مرا نام نہیں ہے

دُنیا ہی نہیں عکسِ دو عالم نظر آتا
زاہد ترے ہاتھوں میں مرا جام نہیں ہے

مستی مری خود ہے مری لغزش کا سہارا
ساقی کا کرم بھی نہیں اس وقت گوارا

بازی گہِ ہستی میں مری چال نہ پوچھو
اُلفت کا کھلاڑی کبھی جیتا، کبھی ہارا

آسودۂ ساحل سے کوئی بڑھ کے یہ کہہ دے
ساحل ہی نہیں موجِ رواں بھی ہے کنارا

ساغر کبھی پینے سے نہ چوکے ہیں نہ چوکیں
گنگا کا کنارا ہو کہ کوثر کا کنارا

ساغر نظامی

فلسفۂ محبّت

ولؔ (W a l l) بچپن سے ایک مِل پر کام کرتا تھا۔ مِل کے مالک نے اس کو متبنّیٰ بنالیا۔ مِل کے علاوہ اس کے یہاں ایک چھوٹی سی سرائے تھی جس میں مسافر آکر ٹھہرتے تھے۔ مِل والے کے مرنے پر ولؔ بحیثیت وارث کے تمام ترکہ کا مالک قرار پایا۔ مندرجہ ذیل حصّہ مضمون کی ابتدا یہیں سے ہے!

(۱)

کچھ مدت کے بعد عمر رسیدہ چکّی والے کا انتقال ہوگیا اور اُسی موسم سرما میں اُس کی بیوہ کی بھی موت واقع ہوئی۔ ولؔ نے اپنے مقدور بھر اُن کی تجہیز و تکفین کی اور خاموشی کے ساتھ اُن کا ماتم کرلیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب ولؔ تمام سامان فروخت کرکے دریا کے اُس پار جا بسے گا۔ لیکن ولؔ کی طرف سے اس ارادہ کا کچھ اظہار نہ ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس اُس نے چکّی کا کام اور مضبوط کرلیا اور اپنی مدد کے لئے دو ملازم بھی رکھ لئے۔ وہ اپنے گردونواح میں ایک "وہمی" مشہور تھا۔ اس لئے کہ اُس کا دماغ ہمیشہ سے توہمات کا مسکن تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پادری کی لڑکی مارجری سے اُس کا ارتباط و اخلاص بڑی تعجب کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مارجری کی عمر تقریباً انیس ۱۹ سال تھی۔ جبکہ ولؔ تیس ۳۰ سال کا تھا۔ مارجری قبول صورت اور تربیت یافتہ تھی۔ اُس کا سر ہمیشہ بلند رہتا تھا۔ اور اُس نے کئی نوجوانوں کی شادی کی درخواست کو مسترد بھی کردیا تھا۔ جس وجہ سے لوگ اسے "سنگدل حسینہ" کہتے تھے۔

ولؔ کبھی اُس سے خصوصیت کے ساتھ نہیں ملا تھا۔ حالانکہ گرجا اور اُس کے مکان کا فاصلہ مشکل سے دو میل ہوگا اور ہر اتوار کو گرجے جانا اُس کا معمول بھی تھا۔

اتفاقاً پادری کے مکان کا کچھ حصّہ گر گیا۔ جس کی مرمت کی وجہ سے اُن کو مکان خالی کرنا پڑا اور ایک مہینہ کے لئے کسی دوسری جگہ اقامت کرنے کے لئے اُن کو مکان کی جستجو ہوئی۔ ولؔ نے واجبی کرایہ پر اُن کو اپنی سرائے میں جگہ دے دی۔

ولؔ علاوہ چکّی کے ایک سرائے کا مالک اور ملّر کے تمام ترکہ کا وارث تھا۔ اس لئے لوگوں کا یہ خیال کہ پادری نے اپنا عارضی قیام بغیر کسی مقصد کے نہیں کیا، کچھ غلط نہ تھا۔ لیکن ولؔ ہی شاید وہ آخری شخص ہو جس کو شادی کے قید و بند میں جکڑا جا سکتا تھا۔ ولؔ کے چہرہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی کہ اُس کی آنکھوں میں دل کی گہرائیوں سے ایک روشنی آتی ہے، جو حوض کے پانی کی طرح ان کو چمکا رہی ہے۔ نیز یہ کہ وہ اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اور جو تہیّہ وہ ایک دفعہ کرلیتا ہے، اُس سے وہ کبھی نہیں ہٹتا۔

مارجری بھی ضعیف طبیعت عورت نہ تھی۔ اُس کی آنکھوں سے استقلال، عزم اور خاموشی ٹپکتی تھی۔ ممکن ہے وہ ولؔ کے مقابلہ میں کم صاحبِ عزم و استقلال ہو۔

(۲)

ابھی موسم کا آغاز تھا اور ولؔ کی سرائے میں اکّا دکّا ہی مسافر نظر آتا تھا۔ موسم ملائم تھا اور ولؔ مع اپنے مہمانوں کے صحن ہی میں کھانا کھاتا۔ دریا کا شور، جنگلوں کی سنسناہٹ، پرندوں کے نغمے اُن کے کانوں تک پہنچتے۔ ولؔ کو اس مہمان نوازی میں ایک خاص لطف آنے لگا تھا۔ پادری ایک مجہول الکیفیت انسان تھا۔ وہ میز پر بیٹھ کر غنودگی کے عالم میں پہنچ جاتا اور کوئی مفید، غیر مفید بات اُس کی زبان سے نہ نکلتی۔ لیکن مارجری کی ہر بات سے اُس کی قابلیت اور ذہانت کا پتہ چلتا۔ ولؔ نے مارجری کے متعلق ایک بلند خیال قائم کیا۔ جب وہ میز پر آگے کو جھکتی تو ولؔ اُس کا چہرہ دیکھتا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک ہوتی۔ اُس کے بال روشنی میں چمک اُٹھتے۔ اُس کے سُرخ لبوں پر تبسم کھیلتا نظر آتا۔ ولؔ اُس کو اکثر گھورتا ہوا دکھائی دیتا۔ مارجری اپنے خاموش ترین لمحات میں بھی پیکرِ حیات معلوم ہوتی۔ سر سے پاؤں تک زندگی کی لہر اُس میں دوڑتی ہوئی نظر آتی۔ یہاں تک کہ دُنیا کے تمام جاندار اُس کے مقابلہ میں بے زلیت نظر آتے۔ ولؔ جب مارجری سے نظر ہٹا کر اُس کے ارد گرد دیکھتا۔ تو درخت اُس کو بے حس اور مردہ نظر آتے۔ اور بادل آسمان میں مردہ اجسام کی طرح لٹکے ہوئے دکھائی دیتے۔ یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی بے کیف معلوم ہوتیں۔ تمام وادی کی فضا اس ایک لڑکی کے

مقابلہ میں ہیچ اور بے کیف تھی۔

ول اپنے مشاہدات کی وجہ سے بھی مشہور تھا۔ اور مارجری کے معاملہ میں اُس کے مشاہدات اس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ وہ ہر اس لفظ کو جو مارجری کی زبان سے نکلتا غور سے سنتا اور ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا۔ بہت سی سادہ اور پُرخلوص باتیں اُس کے کانوں میں گونجتی رہتیں۔ اُس کے جسم میں ایک ایسی روح ساری تھی۔ جو خواہشات اور نفرت سے پاک اور محبت سے لبریز تھی۔ وہ مارجری کی شکل کو خیالات سے جدا نہیں کرسکتا تھا۔ اُس کی گول کلائی، اُس کی مترنم آواز، اُس کی آنکھوں کی روشنی، اُس کے جسم کی رعنائی، اس پر ترنم ریز لہجہ گویا ایک سحرکار مغنیہ تھی جو جملہ لوازمات سے آراستہ تھی۔ اُس کی موجودگی ول کو عہد ماضی کی یاد دلاتی تھی جبکہ وہ بچہ تھا۔ پانی کی روانی، طلوعِ سحر، لالہ و بنفشہ کی شگفتگی، یہ بچپن کے خیالات اور اب مارجری کا وجود اُس کے دماغ میں ایک حشر برپا کرتا تھا۔

(۳)

ایک رات کھانے کے بعد ول باغ میں چہلقدمی کر رہا تھا۔ رنگینی فضا میں محو ہوکر اُس نے مسکرانا شروع کیا۔ دریا کا پانی پتھروں سے ٹکرا کر بہہ رہا تھا۔ کہیں جنگل میں دور کوئی پرندگیت گا رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی آج بہت بلند نظر آرہی تھی۔ وہ ٹہلتا ہوا ایسی بلندی پر جا پہنچا جہاں سے نشیبی میدان صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر خوشگوار خیالات میں محو ہوگیا۔ میدان اپنی آغوش میں خوبصورت شہر اور ایک نقرئی دریا لئے ہوئے تھا۔ ہر ایک چیز خاموش اور سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بجز چند پرندوں کے جو فضا میں چکر لگا رہے تھے۔ اُس نے زور سے "مارجری" پکارا، اور صدائے بازگشت نے اس کے کانوں کو نغمہ سے بھر دیا۔ اُس نے آنکھیں بند کیں، مارجری کا خوبصورت مجسمہ اُس کے سامنے تھا۔ دریا بہتا رہا۔ پرندوں کی پرواز کی آواز بلند ہوئی یہاں تک کہ انہوں نے تاروں کو جا چھوا۔ لیکن اُس کے لئے یہ سب ہنگامہ بے کیف تھا۔

دوسرے روز کھانے کے وقت ول نے اعلان محبت کیا۔

پادری میز کی دوسری طرف بیٹھا ہوا تمباکو سے پائپ بھر رہا تھا۔ "مس مارجری!" ول نے کہا "مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے تم سے زیادہ کسی سے محبت کی ہو۔ میں سرد دل اور نامہربان قسم کا انسان ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میرے پہلو میں دل نہیں۔ بلکہ اپنے عجیب خیالات کی بنا پر، جو مجھے دوسرے لوگوں سے غیر اور اجنبی بنا رکھے ہوئے ہیں اور علیحدہ بھی۔ گویا ایک دائرہ ہے جو میرے اور تمہارے گرد کھنچا ہے۔ اور تمام دنیا اس سے الگ ہے۔ مجھے لوگ ہنستے اور بولتے سنائی دیتے ہیں۔ لیکن تم میرے بالکل قریب ہو۔ شاید یہ بات تمہارے خلافِ مزاج ہو؟" اُس نے استفسار کیا۔

مارجری خاموش تھی۔

"جواب دو" پادری نے کہا۔

"نہیں اس وقت نہیں پادری صاحب" ول نے کہا "میں ان کو جواب کے لئے مجبور نہ کروں گا۔ خود میری زبان خلافِ معمول بند ہے اور وہ تو عورت ہے۔ اتنا کہہ سکتا ہوں اور جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں محبت میں گرفتار ہوں۔ میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے یہ غلط ہو اور اگر مس مارجری کو مجھ سے محبت نہیں تو کیا مہربانی فرما کر وہ انکاری طور پر سر ہلا سکتی ہیں؟"

مارجری خاموش تھی۔ گویا اُس نے سُنا ہی نہیں۔

"اس کی کیا وجہ ہے! پادری صاحب!" ول نے پوچھا۔

"لڑکی کو ضرور جواب دینا چاہئیے" پادری نے پائپ رکھتے ہوئے کہا "مارجری یہ ہمارے ہمسائے ہیں۔ تم سے محبت کرتے ہیں۔ کیا تم کو بھی ان سے محبت ہے۔ ہاں یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے ان سے محبت ہے" مارجری نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے صرف اسی قدر مطلوب ہے" ول نے کہا اور مارجری کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہئیے" پادری نے پائپ منہ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے خیال میں یہ صحیح ہے؟" ول نے پوچھا۔

"یہ لازمی امر ہے" پادری نے کہا۔

"بہت خوب" ول نے جواب دیا۔

(۴)

دو تین دن ول کے لئے مسرت سے بھرے ہوئے پیغام لائے جس کا اظہار ول کے چہرہ سے ناممکن تھا۔ وہ مارجری کے ساتھ کھانا کھاتا رہا اور اس کے باپ کی موجودگی میں اُس سے ہمکلام بھی ہوا لیکن اُس نے کبھی اُس سے تنہا ملنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اپنے طرزِ عمل کو بدلا۔ غالباً لڑکی اس طرزِ عمل سے مایوس ہوئی اور وہ حق بجانب تھی۔ اگر ول کی زندگی میں انقلاب آجاتا تو شاید وہ مطمئن ہو جاتی۔ وہ بدستور دریا کے

کنارے بیٹھتا - ریت، مچھلیوں اور گھاس کو دیکھتا - وہ روشوں پر ٹہلتا - وہ جنگل میں پرندوں کے جھنڈ کے قریب پھرتا - روز صبح سویرے اٹھتا اور آسمان کی سیاہی کو سنہرا ہوتا ہوا دیکھتا اور سورج کی شعاعوں کو پہاڑی چوٹیوں پر رقص کرتے ہوئے دیکھتا - گویا یہ سب چیزیں نئی تھیں - اپنی چکی کی آواز، درختوں میں ہوا کی سنسناہٹ، یہ سب چیزیں کیف انگیز تھیں - وہ اسقدر خوش تھا کہ راتوں بیدار رہتا اور اسقدر بے چین کہ بغیر مارجری کے شاید ہی قرار پایا ہو - لیکن اس پر بھی وہ اس سے بچنا چاہتا تھا اور کبھی اُن کا متلاشی نہ ہوا!

ایک دن جبکہ وہ چہل قدمی سے واپس آ رہا تھا - اُس نے مارجری کو باغ میں پھول توڑتے پایا - وہ اُس کے پاس آیا اور اُس کے ساتھ ٹہلنے لگا -

"کیا تم پھول پسند کرتی ہو؟" وِل نے پوچھا -

"درحقیقت وہ مجھ کو بہت پیارے ہیں" اُس نے جواب دیا "کیا تم بھی پسند کرتے ہو؟"

"کیوں نہیں" وِل نے کہا "لیکن اسقدر نہیں - توڑنے کے بعد وہ بے حقیقت چیز ہیں - میں نے لوگوں کو پھولوں کی قدر کرتے سُنا ہے - لیکن ایسا سلوک کرتے نہیں دیکھا جیسا تم کر رہی ہو -"

"کیسا؟" مارجری نے پوچھا اور وِل کی طرف دیکھا -

"پھولوں کا توڑنا" اس نے کہا "وہ جس جگہ ہیں وہیں زیادہ خوبصورت اور بہتر معلوم ہوتے ہیں - اگر تم اُن کو وہیں رہنے دو" "میں اُن کو اپنانا چاہتی ہوں" مارجری نے جواب دیا "میں اُن کو اپنے دل کے قریب رکھوں گی اور ان سے کمرہ سجاؤں گی - وہ یہاں شاخ پر اُگے ہوئے مجھے بلاتے ہوئے معلوم دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ "آؤ اور ہم سے کھیلو" جب میں اُن کو ایک دفعہ توڑ لیتی ہوں گویا تمام خوبصورتی حاصل کر لیتی ہوں اور پھر اطمینانِ قلب کے ساتھ ان کو دیکھتی رہتی ہوں -"

"اُن پر قبضہ جمانا گویا تمہاری خواہش ہے" وِل نے پوچھا - "تاکہ پھر اُن کا خیال بھی نہ کرو گویا سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو قتل کرتی ہو - بچپن میں میرے بھی ایسے ہی خیالات تھے - میری بڑی تمنا تھی کہ میدان کے اُس پار جاؤں - جہاں پہنچ کر میں اُسے پھر ایک نظر بھی نہ دیکھتا - یہی دلیل میرے وہاں نہ جانے کی تھی - میری پیاری اگر دوسرے بھی ایسا خیال کریں تو سب میری طرح ہو جائیں - اور پھر تم بھی پھولوں کو اپنی جگہ رہنے دو" اتنا کہہ کر وہ رُک گیا -

"معاذاللہ" وِل نے پھر کہا - قبل اس کے کہ مارجری کچھ پوچھتی - وہ سلسلہ کلام منقطع کر کے مکان کے اندر چلا گیا - اس کا چہرہ متبسم تھا - وہ دسترخوان پر خاموش رہا - جب رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل گئی، ستارے آسمان پر چمک اُٹھے، وہ گھنٹوں صحن اور باغ میں بے ربط قدموں سے ٹہلتا رہا - مارجری کے کمرہ کی کھڑکی سے اب بھی روشنی آ رہی تھی - جو پہاڑیوں کی تاریک فضا کو قدرے روشن کئے ہوئے تھی - وِل کا دماغ کھڑکی کے متعلق سوچنے لگا - لیکن اُس کے خیالات عاشقانہ نہ تھے -

"وہ اپنے کمرہ میں ہے" اُس نے سوچا "اور سر کے اوپر آسمان میں ستارے! خدا دونوں پر رحمت نازل کرے" اس لئے کہ ان دونوں کا اثر اُس کی زندگی پر بہت پڑا تھا - دنیاوی آلام میں اُس نے ان دونوں سے تسکین قلب حاصل کی تھی اور اس سے زیادہ وِل کو اُن سے کیا توقع ہو سکتی تھی - اُس نے آسمان پر ستاروں میں ایک جھٹکا محسوس کیا - شاید اُس کی سر کی جنبش کا نتیجہ ہو اور ایک منتشر روشنی ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گئی - کھڑکی کا پردہ ہلا، اُٹھا اور پھر نیچا ہو گیا - اُس نے قہقہہ لگایا -

"ستاروں میں لرزش، پردہ میں جنبش - خدا کی پناہ میں بھی کیسا جادوگر ہوں - یا ایک بڑا بے وقوف........"

وہ فوراً ہی بستر پر چلا گیا اور کہتا رہا "کاش میں بے وقوف ہی ہوتا!!......"

(۵)

دوسرے دن علے الصباح وِل نے مارجری کو باغ میں دیکھا -

"میں اب تک شادی کے متعلق سوچتا رہا" اُس نے اچانک کہا - "اور بار بار سوچنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کوئی قابلِ قدر چیز نہیں -"

ایک لمحہ کے لئے مارجری نے اُس سے نظر ملائی - لیکن پھر خاموشی سے زمین کی طرف دیکھنے لگی - وہ اس کو کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا - "تم کو حیران نہیں ہونا چاہیئے" وِل نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا - "میں نے بار بار اس سوال پر غور کیا اور ہر دفعہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس میں کچھ نہیں - ہم اس سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب نہ ہو سکیں گے، جتنا کہ اب ہیں اور اگر میں عقلِ سلیم رکھتا ہوں، تو کہہ سکتا ہوں کہ اب سے زیادہ اُس وقت خوش بھی نہ رہ سکیں گے -"

"میرے متعلق سوچنا اب بے سود ہے" مارجری نے

کہا۔ " مجھے خوب یاد ہے کہ تم نے قطعی طور پر اپنے کو پابند کرنا نہیں چاہا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم غلطی میں مبتلا تھے۔ تم نے درحقیقت مجھ سے کبھی محبت نہیں کی اور اس بات سے مجھے رنج ہے کہ مجھے بھی غلط فہمی میں ڈال دیا گیا تھا۔"

" معاف کیجئے" ۔ وِل نے پُرزور الفاظ میں کہا " تم میرا مطلب ہی نہیں سمجھ سکیں اور نہ یہ کہ مجھے تم سے محبت ہے یا نہیں۔ میں اس کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑتا ہوں۔ مجھے ناز ہے کہ میرے جذبات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور تمہیں اس بات کا غرور ہوگا کہ تم نے میری تمام زندگی اور طرزِ عمل کو بدل ڈالا۔ لیکن شادی مجھے قابل قدر چیز نہیں معلوم ہوتی۔ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ تم اپنے والد ——— کے ساتھ رہو۔ تاکہ میں تم کو ہفتہ میں ایک دو بار دیکھ آیا کروں۔ جس طرح لوگ گرجا جاتے ہیں اور اس وقت میرا خیال ہے کہ ہم زیادہ خوش نظر آئیں گے۔ یہ میرا خیال ہے۔ لیکن میں تم سے شادی بھی کرلوں گا اگر تمہاری مرضی ہوگی۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تم میری عزت پر حملہ کر رہے ہو!" مارجری نے بگڑ کر کہا۔

"نہیں نہیں" وِل نے کہا " میرا دل قطعی صاف ہے۔ میں اپنی بہترین محبت تم کو پیش کر رہا ہوں۔ تم اس کو لے سکتی ہو۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ یہ میری یا تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ گذشتہ واقعات کو بدل دیا جائے اور خیالات میرے دل سے نکل جائیں۔ میں تم سے ضرور شادی کر لوں گا۔ اگر تمہاری مرضی ہو۔ لیکن میں تم سے پھر کہوں گا کہ یہ قابلِ وقعت چیز نہیں، اور اگر ہم دوست کی حیثیت سے رہیں تو یہ کہیں بہتر ہے۔ اگرچہ میں ایک خاموش انسان ہوں۔ لیکن میں نے زندگی میں بہت تجربے حاصل کئے ہیں۔ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے جو میں کہتا ہوں مان لو۔ اور اگر تم کو پسند نہیں تو کہہ دو میں تم سے فوراً شادی کر لوں گا۔"

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے۔ وِل کے دل میں الجھن پیدا ہونے لگی۔

"شاید تم کو اپنے خیالات کے اظہار میں کچھ دریغ ہے۔" وِل نے کہا۔ اقرارِ گناہ زندگی کا بار ہلکا کر دیتا ہے۔ کیا مجھ سے زیادہ کوئی شخص عورت کے معاملہ میں اسقدر بے باک ہوسکتا ہے۔ میں اپنی رائے کا اظہار کر چکا۔ کیا تم شادی کی تمنا میں ہو؟ یا تم میری دوستی قبول کرنا چاہتی ہو، جو اس سے بہتر ہے۔ یا تم مجھ سے سیر ہوچکی ہو؟ بولو! خدا کے لئے کچھ کہو۔ تمہیں یاد ہوگا۔ تمہارے والد نے .... کہا تھا کہ ایسے مواقع پر لڑکیوں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے۔"

اتنی دیر میں مارجری نے اپنے ہوش ٹھکانے کئے، اور بغیر ایک لفظ کہے جلدی سے باغ سے نکل کر مکان میں چلی گئی اور وِل ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ وہ باغ میں نیچے اوپر پھرتا رہا۔ کبھی وہ آسمان کو دیکھتا اور کبھی پہاڑ کی چوٹیوں کو۔ وہ پانی کے کنارے بیٹھ کر بے وقوفی سے پانی کو دیکھتا رہا۔ اس کو یہ تمام واقعات اپنے خلافِ عادت معلوم ہوئے اور مارجری کی آمد کے دن کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ "پہلے میں بہت خوش تھا" اس نے کہا۔ "میں یہاں آکر تمام دن مچھلیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ مِل کی طرح قائم تھا۔"

(۶)

مارجری کھانے پر آئی۔ لیکن نہایت خاموش۔ جب تینوں جمع ہوگئے۔ پلیٹ پر آنکھ جمائے ہوئے مارجری نے کہا:۔

"اباجان! مسٹر وِل کے ساتھ میں مدت تک معاملات پر گفتگو کرتی رہی۔ ہم نے ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ میری درخواست پر وہ شادی نہ کرنے کے لئے راضی ہوگئے ہیں۔ اور اب وہ مجھ سے ایک دوست کی حیثیت سے ملاکریں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے مابین کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ہم اسی طرح اُن سے ملتے رہیں گے۔ میں اُن کا خیر مقدم کرونگی لیکن میں مناسب سمجھتی ہوں کہ ہم مسٹر وِل کا مکان فوراً خالی کردیں۔ اس لئے کہ واقعاتِ موجودہ کی بنا پر شاید اب ہم خوشگوار وقت نہ گذار سکیں۔"

وِل جس نے اب تک اپنے آپ پر مشکل سے قابو پایا تھا۔ غیر مربوط الفاظ میں برس پڑا۔ گویا وہ مداخلت کرکے مارجری کو جھٹلا دینا چاہتا تھا۔ لیکن مارجری نے ہاتھ سے اس کو وہیں روک دیا اور ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔ اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی جھلک رہی تھی "میں ممنون ہوں گی۔ اگر آپ دورانِ گفتگو میں رکاوٹ پیدا نہ کریں" اس نے کہا۔

مارجری کے اندازِ بیان اور لب و لہجہ نے وِل کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش ہوگیا، کہ لڑکی کے اندر کچھ باتیں ضرور ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔ درحقیقت وہ ٹھیک سمجھا تھا۔

غریب پادری کو بیحد ملال ہوا۔ اس نے یہ بات ثابت کرنے کی بے سود کوشش کی کہ یہ محبت کے جھگڑے ہیں جو ایک رات بعد ختم ہو جائیں گے اور جب کوئی جھگڑا نہیں تو مکان چھوڑنا کیا معنی! وہ وِل

کا ممنون تھا لیکن مارجری نے اپنی صنفی خصوصیات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ثابت کر دیا کہ ملاقات ایسے ہیں کہ اُن کو وہاں سے فوراً چلا جانا چاہیئے - چنانچہ اُسی سہ پہر بعد سہ پہر ٹاؤدی اور اُس کی لڑکی نیچے وادی میں ایک گاؤں میں چلے گئے اور اپنے مکان کی درستی کا انتظار کرنے لگے -

ول کے دماغ میں اب مختلف خیالات چکر لگا رہے تھے - وہ تنہا تھا غمگین ! آسمان پرست تا ... رے اس کی نگاہوں سے بے نیاز تھے - جبتک وہ چاہتے دیکھتا رہے تسکین قلب اور جمعیت خاطر کا کوئی سہارا نہ رہا - مارجری کے سلوک پر اُس کو غصہ آیا - لیکن پھر بھی وہ اس کا مداح رہا - اُس کو مارجری کے پیکر میں ملکوتی صفات کا عکس نظر آتا تھا جس کے ادراک سے وہ قاصر تھا - اگرچہ وہ اُس کی مصنوعی خاموش زندگی کا جزو بننے کے قابل نہ تھی - تاہم وہ اُس کی آرزو کرتا رہا - ول مثل اُس انسان کے تھا جس کی نشو و نما سایہ میں ہوئی ہو اور آفتاب میں آجانے سے جو مسرت یا تکلیف اُس کو ہوسکتی ہے ، وہ اس وقت ول کو محسوس ہو رہی تھی - دن گزرتے رہے - اب ول انتہا پسند ہو گیا تھا - کبھی وہ اپنے عزم بالجزم کو بنظر پسند دیکھتا اور کبھی اپنی احتیاط پر نادم ہوتا - غالباً پہلی بات اُس کے اصلی کیرکٹر کا عکس تھی اور دوسری اُس کے جذبات کا مظاہرہ - تاہم رنج و غم نے اُس کو مجنون بنا دیا تھا - خیالات نے مجبور کیا کہ وہ موجودہ زندگی کا خاتمہ کر دے - اس لئے ایک دن شام کو اس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور ہاتھ میں چھڑی لے کر دریا کے کنارے کنارے نیچے وادی کی طرف چل دیا - اس تہیہ کے ساتھ اُس کا قلب تسکین پذیر ہو گیا اور اُس نے قدرتی مناظر اور موسم کی دلفریبی سے کافی حظ حاصل کیا - وہ ہر نتیجہ کا اقدام کرنے کے لئے تیار تھا - اگر مارجری اُس کو قبول کرتی ہے - تو بہتر ہے اور اگر وہ اُس کی درخواست رد کرتی ہے - تب بھی وہ مطمئن تھا - کہ اُس نے حتی الامکان معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی - زیادہ تر اُس کو نا امیدی کی توقع تھی - جب اس کو مارجری کے مکان کا حصہ درختوں کے درمیان نظر آیا تو وہ اپنے اس اقدام پر شرمندہ ہو رہا تھا - تاہم وہ وہاں پہنچ گیا -

مارجری نے خندہ پیشانی کے ساتھ ول کا استقبال کیا اور بغیر کسی حجاب کے ہاتھ بڑھا دیا -

" میں شادی کے متعلق سوچتا رہا ہوں " ول نے کہنا شروع کیا -

" میں بھی " مارجری نے جواب دیا " اور میں تمہاری دانائی کی بیحد قدر کرتی ہوں - تم نے مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھا اور اب میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ موجودہ حالات ہی بہتر ہیں - "

" اور اس کے ساتھ ساتھ ----- " ول نے جرأت کی -

" او ہو تم تھک گئے ہو گے " مارجری نے دخل دیتے ہوئے کہا " ذرا بیٹھئے میں شراب کا ایک جام لے آؤں - دو پہر سخت ہے - میں نہیں چاہتی کہ یہ ملاقات تکلیف دہ ثابت ہو - اکثر آیا کرو کم از کم ہفتہ وار - میں اپنے دوستوں سے مل کر بیحد خوش ہوتی ہوں . . . . . . "

" بہت خوب " ول نے سوچا " میں درحقیقت واسطی پر تھا " اُس دن کی ملاقات سے اُس کو بیحد مسرت ہوئی اور واپسی پر اس کا دل مسرت سے لبریز تھا - اُس کے بعد اُس نے معاملات پر ذرا بھی غور نہیں کیا -

تقریباً تین سال تک مارجری اور ول اسی مدار پر دن گزارتے رہے - دونوں ہفتہ میں ایک یا دو بار ملتے رہے - اس عرصہ میں محبت کا لفظ تک زبان پر نہ آیا - ول نہایت مسرور معلوم ہوتا تھا - اب اُس نے ملاقاتوں کا سلسلہ کم کر دیا - اب وہ اکثر نصف راستہ سے واپس آجایا کرتا - اسے محرومی دید میں لذت آنے لگی -

اسی طرح تین سال گزر گئے - مارجری نے اچانک دوسرے شخص سے شادی کر لی اور ول کے دل کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچا - لیکن اس نے صدمہ کو بہادری سے برداشت کیا - صرف اتنا کہا " کہ عورتوں سے متعلق جو کچھ علم مجھ کو تھا - اُس کی بنا پر مارجری سے تین سال قبل شادی نہ کر کے غالباً میں نے دانشمندی کا کام کیا " اس نے اس عقلمندی پر اپنے آپ کو مبارکباد دی - اور اپنی عقل کو آفرین کہا - لیکن اس کا دل مغموم تھا - اور ہونا چاہیئے تھا - ایک دو ماہ تک اس رنج و صدمہ سے اس کا حال بہت پریشان رہا اور جسم لاغر ہو گیا - اُس کے نوکر اس انقلاب پر حیرت زدہ تھے -

شادی کے تقریباً ایک سال بعد رات کے پچھلے حصہ میں کسی سوار کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز نے اسے بیدار کر دیا - اُس کے فوراً ہی بعد ہر کے دروازے پر کسی نے دستک دی - اس نے کھڑکی کھولی اور ایک کسان کے لڑکے کو دیکھا جو ایک گھوڑے پر سوار تھا اور ایک خالی گھوڑا اس کے ساتھ تھا - لڑکے نے ول سے کہا - کہ حتی الوسع جلد چلنے کی تیاری کیجئے - کیونکہ مارجری کا آخر وقت ہے اور اُس نے آپ کو بلانے کے لئے بھیجا ہے "

ول کوئی سوار نہ تھا - اس لئے وہ اس قدر کم رفتار سے چلا کہ بیکس مارجری کے آخری لمحات تھے جب وہ وہاں پہنچا - تاہم کچھ منٹ اُن کی تخلیہ میں گفتگو ہوئی - ول کے سامنے غریب مارجری نے آخری سانس لی - ول کی آنکھیں رشک ریز تھیں . . .

ے ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ؛ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(آزاد ترجمہ)

مہاتما گاندھی سے

بات چیت ٹھیٹ اردو میں

مہاتما جی! پرنام۔ ڈاکٹر تاراچند جی سے میں نے جو باتیں کیں وہ آپ نے سُنی تو ہوں گی۔ انہیں باتوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" پرچار کی بات چیت بھی چھڑ گئی تھی جس پر میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا۔ میں کبھی کھل کر اس بارے گاندھی جی سے الگ باتیں کروں گا۔ اسے کئی مہینے ہو چکے۔ جب سے ابتک آپ سے باتیں کرنے کا رہ رہ کے دھیان تو آتا رہا۔ پر ادھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ایسا پھنسا جو ادھر آنا چاہنے پر بھی ابتک نہ آسکا۔ کچھ دنوں سے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملا ہے۔ آج چاہتا ہوں جو کچھ جی میں ہے اور جو ابتک نہ کہہ سکا وہ سب ایک سانس میں آپ سے کہہ دوں۔ پرماتما کرے آپ ٹھنڈے جی سے اسے دیکھ سکیں۔ کس نے کہا اسے دیکھنے والے تو بہت ہیں اور کیا کہا اس کے پڑھنے والے بہت تھوڑے ہوئے اور ہیں اور ہوں گے۔ کون کہہ رہا ہے اسے چھوڑ کر کیا کہا جا رہا ہے اسی کو جانچئے اور پڑتالئے۔

پہلے یہ جتا دینا چاہتا ہوں۔ دیس کے پیچھے آپ نے اپنا سکھ چین سب کچھ کھو دیا۔ اسی کے لئے آپ نے جوگ سادھا۔ نئے نئے ڈھب سے اس سنسار نے آپ کو جھنجھوڑا اور دُکھ پہ دُکھ دئے۔ دوسرا ہوتا تو ستّ پٹا جاتا اور ہڑبڑا کے نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ پر آپ ٹس سے مس بھی نہ ہوئے اور آپ نے یہ دکھا دیا:۔

"نہیں لگتی ہے جونک پتھر کو"

دیس کے سدھرنے کے لئے جو آپ نے اپنے جی میں ٹھان لی۔ اُٹھتے بیٹھتے وہی دھیان ابھی تک ہے اور اپنا سب کچھ تج کے اس کے پیچھے آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ ایسا بات کا دھنی اور دُھن کا پکا ہونا ہنسی کھیل نہیں۔ ہند ماتا کی دُکھ بھری کہانی میں سے یہ آپ کی باتیں کسی کے بھلائے سے بھلائی نہیں جا سکتیں۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں، لکھنے والا مجھے اور آج تک جو میں نے کیا اسے جانتا ہی نہیں۔ جو کچھ کہنا ہے وہ تو پھر کہوں گا پہلے یہ ایک کہانی سُن لیجئے۔

ایک برہمن، ایک چھتری، ایک ویش، ایک شودر یہ چاروں الگ الگ گھرانوں کے نہ جانے کیسے ایک جگہ اکٹھے ہو کے جی بہلانے جنگل چلے۔ چلتے چلتے پیاس لگی۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پر بھی کہیں پانی کی ایک بوند تک نہ ملی اور آگے بڑھے تو سامنے ایک ایکھ دکھائی دی۔ لمبے لمبے اور موٹے موٹے پونڈے کھڑے جھومتے دیکھ کر سبھوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لپک کے ایک نے چٹاخ سے ایک گنا توڑ لیا۔ دوسرے نے پٹاخ سے دوسرا۔ جو دو رہ گئے تھے، انہوں نے بھی ساتھیوں کی دیکھا دیکھی بڑھ بڑھ کے اپنے اپنے لئے ایک ایک توڑ لیا۔ گنّے توڑتے ہی ایک دوسرے کو سراہنے لگا۔

بھئی کیا کہنا اتنا موٹا اور ایسا لمبا گنّا ایک ہی جھٹکے میں یوں جڑ سے اُکھیڑ پھینکا۔ کیوں نہ ہو، ہو نا برہمن۔ برہمن نے کہا اور تم اپنے چھتری پن کو تو کہتے ہی نہیں۔ کتنا بڑا بانس کا بانس گنّا کس پھرتی سے اُکھیڑ لیا۔ ویش اور شودر میں بھی ایسی ہی باتیں ہوئیں

ایکھ والا وہیں کہیں آڑ میں کھڑا یہ سب سُن رہا تھا۔ سنتے ہی جی ہی جی میں کہنے لگا۔ ارے یہ تو سب کے سب الگ الگ گھرانوں کے ہیں۔ ان سے گنّے چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ کہہ کے چلا اور ٹھٹکا۔ پھر کچھ سوچ سانچ کے ایک لمبا سا چکّر کاٹ کے ان چاروں کے سامنے آتے ہی ڈنڈوت کی اور ڈنڈوت کر کے ایک سے کہنے لگا۔ آپ تو ہمارے مائی باپ برہمن ہیں۔ دھرم اور اس کی پوجا پاٹ آپ ہی سے ہے۔ آپ نہ ہوں تو جگ میں دھرم پرچار کا اُجالا ہی نہ رہے اور پورے سنسار میں ایسا اندھیرا گھُپ ہو جائے جو ہاتھ سے ہاتھ نہ سجھائی دے۔ پھر چھتری سے بولا آپ ہی کے بھروسے پر راج جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ آپ ہی کی تلوار کی چھاؤں میں راج پاٹ پھولتا پھلتا ہے۔ یہ چھاؤں نہ ہو تو وہ جھلس جائے۔ آپ لوگوں سے بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویش سے کہا تمہاری کھیتی باڑی کا کٹھن دھندا کبھی ایسا نہیں جو کوئی اس کا گُن نہ مانے۔ اس سے سارا جگ بھلا چنگا دکھائی دے رہا ہے۔ نہیں تو گھڑی بھر میں ادھ مُوا ہو جائے۔ میں تم سے بھی

کچھ نہیں کہنا - تم نے جو کیا اچھا کیا -

اب ایک شودر ہی رہ گیا تھا - اسے گھور کے کہنے لگا - کیوں بے ملیچھ تیری یہ ڈھٹائی - تجھے تو کچا ہی چبا جاؤں گا - ارے بتا - تو نے کیا سمجھ کے گنا توڑا - یہ کہتے ہی اسے کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جھونپڑی میں لے جا ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال آیا -

چار میں سے ایک کی تو یوں چھٹی ہوئی جو تین بچے، وہ اپنے اپنے گنے لئے لمبے لمبے ڈگ رکھتے آگے بڑھ ہی رہے تھے جو وہ ایکھ والا جھپٹ کے دیش سے آ کے بھڑ گیا اور ڈانٹ کے کہنے لگا - او ہل چلانے والے تجھے کبھی یہ دن لگے جو دن دھاڑے یوں ڈاکا ڈالنے لگا - یہ گنے کیا تیرے ماتا پتا کے لگائے ہوئے ہیں - برہمن چھتری یہ تو ہمارے مائی باپ ہیں - ہم ان کے منگتا اور انہیں کا دیا کھاتے ہیں - لو - تو نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالے اور ان کی ریس کرنے لگا - یہ کہہ کے اسے بھی پکڑ دھکڑ کے لے گیا -

جب وہاں سے وہ چمپت ہوا تو برہمن، چھتری دونوں کے دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے - چلو ہماری تو کرکری تو نہیں ہوئی - یہ کہہ ہی رہے تھے جو وہ پھر دوڑتا ہوا آگے بڑھ کے چھتری سے جا بھڑا اور اسے روک کر کہنے لگا - کیوں جی کیا تم چھتری ہو - چھتری کیا ایسے ہی لٹیرے ہوا کرتے ہیں - بڑے آئے وہاں سے چھتری بن کے - ایسے چھتری وتری بہت سے دیکھے ہیں - یہ کہتے کہتے اس کی بھی کولی بھر لی - چھتری نے بہت ہیچ میچ کی اور پنڈت جی نے بھی بہت چھڑانا چاہا، پر اس نے کسی کی بھی نہ مانی اور اسے بھی جھونپڑی میں لے جا باندھ بوندھ کے ڈال آیا -

برہمن کہنے لگے - ساتھی گئے تو گئے ہم تو بچ گئے - وہ کائیاں ہیٹا کٹا اور منہ پھٹ ایکھ والا بھلا ایک کو کیسے چھوڑ دیتا - پنڈت جی ہانپتے کانپتے بھاگم بھاگ بڑھے چلے جا رہے تھے جو وہ پھر جھونپڑی سے نکلا اور نکلتے ہی وہیں سے للکارا - للکارتا ہوا جھپٹا - اور جھپٹ کے پنڈت جی کو بھی جا دبوچا -

کہنے کو تو یہ ایک کہانی ہے - پر سمجھ والوں کے لئے اسی میں بہت سی سیکھنے کی باتیں چھپی ہوئی ہیں - اپنی اپنی پڑی ہونے سے ایک دھن کے پکے نے اپنے سے چوگنوں کو کیسے باندھ کے ڈال دیا - ان میں اتنا ہی ایکا ہوتا جیسے یہ سب مل کے ساتھ آئے تھے تو بھلا ایک تو ایک دو گنے تگنے بھی ایسے جھٹ پٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے -

آجکل دیس میں بھی ایسی ہی آپا دھاپی کی ہولی کھیلی جا رہی ہے - راج نے کسی کو ڈھیل دی اور کسی کو جکڑ دیا - جدھر ڈھیل آئی - ادھر والے اپنے آپے میں نہیں —— مونچھوں کو تاؤ دے دے کے لگے نبکارنے اور ٹوپیاں اچھالنے - یہ دھیان ہی نہیں آتا - ڈھیل دی تو کیا ہوا - ہیں تو سب کے سب بندھے ہوئے - اس کا بھروسہ ہی کیا آج کی ڈھیل کل کھنچ بھی تو سکتی ہے - ایک جگہ کا اٹھنا بیٹھنا رہنا سہنا - اس پر آپس میں آئے دن کی دانتا کلکل - "ساہتیہ پرشد" میں جو آپ نے کہا - کوئی اور اس سے بڑھ کر بھی کہتا تو اسے کوئی دیکھتا بھی نہیں - اچھا تو اسی کا ہے آپ کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلیں جو کوئی دوسرا کہے تو سب انہیں اٹکل پچو سمجھیں -

پہلے تو یہی دیکھ لیجئے - دیس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا نہیں آپ برسوں سے نیند کے ماتوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کے جگانا چاہتے ہیں - پھر کیا سب کے جاگ اٹھے - بہت سے بہت ہوا تو یہی، گھوڑے بیچ کے سونے والوں نے آپ کے جھنجوڑنے سے ہوں ہوں کر کے کروٹیں لیں - ہاتھ ادھر جھٹکے پاؤں ادھر ٹپکے جماہیوں پہ جمائیاں اور انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتے لیتے پھر آنکھیں میچیں اور پھر خراٹے لینے لگے اور آپ کا جھنجوڑنا ان کے لئے لوری بن گیا -

"ساہتیہ پرشد" کی دھوم دھام تبا رہی ہے - دیس کے لئے جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہ سب ہو چکا - سب کے سب انند اور نچنت ہو کر نئی بھاشا کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں - بھاشا واشا کی دیکھ بھال جانچ پڑتال ناپ تول کا کھڑاگ اس گھڑی کیلئے ہے - جب کٹھن باتوں میں سے ایک ایک کر کے سب کی سب پوری ہو چکی ہوں -

دیس کس جنجال میں پھنسا ہے - کنگلا پن کتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورا دیس کیسا اپاہج ہو کے رہ گیا ہے - اپنے بل بوتے پر آج تک نہ یہ کچھ کر سکا اور آپس میں یہی تنا تیری رہی تو آگے بھی یہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا - جب ابھی تک دیس کی کسی بات کا بھی ٹھیک ٹھاک نہیں تو سب چھوڑ چھاڑ کے پہلے دیس ہی کو سدھاریئے - پھر جو جی چاہے وہ کیجئے -

گھر میں تو ہٹس پڑی ہے - کہرام مچا ہوا ہے - کبھیا تک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں - جیسے بھیڑوں کا ریوڑ تتر بتر ہو کے ادھر ادھر مارا مارا پڑا پھرتا ہو - ایسے ہی دیس والے بھی ہیں - آپس [illegible] جوتی پیزار

گالم گلوچ اور بھوگ سنائے جا رہے ہیں۔

ایسے دنوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کی نیو رکھنا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پرچار پر اڑنا ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی گھر میں تو آگ لگی ہوئی ہو۔ دھڑ دھڑ گھر جل رہا ہو اور اس کے رہنے والے آگ بجھانے کی جگہ نئے گھر کا ڈیزائن، چھت کی اونچائی، چھپیت کی بناوٹ، انگنائی کی چوڑائی، جھروکوں کھڑکیوں کی لمبائی، اور پورے گھر میں کہاں کہاں پھول پتیاں بنائی جائیں گی، گھر سجنے کے لئے اور کیا کیا ہونا چاہیئے۔ ایسی ایسی باتیں کھڑے سوچتے رہیں۔ گھر بنے پیچھے اس کے سجنے کے لئے آپ جو چاہیں کریں۔ کوئی ٹوک نہیں سکتا۔ گھر بنا کیسا ابھی تو بھرا گھر اجڑ رہا ہے اور اس کے بننے کی گھڑی آنے تک نہ جانے ابھی کیا کیا ہونا ہے۔ تو ایسی کھچڑی پکانا تو آپکے لئے ٹھیک نہیں یہ تو سوچیئے۔ آپ کدھر جا رہے تھے اور لوگوں کے بہکانے سے بھٹک کے کدھر چلے آئے۔ چلے

کوئی بڑا بکیت، جیالا پھکیت، منچلا سورما، اپنا سب کچھ لٹا کے دُہری، ترنو بیڑیوں ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیس والوں کے چھڑانے کی دُھن میں جھٹ پٹ اُٹھ کھڑا ہو اور لڑائی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کے سوجھ بوجھ اور نت نئی گھاتوں سے جم کے ایسا لڑے جو دوسروں کے دانت کھٹے کر دے اور چھکے چھڑا دے۔ پھر وہی ایکا ایکی لڑائی بھڑائی چھوڑ چھاڑ گھوم گھام بھاشا کے پرچار کرنے والوں میں آ بیٹھے اور ان کے سکھانے پڑھانے سے انہیں کا ساتھ دینے پر اڑ جائے تو اسے یہاں بیٹھا دیکھ کے دیکھنے والے اپنی اپنی سی کہنے لگیں گے۔ کوئی کہے گا لڑائی بھڑائی کے جوکھوں میں پڑنا منہ کا نوالا نہیں جو چُپ چاپ نگل لیا جائے۔ دیکھا جو کہتے تھے وہی ہوا۔ پہلے کیسی اکڑ تکڑ دکھائی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش۔ جب وہاں نہ ٹھہر سکا تو لڑائی سے جی چرا کے یہاں بیٹھنا ہی پڑا۔

دوسرا کہے گا۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں۔ لڑائی کو بھی تو دیکھو گھنٹے دو گھنٹے، ایک دن دو دن، مہینے دو مہینے کی نہیں برسوں ہو چکے۔ ہاتھ پاؤں کب تک چل سکتے ہیں۔ گھڑی بھر انگلی ہلا کے تو دیکھو کتنی سوجھتی ہے۔ لڑتے لڑتے ہاتھ پاؤں تھک کے چور ہو گئے ہوں گے۔ سستانے کے لئے کہیں بیٹھنا بھی کیا بودا پن ہے۔ تیسرا کہے گا بیٹھنا تو بودا پن نہیں پر جم کے بیٹھنا وہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی سوجھ بوجھ والے بھی یہی کہیں گے ایسے منچلے کے لئے سب سے پہلے دیس ہی کی سیوا چاہیئے، دیس کے پورے بندھن جب کھل چکیں تو بھاشا واشا کا پرچار سب کچھ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہو سکتا ہے۔ اور جب تک دیس نہ سنبھلے تب تک ایسے الجھاوے میں الجھنا نہ چاہیئے۔

بجتر کی لڑائی سے ایک بانکے منہ موڑ کے چلے۔ دیکھنے والے نے ٹوکا۔ ہائیں یہ کیا! آپ کی بکیتی پھکیتی کی تو دھوم تھی۔ بڑے بڑے جیالے لوہا مانتے تھے۔ جب آپ ہی نہ جم سکے تو پھر کون جمے گا اور اس گھڑی کو پھر کون جیتے گا اس ٹوکنے پر بانکے پلٹے اور جھنجلا کے کہنے لگے کیا کہتے ہو۔ تم کیا جانو۔ تمہیں تو یہی آتا ہے جو منہ میں آیا بک دیا۔ کیا کہیں ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھ لیا۔ ایسے ایسے بیٹھے جو نک سک سے ٹھیک ڈیل ڈول کے اچھے پورے اور ایسے سجیلے جدھر سے نکل جائیں دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور چھوٹے بڑے سب کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ ان میں کا ایک ایک سینکڑوں پہ بھاری نہتا بھی ہو تو لاکھوں کے ٹڈی دل میں گھس کے دانتوں سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کے تھوک دے اور منچلوں کا پتا پانی کر دے۔ ایسے ایسے جیالوں کے دھڑ گولیوں سے چھلنی چھلنی ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس سب کچھ ہونے پر بھی دیکھنے کی بات یہ ہے جس جگہ ان کے پاؤں جم گئے پھر وہاں سے نہ ہٹے اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی لڑائی ہے۔ اس سے تو بھیڑوں کی لڑائی اچھی۔ کوس بھر سے دنا دن ہونے لگی اور یہاں، جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔ تلوار کے دھنی تھے تو منہ کیوں چھپایا۔ آمنے سامنے ہو کے دو دو ہاتھ ہمارے بھی دیکھ لئے ہوتے۔ کھیرے ککڑیاں جیسے کٹتی ہیں ایسے ہی گھڑی بھر میں پرے کے پرے کاٹ کے نہ رکھ دیتے تو یہ اپنی موچھیں منڈا ڈالتے۔

اب یہ جگہ منچلوں کے ٹھہرنے کی نہیں اور سچ تو یہ ہے اب جلنا دوبھر ہو گیا۔

پہلے کبھی بانکوں کی بڑی دھاک تھی اور ہوتے بھی تھے بڑے تلور سے۔ پھر بھی اُن میں اوّل جلول پن بہت ہوا کرتا تھا پر آپ تو ایسے نہیں۔ آپ میں جو سمجھ، سوجھ بوجھ اور اچھی اچھی باتیں پرمیشور نے اکٹھی کر دی ہیں۔ وہ پہلے کے بانکوں میں کہاں۔ آج آپ ہی ہند ماتا کے لہلہاتے بانکے ہیں۔ دیس کا اکھاڑا کھدا ہوا ہے اور اس میں برسوں سے بڑا ج کے ساتھ آپ کی گتھم گتھا ہو رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو رگید رگید کے چت کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھنے والوں کے جتھے کے جتھے اور ٹولیاں کی ٹولیاں پرا جمائے آپ کے اس بڑھنے کو بڑے اچنبے سے دیکھ رہی ہیں۔ پر کچھ دنوں سے جو آپ اس اکھاڑے سے

نمل کر دوسرے دھندے میں لگ گئے - اس پر اپنے پرائے سب
میں کانا پھوسی ہو رہی ہے اور کہا جا رہا ہے مہاتما جی سیدھے جاتے
جاتے یہ کدھر مڑ گئے -

آپ کے ادھر آنے سے دیس کی بات کیسی ادھوری ہو کے رہ
گئی تو پھر ادھر ہی جائیے نا، اور دیس ہی کے لئے جو بن پڑے وہ کیجئے -
رہا بھاشا کی گتھیاں سلجھانا اسے پھر کے لئے اٹھا رکھئے - بھاشا کیا کہیں
بھاگی جا رہی ہے - جو اس کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے پھر نہ ہو سکے گی -
جدھر آپ جا رہے تھے اس کے سامنے بھاشا واشا ہے کیا - آنند ہو کے
ایسے سیکڑوں کھیل کھیلے جا سکتے ہیں -

گاؤں میں دیکھا ہو گا جو ہاٹ آج بھرا پھر سات دن تک یونہی
سنسان پڑا رہتا ہے - اس سنسار میں جو جو دھندے لوگ کر رہے ہیں -
کچھ ہی دنوں کے لئے ان دھندوں سے انہیں الگ رکھا جائے تو وہ
پہلے سے نہیں رہتے - سینے پرونے والوں سے سلائی، بڑھیوں سے
لکڑی کی چیر جار، لہاروں سے لوہے کی پیٹ پاٹ، کمہاروں سے مٹی
کی تھوپ تھاپ، لکھنے پڑھنے والوں سے لکھت پڑھت، سوچ بچار
بہت نہیں، تھوڑے دنوں کے لئے یہ ان سے چھڑا کے دیکھ لیجئے - ان
میں سے کسی میں بھی پہلے کی سی بات نہیں رہے گی -

آج جو کرنا ہے اسے کل کے لئے اٹھا رکھنے پر بات آئی گئی
ہو جاتی ہے - آج کا دھندا آج ہی کے ساتھ ہے اسے آج ہی لپٹا ہو
جانا چاہیئے - کل کا دھندا آج سے الگ ہو گا - آج کی بات کل پر چھوڑ دی
تو کل کی پرسوں اور پرسوں کی اترسوں پر چھوٹتی رہے گی اور یونہی چھوٹتے
چھوٹتے پھر وہ بات ہی چھوٹ جائے گی - بات ادھر ٹھنڈی پڑی تو
پھر دھیان بھی ٹھٹھر کے رہ جاتا ہے - تو ابھی دیس کی بات ٹھنڈی نہیں
پڑی ہے - یہ سماں ابھی ایسا ہے - جس میں بھاشا واشا کو چھوڑ چھاڑ کے
پھر آپ دیس کو سجھا سکتے ہیں اور اس کے لئے ان تھک دوڑ دھوپ
کر سکتے ہیں - آپ کی دوڑ دھوپ باسی کڑھی کا ابال نہیں جو کچھ نہ ہو سکے -
آج کچھ نہیں ہے تو کل کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا اور آگے بڑھ کر آنکھیں
یہ سہانا سماں دیکھیں گی -

دیس میں میل ملاپ کے جھنڈ کے جھنڈ ایسے چھائے ہوئے
ہیں - جن کی گھنی چھاؤں میں پریم جل انگڑائیاں لیتا بہہ رہا ہے - ایک کے
من کی ٹہنیاں دوسرے کے من میں کھچڑی ہو رہی ہیں - پیار کی بیل
میل جول کے پھبکتے ہوئے پودوں پر چڑھی جا رہی ہے - پریم کے
پھولوں کے گچھے کے گچھے ادھر ادھر لٹک رہے ہیں - سکھ چین کے
پھولوں کی بھینی بھینی باس سے دیس کا دیس بسا ہوا ہے - جن پر ملنے
والی گھنگھور گھٹائیں سنسار کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہیں - کالے
کالے بادلوں کے ٹھاٹ رہ رہ کے دیس کے گیت گا رہے ہیں - کوئل
کی کوک، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، ہلکی ہلکی پھوار، سلونی سالونی
گھٹاؤں کے اندھیرے گھپ میں رہ رہ کے بجلی کی چمک جیسے کسی
جوبن کی متوالی کے بھیگے ہوئے بال سکھانے کے لئے جھٹکے میں گھڑی
گھڑی منہ پر آ جاتے ہیں - ایسے دھندلکے میں دیس کے سپوت آپ کے
چرنوں میں جھکے ہوئے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور آپ دیس کی ہری
بھری پھلواری کے منڈوے میں ایسی سبھ گھڑی کو دیکھ دیکھ کے مسکرا
رہے ہیں -

اچھا - لگے ہاتھوں اپنی اس نئی بھاشا کو بھی دیکھتے چلئے جس
کے پرچار کی دھن میں آپ اپنا اب تک کا کیا کرایا سب اکارت کر دینا چاہتے
ہیں - اردو میں عربی فارسی بولوں کی بہتات سے ایسا دھوکا کھایا جو کھلم
کھلا آپ یہ کہہ اٹھے -

"اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے - قرآن کے حروف میں
لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان
چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں -"

یہ آپ سے کس نے کہہ دیا - کہاں مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا
اور کہاں اردو، دونوں میں کوئی میل بھی ہے - ایسی بات منہ سے نکالنے
سے پہلے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو ہی سے پوچھ لیا ہوتا -

ہندی اور اردو کے جھگڑے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے
ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی تھی - اس میں ایک جگہ
پنڈت جی یہ لکھتے ہیں :-

"عجیب بات تو یہ ہے کہ نہ جانے ہمارے ملک
میں کتنی چیزیں ہیں جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی
ہیں - زبان کا مسئلہ بھی مذہبی بن گیا اور بعض نامعلوم
اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اردو مسلمانوں کی
زبان ہے - میں بصد ادب عرض کروں گا کہ میں اسے
ماننے کے لئے تیار نہیں - اردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں
جسے میں بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں -"

لیجئے پنڈت جی تو اردو کو اپنی ایسی بھاشا سمجھ رہے ہیں جیسے وہ

بچپن سے بولتے چالتے ہیں اور آپ اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا
کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ سُننے والا کس کا کہا مانے
کسے جھٹلائے اور کسے سچ جانے۔ اس کے ساتھ ساتھ پنڈت برجموہن
دتاتریہ کیفی نے مسلم یونیورسٹی یونین میں اردو کانفرنس کے اسٹیج پر "اردو
ہماری زبان" کہہ کر جو لمبی چوڑی اسپیچ پڑھی اسے بھی کہیں کہیں سے سُن
لیجئے۔ پنڈت جی اسی میں ایک جگہ یہ کہتے ہیں:-

"اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اردو قوموں کے میل جول
اور دیسی بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہوگئی لیکن
بعد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس
کو استعمال کرتے رہے حضرت میں اس تنقیح کو مُبہم
میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ سُنئے ہندوؤں میں تبلیغ مذہب
تو عرصہ سے بند ہو چکی تھی قریباً دو ہزار برس کے بعد
اب پھر تازہ ہوئی ہے۔ اس واقعہ کو نظر میں رکھ کر دیکھنا
یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اردو
اختیار کی گئی یا نہیں۔ اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات
میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو ہندوؤں نے
اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا۔
انیسویں صدی عیسوی کے اوّل برسوں میں اچھوت ادھار
اور ہریجنوں کی تبلیغ یا شدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا۔
مگر ۱۸۱۹ء میں سمر بھو بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب
اردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمیٰ آئینہ مستور کی صورت میں
ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے
کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب
ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اردو نظم
میں تصنیف کرتا ہے۔"

پھر پنڈت جی نے ہندو دھرم کی لائبریری میں سے ایسی بہت سی
چھوٹی بڑی اردو لکھتوں کا اتا پتا دیا ہے، جو پوری کی پوری ہندو دھرم
کی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ گھر کے بھیدی کی یہ باتیں بھی سننے کی ہیں:-

"سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے
ہندوؤں نے اردو کو اور اردو وظائف سے یا زیادہ احتیاط
سے یہ کہئے کہ مذہبی اور ملّی تقریبوں سے خارج نہیں کیا۔
شکنت چالیسی ایک اردو کی کتاب "استوترہ" یعنی وظیفہ
کی ہے۔ یہ اردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے۔
ہر بند کے چار مصرعے ٹھیٹ اردو میں ہیں اور ترجیع
کا مصرع "بمتس تسعی" چار بار آتا ہے۔ اس کو میں نے
پوجن کے سلسلے میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے
ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات
ہے کہ تلسی داس، رامائن لکھ چکے تھے۔ اس کی کتھا برابر
ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری
مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں۔ لیکن اپنے
اہالی ملّت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ
اردو سے کام نہیں لیا گیا۔ اس ضمن میں وہ، تمام اردو دنیا
کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے مہابھارت، رامائن
گیتا، مہاتم، شو پران، گنیش پران اور جانکی جیے وغیرہ
دھرم پستکیں اردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں
منشی نول کشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو
رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور
روایاتِ ملّی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں۔ ان
نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور جھیئوں
شاستر اور سمرتیاں اردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں
اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ
سماج کے لٹریچر کا ہے۔"

یہ کہانی کہتے کہتے پنڈت جی نے کہی ہوئی باتوں کو پھر ایک جگہ
اکٹھا کر کے ایک چیلنج بھی دیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے:-

"آپ نے دیکھا کہ اردو کی تعمیر و تدوین اور ترویج میں
ہندوؤں کا کتنا متعدد حصّہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں
کی مذہبی اور ملّی کتابیں کس کثرت سے اردو میں لکھی گئیں
اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا* ہر سال بلا ناغہ شائع
ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے
اردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں
موجود ہے تو سامنے آکر بتائے کہ جو واقعات ابھی
پیش کئے گئے ان میں سے کونسا صداقت سے محروم
ہے۔"

پنڈت کیفی کی باتیں سنتے سنتے آپ اُکتا گئے ہوں گے۔ یہاں تک

* کے ایک سے زیادہ منظوم ترجمے اور تفسیریں اردو نظم اور نثر

تو آپ سُن ہی چکے - گنتی کی دو ڈھائی باتیں اور سُن لیجئے - یہ لکھت کسی مسلمان کی ہوتی تو سچ مانئے اس میں سے دو بول بھی کبھی یہاں نہ لکھتا - پر اس کا لکھنے والا ہندو اور ہندو بھی ایسا ویسا نہیں بڑی سُوجھ بُوجھ کا پنڈت ہے جس کی آنکھیں سچائی پر جمی ہوئی ہیں - اپنے ساتھ کے بھٹکے ہوؤں کو پکار پکار کے ادھر ہی بلانا چاہتا ہے - جدھر سچائی کا اُجالا ہے - اس کی لکھت کے ایک ایک بول سے یہی دکھائی دیتا ہے - جن باتوں سے دیس نڈھال ہوتا جا رہا ہے - ان پر وہ جی ہی جی میں کڑھ رہا ہے - اونٹ رہا ہے اور سیرا بیٹھا ہے - اس لکھت میں جی کی بھڑاس نکالی ہے اور پتے پتے کی باتیں ایسی ایک جگہ اکٹھی کر دی ہیں جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا - اس میں ایک جگہ پنڈت جی نے یہ بھی لکھا ہے :-

"جب مہاتما گاندھی نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مُرتب کرنے کا حکم دیا - اس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا یہ نظریہ جو اب ناگپور میں ہنگامہ آرا ہوا - کہاں چلا گیا تھا - یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتما جی کے مرحوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۸۱ بھجن ہیں - جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندوستانی نام دیا گیا ہے - باقی ۷۹ بھجن گجراتی، مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں - جیسے :-

ہے بہار باغ دنیا چند روز
دیکھ لو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے - اب اگر اردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہو گئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندوستانی ہی سے کام رکھتے -"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کیا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں - اچھا انہیں چھوڑیئے - بیچ میں بات میں سے بات نکل آئی اور جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا - میں یہ کہہ رہا تھا اردو میں آپ نے عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل دیکھ کے اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا سمجھ لیا - دیکھئے بات یہ ہوئی - اردو کی جب نیو ڈالی جا رہی تھی تو یہاں کے چھوٹے بڑے جتنے سب ہی اس میں لگے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا راج تھا - اس لئے عربی، فارسی کے بول اردو میں آئے اور بہت آئے اور جو مسلمان راج کی جگہ کوئی اور راج ہوتا تو اُس راج کی بھاشا کے بولوں کی بھیڑ کی بھیڑ اردو میں لگ جاتی - کسی بھاشا میں اور دوسری بھاشا کے بولوں کی بھرمار دیکھ کر بے سوچے سمجھے کہہ دینا یہ بھاشا اس جتھے کے دھرم کی بھاشا ہے سوچئے تو یہ کتنی بڑی بھول ہے - آجکل اردو میں انگریزی بول بڑھتے جا رہے ہیں - کوئی نہ جاننے والا انگریزی بولوں کی بہتات دیکھ کر اردو کو انگریزوں کے دھرم کی بھاشا کہنے لگے تو سچ کہئے اس کے اس کہنے پر کیا آپ اپنی ہنسی روک سکیں گے -

دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں - ان دونوں کے گھال میل کو جس سے پوچھئے یہی کہے گا یہ کوئی اچھی بات نہیں - جب دھرم اور بھاشا کا آپس میں گڈ مڈ کرنا ٹھیک نہیں کہا جاتا تو منہ سے جو کہا جا رہا ہے وہ کیا کیوں نہیں جاتا - جا بجا کے باتیں کرنا کس لئے دونوں کا میل جول اچھا لگتا ہے تو کھُل کر کہہ دیجئے دھرم اور بھاشا کو ہم الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں - اس کہنے پہ بھی کوئی آپ کو ٹوکے - تو اسے جو جی چاہے کہئے - پر جبتک آپ منہ سے یہ نہ کہیں گے تب تک پوچھا گچھی کی لے بڑھتی ہی رہے گی -

پہلے پہل جو بھاشا کے جھگڑے کی بھنک کانوں میں پڑی تو میں نے جی میں کہا - کہیں ایسا تو نہیں نئے نئے مولوی، مُلا اپنی بڑائی جتانے کے لئے چھانٹ چھانٹ کے ایسے موٹے موٹے اور بھاری بھاری عربی فارسی کے بول بات چیت میں ٹھونستے ہیں جو بہت سے ہندو نہیں سمجھ سکتے - یہ بات ہندوؤں کو بُری لگی ہو اور جھلا کر انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چُنتے کی ٹھان لی ہو - ساتھ ہی یہ بھی دھیان آیا ایسا تھا بھی تو اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو کیا جا رہا ہے - وہ بات ہی کیا تھی - دونوں پنتھ کے لکھے پڑھے سمجھ والوں کو بلا لیا ہوتا، یہ سب ایک جگہ بیٹھ بٹھا کے گھڑی دو گھڑی میں یہ جھگڑا چکا دیتے -

یہ بھی آج کا اک نیا ڈھکوسلا ہے - جسے دیکھئے "اردو" اور "ہندی" کا منتر پڑھ رہا ہے اور اسی کی مالا جپ رہا ہے - بہت سے پڑھے لکھوں سے یہ پہیلی بوجھی جا چکی - میرا پوچھنا یہی تھا اور ہے - جب اردو کا دیول ہندی ہی کی مٹی سے بنا ہے تو پھر اردو کے ساتھ اور "ہندی" لکھنا کس لئے - اردو میں ہندی ایسی پیری ہوئی ہے جو کبھی اس سے الگ ہی نہیں ہو سکتی - اور کیسے الگ ہو سکتی ہے، جب اردو کی کھال، چمڑا، ہڈیاں، ڈھانچہ جو کچھ ہے وہ ہندی ہی ہے - اپنی اپنی سب کہہ رہے ہیں اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں یہ ہے کیا - جا بیچئے تو گھڑی بھر میں دودھ کا دودھ، اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگے گا - اس کے پرکھنے اور جانچنے کا ڈھب یہ ہے - دو اچھے پڑھے لکھے سامنے بٹھا کے ایک سے کہئے تم ایسی

اردو لکھو۔ جس میں عربی فارسی بولوں ہی کی ریل پیل ہو اور بھولے سے بھی کہیں ہندی کا ایک آدھ بول تک نہ آئے۔ ہندی کے کسی بول کے نہ آنے پہ بھی پوری لکھت اردو ہی رہے۔ دوسرے سے کہا جائے تم عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤ اور ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں کی کہیں چھان نہ آئے اور پوری کی پوری لکھت ٹھیٹ اردو رہے۔ تو بھلا ایسے ڈھائی بول بھی نہیں لکھ سکتا۔ جس میں اردو بن رہ سکے۔ پہلے لکھنے والے کی لکھت عربی، فارسی بولوں کی ایسی کھچڑی ہو کے رہ جائیگی جیسے اردو سے نہ کوئی لگاؤ ہوگا اور نہ کوئی اسے اردو کہہ سکے گا۔

دوسرا لکھنے والا عربی، فارسی بولوں کی بھیڑ چیرتا ہٹاتا آگے بڑھ کے ٹھیٹ اردو لکھ سکتا ہے۔ تو اردو لکھنے اور بولنے میں ہندی سے کترا کے کوئی کتنا ہی نکلنا چاہے کبھی نہیں نکل سکتا اور کیسے نکل سکتا ہے جب اردو کے پُتلے میں پوری مٹی ہندی ہی کی لگی ہوئی ہو۔ باہر والی بولیوں میں سے عربی، فارسی بول اس میں بہت سہی پہ ہندی کے آگے وہ ایسے ہی ہیں جیسے موسلا دھار مینہ کے سامنے پانی کی کچھ بوندیں۔

یہ کبھی نہیں ہوسکتا جو ہندی کو نہ چھوا جائے اور عربی، فارسی بولیوں ہی کی اُلٹ پلٹ سے اردو لکھت اور بات چیت ہوسکے۔ ہندی کو ہاتھ نہ لگانے اور عربی، فارسی کے اکٹھا کر دینے سے اردو نہیں ہو سکتی۔ اردو میں سے عربی، فارسی بول نکال کے یوں لکھا جا سکتا ہے۔ جیسے لکھنے کا یہی ڈھنگ جس میں آپ سے باتیں کی جا رہی ہیں۔ جب کسی جتن سے بھی ہندی کو اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اردو کے ساتھ ساتھ "اور ہندی" کا ٹکڑا کس لئے بڑھایا جا رہا ہے۔ کیا یہ بتا سکیں گے۔

اور سنئے۔ پھل گیندا نہ مارو لگت کلجوا میں چوٹ، سائیں سے سچا رہ اور بندہ سے ست بھاؤ، مو پہ ڈار دیو سارے رنگ کی گگر۔ یہ سب اور لکھنے کا یہ ڈھب جس میں بات چیت ہو رہی ہے۔ ان میں سے آپ کسے ہندی کہیں گے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا جو ایک لاٹھی سے سب کو ہانک دیں اور کسی کو بھی آپ ہندی نہ کہیں۔

اچھا ان میں سے آپ جسے بھی ہندی کہیں اپنے بنارس کے "ہنس" کو اس سے ملا کے تو دیکھئے "ہنس" کی لکھت کیا اسی کی سی ہے۔ آپ "ہنس" کی لکھت کے ڈھب کو کٹھن نہیں سمجھتے نہ سمجھئے۔ اوروں سے پڑھوا کے تو دیکھئے۔ اسے سب پڑھ بھی تو نہیں سکتے اور کیسے پڑھ سکیں گے۔ اس کی ایسی نرالی لکھت ہے جو پہلے اور آج کل کے ہندوؤں کی لکھت سے میل ہی نہیں کھاتی۔

"ہنس" اور کچھ ہنس والوں کو چھوڑ کے ہندوؤں ہی میں سے کیا دو ایک کی بھی ایسی لکھت آپ دکھا سکیں گے "ہنس" میں اور اوروں کے ایسے ایسے من مانے کڈھب سے کڈھب بول ٹھونسے جا رہے ہیں اور ایسے بھولے لبرے بولوں کی بھرمار کی جا رہی ہے جن کے سمجھنے کے لئے مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کو بھی سنسکرت کی ڈکشنری دیکھنا پڑتی ہے۔ آج کل کے نئے ہندی لکھنے والوں کی نہ کہئے یہ سب اور ان کے تُرتے ہیں۔ کچھ لکھنا لکھانا ہوا، جھٹ سے سنسکرت کی ڈکشنری گھسیٹ لی۔ اسے سامنے رکھ کر آئیں بائیں شائیں جو جی میں آیا بھولے لبرے بول دیکھ دیکھ کے لکھتے چلے گئے۔ یہ میں نہیں کہتا۔ ان کے لکھنے کا ڈھب آپ پکار پکار کے کہہ رہا ہے۔

سنسکرت کا ہندو دھرم کی بھاشا ہونا اور اس بھاشا کا کبھی نہ پرتا۔ ہوا پھیلاؤ کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہیں جانتا اس میں دیکھنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے سنسکرت جب سہاگن تھی اور راج کی چہیتی بھاشا سمجھی جاتی تھی تب بھی چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب اسے نہیں بول سکے۔ کچھ ہی لوگ تھے جو اس میں بات چیت کر سکتے تھے۔ تو راج کی بھاشا ہونے پر بھی جب یہ سب کی بھاشا نہ بن سکی تو اب کیا بن سکتی ہے۔ راج کے پانی ہی سے جو پودا نہ پھیک سکا وہ بھوبل میں کیا پھل پھول سکتا ہے۔ پھلواری کی دیکھ بھال اور اس کے ٹھیک ٹھاک ہونے پر بھی جو پھول نہ کھل سکے تو اب پت جھڑ میں کیا کھلیں گے۔ جس کچھی بھون کو راج بھی نہ بنا سکا تو راج کی دھوپ ڈھل چکنے پر وہ کیا بنتا۔ جب دانت تھے جبھی جو چنے نہ چب سکے۔ تو دانت ٹوٹنے پر وہ کیسے چبائے جا سکتے ہیں۔ وہ پُرانے ڈھنگ کے سڈول موتی جو راج کا سنگھار ہونے پر بھی مٹی میں اٹے رہے۔ اب ٹوٹ پھوٹ پر ان کی جھاڑ پونچھ ہوئی بھی تو کیا۔

پھر یہ بھی دیکھئے آج جس نئے گھر کی نیو رکھی جا رہی ہے۔ یہ بنتا بھی رہا تو کتنے تک پورا بن سکے گا۔ بھاشا کا گھر اور گھروں کا سا تو نہیں جو کچھ دنوں میں بن بنا کے پورا ہو گیا اور اس میں گھر والے رہنے سہنے لگے۔ بھاشا کا گھر بنانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور پھر یہ ایک آدھ جیتے کے بوتے کا روگ نہیں۔ اس کے بنانے کے لئے سب کا ایکا اور بڑی سوجھ بوجھ چاہیئے۔ یونہی سی آنکھ بچی اور کچھ سے کچھ ہو گیا یونہی سی چوک ہوئی اور سب کی کرائی باتوں پر پانی پھر گیا۔

نہ ماننے اور اپنی بات کی پچ کرنے کی تو اور بات ہے۔ پر ٹھنڈے

جی سے دیکھئے تو آپ کی اردو میں وہ سب باتیں پائی جا رہی ہیں جو بڑھنے والی بڑی سے بڑی بھاشا میں ہونا چاہئیں اور جو سچ کہنا کوئی پاپ نہ ہو تو مجھے یہ کہنے دیجئے۔ اردو میں کچھ پھیلاؤ کی ایسی ایسی باتیں بھی چھپی ہوئی ہیں جو اوروں میں نہیں۔ ابھی اس کا چھٹپنا ہے۔ اس چھٹپن ہی میں بھولی بھولی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ وہ چنچی تُلی گہری گہری باتیں بھی اس میں ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے سچ کہا ہے۔ بہو کے بول گھونگٹ میں اور پوت کے پاؤں پالنے میں' اس پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھئے تو جب ابھی سے اس کی ادھکٹی باتیں جی موہے لیتی ہیں تو آگے کیا ہوگا۔ کسی بھاشا کے پھیلاؤ کے جانچنے کے اور بہت سے ڈھبوں میں سے ایک ڈھب یہ بھی ہے:۔

جگ میں لوگوں کی چھٹائی بڑائی ایک سی نہیں ہوتی۔ سنسار میں یہی ہوتا آیا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ کوئی بہت چھوٹا ہے۔ تو کوئی بہت بڑا۔ کوئی راجہ ہے تو کوئی مہاراجہ۔ کوئی اس کی چوکھٹ کا منگتا ہے اور کوئی اس منگتا کے گھر کا بھکاری۔ ایسے ہی ایسی بہت اونچ نیچ اور سیکڑوں اُتار چڑھاؤ لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ تو جس بھاشا میں ایسے اُتار چڑھاؤ کے لئے الگ الگ بات کرنے کے ڈھب (Form of address.) جتنے بہت ہوں اس بھاشا کا پھیلاؤ ماننا پڑے گا۔

عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی ان سب میں سے کسی میں بھی یہ بات کرنے کے ڈھب بہت سے بہت نکلیں گے، تو تین چار۔ انہیں کے سامنے اب اپنی اردو کا پھیلاؤ دیکھئے گنئے گا تو ان کی گنتی اردو میں پندرہ سولہ تک پہنچے گی اور پورا پورا سوچ بچار کیا جائے تو ایسے اور اور بول بھی نکل سکیں گے۔ انہیں دیکھ کے کہیں یہ نہ کہہ اُٹھئے گا۔ یہ بول ہیں کہاں کہاں کے۔ جہاں کے بھی ہوں اب یہ سب کے سب اردو ہی کے ہیں۔ اردو کوئی ایک بھاشا تو نہیں بیچ میں مٹھائی ہے۔ اچھا اب انہیں دیکھئے:۔

تو، تم، آپ، جنابِ من، جنابِ مکرم، جنابِ محترم، جنابِ والا، جنابِ عالیجناب، سرکار، حضور، پیرو مرشد، جلالت مآب، اعلیٰحضرت، ملک معظم، شہنشاہ، جہاں پناہ۔ یہ موتی جن سیپیوں کے ہیں کیا وہاں بھی انہیں ایک جگہ ایسا ہی اکٹھا کر لیا گیا ہے جیسے ان بکھرے ہوئے موتیوں کی اردو نے جھمکتی ہوئی لڑیاں بنا دیں یہ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

تو جس ندی کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا ہو۔ جس کا اُتھلاپن گہرے پن میں چھپتا جا رہا ہو۔ اسے پاٹنے کی دُھن میں دن رات نئے نئے جتن کرنا اور الگ سے ایک نئی ندی نکالنے کے سوچ بچار میں آئے دن کھکیڑیں اُٹھانا کیا کوئی سمجھ والا اسے اچھا سمجھ سکتا ہے۔

عربی کو آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔ اچھا نہ سہی۔ پر فارسی سے آپ کی یہ چڑ کیسی۔ فارسی اور سنسکرت یہ دونوں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان دونوں کے کچھ بول لکھتا ہوں ان کا ملا جُلا ہونا دیکھئے:۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے جُلتے بول

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مہ	مہا	شاخ	شاکھا	ترس	تراس
کافور	کرپور	آستان	سھان	بیوہ	ودھوا
بیم	بھیم	بار	بھار	برودت	بھرورت
تپاس (عبا)	تپسیا	کرباس	کپاس	جندال	چنڈال
گمرچ	مگرمچھ	انگارہ	انگار	موش	موشک
باش	باس	فرمان	پرمان	ریشم	رشمی
است	استی	داغ	داگھ	کفت	کپھ
خشخاش	کھس کھس	بند	بندھ	ابرو	ابھرو
زانو	جانو	انگشت	انگشٹ	ادرک	آدرک
آش	آشن	اشتر	اشٹر	سرشت	سرشٹی
خسر	سوسر	خر	کھر	سخت	شکت
بادام	باتام	دیر	دھیر	سریر	شریر
میغ (ابر)	میگھ	نیلوفر	نیلوت پل	کان	کھان
کنج	کنج	گرم	گھرم	کام	کامنا
در	دوار	گرہ	گرہ	تن	تنو
ماست (دہی)	ستو	یک	ایک	شام	شائم
برشگال	برشاگال	بارش	برشا	جنگل	جنگل
میش	مہش	ارج	ارج	بوم	بھوم
شغال	سرگال	گاد	گئو	ماہ	ماس
روز	روج	گندم	گودھوم	شیر (دودھ)	کشیر
جو	یو	پارینہ	پورانا	چرم	چرم
خون	شون	پدر	پتر	مادر	ماتر
برادر	بھراتر	پور	پتر	دختر	دُہتر
سرین	شرونی	بخش (حصہ)	پکش	ہستہ استہ (گٹھلی)	استھی
پُر	پورن	ششم	ششٹم	پنجم	پنچم

آپ نے ان بولوں کا مِلا جُلا ہونا تو دیکھ لیا - اب فارسی اور سنسکرت کے پُرانے میل ملاپ کی کچھ اور کڑیاں بھی ساتھ ساتھ دیکھ لیجیے - یوں تو انگریزی اور جرمن بھاشا کے بھی کہیں کہیں سے اِکّا دُکّا کچھ بول سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں - پر جو بات پُرانی فارسی اور سنسکرت کے بولوں کو آمنے سامنے رکھنے پر دکھائی دیتی ہے وہ اور کسی بھاشا میں نہیں - اس سے تاڑنے والے نہ رہ سکے اور یہ کہہ اُٹھے -

ایران کے کیانی، زرتشتی اور ہند ماتا کے سپوت برہمن، چھتری، ان سب کے پُرکھا اور بڑے بوڑھے ایک ہی گھرانے کے تھے جن میں کبھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی - ایک ہی جگہ سب کا رہنا سہنا، اُٹھنا بیٹھنا تھا - پُرانی فارسی اور سنسکرت ایک ہی بھاشا تھی - جب آپس میں پھوٹ پڑنے سے یہ الگ ہوئے تو الگ الگ رہنے سہنے سے اس ایک بھاشا میں پہلے تھوڑا، پھر بہت اَل بَل ہوتا گیا - ژند اوستا اور سنسکرت کے بول ایسے ایک سے ہیں - جنہیں نہ جاننے والا سُنے تو ایک ہی سمجھے اور دونوں کو ایک ہی بتائے -

پرانی فارسی کو الگ الگ تین نمبروں میں بانٹا جا سکتا ہے - ایک ژند اوستا کی بھاشا - دوسرے پہلوی بھاشا جو ژند کے پیچھے بڑھی اور پھیلی - تیسرے دری بھاشا جو ساسانیوں کے راج میں پھلی پھولی - یہ دری بھاشا ژند اوستا سے بہت الگ اور محمود غزنوی کے راج کی بھاشا سے میل کھاتی ہے - ساسانی راج کی بھاشا اور غزنوی راج کی بھاشا جیسے یہ دونوں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہیں - ایسے ہی ژند اوستا اور سنسکرت ہیں یہی دیکھ کے یورپ کے کھوج لگانے والے یہ کہنے لگے - "یونہی سی گھٹ بڑھ سے ویدک گیت اوستا میں اور اوستا کے بول ویدک کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں -

اوستا کا منترا اور ہوما اور وید کا منتر اور سوما دونوں کے دونوں ایک ہیں - ایسے ہی ژند اوستا کا مترا وہی ہے جو رگوید کا مترا، متھرا ہے رگوید کا اریمن دیوتا، اور ژند اوستا کا ایرمن یہ دونوں بھی ایک ہی ہیں - ایران کی راجدھانی میں پہلے پہلے جن جن کا راج رہا وہ رگوید اور ژند اوستا میں ایک ہی سے ہیں - ژند اوستا کا یما خشائتا (جمشید) رگوید میں یما راجہ ہے، خشائتا مہاراجہ (بادشاہ) کو کہتے ہیں - اسلئے یما خشائتا اور یما راجہ یہ دونوں ایک ہی ہوئے - ژند اور رگوید میں کیکاؤس اور کاوہ اشانس دونوں کی باتیں ایسی ایک سی ہیں جن میں رتی بھر اَل بَل نہیں -

بھینٹ دینے والے اور چڑھاوے چڑھانیوالے کو ژند اوستا میں اتروا کہتے ہیں - وید میں اسی اتروا کو اتھرون کہا گیا ہے -

کرتی یہ بول ویدوں میں آنے والی باتوں کے جاننے والوں اور بڑے بھاری بھرکم سمجھ والوں کے لئے بولا گیا ہے - ایران میں بھی بڑے بڑے راج پاٹ والوں کے لئے بھی یہی بول بولا جاتا تھا - جیسے کوی سرو (کیخسرو) کوی کوات (کیقباد) ٹوہ لگانے والوں نے تو یہاں تک کھوج لگایا - پوجا پاٹ میں جو بول منہ سے نکلتے تھے وہ ژند اور ویدوں میں کہیں کہیں یونہی سا اَل بَل ہو تو ہو نہیں تو دونوں کے بول کے بول ایک ہی سے ہیں -

وید میں سورج کو گھوڑے والا اور دوڑنے والا بتایا گیا ہے - اوستا میں بھی یہی ہے - سورج دیوتا کو وید میں اریامن اور اوستا میں... ایریامن کہا گیا ہے - یہاں وہاں دونوں جگہ اس دیوتا کے منتر بیاہ کی سبھ گھڑی میں پڑھے جاتے تھے - انگیرا رشی کی پود سے آگ کی پوجا کا پرچار ہندو مانتے ہیں - اوستا میں اس آگ کی پوجا کا پرچار انگرو اور اس کے گھر والوں سے مانا گیا ہے - ترتیا کو اوستا میں پہلا بید بتایا ہے - رگوید اور اتھرون وید میں بھی ترتیا، تھرتیا، ترتیا ہے جو دُکھوں سے اچھا کرنے والا دیوتا مانا گیا ہے - اگنی ماتا کو جیسے ہندو گھروں میں رکھتے تھے - ایسے ہی ایرانی بھی - ایرانی آگ پوجنے والوں کے رات دن گانے کے منتر کو گاتا کہتے تھے - ہندوؤں میں بھی گاتا - گائتری منتر کہلاتا ہے - جونسے برس ہندو اپنے لڑکوں کو جنیو پہناتے - ایرانی بھی اسی برس پہناتے تھے -

یہاں ندیوں پر جیسے اشنان کے میلے لگتے ہیں - ایسے ہی ایران میں آب ریز کے تہوار ہوا کرتے تھے - جاڑے آتے جیسے یہاں دیوالی کا تہوار ہوتا ہے ایسے ہی ایرانیوں میں چراغاں کی دھوم دھام ہوا کرتی تھی - ہولی سے اگلے دن یہاں ہندو جو کیا کرتے ہیں یہی سب ایران میں کوسہ برنشین کے تہوار میں کیا جاتا تھا - جس مہینے میں یہاں بسنت کا میلا لگتا ہے - ایران میں بھی اس مہینے جشن گل کریزی منایا جاتا تھا - ان باتوں سے یہی پتا چلتا ہے - پہلے پہل یہاں کے آریہ جب ایرانیوں سے الگ ہوئے تو یہ اور ایرانی ایک ہی دھرم رکھتے تھے - پُرانے لکھنے والوں میں سے کچھ نے ایران سے آریوں کے نکلنے کی باتیں یوں لکھی ہیں : -

ان میں کا ایک جتھا دھرم کی باتوں میں کچھ کتر بیونت کر کے دھرم کو بگاڑنا چاہتا تھا - اس سے ایک آگ بھڑک اُٹھی اور دھرم کے بچاؤ کے لئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے - بڑا رن پڑا - لڑائی بھڑائی ہو چکنے پر آپس میں ایسی جھُٹم جھُٹا ہوئی جو پھر کبھی ایک جگہ مِل جُل کے نہ بیٹھ سکے - ہارا ہوا جتھا ٹھوکریں کھاتا اِدھر آ نکلا اور یہیں رہ پڑا -

۱۰۵۰ء میں پُرانی دھرانی لکھت کے کچھ ٹکڑے کسی پارسی کے ہاتھ سے نکل کے یورپ پہنچے۔ پھر پُرانی لکھت کے کھدے ہوئے کئی ٹکڑے ڈھونڈھنے والوں کو ایرانؔ سے ملے۔ ان سب کو دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بال کی کھال نکالنے والوں نے سوچ بچار سے ان بکھری ہوئی کڑیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

ان باتوں کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا۔ اسی لئے انہیں چھوڑتا ہوں۔ فارسی اور سنسکرت کے کبھی کے میل جول پر جو لکھا گیا وہ اتنا بھی نہیں جتنا ایک بہتی ہوئی ندی سے چلو بھر پانی۔ پھر بھی آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔

فارسی اور سنسکرت ایک ہی پیڑ کی ڈالیاں ایک ہی پھلواری کے پھول ایک ہی سیپی کے موتی اور ایک ہی منہ کی دو آنکھیں ہیں۔ جب ان دونوں کا میل ملاپ آپ دیکھ چکے تو اب فارسی بدیشی بھاشا کہاں رہی یہیں کی ہوئی اور جب یہیں کی ہوئی تو پھر اس کے بولوں کو ٹھکرانا کس لئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے ہوئے پریم کی کہانی میں آریوں کے باہر سے یہاں آنے کی بات چھڑ گئی ہے تو یہیں وہ جھگڑا بھی چکا دینا چاہیئے جو نوک جھونک چلی آتی ہے اس میں سب سے بڑھ کر ہندوؤں کی یہ ہنکار ہے۔ ہند ہمارا دیس اور ہمارا ہی جنم بھوم ہے۔ دیس کا جھولا ہمارے ہی لئے ہے۔ اور ہمیں اس میں جھولتے رہیں گے۔ پہلے سے ہمیں یہاں کے رہنے والے ہیں۔ باہر سے آنے والے جو ساتھ رہ پڑے یہ کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے۔ دیس کے اکلوتے سپوت ہمیں ہیں اور رہیں گے یہ دیس کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

گونڈ، بھیل، لمباڑے یہ بات کہیں تو سچ یہ ہے انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور ہے بھی یہی۔ انہیں گونڈ، بھیل، لمباڑوں کی یہ جگہ جنم بھوم ہے اور انہیں کے جیتے دیس والے ہیں جو ننگے دھڑنگے پہاڑوں، بنوں، جنگلوں میں مارے مارے پڑے پھر رہے ہیں۔ انہیں چھوڑ کے دیکھیئے تو پھر کوئی دیس والا ہی نہیں رہتا۔ آگے پیچھے سب باہر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔ کیسی ہی پُرانی سی پُرانی لکھت اُٹھا کے کیوں نہ دیکھئے۔ یہی پتہ ملے گا آریہ پہلے سے یہاں کے رہنے والے نہیں۔ یہ باہر ہی سے آئے اور یہاں رہ پڑے۔ جیسے آریہ باہر سے یہاں آ گئے۔ ایسے ہی مسلمان بھی آ دھمکے۔ دونوں کے یہاں آنے میں بھی بڑا بل تھا۔

آریہ جو آئے تو آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے انہوں نے یہاں کے بسنے والوں کا مار مار کے ایسا کچومر نکالا جو گنے چنے دیس والے یہاں کا رہنا سہنا چھوڑ چھاڑ بھاگ بھوگ کر اندھیری گھاٹیوں میں منہ چھپا کے بیٹھ رہے اور جو نہ بھاگ سکے شودر کہلائے۔ یہ اور ان کی پود، داس بن کے باہر والوں کی سیوا کرتی رہی۔ گھر بنانا، چھپر چھانا، گھر کی جھاڑ پونچھ، کوڑا کرکٹ اُٹھا اُٹھا کے پھینکنا، چکیاں پیسنا، برتن باسن مانجھنا، لکڑیاں چیرنا، گائے بھینسوں کو چرانا، گوبر اٹھانا، اُپلے تھاپنا۔ انہی دھندوں میں ان دیس والوں کے دن رات کٹتے تھے۔ یونہی سی بھول چوک پر ان کی وہ درگت بنتی جس کے دھیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مندروں میں آنا جانا کیسا۔ ان کی پرچھائیں سے پوجا پاٹ کی ستھری جگہ پاپ کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی تو ایسے ملچھ وہاں کیسے پھٹک سکتے تھے۔

یہ ادھم دیکھ کے سنسار نے کروٹ لی۔ وہ ڈری ہوئی بھیڑیں جو آئے دن مار دھاڑ سے چُپ چاپ رہتی تھیں اب سب کی سب مل کے چیخ اُٹھیں ایسے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اب آنکھیں کھلیں اور انہیں چُمکار چُمکار کے روکا تھاما جا رہا ہے اور ان کے اپنے سے الگ نہ ہونے کے لئے سینکڑوں جتن کئے جا رہے ہیں اور یہ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے ان کے لئے نہیں۔ یہ بھی سب اپنے ہی لئے ہے۔ ڈر یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ پورا ریوڑ کا ریوڑ کسی اور گلے میں جا کے نہ مل جائے۔ اور اس کے ملنے سے دوسرے اپنی بہتات کے گھمنڈ پر آگے بڑھ جائیں اور ہمیں چُپ بیٹھنا پڑے۔

رہے مسلمان تو وہ یہاں ایسے آئے جیسے کوئی اپنے گھر آتا ہے کسی نے انہیں دیکھ کے ٹیڑھی ٹوپی کی تو راج نے ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ نہیں تو یہاں والوں کو مسلمان اپنے راج کی جگمگاتی سبھا میں ساتھ بٹھاتے رہے۔ بابرؔ، ہمایوںؔ، اکبرؔ، جہانگیرؔ، شاہجہاںؔ۔ ان میں اکبر کا پوچھنا ہی کیا۔ یہ تو اوتار ہی مان لیا گیا۔ اوروں کو بھی ہندو اچھا ہی جانتے ہیں۔ بُرا نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ ان سب میں سے ایک اورنگ زیبؔ ہی ایسا ہے جسے دھرم کا کٹر، لبس کی گانٹھ، ہندوؤں کو دُکھ دینے والا، اور نجانے کیا کیا اسے ہندو کہا کرتے ہیں۔

یہی اورنگ زیبؔ جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا جب دکھن کا گورنر تھا تو ہندوؤں کو آگے بڑھانے، انہیں جنجال سے چھڑانے کے لئے اُس نے کیا کیا کیا۔ یہ کہانی سر جدو ناتھ سرکار کے منہ سے سُننے کی ہے۔ دھرم کا کٹر اورنگ زیب، شاہجہاں کو ہندوؤں کے لئے ایسے ایسے ڈھب سے لکھتا تھا جو کبھی کبھی شاہجہاں کی تیوری

پر بل پڑ جاتے تھے ۔ اس پر بھی اُس نے ہندوؤں کا ساتھ دینا نہ چھوڑا۔ اور اُن کی جو باتیں اُسے سچّی دکھائی دیں ۔ شاہجہاں کے سامنے ان کے کہنے سے نہ چُوکتا تھا ۔

دیوگڑھ کا راجہ کیسری سنگھ ، راؤ کرن راجپوت، مہیش داس راٹھور، نرسنگھ داس ، حیات سنگھ ، سارنگدھر، اندرمن ، یہ اور ایسے ہی اور ہندوؤں کو سُکھ ، چین سے بٹھانے کے لئے اورنگ زیب اپنے سے جتن کرتا رہا ۔

یہ باتیں تو جب کی ہیں جب یہ کنور تھا اور اُس نے اپنے راج میں ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا انہیں کیسی کیسی جگہیں دیں ۔ ان کی بڑی سے بڑی بُھول اور بھاری سے بھاری چُوک کو بھی کیسا ٹالا ۔ اس کے لئے پیچھے ہٹ کے یہ دیکھنا چاہئیے :۔

کھجوا کی لڑائی میں جسونت سنگھ نے داراشکوہ سے مل کے اورنگ زیب کو نیچا دکھانا چاہا ۔ ایسے ہی اجمیر کی لڑائی میں کنور رام سنگھ سے بڑی بھاری چُوک ہوئی ۔ کوئی اور راج ہوتا تو انہیں پاپی ٹھہرا کے ان کے ایسے کرتوت سے نہ جانے اُن کی کیا درگت بنا دیتا ۔ پر اورنگ زیب نے نہ جب اور نہ لڑائیاں جیتنے پر کسی سے بھی کچھ پوچھ گچھ نہ کی اور جو کچھ ہو چکا تھا اُسے ایسا کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا ۔

دھیراج راجہ جے سنگھ ، بجے سنگھ ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راؤ دلیپ سنگھ بندیلہ، رائے سنگھ راٹھور، راجہ راج روپ ، رائے رایاں راجہ رگھناتھ داس ، رام سنگھ ہاڈا ، راجہ رام سنگھ کچواہا ۔ ۔ ۔ رگھناتھ سنگھ سیسودیہ ۔ یہ اور ایسے اور بہت سے ہندو نکلیں گے جو اورنگ زیب ہی کی دیا سے پھلے پھولے اور پروان چڑھے ۔ ان باتوں کے پھیلاؤ کے لئے نہ یہ جگہ ہے اور نہ یہ ڈھائی بولوں میں سما سکتی ہیں ۔

تو آپ نے دیکھا باہر سے آنے میں مسلمان اور ہندو دونوں کے دونوں ایک سے ہیں ۔ بس اتنا ہی ہے ۔ آریوں نے پہلے آ کے ہند میں چھاؤنی چھائی اور مسلمان آریوں کے پیچھے آگے ۔ پیچھے آگے کا ال بل ایسا ہیں ہوا کرتا جو پہلے آنے والے جس جگہ آ کے ٹھہریں اسے اپنا تو جنم بھوم سمجھیں اور اپنے پیچھے آنے والوں کو باہر والا ہی سمجھتے رہیں ۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کسی جگہ آگے پیچھے دو جتھے باہر سے آ آ کے ٹھہریں اور پھر وہیں رہ پڑیں ۔ ان دونوں میں سے پہلے آنے والا جتھا اپنے پیچھے آنے والوں سے یہی کہتا رہے یہ جگہ ہماری ہی ہے تم ساتھ رہنے سہنے پر بھی کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے اور نہ یہ جگہ کبھی تمہاری ہو سکتی ہے تو اس اڑنے اور ہٹ کرنے کو سمجھ والے بالک ہٹ کہیں گے ۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اچھی بات نہیں مسلمان ہندو جو بھی یہاں آ آ کے رہ پڑے ، ہند اب ان سب کا جنم بھوم ہے اور رہے گا ۔ مُنہ سے کہہ دینے سے یہ کسی ایک جتھے کا دیس کبھی نہیں بن سکتا ۔

دیس کے باہر اب بھی ایک چھوڑ کئی کئی راجدھانیاں مسلمانوں کی ہیں ۔ پر ان میں سے کسی میں بھی یہاں کے مسلمانوں کے لئے جوتے ٹیکنے کی بھی جگہ نہیں ۔ جیسے ہندوؤں کا باہر کوئی ٹھکانا نہیں ہے ایسے ہی یہاں کے مسلمان بھی ہیں ۔ جن کا رہنا سہنا اُٹھنا بیٹھنا ، مرنا جینا جو ہے وہ سب یہیں تو پھر اب یہ باہر والے کیسے ہو سکتے ہیں ۔

یہ سچ ہے مسلمان ہندوؤں سے تھوڑے اور بہت تھوڑے ۔ پر جب اُن کے دُکھ ، سُکھ ، مرنے جینے کی بات بیچ میں آ پڑے تو پھر تھوڑے سے تھوڑے بھی نہیں رہتے ۔ آٹھ کروڑ ٹڈی دل کبھی ایسا نہ بن سکے گا جس کا ہونا ایک سا ہو کے رہ جائے ۔ سانس لینے والا اتنا بڑا جتھا مٹی کا کھلونا تو بننے سے رہا ۔ اس میں کھلونوں کی سی من مانی توڑ پھوڑ کبھی نہیں ہو سکتی ۔ اس کا یہاں رہنا سہنا کیچڑ کا سا دھبہ نہیں ہے ۔ جسے جب چاہا دوڑ دھوپ کے پانی سے دھو دھلا کے چھڑا ڈالا ۔

مہاتماجی ! پرماتما کے لئے دیس والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنا ، ہٹ کرنا چھڑائیے ۔ تیری چھوٹی میری موٹی ایسی بے سُری اُلجھی ہوئی تانیں کب تک ۔

دیکھئے اسی آپس کی جھٹک پٹک ، تن پھن سے دیس اب تک کتنے ٹوٹے میں رہا ۔ آپ میں بھلائی اچھائی کی جو جو باتیں ہیں اُنہیں بھگوان کی دیا سمجھ کے آگے بڑھیئے اور جگت گرو بنیئے ۔ یہ ایک جتھے کا لیڈر بننا کیسا ۔ آپ کو تو پورے دیس کا گرو بننا چاہیئے ۔ سچ ہے یہ بات ایسی نہیں کہ جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جائے ۔ پر آپ تو پاؤں توڑ کے بیٹھنا نہیں چاہتے ۔ آپ تو پتا مار چکے ہیں ۔ کٹھن سے کٹھن باتیں ہم جیسوں کے سٹ پٹا جانے کے لئے بہت سہی پر آپ کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں ۔ آپ تو دیس ہی کے سدھارنے کی ادھیڑ بن میں رہے اور ہیں ۔ تو دیس والوں کو بھی ایسا بنا دیجئے جو آپ کی دیکھا دیکھی یہ سب بھی دیس کے پروگی بن جائیں اور

بارہ سنگہ

جو یہ اب تک آگ لگا کے پانی کو دوڑتے رہے ہیں۔ ایسی اندھا دُھند دوڑ دُھوپ سے اُکتا کر آپ کے ساتھ ساتھ اُس چوڑی سڑک پر چلنے لگیں جو پریم نگر پہنچا دیتی ہے۔ ان کے من کی انگیٹھیوں میں پریم کی دبی ہوئی چنگاریوں کو کُرید کُرید کر منتروں کے پنکھے سے دھونک دھونک کے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیجئے جو بھُول چُوک کے پانی کے چھینٹوں سے بھی نہ کبھی بُجھے اور نہ کبھی کُملائے۔

مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی، پرماتما نے ان سبھوں کو ایک سا ڈیل ڈول، ہاتھ پاؤں، آنکھیں، ناک کان دئے ہیں جیسے اس دین میں سب کو ایک سا رکھا وہ چاہتا تو کیا بڑی بات تھی جو سارے جگ میں ایک ہی دھرم، پرچار کا ڈنکا بجتا ہے۔ ایک ہی دھرم کے مندر میں سب مِل جُل کے ایک ہی ڈھب پر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ پر بھگوان نے ایسا نہیں کیا۔ کسی نے اسے ایک ڈھب پر پوجا۔ دوسرے نے اُس کے پوجنے کا اور ڈھنگ نکالا۔ تیسرے نے کسی اور ڈھب سے اس سے لو لگائی۔ سب دھرموں کو دیکھئے تو یہ سب کے سب چھوٹی بڑی الگ الگ سڑکیں ہیں جو اُسی ایک کے پاس پہنچانے کے لئے کھُلی ہوئی ہیں۔ جس کے راج کا پھیلاؤ چھوٹے بڑے لاکھوں کروڑوں اَن گِنت سنساروں سے بھی آگے بنجانے کہاں تک یوں ہی گھیرے ہوئے ہے۔ ایسے سنسار اُسے نہ مانیں اور اس کے پوجنے کا دھاگا سب مل کر توڑ تاڑ کے رکھ دیں۔ جب بھی اس کے امٹ راج میں سے ایک رتی بھی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ ایسے ہی اہنیں جگمگاتے سنساروں کے رہنے والے کیسی ہی بڑھ چڑھ کے اس کی پوجا پاٹ کیوں نہ کریں پر اس سے اس کا راج رتی بھر بڑھ نہیں سکتا۔

دھرموں کے ماننے نہ ماننے کی بھلائی بُرائی جو بھی ہے وہ دھرم والوں ہی کے لئے ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کے پیار کرنے والا پرماتما ان باتوں سے ایسا الگ تھلگ ہے جو یہاں کے دُکھ سُکھ کی دھوپ چھاؤں اس پر پڑ نہیں سکتی۔ اس کے نہ ملنے والے راج کی جو کھٹ اتنی اونچی ہے جو یہ سنسار اپنے پہاڑوں کے ہاتھوں سے بھی اُسے چھُو نہیں سکتے۔ ہمارے دھیان کا پھیلاؤ اور پھُرتی جس کے سامنے بجلی کا چھلاوا پن بھی پانی بھرتا ہے اور جو گھڑی بھر میں اونچی سے اونچی جگہ کو روند کے اُس کی اونچائی ناپ توپ کے رکھ دیتا ہے۔ [illegible] یک پہنچتے ہیں یہ بھی اپاہج ہے۔ رات دن سے گھرے ہوئے سنسار اُس کے راج کے پھیلاؤ کو کبھی نہیں پا سکتے۔

جب سب کے سب اُسی ایک کو اپنے اپنے من کی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر اُسی کے آگے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اُسی کے دھیان میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ تو الگ الگ دھرم ہونے پر دھرم کے لئے آپس میں یہ ارے ترے کرنا کیا دھرم الگ الگ ہوا کریں اس سے کیا ہوتا ہے۔ جو دھرم ہے وہ اپنی جگہ اچھا۔ کسی کو بھُول کر بھی یہ نہ چاہیئے جو اپنے دھرم کو اچھا اور دوسرے دھرم کو بُرا کہے۔ بُرا کہنا کس لئے۔ ایک کے دھرم کی پوچھ گچھ دوسرے سے تو ہونے سے رہی۔ جو جس کا دھرم ہے اس کا بوجھ اُسی کے کاندھوں پر ہے۔ اس کے پیچھے آئے دن آپس میں لڑنا جھگڑنا بڑی بُری بات ہے۔

مسلمان اور ہندوؤں کا ایک دن دو دن کا تو ساتھ نہیں۔ پہلے بھی یہی مسلمان تھے اور یہی ہندو، یہی مسجدیں تھیں اور یہی مندر، یہی دُکھ کا اندھیرا تھا اور یہی سُکھ کا اُجالا۔ یہی سنہری دن تھے اور یہی روپہلی راتیں باجا گاجا مسجدوں کے سامنے بجتا تھا اور مندروں کے بھی۔ اس پر نہ کبھی مسجد والے بھڑکے اور نہ کبھی مندر کے پجاری بڑبڑائے۔ آپس میں مِل جُل کے رہتے اور جس سے جتنی جان پہچان ہو جاتی مرتے مرتے اُسے نباہتے اور اس میں کچھ بل نہ آنے دیتے تھے۔ بڑے بوڑھوں سے ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی جو کہانیاں کان سُن چکے ہیں وہ اب ساری کی ساری من گھڑت اور نِرٹل دکھائی دینے لگیں۔

آج کل کے ہندو، مسلمان تو ایسے ہو گئے جیسے توے سے روٹی اُکٹ جاتی ہے۔ بات بات میں آپے سے باہر۔ یونہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اُٹھے۔ پھر کیا تھا۔ چیخ چاخ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو یہ آپس میں گُتھ گئے۔ سمجھ والے اجڈوں کی گتھم گتھا الگ تھلگ ہو کے دیکھنے لگے۔ آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔

یہ سنتے سنتے کان جھنّانے لگے۔ آج یہاں جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا، کل وہاں لاٹھی چلی۔ پرسوں اُس جگہ گھمسان کی لڑائی ہوئی سینکڑوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے، لہو لہان ہوئے، بیسیوں مارے گئے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں تھک کے ہانپنے لگے تو راج نے پکڑ دھکڑ کے جیل میں ڈال کے بیچ بچاؤ کر دیا۔ پٹے پٹائے الگ۔ چھوٹنے کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ انٹی میں تھا وہ ہاتھ سے الگ نکل گیا۔ جن دھندلی

سے چار پیسے ہاتھ میں آ رہے تھے وہ دھندے الگ چھٹے اور گانٹھ میں ایک جھنجی کوڑی بھی نہ رہی۔ بیٹھے بٹھائے جو اکڑ تکڑ کا دھیان آ گیا تھا اُس کا یہ پھل مل گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

یہ آئے دن کی جھڑپ، بات بات میں ٹیڑھ بیس، گھڑی گھڑی کا ٹرائین۔ دیس والوں کی ایسی سمجھ پر تیل ماش اُتاریئے اور جیسے بنے انہیں ٹھچے پن سے روکئے۔ یہ سمجھ کے ہیٹے کانوں کے کچے آپس میں کھنچے چلے جاتے ہیں اور ان کی جھپٹ میں دیس کا ستیاناس ہوتا جا رہا ہے۔ آپس کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے دیس کے لنگوٹی بندھوا دی۔ مہاتما جی۔ آپ کے سامنے ایسی باتیں کرنا سورج کو دیا دکھانا ہے۔ پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کبھی بڑے بڑے سمجھ والوں سے بھی سامنے کی باتیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اب پھر اسی بھاشا کو لیجئے۔ کٹھن باتیں چھوڑ کے نئی بھاشا بنانے کے جنجال میں پھنسنا اور منجھی منجھائی بھاشا کو ٹھکرا کے منہ پھیر لینا یہ بھی نئی بات ہے۔ میں مانتا ہوں دیس کے کچھ ٹکڑوں کی بولیاں ایسی الگ الگ ہیں جو ایک دوسرے سے نہیں ملتیں اور ایک ٹکڑے کی بولی بولنے والا دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا۔ پر یہ سب کی سب بولیاں ایسی چھوٹی سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں ہی میں بولی جاتی ہیں۔ باہر اُنہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ ان سب میں اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو سارے دیس میں تھوڑی بہت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دیس کی پوری بولیوں میں سے ایک اردو ہی کا ایسا پھیلاؤ ہے جو ٹھیک ٹھیک پورے دیس کی بھاشا بننے کا بل بوتا رکھتا ہے۔

کسی بھاشا میں باہر والی بولیوں کے بولوں کی بہت سی بہتات جتنی بھی ہو پرکھنے والے اُسے تو بھاشا کی بڑھوتری سمجھتے ہیں اور آپ نجانے کیا چاہتے ہیں جو عربی، فارسی بول اردو میں دیکھ نہیں سکتے اور یہ بھی کیوں آپ کو بُرے لگتے ہیں۔ کیا آپ کوئی بھی ایسی آگے بڑھنے والی بھاشا دکھا سکیں گے جو باہر کی بولیوں کو ٹھکرا کے اپنے ہی گنے چنے ڈھائی بول لئے بیٹھی رہی ہو۔ اور انہیں کے سہارے آگے بڑھ کے یہ ٹٹ پونجیا بھاشا ایسی پھیلی پھولی ہو جو دوسری بڑھنے اور پھیلنے والی بولیوں کے لگ بھگ کہی جا سکے عربی فارسی بولوں کے نکال ڈالنے سے اردو کی بڑی لمبی چوڑی انگنائی گھٹ گھٹا کے بالشت بھر رہ جائے گی۔ یہ سچ ہے ہندوؤں کو چوڑی چکلی انگنائیاں اچھی نہیں لگتیں اور اسی لئے وہ اپنے اپنے گھروں کی انگنائی چھوٹی چھوٹی سی رکھا کرتے ہیں۔ پر یہ گھر اور بھاشا کا گھر دونوں کے دونوں تو ایک سے نہیں ہو سکتے۔ جس بھاشا کی بڑھوتری دن دونی رات چوگنی ہو اور جس کی دوڑ پھیلاؤ سے پھیلاؤ کو بھی روندتی چلی جا رہی ہو اُسے آپ ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اسے تو کلیجے سے لگائے رکھئے۔

آپ سے یہ تو کوئی نہیں کہتا۔ عربی فارسی کے نئے نئے من من بھر کے بھاری سے بھاری بول اردو میں آپ ٹھونستے چلے جائیں۔ جو یہ کہے اُسے سڑی سمجھئے۔ پر ان دونوں بولیوں کے وہ بول جنہیں پڑھے لکھے تو پڑھے لکھے، اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار تک دن رات بولتے چالتے ہیں۔ انہیں اردو میں سے نکالنے کے جتن کرنا تو ٹھیک نہیں۔

دیکھئے، ہل جوتنے والے جو پو پھٹتے ہی تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے دھندوں میں لگے سورج ڈوبنے پر ستانے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھاشا واشا کے کھڑاگ کو کیا جانیں پر یہ اردو کا پھیلاؤ دیکھنے کا ہے جو وہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے عربی، فارسی کے سینکڑوں بگڑے ہوئے بول کے بول بے جھجک بولتے چالتے ہیں۔

جب آپ گاؤں گاؤں اچھوتوں کے لئے پھر رہے تھے تو یہ سب کچھ آپ سُن چکے ہوں گے جو اب آپ کو سنایا جا رہا ہے۔

عربی فارسی کے وہ بگڑے ہوئے بول جو گاؤں والے اور گنوار رات دن بولتے ہیں:۔

مرجی (مرضی) ناراج (ناراض)۔ کھپا (خفا)۔ منجور (منظور)۔ تکدیر (تقدیر)۔ جمین (زمین)۔ مہنت (محنت)۔ منائی (منع)۔ کبالہ (قبالہ)۔ کھزانہ (خزانہ)۔ تنکھا (تنخواہ)۔ مجوری (مزدوری)۔ کھون (خون)۔ بے دکھلی (بے دخلی)۔ دستاویج (دستاویز)۔ کاگج (کاغذ)۔ کلم (قلم)۔ کاجی (قاضی)۔ راجی (راضی)۔ کھتا (خطا)۔ جُلم (ظلم)۔ کابل (قابل)۔ کبول (قبول)۔ جکام (زکام)۔ نجلا (نزلہ)۔ کم بکھت (کم بخت)۔ حاجر (حاضر)۔ کھالی (خالی)۔ کسور (قصور)۔ سجا (سزا)۔ بکھار (بخار)۔ رجا (رضا)۔ پیغمبر محمد (نبیٔ محمدؐ)۔ کھیرات (خیرات)۔ کیامت (قیامت)۔ اجاب (عذاب)۔ ناجک (نازک)۔ سورت (شہرت)۔ جلدی (جلدی)۔ ترا ترا (طرح طرح)۔ میجود (موجود)۔ مالوم (معلوم)۔ نکد (نقد)۔ مالا (معاملہ)۔ گلت (غلط)۔ مندرسا (مدرسہ)۔ نالت (لعنت)۔ رونک (رونق)۔ مولی صاب (مولوی صاحب)۔ ہمیسہ (ہمیشہ)۔ کمزور (کمزور)۔ کھسامد (خوشامد)۔ ریسم (ریشم)۔ جمانت (ضمانت)۔ جامن (ضامن)۔ مکدما (مقدمہ)۔ کھارج (خارج)۔ دسکھت (دستخط)۔ کواب (کباب)۔ سادی (شادی)۔

یہ کچھ بول تو یونہی لکھ دئے ہیں۔ سوچ بچار کیا جائے تو اور ایسے سینکڑوں بول کے بول نکل آئیں گے۔ عربی فارسی کے بگڑے

ہوئے کچھ بول ابھی آپ نے سُنے اب اپنی بولیوں کے وہ بول بھی دیکھ لیجے جنہیں اَن پڑھ سے اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار جوں کا توں بولتے ہیں۔

جیسے مکان، دُکان، میدان، جان، ران، تکیہ، لتّہ، صورت، بدن، گردن، سینہ، پلک، کمر، آدمی، عورت، بچّہ، اگر، مگر، کتاب، سردی، گرمی بادام، ادرک، کام، نام، کمان، تیر، لگام، مال، عینک، گلاب، بہار۔

میرا کہنا یہی ہے۔ یہ اور ایسے اور اور عربی، فارسی کے وہ جو اردو میں پورے سما چکے ہیں۔ جنہیں چھوٹے بڑے سب بولتے ہیں انہیں ہاتھ نہ لگائیے۔ ایسے ہی ہندی کے وہ گھُلے ملے بول جو سب کی بات چیت میں چلے آرہے ہیں ان سب کو ملا جُلا کے اردو کو اور آگے بڑھانے کے نئے نئے ڈھب نکالئے۔ ہند جیسے ہندو مسلمان سب کا جنم بھوم ہے ایسے ہی اردو بھی ان میں سے کسی ایک کی بھاشا نہیں۔ یہ بھی ان سب کی بھاشا ہے۔ سب کی بھاشا اس لئے کہہ رہا ہوں، اردو کے آگے بڑھنے اور پنپنے کے لئے مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ اب تک اپنے اپنے سے جتن کرتے رہے۔

یہ کہہ چکا ہوں، ہند کے چپّے چپّے کی چھوٹی چھوٹی بولیاں ایسی بہت سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں الگ الگ بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں دیکھئے اور ڈھونڈیئے تو عربی، فارسی بول چھپے چھپائے ملیں گے۔ بَل اتنا ہی ہوگا کسی میں بدیسی بولیوں کے بول بہت ہوں گے۔ کسی میں تھوڑے اور کسی میں بہت تھوڑے۔

دیس کی سب بولیوں کے گنتی کے کچھ کچھ بول یہاں لکھے جائیں تو یہ لکھت بڑھ کے نجانے کہاں تک پہنچے۔ اس لئے وہ سب تو نہیں اک مرہٹی بھاشا کے کچھ بول لکھتا ہوں:۔

عربی فارسی بولوں کی ریل پیل مرہٹی میں

ائین (آئین) اکّل (عقل) اکھتیار (اختیار) آکھر (آخر)۔ اکھیر (اخیر) سپھائی (صفائی) عجب، اجمت (عظمت)۔ آجماس (آزمائش) آجار (آزار)۔ اجاری (آزاری) اتر (عطر) عدالت، عداوت، انامت (امانت) اپھکرا (افکرہ) اپھوا (افواہ)۔ اباد (آباد) امباری (عماری) ایبر (ابرِ) عیب، ارکھ (عرق) ارج (عرض) الاہیدہ (علیحدہ) اول (اوّل) آتسباجی (آتشبازی) آپ گرجی (خودغرضی) آمیج (آمیز) اواج (آواز) اِشک (عشق) آشک (عاشق) اِشک باج (عشق باز) اکرار (اقرار) اجّت (عزت) اکھلاس (اخلاص) ایجا (ایذا) اتبار (اعتبار) اتلا (اطلاع) انساپھ (انصاف) انام (انعام) ارادہ، عنایت، امان (ایمان) عادت۔ عالم، انگشتان (انگشتانہ) آلی سان (عالیشان) عبرت، الاکھا (علاقہ) علّت، علاج، عمدہ، عمر، ادا، ادب، امین، امل، امیدوار، اولاد۔

مرہٹی کی بات چیت پہ ایک بھُولی ہوئی بات دھیان میں آئی بہت دن ہوئے جو مرہٹی کے اک اناڑی کھلاڑی سے مٹ بھیڑ ہوئی۔ اس کا اوڑھنا بچھونا جو تھا وہ مرہٹی اور انگریزی، اور کوئی بھاشا واشا جانتا نہ تھا۔ کچھ لوگ آپس میں کسی بھاشا کے پھیلاؤ پر کچھ کہہ سُن رہے تھے۔ مرہٹی کا نیا کھلاڑی جو سب سے الگ بیٹھا تھا یہ بات چیت سُن کے نہ رہ سکا۔ اور وہیں سے تڑ سے بولا۔ ہماری بھاشا کا سا پھیلاو دیس کی کسی بھاشا میں نہیں۔ چار دن سے اردو بڑھ چلی ہے۔ یہ بھی ہماری بھاشا کے بل پہ۔ نجانے مرہٹی نے اردو کی کیسی سیوا کی جو اس کے سینکڑوں بول اردو میں آ گئے۔ جنہیں اردو والے اپنے یہاں کا سمجھ رہے ہیں۔ وہ بول کون کون سے ہیں اس پوچھنے پر وہ مُسکرا کے کہنے لگا۔ ایک، دو، سینکڑوں، یہ کہہ کے اوپر لکھے ہوئے بولوں میں سے کئی بول اُس نے سنائے۔ جس پر جاننے والے ہنس پڑے اور وہ ہکّا بکّا ہو کے ایک ایک کا منہ دیکھنے لگا۔ اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے اسی پہ اُسے اچمبا ہوا۔ مظفر پور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے ایک بڑے بھاری بھر کم پنچ نے جو وہاں پڑھ کے سنایا۔ اُس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں لکھتا ہوں:۔

"ہماری ہندی کے کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے۔
وہ کبتا کی گاڑی کے دُھرے اور پہیّے بھی بدل رہے
ہیں۔ اپنے اُدبُت چھکڑے میں پیچھے کی اور مریل ٹٹو جوت
کر گنتو بیتھ پر پہنچایا چاہتے ہیں۔ یہ اتنی نہیں منو مکھتا کا لکشن
ہے۔ اس سے کبتا کا سُدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے۔"

کیا ایسی ہی اَن گھڑ بھاشا سارے دیس کی بھاشا بن سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی انوکھی بولی پورے دیس میں پھیل سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی لکھت کے پرچار پہ آپ اڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہی سب جنم بھوم والوں کی اکیلی بھاشا بن سکے گی اور کیا اسے ہی سب چھوٹے بڑے بول سکیں گے۔ دیکھئے تو یہ کیسا اودھم مچا ہوا ہے۔ عربی فارسی کے گھُلے ملے بول جو سب بولتے چالتے ہیں۔ جان جان کے انہیں چھوڑ چھاڑ اور چھانٹ چھانٹ کے یوں متی گتی، کبتا، اُدبُت، گنتو بیتھ، منو مکھتا، لکشن۔ ان بھُونڈے بسرے بولوں کو ٹھونسا گیا ہے۔ باہر والی بولیوں سے کترا کے اور بچ بچا کے نکلنے پہ بھی بدیسی بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی اور گنتی ہی کے سہی پر کئی بول اس میں آ ہی گئے۔ کچھ فلم بنانے والی کمپنیاں بھی اپنے یہاں کے ڈراموں میں ایسی ہی ٹھونس ٹھانس کر رہی ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے دیس کے ماتھے کے لئے کلنک

کا ٹیکا ہے - پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اس نئی اپکا کو دیکھ کے نہ رہ سکے۔ اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا -

"یہ زبان کیونکر کل ملک کی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور کوئی مذاق سلیم اور اردو میں شعور رکھنے والا اردو کو چھوڑ کے اسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے -"

فارسی کے رسیا کھیم سین کائستھ، پٹن کے ایسری داس، پٹیالے کے سبحان رائے، جگجیون داس، کیول رام اگروال، منشی بھوپٹ رائے، منشی چندر بھان، اودے رائے، منشی ٹیک چند بہار، یہ اور ایسے اور اور ہندوؤں کی فارسی لکھتیں دیکھنے کو آپ سے نہیں کہا جاتا - یہ وہ نئے پرانے اردو لکھنے والے ہندو جنہوں نے اردو کی ایسی سیوا کی جس پر اتنا لکھا جاتا ہے جو لکھتے لکھتے اک بڑا ڈھیر لگ جائے - ان کی لکھتوں کو تو دیکھ لیجے -

پنڈت دیا شنکر نسیم - پنڈت میندولال زار، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت لشن نرائن درابہ، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور، منشی پریم چند - سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ جھا، پنڈت گنگا ناتھ جھا، پنڈت آنند نرائن ملا، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت منوہر لال زتشی، مسٹر رگھوپتی سہائے فراق، مسٹر اقبال ورما سحر، مسٹر رام پرشاد کھوسلا ناشاد مسٹر کرشن سہائے - مسٹر تلوک چند محروم، مہاراج بہادر برق، جودھر مگت موہن لال رواں، پروفیسر سری رام شرما، مسٹر رام دیال سکسینہ، ٹھاکر جے آر رائے، لالہ روشن لال مسٹر رام سرن نگم، مسٹر سری نرائن نگم، مسٹر دیا نرائن نگم، مسٹر سورج نرائن مہر، مسٹر سدرشن، مسٹر شیام موہن لال جگر، یہ سب کے سب ہندو اور پکے ہندو اس پر بھی ان کی لکھتوں کا ڈھیر ایسا ہے جس میں کویوں، متی گتی، کبتا، اوبھت گنتو بیتہ، منو نکھنا، لگشن، سمپتی، شکتی، ریکھا، نویدن، آشا، وشا، سمبندھ، کلاپ، ویاکرن، ہتوں - ایسے ایسے بولوں کا پتا بھی نہیں اور ڈھونڈے سے بھی ایسے کٹھن بول ان میں کہیں نہ مل سکیں گے -

ان ہندوؤں کی لکھت کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کا - دونوں میں بال بھر آل بل نہیں - اور آل بل ہو کیسے جب ہندو مسلمان نے مل جل کے ابتک اردو کو یہاں تک سدھارا جو راج کے بل پر بڑھنے والی بولیوں کے لگ بھگ دکھائی دینے لگی - ابتک پہلا سا، نہ ہی - اسی اردو کے بولنے جاننے میں ہی تھوڑا بہت جو بھی، ہے تو ابکا، یہی ایکا آگے بڑھ کر جب بہت سیدھی ہو گی تو پورا بھی ہو سکتا ہے اور جو یہ تھوڑا بھی نہ رہا تو پھر رہا کیا - اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ -

ہند ماتا کا گہنا پاتا جو بھی تھا ایک ایک کر کے سب کا سب کب کا لٹ لٹا چکا اور آئے دن کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے ایک چھلا بھی نہ چھوڑا - لے دے کے یہی اردو ہندو مسلمانوں کے ملاپ کی ایک پرانی انگوٹھی دیس کے ہاتھ میں پڑی رہ گئی تھی - آج کل اس کی بھی چھینا جھپٹی ہو رہی ہے اور دیس کی انگلی سے اسے بھی اتارنے کے جتن کئے جا رہے ہیں یہ پرانی انگوٹھی بھی چھن گئی تو پھر کیا ہو گا - یہ آپ سوچئے -

اردو کو مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا آپ کہہ چکے ہیں - اس لئے یہ ڈر لگتا ہے کہیں اس بات چیت سے آپ یہ نہ سمجھ لیں - اپنی بھاشا کی پرچک لے جا رہی ہے - اور اس کے بچاؤ کے لئے یہ باتیں بنائی جا رہی ہیں کسی کے وعبان پر کیسے روک ٹوک ہو سکتی ہے - جس کا جو جی چاہے سمجھ لے - پر سچی بات تو یہ ہے - دیس کے لئے یہ باتیں چھیڑنا پڑیں - آپ دیکھ رہے ہیں - دیس کے منہ پہ کیسی جھریاں پڑتی چلی جا رہی ہیں - یہ کیسا نڈھال ہوتا جا رہا ہے - آپا دھاپی کے کیسے جھکڑ چل رہے ہیں - ایسا اندھیا دھے جو آنکھیں کھولنا دوبھر ہو گیا ہے - دیس کے اندھیرے گھپ میں بگاڑ کا لمبا تڑنگا بھوت ہاتھ پھیلائے دانت نکالے کھڑا ہنس رہا ہے - اس کے ... پرچھاویں سے یہاں والے سڑی بن کے آپس میں لڑے مرتے ہیں - کوئی بڑا منتر پڑھنے والا ایسا منتر پڑھے اور ٹوٹکا کرے جس سے دیس پر سے یہ بھوت اتر جائے اور بھوت اتر جانے سے یہاں کے ساتھ رہنے سہنے والوں کی ایسی آنکھیں کھلیں جو سب مل ملا کے سانس لینے کے یہ ڈھائی دن آپس میں ہنس بول کے کاٹ دیں - بھوت اتارنا ہنسی کھیل نہیں - اس کے لئے بڑی پڑھنت پھوک چاہیئے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں -

رہی اردو تو اب یہ مٹنے مٹانے کے جوکھوں سے نکل چکی - اس کا پودا اب پودا نہیں رہا - جو لو کے تھپیڑوں اور ٹھنڈک سے جھلس اور ٹھٹھر کے رہ جائے - یہ پودا پیڑ بنا اور بن رہا ہے، اس کی جڑیں آگے تک پھیلیں اور پھیل رہی ہیں - اس کی بڑی بڑی ڈالیاں، موٹے موٹے ٹہنے اور ہری بھری ٹہنیوں سے موٹی پتلی اور اور ٹہنیاں نکل نکل کے ان میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جا رہی ہیں -

اس کا تو اب کچھ ڈر ہی نہیں - اس میں ایک یہی بات دیکھنے کی ہے جس دھندے کو سب اب تک مل جل کے کر رہے تھے - اب ان میں پھوٹ پڑنے اور الگ تھلگ ہو جانے سے ایک ہی جتے کو وہ پورا بوجھ اٹھانا پڑے گا - جسے پہلے سب مل ملا کے اٹھا رہے تھے - اس

سے بڑھتی ہوئی چال دھیمی پڑ جائے گی اور پہلی سی پھرتی نہیں رہے گی۔ پہلے جو بات دنوں میں پوری ہوتی تھی وہ اب مہینوں پہ جا پڑے گی۔ پر مجھے تو یہ دکھائی دیتا ہے پورے ہندو بھی کبھی اپنی اردو کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اور اپنے بڑے بوڑھوں کے گاڑھے پسینے سے سینچی ہوئی اس ہری بھری کھیتی سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

مہاتما جی۔ دیکھئے تو آپ کی اردو کسی بھاشا سے کبھی ہیٹی اور دبتی ہوئی نہیں۔ وہی باتیں وہی گھاتیں ایک ایک کر کے اس میں دیکھ لیجے تو نئی بھاشا کی جگہ اپنی اسی اردو کو ایسے ہی آگے بڑھائیے نا، جیسے آج تک ہندو مسلمان سب مل جل کے اُسے بڑھاتے اور سدھارتے چلے آئے۔

اس کے پرچار کے لئے پہلے ایسی ریڈریں لکھوائی جائیں جن میں عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہی گھلے ملے بول ہوں جنہیں سب بولتے ہیں۔ جیسے عربی، فارسی کے کڈھب بول ان میں جگہ نہ پا سکیں ایسے ہی ہندی کے بھولے بسرے بول بھی ان میں کہیں نہ آنے پائیں۔ اسی بات میں آگے بڑھ کر یہ دیکھ بھال بھی کرنا پڑے گی۔ اردو کے اور پھیلاؤ اور بڑھانے کے لئے کہاں کہاں سے اور کون کون سے بول چنے جائیں۔ یہ گتھی ایسے لوگوں کے اکٹھا کرنے سے سلجھ سکتی ہے۔ جو بھاشا کی بناوٹ، اس کا اُتار چڑھاؤ، لوچ، گھلاوٹ اور بولوں کی ناپ تول ان کا بھدا پن، ہلکاپن، یہ اور ایسی اور اور باتوں کو پرکھ سکتے ہوں۔

جیسی جگہ ہو چُن چُن کے ویسے ہی بولوں کا وہاں جڑنا اور بٹھانا جانتے ہوں۔ سب لوگ بھاشا کا ست لڑا نہیں بنا سکتے۔ بڑی سی بڑی سبھا میں سے بھی چھانٹئے گا تو ایسے لوگ کچھ ہی نکلیں گے۔ عربی، فارسی، ہندی ان میں سے نئے بول جن کے بھی ہوں پورے سوچ بچار سے جانچ جانچ کے ان کا چنا اور اُنہیں اپنی اپنی جگہ ایسا جمانا جو وہ پھر نہ اُکھڑ سکیں ایسے ڈھب انہیں لوگوں کو آتے ہیں جو بھاشا کے پورے ہتھکنڈے جانتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال سے یہ ریڈریں ایسی لکھی جائیں گی جن میں نہ بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول ہوں گے اور نہ ہندی کے بھولے بسرے بھد لیسے بول۔ ان میں نہ مولویوں، ملاؤں کے اُن گھڑ بول دکھائی دیں گے اور نہ پنڈتوں کے کٹھن اور کڈھب بول، ان میں نہ ٹھیٹ ملاپن ہوگا اور نہ ٹھیٹ پنڈت پن۔ یہ ریڈریں ٹھیٹ مولویوں اور ٹھیٹ پنڈتوں کی لکھتوں سے الگ ہوں گی۔

ان کے لکھنے کا ڈھب ایسا سمویا ہوا، موتی سا چمکتا، میٹھا پانی ہوگا۔ جس میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کا کوڑا کرکٹ اور گدلا پن کچھ بھی نہ رہ سکے گا اور یہ سوجھ بوجھ بڑھانے والا امرت جل آنکھوں سے پیا جائے گا۔ جس سے من دھلتے دھلتے چمک اُٹھیں گے اور آنے والی پود پہلے ہی سے یہ پریم جل پی کے سمجھ کی پوری آنکھ کھلنے تک ایسے ستھرے من کی ہو جائے گی جیسے پھرتی سے آگے بڑھنے اور دیس کے سنبھالنے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ رہے گی۔

پہلے ہی سے عربی، فارسی، ہندی ان سب کے ملواں بول ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے سے پھوٹ ڈالنے والا یہ دھیان کبھی بھولے سے بھی پھر کسی کو نہ آئے گا۔ اس لکھت میں بدیسی بولیوں کے اتنے بول ہیں اور دیسی بولی کے اتنے۔ ان میں سے انہیں چھوڑ کر اُنہیں چُن لینا چاہئیے۔ سب بولوں کے ساتھ ساتھ دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے ان سب کا پیار، پریم، جی میں جڑ پکڑتا چلا جائے گا اور سب اسی اردو کو اپنی بھاشا سمجھیں گے اور اس کے اور اور بناؤ سنگھار کے لئے سوچ سوچ کے نئے نئے ڈھب نکالتے رہیں گے۔ تو اس جتن سے بھاشا الگ پھلے پھولے گی۔ اور آجکل کی سی چھیڑ چھاڑ جس سے دیس کو گھن لگتا جا رہا ہے یہ بات بھی پھر نہ رہے گی۔ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے اس کہاوت کو سچا کر کے دکھا دیجے اور جو اوپر لکھا جا چکا ہے اس کا پرچار ایسا کیجے جس سے گھڑی گھڑی کے جھگڑے ٹنٹے کا سانپ بھی مر کے رہ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

بھاشا کے لکھنے کا ڈھنگ (Transcription.) کون سا رکھنا چاہئیے یہ بھی ایک بڑی اُلجھی ہوئی گتھی ہے۔ اس پر بھی یہیں لکھنا چاہتا تھا پر اس لئے چھوڑتا ہوں۔ ایک تو یہ بات کٹھن ہے اور اس کے کٹھن ہونے سے بہت پھیلنا پڑے گا۔ دوسرے یہاں تک جو کچھ لکھا جا چکا ابھی یہ بھی دیکھنا ہے اسے دیکھ کے آپ کہتے کیا ہیں۔ یہ باتیں آپ نے کان دھر کے سُن لیں تو پھر کبھی اس پر بھی جو جو باتیں دھیان میں ہیں ایک ایک کر کے سب لکھوں گا۔ اور بتاؤں گا اس کے لئے کیا کرنا چاہئیے۔

یہاں تک ادھ کٹے بولوں میں جو کچھ کہا جا چکا ٹھنڈے جی سے اسے آپ نے سُنا اور سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھا تو سمجھوں گا یہ لکھت ٹھکانے لگی اور جو یونہی دیکھ دکھا کے ڈال دیا تو بات آئی گئی ہوئی۔ اچھا، چلتے چلتے یہ ایک بات اور سُن لیجے:۔

اب تک میں نے جو کچھ کہا اسے آپ نہیں سنتے اور نہیں مانتے۔ نہ سنئے اور نہ مانئے۔ عربی، فارسی بولوں کو آپ ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ نہ لگائیے۔ ان بدیسی بولیوں کے بول آپ نہیں دیکھ سکتے۔ نہ سہی۔ اچھا ٹھیٹ اردو لکھنے

کا یہی ڈھب جو آپ کے سامنے ہے اسی کو برتئے اور اسی کا پرچار کیجئے
عربی، فارسی بول جن سے آپ کو چڑ ہے، دیکھ لیجے اس میں ان کا پتا بھی نہیں
تو پھر کو یوں، مت گتی، کبنا، اُد بھت، گنتو ہیچ، منو مکھتا، للکش، کرتویہ، ساتھیہ
سو بھاؤ، سمئے، جیون، آشا، دشا، شکتی، شکشا، سمبندھ، انیکتا، ہتوں،
ابھیاس، وشئے، شبد، رکھپا، نیشچئے، کلاہل، دیاکرن، ادوسے، راج نیتی
ایسے ایسے بھوسے لبسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس سے نئی بولی بنانے
کی کھکیڑیں اُٹھانے سے کیا یہ اچھا نہیں جو آپ اسی ٹھیٹ اردو لکھت
کے پرچار کی ہامی بھریں اور اسی کو پھیلائیں اسی کو آگے بڑھائیں۔

آپ سے باتیں کرتا تھا اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ ہے تو
پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ عربی، فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے
لکھتا جیسے لکھا کرتا ہوں تو اُس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے۔

اسے دیکھ چکنے پر جو بھی بات آپ کو دکھائی دے وہ آپ لکھ بھیجیں۔ پرماتما
کرے آپ انند ہوں۔

سید ابوالقاسم

حدیثِ حیات

ہوئی ہے منزلِ عنقا میں یوں گم داستاں میری
کہ مجھ کو ڈھونڈتی پھرتی ہے عمرِ جاوداں میری

ہے ذرّہ ذرّہ عالم کا زبانِ بے زباں میری
کہ ہے کل کائنات اک مختصر سی داستاں میری

فنا ہو یا بقا ہر دم ہیں دونوں ہمعناں میری
حیاتِ جاوداں میری ہے مرگِ ناگہاں میری

یونہی لے سنگِ در ہوتی ہے تکمیلِ نیاز اکثر
مرے سجدوں کی زینت ہے جبینِ خونفشاں میری

لڑایا تھا نگاہوں کو کبھی برقِ تجلّی سے
زبانِ طور خود دہرا رہی ہے داستاں میری

کبھی زنداں میں زنجیروں سے جا کر کھیلتا تھا میں
کبھی قیمت عزیزِ مصر پر بھی تھی گراں میری

کبھی مہدِ طفولیت میں اک رُوحِ مجسّم تھی
کبھی غارِ حرا میں تھی تجلّی ضوفشاں میری

مری عظمت مری رفعت مسلّم ہے زمانے میں
حقیقت ہے الٓم مہرِ نبوّت سے عیاں میری

محمد اسحاق الٓم

غزل

سونی پڑی ہے محفل سنسان ہیں فضائیں　　ساقی کسے پلائیں، مطرب کسے سنائیں

جن کی لطافتوں میں، گم تھی مری جوانی　　راتوں کی خامشی میں سنتا ہوں وہ صدائیں

جی بھر کے دیکھ لیتا بیمارِ دردِ ہجراں　　اے کاش جانے والے، اکبار لوٹ آئیں

دل کی ہر اِک تمنا، کروٹ بدل رہی ہو　　محشر بپا نہ کر دیں، ساقی تری ادائیں

توبہ کی اوٹ میں وہ، ایمان لڑکھڑایا　　چلنے لگیں ہوائیں، چھانے لگیں گھٹائیں

اس دُکھ بھرے جہاں میں کوئی نہیں کسی کا　　برباد ہو رہا ہوں، اب آپ ہی بچائیں

زاہد، گناہ میں بھی، تھا ذوقِ پارسائی　　اب بخشوا رہی ہیں، مجھ کو مری خطائیں

تاروں کے نوچنے کا۔ اک روز حکم دیجے　　اِک روز آپ میرے، دعوے کو آزمائیں

میں جانتا ہوں اُن کی فطرت ہے بے نیازی　　کرتا رہوں گا لیکن، بے خوف التجائیں

اب تک جگر میں کوئی کانٹا سا چبھ رہا ہو　　اب تک بھٹک رہی ہیں شاید مری دعائیں

اے دوست آ، کہ ہم تم اک آسماں تراشیں　　اے دوست آ، کہ ہم تم دنیا نئی بسائیں

اے کاش کوئی آکر ان کو سہارا دیتا
برباد ہو رہی ہیں، برباد کی وفائیں

احمد ندیم قاسمی

سینما

ہندوستان کے فلم ڈائرکٹر

انسان کے جسم میں مختلف اعضا و جوارح ہیں اور ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک خصوصیت کا مالک ہے۔ ایک کا فرض دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن قلب تمام اعضائے جسم اور جوارح بدن پر آمرانہ اختیار رکھتا ہے، جسم کا کوئی عضو قلب کی سلطنت و فرمانروائی سے آزاد نہیں، کائنات فلم میں یہی حیثیت فلم ڈائرکٹر کی ہے

ایک نگارخانہ مختلف اہل فن پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ سب ارکان و عناصر کا حکم رکھتے ہیں۔ لیکن ڈائرکٹر ان پر آمر اور فرمانروا ہوتا ہے۔ اداکار، عکاس، صدابند، غرض نگارخانہ کا ایک ایک کارپرداز بلکہ ایک ایک شے ڈائرکٹر کے اختیار و تصرف میں ہوتی ہے۔

اپنے ہمہ گیر فرائض و اختیارات کے اعتبار سے صنعت فلمسازی میں ڈائرکٹر جامع حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ اسے صنعتِ فلمسازی میں کامل دستگاہ ہوتی ہے، وہ باعتبار معلومات ہر شعبہ نگارستان پر حاوی ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک کامل ڈائرکٹر تہذیب و تمدن اور ادب و تاریخ میں بھی بصیرت و درخور رکھتا ہے۔ ڈائرکٹر کی ہستی غیر معمولی ہستی ہوتی ہے۔

ایک ماہرِ فن ڈائرکٹر جو اپنے فرائض سے کامل علم و خبر رکھتا ہو، جو صنعت فلمسازی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو، جس کی نگاہ دوررس اور مذاق بلند ہو وہ معمولی افسانے میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ وہ دقیقہ سنجی اور نکتہ آفرینی سے معمولی اداکار کو بھی سپہرِ فلم کا درخشندہ ستارہ بنا سکتا ہے۔

اس کے برعکس اگر ڈائرکٹر کامل الفن نہ ہو، قسمت کی یاوری یا مالکان فلم کی جہالت سے ڈائرکٹر بن گیا ہو، نہ اسے فن فلمسازی میں درک و مہارت حاصل ہو نہ رفعتِ ذوق و وسعت نظر سے بہرہ مند ہو، نہ تہذیب و معاشرت اور تاریخ و تمدن سے علم و واقفیت رکھتا ہو تو ایسا ڈائرکٹر قدم قدم پر ٹھوکر کھائے گا، بات بات میں غلطی کرے گا۔ اور اپنے ساتھ فن کی رسوائی کا بھی سبب ہوگا۔

جو لوگ محض عامیانہ مذاق کے زیر اثر سینما نہیں دیکھتے بلکہ تصاویر کے معائب و محاسن پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ جن کی معلومات میں وسعت اور دماغ میں حقیقت فہمی کی صلاحیت ہے ان کی تنقیدات و تبصرات کو ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک ڈائرکٹر کی قابلیت یا عدم قابلیت سے ایک فلم کس طرح بلند یا پست ہو جاتی ہے۔ ایک معمولی اداکار کس طرح کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور ایک لائق اداکار کس طرح ناکامیابی کے غار میں گر پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر راجکماری کو لیجئے "انصاف کی توپ" میں اسے قابل ڈائرکٹر سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس لئے وہ اس فلم میں ناکام رہی، لیکن "دیوداس" میں اسے اچھا ڈائرکٹر مل گیا اس لئے وہ چمک گئی۔ اس کے بعد کروڑپتی اور پجارن میں اسے اور بھی کامیابی ہوئی، دوگایائی کھوسلے کو دیکھئے "پتیت پاون" میں اسے اچھا ڈائرکٹر نہیں ملا، لہذا وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی، لیکن "راج رانی میرا" اور "سیتا" میں اچھے ڈائرکشن کی وجہ سے صفِ اوّل کی اسٹاروں میں اس کا شمار ہو گیا۔

ڈائرکٹروں کے اغلاط کی بعض نمایاں مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ڈائرکٹر کو کتنا حاضر دماغ اور وسیع النظر ہونا چاہیئے، الیسٹ انڈیا فلم کمپنی کی "سیتا" میں رام چندر مہاراج کے دو بچوں کے بھی واقعات ہیں۔ ڈائرکٹر نے ان کے پارٹ دو لحیم و شحیم جوانوں سے کرائے ہیں۔ خیال فرمایئے کسقدر مضحکہ خیز بات ہے؟

"عورت کے پیار" میں فریدہ ایک دوشیزہ عورت ہے۔ اس کی جگہ ڈائرکٹر نے ۵۰ سال کی مس مختار کو پیش کیا، ایک رسمی مس حقیقی معنوں میں تو دوشیزہ ہو نہیں سکتی۔ اس لئے اس کا بعید از اصلیت پارٹ ایک ذوقِ سلیم میں تکدر پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "آنکھ کا نشہ" میں ناگکہ کا کام ایک جوان ایکٹرس کرتی ہے۔ ڈائرکٹر نے غالباً صرف یہ

لحاظ رکھا کہ جوان ایکٹرس کے پارٹ سے فلم بیں محظوظ ہوں گے ، اگر کسی سن رسیدہ عورت سے یہ پارٹ کرایا گیا تو فلم کی جاذبیت میں کمی ہو جائے گی۔ اگر یہی بات ہو تو ڈائرکٹر نے جاذبیت پر اصلیت قربان کر دی۔

فلم ڈائرکٹر کے اختیارات و فرائض اور اس کی قابلیت و عدم قابلیت کے نتائج و اثرات پر بالاختصار گفتگو کرنے کے بعد آیئے ہندوستانی فلم ڈائرکٹروں کی مہارت فن اور صلاحیت کار کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں اور دیکھیں ان میں کس کا درجہ کیا ہے اور یہ رائے بھی قائم کریں۔ کہ سب سے بڑا ماہرِ فن کون ہے ؟

ہندوستان کے مشہور فلم ڈائرکٹروں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

چندو لال شاہ ، رام شنکر چودھری ، نیتن بوس ، پرم تھیش بروا شانتارام ، پی کے اترتھی ، دیو کی کمار بوس ، یہ لوگ صف اوّل میں شمار ہوتے ہیں دوسرے درجے میں مسٹر بھونانی ، سرو تم بادامی ، مسٹر آسپین (بمبئی ٹاکیز)، مسٹر عذرا میر ، مسٹر کاردار ، مسٹر لوہار ، بابوراؤ پینٹر ، نند لال گنگولی (دینا ناتھ) ، پریمل راؤ ، جیوتش بنرجی۔

ان سب کے علاوہ جتنے ڈائرکٹر ہیں ان کا شمار تیسرے درجے میں ہوتا ہے۔

چندو لال شاہ کی بہترین فلم "بیرسٹر کی بیوی" ہے اور یہ ان کی تمام فلموں میں فنی اعتبار سے سب سے زیادہ بلند ہے۔ اس کے بعد چاہیئے تھا کہ وہ بتدریج ترقی کرتے جاتے اور نقش ثانی نقش اوّل سے روشن جلی اور دلکش ہوتا جاتا۔ لیکن صورت واقعہ اس کے برعکس ہے حقیقت یہ ہے کہ چندو لال شاہ کو فن سے زیادہ روپیہ عزیز ہے۔

رام شنکر چودھری کے کمال فن کا مخصوص ترین کارنامہ "مادھوری" اور "ٹیمپل بیلز" ہیں۔ ان کی باقی فلموں میں ان دونوں سے زیادہ بلند کوئی بھی نہیں ہے ، سب ان سے فروتر ہیں۔ رام شنکر کی قابلیت میں کلام نہیں ، لیکن خبر نہیں وہ اپنے جوہر قابلیت سے کام کیوں نہیں لیتے؟ انہوں نے حال ہی میں ایک انٹرویو کے دوران میں کہا تھا کہ وہ تاہنوز ایک عجیب حالت میں مبتلا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے کمال فن کے اظہار سے قاصر ہیں۔ تاہم ان کا آغوش دل تمناؤں سے خالی نہیں ـــــ ان کی آرزوئیں پھل پھول کر وقت کا انتظار کر رہی ہیں۔

فلم بیں حضرات بھی صبر کے ساتھ انتظار فرمائیں۔ اگر وہ وقت آیا تو مجھے تبصرۂ ثانی میں چنداں زحمت نہیں ہوگی۔

صف اوّل کے باقی ڈائرکٹروں میں نیتن بوس ، بروا ، شانتارام اور دیو کی بوس بے شبہ اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں اور ان کے درک و تبحر میں کسی کو کلام نہیں ، تاہم ان میں ہر ایک کی صحیح صحیح پوزیشن دریافت کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ان کے کاموں کا بنگاہِ تعمق مطالعہ کیا جائے۔

مسٹر نیتن بوس اور مسٹر پرم تھیش بروا "نیو تھیٹرز" (کلکتہ) کے ڈائرکٹرس ہیں۔ اور اس کمپنی کی متعدد کامیاب اور مشہور فلمیں پبلک میں آچکی ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان فلموں کی کامیابی کا تمام تر امتیاز و اختصاص انہیں کو حاصل ہے یا اس میں ان کے دوسرے رفقائے کار بھی حصہ گیر ہیں۔

نیو تھیٹرز کے فلموں کی کامیابی کا سب سے زیادہ انحصار اس کے بیک گراؤنڈ میوزک اور موسیقی پر ہے اور اس کا کامل امتیاز مسٹر آر۔ سی۔ بورل کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں مسٹر کندن لال سہگل اور کے۔ سی۔ ڈے۔ جیسے موسیقی طراز اشخاص کمپنی میں موجود ہیں۔ جن کی نغمہ زائی اور ترنم آفرینی نے ملک کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہندوستان کا باکمال اداکار مسٹر پرتھوی راج کپور اسی کمپنی کی شہرت و ناموری کو چار چاند لگا رہا ہے۔ مسٹر سہگل ، پہاڑی سانیال اور نواب جیسے ماہرِ فن اداکار یہاں کی فلموں میں کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کی ممتاز ترین ایکٹرسیں مس اوما شاشی ، مس چندرا ، مس جمنا اسی کمپنی کی فلموں کی رونق و دلکشی اور مقبولیت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ نیو تھیٹر کے عکاس اور صدا بند بھی اپنے فن میں معقول دستگاہ رکھتے ہیں۔ مسٹر امر ملک ، مسٹر کدار اور مسٹر سدرشن جیسی قابل شخصیتیں بھی یہیں موجود ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "نیو تھیٹرز" کی فلموں کی رفعت و برتری میں... نیتن بوس اور بروا کے علاوہ ان اشخاص کی کارفرمائیاں بھی شامل ہیں۔

مسٹر شانتارام "پربھات" میں کامل اختیار و تصرف رکھتے ہیں۔ اور "پربھات" ہندوستان کی ایک فارغ البال کمپنی ہے۔ اس لئے وہاں شانتارام کو ہر طرح کی آسانیاں حاصل ہیں ، اس کے علاوہ انہیں مسٹر فتے لال اور مسٹر دھائے وار جیسے اہلِ فن کی اعانت حاصل ہے۔ اس لئے "پربھات" کی فلمیں صرف شانتارام کی کاوشِ فن کی مرہونِ منت نہیں۔ دوسرے اسباب کی سازگاریاں بھی ان کے محاسن کا باعث ہیں

دیو کی بوس پہلے "نیو تھیٹرز" میں تھے۔ آج کل ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اس لئے ان بیچارے کے ساتھ معذرت نا

فضول ہے۔ ان کو بھی وقت آنے تک کے لئے چھوڑ دیجئے۔

یہ ہے ہندوستان کے ممتاز اور نامور ڈائرکٹروں کی پوزیشن کا اجمالی خاکہ۔ اب آئیے دیکھیں ان میں سب سے زیادہ صناع اور ماہرِ فن کون ہے۔

نیتن بوس نے اب تک تین فلمیں تیار کی ہیں۔ "ہندی چنڈی داس" "ڈاکو منصور" اور "بھاگیہ چکر" (تقدیر کا چکر) ان میں سے "ڈاکو منصور" کی فلمبندی اس زمانے میں ہوئی تھی جب "نیو تھیٹرس" اپنے نصب العین میں تغیر کرنا چاہتی تھی۔ اور اس کا رجحان "بوکس آفس" کی جانب ہو رہا تھا۔ اس لئے "ڈاکو منصور" کا معیار لازمی طور پر پست ہے — "چنڈی داس" کے لئے بھی نیتن بوس کو کوئی امتیاز نہیں دیا جا سکتا۔ کہ قبل ازیں ایک متبحر اہلِ فن اسے تیار کر چکا تھا۔ "بھاگیہ چکر" بے شک فنی حیثیت سے ایک بلند پایہ اور معیاری فلم ہے۔ لیکن اس کا بھی تمام تر امتیاز صرف نیتن بوس کو بخش دینا ان ارباب فن پر صریح ظلم ہوگا۔ جن کا "بھاگیہ چکر" کے محاسن میں ناقابلِ انکار حصہ ہے۔ فلم کا سنگِ بنیاد فسانہ ہوتا ہے۔ اور "بھاگیہ چکر" مسٹر سدرشن کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے جو اردو اور ہندی کے نامور اور کامیاب فسانہ نویس ہیں۔ اس فلم کی اداکاری اور موسیقی بھی قابلِ قدر و داد ہے۔ اس لئے بھاگیہ چکر کو ایک گراں پایہ فلم قرار دینے کے باوجود اسے صرف نیتن بوس کا کارنامہ نہیں کہا جا سکتا۔

مسٹر بروا کی شہرت کو "دیوداس" اور "منزل" نے دو شہپر لگا دئے ہیں۔ جن کی مدد سے وہ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہو گئے ہیں۔ لیکن ان دونوں فلموں کے اوصاف و محاسن کی تحلیل و تجزیہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی کامیابی میں پچاس فیصدی حصہ ان کے فسانوں کا ہے جو بنگال کے شہرۂ آفاق اہلِ قلم شرت چندر چٹرجی کے ناولوں کا چربہ ہیں۔ پچیس فیصدی اداکاروں اور دوسرے ماہرین فن کا اور صرف پچیس فیصدی حصہ مسٹر بروا کا ہے۔ مسٹر سہگل، مسٹر کے۔ سی۔ ڈے اور مس جمنا نے دیوداس میں خوب خوب داد کمال دی ہے۔ سہگل کی نغمہ طرازی تو دیوداس کی جان ہے۔

"منزل" کی تمہید میں پرتھوی راج کپور نے بہت اچھا کام کیا ہے خود مسٹر بروا اور مس جمنا نے اس فلم میں قابلِ داد پارٹ کئے ہیں۔ غرض دیوداس اور منزل میں مسٹر بروا کا ڈائرکشن کوئی امتیازی خصوصیت نہیں رکھتا۔ لیکن میری رائے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ مسٹر بروا اچھے ڈائرکٹر نہیں ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ "دیوداس" اور "منزل" کی کامیابی و قبولیت کا تمام تر امتیاز مسٹر بروا کو حاصل نہیں اور وہ ہندوستانی ڈائرکٹروں میں سب سے اوّل قرار نہیں دئے جا سکتے۔

شانتا رام اور دیوکی بوس بھی اپنی اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق فلمسازی میں ہندوستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔ شانتا رام نے اب تک مفصلہ ذیل سات فلمیں تیار کی ہیں۔

(۱) اجودھیا کا راجہ - (۲) جلتی نشانی - (۳) مایا مچھندر - (۴) سیرندھری (۵) امرت منتھن (۶) مہاتما - (۷) امر جیوتی -

اسی طرح دیوکی بوس نے بھی سات تصویریں بنائی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) چنڈی داس (بنگالی) (۲) پورن بھگت (۳) راج رانی میرا (۴) سیتا (۵) انقلاب (۶) جیون ناٹک (۷) سنہرا سنسار۔

شانتا رام کی پہلی تین فلمیں اجودھیا کا راجہ - جلتی نشانی اور مایا مچھندر فن کے اعتبار سے بہت زیادہ بلند نہیں ہیں۔ ان کے کمال فن کا اظہار "امرت منتھن" سے شروع ہوتا ہے۔ جو "مہاتما" میں مزید ترقی کرتا ہے۔ اور "امر جیوتی" میں بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ لیکن دیوکی بوس کی تمام فلمیں اوّل سے لے کر آخر تک کمال صنعت اور مہارت فن کا نمونہ ہیں اور یکے بعد دیگرے علی الترتیب ترقی کرتی چلی گئی ہیں۔

شانتا رام کے ڈائرکشن میں صنعت سے زیادہ آمدنی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور فن پر کاروبار کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تصویریں اغلاط و نقائص سے معمور ہیں۔ سنجیدہ پبلک تو اب برمحل گانوں کو بھی چنداں پسند نہیں کرتی۔ لیکن مسٹر شانتا کی پست مذاقی کا یہ حال ہے کہ وہ بے محل گانوں سے بھی پرہیز نہیں کرتے، ان کی فلموں میں ڈرامٹک گانے تک موجود ہیں، آخر اس سے زیادہ ابتذال ذوق اور کیا ہو سکتا ہے "امرت منتھن" اور "مہاتما" میں بے شک مسٹر شانتا نے صنعت دانی اور دانش فن کا ثبوت دیا ہے، اگر وہ عامیانہ مذاق سے بلند ہو کر اور کاروبار پر فن کو فائق رکھ کر ڈائرکشن کریں تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ہندوستان کے قابل فخر فلم ڈائرکٹر ہو سکتے ہیں۔

اب صفِ اوّل کے ڈائرکٹروں میں صرف دیوکی بوس کی ذات باقی رہ جاتی ہے اور میرے نزدیک مسٹر دیوکی ہی ہندوستان کے سب سے ممتاز اور باکمال فلم ڈائرکٹر ہیں، ان کی جتنی فلمیں ہیں سب معیاری

ہیں، سب بلند پایہ ہیں، سب کمالِ فن کا نمونہ ہیں، صرف مسٹر بروا کی "منزل" دیوکی بوس کی "انقلاب" سے فائق اور "جیون ناٹک" سے فروتر ہے باقی تمام ہندوستانی فلموں پر دیوکی بوس کی تصویریں ترجیح و فوقیت رکھتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی معیارِ فلم کی بلندی کا تمامتر شرف و امتیاز مسٹر دیوکی بوس کو حاصل ہے۔ جس زمانے میں ہندوستانی فلم اسٹوڈیو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ستیہ وان ساوتری، صبح کا ستارہ جیسی پست، مبتذل اور عامیانہ تصویریں تیار کر رہے تھے۔ دیوکی بوس نے "چنڈی داس" اور "پورن بھگت" پیش کر کے دنیائے فلم میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اور جس وقت تک چندولال شاہ "رادھا رانی"، "شانتا رام" "ادھیا کا راجہ" اور "مایا مچھندر" سے بہتر تصویر پیش نہ کر سکے تھے، مسٹر بروا کے نام سے بھی پبلک واقف نہ تھی اور مسٹر نیتن، دیوکی بوس کی نگرانی میں تحصیلِ فن کر رہے تھے مسٹر دیوکی چنڈی داس اور پورن بھگت جیسی بلند پایہ فلموں کی تکمیل کر چکے تھے جن کی نظیر آج بھی ہندوستان کی دنیائے فلم میں ناپید ہے۔

چنڈی داس اور پورن بھگت سے پہلے پردۂ فلم تھیئٹر اسٹیج کی مضحکہ انگیز نقل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ تھیئٹر ہی کی طرح منظوم اور مقفیٰ مکالمے ہوتے تھے۔ ویسے ہی محل بے محل گانے، سحر و جادو کے دور از حقیقت واقعات۔ اور انہیں چیزوں کی پبلک طالب اور خوگر تھی۔ یہ مسٹر دیوکی ہی کا کمالِ فن تھا کہ اس نے چنڈی داس اور پورن بھگت تیار کر کے تن تنہا مذاقِ عام کے سیلاب کا رُخ پلٹ دیا۔ اور نقل میں اصل زندگی کی صحیح شان پیدا کر دی۔ اب جو ہماری فلمیں ہماری حقیقی زندگی سے روز بروز قریب تر ہوتی جا رہی ہیں اس مصلحانہ رہنمائی کا شرف صرف دیوکی بوس کو حاصل ہے۔

دیوکی بوس کی فلموں میں ایک شعریت ہوتی ہے، ایک شاعر کی رُوح کارفرما ہوتی ہے، ان میں ایک خاص پیغام ہوتا ہے۔ اگر "جیون ناٹک" ہمیں فطرت کی جانب بازگشت کرنے کی دعوت دیتی ہے تو "انقلاب" میں محبت کی دعوتِ عام موجود ہے —— فنی نقطۂ نظر سے "انقلاب" کا معیار بہت بلند ہے۔ یہ تصویر ہمیں کسی محدود کردار سے روشناس کرانے کی بجائے ہمارے سامنے دنیا کا ایک وسیع مرقع پیش کرتی ہے۔ اس کا "مسافر" ایک دنیا دیکھے ہوئے ہے اور دنیا کی فطرت و طینت سے بخوبی واقف ہے، وہ دنیا کی زمانہ سازی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس کی "زمین" دنیا سے بیزار ہو چکی ہے۔ وہ اس کی گیا دیو سے متنفر ہے، وہ اس کے دامِ فریب کو پارہ پارہ کر کے اس سے نکل بھاگنا چاہتی ہے۔ اس کا "جلیسوال" نوجوان ہے، وہ دنیا کی لغویت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ انقلاب کا طالب ہے، وہ سوسائٹی میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے، وہ سوسائٹی کی تمام بے ہودہ بندشوں کو نیست و نابود کر ڈالنے پر تُلا نظر آتا ہے۔

اس طرح "جیون ناٹک" بھی ایک خاص حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے، اس کی "کومن" کے نزدیک فطرت کی جانب بازگشت کرنے کا پیام محض لایعنی ہے، وہ اپنے کوٹھے سے شوق و تمنا سے دنیا کی آغوش میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن بعد میں اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دنیا جو دور سے نظر فریب و دل آویز پھولوں کا تختہ نظر آتی تھی وہ خاردار جھاڑیوں سے لبریز ہے۔ اور ان جھاڑیوں میں ایک سے ایک ہولناک درندے اور زہریلے جانور چھپے ہوئے ہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہم ایک دوسرے کو کھا جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں مصیبت زدوں کی مصیبت کی کچھ پروا نہیں، ہم اپنی مسرت و شادمانی اور آسائش کے لئے دوسروں کی گردن پر چھری چلاتے ہیں، ہمیں محبت کرنے کے لئے دوسروں کی دلشکنی کرنی پڑتی ہے۔ وہ ان حالات سے پریشان ہو جاتی ہے۔ اسے پھر فطرت کی جانب بازگشت کرنے کا پیام ملتا ہے، وہ اس بار اس پیام کو سنتی ہے اور دنیا کی تمام الجھنوں کو روندتی ہوئی اس سے نکل جاتی ہے۔

"سنہرا سنسار" بھی ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر تیار ہوئی ہے اس فلم کے ذریعہ بھوک کے مسئلہ کو حل کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے اور توقع ہے کہ مسٹر دیوکی کے ایک خاص کارنامے کی حیثیت سے "سنہرا سنسار" پبلک سے دادِ تحسین حاصل کرے گی۔

ماہرِ فن ڈائرکٹر کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ معمولی اداکار کو بھی اپنی تعلیم و ہدایت سے کامیاب اداکار بنا دے اور اس کی اداکاری و جذبات نگاری میں کمال پیدا کر دے، مسٹر دیوکی بوس میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ مہارتِ فن اور کمالِ تجربہ سے معمولی اداکار کو کامیاب اور کامیاب کو کامیاب تر بنا دیتے ہیں۔ جس اداکار نے مسٹر دیوکی کے ماتحت کام کیا وہ پبلک کے دل کا مالک ہو گیا۔ کیا "پورن بھگت" کے کمار کو کوئی ہندوستانی فلم بین کبھی بھول سکتا ہے؟ مدت العمر نہیں۔ ہندوستانی فلم میں درجۂ اوّل کے جتنے ایکٹر اور ایکٹریس ہیں سب کے سب دیوکی بوس کے تربیت یافتہ ہیں، درگا داس بنرجی، پرتھوی راج کپور اور نواب ہندوستان کے

کامیاب ترین اداکار سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح ایکٹرسوں میں مس افشاں شتی اور ورنگا بائی کھوٹے اوّل درجے کی ایکٹرسیں خیال کی جاتی ہیں - ان سب کو درجۂ کمال پر پہنچانے والے مسٹر دیو کی ہیں -

غرض دیو کی بوس نے ہر طرح صنعت فلم سازی کو ترقی دی - فلم کا معیار بلند کیا، خود اچھی فلمیں تیار کیں، دوسروں کو اپنی پیروی پر مجبور کیا - اقرب الی الفطرت تصویریں تیار کر کے دنیائے فلم میں ایک جدید دور جاری کیا، ایکٹروں کو اداکاری و جذبات نگاری کے رازہائے سربستہ سے مطلع کیا - ڈائرکٹروں اور اداکاروں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اداکاری رونے، ہنسنے، اچھل کود کرنے اور گانے کا نام نہیں ہے - اداکاری کے معنی ہیں انسانی جذبات و احساسات کی حقیقی ترجمانی و نمائش - مسٹر دیو کی کے ان کمالات اور کارناموں کی بنا پر اہنیں ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ڈائرکٹر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا -

"تماشائی"

دیہاتی مدرّس

یاس گیں - سہما ہوا - غم آشنا - بے آبرُو ‏ ‏ آدمی ہے یا کسی حسرت زدہ کی آرزُو

جھرّیاں چہرے پہ ماتھے پر الم کی تیرگی ‏ ‏ جسم لاغر، جامہ بوسیدہ، نگاہیں رحم جُو

رکھا ہی کیا ہے سیہ بختی نے بیچارے کے پاس ‏ ‏ چند آہیں، بے اثر فریاد، سوزِ آرزُو

خوف سے افسر کے آہیں حلق میں اٹکی ہوئیں ‏ ‏ خشک ہونٹوں پر سیاہی اور آنکھیں باوضُو

سینچتا رہتا ہے رقّت آفریں حالات میں ‏ ‏ قوم کے پودوں کو دے دے کر کلیجے کا لہُو

یہ خداوندانِ ارضی کی جفا سے نوحہ گر ‏ ‏ اور اربابِ حکومت اس کے دم سے سرخرُو

رُوح اس کی پارہ پارہ دردِ غم انگیز سے ‏ ‏ زندگی اس کی رہینِ مسلکِ لا تقنطُو

آہ سے اس کی جہاں میں زلزلہ آنے کو ہے
قصرِ استبداد کی بنیاد ہِل جانے کو ہے

شیر افضل خاں جعفری

نورجہاں

ایک منظر

آگرہ کا قلعہ، شام کا وقت ہے، سنہری آفتاب کی زرّیں شعاعیں درختوں کی پتیوں پر ایک خوشنما رنگ پیدا کر رہی ہیں، جمنا کی لہروں میں آفتاب کا رنگ جاذبِ توجہ ہے، ایسا سہانا منظر ایسا دلکش سماں —— ہلکی ہلکی فرحت بخش ہوا رُوح کو تازگی بخش رہی ہے، ملکہ نورجہاں آج باغ میں ٹہلنے کی بجائے دریا کی سیر کے لئے بارہ دری کی چھت پر چڑھ آئی ہیں - شاعری کی دھن سوار ہے اور اپنی شاعرانہ دنیا میں کھوئی ہوئی والہانہ طور پر اپنے جذبات کی رو میں بہہ رہی ہیں، کبھی کوئی اچھا مصرع ہو جاتا ہے تو ترنّم کے ساتھ گنگنانے لگتی ہیں - ہاتھ بھی ہلنے لگتے ہیں، دریا کی بھی سیر دیکھ رہی ہیں۔ ایک لونڈی سے قلم اور کاغذ منگایا دوسری ایک گوشہ میں کھڑی ہوئی دریا کی سیر دیکھ رہی ہے - کبھی کسی اور طرف دیکھنے لگتی ہے اور چور نظروں سے بیگم کی کیفیت اور مجنونانہ حالت کو دیکھ کر دوسری کنیز سے بھی سرگوشی کرتی جاتی ہے - جو ابھی کاغذ دے کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی ہے - یہ لیجئے ایک شعر ہو گیا، اب کاغذ پر لکھ رہی ہیں - ؎

کشادِ غنچہ اگر از نسیم گلزار است
کلیدِ قفلِ دلِ ما تبسّم یار است

اور اب اسے بار بار گنگنا رہی ہیں، دریا میں اِدھر اُدھر دو ایک کشتیاں دُور تیر رہی ہیں، سامنے سے ایک کشتی کنارے کنارے آہستہ آہستہ آ رہی تھی - اب آ کر سامنے ایک طرف ٹھہر گئی، تین آدمی بیٹھے ہیں ایک طرحدار نوجوان بیٹھا ہوا اس طرف تک رہا ہے، اور ملکہ کی کیفیات کو حریصانہ نگاہ سے دیکھ رہا ہے، ——

اب ایک مصرع اَور ہو گیا ؏

دلِ کسیکہ بحسنِ ادا گرفتار است

سر جھکا کر دریا کی جانب رُخ کئے دوسرے مصرعے کی فکر میں غوطہ زن ہیں، وہ بلیساختہ آ گیا، ؏

نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف

بیگم اُچھل پڑیں اور اب عجلت کے ساتھ لکھ رہی ہیں، کشتی میں بیٹھا ہوا نوجوان نہایت بیتابی سے بیگم کی طرف دیکھ کر کشتی میں اُچھل رہا ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ عورت مجھے پرچہ لکھ رہی ہے یہ لیجئے اب تو وہ اپنی کشتی اور بھی قریب لے آیا - ساتھی بھی اس کے سمجھائے یہی سمجھ رہے ہیں - اور ڈرتے ڈرتے محل کی جانب کشتی بڑھانے پر راضی ہو رہے ہیں، ایک نے تو ہاتھ بڑھا کر نوجوان کے ہاتھ سے ڈانڈ بھی چھین لی - وہ جھنجلاتا ہے اور بیگم کی حالت دکھا کر بیتابی سے کشتی قلعہ سے قریب کرتا چلا آتا ہے، اس طرف بیگم پورا شعر جوش کے ساتھ ترنّم سے پڑھتی ہیں ؎

نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف
دلِ کسیکہ بحسنِ ادا گرفتار است

"کسے" پر زور دیتی ہیں اور ہاتھ کا اشارہ اپنی جانب کرتی ہیں اور "حُسنِ ادا" پر ہاتھ لمبا کر دیتی ہیں وہ شخص یہ سمجھ کر کہ یہ عورت مجھے اشارہ کر رہی ہے - پرچہ لکھ چکی ہے اور اب اظہارِ عشق کر رہی ہے خود بھی چلّا کر ایک شعر پڑھتا ہے، (کشتی بالکل قریب آ چکی ہے) ؎

اے کہ باسلسلۂ زلف دراز آمدۂ
فرصتت باد کہ بیگانہ نواز آمدۂ

آواز کے ساتھ ہی بیگم کی نگاہ اس شخص پر پڑتی ہے، اس کے اشاروں اور عاشقانہ طور کو دیکھ کر بیگم غصّہ سے تھر تھر کانپتی ہیں، دوسری لونڈی اشارہ کرتی ہے کہ واپس ہو جائے، وہ دُور سے اس مفہوم کو نہیں سمجھتا اور لجاجت کے ساتھ ایک شعر اور پڑھتا

ہے سے

زاہد من با تو چہ سنجد کہ بغمائے دلم
مست و آشفتہ بجلوتگہ رانہ آمدہ

بیگم غصہ سے تاب نہ لاکر فوراً کمان پر تیر چڑھاتی ہیں، دوسرے ہی لمحہ میں نوجوان کی لاش کشتی میں تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے، دونوں لونڈیاں لرزہ بر اندام ہیں، بیگم کی غصہ سے تیوری چڑھی ہوئی ہے، بپھری ہوئی شیرنی کی طرح واپس ہوتی ہیں اور نیچے اُتر جاتی ہیں، دونوں کنیزیں بھی بھیگی بلی کی طرح پیچھے پیچھے جا رہی ہیں۔

عبیداللہ قدسی

سہرا

بہ تقریب سعید کتخدائی جناب راجہ محمد افضل خاں صاحب فرزند ارجمند جناب محترم خان بہادر راجہ فاضل محمد خاں صاحب پی۔ای۔ایس۔ ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن میونسپل بورڈ دہلی

پڑھ کے گوندھا جو گیا انّا فتحنا سہرا — سارے سہروں میں رہا اس لئے اچھا سہرا

ہر لڑی سہرے کی گوندھی گئی ہو پڑھ کے درود — واہ واصلِّ علیٰ لکھا ہے کیسا سہرا

آبِ کوثر سے وضو کر کے تخیل نے مرے — لب پہ تھا صلِّ علیٰ لکھا جو یکتا سہرا

نورِ ایمان ہوا لوحِ جبیں پر بیدار — دستِ شفقت سے بزرگوں نے جو باندھا سہرا

ہر طرف سے یہ ندا آئی "مبارک باشد" — باندھا فاضل نے جو افضل کے یہ اعلیٰ سہرا

عرقِ روئے محمد کی ہے ہر گل میں شمیم — اس سے دنیا میں نہیں کوئی نرالا سہرا

اس سے ممتاز کی ممتاز محبت ہے عیاں
سارے سہروں میں ہے ممتاز سراپا سہرا

ممتاز فاروقی
بیرسٹر ایٹ لا (گجرات)

سوال و جواب

سوالات

(۱) مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے۔

(۱) اکبر الہ آبادی کا اردو شعرا میں کیا درجہ ہے؟ کلام اکبر کے محاسن و معائب پہ ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ رباعیات و قطعات کے علاوہ اکبر کے کلام کا بیشتر حصہ ابتذال و عریانی سے پُر ہے کیا آپ کی نظر میں حضرت اکبر بھی "ذوقی" ہیں یا نہیں؟

(۲) مندرجہ ذیل الفاظ کی تذکیر و تانیث مشتبہ ہو رہی ہے ان میں سے اکثر دونوں طرح مستعمل ہیں۔ آپ اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کریں۔

فکر۔ طرز۔ سائنس۔ لغات۔ موٹر۔ تار۔

نیاز مند
چرنجی لال گینا آتش بی۔ اے۔ موگا ضلع فیروز پور

(۲) بسلسلہ سوال و جواب ماہ فروری ۳۷ء عرض ہے کہ اصل لفظ نَدِی بغیر تشدید دال ہے یہ لفظ بھاشا کا ہے اس میں نون مفتوح اور دال مکسور ہے۔ گوسائیں تلسی داس فرماتے ہیں ؎

تلسی اس سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ
سب سے مِل جُل بیٹھئے ندی ناؤ سنجوگ

ہندی کے ایک اور مستند شاعر کا دوہا ہے ؎

ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے
جا کارن جوگن بنی، وہی نہ جلتا ہوئے

چڑی چونچ بھر لے گئی ندی نہ گھٹیو نیر　(بھگت کبیر)

ندیاں بصورتِ جمع بھی بغیر تشدید بالکل درست ہے اور لکھنا چاہیئے۔ مثلاً ؎

کہیں بگلوں سے اک بارش سی ہے سیمیں ہیولوں کی
کہیں سرسوں سے ندیاں بہ رہی ہیں زرد پھولوں کی

بعض شعراء اسے مشدّد لکھتے ہیں مگر اس کے جواز میں کوئی سند نہیں ملتی۔ اسے ان کا تصرّف یا سُبول چُوک سمجھ لیجئے۔ خیر یہ تصرّف تو مذاقِ سلیم کو گراں نہیں گزرتا اگر کوئی ندی بہ تشدید دال لکھ دے تو غلط نہیں۔ مگر بعض جگہ یہ تصرّف بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً بھاشا کا لفظ کنگنا بہ سکون گاف تمام ہندوستان میں لکھا اور بولا جاتا ہے۔ استاد ذوق نے اسے کنگَنا نظم کیا ہے (سہرے میں) جو قابلِ تسلیم و تقلید نہیں ہے۔

(خستہ، جہلم)

(۳) ا۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا آسمان چکر کاٹتا ہے۔ لیکن اب یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اس لئے "گردش گردوں" کہنا صحیح ہے یا نہیں۔ اسی طرح کے کئی محاورات ہیں ان کا استعمال کہاں تک جائز ہے؟

(ب) آندھیاں چلنا درست ہے یا آندھیاں آنا ؎

اب زمیں ہلنے کو ہے اور آندھیاں آنے کو ہیں

(ج) "میں نے وہ الفاظ سادگی سے استعمال کئے۔ کسی کے دل کو دکھانا منظور نہ تھا۔" کیا یہاں سادگی کے معنی غلطی سے ہیں یا کچھ اور۔ اصل مطلب کیا ہے۔

شیخ محمد طفیل (امرتسر)

(۴) مجھے شاعر بننے کا شوق ہے، لیکن شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس معاملے میں میری راہنمائی فرمائیں۔

(حافظ رفیع الدین)

(۵) اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے اور اس کے بعد کون ہوگا؟　(رائم شفیع)

(۶) ہندوستان میں صحیح قوم پرست اخبار کون کون سے ہیں۔

(جیون لال)

(۷) میں عامل کریم الدین سے ملنا چاہتا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟　(شاہ محمد)

(۸) میں "مخزن" کا خریدار بننا چاہتا ہوں، براہ کرم اس کے دفتر کا پتہ تحریر کر کے ممنون فرمایئے۔

(۹) مولینا سیماب کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جوہر اعظمی

جوابات

نذیر احمد شاد بی۔ اے (ملتان)

(۱) لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی ایک مشرقی ماحول میں پیدا ہوئے، مشرقی تہذیب میں انہوں نے تربیت پائی۔ مذہب کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔

مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا تصادم اور اس تصادم میں مشرقی تہذیب کی پسپائی۔ اس کے ساتھ مذہب سے عام بے اعتنائی کے مناظر نے ان کے احساس کو مجروح کیا۔ ان کی شاعری درحقیقت مغرب زدگی اور مغربی تہذیب کی پرستاری کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے جسے کبھی رو کر اور کبھی ہنس کر بلند کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک خدا۔ مذہب، ضمیر، کیرکٹر، اور مشرقیت کو مغربی تعلیم و تہذیب نے رخصت کر دیا ہے۔ انسانیت اس تہذیب کی کورانہ تقلید سے دکھ اٹھا رہی ہے۔ اکبرؔ کی ساری شاعری انہیں شکایات کا دفتر ہے۔

اکبرؔ کی قدیم غزلیات میں ابتذال اور پرانی شاعری کی بعض بدنما ادائیں موجود ہیں۔ لیکن جدید کلام (نظمیں ہوں یا غزلیات) بھرتی سے پاک ہے۔

البتہ چونکہ اکبرؔ خدا اور مذہب سے بے اعتنائی، مغرب پرستی، اور مشرقیت کی موت کے متعلق بار بار مختلف پیرایوں میں اظہار خیال کرتا ہے۔ اس لئے تکرار خیالات کے سبب اکبرؔ کا کلام مسلسل طور پر اکتائے بغیر نہیں پڑھا جاتا۔

البتہ اکبرؔ ذوقی (ذوقؔ کا پیرو) ہرگز نہیں۔ ذوقؔ کا کلام تو صنعتوں کا ایک انبار ہے۔ فرسودگی، پست نوائی، بے کیفی اس کی شاعری کے بڑے بڑے نقائص ہیں۔ اور اکبرؔ کا کلام خصوصاً جدید کلام ان معائب سے قطعتہً پاک ہے۔

(۲) فکر اور طرز مؤنث ہے۔ موٹر جدید لفظ ہے اور جدید مغربی الفاظ کی تذکیر و تانیث میں ملک کے اُن حصوں کی پیروی کرنی چاہیئے جن میں یہ چیزیں اور ان کے نام پہلی مرتبہ آئے اور زیادہ آئے۔ پنجاب میں موٹر کا لفظ مؤنث ہے اور یہی صحیح ہے۔ البتہ تار کا لفظ بھی یہاں مؤنث ہی بولا جاتا ہے۔ اور غلط ہے کیونکہ تار سارے ہندوستان میں ایک ساتھ آیا اور دلی لکھنؤ والوں نے اسے مذکر بولنا شروع کیا۔ تار کو مذکر ہی بولنا چاہیئے۔ اس کی جمع تاریں غلط ہے۔

سانس لکھنؤ میں مؤنث بولا جاتا ہے۔

"سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اندھیرا کا دیا جلّاد نے جاتے جاتے"

دہلی میں مذکر بولا جاتا ہے۔ اہلِ پنجاب تذکیر و تانیث میں عموماً دہلی کے پیرو ہیں

لغات مؤنث ہے۔

(۳) ندی بہ تخفیف دال کھاتا کا تلفظ ہے اردو کہا ہیں۔ اردو میں بہ تشدید دال فصیح ہے۔ اگرچہ بتخفیف دال بھی غلط نہیں۔ گنگنا بہ سکون کاف صحیح ہے بہ فتحہ کاف فارسی غلط ہوگا۔

(۴) (الف) محاورات جس نظریہ یا خیال پر اوّل اوّل وضع کئے گئے ہیں اُنہیں کے مطابق اُن کا استعمال صحیح ہو سکتا ہے خواہ وہ نظریہ غلط ہی ثابت ہو چکا ہو۔ اس لئے "گردشِ گردوں" بالکل صحیح ہے۔

(ب) آندھیاں چلنا۔ آنا اور اُٹھنا ہر طرح درست محاورہ ہے

"اب زمیں ہلنے کو ہے اور آندھیاں آنے کو ہیں"

یہ بھی درست ہے۔

(ج) یہ فقرہ بھی درست ہے۔ سادگی سے یہاں مراد بے خبری اور انجان پن ہے۔

(۵) آپ کو شاعری کا بڑا شوق ہے۔ خدا رحم کرے۔ شعر کہنا چاہتے ہیں اور نہیں کہہ سکتے۔ واقعی آپ کی قابلِ رحم حالت ہے۔ مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔ خدارا اس شوق نارسا کو اپنی بیماری نہ بنا لیجئے! شاعر نہ ہونا آدمیت کا کوئی نقص نہیں ہے۔ نہ تعزیرات ہند میں کوئی ایسی دفعہ ہے کہ

"جو شاعر نہ ہو یا نہ بننا چاہے وہ دو سال کی قید سخت کا مجرم ہے۔"

اردو شاعری کا انجام گداگری اور یا پھر فاقہ کشی ہوتا ہے۔ آپ کو اس انجام کا کونسا پہلو پسند ہے؟

میری رائے تو یہی ہے کہ اپنے اوپر رحم کیجئے اور اس خبط سے باز آجائیے!

قبلہ اردو شاعری تو شادی کی طرح "لبڈو کے لڈو" ہیں جو کھائے پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔

اگر یہ سودا اُچھلے بغیر نہ مانے تو شاعر بننے کے منحوس وقت آنے سے پہلے افیم کی ایک بڑی سی گولی کھا کر سو رہیئے!

(۵) اس وقت اردو کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے۔

"اور اُس کے بعد" کا جواب یہ ہے کہ

آپ اور مَیں۔

(۶) صحیح معنی میں قوم پرست اردو اخبارات ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ روزنامہ ہند کلکتہ، ریاست دہلی اور پارس لاہور یہ ہر سہ اخبارات قوم پرست ہیں اور ان کی پالیسی قوم پرستانہ ہے۔ اُسے نباہتے بھی ہیں۔

(۷) "آپ عامل کریم الدین سے ملنا چاہتے ہیں"۔ اس میں میرے مشورے کی کیا ضرورت ہے؟ مل لیجئے! آپ ہی جیسے شردھالوؤں سے عامل کریم الدین کی دکان چل رہی ہے اپنے وجود کو بیکار نہ سمجھئے کہ خدا نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی۔

لیکن عامل کریم الدین سے شرف نیاز حاصل کرنے کا جو ہیضہ آپ کو ہوا ہے پہلے اس بیماری کا علاج کرائیے۔ بہتر تو یہ ہے کہ پہلے اپنے دماغ کا معائنہ ضرور کرا لیجئے۔ مبادا دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہو۔

(۸) "آپ مخزن کے خریدار بننا چاہتے ہیں"، شوق سے بن جائیے! البتہ لاہور میں سے اس کا دفتر مدت ہوئی منتقل ہو چکا ہے اُسے لاہور میں تلاش کرنے کی بجائے آپ کو ملک عدم تشریف لے جانے کی زحمت فرمانی پڑے گی۔

ایک سوال:۔ آئندہ اپریل میں انٹرمیڈیٹ کے اردو پرچے کا امتحان ہوگا۔ براہِ کرم مولانا حالی پر کوئی مختصر مگر جامع مضمون ضرور شائع کر دیں تاکہ ہم طلبہ کو اردو امتحان دینے میں سہولت

۴ حاصل ہو جائے۔ (بشیر احمد۔ خالصہ کالج امرتسر)

جواب:۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل میں خواجہ حالی پر ایک مختصر سا مضمون اسی نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔

تاجور

(۹) علامہ سیماب ملک کے چند در چند منتخب شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری بلند خیالات، پاکیزہ جذبات، اور دلنشیں تغزل کی سرمایہ دار ہے۔ اُن کی غزلیات شاداب زمینوں، بولتے ہوئے قافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں سے غزل سرا معاصرین میں درجۂ امتیاز رکھتی ہیں۔

اُن کی بعض نظموں اور غزلیات کے متعدد اشعار پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ آگرے کی بجائے لاہور کے باشندے ہوتے تو پیغمبر بے کتاب بنا دیئے جاتے۔

"کار امروز" اور کلیم عجم اُن کے ساحرانہ کارنامے ہیں۔

افسوس ہے کہ ایسا باکمال سحرکار اس عالم ضعیفی میں زندگی کی کشاکش سے دوچار ہے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

یہ افسوس زیادہ دل گداز بن جاتا ہے جب بے مایہ اور فرومایہ تُک بندوں کو عام کالعوام کی پذیرائی اور اس سبب سے زندگی کی کامرانیوں سے ہمکنار دیکھا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ ذوق سخن فہمی سے اسی قدر دور ہے جتنا گروہ عوام اور تعلیم یافتہ جماعت چونکہ تہذیب حاضرہ کی نمائندہ اور علوم و فنون کی حامل ہے۔ اس لئے اس کی بے فہمی اردو شاعروں کے لئے شاعری سے بیزاری کا سبب بن رہی ہے۔

بقیہ تبصرا

قنوطیت یعنی فلسفہ یاس:۔ قنوطیت، یاسیت اور تشائم یہ تینوں لفظ ایک ہی مطلب لئے ہوئے ہیں، یعنی زندگی سے یاس و حرماں، ناامیدی و مایوسی۔ ایک قنوطی کی نگاہوں میں زندگی شر عظیم ہے، کائنات کے بنیادی عناصر تخریب کی طرف مائل نہیں، اس جذبے سے متاثر ہو کر کہتا ہے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولے برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

اردو دان حضرات کو ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس کتاب میں آسان و عام فہم زبان میں قنوطیت کی وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے قنوطیت پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ فاضل مصنف نے دلائل و براہین کی روشنی میں قنوطیت پر اسطرح تنقید کی ہے کہ کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہیں رہا جو حضرات قنوطیت کے نظریے پر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ اس موضوع پر انہیں دیگر تصانیف سے بالکل بے نیاز کر دے گی۔

کتاب کی کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ ہے۔ صفحات ایک سو دس۔ قیمت دو روپے (عہ/)۔ پتہ:۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاد فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔ (یزدانی)

سالنامۂ ساقی:۔ ایڈیٹر شاہد احمد بی۔ اے (آنرز) دہلوی۔ قیمت سالنامہ عہر

ساقی اُردو کے مقتدر رسائل میں سے ہے۔ اِس کا پیش نظر سالنامہ تنوع مضامین اور ترتیب کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔

مولانا عنایت اللہ بی۔ اے دہلوی نے ہیملٹ کا اُردو ترجمہ پیش کر کے اُردو ادب میں بیش قیمت اضافہ اور بی۔ اے کے طلبہ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا ایک ایکٹ کا ڈرامہ زلزلہ بھی خوب ہے۔

افسانوں میں فورسڈلینڈنگ۔ آہ جوانی۔ فسانۂ زمستاں اور دو حادثوں کے درمیان ہمیں بیحد پسند آئے۔

مضامین میں سے "پچاس برس پہلے کی دِلّی"۔ "اردو افسانہ نویسی" "داراشکوہ کا نظریۂ حیات" وغیرہ مستحق تحسین ہیں۔

نظمیں بھی دِلکش اور وجد آفریں ہیں۔ سہ رنگی و یک رنگی تصاویر سے رسالہ کی زینت میں اضافہ کی کوشش کی گئی ہے۔ "فاوسٹ کا خواب" اگر شائع نہ کی جاتی تو بہتر تھا۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ منیجر رسالہ ساقی دہلی سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

سالنامہ کنول:۔ ایڈیٹر منظر صدیقی اکبرآبادی۔ قیمت سالنامہ دس آنے۔

اکبرآباد (آگرہ) ترقی پذیر شاعری کا مرکز رہا ہے۔ کنول کے فاضل مدیر نے سالنامہ شائع کر کے ثابت کر دیا ہے۔ کہ اب پھر اکبرآباد ادب کا مرکز بن رہا ہے۔ مضمون نگار حضرات میں حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی۔ مولانا سیماب اکبرآبادی۔ حضرت ماہر القادری۔ جناب منصور احمد مدیر ادبی دُنیا۔ ڈاکٹر سیّد محی الدین زورؔ قادری ایم۔ اے۔ حضرت وردؔ کاکوروی۔ حضرت لطیف الدین احمد۔ اور دیگر بلند پایہ شعراء و ادبا کے اسمائے گرامی سالنامہ کی کامیابی کے شاہد ہیں۔ تصاویر خوب ہیں۔ ٹائٹل یک رنگ ہونے کے باوجود جاذب نظر ہے۔ صفحات ڈیڑھ سو کے قریب ہیں۔ منیجر رسالہ کنول۔ مرکز اشاعت آگرہ کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

سالنامہ اَدبی دُنیا:۔ ایڈیٹر منصور احمد قیمت سالنامہ عہ حسب دستور رسالہ "اَدبی دُنیا" نے بھی اپنا سالنامہ شائع کیا ہے۔ ہمیں مسرت ہے۔ کہ مولانا منصور احمد صاحب اِس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ سالنامہ کیا ہے بقول مولانا شاہد احمد صاحب "دامانِ باغبان وکفِ گلفروش ہے"۔

افسانے۔ ڈرامے۔ علمی، ادبی و تنقیدی مضامین۔ اور منظومات سب اپنی اپنی جگہ رسالہ کی دلچسپیوں میں اضافہ کا موجب ہیں۔ سہ رنگی و یکرنگی آرٹ تصاویر کے علاوہ مضمون نگار حضرات کی تصاویر کا تو شمار ہی نہیں۔

منصور احمد صاحب کا ترجمہ۔ افسانوں میں دولہا دُلھن کی ڈائری اور خوشبودار خط کامیاب افسانے ہیں۔ "دو مسئلے" قابل قدر ڈرامہ ہے۔ حِصّۂ نظم میں بہترین شعراء کا کلام شامل ہے۔ مضمون بھی اَدب کے بہترین شاہکار ہیں۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔ منیجر اَدبی دُنیا۔ کمرشل بلڈنگس لاہور۔

پندرہ روزہ شمع:۔ ایک عرصہ سے پنجاب کی فضائیں "شمع" "شمع" کے شور سے گونج رہی تھیں دیواروں پر ہر طرف "شمع" کے قدِ آدم پوسٹر لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ آخر صبر شکن انتظار کے بعد شمع اَدب کی ضو فشانی کا وقت آ ہی پہنچا قلم سے مَس رکھنے والے یہ سُن کر بیحد خوش ہوں گے۔ کہ پندرہ روزہ رسالہ شمع لاہور یکم مارچ سے شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ پہلے دو نمبروں کی ترتیب و تدوین اُس کے شاندار مستقبل کی آئینہ دار ہے۔ اور ہم اُس کے مضامین اور مستحکم انتظامات کے پیشِ نظر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ "شمع" فی الحقیقت ہندوستان کی قلمی محفل کی شمع درخشاں ہے۔ رسالے کے پروپرائٹر شیخ مظہر الدین کنور دہلوی ہیں۔ اَدارت کے فرائض دو قابل قدر سرگرم اور میدان قلم و اَدب کے شہسوار حکیم بدر محی الدین اور اختر رضوی سرانجام دے رہے ہیں۔ پانچ چھ رنگین تصاویر بھی اس کی ظاہری زیب و زینت کو دوبالا کر رہی ہیں۔

لسان العصر احسان ابن دانش۔ میرزا ادیب بی۔ اے۔ سراج الدین ظفر بی۔ اے۔ حاجی لق لق، الطاف مشہدی ایسے شعراء و ادبا کے نام اس کے اَدبی معیار کے شاہد ہیں۔

قلم و اَدب کے شائقین کو ضرور اس کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ چندہ سالانہ تین روپے فی پرچہ ۲ر آنے ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "شمع" ۱۴۷ انار کلی لاہور

دیال سنگھ کالج میگزین:۔ حال ہی میں اس کا سالنامہ شائع ہوا ہے۔ اس کے ایڈیٹر بشیر اثر چکوالی نے تھوڑے سے صفحات میں بیش قدر مضامین پیش کرکے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ طلبۂ کالج کے علاوہ سید رضا قاسم مختار، سید عبدالحمید عدم ایسے مشاہیر ادب کو کالج میگزین میں جمع کرنا ادارہ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ ہم اس کامیاب کوشش پر اثر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

سوزِ ناتمام:۔ جناب عاشق بٹالوی کے سحر طراز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ عاشق صاحب پختہ مشق افسانہ نویس ہیں اور چونکہ اپنے محسوسات اور تجربات و مشاہدات کو افسانوی رنگ میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے آپ کے افسانے بہت کچھ واقعیت کا پہلو لئے ہوتے ہیں۔ یہی خوبی آپ کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" آپ کا شاہکار ہے۔ جو مارچ کے شاہکار میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ "زندگی" اور "عذرِ گناہ" وغیرہ بھی کامیاب اور اپنی طرز کے بے مثل افسانے ہیں۔ آخری افسانہ "حیاتِ تازہ" بھی بہترین افسانوں میں سے ہے جسے دوسرا نمبر دیا جا سکتا ہے۔

عاشق صاحب کا اندازِ نگارش پختہ، پیرایۂ بیان دلکش و شگفتہ، اور افسانے عبرت آموز ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اہلِ ذوق نہایت احترام سے اس مفید و دلچسپ کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت صرف ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مینیجر صاحب رسالہ "ادبی دنیا" لاہور۔

ہدیۂ اخلاص بحضرتِ اقبال:۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب اعظم گڑھی کی دو نظموں "خطاب بہ شاعرِ حکیم ہند" اور "شاعرِ مشرق اور فلسفۂ حیاتِ ملّی" کا مجموعہ ہے۔ جسے عبداللطیف صاحب اعظمی نے شائع کیا ہے۔ پہلی نظم علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی حکیمانہ شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے جس کے آخر میں کمال عقیدت و احترام کے ساتھ ناقد شاعر کی طرف سے ایک "شکوۂ بے اختیار" بھی ہے۔ آخری چند شعر ملاحظہ ہوں

آج تو کل ملّتِ اسلام کا محبوب ہے
بلکہ مشرق کی تمام اقوام کا محبوب ہے
آج مسجودِ نظر ہے تیرا ہر "فیضِ قلم"
کیوں نہ تڑپے دل اگر اٹھے غلط تیرا قدم
کاش ہو جاتا یہ تجھ پر رازِ پنہاں آشکار
بے سبب ہرگز نہیں یہ نالۂ بے اختیار
اس فغانِ درد کی شاہد محبت ہے تری
اس نوائے تلخ کا باعث عقیدت ہے تری
یہ نہیں تعریض، دل کے درد کا افسانہ ہے
ایک آہِ مضطرب، اک اشکِ بے تابانہ ہے
نقطہ چینی یہ نہیں اک داستانِ غم ہے یہ
آبروئے ملّتِ اسلام کا ماتم ہے یہ

دوسری نظم شاعر کے پچھلے خیالات و معتقدات میں غیر معمولی انقلاب کا نتیجہ ہے جو شاید بطور کفارۂ گناہ لکھی گئی ہے۔ آخری بند کے چند منتخب شعر پیشِ نظر ہیں:۔

آہ اب بھی امتِ خیر البشر ؛ ہے مئے غفلت سے مست و بے خبر
ہے نظامِ دیں سے سرتابی وہی ؛ اب بھی طاری ہے گراں خوابی وہی
جذبۂ احساس و خودداری نہیں ؛ اضطرابِ ذوقِ بیداری نہیں
آہ کیا اس ملّتِ خوابیدہ کو ؛ آہ کیا اس مسلمِ شوریدہ کو
حاجتِ پیغمبرؐ و جبریلؑ ہے ؛ انتظارِ صورِ اسرافیل ہے
اے خدا اس عندلیبِ زار کو ؛ گلشنِ مشرق کے خوش گفتار کو
آرزوئے حال و استقبال کو ؛ ملّتِ اسلام کے اقبال کو
فطرتِ برق و شرر کر دے عطا
اور بھی سوزِ جگر کر دے عطا

شائق حضرات عبداللطیف صاحب اعظمی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرول باغ دہلی سے تین آنے کے ٹکٹ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔

مخدوم الملک:۔ مرتبہ رشید احمد صاحب بہاری۔ یہ کتاب "مخدوم الملک" حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بہاریؒ کا مفصل تذکرہ ہے جس میں آپ کی پیدائش، تعلیم، ازدواج، بیعت، مجاہدات، عبادات و ریاضات، کرامات و ارشادات اور تصنیفات کا حال نہایت تحقیق و تفتیش کے بعد لکھا گیا ہے۔

زبان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ حجم ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے ۲۷ صفحات قیمت ۴ آنے مجلد ۸ آنے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ:۔
رشید اینڈ کمپنی ایڈیشن اینڈ وارج ڈیلرس بہار شریف ضلع پٹنہ۔

صفحۂ اطفال ــــــ تمہارا دوست

تم اپنے ہمجولیوں میں جب کسی سے بات چیت کرنے لگتے ہو۔ تو کہا کرتے ہو " دوست یہ بات یوں ہے " دوست میں تمہارے گھر آؤں گا۔ دوست کل اسکول میں چھٹی ہے۔" تمہارے خیال میں ہر ہمجولی تمہارا دوست ہے۔ جبھی تو اُسے بات بات پر دوست کہتے ہو۔ لیکن پیارے بچو یاد رکھو۔ دنیا میں ہر چیز کی افراط ہے۔ ارزانی ہے۔ بہتات ہے۔ لیکن جو چیز جواہرات سے کہاں بھی نہیں ملتی۔ وہ سچی دوستی اور سچا دوست ہے۔

تم نے دُنیا کے ایک مشہور فلسفی کا قصہ پڑھا ہوگا پڑھا نہ ہوگا۔ تو کسی سے سُنا ضرور ہوگا۔ اگر سُنا بھی نہیں تو لو ہم تمہیں سناتے ہیں۔

یونان کے مشہور حکیم اور فلاسفر بقراط نے ایک بار ایک چھوٹی سی کوٹھری اپنے اُٹھنے بیٹھنے کے لئے تعمیر کرائی۔ وہ کوٹھری بڑی تنگ تھی بمشکل سے تین چار آدمی اُس میں بیٹھ سکتے تھے۔

بقراط کے ایک شاگرد نے کہا۔ محترم استاد! یہ کوٹھری بہت تنگ ہے۔ آپ کے دوست احباب اس میں کیسے اُٹھ بیٹھ سکتے ہیں۔ آپ کے ہاں دوستوں کی آر جار رہتی ہے۔ اس تنگ کوٹھری میں تو مشکل سے دو تین دوست بیٹھ سکیں گے۔

بقراط نے جواب دیا۔ برخودار! اس کوٹھری میں بیٹھنے کے لئے دوست کہاں سے لاؤں گا؟ وہ آدمی تو بڑا خوش نصیب ہے۔ جسے اتنے دوست مل جائیں۔ جو اس کوٹھری کی جگہ کو پُر کر سکیں۔ عزیز! دوست تو ایک بھی نصیب ہو جائے۔ تو انسان کی قسمت جاگ جائے اور جن آنے جانے والوں کو تم میرا دوست سمجھتے ہو وہ دوست نہیں۔ بلکہ میرے واقف ہیں۔ دوستی اور دوستوں کا دُنیا کے بازار میں ہمیشہ قحط رہا ہے۔

اِس کہانی سے تمہیں اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر ایک کو اپنا دوست سمجھ لینا درست نہیں۔ دوست سچا دوست بے غرض دوست دُنیا میں ناپید ہے۔ تمہارا سچا دوست وہ ہے جو تمہاری غلطیوں پر تمہیں ٹوکے۔ تم سے اپنی کوئی غرض نہ رکھے۔ تم سے اُسے کوئی لالچ نہ ہو۔ تمہارے فائدے پر اپنے فائدے کو قربان کر دے۔ تمہاری غیر حاضری میں بھی تمہاری بھلائی چاہے۔ تمہاری مصیبتوں کا شریک ہو۔ تمہاری خوشی میں خوش رہے۔ تمہاری تلخی ترشی کو برداشت کرے۔ تمہاری برائیوں کی اصلاح کرے۔ خود نیک ہو اور تمہیں نیک بنائے۔ اپنی زندگی کے مقابلے میں تمہاری زندگی کو زیادہ ضروری سمجھے۔ وقت پڑے پر تم سے منہ نہ پھیرے۔ تم اس کے وفادار ہو یا نہ ہو۔ وہ ہر حال میں تمہارا وفادار بنا رہے۔

بچو! تمہیں بتاؤ۔ ایسی خوبیوں والے تمہارے دوستوں میں کتنے ہیں۔ تم کہو گے ایک بھی نہیں۔ ہاں تم ٹھیک کہو گے۔ ان خوبیوں والا کوئی ساتھی تمہیں نہیں ملے گا۔ تو بس سمجھ لو کہ تمہارا دوست سچا دوست کوئی نہیں۔ اور جنہیں تم دوست کہتے ہو۔ دوست سمجھتے ہو۔ وہ تمہارے واقف ہیں۔ روشناس ہیں۔ تمہاری ان کی جان پہچان ہے تمہارے ساتھ کھیلنے کودنے والے ہیں۔ ہمجولی ہیں۔ مگر ان میں کوئی سچا اور بے غرض دوست نہیں ہے۔

(منقول از پریم لاہور)　　　　تاجور

"شاہکار" کے متعلق

مقتدر اخبارات و رسائل کی رائوں کے اقتباسات

ڈیلی ٹریبون لاہور :-

"شاہکار" میں موجودہ ترقی یافتہ صحافت کے تمام درخشاں موضوعات کے علاوہ بعض جدید ممتاز عنوانات بھی ہیں - یہ اپنے آغاز ہی سے بتا رہا ہے کہ اس کا عزم اردو زبان و ادب کی اصلاح اور اسے مالا مال بنانے کے سلسلے میں کچھ کر دکھانے کا ہے - متعدد اجنبی زبانوں کی دخل یابی نے یہ خطرہ پیدا کر دیا ہے کہ اردو زبان بھی دیگر غیر صرفی زبانوں کی طرح اپنی قدامت کو خیرباد نہ کہہ دے - اس کے انسداد کے لئے فاضل ایڈیٹر "شاہکار" نے "بزم تحقیق" کا عنوان قائم کیا ہے - ہم اردو صحافت کو مبارکباد دیتے ہیں - کہ اس کی صف میں ایسا گرانقدر اضافہ ہوا ہے -"

روزنامہ "احسان" - لاہور

"مولانا تاجور کی ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں اور جو رسالہ ان کے زیرِ ادارت شائع ہوگا اُس کے معیار کی بلندی موردِ شک نہیں ہو سکتی -

"شاہکار" میں ملک کے مشہور و معروف اور مسلم الثبوت ادیبوں اور شاعروں کے مضامین نثر و نظم درج کئے گئے ہیں اور بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھرتی کے ایسے مضامین سے خالی ہے جنہیں "ادب" کے نام سے اکثر رسالے اپنے صفحات پر جگہ دینے کے عادی ہیں - رسالے کے اجراء کی غرض ادبی سے زیادہ تعلیمی نظر آتی ہے اور اسی نقطۂ نگاہ سے اس میں بعض ایسے مضامین بھی موجود ہیں، جو علمی اور تاریخی تفتیش و تفحص کا نتیجہ ہیں -"

روزنامہ سیاست لاہور :-

"شاہکار" ظاہری اور باطنی خوبیوں میں بے نظیر ہے - اس پلّہ کا پرچہ آج تک ہندوستان میں جاری نہیں ہوا - تراجم کم ہیں اور تخیلی مضامین کی بہتات ہے - علمی اور تحقیقی مضامین نہایت کوشش سے لکھے گئے ہیں - ہندوستان کے تمام مشہور و معروف اہلِ قلم حضرات کے شاہکار میں ایک جگہ نظر آتے ہیں -

پرچے میں عریانی کی تھوڑی سی جھلک بھی نہیں ہے - اس لئے یہ پرچہ خواتین کے لئے بھی یکساں مفید ہے -"

روزنامہ پرتاپ - لاہور

"مولینا تاجور نجیب آبادی کے ذوقِ ادب نے پنجاب میں ہمیشہ اردو ادب کی رہنمائی کی ہے - مخزن اور ہمایوں کی جلدیں اُن کے وجدان سلیم اور ذوقِ صحیح پر شاہد ہیں - اس کے بعد انہوں نے پنجاب کے اردو ادب میں ایک انقلابی قدم اٹھایا اور "ادبی دنیا" جاری کر کے رسائل کے لئے ایک بلند معیار مقرر کر دیا - شاہکار اُن کے اسی ادبی ذوق کا ایک دل آویز اور شاندار مظاہرہ ہے - رسالہ اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے لاجواب ہے -"

لاہور کے مشہور ایجنٹ اخبارات کی وفات

ہم نے یہ خبر نہایت افسوس اور رنج سے سُنی کہ لاہور کے مشہور و قدیمی ایجنٹ میاں غلام محمد رہگیر عالمِ جاودانی ہو گئے ہیں - مرحوم لاہور کے انارکلی چوک میں اخبارات و رسائل فروخت کیا کرتے تھے اور اس تجارت میں اُنہیں کافی دسترس حاصل تھی - نہایت خلیق، دیانتدار اور وسیع الاخلاق انسان تھے -

ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے - اور اُن کے وابستگان کو صبرِ جمیل عطا کرے -

(ادارہ)

ایڈیٹر :- پروفیسر تاجور

آنریری ایڈیٹر :- میرزا ادیب بی-اے

"شاہکار"

بابت ماہ مئی ۱۹۳۷ء

ادارہ :- خواجہ محمود جاوید ایم-اے

سیّد عبدالرشید یزدانی

جلد ۵ — نمبر (۲)

فہرست

تصاویر :- (سہ رنگی) بہار کا تحفہ (یک رنگی) داستانِ دل - بے فکری جھیل آناساگر (اجمیر) کا ایک منظر۔

ایم ہادی حسن اشعر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

سر ظفر اللہ خاں کی احمدیت نوازی

عداوت اور دشمنی ہر انسان میں ایک قدرتی جذبے کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن خدا ترس انسان جذبۂ عداوت کے اظہار میں حق و صداقت کے حدود سے تجاوز نہیں کیا کرتا، خیر القرون کے مسلمان اپنے جانی دشمن کے خلاف بھی کوئی ایسا الزام منسوب نہیں کرتے تھے جو غلط ہو یا اگر واقعی ہو تو اس کے اظہار میں خوفناک انداز نہیں اختیار کرتے تھے، لیکن وہ خیر القرون کے مسلمان تھے اور وہ مبارک زمانہ ماضی بعید بن چکا ہے۔ اب اخلاق کا معیار بدل گیا ہے۔ عیاری کا نام تدبر اور فریب کاری کا لقب ڈپلومیسی قرار پایا ہے۔ دیانت اور صداقت صرف ڈکشنری کے الفاظ رہ گئے ہیں، خارج میں ان کا مصداق نایاب ہے۔ کسی کے خلاف عداوت کا اظہار اس پر افترا، بہتان، تہمت اور کم سے کم غلو و مبالغے کے بغیر نہیں کیا جاتا۔

سب جانتے ہیں کہ سر ظفر اللہ خاں ابتدا سے احمدی جماعت سے وابستہ ہیں، لیکن جب مسلم آؤٹ لک کے مالک کے خلاف ہائی کورٹ نے مقدمہ چلایا ہے اور کوئی مسلمان وکیل ہائی کورٹ کے خوف سے اس مقدمے کی پیروی کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو اسی ظفر اللہ خاں نے اپنے مستقبل کو ٹھکرا کر مقدمے کی پیروی کی اور اُن کی مدافعانہ تقریر سے متاثر ہو کر ملک کے مشہور لیڈر حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب نے اُن کی پیشانی چومتے ہوئے فرمایا تھا کہ "آپ نے یہ بہت بڑی اسلامی خدمت انجام دی ہے۔"

شیخ محمد امین بار ایٹ لا، سابق ساگر چند کے مقدمے کی پیروی سے بھی مسلم وکلا نے انکار کر دیا تھا لیکن اسی "کافر" خدا ترس ظفر اللہ خاں نے اپنے تمام معاشی مفاد کو نظر انداز کر کے اُن کے مقدمے کی مفت پیروی کی اور انہیں بچایا۔ اس پر تمام اسلامی پریس نے ظفر اللہ خاں کی اسلام دوستی کے قصیدے شائع کئے تھے۔

پھر یہ وہی ظفر اللہ خاں ہے جو پنجاب کونسل کے لئے اپنے حلقے کے مسلم رائے دہندوں کی جانب سے بلا مقابلہ کونسل میں بھیجا گیا، اسی ظفر اللہ خاں نے پنجاب کونسل کی ممبری کے زمانے میں اسلامی مسائل پر دھواں دھار تقریریں کیں اور مسلم زعما اس کی داد دیتے رہے۔ اسی ظفر اللہ خاں کو گول میز کانفرنس کے لئے تمام مسلم ممبران کونسل نے چُنا اور بقول مسز سروجنی نیڈو:۔

> "ظفر اللہ خاں نے سب سے موثر اور شاندار طور پر ہندوستانی مسائل کو گول میز کانفرنس میں پیش کیا۔"

انہیں ظفر اللہ خاں کے پیر و مرشد مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ قادیان کو کشمیر ایجی ٹیشن کے زمانے میں مسلم کشمیر کمیٹی کا اصرار کے ساتھ سر اقبال نے صدر بنایا، لیکن کچھ دنوں سے چند ذاتی مصلحتوں کے پیش نظر بعض سیاسی پارٹیوں نے جب سے احمدیوں کے خلاف شور و شغب کو اپنی پارٹی کا بنیادی مسئلہ بنایا اُس وقت سے ان ظفر اللہ خاں میں کیڑے ڈالے جا رہے ہیں اور اُن کے خلاف بہتان تراشی جوش و انہماک کے ساتھ جاری ہے۔

کہا جا رہا ہے کہ ظفر اللہ خاں ریلوے میں صرف احمدیوں کو بھرتی کر رہے ہیں۔ ادھر غیر مسلم پریس انہیں منتقد
کہ ان کے خلاف زمین و آسمان کے
ظفر اللہ خاں کی غیر معمولی قابلیت
حقوق رسانی کے انداز
وجہ سے نہ تھی کہ ظف
تو صحیح طور پر یہ سمجھ
میں ہندوؤں اور
حقوق واپس
غیر مسلم پریس اور
کیوں کہ سر ظفر ا

اور ہر سہ ماہی پر ہر محکمے سے ملازمین کا گوشوارہ طلب کر کے مسلمانوں کے تناسب پر زور دیتے رہتے تھے۔

لیکن مسلمان رہنماؤں کو دوست دشمن کی تمیز کے لئے بصیرت ہی نہیں ملی۔ انہوں نے غیر مسلم پریس کی مخالفت کی تائید کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ظفر اللہ خاں نے مسلم پریس کی معاندانہ تحریروں سے متاثر ہو کر وائسرائے سے یہ کہہ دیا کہ "میں ریلوے ڈیپارٹمنٹ کو چھوڑنا چاہتا ہوں، کیونکہ جب وہ لوگ جن کی میں خدمت کر رہا ہوں میری مخالفت پر آمادہ ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ اپنے وقت اور آرام کو مشکلات میں ڈالوں۔"

آخر کار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا کہ ظفر اللہ خاں کے انکار اور انکار پر اصرار نے وائسرائے کو ریلوے کا محکمہ ایک یورپین کے سپرد کرنا پڑا۔ اب صرف یہی نہ ہوگا کہ مسلمان ریلوے میں بدستور سابق ایک لاوارث قوم کی حیثیت میں رہ جائیں گے بلکہ ہندو اور سکھ بھائی بھی ریلوے میں ظفر اللہ خاں کی عدم موجودگی کو بری طرح محسوس کریں گے، ریلوے میں پھر یورپین، اینگلو انڈین اور دیسی عیسائیوں کا دور دورہ ہو جائے گا۔ مڈل پاس دیسی عیسائی قابل سے قابل ہندو مسلمان اور سکھ امیدواروں کے مقابلے میں قابل ترجیح قرار دئے جائیں گے۔ ورنہ سر ظفر اللہ خاں کے عہد ممبری میں اکثر بلند منصب ہندو ریلوے ملازموں کی زبانی یہ سنا گیا ہے کہ "سر ظفر اللہ خاں کے عہد میں کسی غیر مسلم کے ساتھ ناانصافی کی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور یہ کہ وہ یورپین اور انڈین کے معاملے میں ہندوستانی امیدواروں کی حمایت

، صرف احمدیوں
ی سی نہ حمت
بلا تحقیق ما دشما
انہ نعروں سے

ل پر نظر ڈالیں
ں کو بھرتی
ہے۔ اصل
اعلیٰ مناصب

کی تنخواہ تین ہزار سے پانچ ہزار تک ہوتی ہے۔

سر ظفر اللہ خاں سے پیشتر ریلوے بورڈ میں برائے نام ایک مسلمان تھا جو ان کے جاتے ہی ریٹائر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ریلوے بورڈ مسلمان افسروں سے بالکل تہی داماں ہو گیا تھا۔ سر ظفر اللہ خاں نے مسلم حقوق کے پیش نظر دو ہزاری اور سہ ہزاری منصبوں پر حسب ذیل مسلمانوں کا تقرر کرایا:۔

(۱) مسٹر زیڈ، ایچ خاں ڈپٹی ڈائرکٹر۔
(۲) مسٹر الیف، ایم خاں۔ " "
(۳) سید یعقوب شاہ " "
(۴) مسٹر حسن " "
(۵) خواجہ عبید اللہ " "

اور یہ سب کے سب غیر احمدی ہیں۔ انہیں اگر احمدی کہہ دیا جائے تو شاید ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیں گے۔ ان مناصب پر پہلے یورپین حضرات مسلط تھے۔

خواجہ عبید اللہ کئی یورپین اور ایک قابل ترین احمدی مسٹر صوفی کو سپرسیڈ کر کے ڈپٹی ڈائرکٹر بنائے گئے ہیں۔

اگر کوئی غیر مسلم یا غیر احمدی مسلمان کبھی ریلوے ممبر ہوتا تو مسٹر صوفی کی لیاقت، کارروائی اور سینیارٹی کے پیش نظر ان کو یہ منصب دیتا اسی بنا پر مسٹر صوفی بے چارہ یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ "میں نے تو احمدی ہونے کا نقصان اٹھایا ہے۔"

ہر منصف مزاج جس کی بصیرت پر غیر اسلامی عناد کے پردے نہ پڑے ہوئے ہوں، ان اعلیٰ مناصب پر تمام غیر احمدیوں کے تقرر کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ سر ظفر اللہ خاں احمدیوں کو بھرتی کر رہے ہیں۔

اب رہا مسٹر غلام ربانی اختر اور جہلم کے ایک نوجوان احمدی کا معاملہ جسے سامنے رکھ کر فلک فرسا نعرے لگائے جا رہے ہیں اس کی حقیقت یہ ہے:

کہ مسٹر اختر سر ظفر اللہ خاں کے جانے سے پہلے اپنے حسن کارکردگی سے اسسٹنٹ وارڈن بنا دئے گئے تھے۔ یہ سر جوزف بھور کا عہد تھا۔ معلوم نہیں مسٹر جوزف بھور احمدی ہیں یا احمدیوں سے انہیں کوئی خاص ہمدردی تھی، ان کے متعلق تو تمام ہندو مسلم ریلوے ملازمین یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ وہ دیسی

عیسائیوں کے حامی تھے۔

یہ مسٹر غلام ربانی اختر وہ نوجوان ہے جسے ایک بین الاقوامی ٹورسٹ نے غیر معمولی ٹورسٹ خیال کر کے ایک ہزار روپیہ یہ کہہ کر بطور انعام دیا تھا کہ ایسا نوجوان میں نے اپنی سیاحت عالم میں کہیں نہیں دیکھا۔ اِس واقعے سے مسٹر اختر کی ترقی کی نوعیت کا ہر انصاف پسند اندازہ کر سکے گا۔

جہلم کے احمدی کا یہ واقعہ ہے۔

کہ مشہور ہر دلعزیز اخبار نویس سید انعام اللہ شاہ مرحوم، ایڈیٹر "دورِ جدید" کا وہ بھتیجا ہے۔ سید انعام اللہ شاہ کے تعلقات ہر طبقے اور ہر سوسائٹی میں جیسے کچھ تھے اُن سے اخبار بین طبقہ آگاہ ہے۔

اس نوجوان کو سید غلام حسین شاہ نے ایک عارضی جگہ ۳۵ روپے کی دیدی تھی اور پھر انہوں نے ہی اُسے علیحدہ بھی کر دیا تھا۔

سر ظفر اللہ خاں بہ حیثیت ریلوے ممبر کسی کو ریلوے میں اعلیٰ منصب تو دلا سکتے تھے، لیکن چھوٹی چھوٹی ملازمتوں سے انہیں دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اِس سلسلے میں راقم الحروف کو ایک ذاتی تجربہ بھی ہے۔

ایک غیر احمدی نوجوان جو لاہور کے میڈیکل کالج میں تعلیم پا رہا ہے میرے ایک دوست کا لڑکا ہے، میرا یہ دوست اُس کے میڈیکل کالج کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے کہنے سے میں نے سر ظفر اللہ خاں سے اُس نوجوان کی ملازمت کے لئے سفارش کی۔

سر ظفر اللہ خاں سے میرے بیس سال کے دوستانہ تعلقات ہیں اور اس واقعے سے پہلے میں نے کبھی اُن سے کوئی سفارش نہ کی تھی، اُن کے میرے ایسے تعلقات ہیں کہ اگر سر ظفر اللہ خاں کے اصول کے خلاف نہ ہوتا تو وہ اس نوجوان کو ایجنٹ سے کہہ کر ضرور ملازمت دلا دیتے، لیکن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کسی ریلوے ملازم سے خواہ ایجنٹ ہو یا کوئی اور کبھی سفارش نہیں کی، کیونکہ ایسا کرنے کے بعد میں اُن کے فرائض منصبی کے متعلق باز پرس کرنے کی حیثیت میں نہیں رہ سکتا۔ آپ اس نوجوان سے کہیں کہ وہ میڈیکل کالج کی تعلیم میں لگا رہے اور میں اُسے تا اختتام تعلیم اپنی جیب سے وظیفہ دوں گا۔ چنانچہ اُس طالب علم کو ان کی جانب سے ماہ بماہ تعلیمی وظیفہ مل رہا ہے۔

اس ذاتی تجربے کے بعد میں تو کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ سر ظفر اللہ خاں چھوٹی چھوٹی ملازمتیں احمدیوں کو دلا رہے ہیں جب سے سر ظفر اللہ خاں نے ریلوے ممبری کا چارج دیا ہے غیر احمدی اعلیٰ مسلمان ریلوے افسروں کو میں نے اظہار تاسف کرتے دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ریلوے سے اُن کی علیحدگی مسلمان ریلوے ملازمین اور مسلم قوم کو ایک تکلیف دہ احساس کے ساتھ یاد رہے گی۔ بلکہ ہندو اور سکھ حضرات بھی اس علیحدگی کو اسی احساس کے ساتھ یاد کریں گے۔

سر ظفر اللہ خاں احمدی ہیں، اِس سے کسی کو انکار نہیں، یہ امر کوئی راز نہیں، وہ ڈنکے کی چوٹ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن جب وہ اسمبلی کے لئے امیدوار رہے تھے تو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ "میں اگرچہ احمدی ہوں لیکن عام مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت اور حمایت میرا فرض ہوگا، اور کوئی ایسا سوال جو احمدیوں اور غیر احمدیوں میں مابہ الاختلاف ہوگا، اس میں میں عام مسلمانوں کے مفاد کی حمایت کروں گا۔ میں بہ حیثیت ممبر کبھی اپنے آپ کو احمدی خیال نہیں کروں گا۔"

پنجاب کونسل میں ان کی قابلانہ تقریریں مطبوعہ صورت میں موجود ہیں انہیں پڑھ کر ہر شخص یہ اندازہ کرے گا کہ وہ اپنے عہد پر کس حد تک قائم رہے۔

سر ظفر اللہ خاں کو بعض اخبار نویسوں اور کچھ ذاتی مصالح رکھنے والے رہنماؤں نے مسلمانوں میں ہوا بنا دیا ہے، لیکن میں ایک غیر احمدی ہوتے ہوئے بھی اپنے بست سالہ تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ ایسا خدا ترس، پابند صوم وصلوٰۃ، انصاف دوست، سادہ معاشرت اس اعلیٰ پوزیشن کے آدمیوں میں کوئی دوسرا میری نظر سے نہیں گزرا اور ان نام نہاد مسلمان لیڈروں میں تو یقیناً کوئی بھی ان صفات حامل نہ ہوگا۔

شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی تنخواہ کا ایک معقول حصہ خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ بہت سے غیر احمدی مسلمان طلبہ بلکہ غیر مسلم بھی ان کی امداد سے تعلیم پا رہے ہیں اور بہت سے تعلیم ختم کر کے کامیاب زندگی کے مالک بن چکے ہیں۔

غیر احمدی مسلم انجمنوں، تحریکات اور حادثات میں اُن کی امداد ضرور شامل ہوتی ہے۔ لیکن معاندین جن کا مطمح نظر سر ظفر اللہ خاں کو

کافر، بے دین، احمدیت نوازی ظاہر کرنے تک محدود ہے اسر ظفراللہ خاں ہیں دُنیا بھر کے عیوب دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے معتبر سے معتبر شہادت، متین سے متین ثبوت بھی ظفراللہ خاں کی بے گناہی کے لئے کافی نہیں۔ وہ تو بقول شاعر عربی:

"وجودُکَ ذنبٌ لایقاسُ بہٖ ذنبُ"

ظفراللہ خاں کے وجود ہی کو گناہ خیال کرتے ہیں۔

ٹائم اسکیل اور گریڈ بندی

ٹائم اسکیل کا سسٹم جاری نہ ہونے کے سبب استادوں کی حق تلفیاں اب حدِ برداشت سے بڑھ چکی ہیں۔ ساری تعلیمی فضا پر بیدلی سی چھائی ہوئی ہے۔

اکثر استاد جن کے نتائج امتحان مسلسل طور پر سو فیصدی نکل رہے ہیں، تعلیم و تدریس کے فن میں ایک ماہرِ تعلیم کا درجہ حاصل کر چکے ہیں مگر پہلے گریڈ کو ختم کر کے سالہا سال تک ترقی کا ناکام انتظار کر کے معاشی زندگی کی مسرتوں سے محروم زندگی بسر کر رہے ہیں، گویا پہلا گریڈ ان کی ترقی کی زندگی تھی اور گریڈ کا اختتام اُس زندگی کی قبر اور اس قبر کا سوگوار مجاور غریب استاد بن گیا ہے۔ اس عام بیدلی کا قدرتی اثر یہ ہو رہا ہے کہ اچھے تعلیمی کارکنوں کی طاقت عمل مفلوج ہو چکی ہے۔ وہ ایک فرض کی ادائگی کی خاطر تعلیم و تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں مسلسل حق تلفیوں نے تعلیم کو اُن کا محبوب مشغلہ نہیں رہنے دیا۔ افسردہ دل اور پژمردہ زندگی استاد ملک کی قسمت کے آئندہ مالکوں میں بھلا زندگی کا ولولہ کیوں کر پیدا کر سکتے ہیں۔

آنریبل وزیرِ تعلیم کو اپنے عہدِ وزارت کی روشن یادگار کے طور پر ٹائم اسکیل کو جاری کر دینا چاہیئے! تاکہ ہر استاد اپنے معاشی مستقبل سے مطمئن ہو کر اپنے اندر روحِ عمل کو تازہ رکھ سکے اور اپنے شاگردوں کے دلوں میں جوشِ زندگی پیدا کرنے کی سعی میں لگا رہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جذبۂ بیدلی کے ساتھ مسلسل دماغی جدوجہد استادوں کے دل و دماغ اور صحت پر بہت بُرا اثر ڈال رہی ہے۔ دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ موجودہ گریڈوں پر فراخ دلانہ نظرِ ثانی کرنی چاہیئے! اِس سلسلے میں سب سے پہلے موجودہ بے امتیازی کو مٹانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً:

(۱) السنہ مشرقیہ کے استادوں کا گریڈ صرف انہیں کے لئے مخصوص رہنا چاہیئے۔

اُن کے ساتھ ڈرل ماسٹروں، ایس ویوں اور ورنیکولر ٹیچروں کو نتھی کرنا حد درجے کی بے امتیازی ہے۔

(۲) ملکی زبانوں کے استادوں کے لئے جُدا گریڈ ہونا چاہیئے جو اُنہیں کے ساتھ مخصوص ہو۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ملکی زبانوں کے استادوں کا گریڈ السنہ مشرقیہ کے معلموں سے کم رکھنے کے حامی ہیں، مطلق نہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے ہر مضمون کے استادوں کا گریڈ صرف انہیں کے لئے مخصوص کیا جائے۔

دوسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ گریڈ بندی پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے مشرقی اور ملکی زبانوں کی اہمیت کے مطابق گریڈوں کی قلیل المقداری پر ہمدردانہ غور و تامل اور کریمانہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہمارے ملک کے لئے اتنے مہنگے ثابت نہیں ہوئے جسقدر انگریزی زبان ہمیں مہنگی پڑ رہی ہے۔ کیونکہ انگریزوں نے ہمارے جسموں کو غلام بنایا، لیکن انگریزی ہمارے دماغوں ہمارے خیالوں، ہماری شریانوں کے خون کو غلام بنا رہی ہے مگر ہماری بے بصیرتی کس قدر افسوسناک ہے کہ انگریزوں سے زیادہ ہم انگریزی کے پرستار اور پجاری بن گئے ہیں، ہماری ملکی زبان تباہ ہو چکی ہے، ہماری مشرقی زبانیں دم توڑ رہی ہیں اور اس مصیبت کے زیرِ اثر ہماری ملکی تہذیب اور ہماری مشرقی معاشرت و تمدن فنا کے کنارے آ لگے ہیں۔

ملکی زبان کا حق تو یہ تھا کہ وہ تمام مضامین کے لئے ذریعۂ تعلیم بنائی جاتی اور اُس کا رتبہ وہی قرار دیا جاتا جو اِس وقت انگریزی زبان کے سر منڈھ دیا گیا ہے اور انگریزی کو وہ مقام ملتا جس میں ملکی زبانیں اپنی زندگی کے سانس شمار کر رہی ہیں۔ لیکن محکمہائے تعلیم اور تعلیمی اداروں میں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ انگریز حاکم ہیں انہیں خوش کرنے کی ضرورت۔ اس ضرورت کو ضرور پورا کیجئے، لیکن انہیں خوش رکھنے کے طریقے اور بہت سے ہیں۔ جس حصۂ ملک کے

باشندوں نے سب سے پہلے انگریز حاکم کو یہ سمجھایا کہ

" صاحب آپ کو ملکی زبان سیکھنے کی کچھ ضرورت
نہیں، ہم انگریزی سیکھ کر آپ کو اِس زحمت سے
بچائے لیتے ہیں۔"

وہ حصۂ ملک اور اُس کے رہنے والے ہندوستان کے
دامن زندگی کا بدنما داغ ہیں۔

اصل تو یہ ہے کہ ہم اپنی ملکی زبان کو بھول کر اپنے
آپ کو بھول چکے ہیں۔

خیر یہ افتاد بھی اہلِ ملک کی قسمت میں تھی، لیکن سوال یہ ہے
کہ اب جب کہ صوبے آزاد ہو رہے ہیں، انگریز حاکموں کو یہ اصرار
بھی نہیں کہ تم انگریزی کو اپنی دماغی بیماری بنائے رکھو، ادھر غیر
زبان میں تعلیم دل و دماغ کو ماؤف کر چکی ہے۔ آخر کب
تک اپنے معصوم بچوں اور نوجوانوں کے دماغوں پر اس بارِ گراں
کو مسلط رکھا جائے گا۔ کب وقت آئے گا کہ ہماری تعلیم ایک
ایسی زبان کی زنجیروں سے آزاد ہوگی جسے بولنے اور پڑھنے کے
لئے جغرافی حدود کی آب و ہوا ہمارے کام و زبان کو تیار نہیں کر
سکتی۔

ہندوستانی بچّہ اپنی تعلیمی نشو و نما کے عروج تک مضامین
کو سمجھ کر پڑھنے کی بجائے انگریزی زبان کے اسپیلنگ اور اس
کی اجنبی ساخت سے اُلجھا رہتا ہے، اور ساری تعلیمی زندگی اس
پر نثار کرنے کے بعد بھی صحت کے ساتھ اس کے بولنے، پڑھنے
اور لکھنے پر قدرت نہیں پاتا۔

مختصر یہ کہ ملکی زبان کی تعلیمی اہمیت کو محسوس کرنے کا وقت
آگیا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ وقت جا چکا ہے۔ ملکی زبان اور ادبیات
سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ یکسر ناآشنا ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے
محکمہائے تعلیم کے افسران اور تعلیمی ادارات کے اربابِ نظم و
نسق ملکی زبان سے ناآشنا ہونے کے سبب اس کی ترویج و تعلیم
کی جانب بھی توجہ نہیں کرتے۔ ضرورت ہے کہ ماہرین تعلیم ملکی زبان کو
ذریعۂ تعلیم بنانے کا اقدام کریں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے کامیاب
تجربے کو اپنے ارادوں کے لئے دلیل راہ بنائیں۔ اس وقت ملکی
زبان کے استاد بے طرح معاشی مشکلات میں مبتلا ہیں اور
چونکہ ملکی زبان تعلیمات میں ایک غیر ضروری حیثیت میں زندہ ہے
اس لئے ملکی زبان کے اساتذہ بھی اپنی بے حیثیتی سے نالاں زندگی
گزار رہے ہیں۔

مولوی فاضل، شاستری اور منشی فاضل

یہ حقیقت شاید فارسی کے اساتذہ کے لئے تلخ ثابت ہو
مگر اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربی اور
سنسکرت فارسی کے مقابلے میں مشکل ترین زبانیں ہیں۔ اس کے علاوہ
منشی فاضل کا سارا نصاب صرف ادبی ہے۔ لیکن مولوی فاضل اور
شاستری کے نصاب مختلف علوم و فنون پر حاوی ہیں۔

منشی فاضل کے امیدواروں میں ۵۰ فی صدی وہ لوگ ہوتے
ہیں جنہوں نے اپنی تعلیمی زندگی میں کبھی فارسی کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن
وہ انگلش میں بی۔اے بن جانے کی سہولت حاصل کرنے کے
لئے پانچ چار ماہ میں درسی کتابوں کو رٹ رٹا کر منشی فاضل کے امتحان
میں شامل ہو جاتے ہیں اور ان کی کامیابی کا اوسط کسی طرح اُن
امیدواروں کی اوسط کامیابی سے کم نہیں ہوتا جو شروع سے فارسی
پڑھتے آئے ہیں۔ مختلف دفاتر کے کلرک جن کی طبیعت ریاضی
سے مانوس نہ ہو سکی اور اس لئے انٹرنس میں کامیاب نہ ہو سکے۔
اپنی دفتری ملازمت کی ترقی کے لئے چھ ماہ کی چھٹی لے کر منشی
فاضل کے امتحان میں شریک ہو جاتے ہیں اور کامیابی کے بعد پھر
تین سال میں صرف انگلش کا امتحان دے کر انٹرنس سے ایف۔اے
اور ایف۔اے سے بی۔اے بن جاتے ہیں اور اس طرح دفاتر میں گریجویٹ
کلرکوں کے حقوقِ ترقی میں شامل ہونے کا حق حاصل کر لیتے ہیں۔
لیکن آپ نے یہ کبھی نہ سنا ہوگا کہ کسی کلرک نے چھ ماہ میں مولوی
فاضل کی تیاری کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے اور اس
راستے سے بی۔اے بنا ہے۔ کیوں کہ مولوی فاضل عربی کا آخری
اور مشکل ترین امتحان ہے۔ عربی اور فارسی میں بہ حیثیت دقّت
و اشکال ایک اور پچاس کی نسبت ہے۔ اس سے کم ہرگز نہیں
پھر مولوی فاضل کے نصاب میں فقہ، حدیث، تفسیر، منطق، فلسفہ
جیسے مشکل علوم بھی داخل ہیں جو زبان سے قطع نظر ذاتی طور پر
شروع سے پڑھنے پڑتے ہیں۔

یہی حال سنسکرت کا ہے کہ وہ عربی کی برابر بلکہ شاید اُس
سے بھی دشوار تر زبان ہے۔

لیکن محکمہائے تعلیم مولوی فاضل، منشی فاضل اور شاستری کو مساوی خیال کر کے انہیں مساوی درجہ بخش رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی بے امتیازی ہے اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ افسران تعلیم میں عربی، سنسکرت اور فارسی کی باہمی مسافت و بعد اور نشیب و فراز کا صحیح اندازہ کرنے والے نایاب ہیں۔

محکمۂ تعلیم کو اس بارے میں عربی اور سنسکرت کے حقوق امتیاز کو قائم کرنا چاہیئے!

راقم الحروف سنسکرت سے واقف نہیں، سنسکرت کے متعلق اس کا علم سماعی ہے۔ البتہ عربی اور فارسی کے دونوں آخری امتحان پاس کر چکا ہے۔ مجھے جامعۂ دیوبند میں درس نظامیہ کی تکمیل کرنے کے بعد بھی مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری میں ایک سال لگانے پر مجبور ہونا پڑا تھا، لیکن منشی فاضل کا امتحان صرف ۱۲ دن کے مطالعے کے بعد پاس کر لیا اور ۸۰ کامیاب امیدواروں میں چوتھے نمبر پر پاس ہوا۔ حالانکہ عہد طفلی میں گلستان کے چار باب تک فارسی پڑھی تھی جو نہ پڑھنے کے برابر سمجھی جا سکتی ہے لیکن چونکہ فارسی زبان میں عربی کے نوّے فیصدی الفاظ آتے ہیں، اس لئے عربی کے زور پر یہ امتحان ۱۲ دن کی محنت سے پاس کر لیا۔

خلاصہ یہ کہ اس مسئلے پر مجھے رہنمائی کا حق حاصل ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کو عربی کی مساوی حیثیت گزشتہ سولہ سال ہوئے ملی تھی ورنہ اس سے پہلے عربی اور سنسکرت کا تو مساوی رتبہ تھا ان کا ہر پرچہ ۱۵۰ نمبر کا ہوتا تھا اور فارسی کا ۱۲۰ کا۔ فارسی کو عربی کے ہمرتبہ بنانے میں فرقہ وارانہ جذبات سے زیادہ کام لیا گیا۔ ورنہ ان دونوں کو مساوی حیثیت دینا انصاف اور علم دونوں کے خلاف ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس

گزشتہ ۲۴-۲۵ اپریل کو لاہور میں علامہ عبداللہ یوسف علی کی صدارت میں پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔

اس کے زیر اثر پنجاب نان گورنمنٹ سکولز فیڈریشن، پنجاب ٹیچرز ایسوسی ایشن، پنجاب ایس، سی، ایس ایسوسی ایشن کے اجلاس بھی ہوئے۔ ان تعلیمی انجمنوں کے اجلاس میں پنجاب کے ہیڈ ماسٹر، ماہرین تعلیم اور عام اساتذہ کثرت سے شامل ہوئے۔

حسب دستور بہت سی تجاویز منظور ہوئیں۔ تجاویز پر دھواں دھار تقریریں بھی ہوتی رہیں۔ سب سے اہم تجویز جو اس اجلاس میں گرما گرم بحثوں کے بعد منظور ہوئی یہ تھی کہ:

"تعلیمی کانفرنس کا یہ نمائندہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ انٹرنس کے تمام مضامین (انگلش کے سوا) ورنیکولر میں پڑھائے جایا کریں"

اس تجویز پر بعض دوربین اساتذہ نے مطالبہ کیا کہ تجویز میں ورنیکولر کی بجائے اردو کا لفظ رکھا جائے تاکہ آئندہ یہ تجویز پولیٹکل ہنگامے برپا کر کے صوبے کے اتحاد کو خطرے میں ڈالنے کا باعث نہ بنے۔

اس پر لالہ برج لال انسپکٹر آریہ سکولز پنجاب سیکرٹری فیڈریشن نے معترضوں کو اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ:

"مڈل کی جماعتوں میں تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں، وہاں بھی ورنیکولر سے اردو ہی مراد تھی اور اس تجویز میں بھی یہی مراد ہوگی۔ اس لئے ورنیکولر کے لفظ کو اردو کے لفظ سے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔"

لیکن معترضین کی اس بیان سے تسلّی نہیں ہوئی، اور سچ یہ ہے کہ اُن کے خدشات بے جا نہ تھے۔ آجکل پنجاب کے سوا سارے ملک میں اردو زبان کے خلاف متحدہ اور سرگرم کوششیں جاری ہیں، مبادا ورنیکولر کا لفظ اپنی عمومیت معنی کے لحاظ سے شر انگیز عناصر کو بے جا فائدہ اٹھانے کے مواقع بہم پہنچائے۔

پنجاب کی تعلیمی زبان ابتدا سے اردو چلی آتی ہے کہ اردو درحقیقت پنجابی ہی کی ایک لٹریری شکل ہے۔

اس تجویز میں ورنیکولر کا لفظ بہت سے خطرات کا حامل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اردو ہندی کے سوال اٹھانے والے حضرات اس میں ورنیکولر کو اردو ہندی اور گورمکھی سے یکساں طور پر تعبیر کرنے لگیں اور ملکی خلفشار میں ایک اور تنازعے کی بنیاد پڑ جائے۔

لالہ برج لال سیکرٹری نے اگرچہ اطمینان دلانے کی کوشش کی، لیکن جو لوگ حالات کی رفتار اور انقلاب کا اندازہ رکھتے ہیں، اُن کا یہ خدشہ بے جا نہیں کہ آئندہ اس لفظ سے غلط فائدہ اٹھانے کی سعی کی جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ ذریعۂ تعلیم ملکی زبان کی بجائے کسی بیرونی زبان کو بنانا ایک ذلیل قسم کی دماغی غلامی ہے۔ اس سے نوجوانوں کی دماغی نشوونما خاک میں مل جاتی ہے اور قوت اختراع و ابداع سے وہ یکسر محروم ہو جاتے ہیں۔ تعلیمی انحلال کے ساتھ ہی کوئی مضمون ان کے لوحِ خیال پر نقش نہیں بن سکتا۔ وہ پڑھنے کے بعد دفتری بابو بن کر رہ جاتے ہیں اور کچھ نہیں اور دفتروں میں ان کے لئے "نو ویکنسی" کے سوا کچھ نہیں رہا ہے۔

مختصر یہ کہ جس کام کے لئے یہ ڈھالے گئے تھے وہ کام اتنا نہیں جس میں سب بابو لگائے جا سکیں اور کسی مصرف کے یہ ہوتے نہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ ملک کا لاکھوں نونہال بابو بن کر ملکی زندگی کے لئے وبال بن رہا ہے۔ اسی لئے تعلیم یافتوں میں جعل سازی، رہزنی اور خودکشی عام ہو رہی ہے۔

ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے تو جہاں مدتِ تعلیم مختصر ہو جائے وہاں جو کچھ پڑھیں اس میں درک حاصل کر سکیں اور طریقۂ تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی سے بے کاری اور بے روزگاری کی روک تھام ہو جائے۔ اس لئے پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ ریزولیوشن کہ ورنیکولر کو انٹرنس تک ذریعۂ تعلیم بنایا جائے وقت کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ اردو کی بجائے ورنیکولر کا گول مول لفظ تجویز میں داخل کر کے کانفرنس والوں نے باہمی منافرت و تصادم کے بہت سے خطرات مول لے لئے ہیں۔ مبادا بیرونِ پنجاب کے اردو ہندی جھگڑے اس ورنیکولر کے راستے .. .. سے پنجاب کے امن و امان کے لئے خطرہ بن جائیں۔ حکومت، اور تمام اہلِ پنجاب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پنجاب کا ذریعۂ تعلیم مڈل تک اردو زبان ہے اور اوپر کے درجوں میں بھی یہی زبان ذریعۂ تعلیم بن سکے گی۔ تعلیمات میں جہاں جہاں ورنیکولر کا نام آتا ہے اس سے اردو زبان جو درحقیقت پنجابی زبان کی ترقی یافتہ صورت ہے مراد لی جائے گی۔ اس بارے میں حکومت کی جانب سے ایک واضح اعلان کی ضرورت ہے۔

ہم ہندی اور گورمکھی کی تعلیم کے ہرگز مخالف نہیں، سرہلری سرکلر کی طرح کے کسی سرکلر کی جو محکمۂ تعلیم پنجاب کی جانب سے جاری کیا جائے ہم حمایت نہ کریں گے جس ہندو و مسلمان، سکھ یا عیسائی طالب علم کی مرضی ہو وہ ہندی اور گورمکھی ایک مضمون کے طور پر لے سکتا ہے، لیکن یہ مسئلہ طے شدہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ پنجاب میں ذریعۂ تعلیم کوئی ملکی زبان ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ مڈل کے درجے تک تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں، انٹرنس اور اس سے اوپر ایف۔ اے اور بی۔ اے اور بی۔ اے میں بھی ذریعۂ تعلیم صرف اردو کو بنایا جائے گا کہ اردو پنجاب کی تعلیمی زبان ہے۔

تاجور

کاغذ کی گرانی

ڈیٹا گڑھ پیپر ملز کی مسلسل ہڑتال نے دیسی کاغذ کو حدِ برداشت سے زیادہ گراں کر دیا۔ گراں ہی نہیں بلکہ نایاب بھی۔ جو کاغذ بازار میں تھا اس کا زیادہ حصہ جدید دستورِ حکومت کے نئے نئے محکموں نے خرید لیا ہے۔ رہی سہی کسر درسی کتابوں کے پبلشروں نے پوری کر دی۔ پہلے انہیں یہ خیال تھا کہ پنجاب ایڈوائزری بورڈ اپنی نئی اسکیم کا اعلان کر کے درسیات کے مقابلے کے لئے نئے کورس طلب کرے گا۔ اس لئے انہوں نے مروجہ کتابوں کی طباعت غیر ضروری سمجھ کر کاغذ کے لئے ڈیٹا گڑھ کے کارخانے کو آرڈر نہیں دیئے۔ آرڈروں کی عدم وصولی کی وجہ سے وہاں کاغذ تیار بھی نہ ہو سکا۔ اب بیک وقت پبلشروں نے کاغذ کی مارکیٹ پر ہلہ بول دیا اور تمام کاغذ خرید لیا۔ اُدھر ولایتی کاغذ بھی تبرک کے طور پر آ رہا ہے۔ یعنی حالت یہ ہے کہ بعض بعض سائزوں کا کاغذ کسی قیمت پر بھی نہیں ملتا۔ پنجاب کے تمام رسالے سری رام پوری کاغذ لگانے پر مجبور ہو گئے، کاغذ کی گرانی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سری رام پوری کاغذ کی قیمت بھی بجلی کی رفتار کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جس قیمت پر ڈیٹا گڑھ کا کاغذ ملتا تھا اب سری رام پوری کاغذ اُسی قیمت پر مل رہا ہے۔ دفترِ شاہکار کو بھی اس ہمہ گیر مصیبت میں شامل ہونا پڑا کہ اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا؟ ہمیں سری رام پوری کاغذ پسند نہیں، لیکن کیا کریں کہ بازار میں کسی ایک دکان پر اکٹھا یہ بھی نہیں ملتا۔ امید ہے ہماری اس مجبوری کو کسی ارادی بے پروائی یا تجارتی مصلحت پر محمول نہ کیا جائے گا۔

عدم گنجائش: اس نمبر میں عدم گنجائش کے ایڈوائزری بورڈ کے متعلق نوٹس اور سوالات و جوابات نہ کیا جا سکا، اگلے نمبر کا انتظار کیجئے۔

مسخ چہرہ ہو کے رہتا ہے ریا کا اشتہار		دل کی کالک صاف ہوتی ہے جبیں سے آشکار
دیدۂ خود بیں میں رہتا ہے شرارت کا خمار		جھوٹ کے بھپکوں سے ہو جاتا ہے سینہ تنگ و تار

بندشِ اخلاق قلبِ حیلہ جُو سہتا نہیں
آدمی پھر فی الحقیقت آدمی رہتا نہیں

ایسے ہوتے ہیں بہت کم خوش نصیب و کامگار		جن کو مِل جاتی ہے قسمت سے فضائے خوشگوار
ہاں کبھی کوشش کے اندھے تیر کر جاتے ہیں وار		بے زری کو ورنہ کب ملتا ہے نرد اہی میں بار

بُھوک میں کچھ ضبط کی تلقین ہو سکتی نہیں
ڈگریوں کو چاٹ کر تسکین ہو سکتی نہیں

احسان دانش

رباعیات

شکوۂ احباب

احباب تو جینے نہیں دیتے یارب!
دل چاک ہے، سینے نہیں دیتے یارب!
نادانوں کا التفات، اللہ اللہ
اب بھی مجھے پینے نہیں دیتے یارب!

ذوقِ گناہ

کٹ جائے یہ عمر آہ کرتے کرتے
فردِ ہستی سیاہ کرتے کرتے
رحمت، مری ہمت کو بڑھا دے یارب!
تھک جاؤں میں جب گناہ کرتے کرتے

یزدانی جالندھری

کرنول کے آخری تاجدار کی حکومت سے بیدخلی کے اسباب

(گذشتہ سے پیوستہ)

معلوم ہوتا ہے کہ کمیشن اور حکومت وقت نے اس اہم پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ نواب کو ہر قسم کا حق حاصل تھا کہ وہ ایک منظم فوج ہر وقت تیار رکھے، اور ضرورت کے وقت اپنی حفاظت یا حکومت کمپنی کی امداد کرے، نواب کا یہ فعل صرف اسی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے آبا و اجداد نے بھی ایک سے زیادہ مواقع پر اپنی فوج سے حکومت کی امداد کی تھی صرف یہی نہیں بلکہ شاہی خاندان کے افراد کو ان جنگوں میں حصہ لینے کے لئے بھجوایا تھا۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے ذیل کے خط مورخہ ۲۷ر فروری ۱۸۱۰ء میں ان خدمات کا اعتراف کیا ہے:۔

"آپ کے مذکورہ صدر قاصد نے کچھ دنوں پہلے مجھ سے کہا تھا کہ کرنل کلوز کی خواہش کے مطابق کیپٹن سیڈ تھام نے آپ کی فوجیں جالنہ پور کی طرف اس غرض سے روانہ کر دی ہیں کہ وہ کرنل مونٹر وز کے تحت کی برطانوی افواج کے ساتھ مل جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنے آپ کی فوجیں ہماری فوجوں کے ساتھ ساتھ کوچ کر رہی ہیں۔ آپ نے جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور معرض بحث افواج کے روانہ کرنے میں جس عجلت سے کام لیا ہے اس سے آپ کے اور برطانوی حکومت کے گہرے تعلقات کا صحیح صحیح پتہ چلتا ہے نیز یہ کہ ایسے افعال سے برطانوی تاج سے آپ کی حقیقی وفاداری کا بھی کافی ثبوت ملتا ہے۔ آپ کا یہ قابل تعریف کارنامہ میرے لئے بیحد مسرت اور طمانیت کا باعث ہوا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کرنل مونٹر وز آپ کے بھائی کے شایان شان سلوک کرنے میں کبھی دریغ نہ کریں گے۔ بلکہ انہیں ہمیشہ آپ کے خانوادہ شاہی کے خاص آداب اور حکومت برطانیہ کے ساتھ آپکے پُر خلوص دوستانہ تعلقات کا خیال رہے گا۔"

حکومت کو ہر وقت اختیار حاصل تھا کہ جب چاہے نواب کی افواج کو گھٹا دے بڑھا دے، توپ خانہ کو توڑ کر پرزے پرزے کر دے جنگ کے دوسرے ساز و سامان کو برباد کر دے اور آئندہ کے لئے نواب کے ملک میں اسلحہ اور بارود گولی کی درآمد کی قطعی طور پر ممانعت کر دے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف اس وقت زیبا تھا جب کہ نواب حکومت کے احکام کی تعمیل میں لیت و لعل برتتا یا برطانوی تاج کے اقتدار اعلیٰ کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا، ان صورتوں میں نواب کا تخت سے ہٹا دیا جانا واجبی ہوتا مگر ہمیں تعجب ہوتا ہے جب یہ دیکھتے ہیں کہ نواب کا طرزِ عمل بالکل وفادارانہ رہا اور اس کے باوجود اس کو بُرے دن دیکھنے پڑے، اس نے کمشنروں کو اپنے پوشیدہ اسلحہ کے دکھانے میں ذرہ برابر بھی تساہل نہ کیا۔ اس کے علاوہ قلعہ اور پوری سلطنت کو حسب ایمائے کمپنی کمشنروں کے آتے ہی خود بخود حوالے کر دیا تا کہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور اس وقت تک بالکل خاموشی کے ساتھ علاقہ زورا پور میں گوشہ نشین رہا۔ جب تک کمشنروں نے حکومت کی ہدایات کے مطابق پورے الزامات کی تحقیقات نہ کر لی۔ اس کے باوجود حکومت کی پالیسی توقع کے خلاف رہی، حکومت کا اصل مقصد اپنی سلطنت کو وسعت دینا تھا۔ اس لئے اس نے کرنول کی جاگیر کو اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔ حالانکہ حکومت کا یہ طرزِ عمل خود اس کے بیانات اور اظہارات کے خلاف تھا۔ چنانچہ ایک خط نمبر ۴۴۳ مورخہ ۷ر اکتوبر ۱۸۳۹ء سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے:۔

"فضیلت مآب کو آپ کی رائے سے کامل اتفاق ہے۔ اگر نواب نے کرنول کا قلعہ بلا تکلف حوالہ کر دیا ہے اور ہمارے احکامات اور شرائط کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے۔ تو ایسی صورت میں اس امر کی چنداں ضرورت نہیں کہ فی الحال اس کی سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔"

ان واقعات کے بعد ہم فوجی اشیاء کی خفیہ فراہمی کے مسئلہ کو لیں گے - اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ فعل نواب کی اہم ترین غلطی اور زبردست عہد شکنی معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ہم واقعہ کی تفصیلات میں پہنچ کر کمشنروں کی رپورٹ پر غور کرتے ہیں تو ہم کو صریح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے یہ حرکت عمداً یا کسی خاص ارادہ یا بُری نیت سے نہیں کی تھی، بلکہ پوری کارروائی اس کے دماغی فتور کا نتیجہ تھی، اس لئے کہ ایک سازشی انسان جس نے بُرے مقاصد کے تحت جنگی ساز و سامان مہیا کیا ہو اس طرح غیر محفوظ طریقہ پر ہرگز نہیں رکھ سکتا تھا جس کی اطلاع ہر کس و ناکس کو ہو جائے - نواب نے جو بھی ذخیرہ فراہم کیا تھا وہ سب کچھ معمولی حفاظت کے ساتھ کھلے مقام پر پڑا ہوا تھا - تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ نواب کا ارادہ واقعی وہی تھا جس کا الزام اس پر رکھا گیا تھا - تو ایسی صورت میں ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا نواب کو فوج کی ضرورت نہیں تھی ؟ کیا اس کا ارادہ اس تمام خفیہ ذخیرہ کے ساتھ بذاتِ خود یا چند سپاہیوں کے ساتھ کسی دشمن کا مقابلہ کرنا تھا ؟ معمولی عقل کا انسان بھی اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ اسلحہ اور سپاہی لازم و ملزوم ہیں - اگر نواب کو لڑائی ہی مقصود تھی تو وہ سپاہی بھی ساتھ ساتھ جمع کرتا تاکہ فوجی قوت مکمل ہو سکے - لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نواب غلام رسول خاں نے اپنی فوج کو منظم کرنے کی کبھی تکلیف ہی گوارا کی اور نہ اس کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی، تنظیم کا سوال تو خاص اہمیت رکھتا ہے - افسوس کی بات تو یہ ہے کہ نواب مذکور نے اپنے آخری دورِ حکومت تک کسی وقت بھی پابندی سے تنخواہیں تک تقسیم کرنے کی کوشش نہیں کی جب کبھی ان غریبوں کی حالت زار پر رحم آ جاتا تو تھوڑا بہت اناج یا اس قسم کی اور چیزیں تقسیم کروا دیتا - جب فوجیوں کی یہ حالت ہو تو اس پر ہم فوج کی باقاعدگی کا اندازہ کر سکتے ہیں اور بعض روایات کے مطابق یہ کہہ سکتے ہیں کہ نواب کی فوج کی بندوقوں کی ایک نال ہی سیدھی تھی اور نہ ایک توپ ہی ٹھیک حالت میں تھی - بارود صرف روزانہ سلامی کے لئے استعمال ہوتی تھی اس کے بعد اللہ اللہ خیر صلا کا حساب تھا - اگر ضرورت پڑے تو بارود خانہ سے ایک سیر بارود زائد نہیں نکل سکتی تھی - ذیل کے ایک اقتباس ع۹۰ مورخہ ۲۲ فروری ۱۸۴۰ء (Minutes of Consultation) سے ہمارے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

"قابلِ احترام گورنران کونسل کو سابقہ خط والی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے اور قلعہ کرنول سے جو بارود برآمد ہوئی ہے اس کی کچھ مقدار پتھروں کے اڑانے کان کنی کے تجربوں، صبح اور شام توپوں کے داغنے اور کچھ حصہ فوج کے استعمال کے لئے حاصل کرنے کا آپ کو مجاز گردانا جاتا ہے اور باقی حصہ اگر کرنول میں خریدار پیدا ہوں تو فروخت کر دیا جائے ورنہ جلا دیا جائے۔"

یہ اسی بارود کی مقدار کا ذکر ہے جو صرف نواب کی سلامی کی توپوں کے لئے روزانہ استعمال ہوتی تھی - یہ ذخیرہ سال کا سال خرید لیا جاتا تھا، اس کے علاوہ صبح اور شام کی توپوں کے لئے ایک مقررہ مقدار ہر سال لے لی جاتی تھی - ان دو ذخیروں کے علاوہ تیسرے کسی غیر معمولی ذخیرہ کا کہیں بھی ذکر نہیں آیا -

لہذا ایک ایسی فوج جس کے پاس بارود گولی تک کافی مقدار میں نہ ہو وہ کسی دشمن کا تو کیا ڈاکوؤں اور لٹیروں تک کا مقابلہ نہیں کر سکتی، قلعہ کی دیواریں خستہ حال اور غیر محفوظ حالت میں پڑی ہوئی تھیں قلعہ کی حفاظت کے خیال کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ فصیل کے بیرونی حصہ پر ایک خاص مقام سے نہایت چوڑی سیڑھیوں کا سلسلہ انتہائے دیوار تک تھا جس کے ذریعہ ایک بھاری فوج صرف چند منٹ میں قلعہ کے اندر بلا کسی مداخلت کے داخل ہو سکتی تھی - اس قسم کے حالات سے ہم سوائے اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نواب غلام رسول خاں کو اسلحہ جمع کرنے کا مرض تھا، جیسا کہ ہم نے پیشتر بارہا کہا ہے کہ اس حرکت سے نواب کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا - نواب کی مرغ بازی، عمدہ عمدہ قسم کے اور اعلیٰ نسل کے مرغ جمع کرنے کا انہماک اور ان کو لڑانے کا شوق درجہ کمال کو پہنچنے کے باعث ضرب المثل کی حد تک پہنچ گیا تھا - پس اسلحہ جمع کرنے کے شوق کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ مرغ بازی اور فراہمی اسلحہ کا شوق مساویانہ درجہ رکھتے تھے - لیکن یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ تعمیر امکنہ اور باغبانی کا ذوق بھی کچھ کم نہ تھا، یہ تمام حرکتیں اس کے جنون کا کافی ثبوت تھیں - اس کی بیوقوفی کی انتہا کے ثبوت میں ایک اہم واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے چند روز تک ایسے مقام پر قیام کیا جس کے اطراف بارود کے خزانے تھے اور وہ بھی بالکل غیر محفوظ حالت میں - اب آپ خود بتائیں

کہ یہ پگلے پن کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔" اب جنون کے زمانہ میں بھی اس نے کسی وقت اپنے جمع کردہ اسلحہ کے بل بوتے پر اس قسم کا خیال تک ظاہر نہیں کیا کہ وہ برطانوی حکومت سے لڑنا چاہتا ہے یا اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لڑائی یا جنگ سے غیر ارادہ کا کافی ثبوت اسی وقت مل جاتا ہے جب کمشنر کرنول کے علاقہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے شہر میں داخل ہونے پر نواب نے پُرتپاک خیر مقدم کے لئے اپنے امراء روانہ کئے۔ جب وہ لوگ محل میں آئے تو خود نواب نے آگے بڑھ کر جوشِ عقیدت اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور انہیں شان و شوکت سے لاکر اپنی گدی پر بٹھایا۔ جب انہوں نے حکومت کے احکام سنائے تو بغیر کسی اعتراض کے خاموشی کے ساتھ شہر اور ملک کرنول کو ان کے حوالے کر کے خود ایک دُور مقام پر جاکر ٹھہر گیا۔ تاکہ کمشنروں کو تحقیقات میں کسی قسم کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔ صرف یہی نہیں کیا بلکہ انہیں تحقیقات کے دوران میں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غلام رسول خان اگرچہ اپنی جگہ پاگل، مجنوں اور بے وقوف انسان تھا لیکن وہ لڑاکو، سازشی یا حکومت برطانیہ کا نافرماں بردار نواب نہیں تھا بلکہ اس کی بجائے کمشنروں کی تحقیق و تلاش میں وہ ایک مستقل مزاج اور حکومت برطانیہ کا یار وفادار نیز ایک ایسا غیر جانب دار شخص ثابت ہوا جس کو کسی نواب یا رئیس سلطنت سے برطانیہ کے خلاف سازشی خط و کتابت کا مطلق تعلق نہیں۔

اب ہمیں ذرا اپنے موضوع سے ہٹ کر نوابان کرناٹک کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ ان نوابوں کے تعلقات حکومت برطانیہ اور نوابان کرنول کے ساتھ کیسے تھے۔

ایک سے زائد موقع پر علاقہ کرناٹک میں کمپنی کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور شورشوں کے وقت امن قائم کرنے میں بہت سی مشکلوں سے دوچار بھی ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ نوابان کرناٹک کے دور حکومت میں رعایا سے محاصل وصول کرنے یا نوابان کرناٹک اور ان کی باج گذار ریاستوں مثل ٹانجور کے جھگڑے چکانے اور سب سے بڑھ کر ان ریاستوں سے کمپنی کو خود اپنا قرض وصول کرنے میں کتنی تکلیفیں سہنی نہیں پڑیں۔ یہ جملہ ریاستوں کے والی ایک نہیں بلکہ کئی مرتبہ کمپنی اور برطانوی قوم کی نظروں میں جھوٹے ٹھہر چکے ہیں۔ محمد علی خاں یا عمدۃ الامراء کی اطاعت پذیری کا سوال ہمیشہ معرضِ بحث میں رہا ہے حالانکہ ان دونوں نے جو کچھ بھی شان و شوکت یا قوت حاصل کی اور آخر وقت تک اپنے حلیفوں سے بچتے رہے وہ محض کمپنی کی مہربانی کا طفیل تھا، محمد علی کے بھائی محفوظ خاں اور اس کے والد انوارالدین خاں نے انگریزوں کو وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی جو تکلیفیں پہنچائی ہیں اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (Manual of Carnatic & Karnool) کا پہلا حصّہ۔ اس کتاب میں نوابان کرناٹک کے سازشی اور ظالمانہ کردار کا پورا پورا ثبوت ملے گا لیکن کمپنی نے ان کو بُری نظر تک سے نہیں دیکھا، بھلا اس کو کس کو ایک بے گناہ اور معصوم خیال نواب غلام رسول خاں کو جس پر بلا وجہ عائد کردہ الزامات کی تحقیق اور ثبوت کے باوجود حکومت نے ایسی مصیبت نازل کی کہ اس کے خاندان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگا کر چھوڑا۔ کمپنی یہ جانتی تھی کہ جنوبی ہند میں حکومت برطانیہ کے جانی دشمن ٹیپو سلطان کے ساتھ عمدۃ الامراء کی سازشی مراسلت جاری تھی۔ حکومت کے لئے اس سے بڑھ کر قابلِ اعتراض چیز کیا ہو سکتی تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جانتے ہوئے بھی حکومت نے نواب موصوف سے کوئی بازپُرس تک نہ کی، اس مراسلت کا اصل مواد سرنگاپٹم کی تباہی کے بعد ہاتھ آیا۔ جس کا کچھ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"عمدۃ الامراء جس نے اپنے باپ محمد علی کے انتقال کے بعد ۱۷۹۵ء میں حکومت کی باگ ہاتھ میں لی، شروع ہی سے کمپنی سے متنفر تھا اور کمپنی کے ساتھ جو بھی وعدے کئے تھے ان کے پورا کرنے کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ حتیٰ کہ ٹیپو سلطان اور کمپنی کی آخری فیصلہ کُن جنگ کے موقعہ پر بھی اس نے موعودہ ساز و سامان کی سربراہی روک لی جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کمپنی کے ساتھ اس کی نیت صاف نہیں ہے، سرنگاپٹم کی تسخیر کے بالکل ہی بعد سلطان کے سرکاری کاغذات میں اس قسم کے مراسلے بھی برآمد ہوئے جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ علاقہ ارکاٹ کے دونوں والوں سے ٹیپو سلطان کی خفیہ مراسلت تھی۔ اس مراسلت کا کچھ حصّہ بے معنی سا تھا لیکن اس کا حل سلطان کے بعض سرکاری کاغذوں میں موجود تھا جس کا یہ تھا کہ وہ تاریخ مطلب انگریزوں اور ان کے حلیفوں کے نام تھے، یعنی انگریزوں کے لئے "تازہ وارد" کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے اور سرکار نظام کو "ہیچ" یعنی کچھ بھی نہیں اور مرہٹوں کو "پوچ" یعنے حقیر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں ان دستاویزات سے اس سے زیادہ اہمیت کا اور کوئی خاص انکشاف نہ ہو سکا لیکن چونکہ یہ مراسلت کمپنی کے ایک دشمن کے ساتھ تھی اور نواب کا یہ عمل ۱۷۹۲ء کے ایک معاہدہ کے خلاف اشتعال انگیز شکل پر مبنی تھا لہذا ایسی صورت میں اگر کمپنی نواب موصوف کو تخت سے علیحدہ بھی کر دیتی تو اس کا یہ عمل حق اور انصاف کی پالیسی پر مبنی ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے قابل اعتراض اور اہم معاملہ میں گورنر جنرل کا طرزِ عمل وہی رہا جو پہلے تھا۔ شاید آخر میں گورنر جنرل کی طرف سے کوئی باز پرس ہونے والی تھی، لیکن نواب کی طویل علالت نے اس مسئلہ کو لیت و لعل میں ڈال دیا۔ اور کمپنی نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔

۱۵ر جولائی ۱۸۰۱ء کو نواب عمدۃ الامراء کا انتقال ہو گیا۔ نواب کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا علی حسین تخت پر بیٹھا، اس نوجوان شہزادہ کے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی درپردہ یہ کوشش شروع ہو گئی۔ کہ کسی طرح اس کو راضی کر لیا جائے کہ اپنی حکومت کمپنی کی حکومت سے ملحق کر دے تاکہ کرناٹک کا ایک بڑا علاقہ انگریزی اقتدار کے تحت آ جائے، لیکن اس قضیہ کے طے ہونے سے قبل اس شخص کی نااہلیت اور مملکت کی امور میں ناقابلیت نے اس کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اس کا جانشین خود اس کا چچازاد بھائی عظیم الدولہ ہوا۔ اس شخص کے نواب بنانے میں انگریزوں ہی کا ہاتھ تھا۔ کمپنی نے پہلے پہل اس کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور پھر حکومت کا لالچ دے کر اس سے یہ شرط منظور کرا لی کہ سالانہ ایک معقول معاوضہ اور خطاب نوابی کے صلہ میں وہ کرناٹک کا پورا علاقہ انگریزی حکومت کے اقتدار میں ہمیشہ کے لئے شامل کر دیگا۔

ہم نے دیکھ لیا کہ عظیم الدولہ کو حکومت کن شرائط کے تحت ملی تھی، لیکن اس کے باوجود تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ برسر اقتدار ہونے کے بعد نواب مذکور نے کمپنی کی کوئی شرط اور کسی معاہدہ کی تکمیل نہیں کی، کمپنی کے آڑے وقت فوجی یا مالی کسی قسم کی امداد نہیں کی اگر کسی وقت تھوڑی بہت مدد کچھ کی بھی ہے تو سچے دل سے نہیں بلکہ شرائط کی سخت جکڑ بندیوں کے باعث محض ظاہرداری کی خاطر، ہم شروع سے اس بات کو خاص طور سے دیکھ رہے ہیں کہ خاندان کرناٹک کا کوئی فرد انگریزوں یا ان کی حکومت کے موافق نہیں تھا۔ جس کا مزید ثبوت مسٹر منٹو کے مندرجہ ذیل خط بنام کورٹ آف ڈائرکٹرس مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۷۹۷ء سے ملتا ہے :-

"جب میں یہ خط لکھ رہا تھا۔ نواب کے لڑکوں کے پاس سے ایک اطلاع آئی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کا باپ فرانسیسیوں کے ساتھ واقعی ملا ہوا ہے، جس کے ثبوت میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ حال ہی میں چار قیدی ارکاٹ سے پونڈیچری روانہ کیے گئے، اس امر سے ہمارے تعلقات مشتبہ ہو جاتے ہیں، لہذا ہمیں چاہیئے کہ نواب اور اس کے لڑکوں کو اپنا بنانے کی ممکنہ کوشش کریں، اور ان کے پچھلے معاہدوں کا اعادہ کر کے اپنے مفاد کو مستحکم کرنے کی کوشش کریں اور اگر ممکن ہو تو اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ علاقہ مدراس کو دوبارہ سے اپنے قبضہ میں لانے کے لئے ایک خاص شرط منظور کرا لی جائے۔ میرے خیال میں یہ امر زیادہ مشکل اس لئے نہیں ہے کہ وہ خود اب تک اس کا اقرار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ نواب کے مشیر ظاہری اور فوری فائدہ سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے آدمی اعتبار کے قابل کب ہو سکتے ہیں۔"

اس ضمنی بحث کے بعد پھر سے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے ...... بدبخت نواب غلام رسول خاں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ نواب موصوف یا اس کے آبا و اجداد نے اپنی حلیف حکومت یعنی حکومت برطانیہ کے ساتھ کسی موقعہ پر بھی دھوکہ یا دغا کا سلوک نہیں کیا۔ کشنروں کی روئداد سے کسی ایسے واقعہ کا ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ نواب سازشی کردار کا حامل تھا، بدقسمت نواب اور اس کے اجداد حکومت برطانیہ کو یار وفادار سمجھ کر ہمیشہ ان کی مدد کرتے رہے ہیں حق تو یہ ہے کہ محض وفاداری اور دوستی کے مغالطہ میں انہوں نے معزز کمپنی کی امداد میں اپنی بھلائی برائی اور اپنے اور بیگانے کی جان و مال تک کا خیال نہ کیا۔ حتٰے کہ جب ضرورت پڑی ہے تو اپنے عزیز اقربا کے جانی ایثار تک سے دریغ نہ کیا۔ لارڈ منٹو کے خط کا اقتباس جو پچھلے صفحات

میں دیا جا چکا ہے اور لارڈ ہیسٹنگز کے ایک خط مورخہ ۲۲ر جون ۱۸۱۸ء کے اقتباس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نواب نے ان معاملات میں کسی قسم کی گرم جوشی اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

"آپ نے اپنے وعدے کے موافق ایک فوجی دستہ کو پورے طور پر مسلح کرنے میں واقعی قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ اس واقعہ سے ہمارے ساتھ آپ کی حقیقی دلچسپی اور دوستی کا اظہار ہوتا ہے، ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ کی وعدہ خلافی اور نافرمانی کے متعلق ہم کو جو غلط فہمی تھی اس کو آپ نے فضیلت مآب معزز معززاں مسٹر ہولٹ گورنر مدراس کے خرلطے کے پہنچتے ہی نہایت تدبر اور دانشمندی کے ساتھ بہت جلد دُور کر دیا، اور اپنے چھوٹے اور وفا شعار بھائی احمد خاں اور اپنے ... چچا عبدالرحمٰن خاں کی سرکردگی میں پانسو پیدل اور پانسو سوار کی ایک منظم اور باقاعدہ فوج کو ہمارے سپہ سالار جنرل لیک کے ساتھ تعاون عمل کرنے کے لئے بھیج کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تاکہ ہم اور آپ مل کر متحدہ طور پر مغرور اور بے ایمان سردار باجے راؤ کو اس کی بد اعمالیوں کی خاطر خواہ سزا دے سکیں۔"

(باقی آئندہ)

غلام محمد خاں (عثمانیہ)

غزل

اب پسند آئیں ادائیں انہیں دیوانوں کی
دھجیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں گریبانوں کی

سجدے کرتا ہوں میں چوکھٹ پہ صنم خانوں کی
کونسی بات ہے اب مجھ میں مسلمانوں کی

خوگرِ درد بھی ہوں، شوق سے بیتاب بھی ہوں
شمع کے بھیس میں تقدیر ہوں پروانوں کی

جھلملاتے ہوئے تاروں کو یہ کیا سوجھی ہے
دیکھنے آئے ہیں دنیا مرے ارمانوں کی

شمع لائے ہیں تری بزم میں مطلب یہ ہے
یاد آئے تجھے بھولے ہوئے پروانوں کی

پھر کہاں لیکے چلی حسرتِ دیدار مجھے
پاؤں پر گرد ابھی باقی ہے صنم خانوں کی

تنگ ہے پھر بھی یہ دنیائے محبت خنداںؔ
دل کے ہر ذرّے میں وسعت ہے بیابانوں کی

رام جویا خنداںؔ

قطعات

ایک شام

جا رہا تھا میں سر جھکائے ہوئے — گزری اک ماہرو برابر سے
بھر کے اپنی نظر میں کچھ کرنیں — اُس نے سینے میں ڈال دیں میرے

مدہوش رات

چاندنی، تارے، ابر کے ٹکڑے — ہائے کس قہر کی حسیں ہے رات
لیجئے وہ پھوار پڑنے لگی — آج کیوں ہوش میں نہیں ہے رات!

مدفنِ شباب

جہاں دیدنی ہے لہو کی روانی! — برستی ہے جس جائے ارغوانی
جسے کہتے ہیں سرزمینِ محبت — وہیں دفن ہے میری کافر جوانی

رعنائی خیال

نہ دل ہے نہ ہنگامہ آرائیاں ہیں — تحسّر ہے، حرماں ہے تنہائیاں ہیں
یہ عشق و محبت، یہ بادہ، یہ نغمہ — سب اپنے تخیل کی رعنائیاں ہیں

اُمنگ

فضا نہ تھی کبھی اتنی جواں مرے نزدیک — ہوا کے جھونکے مرے واسطے نئے ہیں آج
مری امنگ ہے پرتو فگن گلستاں پہ — سفید پھول بھی رنگین ہو گئے ہیں آج

چاندنی رات

فضا ہے نور کی بارش سے سیم گوں اس وقت — جہانِ مست پہ طاری ہے اک سکوں اس وقت
نہ چھیڑ دردِ جدائی کی داستاں اے دل — تجھے خبر نہیں میں کس کے پاس ہوں اس وقت

اختر انصاری دہلوی
بی۔ اے (آنرز)

عجیب محبّت

(تاریخی افسانہ)

"کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو، فلینا!؟"

"میں تمہاری پرستش کرتی ہوں، لوکوس!"

"عہد کرتی ہو؟"

"ہمیشہ کے لئے۔"

"اب میں میدانِ جنگ میں بے فکر جاؤں گا، مجھے تم پر پورا بھروسہ ہوگا۔ مجھے اس خیال سے تسکین ہوگی کہ تم میرا انتظار کر رہی ہو اور میری سلامتی کے لئے معبودوں سے دُعا کر رہی ہو۔"

لوکوس نے یہ کہا، فلینا کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے چند قطرے گرے، وہ فوج میں واپس چلا گیا۔

کوئی نصف گھنٹے کے بعد، اُسی کمرہ میں ایک دوسرا نوجوان موجود تھا، کشادہ پیشانی، لانبا جسم، مضبوط اعضا، غرض لوکوس سے بالکل مشابہ۔ فلینا سے اُس نے کہا:۔

"کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو، فلینا؟!"

"محبت نہیں بلکہ پُوجتی ہوں۔"

"وعدہ کرتی ہو کہ صرف مجھی سے محبت کروگی اور ہمیشہ؟"

"بسر و چشم!"

"اب میں نہایت اطمینان سے جنگ میں جاؤں گا، مجھے امید ہے کہ تم میرا انتظار کروگی اور خدا سے دعا کروگی کہ صحیح وسلامت واپس لائے، اس کے بعد تم ہوگی اور میں۔"

لاجوس نے یہ کہا اور فلینا کی آنکھوں سے پھر گرم آنسوؤں کے قطرے گرے۔ وہ فوج میں واپس چلا گیا۔

عورت دو آدمیوں سے محبت کرے، یہ کوئی حیرت انگیز چیز نہیں تاریخ کے اوراق اس قسم کے واقعات سے لبریز ہیں۔ لیکن یہ یقیناً قابلِ تعجب ہے کہ دونوں سے شدید محبت ہو، دونوں میں سے کسی ایک کی بھی جدائی گوارا نہ ہو۔ اس سے زیادہ تعجب اس پر ہے کہ ہر دو عاشق اپنے رقیب سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن انہیں کوئی شکایت نہیں۔ وہ اس سے بھی واقف ہیں کہ وہ ہر ایک سے یہی وعدہ کرتی ہے کہ میں تم سے، صرف تم سے محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ مگر انہیں کوئی اعتراض نہیں۔

"فلینا کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

ملکہ مصر، کلوپیٹرا کے محل میں دونوں عاشق، لوکوس رومی اور لوجوس یونانی روزانہ یہی سوال فلینا سے کرتے۔ یہ عجیب وغریب فلینا کون ہے؟ اس سے کوئی بھی واقف نہیں۔ جسے کچھ واقفیت تھی وہ یکایک مرگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے کھانے میں زہر دے دیا گیا اور اس سازش میں اسی لڑکی، فلینا کا ہاتھ تھا، کیونکہ یہ اس سے رہائی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اُس کا نام عمر تھا۔ عربی النسل تھا، یولیوس قیصر کے اسکندریہ میں داخل ہونے اور کلوپیٹرا کے تخت پر بیٹھنے کے بعد مصر آیا تھا؛ فلینا بھی ساتھ تھی۔ اس وقت فلینا کی عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ کلوپیٹرا نے اسے دیکھتے ہی اپنے یہاں رکھ لیا، اس سے انتہائی محبت کرتی۔ اس کے متعلق محل میں عجیب وغریب باتیں مشہور تھیں۔ عموماً خیال تھا کہ:۔

> "یہ لڑکی ملکہ کی بہن ہے۔ بطلیموس ایک عربی عورت سے محبت کرتا تھا، اس سے یہ پیدا ہوئی ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد، اس نے اپنی محبوبہ کو قتل کر دیا اور اس لڑکی کو کسی درباری کے ساتھ بہت سامال دے کر مصر سے باہر بھیج دیا۔ اس نے نہایت سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ میری زندگی میں واپس نہ آنا۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد جب کلوپیٹرا تخت پر بیٹھی ہے تو عمر اسے لے کر واپس آیا۔۔۔۔۔۔"

یہ باتیں صرف محل کی لونڈیوں ہی تک محدود نہیں رہیں بلکہ ملکہ کو بھی معلوم ہو گیا۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ اپنے رومی عاشق مارک انٹونیو کے پاس

فوراً آ گئی اور اُس سے کہا۔ والد کے زمانہ میں ایک امیر لشکر تھا، اُس کی یہ لڑکی ہے۔ شروع سے میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ میرا اس سے برتاؤ ویسا ہی ہے، جیسا ایک بہن کا اپنی بہن سے ہوتا ہے۔

فلیتا کے اطوار اور اعمال عجیب و غریب تھے وہ بیک وقت ہنستی بھی اور روتی بھی، غصہ بھی ہوتی اور خوش بھی، راضی بھی اور ناراض بھی، سوتی بھی اور جاگتی بھی۔ ان وجوہ کی بنا پر محل کی کنیزوں کا اعتقاد تھا کہ اس پر معبودوں کا سایہ ہے۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ فلیتا دو آدمیوں پر جان دیتی تھی۔ وہ رومی سپاہی لوکوس سے محبت کرتی تھی اور یونانی سپاہی لاجوس پر بھی عاشق تھی۔ دونوں سے اخلاص محبت کا وعدہ کرتی اور کہتی کہ نہ دونوں میں سے کسی کو جدا کرے گی اور نہ اس پر قادر ہے۔

رومی فوج کی ایک رجمنٹ نے بغاوت کر دی جو مارک انٹونیو کے ساتھ مصر گئی اور عاشق قائد کے ساتھ وہاں مقیم تھی۔ "ملکہ کی باڈی گارڈ" گوشمالی کے لئے بھیجی گئی، باڈی گارڈ میں لوکوس یونانی بھی تھا۔ اتفاقاً انہیں ایام میں سرحدی قبائل میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی، جس کی سرکوبی کے لئے "جانباز سواروں" کی فوج بھیجی گئی، جس میں لاجوس رومی سپاہی تھا۔

فیتا اس کے بعد سے دعا میں مشغول ہو گئی، کمرہ سے باہر نکلنا بند کر دیا، رات دن معبودوں کے سامنے روتی، گڑگڑاتی، دعائیں کرتی کہ اس کے دونوں محبوب صحیح سلامت واپس آئیں۔

دو ہفتے گزر گئے، تیسرے ہفتے میں باڈی گارڈ کی کامیابی اور باغیوں کی شکست کی خوشخبری لے کر ایک قاصد آیا مگر اس کے ساتھ ہی یہ افسوسناک اطلاع بھی ملی کہ تمام بہادر نوجوان کام آ گئے، مقتولین میں لوکوس بھی تھا۔ فیتا کو جب معلوم ہوا تو اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی، دامن صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ چھوٹے سے نقرئی خنجر کو جسے کلوپیٹرا نے ہدیہ میں دیا تھا، سینہ میں اتار دیا۔ خنجر کا اترنا تھا کہ زمین پر بیہوش ہو کر گری اور زخم ——— بلکہ دل سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا — معبودوں کی مورتیں، جنہوں نے غریب عاشق کی دعاؤں کو قبول نہیں کیا تھا، خون سے رنگین ہو گئیں۔ دل کی رگ بالکل منقطع ہو گئی تھی مگر فیتا مری نہیں، قلب کی حرکت بند ہو جانے کے باوجود زندہ تھی۔

کئی ہفتے گزر گئے، فیتا اچھی ہونے لگی، حالانکہ قلب کی حرکت علی حالہٖ بند تھی۔

"جانباز سپاہیوں" کی کامیابی اور باغی قبائل کی اطاعت کی اطلاع لے کر قاصد آیا، لیکن یہ خوش خبری بھی غم سے خالی نہ تھی۔ تمام سپاہی کام آ گئے تھے، مقتولین میں لاجوس بھی تھا۔ جب فیتا کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو وہ صبر نہ کر سکی، نقرئی خنجر کو دوسرے پہلو میں بھی اتار دیا۔ اور بیہوش ہو کر چارپائی پر گر پڑی۔

دوسرا زخم پیام اجل ثابت ہوا، تمام شاہی اطبار اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ ملکہ کلوپیٹرا کو بڑا رنج ہوا، محل کے باغ میں دفن کرنے کا حکم دیا اور اس کی قبر پر بہت سے پھول لگوا دئے۔

ملکہ فیتا کی کوئی ایسی نشانی رکھنا چاہتی تھی جس سے اس کی یاد تازہ ہوتی رہے۔ اس نے اطباء کو حکم دیا کہ اس کا دل نکال کر نہایت احتیاط سے ایک شیشے کے برتن میں محفوظ کر کے میرے کمرے میں رکھ دیا جائے۔ اطبار نے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن ان کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب سینہ میں دو قلب ملے۔ ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں جانب۔

گویا ایک عورت کے قالب میں دو عورتیں تھیں اور ایک عاشق کی صورت میں دو عاشق تھے۔ عشق کا یہ واقعہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ بائیں قالب میں رومی کو لوکوس کی محبت تھی، اور دائیں میں لاجوس رومی کی۔ اس نے دو مرتبہ خودکشی کی ——— جس دل میں لوکوس کی محبت تھی اسے اس کی موت کے بعد شق کر دیا اور جس میں لاجوس کی محبت تھی اسے اس کی موت کے بعد۔

دونوں دلوں کو شیشہ کے برتن میں رکھ کر کلوپیٹرا کے کمرہ میں رکھ دیا گیا۔

جب ملکہ اور اس کے حلیف مارک انٹونیو کو شکست ہوئی، اس کے رومی عاشق نے خودکشی کر لی، اوکتافیوس اسکندریہ میں مظفر و منصور داخل ہوا۔ اور کلوپیٹرا کا جو حشر ہوا، اس سے ساری دنیا اچھی طرح واقف ہے، تو رومی اوکتافیوس کو ملکہ کے کمرہ میں وہ شیشہ کا برتن ملا، جب اسے "ذات القلبین" اور "ذات الجیبین" فیتا کا قصہ معلوم ہوا تو شیشے اپنے ساتھ روم لیتا گیا۔

یہ واقعہ ۳۰ سنہ قبل میلاد کا ہے۔ **عبد اللطیف اعظمی (دہلی)**

"غلط العام فصیح"

کا ناجائز فائدہ

میں یہ مضمون "شاہکار" میں شائع کرانے کا شرف حاصل کر رہا ہوں - جس کے قابل ایڈیٹر علامہ تاجور ہیں - اگر غلط العام فصیح کے معنی سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو میں امید کرتا ہوں کہ حضرتِ تاجور اس مقدمہ کی صراحت فرما کر مجھے، نیز شائقینِ ادب کو مطمئن کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

(زاہد احسنی)

غلط العام کے معنی بیان کرنے میں عام وخاص کا اختلاف ہے - عام و نیم خواندہ آدمی اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ جس لفظ کو عام طور پر بولا جاتا ہو خواہ بولنے والے بازاری اور دیہاتی ہی کیوں نہ ہوں وہ فصیح ہے - اس کو تحریر و تقریر میں استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن اربابِ علم و ادب کہتے ہیں کہ وہ لفظ جو پڑھے لکھے مستند ادبا و شعرا میں رواج پا چکا ہو اور اسی طبقہ میں عمومیت سے استعمال کیا جاتا ہو وہ غلط العام فصیح کے ذیل میں آتا ہے - اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں:-
"غلط العام فصیح، و غلط العوام قبیح"

جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے اس بیماری نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے - یہ ایک سیلاب ہے جو اپنی پوری طاقت سے صحیح لغات کو پامال کرتا ہوا، اور صحت لفظی کے سرسبز و شاداب پودوں کو اکھاڑتا ہوا چلا جاتا ہے - جہاں کسی نے غلطی کی اور اس کی گرفت ہوئی فوراً "غلط العام فصیح" کہہ کر نجات حاصل کر لی - گویا یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کو جا و بیجا چلایا جا سکتا ہے اور اسی سہارے کی بنیاد پر ہمارے شعرا و ادبائے عصر صحت الفاظ کی تحقیقات سے قطعاً بے نیاز ہو گئے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں فی صدی ۹۹ مطلق العنان بن کر رہ جائیں گے اور بقائے ادب کو جس کاوش و تحقیقات کی ضرورت ہے وہ ایک بے معنی چیز بن کر رہ جائے گی۔

یہ تیغ عام طور پر لغات کی گردن پر چلائی جا رہی ہے - ہم لوگ باہم کا قافیہ بے تکلف موسم اور صورت کا میت لکھ جاتے ہیں - یہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر الفاظ کا استعمال ہم لغات کے خلاف کرتے رہتے ہیں اور ہمارا یہ مذموم فعل گرفت کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پہلے زبان بنی - الفاظ مقرر ہوئے - اس کے بعد قواعد و لغات کی تدوین عمل میں آئی - لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب لغات کو مدوّن کیا جا رہا تھا تو اُن میں ایسے الفاظ بھی شامل کر دئیے گئے تھے جو مقرر کردہ الفاظ کے خلاف ہوں، نہیں ہرگز نہیں - لغات میں وہی الفاظ حرکات و اعراب کے ساتھ لکھے گئے جو اس وقت کے اہلِ زبان حضرات نے مقرر کئے تھے - گویا جن الفاظ کو ہم غلط بولتے ہیں وہ ہماری اختراع ہے اہلِ زبان اور اربابِ لغات نے ان کے مقرر ہونے کے بعد نہایت تحقیق سے صحیح لکھا تھا پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آج ہم کو یہ حق اجتہاد کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہم علی الاعلان لغات کی مخالفت کریں اور اپنے اس عیب و جہالت پر "غلط العام فصیح" کا پردہ ڈال کر معترضین کی زبان پر مہرِ سکوت لگا دیں - ہم کو ہر حال میں لغت کی پابندی کرنی ہو گی اور لغت سے جو فیصلہ ہو گا وہ ہمارے حق میں ناطق ہو گا - اگر ہم نے کوئی لفظ غلط استعمال کیا ہے - تو یقیناً ہم کو اپنی غلطی ماننی پڑے گی - ورنہ اس کے برخلاف یہ معنی ہوں گے کہ لغات ایک بے معنی اور بے کار چیز ہے، جو ہماری لائبریریوں پر زبردستی کا بار ہے - جس کے متعلق ہمیں فوراً ع

این دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

پر عمل کرنا چاہیئے اور کہ جن لوگوں نے لغات کی تدوین میں طرح طرح کی کاوشیں اٹھائیں، وقت صرف کیا وہ ان کا مجنونانہ فعل تھا، جس کا بیکار ہونا عہد موجودہ کے آزاد ادبا و شعرا نے ثابت کر دیا ہے۔

لیکن ہماری روزانہ کی طرزِ عمل بتاتی ہے کہ لغات بیکار نہیں، ہم

بحث کے مواقع پر لغت کی ورق گردانی کرتے ہیں اور اُس کے ذریعہ اپنی دعوے کی دلیل دیتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے ہمارا یہ فعل کسقدر مضحکہ خیز ہوجاتا ہے کہ جب ہم کوئی لفظ لغت کے خلاف استعمال کرتے ہیں، اُس وقت لغت کے احکام کو پسِ پشت ڈال کر غلط العام فصیح کا نعرہ لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا ہم بندۂ غرض ہیں اور ہمارا قانون اپنے مفید مطلب بات کہ لے بدلتا ہے۔ اس اجتماعِ ضدین کو کیا کہا جائے۔

لطف تو یہ ہے کہ آجتک غلط العام فصیح الفاظ کی کوئی فہرست بھی اس کے دعویداروں نے مرتب نہیں کی، جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فلاں فلاں لفظ امتدادِ زمانہ سے بدل گئے ہیں۔ تاکہ اُن کو لغات سے نکالا جاسکتا یا موجودہ استعمال کے مطابق لغات میں اُن کو دکھایا جاسکتا۔ یا آئندہ شائع ہونے والی لغات میں کوئی نشان لگا دیا جاتا کہ یہ لفظ پہلے یوں تھا اور اب غلط العام فصیح کے حامیوں نے یوں کر دیا ہے۔ یہاں تک یہ قیامت برپا ہے کہ ایک عامی سے لے کر ایک مستند شاعر تک اس علّت میں گرفتار ہے اور ٹوکنے پر سب ایک ہی فقرہ دہرا دیتے ہیں کہ "غلط العام فصیح" اور لفظی معاملے میں کسی لفظ پر بحث ہو اسی کی آڑ لے لی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ اپنی رفتار کے ساتھ ہر چیز میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ اردو ہی کو لیجئے۔ وؔلی دکنی اور میرؔ و سوؔدا کے زمانے کے الفاظ آج قطعاً متروک ہیں اُن کو استعمال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر کسی چیز کا متروک ہوجانا اور بات ہے اور اُس کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنا الگ چیز ہے۔ اگر آج کوئی پرانے زمانہ کے الفاظ استعمال کرنے لگے تو اُسی طریقہ سے ادا کرنے پڑیں گے۔ جیسے وہ اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں ان میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح سب لوگ لغت کے حافظ نہیں ہوتے۔ بے پڑھے لکھے آدمیوں کا خاصہ ہے کہ وہ زبر کی جگہ زیر اور زیر کی جگہ پیش استعمال کر جاتے ہیں۔ یا کسی لفظ کو آسانی سے استعمال کرنے کے لئے اس میں کوئی ترمیم کر لیتے ہیں۔ وہی الفاظ بار بار سنتے سنتے پڑھے لکھوں کے کانوں میں بس جاتے ہیں۔ جن کو وہ صحیح سمجھ کر خود بھی استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تقلید غلط ہے۔ ورنہ ہر دیہاتی جس کی بول چال میں الفاظ و محاورات وہی استعمال ہوتے ہیں۔ جو زبان میں مروج ہیں۔ مگر اُن کو جس طرح وہ توڑ موڑ کر غلط سلط استعمال کرتے ہیں، وہ ظاہر ہے۔ پس جس طرح کوئی دیہاتی اپنی زبان کو تحریر میں لاتے ہوئے یہ کہنے کا حقدار ہیں کہ غلط العام فصیح اسی طرح لغات کے خلاف ایک لفظ بھی استعمال کرنے والا غلط العام فصیح کی آڑ نہیں لے سکتا۔ ورنہ اُس میں اور گنوار میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ کیونکہ وہ کثرت سے غلطیاں کرتا ہے۔ یہ قلت سے قانونِ لغات کی مخالفت کے مرتکب دونوں ہیں۔ جس طرح وہ اپنے دیہاتی بھائیوں سے گاؤں کی بولی سنتے سنتے اُسی کو صحیح ماننے لگا ہے، اسی طرح یہ ادیب یا شاعر صاحب بھی ایک یا چند الفاظ سنتے سنتے اُن کی صحت پر ایمان لے آئے ہیں۔ چوری سونے کی ہو یا لوہے کی قانون میں سزا برابر ہے۔

یہاں تک عرض کر دینے کے بعد یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ زبان میں تغیر ہوا ہے۔ ہو رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ بہت سے لفظ بڑھیں گے، بہت سے محاورات میں ترمیم و تنسیخ ہو رہی ہے۔ یا ہو چکی ہے۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم صرف الفاظِ لغات کے ہی پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اور اسی کی ترمیم کو ہم غلط العام کہہ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ زبان میں صرف الفاظ ہی نہیں ہوتے، محاورے ہوتے ہیں، حروف ہوتے ہیں، واحد جمع، اشعار۔ غرض غلط العام کا قانون ہر جگہ کام کر سکتا ہے۔ اگر اسی زد میں کچھ الفاظ بھی آ چکے ہوں تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن اِس بات پر ہم کو تمام تر غور کی ضرورت ہے کہ جو لفظ یا محاورہ وغیرہ اساتذۂ متقدمین استعمال کر گئے ہیں ہم اُسی پر اکتفا کریں اور نہ اپنی ناواقفیت سے تمام لغت کو تباہ کرنے کے درپے نہ ہوں۔ اگرچہ غلطی ہر حال میں غلطی ہے۔ خواہ وہ ایک مبتدی سے ہو یا ایک مستند منتہی سے، لیکن غلط العام کے تحت میں جن غلطیوں کا ارتکاب ہمارے متقدمین میں سے ہوا ہے، وہ بجائے خود ایک الگ چیز بن کر داخلِ لغات یا کتبِ فن میں داخل ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) تمہیں، ہمیں۔ بجائے تم ہی۔ ہم ہی۔ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ مستقل طریقہ پر لغات اردو میں جگہ پا چکے ہیں۔ حالانکہ غلط ہیں اور تم ہی، ہم ہی کا مخفف ہیں اور یہی نہیں کہ لغت میں ایک علیحدہ لفظ بن گئے ہیں بلکہ تم ہی، ہم ہی کے مقابلے میں اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) تھا۔ تھے۔ بجائے ہا، ہے۔ ہونا مصدر سے یہ مشتق ہیں

لیکن کسی اردو قواعد میں آپ یا ہے نہیں پائیں گے - گویا یہ ایک الگ چیز بن گئی -

(۳) "ذرا سے" یا "ذرا سے" دونوں طرح لکھا جاتا ہے - جس کے معنی تھوڑے سے کے لئے جاتے ہیں - یہ مخفف ہے - "ذرہ" کا کثرت استعمال نے اس کے معنی ہی بدل دئے - اب اگر کوئی ذرا کہے تو اس کے معنی ذرہ ہرگز نہیں سمجھے جائیں گے -

(۴) سہی - ایسا ہی سہی - تمہیں سمجھے سہی وغیرہ ارباب تحقیقات اس کا مخرج صحیح بناتے ہیں - جو قرین قیاس بھی ہے - لیکن عام لوگوں کی غلطی نے اس کے معنی - املا، محل استعمال سبھی بدل دئے اور یہ لفظ بجائے خود ایک الگ لفظ بن گیا -

(۵) "خدا معلوم" جس کے معنی ہوئے خدا علم کیا گیا اور جو بجائے خدا جانے استعمال ہوتا ہے - ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے لیکن ہماری بول چال میں اس کے یہی معنی ہو گئے اور کوئی لغت اس کو غلط بھی قرار نہیں دیتا - پس یہی غلط العام فصیح ہو سکتا ہے -

(۶) ہر ایک - بمعنی "ہر" برابر بولا جاتا ہے، اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو "ایک" قطعاً حشو قبیح نظر آئے گا - مگر چونکہ داخل زبان ہو چکا - اس لئے باوجودیکہ غلط ہے، مگر صحیح ہے - فصیح ہے اور اسی کی اشاعت پر لغات بھی مجبور ہیں -

(۷) باغیچہ، دریچہ - بمعنی باغچہ - درچہ - مثلاً خوانچہ - دیگچہ اسمائے تصغیر ہیں جن کے بنانے کا قاعدہ یہی ہے کہ اسم کے آگے چہ، لگا دیا جائے - تو اسم تصغیر ہو جائے گا - مگر چونکہ غلط العام ہو کر باغیچہ اور دریچہ وغیرہ میں اسم کے آگے "ی" کا اضافہ ہو گیا ہے - اسی چیز کو قاعدہ میں داخل سمجھ لیا گیا اور لغات نے بھی اسی غلط لفظ کو فصیح مان کر اپنے دامن میں جگہ دے دی -

(۸) حور واحد ہے - حور جمع ہے - لیکن حور کو ہر جگہ بمعنی واحد استعمال کیا جاتا ہے - دور حاضرہ کے لغات تشریح کر دیتے ہیں کہ یہ لفظ جمع ہے اور واحد میں استعمال ہوتا ہے -

(۹) اولاد - جمع ہے ولد کی، لیکن کلیتہً واحد کے معنی میں مستعمل ہے - لغات میں بھی اب اس کی تشریح نظر آنے لگی ہے -

(۱۰) ~~مصرع~~ دل کی بات ہے حضور آپ سنیں اسے ضرور بروزن مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن - اگر مصرعہ ہذا کی وزن مندرجہ پر تقطیع کریں، تو حضور کی "ر" اور ضرور کی "ر" تقطیع سے گر جائے گی مصرعہ کے آخر میں تو ایک حرف زائد ہونا تقریباً ہر بحر میں جائز کر لیا گیا ہے - لیکن درمیان کے لئے کوئی قاعدہ نہیں تھا - لیکن اب چند بحروں کے لئے یہ بات جائز کر لی گئی ہے اور تمام عروضی اس کو تسلیم کر چکے ہیں - عروض کی تازہ تصنیفوں میں بھی اس کا ذکر کر دیا جاتا ہے -

مندرجہ بالا معروضہ سے یہ مقصد ہے کہ غلط العام فصیح کا اطلاق زبان کے ہر شعبہ میں ہوتا ہے - نہ کہ صرف الفاظ ہی پر اور جو جو چیزیں غلط العام ہو کر فصیح تسلیم کی جا چکیں ہیں - فنی کتب میں قریب قریب ان کا ذکر آ چکا ہے - ہماری روزمرہ کی گفتگو میں اس قسم کی بہت سی باتیں نظر آئیں گی - جو اصل معنوں کے خلاف بولی جاتی ہیں - اگر ہم غور کریں تو اسی چیز سے ایک چھوٹی موٹی کتاب بنائی جا سکتی ہے - ہاں تو اصلاً یہ ہیں "غلط العام فصیح" کے معنی جس کو ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف الفاظ لغات ہی کو غلط بولنا غلط العام فصیح میں داخل ہے - لغات تو زبان کے پختہ ہونے کے بعد ترتیب دئے گئے - اس میں ترمیم و تنسیخ کا کس کو اختیار ہے اور یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ لغات کے تمام الفاظ صحیح ہی تحریر کئے گئے ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ لغات کی تدوین سے پہلے بہت سے الفاظ غلط ہو چکے ہوں - جن کو فصیح مان کر لغات میں اسی طرح لکھ دیا ہو - جس طرح بولتے ہوئے سنا گیا - بہرحال یہ زیادتی کسی طرح روا نہیں کہ ہم لوگ الفاظ کی تحقیقات کئے بغیر جس طرح اپنے یہاں کے عام و عوام کو بولتا سنیں اسی کو قرآن و حدیث مان لیں، ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ الفاظ کی تحقیقات کریں اور اسی طرح بولیں جس طرح لغات بتائیں - یہ غلط العام فصیح کی آڑ لینی تو اپنی حماقت اور لاعلمی کا اعلان کرنا ہے -

اب میں بطور مثال چند ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جو "غلط العوام قبیح" کے ذیل میں شمار کئے جائیں - یعنی وہ ہیں کچھ اور بولے کچھ جاتے ہیں - اگر ناظرین و ادارہ نے اس سلسلہ کو مفید تصور کر لیا، تو اور بہت سے الفاظ بطور اقساط پیش کرنے کی کوشش کروں گا - ورنہ اسی گزارش پہ مضمون کو ختم سمجھئے کہ الفاظ کو صحیح استعمال کیا جائے اور لغات کے بارے میں غلط العام فصیح ایک بے معنی بات تصور کی جائے -

— — —

الفاظ	معانی	صراحت
آدمی ۔۔۔۔	انسان حضرت آدم سے نسبت رکھنے والا۔	بسکون دال غلط ہے بہ فتح دال صحیح۔[1]
آرد ۔۔۔۔	آٹا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	بفتح را غلط ہے بسکون را صحیح۔
بابر ۔۔۔۔	بادشاہ پدر ہمایوں ۔۔۔۔۔۔	بضم بائے ثانی صحیح ہے بفتح غلط ہے[2]
بیگم ۔۔۔۔	زنِ عمدہ ۔۔۔۔۔۔	بکسر کاف فارسی صحیح ہے بفتح کاف اس معنی میں غلط[3]
پشّہ ۔۔۔۔	مچھر ۔۔۔۔۔۔	بکسر اوّل غلط ہے بفتح اول صحیح ہے[4]
پلاؤ ۔۔۔۔	مشہور کھانا ۔۔۔۔۔۔	بفتح اوّل صحیح ہے بضم اوّل غلط ہے[5]
ترجمہ ۔۔۔۔	ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا ۔۔۔۔	بفتح تا و جیم صحیح ہے بضم جیم غلط ہے۔[6]
تنازع ۔۔۔۔	جھگڑا کرنا ۔۔۔۔۔۔	یہ تغافل کے وزن پر ہے بفتح زا غلط ہے۔

ابر احسنی گنوری

---

[1] بلکہ اس کے برعکس۔　[2] اردو میں بابر بہ فتحہ با صحیح ہے

[3] اردو کا تلفظ اردو میں صحیح ہے۔　[4] پشّہ بکسر اوّل ہی صحیح ہے۔　[5] اردو میں بہ فتحہ اوّل غلط ہوگا۔

[6] اردو تلفظ ہی اردو میں صحیح ہے۔　(تاجور)

نوٹ:- مضمون نگار نے "غلط العام فصیح" کا جو مفہوم بتایا ہے۔ تسلیم، لیکن اُن کا یہ نظریہ صحیح نہیں کہ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال جبھی صحیح ہوگا جب اصلی زبان کے تلفظ کے ساتھ ہو۔ یہ اصول قطعاً گمراہ کُن ہے۔ اردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ مستند ادبا و شعرا نے جس تلفظ سے بھی استعمال کئے ہیں وہی تلفظ صحیح ہوگا، خواہ اُن کا اصلی تلفظ کچھ ہو۔

انگریزی کی لینٹرن اردو میں لالٹین بن گئی اور مستند سے مستند فصحا بھی لالٹین ہی کہنے لگے۔ اب کوئی اصرار کرے کہ اردو میں لالٹین کو لینٹرن کہو تو اُس کا اصرار ناقابلِ تسلیم۔

بعض الفاظ ایسے ہیں کہ اردو میں ان کا اصلی تلفظ بھی صحیح ہے اور اردو تلفظ بھی۔ جیسے میّت بہ کسرِ یا و بہ فتحہ یا دونوں صحیح۔ رہا موسم کا لفظ اگرچہ عربی میں بہ کسرۂ سین ہے لیکن اردو میں اصلی تلفظ غلط قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ موسم کو باہم اور ماتم کے قافیوں میں تمام شعرا نے باندھا ہے یہ غلط تلفظ "غلط العام فصیح" کے زمرے میں شامل کرنا پڑیگا۔ مفرد ہو یا حالت ترکیب میں موسم اردو میں بہ فتحہ سین ہی استعمال ہوگا اور پھر بھی میں اسے مہنّد یا مورّد الفاظ کے ذیل میں شمار نہیں کروں گا۔ یعنی اسی تلفظ کے ساتھ بہ حالت ترکیبی میں بھی استعمال ہونا چاہیئے۔ مضمون نگار نے اخیر کے جدول میں جن الفاظ کے اردو تلفظ کو غلط ٹھہرایا ہے۔ میں اُن کے اردو مروجہ تلفظ ہی کو صحیح سمجھتا ہوں اور اُن کے اصلی تلفظ کو اردو میں غلط خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ اُن الفاظ کا اردو تلفظ فصحا میں بھی رواج پاگیا ہے۔

خود عربی میں دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اصلی تلفظ کے خلاف استعمال ہوتے ہیں اور عربی میں اُن کا استعمال عربی تلفظ ہی فصیح سمجھا جاتا ہے۔ معرّب والدخیل عربی لغت کا مستقل باب ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ اور عربی ہی پر کیا انحصار ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ہیں اور غیر اصلی تلفظ کے ساتھ۔ اُن زبانوں میں بولے جاتے ہیں اور اُن کا غیر اصلی تلفظ ہی فصیح متصور ہوتا ہے۔

بیگم کو اردو میں بیگم بہ کسرِ کاف فارسی یا بہ ضمۂ کاف فارسی بیگُم یا بیگَم بولنا تو مضحکہ خیز ہے۔ خواجہ آتش نے المضاعف کو المضاعف اور بیگم بہ ضمۂ میم کو بیگم بہ فتحۂ میم استعمال کرنے پر ناسخ کے پیروؤں کو جو جواب دیا تھا کہ "جب ہم ترکی یا عربی زبان میں شاعری کریں گے تو بیگُم اور المُضاعف ہی لکھیں گے۔" بالکل معقول اور صحیح جواب دیا تھا۔ مولینا آزاد کا یہ جواب نقل کر کے اُسے تسلیم نہ کرنا قابلِ تقلید نہیں۔ بس ایک ہی اصول ہے۔ اُن کو ہم نے جن الفاظ کو دوسری زبانوں سے لے کر جس تلفظ اور املا میں اردو میں استعمال کیا اور فصحائے اردو میں اُس کا رواج ہوا۔ اردو میں صرف وہی تلفظ صحیح ہوگا۔ اصلی تلفظ اور املا سے اُن الفاظ کو کوئی واسطہ نہ رہے گا۔ مختصر یہ کہ فصحا اور مستند ادباء کا استعمال ہی سندِ صحت و فصاحت ہے اور بس۔　تاجور

تعلیمی ادارات

بنارس ہندو یونیورسٹی

بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام کا خیال پنڈت مدن موہن مالوی کے دماغ میں پیدا ہوا، جس کو اوّل اوّل انہوں نے ۱۹۰۴ء میں ایک جلسے کے سامنے پیش کیا، یہ جلسہ منٹ ہاؤس بنارس میں مہاراجہ سر پربھو نارائن والئے بنارس کی زیر صدارت انعقاد پذیر ہوا تھا، دسمبر ۱۹۰۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بنارس میں ہوا، اس کی شرکت کے لئے ہندوستان کے تمام صوبوں سے ہندو علماء و زعماء اور قوم پرست افراد آئے تھے۔ ۳۱ دسمبر کو ٹاؤن ہال بنارس میں ہندو اکابر و زعماء کا ایک جلسہ ہوا، جس میں مالوی جی نے یونیورسٹی کی اسکیم پیش کی۔ آئندہ سال الہ آباد میں ہندو مہا سبھا کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں بھی یہ اسکیم پیش کی گئی اور طے پایا کہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کیا جائے۔

اسی زمانے میں مسز اینی بیسنٹ بھی جو سنٹرل ہندو ہائی کالج کے ٹرسٹیز بورڈ کی صدر تھیں، بنارس میں "بھارت کا وشو ودیالیہ" (ہندوستان کا دارالعلوم) قائم کرنے کی سعی کر رہی تھیں، چنانچہ جامعہ کا چارٹر حاصل کرنے کے لئے بہت سے آدمیوں کے دستخط سے ایک میموریل بھی انہوں نے حکومت کے پاس روانہ کر دیا تھا، علاوہ ازیں ممتاز اور سر برآوردہ ہندوؤں کی ایک جماعت "بھارت دھرم مہامنڈل" بنارس کے ماتحت ہندو ادبیات کی تعلیم کے لئے "شاردا وشو ودیالیہ" کے نام سے ایک درسگاہ قائم کرنی چاہتی تھی۔ اس جماعت کے سرکردہ مہاراجہ رامیشور سنگھ آف دربھنگہ تھے۔ ایک شہر میں ہندو قوم کے تین تین دارالعلوم کا قیام صحیح نہیں تھا۔ اس لئے پنڈت مدن موہن مالوی، مسز اینی بیسنٹ اور مہاراجہ دربھنگہ سے ملے اور دونوں کو اپنی اسکیم میں شریک کر لیا۔

اس کے بعد مہاراجہ دربھنگہ اور مالوی جی لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند اور حکومت ہند کے رکن تعلیم بٹلر سے ملے اور کچھ شرائط کے ساتھ وعدۂ امداد مل گیا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں ہندو یونیورسٹی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی اور نئے سال سے الہ آباد میں اس کا دفتر کھل گیا۔ اس سوسائٹی کے صدر مہاراجہ دربھنگہ اور آنریری سکریٹری مالوی جی منتخب ہوئے۔

مئی ۱۹۱۱ء میں یونیورسٹی کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا کام شروع ہو چکا تھا اور چند ہی مہینے میں ۳۰ لاکھ روپے کے وعدے مل چکے تھے۔ اکتوبر میں مہاراجہ دربھنگہ بھی اس وفد میں شامل ہو گئے جو فراہمی سرمایہ کے لئے ملک میں دورہ کر رہا تھا، مہاراجہ دربھنگہ کی شرکت سے وفد کو خاص کامیابی ہوئی، یہ وفد ہر صوبے میں گیا اور یونیورسٹی کے سرمائے میں راجہ، مہاراجہ، تعلقہ دار، زمیندار، امیر، غریب، مرد، عورت سب نے شرکت کی چنانچہ ۱۹۱۲ء کے آخر تک ۸۲ لاکھ روپے سے زیادہ کے وعدے ہو گئے اور تقریباً ۴۲ لاکھ روپے نقد مل گئے۔

اس کے ساتھ حکومت ہند سے خط و کتابت بھی ہوتی رہی، چنانچہ ۱۹۱۵ء میں یونیورسٹی قانون پاس ہو گیا اور ۴ فروری ۱۹۱۶ء کو بلدۂ بنارس سے دو تین میل کے فاصلے پر جانب جنوب یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اس تقریب کی شرکت کے لئے ہندوستان کے متعدد والیان ریاست، صوبوں کے گورنر اور بڑے بڑے زعماء اور اکابر ملک بنارس آئے تھے، سنگ بنیاد رکھنے کی تاریخی تقریب نائب السلطنت لارڈ ہارڈنگ کے ہاتھ سے عمل میں آئی۔

۱۹۱۸ء میں سر گنگا رام کی نگرانی میں یونیورسٹی کی عمارتوں کا سلسلۂ تعمیر شروع ہوا، تین سال کے اندر متعدد عمارتیں تیار ہو گئیں۔

۱۹۲۱ء میں سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم بحیثیت ولیعہد ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے، انہوں نے یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔

جن اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر ہندو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سنسکرت علوم و فنون اور ہندو تہذیب و تمدن کی ترویج و ترقی۔

(۲) جدید آرٹس، سائنس اور ان کی شاخوں کی تعلیم و تکمیل۔

(۳) جدید علوم و فنون کی ایسی تعلیم جس سے ملک کی صنعت و حرفت اور خوش حالی و فارغ البالی کو ترقی ہو۔

(۴) طلبہ کو نہ صرف مذہب و اخلاق کی تعلیم سے بہرہ ور کرنا بلکہ انہیں بہترین سیرت و کردار سے آراستہ کرنا۔

یونیورسٹی کی مختلف درسگاہیں

(۱) سنٹرل ہندو کالج:۔ ہندو یونیورسٹی کے قیام سے بہت قبل سے یہ کالج موجود تھا اور اپنے نصب العین میں ہر طرح کامیاب تھا، جب بنارس میں یونیورسٹی کا قیام طے پایا تو کالج کے ٹرسٹیوں نے اسے یونیورسٹی کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ جب تک یونیورسٹی کی عمارتیں تیار نہیں ہوئی تھیں اسی کالج کی مختلف عمارتوں میں یونیورسٹی کے طلبہ تعلیم پاتے تھے، اس حیثیت سے یونیورسٹی کا اولین کالج یہی ہے۔

اس کالج کے دو حصے ہیں، آرٹس اور سائنس، اول الذکر شعبے میں ایم۔اے تک کی، اور ثانی الذکر میں ایم۔ایس۔سی تک کی تعلیم ہوتی ہے، آرٹس کے شعبے میں انگریزی، ہندی، سنسکرت، پالی، برج بھاشا، اردو، عربی، فارسی، بنگلہ، مراٹھی، فرنچ، اور جرمن زبان نیز تاریخ سیاست، اقتصادیات، فلسفہ، نفسیات اور قدیم ہندو تہذیب و تاریخ اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سائنس کے درجے میں... علم الحیوانات، علم النباتات، زراعت، معدنیات، معالجات وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے، اس شعبے میں شیشہ سازی، روغن سازی، صابن سازی چینی کے برتن اور کھلونے بنانے کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

زراعت اور نباتات کی تعلیم کے شعبوں کے ساتھ کھیت اور باغ بھی ہیں، معدنیات، معاشیات، حیوانیات وغیرہ کی تعلیم کے لئے میوزیم موجود ہیں، آرٹس اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق تعلیم کے جسقدر سامان اور ذخائر یہاں فراہم ہیں ہندوستان کے کسی دارالعلوم میں نہیں ہیں۔

ایم۔اے اور ایم۔ایس سی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد طلبہ کے لئے جدید تحقیقات کے سامان بھی فراہم ہیں، جدید تحقیقات میں جو طلبہ کامیاب ہوتے ہیں انہیں ڈاکٹر کی ڈگری دی جاتی ہے، یہ کالج یونیورسٹی کا سب سے بڑا دارالعلوم ہے ۱۹۳۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق اس کالج میں ۲۲۰۷ طالب العلم تھے اور معلمین کی تعداد ایک سو نو تھی۔

(۲) قدیم ہندو تہذیب و اخلاق کا دارالعلوم:۔ اس کالج میں سنسکرت کی قدیم کتابوں کے ذریعہ ہندو مذہب و فلسفہ اور تصوف و اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے اور وید وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں، یہ دارالعلوم ان علوم و معارف کا ہندوستان میں بے مثل مرکز سمجھا جاتا ہے۔

(۳) آیور ویدک کالج:۔ اس کالج کو یونیورسٹی نے ۱۹۲۷ء میں قائم کیا، اس میں قدیم آیور ویدک کی تعلیم ہوتی ہے اور جدید ایلوپیتھک کی بھی۔ تاکہ ہندوستان کا قدیم طریقہ علاج بھی باقی رہے اور یہاں کے تعلیم یافتہ معالجین جدید اصول معالجہ سے بھی بے بہرہ و ناواقف نہ رہیں۔ اس کا نصاب چھ سال میں پورا ہوتا ہے۔ اس میں علم الابدان اور علم الادویہ وغیرہ کی بھی تحصیل کرنی پڑتی ہے، جو لوگ یہاں تکمیل تعلیم کرتے ہیں انہیں "آیور وید اچاریہ" کی ڈگری دی جاتی ہے۔

اس کالج کے ساتھ ایک شفاخانہ بھی ہے جس میں قدیم و جدید دونوں طریقوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ سو مریضوں کی جگہ کا انتظام ہے، متعدی امراض کے مریضوں کے لئے علیحدہ وارڈ موجود ہیں۔ اب سے تین سال قبل اس میں دو سو طلبہ تھے اور ۱۴ اساتذہ، کالج کے ماتحت ایک آیور ویدک باغ بھی ہے۔

(۴) ٹریننگ کالج:۔ تمام ہندوستان سے انتخاب کرکے ۵۴-۵۵ طلبہ اس میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اس میں عورتیں بھی تعلیم پاتی ہیں، مختلف مصالح کے پیش نظر یہ کالج ہندو اسکول کے ساتھ شہر میں رکھا گیا ہے، اس کے اساتذہ کی تعداد چھ ہے۔

(۵) لا کالج:۔ اس کالج کا کورس دو برس کا ہے، مستقل پروفیسروں کے علاوہ آنریری طور پر بھی بعض اصحاب تعلیم دیتے ہیں۔

(۶) زنانہ کالج:۔ اس کالج میں عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اصول صحت، نفسیات اطفال اور موسیقی کی تعلیم کا خاص اہتمام ہے، یہاں عورتیں ہی تعلیم دیتی ہیں، مرد اسی صورت میں پروفیسر مقرر کئے جاتے

ہیں جب کسی موضوع کی تعلیم کے لئے بہتر معلمہ نہیں ملتی ۔

اس کالج کی طالبات کی ایک مجلس بھی قائم ہے، جس میں جمع ہو کر باہم آپس میں تبادلۂ خیالات کرتی ہیں، یہ طالبات ایک لیڈی سپرنٹنڈنٹ کی زیر نگرانی رہتی ہیں جو ڈاکٹر بھی ہیں، لڑکیوں کے رہنے کے لئے ایک ہوسٹل بھی کالج ہی کی عمارت میں ہے، ہوسٹل کے ساتھ ایک احاطہ ہے جس میں لڑکیوں کی سیر و تفریح، کھیل کود اور ورزش کا سامان موجود ہے ۔

کالج میں تعلیم پانے والی لڑکیوں کی تعداد روز بروز ترقی پذیر ہے

(۷) انجینئرنگ کالج:- ہندوستان بھر میں انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے اس پائے کا دار العلوم نہیں ہے ۔ اس میں میکینیکل... انجینئرنگ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور الیکٹریکل انجینئرنگ کی بھی، یعنی وہ ہے کہ مشین اور کل پرزوں کا بنانا بھی سکھایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی اور اس کے متعلقات کی بھی تعلیم ہوتی ہے ۔ یہاں انجینئرنگ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا انتظام موجود ہے، چار سال تک کالج میں مطالعہ کرنے اور ایک سال کسی کارخانے میں عملی طور پر کام سیکھنے کے بعد طلبہ کو سند تکمیل عطا کی جاتی ہے ۔

یہ کالج ہندوستان بھر میں مشہور ہے چنانچہ ہر سال برطانوی ہند اور ریاستوں سے بڑی تعداد میں طلبہ کی درخواست ہائے داخلہ آتی ہیں، لیکن ان میں سے صرف سو درخواستیں منظور کی جاتی ہیں ۔ ۱۹۳۳ء میں اس کالج میں ۴۰۵ طلبہ تھے اور ۲۵ اساتذہ ۔

ہندو یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج نے ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری کر دی ہے، جب تک یہ کالج قائم نہیں ہوا تھا ہندوستان کے طلبہ کو یورپ، امریکہ اور جاپان جانا پڑتا تھا، اب ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس کالج کے انجینئر کمال قابلیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔

(۸) کان کنی اور دھات پگھلانے کی تعلیم کے لئے یونیورسٹی میں ایک جداگانہ شعبہ موجود ہے، ہندوستان میں اس فن کی تعلیم دھنباد کے سرکاری ادارہ میں ہوتی ہے، لیکن طلبہ کی زیادہ تعداد یونیورسٹی ہی میں آتی ہے ۔

(۹) موسیقی کی تعلیم:- موسیقی سیکھنے والے طلبہ کے لئے موسیقی کے معلم موجود ہیں، روزانہ شام کو موسیقی سکھائی جاتی ہے ۔

(۱۰) فوجی تعلیم:- یونیورسٹی میں فوجی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ نوّے سے اوپر نوجوان فوجی تعلیم پا رہے ہیں، حکومت کی طرف سے ان کے لئے وردیاں اور بندوقیں ملی ہوئی ہیں، ایک سارجنٹ مقرر ہے جو باقاعدہ فوجی تعلیم دیتا ہے، اس صوبہ کی یونیورسٹی اور کالجوں کے فوجی تعلیم پانے والے طلبہ ہر سال کسی شہر میں جمع ہوتے ہیں اور ان میں کھیل کود اور ورزش وغیرہ کا مقابلہ ہوتا ہے ۱۹۲۵ء میں پہلا مقابلہ ہوا تھا، اس وقت سے لے کر ۱۹۳۳ء تک ہندو یونیورسٹی کے طلبہ چھ بار اول رہے ہیں ۔

(۱۱) ہائی اسکول اور مدرسے:- ان اداروں کے علاوہ یونیورسٹی کے ماتحت ایک ہائی اسکول بھی ہے جس میں ایک ہزار سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں، اس پیمانہ کے ہائی اسکول ہندوستان بھر میں دو تین ہیں ۔ ۱۹۳۳ء میں ۱۲۰۰ طلبہ اور ۶۰ اساتذہ تھے ۔ سنسکرت کے چھوٹے طلبہ کے لئے ایک درسگاہ ہے جس میں دس سے زیادہ معلم ہیں اور متعلمین کی تعداد بھی کافی ہے، چھوٹی لڑکیوں کے لئے ایک اسکول ہے جس میں دو سو سے زیادہ لڑکیاں پڑھتی ہیں ۔ ۱۹۳۳ء میں اس مدرسہ کی معلمات کی تعداد ۲۴ تھی، یہ تعلیمگاہیں شہر میں ہیں ۔

اس طرح ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم تک کا اہتمام کر کے یونیورسٹی اپنے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم ہے ۔ اس میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے اور کبھی بیرون ہند سے بھی طلبہ آتے ہیں ۔ نادار اور ہونہار طلبہ کو فیس معاف کر دی جاتی ہے اور تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں ۔ ۱۹۳۳ء میں اسکولوں کے طلبہ کے علاوہ یونیورسٹی کے متعلمین کی تعداد ۳۵۰۰ تھی اور معلمین کی تعداد ۲۰۰ سے زائد تھی ۔

یونیورسٹی کے شعبہائے تعلیم میں صنعت و حرفت کی تعلیم کا شعبہ بہت مفید اور کامیاب ثابت ہو رہا ہے، یہاں کے تعلیم پائے ہوئے کتنے نوجوان کامیاب زندگی گزار رہے ہیں، اس شعبے میں نوجوانوں کو تیل، عطر، لونڈر، پاؤڈر، رنگ، سٹیل پنسل، چاک، کھونٹے، چینی کے برتن، چوڑی، وغیرہ روزمرہ استعمال میں آنے والی چیزوں کی صنعت سکھائی جاتی ہے، اس شعبے نے ایک خاص طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ گھی کی تحقیقات کی جاتی ہے اور چربی کی آمیزش صحیح طور پر معلوم کر لی جاتی ہے ۔ اس کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے میونسپلٹیوں کے کتنے ہیلتھ آفیسر یہاں آ چکے ہیں ۔

حکومت ہند اور ریاستیں وظائف دے کر اپنے طلبہ کو کام سیکھنے کے لیئے بھیجتی ہیں، یہاں کے انجینیرنگ کالج نے اب تک انجنیروں کی ایک بڑی تعداد تیار کر کے ملک کی گراں بہا خدمت انجام دی ہے، معدنیات اور کان کنی نیز دھاتیں گلانے کی تعلیم دینے والے شعبوں سے بھی ملک کو زبردست فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ دواسازی کی تعلیم کا شعبہ بھی قائم ہے، اس شعبے کے کامیاب ہو جانے کے بعد یہاں دوائیں تیار ہونے لگیں گی اور ایک بڑی رقم جو دواؤں کی قیمت کی صورت میں ملک سے باہر چلی جاتی ہے بچ جائے گی

(۱۲) ہندی پبلکیشن بورڈ:- ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مقصد ابتدا ہی سے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے پیش نظر ہے اور اب تک اس میں ایک گونہ کامیابی بھی حاصل ہو چکی ہے، اسی غرض سے یونیورسٹی میں ایک ہندی پبلکیشن بورڈ قائم ہے، جو سائنس اور حکمت کی کتابیں ہندی میں تیار کر رہا ہے۔

(۱۳) کتب خانہ:- یونیورسٹی کے ماتحت ایک کتب خانہ بھی ہے، اس میں مختلف علوم و فنون کی تقریباً دس ہزار کتابیں ہوں گی۔ ملک کی تازہ ترین عمدہ تصانیف برابر کتب خانہ میں آتی رہتی ہیں، جو کتابیں روزمرہ کی ضروریات کی ہیں وہ متعلقہ کالجوں میں رہتی ہیں، باقی کتابوں سے طلبہ اور اساتذہ کو ہر وقت فائدہ اُٹھانے کا موقع حاصل رہتا ہے۔

یونیورسٹی کی آبادی

یونیورسٹی کی آبادی تقریباً ۲ میل کے طول اور سوا میل کے عرض میں ۱۳۰۰ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس آبادی میں ۲۱ میل لمبی متعدد سڑکیں ہیں جن کا بیشتر حصہ پختہ ہے، یونیورسٹی کی عمارتیں بعض کے علاوہ سب ایک خاص ترتیب سے بنائی گئی ہیں۔ ایک قطار میں اساتذہ اور افسران جامعہ کے سکونتی مکانات ہیں، دوسری قطار میں دارالطلبہ کی عمارتیں ہیں جن کے سامنے کھیل کے میدان ہیں، میدان کے بعد ایک لائن میں کالج کی عمارتوں کا سلسلہ ہے، ان عمارتوں کے بعد پھر میدان ہے۔ جتنے میدان ہندو یونیورسٹی میں ہیں شائد ہندوستان کی کسی تعلیمگاہ میں نہ ہوں گے، چند خاص قابل ذکر چیزیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) طلبہ کے لیئے سات ہوسٹل ہیں جن میں سے ایک میں نسوانی کالج کی طالبات رہتی ہیں اور بالائی منزل پر ان کا کالج قائم ہے، علوم قدیمہ کی تعلیم کا کالج بھی ہوسٹل ہی کے ایک بالاخانے میں ہے۔

(۲) آرٹس کالج کی عمارت:- اس کالج کی عمارت مندر نما ہے۔ اور اتنی مستحکم اور شاندار بنی ہوئی ہے کہ راجگانہ عمارتوں سے چشمک زنی کرتی ہے، اسی عمارت کے بالائی حصے میں پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار کے دفتر ہیں، خزانہ اور بکڈپو ہے، زیریں حصے کے ایک گوشے میں دارالمطالعہ قائم ہے، وسط کا وسیع ہال جلسوں، لکچروں اور تقریبوں کے کام آتا ہے۔

(۳) ایک عمارت میں علم الحیوانات و علم النباتات کی تعلیم ہوتی ہے۔

(۴) ایک عمارت ہے جس میں علم الکیمیا کی تجربہ گاہ ہے، اسی عمارت کے مختلف حصص میں کان کنی، دواسازی، معدنیات اور صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(۵) صنعت و حرفت کی درسگاہ کے قریب ایک گیس پلانٹ ہے جہاں گیس تیار ہوتی ہے۔

(۶) زراعتی کالج کے لئے علیحدہ عمارت موجود ہے۔

(۷) انجنیرنگ کالج کی عمارت، فیکٹری اور ورکشاپ کی عمارتیں۔

(۸) لائبریری کی شاندار عمارت۔

(۹) شیواجی ہال، جس میں ورزش وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(۱۰) سندرلال دواخانہ کی عمارت۔

(۱۱) آریوویدک فارمیسی کی عمارت۔

(۱۲) ایمپی تھیئٹر۔ یہاں بیٹھ کر ہزاروں آدمی کھیل کود کا سالانہ مقابلہ دیکھتے ہیں۔

(۱۳) ڈیری فارم۔

(۱۴) آیورویدک باغ۔

(۱۵) علم النباتات کی تعلیم کے لئے سبزہ زار۔

ابھی یونیورسٹی کے ہر شعبے میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے اور نئے نئے شعبے جاری کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، وسیع پیمانے پر ایک مطبع بھی قائم ہونے والا ہے، ایک مندر کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے جو مجوزہ نقشے کے مطابق تیار ہونے کے بعد ایک بے نظیر مندر ہوگا۔

آبادی کی صفائی اور عمارتوں اور سڑکوں کی مرمت خود یونیورسٹی کے ذمے ہے، پانی اور روشنی کا انتظام بھی وہی کرتی ہے، یونیورسٹی کے انجنیرنگ کالج کا پاور ہاؤس برقی روشنی مہیا کرتا ہے اور بجلی کے کوئیوں اور پمپ سے پانی بہم کیا جاتا ہے۔

اس عظیم الشان یونیورسٹی کے دیکھنے کے لئے ہندوستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی آتے رہتے ہیں، جن میں پروفیسر سوما فیلڈ (جرمنی) سلون آسے وی (فرانس)، پروفیسر رامزے میبو (مانچسٹر) ڈاکٹر ہیوم (امریکہ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہندو یونیورسٹی کا محل وقوع نہایت دلفریب اور پُر فضا ہے، شہر سے دُور چاروں طرف کھلا ہوا سرسبز میدان، دریائے گنگ کا کیف پرور اور سرور افزا ساحل، یونیورسٹی کی شاندار خوشنما عمارتیں، صاف ستھری سڑکیں، ہر طرف میدان، ہر طرف درخت، یونیورسٹی کی آبادی میں پہنچتے ہی رُوح مسرت و تازگی سے لبریز ہو جاتی ہے صبح کے سورج کی سنہری کرنیں یونیورسٹی کی عمارتوں کو آبِ زر سے شرابور کر دیتی ہیں اور رات کی چاندنی ان پر چاندی کے غلاف چڑھا دیتی ہے اور اندھیری رات میں جگمگاتے ہوئے تارے ان عمارتوں کے کلس اور مینار پر آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ ایک بار جرمن سیاح بذریعہ کشتی دنیا کی سیاحت کرتا ہوا یہاں آیا تھا، اس نے یہ دریافت کرنے پر کہ یہ یونیورسٹی تمہیں کیسی معلوم ہوتی ہے کہا تھا کہ اتنا شاندار، اتنا حسین، اسقدر پُر فضا اور دلکش مقام اپنی سیاحت میں ابھی تک میں نے نہیں دیکھا۔

صحت اور اخلاق کی تربیت

یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد طلبہ کی صحت اور اخلاق کی اصلاح و تربیت کا کامل لحاظ رکھتے ہیں، ان کی حفاظت و نگرانی کے لئے وارڈن مقرر ہیں، سال میں ایک مرتبہ ان کا ڈاکٹری معائنہ ہوتا ہے، صحت کی بقا و ترقی کے لئے دیسی اور ولائتی ہر طرح کے کھیل اور ورزش کا اہتمام ہے۔

اخلاق کی درستی کے لئے مذہبی تعلیم و تربیت کا بندوبست ہے درجے میں لکچروں کے ذریعہ طلبہ میں مذہبی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سال میں قومی تہواروں اور مذہبی تقریبوں کے مواقع پر قومی و مذہبی تقریریں ہوتی ہیں، مختلف مذاہب کے طلبہ کو اپنے اپنے مذہبی فرائض انجام دینے کی آزادی حاصل ہے مسلمانوں کے لئے کوئی مجبوری نہیں، لیکن کوئی سامان بھی نہیں ہے۔ مالوی جی کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں کے طلبہ عموماً سادگی پسند ہوتے ہیں، مغربی وضع قطع کے مقابلے میں ملکی طور طریق کو زیادہ پسند کرتے ہیں، ان کے چہروں سے عام طور پر صحت و تازگی نمایاں ہوتی ہے، دماغ ملکی و قومی جذبات سے لبریز ہوتے ہیں لیکن قومی خیالات میں مہاسبھائیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس میں وسعت کی ضرورت ہے۔

یونیورسٹی کی مالی حالت

ہندو یونیورسٹی کے معاونین کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے جن میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں، اب سے تین سال قبل کی اطلاع کے مطابق یونیورسٹی کو اپنے معاونین سے تقریباً ایک کروڑ اکیاون لاکھ روپے وصول ہو چکے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں اسقدر گراں رقم کسی ہندوستانی ادارہ کو نہیں ملی، اس رقم میں ۱۲ لاکھ روپے حکومت ہند کے ہیں اور باقی اہلِ ملک کے، ۳۰ لاکھ کی موعودہ رقم ہنوز وصول طلب ہے۔

موصولہ رقوم میں سے ایک قانون کے پانچ لاکھ روپیہ یونیورسٹی کو اپنے محفوظ سرمایہ میں رکھنا پڑتا ہے، باقی ۳۲ لاکھ روپے علوم و فنون کی تعلیم و تربیت کے سامان کی فراہمی میں صرف ہوئے اور ۶۹ لاکھ زمین کی خریداری اور عمارتوں پر خرچ کئے گئے ہیں۔

یونیورسٹی کی سالانہ آمدنی تقریباً دس لاکھ ہے جس میں حکومتِ ہند اور ریاستوں کی امداد بھی شامل ہے، باقی رقم یونیورسٹی کی جائداد، تعلیم اور امتحانات کی فیس اور محفوظ سرمایہ کے سود سے وصول ہوتی ہے، یونیورسٹی کا سالانہ خرچ ۲۱ لاکھ روپیہ ہے۔

آمدنی اور خرچ کا حساب ہر سال جانچ کر کے گزٹ آف انڈیا میں شائع کرا دیا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے پانسو یا اس سے زیادہ کی رقم سے یونیورسٹی کی امداد کی ہے انہیں حساب کی ایک ایک کاپی بھیج دی جاتی ہے۔

یونیورسٹی کا نظام

ہندو یونیورسٹی کا انتظام حکومتِ ہند کے منظور کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے، انتظام کے لئے متعدد کمیٹیاں قائم ہیں، فکلٹی اور بورڈ آف سٹڈیز کی تائید کے بعد سنیٹ تعلیم کے موضوع اور دستور مقرر کرتی ہے، امتحانات کا تقرر اور انتظام سنیٹ کے ماتحت ہے۔ یونیورسٹی کی آمد و خرچ کا اہتمام، معلمین اور دوسرے کارکنوں

کا تقرر" یونیورسٹی کونسل" کرتی ہے۔ "کورٹ" کی سالانہ نشست ہوتی ہے اور سال بھر کے کاموں کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ چانسلر، پرو چانسلر، وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کا انتخاب کورٹ ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

ہندو یونیورسٹی ہندو قوم کا سب سے عظیم الشان اور کامیاب ادارہ ہے جس نے اپنے حلقے میں ہندوستان کی قدیم اور یورپ و امریکہ کی جدید برکتوں کو ایک ساتھ مہیا کر دیا ہے۔ یہ ادارہ ہندو قوم کو بسرعت تمام اس دورِ مسعود سے بہرہ ور ہونے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ جب ملک میں آزادی کا آفتاب ضیاباری کر رہا ہوگا اور اس کی روشنی میں اہلِ ملک کو کامل حق حاصل ہوگا کہ اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ملک کی برکات سے متمتع و فیضیاب ہوں۔

ابو محمد امام الدین رامنگری

نقشِ خلیقؔ

چھیڑ نہ مجھ کو ہمنشیں اور دبھرا بیاں ہوں میں
معنیٔ حرفِ آرزو، شرحِ غمِ نہاں ہوں میں

نقش گرِ ازل نے ہاں، یاد ہے جب کہا تھا کُن
شاہدِ حکمِ اوّل آمرِ کُن فکاں ہوں میں

گرچہ رہے ہیں شش جہت حلقۂ پیکِ جستجو
مجھ پہ نہ کھُل سکا مگر، کون ہوں کہاں ہوں میں

کاشفِ سرِّ آسماں، ساکنِ ارضِ لسپت تر
اہلِ نظر کے واسطے دفترِ بیکراں ہوں میں

میری بقا حقیقتہً ضامنِ ہستیٔ خدا
وجہِ وجودِ دو جہاں، پیکرِ ناتواں ہوں میں

میری نسیلۂ مندیاں، وجہِ فرازِ حسن ہیں
حسن رہینِ عشق ہے، حسن کی عزّوشاں ہوں میں

عمرِ عزیز کٹ گئی درسِ وفا میں گو خلیقؔ
مکتبِ دہر میں ہنوز ابجدِ عشق خواں ہوں میں

خلیق قریشی
(لائلپور)

افسانۂ ما

مَیں جوانی کی مئے گلگوں کا پیمانہ نہیں — جس کے ہر قطرے سے پیدا ہو خمارِ آتشیں
مَیں نہیں ہوں حُسن والوں کی نگاہِ سحر بار — برق بن کر پھونک دے جو خرمنِ صبر و قرار

مَیں ہوں اِک اُجڑے ہوئے معبد کا بے روغن چراغ
جس کے جلووں سے دلِ مضطر میں آجاتا ہے داغ

مَیں وفورِ شوق کی تصویرِ دل آرا نہیں — ثبت ہو جاتا ہے دل پر جس کا ہر نقشِ حسیں
مَیں نہیں ہوں پھول کی دُنیا میں رنگِ نو بہار — جس کی نکہت سے مہک اُٹھتے ہیں سارے لالہ زار

اک کلی باغِ تمنّا کی ہوں مرجھائی ہوئی
جس کی ہر پتّی پہ ہے افسردگی چھائی ہوئی

مَیں سمندر کی نہیں ہوں کوئی موجِ دلرُبا — مَیں نہیں ہوں آفتابِ دہر کی رنگیں ضیا
مَیں نہ کوئل کا ترانہ ہوں نہ بلبل کی نوا — گونجتی ہے جن کے نغموں سے گلستاں کی فضا

میرا قلبِ غم نوا ٹوٹا ہوا اِک ساز ہے
جاں رُبا، حسرت فزا جس کی ہر اِک آواز ہے

الطاف مشہدی

"موت کی چال"

ترکستان کے سرحدی ویرانوں میں اکبر خاں کا نام ہر شخص جانتا اور اُس سے خائف رہتا تھا۔ قبائل کے جنگ آزما سورما اس سے کانپتے تھے۔

ایک زمانہ گزرا اکبر خاں کے طوفانی شباب کے دور میں اُس کی برق ساماں تلوار نظروں کو خیرہ اور مغرور سروں کو تراش دیا کرتی تھی۔ اکبر خاں نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ اس کے زور آزما قدر انداز بازو ناقابلِ تسخیر تھے۔ بڑے بڑے تلواریوں کے مضبوط بازوؤں پر اس کی تلوار کی فاتحانی کی مہر ثبت تھی۔

یہ سب قصّے ماضی کی آغوش میں سوئے ہوئے ہیں۔

تاہم ان کی یاد اب بھی گرمیِ محفل کا سامان ہے۔ خاں ان واقعات کو اپنے تصور کے جادو سے جگاتا ہے اور تنہائی میں مسرت کے ... قہقہے لگا لیتا ہے۔

چونکہ اکبر خاں کا شباب پُرجوش رہا تھا۔ وہ اب بھی کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو رہا تھا، نچلا بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ گزری ہوئی ہنگامہ خیزیوں کی تجدید کرنی چاہتا تھا، اُسے کسی مشغلے کی تلاش تھی۔ اکبر خاں کی نظرِ انتخاب شطرنج پر پڑی۔ ہر چند کہ جسم اب اُس پھرتی، عیاری اور لچک کا حامل نہیں رہا تھا جو اس کے دورِ شباب کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مگر اُس کا دماغ اب بھی اُن خوبیوں کا خزینہ تھا اور ان فضائل کا مظاہرہ شطرنج سے بھی ہو سکتا تھا۔

اکبر خاں نے شطرنج میں بھی وہ مشق بہم پہنچائی کہ قبائل کے ماہر شاطر اُس سے زک کھاتے۔ یہ خاں کی خوش بختی تھی کہ اردگرد کے سارے قبائل میں شطرنج پسندیدہ کھیل تھا۔ خاں بڑی بڑی شرطوں پر شطرنج کھیلتا تھا۔ صرف امرائے قبائل ہی اس کے شریکِ مشغلہ ہو سکتے تھے۔

بڑھاپے میں خاں اتنا ہی ماہر شاطر بن گیا جتنا ماہر تلوار، وہ عالمِ شباب میں تھا۔ اب اپنے مدِ مقابل کو شکست دیتے دیتے وہ اُکتا سا گیا تھا، یہ غیر دلچسپ یکسانیت اس کے دل میں لذت پیدا کرنے سے قاصر تھی۔ یہ شطرنج کی بازیاں بھی اب فتح کو بے نمک ہی چھوڑ جاتی تھیں۔ ایسی پھیکی فتح بھلا "خاں" کی شورمزاجی کو کیا خاک تسکین دیتی!

آخر کار اُس کے تیز فہم دماغ نے ایک ترکیب سوچی جس سے مقابلۂ شطرنج میں بھی وہ آہنی چمک سی پیدا ہو گئی جو خاں کو بہت دل پسند تھی۔ جب اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا تو وہ بہت مسرور تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ سر بکف جنگ آزماؤں کو دعوت دے گا کہ شطرنج میں بھی سر کی بازی لگائیں۔

دوسرے روز ہمایہ کی مجلس میں خاں نے یہ بات پیش کی کہ اس سے جو شطرنج کی بازی جیت لے گا "وہ وزیرِ اعظم بنایا جائے گا اور جو ہار جائے گا اس کا سر اُڑا دیا جائے گا"۔ یہ خبر بجلی کی طرح سارے علاقے میں دوڑ گئی۔ ایسی دعوت اہلِ قبائل کے لئے سخت پُر اثر ثابت ہوئی۔ ہر چند کہ یہ انوکھی شرط بہت ہی لرزہ خیز تھی۔ مگر اس میں ایک ولولہ انگیز امید کی کرن بھی پوشیدہ تھی۔ وزیرِ اعظم کا قابلِ رشک عہدہ ارمان خیز تھا۔

غرض خاں کو شاطروں کی کمی نہیں ہوئی۔ پہلے پہلے تو صرف اعلیٰ افسر مقابلے میں آئے جنہیں خاں نے ہمیشہ شکست دی اور اُن میں سے ہر ایک کا کاندھا سر سے سبکدوش ہو گیا۔ ہر چند جان کا خطرہ تھا مگر وزارت کے لالچ نے لوگوں کو ہمیشہ آمادۂ مقابلہ رکھا اور خاں کے ملال میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک روز ایک سبزہ آغاز نوجوان مقابلے کے لئے حاضر ہوا، امرائے دربار نے اس نوخیز امیدوار کا مضحکہ اُڑایا....

"واہ واہ! چہ خوش! آپ اور خانِ اعظم کا مقابلہ! صورت ملاحظہ ہو! جاؤ میاں! غنیمت سمجھو کہ تمہارے جسم و جان میں رشتۂ اتحاد باقی ہے!"

"نہیں" نوجوان نے جواب دیا۔ "میں یہاں ہوں اور یہیں

رہوں گا۔" میں دس برس سے شطرنج کھیل رہا ہوں اور میں نے خود اپنے باپ کو شکست دی ہے!"

"اخاہ!" جناب کے والد صاحب! ارے میاں! خان اس وقت سے شطرنج کھیل رہا ہے جبکہ آپ کے والد صاحب کی پیدائش بھی نہیں ہوئی ہوگی! اگر تمہارے داڑھی ہوتی تو ہم لوگ اُسے خوب کھینچتے۔ کہاں چھوڑ آئے داڑھی؟" اہلِ مجلس نے ہنستے ہوئے یہ باتیں کیں۔

"ہشیار!" اپنی داڑھیاں تو بچا رکھو" اگر میں وزیراعظم ہو گیا تو پھر ان کی خیر نہیں۔" اس چھوکرے کے وزیراعظم ہو جانے کا خیال اسقدر مضحکہ خیز تھا کہ مجلس کی مجلس نے وہ قہقہہ لگایا کہ خان اعظم خود باہر چلا آیا۔

"تو کون ہے؟" خان نے دریافت کیا۔

"میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ خان کے ساتھ شطرنج کھیلنے کا فخر حاصل کروں۔"

"میں ہی خان ہوں۔ کیا تم اپنے سر کی کوئی قیمت سمجھتے ہو؟"

"جی ہاں مجھے سب معلوم ہے۔"

"تو پھر جاؤ، ورنہ تمہاری موت یقینی ہے۔"

"نہیں۔ خان اعظم! میری تمنا ہے کہ میں ایک بازی کھیلوں!"

"جاؤ! اس لڑکے کو بیرونی دروازہ کی سیر کرا لاؤ!"

ایک خنجر بکف سپاہی نے اس لڑکے کو دروازۂ مذکور کی سیر کرائی۔ بریدہ سر ہر جگہ دانت نکالے لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ خوفناک بھوتوں کی طرح!

کیا ان سروں کے اندر ایسے ہی خیالات پرورش پا رہے تھے جیسے اس نوجوان کے سر میں؟؟

مگر اس خوفناک منظر نے اس لڑکے کے حوصلے میں اور اضافہ کر دیا۔ خان نے اس کے ارادہ کے استحکام پر اس کی بڑی تعریف کی۔

آخر کار! دونوں شطرنج کھیلنے بیٹھے۔ یہ نوجوان "حسن بے"
سیدھے سادے لباس میں" ناقابل تسخیر" خان کا مدِ مقابل تھا اور
الیاس لڑکا بازی جیت گیا! خان کو اس کا بازی جیت جانا
بہت بھایا اور اس نے لڑکے کو فی الفور وزیراعظم کے عہدۂ جلیلہ سے سرفراز فرما دیا۔

"تم نے شکست دی ہے اے بلند دماغ لڑکے۔ آج تک مجھے کسی معمر یا نوجوان نے زک نہیں دی تھی"! میں تمہیں وزیر اعظم بناتا ہوں۔ مگر آج کی رات" ہم پھر ایک بازی کھیلیں گے!

"جی حضور! آقائے من! ایسا ہی ہوگا!" حسن بے نے جواب دیا۔

کیا وہ اس طرح مسلسل خان کو شکست دیتا رہے گا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر اس کا سر کب تک سلامت رہ سکے گا۔ یہ تھے خیالات جو اس لڑکے کے دماغ میں تیزی سے چکر لگا رہے تھے اور عہدہ وزارت کو تلوار کی دھار محسوس کر رہا تھا!

اس سہ پہر کو حسن بے کا باپ دراز مان خان کو ایک امر کی اطلاع دینے آیا یعنی خان کے خلاف ایک سازش ہو رہی تھی، اس شخص نے جب اپنے لڑکے کو وزیراعظم دیکھا تو حیرت سے منہ تکتا رہ گیا!

حسن بے سازشیوں کے سزا دینے کے لئے تیار ہو گیا، تاکہ ایک رات کو شطرنج سے نجات حاصل ہو جائے۔

دوسرے دن نوخیز وزیر میدان مار کر واپس آیا۔ خان نے اس کی کارکردگی کی بہت تعریف کی، مگر رات کو دعوت شطرنج بھی دے دی۔ رات کے کھانے کے بعد صحن میں بساط بچھی۔ امرائے دربار جمع ہوئے۔ خان کے محافظ سپاہیوں کا دستہ بھی اکٹھا ہوا۔ ایک ایک افسر حاضر تھا۔ معمول سے زیادہ آج شطرنج کی بازی میں دلکشی تھی۔ چند قدم کے فاصلہ پر ننگی تلواریں ہاتھوں میں پکڑے جلادوں کا ایک دستہ گشت لگا رہا تھا۔ قدم کی ایک ایک چاپ نوخیز وزیر کے لئے پیام مرگ معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے زندگی کی ساعت سے ذراتِ ریگ آہستہ آہستہ گزر رہے ہوں۔ ہر عریاں دھار برق بلا کی طرح چاندنی میں چمک رہی تھی۔ منحوس ستاروں اور شیطانی آنکھوں کی مانند!

آخر کار کھیل شروع ہوا۔ خان اور وزیراعظم چال چلنے لگے۔ مجمع ساکت ہو گیا۔ تلوار بردار خاموش کھڑے ہو گئے، ہوا کی سانس بھی بند تھی!

وزیراعظم نے پہلی چال چلی۔ خان اعظم نے تفکر و تامل کے بعد اپنا مہرہ اٹھایا۔ وزیراعظم پھر چلا۔ جیسے ہی مہرہ دوسرے خانے میں رکھا گیا وزیراعظم کو پتہ چل گیا کہ چال غلط چلی گئی۔ خان اس کی

کاٹ کرے گا اور پھر....... پھر......الامان......!

وہ خاقان کی چال چلنے کو دیکھ نہ سکا۔ اس پر ایک ہیبت طاری تھی، چہرہ پر پسینہ آگیا۔ جسم میں تھرتھری دوڑ گئی..... اور ایک ایک خون کی گرم لہر کے بعد سارے عضو ٹھنڈے پڑ گئے...... سانس مشکل سے آنے جانے لگی...... چہرہ پر زردی اور مردنی چھا گئی۔ سر نیچے جھکائے وہ اپنے انجام کو سوچ رہا تھا اور انجام کیا تھا..... منتظر قاتل تلوار کی تیز دھاریں!!

مگر خاقان ابھی تک مہرہ پکڑے سوچ رہا تھا......

ایک گہری فکر میں ڈوبا ہوا...... اس کی آنکھیں بند تھیں .... وزیر کے لئے یہ وقفہ اور وحشت انگیز تھا۔ کاش چال جلدی چلی جاتی اور ہر شے کا خاتمہ ہو جاتا! اُمید اور نا امیدی سب کا۔ وزیر کے کان میں گرم خون کی رو تیر گئی۔ اس نے خوف سے سر اٹھایا۔ خاقان اب تک آنکھیں بند کئے تھا..... شاید اسے نیند آگئی تھی۔ اُس کا سر جھک رہا تھا!

کسی ایک قاتل لمحے میں وہ جاگ اُٹھے گا۔ وزیر کی آنکھیں لپنے مقابل کے مہرے پر خوف و انتظار میں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی انگلیوں کی جنبش میں وزیر کی زندگی دم توڑ رہی تھی۔ خاقان سوتا رہا۔ غلاموں نے تکیے لا دئے۔ تاکہ خاقان کا سر اس پر آرام کر سکے اور پھر سب مؤدب اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔

گھنٹے کے بعد گھنٹے گزرتے گئے۔ بوڑھے لوگ اونگھنے لگے اور ان میں سے اکثر سو گئے۔ بیشتر جوانوں کا بھی یہی عالم تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجلس پر ایک منحوس ہوا پنکھا جھل گئی ہے۔

وزیر اعظم بیٹھا رہا۔ ساکت و جامد، لوہے کی طرح۔ اُس کے لب زور سے بند تھے۔ اس کے ہاتھ مضبوطی سے نشست کو پکڑے ہوئے تھے۔ صرف اس وقت عمارتِ تمنا کی بلندی کا احساس کامل طور پر ہوتا ہے جب ہماری جیتی امیدیں ناقابلِ تلافی حد تک شکستہ ہو چکی ہوں۔ وزیر کی چشم باطن کے سامنے اس کا سادہ۔ بے لوث بچپن، بے آزار بچپن پھر گیا اور پھر چند گھنٹے قبل تک کی شان و شوکت! اس ایک لمحے کے قبل تک جب وہ ایک غلط چال چلا وہ ایک عظیم الاقتدار خاقان کا با اختیار وزیراعظم تھا اور اب وہ ایک ناتواں چوہے کی طرح کونے میں دبکا جا رہا تھا۔ صرف اس خوف و انتظار میں کہ ایک جنگلی بلا اُسے پھاڑ کر موت کے گھاٹ اُتار دے!

خاقان اب تک سو رہا تھا۔

آخر الامر صبح ہوئی...... اللہ اکبر! اللہ اکبر!! کی آواز میناروں سے بلند ہوئی۔ ایک ایسی آواز جس کی اطاعت سب کو کرنی لازم ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا خاقان بھی اس سے سرتابی نہیں کر سکتا۔

یہ ایک نئی بات تھی۔ یہ آواز بھی خاقان کو جگا نہ سکی اور سب امرائے دربار مسجد میں ادائے فرض کے لئے روانہ ہو گئے۔ خدائے اعلیٰ و اکبر کی عبادت کے لئے اس سب سے بڑے کے آگے اپنی گردنیں جھکانے کے لئے۔ اب یہ وزیر اعظم ہی کا کام تھا کہ اکبر خاں کو جگائے۔ اس سونے والے کو جسے وہ پہروں سے اس بیکس مکھی کی طرح تک رہا تھا جو مکڑی کے جال میں آ کر مکڑی کو تکتی ہے کتنے خوفناک گھنٹے اس طرح گزر چکے تھے۔

آخر کار! اُس نے اپنے اینٹھے ہوئے ہاتھ کو مشکل سے اوپر کیا اور اپنی منجمد انگلیوں سے خاقان کو چھیڑا، جیسے کوئی اپنی گردن پر خود سے تیشہ مارے۔ بہرحال اس طرح مصیبتِ مسلسل مصیبت سے نجات تو مل جائے گی۔ اس کابوس خواب سے جو رات بھر اس جسم و جان کو عذاب الیم میں مبتلا رکھے ہوئے تھا۔

وزیر کے لرزاں ہاتھوں نے سونے والے کے کاندھوں کو جنبش دی۔ خاقان کا جسم زمین پر لڑھک گیا۔ اوندھے منہ خاقان اعظم "موت کی چال" کا شکار ہو چکا تھا!! ؎

"بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ؛ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے"

عائشہ خاتون شمیم

"لطفِ شب"

دیدنی تھا بزمِ عشرت کا سماں کل رات کو
حُسن در آغوش تھا سارا جہاں کل رات کو

میکدے کا گوشہ گوشہ کیف سے معمور تھا
چل رہا تھا ساغرِ پیرِ مغاں کل رات کو

دَور تھے آنکھوں ہی آنکھوں میں مئے خوش رنگ کے
رقص کرتی تھی عروسِ کہکشاں کل رات کو

ہر نفس کا زیر و بم تھا نغمۂ ناہید اثر
ہر نفس پر کوندتی تھیں بجلیاں کل رات کو

چادرِ سیماب تھی یا نُور کا طوفان تھا
روشنی برسا رہا تھا آسماں کل رات کو

چاند کے جھرمٹ میں تھا روشن ستاروں کا ہجوم
ہو رہی تھیں انجمن آرائیاں کل رات کو

ہنس رہے تھے انجمِ شب تاب فرطِ جوش سے
لُٹ رہی تھی دولتِ کون و مکاں کل رات کو

دہر کی ہر شے پہ چھایا تھا شبابِ رنگ و بو
تھا جہاں کا ذرّہ ذرّہ نوجواں کل رات کو

تھے گُل و گلزار گویا رشکِ فردوسِ بریں
جلوہ افگن تھی بہارِ جاوداں کل رات کو

فرطِ شادی سے چمن کا ذرّہ ذرّہ مست تھا
لے رہی تھی بوئے گُل انگڑائیاں کل رات کو

نَو عروسانِ چمن سب ہو گئے تھے بے نقاب
نوجوانانِ چمن تھے شادماں کل رات کو

ہر طرف موجِ ہوا پھیلا رہی تھی بوئے دوست
منتشر تھی گیسوئے عنبر فشاں کل رات کو

دہر کی ہر شے شگفتہ تھی فضا تھی عطر بیز
منتشر تھیں حُسن کی رنگینیاں کل رات کو

بام و در سے ہو رہی تھیں زندگی کی بارشیں
محوِ خوابِ ناز تھا خوابِ گراں کل رات کو

رنج و غم دنیا میں گویا نام کو باقی نہ تھا
تھی مسرت ہی مسرت حکمراں کل رات کو

اِس ہجومِ رنگ و بو میں سانس لینا تھا محال
رُک گیا تھا زندگی کا کارواں کل رات کو

بادشاہِ عشق تھا میری حکومت تھی سلیمؔ
زینتِ محفل تھی وہ نورجہاں کل رات کو

سلیم (حیدرآباد دکن)

تعلیمات

جاپان کی ترقی میں تعلیم کا حصہ

جاپان کی ترقی میں جاپان کی تعلیم کا خاص حصہ ہے۔ تعلیم جاپان کی ایک زبردست طاقت ہے، جاپانی حکومت اور جاپانی پبلک دونوں نے تعلیم کے اس اصل اصول کو اپنی عملی زندگی میں داخل کر لیا ہے کہ کسی ملک کے اقبال و ادبار کا دار و مدار معیار تعلیم کی بلندی و پستی اور ترقی و تنزل پر ہے، یہی وجہ ہے کہ جاپانی حکومت اور جاپانی پبلک دونوں تعلیم کو بلند، عملی اور عام بنانے میں اپنی بہترین مساعی صرف کر رہی ہیں۔

جاپان میں ابتدائی تعلیم لازمی ہے، چھ برس سے چودہ برس تک کی عمر کا کوئی جاپانی بچہ ایسا نہیں جو اسکول نہ جاتا ہو، پورے جاپان میں ایک خاندان بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو ناخواندہ ہو، خاندان تو خاندان ایک فرد کا بھی علم سے بے بہرہ ملنا مشکل ہے۔ تعلیم کے معاملے میں اعلیٰ و ادنیٰ، مالدار و مفلس، مالک و مزدور کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا، تمام ابنائے ملک کو نوشت و خواند سے بہرہ ور کرنا حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

جاپانی درسگاہوں کی تعلیم ہندوستانی اسکولوں کی طرح صرف کتاب خوانی تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ نونہالان ملک کو چودہ سال کی عمر تک جو ان کی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کا زمانہ ہے حصول معاش کے قابل بنا دیا جاتا ہے اور وہ اس لائق ہو جاتے ہیں کہ . . . . ذمہ دارانہ زندگی کے میدان میں قدم زن ہونے کے بعد عملی مشکلات کے مقابلے سے عہدہ برآ ہو سکیں، جاپان کی صنعتی و تجارتی ترقی کا خاص سبب وہاں کی عملی تعلیم اور اس کی عمومیت ہے۔ آپ جاپان جائیں اور اس کی تعلیمی جد و جہد کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تعلیم کے لائق سو فیصدی بچے مصروف تعلیم ہیں۔

جاپانی بچوں کی غائت تعلیم معلوم کرنے کے لئے آپ کو جاپان کے آئین حکومت کے حسب ذیل مقاصد تعلیم ملاحظہ کرنے چاہئیں:۔

"اس تعلیم میں بچوں کو قوم اور قبیلے کے بہترین ارکان بنانے پر خاص توجہ کی جائے گی، علاوہ بریں عملی زندگی میں عام طور پر جسقدر علم و ہنر کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تعلیم بھی ہوگی، ساتھ ہی بچوں کی جسمانی نشو و نما کا بھی کامل لحاظ رکھا جائے گا۔"

جاپانی درسگاہوں کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ان میں بچوں کو جو تعلیم دی جائے اس سے وہ عملی زندگی میں مستفید ہو سکیں، چنانچہ وہاں کی درسگاہوں میں بچوں کو انہیں مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے جن کا تعلق ان کی عمومی زندگی سے ہوتا ہے اور جو ان کی آئندہ زندگی کے لئے مفید اور کار آمد ہوتے ہیں۔

جاپانی بچوں میں خود اعتمادی و خود داری کا مادہ پیدا کرنا جاپانی تعلیم کے اصول خاص میں داخل ہے، وہاں بچوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ جوان ہو کر وہ دوسروں کا سہارا تلاش نہ کریں، ان کے اندر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا جذبہ کار فرما ہو، وہاں کے اسکولوں میں بچوں کے جذبات و احساسات کو دبانے اور پامال کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ انہیں برانگیختہ اور بیدار کیا جاتا ہے، نصاب تعلیم سے باہر کے سوال پر ماسٹر انہیں ڈانٹ کر خاموش نہیں کر دیتے انہیں تسلی بخش جواب دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ وہ اسی طرح غور و فکر اور شوق و حوصلہ سے کام لیا کریں۔

جاپانی طریقۂ تعلیم محض اسباق رٹوانے پر مبنی نہیں ہے، اس میں بچوں کی ذہنی وسعت و بلندی کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر اعلیٰ تعلیمیافتہ معلم نہیں ہو سکتا، اس کے لئے طریقۂ تعلیم کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے، وہاں لڑکوں کو زد و کوب

کرنے کا دستور نہیں ہے، بچوں کے لئے اتنی سزا کافی سمجھی جاتی ہے کہ انہیں دیر سے چھٹی دی جائے یا کھیل میں شریک نہ کیا جائے۔ وہاں بچوں کی سزادہی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انہیں اسکول آنے سے روک دیا جائے، اس سے آپ جاپانی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی خوبی و خوشگواری کا اندازہ فرما سکتے ہیں، اسکول نہ آنے دینے کو بچہ سزا تصور کرتا ہے۔

ابتدائی درسگاہوں میں تعلیم مفت ہے، پھر بھی کوئی خاندان اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے قاصر ہو تو حکومت اور پبلک کی جانب سے امداد کے انتظامات موجود ہیں، اس لئے جاپان میں افلاس و ناداری کے باعث کوئی بچہ ناخواندہ نہیں رہ سکتا۔

جاپان کی اسی کامیاب تعلیمی جد و جہد اور سرگرمی نے اپنے ملک کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ان کا ہر فرد ملک کی ترقی میں مشین کے پرزوں کی طرح اپنے فرائض کامل و خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔

ترکی کی تعلیمی سرگرمیاں

اتاترک مصطفےٰ کمال کے ذریعہ خداوند قدوس نے ترک قوم کو جو برکات و حسنات عطا فرمائی ہیں، ان کا شمار و اعادہ دشوار ہے، ترکی میں ابتدائی تعلیم لازمی ہو چکی ہے اور ہر طرح کی تعلیم مفت دی جاتی ہے، بعض اعلیٰ مدارج تعلیم میں امراء کے لڑکوں سے فیس لی جاتی ہے، لیکن عام طور پر ان درجوں میں بھی مفت ہی تعلیم دی جاتی ہے، اس لئے وہاں عام حیثیت کے لوگوں کی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں۔

ابتدائی سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہوتی ہے، بعض کالجوں میں بھی مخلوط تعلیم کا طریقہ جاری ہے اور بعض تعلیم گاہیں ایسی ہیں جن میں صرف لڑکے تعلیم پاتے ہیں یا صرف لڑکیاں پڑھتی ہیں۔

مدرسوں کا نظام کاملاً جمہوری ہے، ہر مدرسہ سے متعلق ایک مجلس منتظمہ ہوتی ہے جس میں اساتذہ کے ساتھ طلبہ بھی داخل ہوتے ہیں، طلبہ کو مجلس میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ رائے دینے کا حق حاصل ہے، وہ انتظامی معاملات میں اپنے اساتذہ کے خلاف بھی رائے دیتے ہیں، یہ مجلس تعلیم گاہ کے پورے انتظام و اہتمام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

ترکی اسکولوں میں طلبہ کو جسمانی سزا دینے کا قاعدہ نہیں ہے۔ صرف اخلاقی سزا دی جاتی ہے وہ بھی اس ضابطے اور آئین کے ساتھ کہ ان کی حمیت و خودداری پامال و مجروح نہ ہو، طلبہ کو جو سزائیں دی جاتی ہیں ان کی دوسروں کو خبر بھی نہیں ہوتی، لڑکا، ماسٹر، اور لڑکے کا سرپرست، تین کے علاوہ چوتھا نہیں جان سکتا کہ کس لڑکے کو کیا سزا دی گئی۔ ہر لڑکے کی سزادہی کے لئے ایک علیحدہ رجسٹر ہوتا ہے، اس میں اس کی سزا درج کی جاتی ہے، ایک لڑکے کے رجسٹر کو دوسرا لڑکا نہیں دیکھ سکتا۔

کامیاب امتحان طلبہ کو کسی قسم کا انعام نہیں دیا جاتا، طلبہ کا تمول و افلاس بھی پردۂ اخفا میں رکھا جاتا ہے۔ ان سب کی غرض و غایت یہی ہے کہ طلبہ ایک دوسرے کے مقابلے میں ذلیل نہ ہوں، ترکی کا یہ اخلاقی نکتہ ہندوستانی درسگاہوں میں بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے۔

چودھری احسان الحق
بی۔اے

موت

وہ قریب آ رہی ہے، ہر صبح میں اُسے نزدیک تر پاتا ہوں
کوئی اس کے آنے سے رنجیدہ ہے، کوئی مسرور۔
لیکن جب اس کا آنا یقینی ہے، تو کیوں نہ میں اپنا کام جلد ختم کر دوں۔
میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے سے اسکی رفتار تو کم نہ ہو گی۔

محمد ایوب

مُحاسبہ

(بارگاہِ ایزدی میں ایک محبّت آمیز گُستاخی)

یہ نظم عدمؔ صاحب نے حضرتِ تاجورؔ کی نظم "عہدِ شدید" سے متاثر ہو کر لکھی ہے جو ماہ فروری کے شاہکار میں شائع ہو چکی ہے۔ (یزدانی)

پڑھ کے تیرا مرثیہ اے شاعرِ افسردہ دل　　ہو گئی ہے زندگی کی ہر مسرّت مُنفعل

اِس جہاں کو ایک بے قیمت سی شئے پاتا ہوں میں　　فکر کی گہرائیوں میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

رُوح میں چُبھتا ہوا سا ایک استفسار ہے　　کیا خدا انسان سے بھی برسرِ پیکار ہے؟

میرا استفسار الحق طالبِ تصریح ہے　　زندگی کیا اُس تماشاگر کی اک تفریح ہے؟

کچھ کھلونے سے بناتا ہے، مٹا دیتا ہے وہ　　کتنے دل اِس کھیل میں لیکن دُکھا دیتا ہے وہ

دل جسے کہئے خدائے عشق کے سجدوں کا فرش　　دل کہ جس کے سامنے جھکتی نہیں توقیرِ عرش

دل کھلونا ہے، مگر ذی رُوح اور حسّاس ہے　　زندگی کا ایک گردابِ امید و یاس ہے

دل، غریب انسان کا دل سنگِ بنیادِ جہاں　　حوصلہ ور، حاملِ بارِ زمین و آسماں!

دل کہ جس کی طاقتوں پر چل رہی ہے کائنات　　دل، خداوندِ عمل، سرچشمۂ سوزِ حیات

دل، خدا کے فلسفے کو جس نے بخشی زندگی　　جس کے دم سے محفلِ ہستی میں ہے تابندگی

دل نہ ہوتا گر بشر کے پاس تو معدُوم تھا　　اک فرشتے کی طرح احساس سے محرُوم تھا

ہے فرشتہ وہ بشر، جو قلب سے محروم ہے		جس کے لب پر صرف "یا جبار" و یا "قیوم" ہے
آہ! انساں نے سنبھالے کار و بارِ کائنات		ہمتِ انساں پہ ہے سب انحصارِ کائنات
اور یزداں آزماتا ہے بشر کو اور ابھی		کر رہا ہے مشتعل دردِ جگر کو اور ابھی
مانتا ہوں میں اجل فطرت کا اک انعام ہے		تلخ بے حد آدمی کی زندگی کا جام ہے
مانتا ہوں میں کہ یہ اُس کا اٹل قانون ہے		موت اُس افسانہ گر کا آخری مضمون ہے
موت کیا خود فطرتِ بالغ نظر مجبور ہے		موت سے فطرت کو عرفانِ بشر منظور ہے
موت کے قبضے میں کچھ ایسے بھی ہیں اونچے مقام		جس جگہ پہنچا نہیں عقل فرو ہمت کا گام
بالیقیں کچھ ماورائے بزمِ آب و گل بھی ہے		علم ظاہر ہی نہیں دُنیا میں، علم دل بھی ہے
مانتا ہوں موت بھی اک راز کی تفسیر ہے		عشق کو بیدار کرتا ہے جو، یہ وہ تیر ہے
عشق کیا ہے علمِ باطن، عشق کے اعجاز سے		آدمی ہوتا ہے واقف ایک اونچے راز سے
پھر بھی دل تو ٹوٹ جاتا ہے تلافی اس کی کیا		آئینہ جو پھوٹ جاتا ہے تلافی اس کی کیا
میں تسلی کا نہیں قائل، مرا دل چور ہے		جو سزا دے گا مجھے میرا خدا منظور ہے
میں کروں گا حشر کے دن سب سے پہلے یہ سوال		ساتھ میرے دفترِ اعمال کے اے ذوالجلال

اپنے روشن کارناموں کی گرہ بھی کھول لے
اپنی جباری کو میری بیکسی سے تول لے

عدم

میں آپ کو کیا سمجھتا ہوں

سلسلۂ سوال وجواب میں میری ایک مختصر تنقید کی تردید میں مرزا یگانہ لکھنوی نے مضمون بھیجا ہے، اُن کا اصرار ہے کہ حرف بہ حرف شائع کیا جائے اور اپنے لئے القاب جو انہوں نے تجویز کئے ہیں اُن کی اشاعت پر بھی مصر ہیں، چونکہ میری تنقید کے جواب میں یہ مضمون آیا ہے اِس لئے میں اصولِ صحافت کا احترام کرتے ہوئے اسے صاحبِ مضمون کے حسب ایما ر ایک حرف کی تبدیلی کے بغیر شائع کر رہا ہوں - میری تنقید کے بعض فقروں سے انہوں نے ایسے معنی اخذ کر لئے جو میرے ذہن میں نہ تھے - بلند خیالات، سہل زبان اور عام فہم اندازِ بیان میں نظم کرنا میرے نزدیک بھی کمالِ شاعری میں داخل ہے - اِسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا صاحب کے کلام میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی، مگر پھر بھی وہ یہ خیال رکھتے ہیں کہ اُن کا کلام اگلی صدی کے لوگ سمجھیں گے - بہرحال میں اپنے اشاعتی اقتدار سے کوئی بیجا فائدہ بھی اُٹھائے بغیر اس مضمون کو شائع کرتا ہوں، اگرچہ میری خواہش تھی کہ وہ اندازِ بیان میں متانت و سنجیدگی کو ملحوظ رکھتے ●

(تاجور)

میرے مہربان دیرینہ مولانا تاجور صاحب سے کسی نے میری شاعری کے متعلق رائے دریافت کی، آپ نے اپنے رسالہ شاہکار میں اُس کا جواب دیتے ہوئے میری شاعری کی کچھ ادھوری سدھوری تعریف کر کے میرے کیرکٹر کو بھی لپیٹ لیا یعنی وہی پرانا دُکھڑا کہ "میرزا یگانہ شعرائے لکھنؤ نیز غالب کے خلاف "چھچھورپن" سے کبھی باز نہیں آتے اور اب تک اس کا خمیازہ جھیل رہے ہیں -"

سوال تو تھا شاعری کے متعلق، مگر وہاں کیرکٹر اور سوانح حیات پر بھی تنقید ہونے لگی - آخر غالب کے خلاف چھچھورپن سے کیوں باز آتے ؟ چھچھورپن کو چھچھورپن تو وہ سمجھے جو شریف و مہذب ہو - میرزا یگانہ نے جب تہذیب و شرافت پر لات مار کر، سیاں شہد سے کے ساتھ صیغہ اخوت پڑھ کر اسے اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا تو پھر تہذیب و شرافت کی توقع رکھنا کیا معنی ؟ ؎

شیخ تو نے خوب سمجھا میر کو

واہ وا اسے بے حقیقت واہ وا

خیر آپ نے جو کچھ مجھے سمجھا سمجھا، غلط ہو یا صحیح، مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ میں آپ کو کیا سمجھتا ہوں -

آپ فرماتے ہیں :-

(۱) "میرزا یگانہ طنزیات کے مالک ہیں"۔ بیشک بہت سچی تعریف فرمائی -

(۲) "کلام میں پختگی ہے"۔ درست فرمایا، مگر یہ بھی تو فرمایا ہوتا کہ کلام یگانہ اُن خامیوں سے پاک و صاف ہے جو غالب کے ہاں بکثرت پائی جاتی ہیں -

(۳) "سوز و ساز، ناکامی و نامرادی کے جذبات سے کلام معمور ہے"۔ یہ تعریف بھی ایک حد تک درست ہے، مگر ناقص اور گمراہ کُن - سوز و ساز تو قیامت کا ہے مگر کہیں تو یہ سوز و ساز آشکارا ہے اور کہیں طنزیات کے پردے میں اس طرح چھُپا ہوا ہے کہ درد آشنا بالغ نظروں کے سوا عام لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا البتہ درد کا ایک اجمالی اثر ضرور پڑتا ہے - ناکامی و نامرادی کی کیفیات جسقدر ہیں وہ نہ ہمہ تن آپ بیتی ہیں نہ ہمہ تن جگ بیتی - ذاتی و شخصی واردات بھی ہیں اور خارجی مشاہدات کے مرقعے بھی ہیں، مگر ان تمام سوز و گداز کے علاوہ جوش و خروش، عالی حوصلگی و اولوالعزمی، خودشناسی و خوداعتمادی بھی میرزا یگانہ کے طرزِ زندگی اور ان کی شاعری میں نمایاں ہے کہ ایک اندھا بھی ٹٹول کر دیکھ سکتا ہے - ؎

(رباعی)

دیوانہ روی کا حق ادا کرتا چل ⁂ چلنا تو یہی شور بپا کرتا چل

گردش میں بھنور ہے بونڈ لاچکر ہیں ⁂ ہاں تو بھی یوں ہی رقص فنا کرتا چل

دیکھو Pessimism میں Optimism کا
مستانہ بانکپن کیا جوش وخروش دکھا رہا ہے، ناممکن ہے کہ مذاق
عامہ اتنی حسین اتنی ارفع واعلیٰ سخنوری کی قدر پہچان سکے۔

مطلع

مستانہ رقص کیجئے گرداب حال میں
بیڑا ہے پار ڈوب کر اپنے خیال میں

اپنے خیال میں غرق ہو کر پار ہو جانا ایک ایسی حقیقت کبریٰ
ہے جہاں نظری حیثیت سے بھی پہنچنا دشوار ہے مگر ایسے لوگ
بھی دنیا میں ہوتے ہیں جو محض قوت خیال کی بدولت تمام مشکلوں سے
نجات پا جاتے ہیں۔ ہرگز مذاق عامہ اس شاعری کی حقیقت تک
نہیں پہنچ سکتا ؎

ہاں کیوں نہ پار اتر چلوں خمیازہ جھیل کر
ڈوبے مری بلا عرق انفعال میں

یہ ہے میرزا یگانہ کا شخصی کیرکٹر۔ شرم وندامت کی بلا میں
گرفتار رہنے سے روح ذلیل ہو جاتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ
گناہوں کا خمیازہ جھیل کر پار اتر جاؤ۔ بڑے پلے کا شعر ہے، جس کی سمجھ
میں آجائے وہ دوسرے لفظوں میں اس کی نقل اتارنے کی
کوشش کرے تو عجب نہیں، بعض معاصرین یہی کر رہے ہیں۔
میں دیکھتا ہوں اور ہنستا ہوں ؎

مست ادا بھلے کو پیمبر نہ بن گیا
سوجھی تو خوب نشۂ بے اعتدال میں
واللہ نگاہ شوق کی معراج ہے یہی
وہ خواب دیکھئے جو نہ آئے خیال میں
ممکن کی آرزو میں موئے کتنے نامراد
اچھی گزر گئی مری فکر محال میں

غور کیجئے، ان اشعار کے مطالعہ سے دل میں جوش و خروش
پیدا ہوتا ہے یا افسردگی؟ ؎

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ
اشارہ چاہیئے ہے جنبش سلاسل کا

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندان بلا
شور ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے
پائے آزاد ہے زنداں کے چلن سے باہر
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پنہاتا ہے مجھے

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تلخ ہو جائے لذت بیداد!

جل جلالہٗ! مسلمات عامہ کے خلاف اُلٹی بات کہی۔ ترک
صبر کی تلقین کی ہے مگر کس جذبے کے تحت؟ دشمن کے جذبۂ
ستم پروری کا پاس و لحاظ ہے۔ تڑپ لو جتنا تڑپ سکو، کیونکہ یہی
مقصد یہی مدعا ہے دشمن کا کہ تمہیں تڑپتا دیکھ کر خوش ہو۔ صبر و
سکوت سے کام لوگے تو دشمن کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ ستم
پروری کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ عملی طور پر تو کجا نظری حیثیت سے
بھی اخلاق کی اس بلندی پہ پہنچنا دشوار ہے۔ ناممکن ہے کہ
پبلک اس مذاق شعری تک پہنچ سکے یا اردو لٹریچر ایسے اشعار کا
جواب پیش کر سکے۔ گزشتہ تیس سال کے اندر کیا کیا حیرت انگیز
حقائق و معارف شاعرانہ آرٹ کے ذریعہ سے یگانہ نے پیش کئے
مگر ملک نے سمجھا تو یہ سمجھا کہ میرزا یگانہ کے خیالات محدود ہیں،
محاورہ بازی کر لیا کرتے ہیں۔
لاحول ولاقوۃ! مگر "محاورہ بازی" بھی ایک قدرتی جوہر ہے
ہر ایک کے بس کی بات نہیں ؎

لپٹتی ہے بہت یاد وطن جب دامن دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے
نہیں معلوم کیا لذت اٹھائی ہے اسیری میں
دل وحشی بھڑک اٹھتا ہے آواز سلاسل سے
تصور نے دکھایا شاہد مقصود کا جلوہ
اتر آئی ہے لیلیٰ سرزمین دل پہ محمل سے

سرزمین دل پر لیلیٰ خود اتر آئی ہے۔ جل جلالہٗ۔ فرمائیے دل و
دماغ کو تازگی و شگفتگی محسوس ہوتی ہے یا پژمردگی۔ حیات انسانی

واردات وکیفیات رنگا رنگ کا مجموعہ ہے، رنگا ہے چنیں گا ہے چناں جس میں تلخی وشیرینی۔ انبساط وانقباض سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یگانہ کے کلام میں سوز وگداز بہت زیادہ اور بدرجہ کمال پایا جاتا ہے۔ (اگر یہ سوز وگداز نہ ہوتا محض انبساط ہی انبساط ہوتا تو میرزا یگانہ ایک سچے شاعر کہے جانے کے مستحق نہ ہوتے کیونکہ حیات انسانی کی ترجمانی محض تصویر انبساط سے مکمل نہ ہوتی) مگر یہ سوز وگداز وہ ہے جو مردوں کے شایاں ہے پست ہمتوں کی نالہ وزاری نہیں ہے۔ وہ ناکامی جس سے ہمت ومردانگی کے جوہر مٹنے کی بجائے اور زیادہ نشو ونما پاتے ہیں۔ وہ ناکامی جو آئندہ کی کامیابی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ وہ ناکامی جو میرزا یگانہ کو اپنے جادۂ مستقیم سے پیچھے نہ ہٹا سکی۔ آگے ہی بڑھتے گئے جس کا زندہ ثبوت غالب شکن ہے ؎

ناخدا زمن بگزر سوئے دیگراں بنگر

کازین بدریا در افگنت و پا زدن تنہا

بھلا ناکامی وبیکسی ایسے اولوالعزم افراد کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ ہولناک ماحول میں بھی دل اتنا قوی ہے کہ خوف وہراس کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ ہمت وغیرت یہ کہتی ہے کہ ناخدا ہٹ جا میرے پاس سے۔ دوسرے کی خبر لے۔ چھوڑ دے مجھے تنہا تلاطم میں ہاتھ پاؤں مارنے دے۔ ایسے نازک وقت میں بھی، ناخدا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بجائے دوسروں کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت کرتے ہیں۔ عالی حوصلگی وخود اعتمادی، ایثار وہمدردی کا جذبہ ایسے وقت میں بھی کام کر رہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے عالی حوصلہ انسانوں کی ناکامی بھی خود غرضوں کی کامیابیوں سے ارفع واعلیٰ ہے۔ طوفان بغاوت کا مقابلہ کرنا۔ اپنی اولوالعزمی کا امتحان لینا، ابنائے زمانہ کی حاسدانہ ومخاصمانہ طاقتوں کو آزمانا یگانہ کی عملی زندگی ہے۔ اپنا بھی امتحان کر لیا اور مخالفین کا زور بھی آزما لیا Pessimism. میں بھی... Optimism. کا پہلو نکال لیا۔ ابنائے زمانہ نے یگانہ کی ذہنیت کو ان کے مرکز خاص سے ہٹا کر اپنے معیار پر کھینچ لانے، ان کی ہمتوں کو پست کر دینے کی امکانی تدبیریں کیں تو سہی مگر تمام مشکلوں کو ٹھکراتے ہوئے آگے ہی بڑھتے گئے (غالب پرستی کے دور میں غالب شکن سا شورش انگیز رسالہ لکھ دینا کیا آسان تھا؟) اور ادبی دنیا میں اپنی طرز زندگی کی قابل تقلید مثال پیش کر کے ترانہ اور آیات وجدانی جیسے کلاسیکل آرٹ کا اضافہ کر دیا۔ اقتصادی ناکامیوں کے باوجود اپنے ادبی مشن میں کامیاب رہنے کی زندہ مثال یگانہ کی شخصیت ہے ؎

ہیں کہاں اور کہاں کے پست وبلند

ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک!

بولو جے میرزا یگانہ کی

پھڑک اٹھے چچا میاں تہ خاک!

(۴) "ان کی شاعری کے مضامین وخیالات محدود ہیں مگر انداز بیان سے تکرار خیالات کو تازہ کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔"

مولانا کی رائے سچ اور جھوٹ کی معجون مرکب ہے۔ تکرار خیالات اور تکرار شعر میں بڑا فرق ہے۔ ایک خیال اگر پانچ سات اشعار میں مکرر نظم ہوا ہے تو اس ایک خیال کے ساتھ مختلف اشعار میں اور کچھ خیالات بھی ہیں یعنی مکرر اور غیر مکرر خیالات کے مجموعہ سے ایک شعر دوسرے سے یقینی مختلف ہے یعنی ایک مکرر خیال کا حامل ہونے کے باوجود ہر شعر اپنی ایک مستقل ہستی رکھتا ہے۔ یہ تکرار خیال ویسی ہی ناقابل لحاظ ہے جیسی میر وغالب کے ہاں۔ یہ بحث ایک جداگانہ مضمون چاہتی ہے۔ مکرر دمنشا یہ خیالات کے اشعار کو خارج کر دیجئے۔ اس کے بعد دیکھئے گا تو اچھوتے مضامین آرٹ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اس کثرت سے بیسویں صدی کے کسی غزل گو کے ہاں نہ ملیں گے۔ اس دائرۂ بحث سے قومی وسیاسی ومذہبی نظمیات کے ڈھول ڈھمکے باہر ہیں۔

مولانا نے یہ عجیب الٹی بات کہی کہ میرزا یگانہ کے ہاں خیالات محدود ہیں۔ اے سبحان اللہ۔ وہی مختصر سا مجموعہ آیات اور وہی مختصر سا ترانہ جو بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے تازگی وشگفتگی مضامین۔ حکیمانہ ودردمندانہ حقائق زندگی۔ مردانہ وشریفانہ آئیڈیل اور حسن عمل کا حیرت انگیز مرقع ہے (شاعروں کو وجد میں لانے والا اور نقالوں کا جی چھڑا دینے والا) اسی سے انکار کیا گیا ہے۔ اس انکار عظیم پر پبلک کی ادبی ترقی جتنا ناز کرے بجا ہے۔

میرزا غالب کے ہاں مکمل آرٹ کے نمونے چالیس پچاس یا زیادہ سے زیادہ ایک سو اشعار ہیں۔ برخلاف اس کے

یگانہ کی آیات وجدانی میں ایسے مکمل اشعار کی تعداد تین سو سے کم نہیں یعنی غالب سے سہ چند - اور ترانہ کا تو کسی سے تقابل ہی بیکار ہے کیونکہ اردو میں اس آرٹ کا جواب ہی نہیں - اس پر بھی کوئی انکار کرے تو وہ جانے اور اس کا ضمیر!

(۵) "ان کا خیال ہے کہ میرا کلام اگلی صدی کے لوگ سمجھیں گے -

میری رائے میں یہ اپنے متعلق حسن ظن ہے یا اس صدی کے لوگوں سے سوءِ ظن - کیونکہ ان کے کلام میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی یا یوں کہہ لیجئے کہ اسقدر آسمان پیما رفعت نہیں ہے کہ اگلی صدی کے لوگ جو مریخ والوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائینگے ان کی رفعت کا اندازہ کر سکیں گے -"

مولانا کی یہ رائے اگرچہ یگانہ پر طعن و تشنیع کی نیت سے ہے مگر اس میں بھی یگانہ کی مدح کا پہلو نکل آیا جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا - آپ کے نزدیک میرزا یگانہ کے کلام میں پیچیدگی نہ ہونا گویا اس بات کی دلیل ہے کہ حقائق و معارف کی بلندیوں، آرٹ کی نزاکتوں اور گہرائیوں سے خالی ہے - جو منتہائے کمال ہے وہی گویا آپ کے نزدیک دلیل نقص ہے - حقایق بلند پہ اس آسانی سے تصرف کرنا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی - پتھر کو پانی کر دینا آپ کی نگاہ میں کوئی کمال نہیں ہے - میرزا یگانہ ابھی کلام کو پیچیدہ بنا سکتے تھے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے مگر پیچیدگی اسی کے کلام میں ہو گی جس میں تصرف کی قابلیت نہ ہو - جس کی نظر تو حقائقِ عالیہ تک پہنچ سکے مگر یارا اسے بیان نہ ہو - کج مج زبان ہو سے

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے

کیا حکم لگایا جائے گا اس شعر پہ - عامیانہ مضمون ہے یا حکیمانہ؟ دیکھنے میں سیدھا سادہ - کوئی پیچیدگی نہیں - یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نظم ہے - مگر کتنی بڑی حقیقت کا مرقع ہے - ختم سفر - فکر کی بلندی - حوصلہ کی پستی پیش پا افتادہ باتیں ہیں جن سے ایک عامی بھی واقف ہوتا ہے - مگر ان حقیقتوں کے باہمی ربط و تقابل سے فکر بلیغ نے کتنا اہم نتیجہ نکالا ہے - سفر ختم کیوں نہیں ہوتا اس کا سبب قریب تو یہی نظر آئے گا کہ حوصلہ کی پستی ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانا گویا ایک منزل طے کرنا ہے - سبب بعید یہ کہ حوصلہ کی بلندی بھی سفر کو ختم نہیں ہونے دیتی - منزل پہ منزل مارنے کے بعد بھی نئی نئی راہیں نئی نئی منزلیں نکلتی آتی ہیں اور حوصلہ عالی آگے ہی بڑھائے لئے جاتا ہے - کیا یہ شاعری محدود خیالی و تنگ نظری کی دلیل ہے - مولانا نے یہ بات کہی تو طعن و تحقیر کی راہ سے کہ شاید مریخ تک پہنچ جانے والے میرزا یگانہ کے کلام کو سمجھ... سکیں گے مگر فی الحقیقت ان کی زبان سے یہ کلمہ تحسین نکل گیا کیونکہ اس شعر کی حقیقت کبریٰ کا زیادہ صحیح اندازہ انہیں لوگوں کو ہو سکے گا جو مریخ تک پہنچ جائیں گے - وہاں پہنچنے کے بعد بلند سے بلند تر منزلیں سامنے آتی جائیں گی تو اس وقت یگانہ کی بلندیٔ فکر کی قدر کریں گے - سادگی و پرکاری کے صحیح مفہوم سے جو لوگ آشنا ہیں انہیں یہ صفت کلام یگانہ میں سر سے پاؤں تک نظر آئے گی مگر ایک ناواقف یا منکر جو کلام کی سادگی و پرکاری کو حسن نہیں بلکہ عیب سمجھتا ہے (کیونکہ یہاں کوئی گنجلک کوئی پیچیدگی ہی نہیں) یہ کہہ دیگا کہ میرزا یگانہ کی شاعری کیا؟ وہ تو فقط نثر کو نظم کر دیتے ہیں - بے شک ایسے لوگوں کی نگاہ میں سچے آرٹ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی -

A True art must Suffer.

منزل ہی نہیں کوئی ٹھہرنے کے لئے
عالم عالم ہے سیر کرنے کے لئے
ہر پست و بلند ہے گزرنے کے لئے
یہ پاؤں ہیں کیا زمیں پہ دھرنے کے لئے؟

کلام میں کوئی پیچیدگی - کوئی خامی نہیں - سیدھے سادے برجستہ انداز سے کام لیا گیا ہے - مگر مریخ تک پہنچنے والے اس شعر کی حقیقت معنوی کو سمجھیں گے کہ واقعی ہر پست و بلند گزرنے - عالم عالم سیر کرنے کے لئے ہے ٹھہرنے کے لئے تو کوئی منزل ہی نہیں - عالم کا ذرہ ذرہ معرضِ انقلاب میں ہے - ایک آرٹسٹ کو اس طنز آمیز بلاغت (یہ پاؤں ہیں کیا زمیں پہ دھرنے کے لئے؟) پر وجد آئے گا مگر ایک منکر ناک بھوں... چڑھائے گا -

(رباعی)

منزل کا پتا ہے نہ ٹھکانا معلوم ؛ جبتک نہ ہو گم - راہ پہ آنا معلوم
کھو لیتا انسان تو کچھ پاتا ہے ؛ کھویا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم!

کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی خامی نہیں، کوئی جھول نہیں، نہ غالب کی دیوزاد زبان نہ اقبالی اردو۔ منکر کی نگاہ میں محض پیش پا افتادہ روزمرّہ اور محاورہ بازی کے سوا اور کیا رکھا ہے۔ مگر ایک فلاسفر ایک آرٹسٹ کی نگاہ میں فلسفیانہ آرٹ کا حیرت انگیز مرقع کمال ہے ناقابلِ تقلید۔ جس کی مثال اگلے اساتذہ کے ہاں سے بھی پیش کرنا ناممکن۔ ہاں معاصرین دیکھا دیکھی نقالی کی کوشش کریں تو ایک طرح کی خوشہ چینی ہوگی!

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا!

بلاشبہ مریخ تک پہنچنے والے اس حقیقت کبریٰ کو زیادہ واضح طور پر سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ جو جتنا بلند ہوتا ہے اتنا ہی اس پر پستی کا زور چلتا ہے، کشش پستی کا اثر بلندی کے اعتبار سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ شعر کا یہ رُخ تو ایک سائنٹفک حقیقت کا مظہر ہے۔ مگر علم اخلاق کے تحت بھی اس شعر کی حقیقت کو جانچنا چاہیئے۔ دنیائے دنی ان بزرگواروں کو زیادہ طاقت کے ساتھ اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے جو عام سطح سے زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ شیطان اپنی طاقت انہیں لوگوں پر زیادہ صرف کرتا ہے جن میں اخلاقی قوت زیادہ ہوتی ہے جبھی تو بعض اوقات پیغمبروں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں مگر اپنی قوت مدافعت کی بدولت سنبھل جاتے ہیں۔ چہ خوش ایسے مضامین عالیہ شعریت کے سانچے میں ڈھلنے کے بعد محدود ٹھہرائے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میرزا یگانہؔ اردو کے شاعر ہیں، اردو زبان میں کہتے ہیں۔ غالب یا اقبال کی ذبان میں نہیں کہتے۔ ٹھیٹھ زبان برتنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ آرٹ کا کمال بھی نقص نظر آنے لگا۔ یہ ہوئی اردو کی ترقی! کیا یہی مفہوم کسی اور نے اس سادگی و پُرکاری سے بیان کیا ہے؟ مگر شرط یہی ہے کہ شعر کے جواب میں شعر پیش کیا جائے اسی مضمون پر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کسی نے تک بندی کی ہے یا معاصرین میں سے کسی نے اس شعر سے مضمون اڑا کر دوسرے لفظوں میں کچھ کہہ لیا تو اس کی سند نہیں۔

گزر کے آپ سے ہم آپ تک پہنچ تو گئے
مگر خبر بھی ہے کچھ پھیر کھائے ہیں کیا کیا؟

واقعی مریخ تک پہنچنے والے داد دیں گے کہ ان کے مراحل و منازل دشوار کی خبر ایک خاک نشین شاعر کو کیوں کر ہوگئی۔ پیش کیجئے متقدمین کے کلام سے اس کا جواب اگر ممکن ہو، مگر شرط یہی ہے کہ اتنا ہی مکمل، اتنا ہی سادہ و پُرکار ہو۔ نمائشی تکلفات قابلیت کی دلیل نہیں بلکہ فریب کاری ہے۔

دکھا دے خاک کے پتلوں میں زور کتنا ہے
ہوا پہ تیر چکا اب زمیں میں دھنستا جا

اس شعر کی لذت وہی لوگ جان سکتے ہیں کہ مریخ تک پہنچنے کو تو پہنچ گئے مگر ایسے لڑکھڑائے کہ زمین میں دھنستے چلے گئے۔ دیکھو طعن و طنز نے کلام میں کس غضب کا زور پیدا کر دیا ہے۔ خاک کے پتلوں سے خطاب ہے کہ ہوا پہ تیرتے تیرتے مریخ تک تو پہنچ گئے۔ اپنی عقل و حکمت اپنی مشین کا زور تو دکھا چکے اب ذرا زمین میں دھنس کر تو دکھاؤ کہاں تک جا سکتے ہو؟ آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے (قافیہ ردیف کی دشواریوں کے ساتھ) جس کی ہوا بھی اساتذہ کو نہیں لگی۔ پیش کریں کوئی صاحب اس کا جواب۔ مگر شرط یہی ہے کہ شعر کے جواب میں شعر پیش کیا جائے محض بامعنی تک بندی یا کلام موزوں کی سند نہیں۔

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

اس شعر کی حقیقت اسی پر کھل سکتی ہے جو آفات ارضی کے ہاتھوں تحت الثریٰ کو پہنچ گیا ہو۔ ایک ماہر طبقات الارض بھی (اگر کچھ ذوقِ سخن رکھتا ہے) اتنا سمجھ سکتا ہے کہ غزل کی زبان میں شاعر نے سائنٹفک حقیقت کو کس حسن کس زور شور سے بیان کیا ہے۔ زمین کی ایک کروٹ (زلزلہ) نے کیا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ دنیا تلے اوپر ہوگئی ہے، وہی خاک کے پتلے جو زمین کو روندا کرتے تھے سنتے اندر سما گئے۔ وہی پاؤں کی خاک سر پہ آگئی (زبان کی سادگی و پرکاری کی تو اب قدر و قیمت ہی نہیں رہی اس کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔) صوبہ بہار کے زلزلے کے متعلق ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ زمین شق ہوئی اور ایک شخص اندر سما گیا۔ مگر فوراً ہی پانی نے اسے اوپر پھینک دیا۔ نکل تو آیا زندہ مگر اتنی ہی دیر میں آدھ مُوا ہوگیا۔ اس سے کوئی پوچھتا۔ وہی بتا سکتا کہ زمین کا کروٹ بدلنا اور پاؤں کی خاک کا سر پہ آنا فی الحقیقت کیا ہے۔ اتنا مکمل اتنا حیرت انگیز آرٹ اتنا حسین، اتنا شگفتہ شعر [illegible]وں کی شگفتگی اور ہے شعر کی شگفتگی

خداوندانِ مجاز

یہ افسانہ نہیں بلکہ ایک روسی کی خود نوشت سرگزشت ہے۔ جسے قارئین "شاہکار" کے ملاحظہ کے لئے انگلش سے ترجمہ کیا ہے۔ نام فرضی ہیں۔ امید کہ ناظرین کرام اسے پسند فرمائیں گے۔ کیونکہ "حقیقت بناوٹ سے زیادہ پُر اثر ہوتی ہے"! (یزدانی)

میں ۱۸۹۰ء میں ماسکو کے مضافات میں مرفع الحال والدین کے گھر پیدا ہوا۔ میرے والد مقامی یونیورسٹی میں کلاسیکل زبانوں کے پروفیسر تھے۔ مطالعہ سے اشتیاق و محبت مجھے اُن سے ورثہ میں ملی تھی۔ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ ناقابلِ فہم چیزوں کی تشریح و تفہیم کا مجھے ابتدا ہی سے بیحد شوق تھا اور جب تک میں اُن کی تہ تک نہ پہنچ جاتا مجھے چین نہ آتا تھا۔

جوانی کے عمومی اثراتِ عشرت مجھ پر چنداں اثر انداز نہ ہوئے تھے۔ جہاں میرے ہم عمر لڑکوں نے اپنی تمام توجہات ورزشی اور فوجی کھیلوں پر مرکوز کر رکھی تھیں میں اعلےٰ حساب اور کیمسٹری کو ازبر کرنے میں ہمہ تن محو تھا۔ میں نے دوست بنانے کی کوئی کوشش کی نہ دوست بنایا گیا۔ اپنے ہمسایوں اور ساتھیوں کے لئے میں ایک "عجیب ہستی" تھا۔

ماسکو میں اس وقت صرف ایک ہی کام "جنٹلمینوں" کے شایانِ شان سمجھا جاتا تھا، یعنی فوج۔ لیکن میں نے فوجی ملازمت کی ایک پیشکش کو خود ٹھکرا دیا اور اس وقت سے میرا "عجیب ہستی" ہونا امر یقینی ہو گیا۔

مجھے جھوٹی نمائش سے سخت نفرت تھی۔ میرا شباب مسرتوں سے معمور تھا۔ کیونکہ میں فطرتاً ہم عمر و ہم مکتب طلبہ کی گہری دوستی سے محروم رہا۔ اس کا نتیجہ بھی میرے حق میں نہایت اچھا رہا اور میں نے اپنی لیاقت و مستعدی سے یونیورسٹی سکالرشپ حاصل کر لیا اور اس کے ساتھ ہی لیبارٹری ریسرچ میں بھی کافی شہرت حاصل کر لی۔ اعلیٰ تعلیمی اعزاز کے بعد مجھے "بیورو آف سائنسز" میں جسے زار کی سرپرستی حاصل تھی نہایت آسانی سے ریسرچ کی آسامی مل گئی۔ کبھی کبھی معزز و مدعو ونہ [illegible]یوں کا چکر لگایا کرتے تھے اور سائنس و سائنسدان حضرات کے متعلق سوال دریافت کیا کرتے تھے۔ میں ایسے مواقع پر عموماً اپنے آپ کو اسقدر مشغول

[illegible]

ظاہر کرتا تھا کہ وزیٹر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ معزز شرفا کے گروہ سے الگ ہو کر میری محویت میں مخل ہوئی، تو میں حیران و ششدر سا رہ گیا۔ نیم مدعیانہ و نیم ملتجیانہ تبسم کے ساتھ اس نے دریافت کیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا جواب شش و پنج اور پریشانی کا عجیب و غریب مرقع تھا۔ تاہم اُس کا نمایاں خلوص میرے لئے وجہ تسکین تھا۔ یہ امر نہایت تعجب انگیز ہے کہ میری ہچکچاہٹ دفعتاً غائب ہو گئی اور پانچ ہی منٹ میں ہم دیرینہ محبوں کی طرح محوِ گفتگو تھے۔ تمام عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ میری خصوصیت خاموشی و کم گفتاری چکنا چور ہو کر رہ گئی۔ چونکہ اس کے ہمراہی واپس جا رہے تھے وہ دوبارہ جلد از جلد ملنے کا وعدہ کر کے تیزی سے اُن کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں اسقدر مسرور تھا کہ اس شام کوئی کام نہ کر سکا۔ مجھے کیا ہو رہا تھا۔ کیا میں محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ میری زندگی نے آخر کار عملی و ذہنی دولت و فراغت حاصل کر لی ہو؟

میں نے خفیہ طور پر معلوم کر لیا کہ میرا خوبصورت ممتحن جنرل "الیقان چیکوف" کی دختر "نستاشیا" تھی۔ جنرل اپنے تمول اور زار کی توجہاتِ خصوصی کے باعث "بیورو آف سائنسز" کا ڈائرکٹر مقرر ہونے والا تھا۔ اس خبر نے مجھے امید و بیم اور یاس و مسرت کی عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ مسرت اس لئے تھی کہ بیورو کے ڈائرکٹر کی لڑکی ہونے کے باعث "نستاشیا" اکثر لیبارٹری میں آزادانہ آتی رہے گی اور مجھے شرفِ ملاقات حاصل ہوتا رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی

یہ خیال سوہانِ رُوح تھا کہ کیا مجھ ایسا غیر معروف سائنسدان ایک معزز خاندانی دوشیزہ کی محبّت حاصل کر سکتا ہے؟ اگرچہ ہمارا خاندان بھی کافی معزز تھا، لیکن ہمیں شاہی محفلوں میں بار نہ تھا اور ہمارے درمیانہ اقتصادی حالات ہمارے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

ان تمام وجوہ کے باوجود میں نے اس کی محبت جیت لی۔ دراصل میں نے یہ میدان اسی روز سر کر لیا تھا جس دن اس نے میرے دل پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جب بے تکلفی انتہا کو پہنچ گئی۔ تو قدرتاً ہمیں شادی کا خیال آیا۔ میں نے اس کے والد کے اعتراضات کا خدشہ پیش کیا اور "لستاشیا" نے بھی میری تائید کی۔ لیکن محبت نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم یہ معاملہ جنرل (لستاشیا کے والد) کے سامنے پیش کر دیں۔

پہلے پہل تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ میں واقعی اس کی لڑکی سے شادی کی درخواست کر رہا ہوں وہ غیر متیقن تھا اور پھر کچھ غیر سنجیدہ۔

"تمہاری تنخواہ بمشکل میری بیٹی کی دو خادماؤں کی کفیل ہو سکتی ہے۔" جنرل نے کہا۔ "لیکن لستاشیا اپنے تمام غیر ضروری عیش و عشرت کے لوازمات ترک کر دینے پر آمادہ ہے!" میں نے جواب دیا۔

"تم ایک بے عمل وہمی ہو!" اس نے گرجتے ہوئے کہا۔ "اپنے بے نتیجہ تجربات کے علاوہ کچھ کرنے کے ناقابل۔ اگر میں آج تمہیں برخواست کر دوں تو تم مارے فاقوں کے مر جاؤ۔ میرا جواب "نہیں" میں ہے۔

اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ تم اعلیٰ خاندان سے ہو اور تمہاری پیدائش اچھی ہے تو اصل صورت حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، تمہارے پاس دولت ہے نہ تم پیدا کر سکتے ہو۔ لیکن کہیں میرے الفاظ سے غلط معنی نہ سمجھ لینا۔ میں کسی نوجوان کو صرف اس لئے ناقابل نہیں کہتا کہ وہ غریب ہے۔ میں خود بھی ایک وقت غریب رہا ہوں، لیکن جو چیز میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے وہ غربت پر قناعت کر لینا ہے۔"

میں نے احتجاج کی کوشش کی لیکن جنرل نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:-

"اس مذمت کی کوئی ضرورت نہیں، اگر تم اپنی غربت پر قانع نہ ہوتے تو گزر اوقات کے لئے لیبارٹری ہی میں پڑے رہتے؟ تم یقیناً ایک بے عمل وہمی ہو۔ حکومتوں نے تو ایسی انسٹیٹیوشنیں بنانے کا شغل جاری کر رکھا ہے۔ یہ بات ایک حد تک قابلِ تعریف بھی ہے اور ان میں بعض ایسی ہستیاں بھی ہیں جنہیں لامحالہ دادِ تحسین ادا کرنا پڑتی ہے، لیکن وہ کبھی بہترین اور پر اسپکٹو داماد نہیں بن سکتے (وقفہ کے بعد اس نے کہا) جب تم ایک شاندار قسمت کے مالک نہیں۔ نہیں بلکہ بذاتِ خود مجسمۂ قسمت بن جاؤ تو میرے پاس آنا۔"

"ہاں تو آپ کے نزدیک دولت ہی سب کچھ ہے!" میں نے قدرے درشتی سے کہا:-

"دولت یا دولت حاصل کرنے کی اہلیت" اس نے کہا۔ "جو چیز تم میں بدرجہ اتم ہونی چاہیئے وہ عمل ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے میں نے امارت اور خوش بختی حاصل کی ہے اور اسی طاقت سے میں اور امارت حاصل کر سکتا ہوں۔ اور کوئی ہستی اسے مجھ سے چھین نہیں سکتی۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں خیال و عمل کے لحاظ سے اس قدر ٹھوس اور مکمل ہوں جس قدر ریکس اور تم اس قدر کمزور ہو جتنا میں تصور کر لوں۔

اس لمحہ سے تمہاری اور لستاشیا کی ملاقات ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اچھا "الوداع" جنرل کا حکم قانون تھا۔ اس کے اس "الٹی میٹم" کے بعد میں ایک دفعہ لستاشیا سے ملا وہ بھی صرف چند لمحوں کے لئے اور ہم ایک دوسرے سے پیمانِ محبت استوار کرنے کے بعد باچشمِ گریاں علیحدہ ہو گئے۔

چند روز بعد لستاشیا کو سوئٹزرلینڈ بھیج دیا گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ جنرل نے یہ صرف اس لئے کیا ہے کہ ہم آپس میں نہ مل سکیں کچھ عرصہ بعد اس کی شادی ایک جارجین پرنس سے کر دی گئی اور جنرل نے عزت و شہرت کے ساتھ بے پایاں دولت بھی حاصل کر لی۔ لستاشیا نے شادی سے ایک دن قبل مجھے ایک درد و یاس میں ڈوبا ہوا مکتوب بھیجا۔ ہم دونوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ لیکن افسوس کہ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

صرف ایک چیز جس نے مجھے مایوسانہ تباہی و بربادی سے بچا لیا وہ انہماکِ شغل تھا۔ میں نے اپنی مصروفیت میں سہ چند اضافہ کرلیا اور اپنی بیداری کا ایک ایک لمحہ انتہائی محنت میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ چھ ماہ کی مدت میں میں نے ایک ملاوٹی دھات بنانے کا طریقہ دریافت کرلیا جس سے عملاً تھوڑے ہی عرصہ میں ایک سخت ترین دھات بنائی جاسکتی تھی۔ آئندہ شش ماہی میں اسی اصول پہ میں ایک اور دھات تیار کرنے کے قابل ہوگیا۔ جو اوّل الذکر میں سوراخ کرسکتی تھی۔ اگرچہ یہ ایک نیا فارمولا تھا۔ تاہم اس سے تیار شدہ دھات آجتک دریافت شدہ (مروجہ) "سخت ترین" دھات کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ اب مجھے اپنے ارادوں میں کامیابی یقینی نظر آنے لگی۔ لیکن جنگ نے میری مساعی و تجارت میں رکاوٹ پیدا کردی۔ میں اور میرے تمام ہم پیشہ ساتھی اسلحہ جنگ تیار کرنے پر لگا دیئے گئے۔ یہ ایک دھکا دینے والا کام تھا۔ جس نے میرے دل میں ایک سوزش پیدا کردی

جنگ کے بعد ہی ابتری، قحط اور انقلاب رونما ہوئے۔ کسی بنا پہ مجھے بھی روسیائے جدید (نیو رشیا) کا دشمن تصور کر لیا گیا اور چند بار تو میں اسی شبہ میں قتل ہوتے ہوتے بچا اور بالآخر پناہ گزین مہاجر کی حیثیت سے انگلستان جا پہنچا۔

نتاشیا اور اس کے شہزادے کے متعلق جو مجھے آخری خبر مل سکی یہ تھی کہ وہ بحفاظت فرانس پہنچ گئے ہیں۔

روس کے مقابلہ میں انگلستان کی دنیا ہی الگ تھی۔ مجھے لندن کی ایک لیبارٹری میں معمولی ریسرچ کا کام مل گیا۔ میں نے فالتو وقت میں مجوزہ دھات کے متعلق اپنے تجربات شروع کئے اور آخر کار میری توقعات کے مطابق وہ دھات تیار ہوگئی۔ ایک ناواقف شخص شاید میرے جذبات کا اندازہ نہ لگا سکے۔ لیکن مجھے اس تکمیل پر جو ناقابلِ بیان مسرت ہوئی اس کا مقابلہ صرف اسی خوشی سے ہوسکتا ہے جو مجھے نتاشیا سے محبت کے بعد یہ معلوم کرکے ہوئی تھی کہ اسے بھی مجھ سے محبت ہے۔ میری سالوں کی مساعی کے اس کامیاب نتیجہ نے میری زندگی اور امنگوں کا نیا دور شروع کر دیا اور میرے مستقبل کا تاریک پہلو یکسر جگمگا اٹھا۔

اگرچہ میں نے آج سے پہلے [illegible] بات کا کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔ لیکن اب مجھے یکایک احساس ہوا کہ میری یہ دریافت دولت کی چابی ہے۔"

میں ایک مشہور کمپنی کی لیبارٹری میں گیا۔ لیکن ایگزیکیٹو اور دیگر سائنسٹ حضرات نے میرے متعلق شک و شبہ اور بے اعتمادی کا اظہار کیا جب تک کہ میں ان کی آنکھوں کے سامنے ثبوت مہیا نہ کروں۔ چنانچہ تجربہ ہوا اور میں نے اپنی تیار کردہ دھات سے ان کی مروجہ سخت ترین دھات میں سوراخ کردیا اور اس طرح دو ہفتے کے عرصہ میں پانچ ہزار پونڈ رقم کا مالک بن گیا۔

غربت کے بعد اس اچانک ترقی نے مجھے سشدر کردیا اور میں دیر تک نہ سوچ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

معمل (لیبارٹری) میں کام کرنے والے ایک دوست نے "شاندار دعوت" کا مشورہ دیا۔ جسے میں نے نرم باتوں ہی ایک دلی مسرت سے قبول کرلیا۔ یہ چیز میرے لئے بالکل نئی اور عجیب تھی۔

میں نے ایک روسی ریسٹورنٹ میں دعوت کا انتظام کیا اور لیبارٹری میں کام کرنے والے عملہ، دوستوں، ان کی بیویوں اور اپنے تمام روسی احباب کو مدعو کیا۔ پارٹی نہایت شاندار تھی ووڈکا (Vod KA) کے روح نواز ٹوسٹ نوشِ جان کرنے کے بعد جنہوں نے ہماری مسرت میں بعید اضافہ کیا ہم نے اپنے خوانِ زندگی (Feast Of Our Lives.) کی مرتبہ فہرست طعام کو دیکھنا شروع کیا، مجھے وہم سا ہو رہا تھا کہ میرے پاس ہی ایک ویٹرس کھڑی ہے میں نے (Bortsch) لانے کا حکم دیا اور اس کے خدوخال کو دیکھا تو وہ بعید مانوس معلوم ہوئے۔ اس قدر مانوس کہ میں انہیں تمام عمر نہ بھول سکتا تھا۔ اچانک میرے منہ سے نکلا "نتاشیا"!

وہ واقعی نتاشیا تھی اور میرے سامنے کھڑی نیم متبسمانہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے جواباً حسبِ معمول آہستہ سے میرا نام پکارا، میں تمام مجمع کو جو میری حرکات سے تقریباً معاملہ کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ ذہن سے محو کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا اور نہایت بلند آواز میں کہا۔ "ہمیں کہیں تنہائی میں چلنا چاہیئے، جہاں اطمینان سے گفتگو کرسکیں۔"

لیکن نتاشیا نے ہچکی لیتے ہوئے کہا "میں کام چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔"

"جہنم میں گیا کام" میں نے کہا۔ "اب تمہیں کسی کام کی ضرورت

نہیں۔"

بہرحال اس نے مینیجر سے اجازت طلب کی اور ہم نے ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر ڈرائیور کو کسی اچھی جگہ چلنے کا کہا۔ میرا دل اسقدر زور سے دھڑک رہا تھا کہ گاڑی کے انجن کا شور بھی اس کے شور سے کم تھا

نستاشیا کی سرگزشت ایک پُردرد افسانہ تھی، وہ اور اس کا شہزادہ پیرس میں کامیاب اور فارغ البال زندگی بسر نہ کر سکے۔ وہ دو بچوں کے والدین بن چکے تھے اور شہزادہ ان کی رہائش و آسائش کے لئے کوئی کام حاصل نہ کر سکا۔ آہستہ آہستہ تمام جواہرات بھی جو "نستاشیا" کسی نہ کسی طرح روس سے اپنے ہمراہ لائی تھی اقتصادیات اور کفایت شعاری سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بہت جلد خرچ ہو گئے، شہزادہ اتنا بُرا نہ تھا لیکن وہی "بےعملی اور ناتجربہ کاری" درپیش تھی۔ انتہائی مایوسی کی حالت میں نستاشیا نے آخری پسماندہ رقم لندن تک آنے میں خرچ کرنا بہتر خیال کیا۔ یہاں شہزادہ ایک جگہ شوفر ہو گیا۔ لیکن چند ہی روز میں یہ ملازمت ہاتھ سے جاتی رہی۔

نستاشیا، اکیلی نستاشیا کو۔ اپنے، اپنے خاوند، بچوں اور بوڑھے ماں باپ کے اخراجات کا بار اٹھانا پڑا۔ نہایت معمولی مشاہرہ پر وہ اس ہوٹل میں ویٹرس کی حیثیت سے ملازم ہو گئی۔ بیچاروں کو اکثر فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ بچوں کی پرورش ضروری تھی۔ جنرل "الفان چیکوف" برگشتہ خیال بدگو اور چڑچڑا بڈھا ہو گیا تھا اور اپنی زندگی کے آخری نیم فاقہ کش سال گزار رہا تھا اور اپنی برگشتگیٔ تقدیر پر آنسو بہانے کے ساتھ ہی کمیونسٹوں کو بےعمل وہمیوں کے گروہ سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔

"میں اب کافی دولتمند ہوں، میں نے کہا اور۔۔۔"

"اچھے اور مہربان بھی" نستاشیا نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "لیکن میں تمہاری اس خیرات کو قبول نہیں کر سکتی، خصوصاً۔۔۔۔"

"لیکن یہ خیرات نہیں ہے۔ میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"بلکہ یہ تو تمہاری رہائش کے لئے ایک قسم کی مدد ہو گی۔ کیونکہ میں اکیلا ہوں، مزید برآں اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ تمہاری کوئی خدمت کر سکوں۔ یہ غرور و تکبر کا موقع نہیں۔"

آخر نستاشیا کو ماننا پڑا اور اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اس وقت سے وہ سب میرے پاس ہیں۔ نستاشیا اور اس کے بچے اس لئے کہ مجھے ان سے محبت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ بہ آرام و آسائش زندگی بسر کریں۔ لیکن اس کے آفتاب لبِ بام والد اور خاوند کی مدد صرف ایک فرض کی ادائیگی اور رحم و ہمدردی کے خیال سے کرنا پڑتی ہے۔

یزدانی جالندھری

دو شعر

شبابِ مست ہوا نذرِ یار کیا کہئے ... لٹی بہار میں اپنی بہار کیا کہئے

ہزار دل حسن مری صورتِ جنوں پہ نثار ... پریدہ رنگ کے نقش و نگار کیا کہئے

ک[illegible]ل دت آبر

پندِ پیرِ دانا

حضرت خواجہ حافظ شیرازیؒ کا ناصحانہ کلام

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

حضرت خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام حقیقت التیام صوفیانہ حقائق و رموز کی تشریح و وجدانی کیفیات کا ترجمان خیال کیا جاتا ہے۔ نشہ و سرور میں ڈوبے ہوئے الفاظ، صوفیانہ حُسنِ اسلوب، وجد انگیز بندش، دل نشین تاثرات کی خوش نما تنظیم نے ان کے کلام میں ایک معجز نما تاثیر پیدا کر دی ہے کہ ہر مصرعہ ذہن میں آتے ہی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے میں جب کلام حافظ کا مطالعہ کرتا ہوں تو . . . . . محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پُر اثر جذبہ دل سے اُبھر اُبھر کر ان کیفیات کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہے جو تاثیرِ شعر سے ذہن کو مسرور کرتی ہوئی دل میں سما جانا چاہتی ہیں۔

حافظ کا کلام روح و وجدان کا مجموعۂ گفت و شنید ہے۔ اس کے مصرعہ مصرعہ سے عرفان و حقیقت کی تجلّیاں چھن رہی ہیں وہ عشق و محبت کے دریا میں غوطہ لگا کر زبانِ شعر کو حرکت میں لاتا ہے اس کا کلام ان ہی لوگوں کے ضمیر پہ دامنِ اثر پھیلاتا ہے جو توحید و معرفت کے رموز و اسرار بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ بایں ہمہ اس دریائے کیفیات کے سینہ میں حکمت و بصیرت کے بھی ہزاروں موتی چمک رہے ہیں لیکن ان کی لمعانی سے اس لئے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ناقدین فن نے آج تک حافظ کو صرف ترجمانِ عشقِ الٰہی ثابت [illegible] کی کوشش کی ہے اور ان کے عام فہم شعر کو بھی فلسفیانہ [illegible] سے تصوّف کے کسی نہ کسی مسئلہ پر لا کر چھوڑا ہے۔ ورنہ حافظ ایک قادر الکلام اور جامع الشروط شاعر کی حیثیت سے جہاں نکاتِ تصوف کی تشریح کا حق ادا کرتا ہے وہاں انسانی زندگی کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی ہلکی سی روشنی ڈال رہا ہے۔

اس حقیقت سے تو کسی شخص کو انکار نہیں کہ حافظ اس عشق کے حقائق و معارف کا بوجوہِ تمام شارح ہے۔ جس کی پرورش آغوشِ روحانیت میں ہوتی ہے، لیکن یہ نظریہ حافظ کو شاعرِ کامل کی خلعت عطا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شاعر کامل ان تمام انسانی حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے جو کفِ پا سے لے کر موئے سر تک حاوی ہیں۔ اسی طرح اس کی نگاہ احساسات و کیفیات کی دنیا کا نظارہ کئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ علم و بصیرت کی بنا پر انسانی فطرت کے تمام اندرونی و بیرونی واقعات پر فیصلہ کن بحث کر سکتا ہے۔ وہ اس کیفیت کے اسرار سے واقف ہوتا ہے جو ذی روح اور آمرِ روح کے درمیان ذریعۂ گفتگو ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں ان نگاہوں سے کبھی بے خبر نہیں ہوتیں جو نفسانی خواہشوں کی تحریک پہ قابلِ احترام ہستیوں کو دعوتِ سیہ کاری دیتی رہتی ہیں۔ وہ نظروں کو آئینہ بنا کر اس میں خلوت کی چھپی ہوئی عیش افروزیوں کا عکس دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کے نقائص کی طرف اس کو متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ عقل و فکر کے پر تول تول کر ایسے حکیمانہ نظریات پیش کرتا ہے۔ جن میں اصلاح و تہذیب کی روح پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ تمام خوبیاں حافظ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اس کو صرف تصوّف و الٰہیات کا شارح

قرار دینا بدترین بے انصافی ہے۔ میں دعوے کی تائید میں اپنی طرف سے کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا، کیونکہ

"آفتاب آمد دلیل آفتاب"

حافظ کا کلام ہی حافظ کو شاعر کامل ثابت کر رہا ہے۔ ذیل میں دیوان حافظ سے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جن کا ہر مصرعہ زندگی کی خطرناک راہ میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ جو حضرات سعدیؒ و صائبؒ کے ناصحانہ اقوال کو دلیل راہ بنا چکے ہیں وہ حافظ کے حکیمانہ اور بصیرت افروز اشعار سے بھی اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کریں۔ خواجہ مرحوم فرماتے ہیں:-

(۱) آسائش دوگیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستاں مروت با دشمناں مدارا

فلسفۂ جدید کے نزدیک بہشت، مطمئن زندگی کا دوسرا نام ہے، لیکن اطمینان کی نوعیت اور اس کے ذریعہ حصول کے متعلق زبان فلسفہ سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے افہام و تفہیم کے لئے ہزاروں حلقہ ہائے فکر سے دلائل مانگنے پڑتے ہیں۔ یہ خواجہ مرحوم کی عقل و فکر کا معجزہ ہے کہ انہوں نے نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں ایک ایسی حقیقت پیش کر دی جس کی وسعت ہزاروں صفحات پر حاوی ہے۔

اگر انسان مروت و مدارا سے دوست و دشمن کے دل مٹھی میں لے لینے کی صلاحیت پیدا کرلے۔ تو اس کی توقعات میں خطرہ کی سیاہی کے بجائے اطمینان کی تجلیاں چمکنے لگیں۔ یہ وہ نعمت ہے جس کو "آسائش دوگیتی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور غزل میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

(۲) اے دل بشباب رفتہ نہ چیدی گلے زعمر
پیرانہ سر مکن ہوس ننگ و نام را

زمانۂ شباب میں آفتاب زندگی نصف النہار پر ہوتا ہے اس عمر میں جوانی قواء کو قابو میں رکھنا خوش سیرتی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن آتش افشاں ولولے ضبط و تحمل کا پردہ پھونکے بغیر نہیں رہتے۔ جوش آلودہ امنگیں ہزار مجبوریوں کے باوجود قصر نوجوانی میں شمع ہوس جلا ہی دیتی ہیں۔ اس زمانہ میں جو شخص حقوق اللہ و حقوق العباد کی دیوار نہیں پھاندتا اس پر نفس زہد کو بھی ناز ہے۔ ورنہ بڑھاپے میں تو قوا کی افسردگی ہر انسان کو جبری زہد کی طرف راغب کر لیتی ہے۔ چنانچہ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبریست
وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار

خواجہ صاحب بھی اس شعر میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب جوانی کو جو عمر کا بہترین عملی حصہ ہے لہو و لعب میں برباد کر دیا گیا تو بڑھاپے میں مجبورانہ زہد و ورع کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ خواجہ صاحب قناعت کا سبق دیتے ہیں کہ

(۳) ملک آزادگی و کنج قناعت گنجیست
کہ بشمشیر میسر نشود سلطاں را

دامن امارت جسقدر وسیع ہوتا ہے، اسیقدر ہوس استعمار دل میں بدنیتی کو بھی لا داخل کرتی ہے اس لحاظ سے طماع امیر پر وہ صابر دوست کہ مفلس فوقیت رکھتا ہے جو تھوڑی سے تھوڑی آمدنی پر قناعت کر کے دل کو سکون و اطمینان کا درس دیتا ہے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ دنیا میں وہی انسان آزادانہ سکون سے زندگی بسر کرسکتا ہے۔ جس کی ضروریات محدود ہیں اور خواہشوں میں حرص کی بجائے قناعت کی روشنی ہے۔ لیکن یہ روشنی عام طور پر غریبوں کے جھونپڑوں میں ہوتی ہے۔ امیروں کے محل اس سے محروم ہیں جب تک امراء میں دولت و پیداوار کی صحیح تقسیم کا احساس پیدا نہیں ہوتا جب تک بادشاہ ہونے کی حرص ملک گیری آتش و خون سے چمکتی ہوئی فضا کی تلاش ترک نہیں کرتی وہ گنج قناعت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتے۔ لیکن یہ دولت مفلسوں کے پاؤں پر سجدے کرتی رہتی ہے۔ کیونکہ ان کی ضروریات اور خواہشیں اسقدر وسیع نہیں جن کے پورا کرنے میں قناعت سوز مشکلات حائل ہوں ان کو جو کچھ میسر آجائے وہی ان کی ضروریات کا مرکز تکمیل ہے۔

(۴) حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

اس شعر میں مے نوشی اور رندی کو اس زہد سے بہتر قرار دیا گیا ہے جس کی بنا عوا[illegible] اور ذاتی اغراض کے ذریعۂ تکمیل پر ہے۔ شراب نوشی بدترین [illegible]یں سے ہے۔

رندی و شاہد بازی کرنا حدود اللہ سے متجاوز ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن یہ سیاہ کاری جو نفسانیت کے مقتضا پر کی جاتی ہے۔ اس میں انسان کا ذاتی نقصان مضمر ہے جس کی تلافی اس کو جسمانی یا روحانی صورت میں ایک دن کرنا پڑے گی۔ شخصی گناہ عقوبت و نتائج کے اعتبار سے کتنا ہی خطرناک ہو لیکن اس فریب کاری کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جو سوسائٹی کے مفاد کو انفرادی اغراض کے ماتحت لانے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور وہ بھی خدا کے نام پر، مذہب کے تقدس پر اور قرآنی نصوص کی امداد سے اس قسم کا گناہ جس کی وجہ جواز آیاتِ قرآنی کی غلط تاویلات پر مبنی ہو، اللہ اور کلام اللہ ہی سے روگردانی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس سوسائٹی کے لئے بھی پیغام ہلاکت ہے جو حقیقت قرآن پر ایمان رکھتی ہے۔

خواجہ صاحب کی اس شعر سے یہ مراد ہے کہ شراب نوشی و رندی انفرادی گناہ ہے۔ جس کا خمیازہ بھی ایک ہی شخص کو بھگتنا ہوگا۔ لیکن قرآن کو "دام تزویر" بنانے سے ساری سوسائٹی گمراہ ہو کر عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اوّل الذکر گناہ ثانی الذکر جرم پر بلحاظ نتائج قابل ترجیح ہے۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

(۵) فقیہِ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد
که مے حرام و لے بہ ز مالِ اوقاف است

اس شعر کے معانی و مطالب میں فلسفیانہ حُسنِ کلام کی جھلک پائی جاتی ہے۔ فقیہہ کا ذریعہ معاش مالِ اوقاف تک محدود تھا، اسی مال سے وہ شکم پُری کرنے کے بعد ہجو کرتا تھا۔ اس کو مالِ اوقاف کی تحریم کا خیال نہ تھا۔ لیکن ذاتی فائدہ کے پیشِ نظر اظہار صداقت سے گریز کرتا رہا۔ کل کسی طریقہ سے اس نے شراب پی لی، اور عالمِ مستی میں اس کو اپنے مفاد کا خیال نہ رہا۔ مالِ اوقاف تو اس کا ذریعہ معاش تھا ہی شراب بھی اس نے پی لی۔ اب دونوں چیزوں کی عقوبت کے تصورات پر عقل دوڑانے کے بعد اس نے فتویٰ دے دیا کہ شراب حرام تو ہے، لیکن اوقاف کے مال سے اچھی ہے۔"

فقیہہ مدرسہ نے مستی سے پہلے اس لئے فتویٰ نہ دیا کہ کوئی دنیا پرست احترام شریعت [illegible] لئے ذاتی اغراض کو نظر انداز

نہیں کر سکتا، اس تشریح سے شعر کا تعلیمی پہلو خود بخود سامنے آجاتا ہے ؎

(۶) عیب رنداں مکن اے زاہدِ پاکیزہ سرشت
که گناہِ دگرے بر تو نہ خواہند نوشت

جہاں تک لفظی معنی کا تعلق ہے۔ اس شعر میں کوئی خوبی نہیں جو "حافظیت" کی آئینہ دار ہو، لیکن تعلیمی اعتبار سے شعر کا ہر لفظ اپنے اندر شمع بصیرت روشن رکھتا ہے۔ بر ظاہر ہے کہ زید کے گناہ کا خمیازہ کسی قانون کے مطابق عمرو نہیں بھگت سکتا، لیکن عمرو اگر زید کے گناہوں پر تبصرہ کرتا ہے تو بجائے اصلاح اعمال کے غیبت کا مرتکب ہوتا ہے۔ شعر کا تعلیمی پہلو یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی گناہگار کے ساتھ عقوبت گناہ میں شامل نہیں ہو سکتا تو اس کو لازم ہے کہ گناہگاری پر تنقید کر کے اپنے تکبر کا ثبوت نہ دے۔ اس مسئلہ پر استاد ذوق کا کتنا اچھا شعر ہے۔

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تُو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو

خواجہ صاحب ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

(۷) زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
رند از رہِ نیاز بدار السلام رفت

زاہد کو اپنی پارسائی اور زہد و تقوےٰ پر غرور تھا اور درگاہِ الٰہی میں غرور پسند لوگوں کی رسائی نہیں۔ رند گنہگار تھا لیکن وہ اپنی سیہ کاریوں پر نادم ہو کر عفو و لطف کا طالب تھا۔ درگاہِ الٰہی میں ندامت ہی سے بدکاریوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ شعر کا تعلیمی پہلو یہ ہے کہ انسان کو غرورِ عمل کامیاب نہیں ہونے دیتا۔

(۸) چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر محبّانِ بادہ پیما را

کتنا دلپذیر شعر ہے۔ "یاد رفتگاں" کا درس اس سے زیادہ مؤثر انداز میں نہیں کہا جا سکتا۔

ٹیگور اپنے فلسفیانہ جادوئے بیاں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر چکا ہے کہ دنیا کسی کا ساتھ نہیں دیتی، لیکن خواجہ مرحوم اس مسئلہ کو جس سادہ اور مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

(۹) مجو درستیٔ عہد از جہانِ سست بنیاد
کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

ایک اور جگہ اسی مسئلہ کو دوسرے انداز میں پیش کرتے ہیں

(۱۰) بروانِ خانۂ گردوں بدر دوناں مطلب
کایں سیہ کاسہ در آخر بکشد مہماں را

ایک اور غزل میں ارباب دہر کی بے مروتی کے پیشِ نظر خود اعتمادی کا درس دیتے ہیں ؎

(۱۱) مروت بخانۂ ارباب بے مروت دہر
کہ کنج عافیت در سرائے خویشتن است

اس مفہوم کو دوسرے رنگ میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

(۱۲) حافظا آب رخت بر در ہر سفلہ مریز
حاجت آں بہ کہ بر قاضی حاجات بریم

خود اعتمادی، خود داری اور قناعت کا اس درجہ روشن اور واضح الفاظ میں شاید ہی کسی نے سبق دیا ہو، بلکہ اس مسئلہ کی تمام جزئیات بھی مکمل صورت میں پیش کر دی گئی ہیں۔ یہ ہے کمالِ فن ؎

(۱۳) مباش در پئے آزار ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہی نیست

مذاہب عالم اور اہل اللہ نے گناہ کا جو تخیل مناسب اصلاح کے بعد پیش کیا ہے۔ اس کی روح معنی یہ ہے کہ خدا کے نزدیک وہ سب سے بڑا گناہ ہے جس کی بنا خلق خدا کی دل آزاری پر ہو اسی طرح وہ نیکی بلحاظ جزا تمام نیکیوں سے بڑھ کر ہے جس کے نتائج سوسائٹی کے لئے انفرادی یا اجتماعی طور پر سود مند ہوں، شب زندہ داری، نماز روزہ، تقوے و پارسائی، زہد و عبادت یہ سب افعال انسان کے آئینۂ اخلاق کو منور کرنے اور انسانی زندگی کو سود مند بنانے کا موجب ہیں۔ لیکن اصولی طور پر یہ صرف انسانی سیرت کو روشن کرتے ہیں۔ ان سے خدا کی ذات کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جو شخص غربا کی پرورش اور یتیم کی امداد کرتا ہے ننگے کو کپڑا دیتا ہے بھوکے کو روٹی کھلاتا ہے۔ مظلوم کو پنجۂ ظالم سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے وہ نادانستہ طور پر قدرت کو اس کے فرائض کی ادائیگی میں مدد دے رہا ہے۔ کیونکہ حاجت روائی کی ذمہ داری قدرت پر عائد ہوتی ہے گویا خدمتِ عامہ کرنا خدا کی مدد کرنا ہے۔ اگرچہ اس کی قادریت کسی امداد کی محتاج نہیں، لیکن وہ ان اعمال حسنہ کو بھی مسترد نہیں کرتا جو خلوصِ دل اور حسنِ نیت کی تحریک پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ "خلق خدا کی خدمت کرنے والا ہی سردار قوم ہے۔"

اسی طرح جو لوگ اپنی زندگی کو خلق خدا کے لئے شر محض بنا لیتے ہیں وہ صرف سوسائٹی کے لئے ہی وجہ ننگ نہیں بلکہ قدرت کے فرائض میں بھی ناجائز اضافہ کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے دل آزاری سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ہرچہ خواہی کن ولیکن مردم آزاری مکن

غرضیکہ خواجہ مرحوم نے چند دلپذیر اور مؤثر الفاظ میں گناہ و اکبر کی جو تفصیلی تصویر پیش کی ہے اس کا دامن معنی انسان کے تمام تصورات حسنہ پر حاوی ہے۔ فلسفیانہ حقائق کی اس درجہ سادہ اور مختصر توضیع "شاعری جزویست از پیغمبری" کا روشن ثبوت ہے۔

(۱۴) نزاع بر سرِ دنیائے دوں کسے نہ کند
بآشتی ببر اے نورِ دیدہ گوئے فلاح

جو لوگ پیغمبر اسلام کی مکمل مکی زندگی سے قطع نظر کرنے کے بعد "آہنسا اور شانتی"، کے فلسفہ کی بابت بجائے ٹالسٹائی یا گاندھی کے آئینۂ افکار میں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے خواجہ صاحب کا یہ شعر سرمایۂ استدلال ہے جس کے پہلے مصرعہ میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ دنیائے دوں میں کوئی طالبِ فلاح جھگڑا نہیں چھیڑتا۔ دوسرا مصرعہ شعر کا تعلیمی پہلو ہے۔ جس میں آشتی سے گوئے فلاح لے جانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اگرچہ شعر دعوے بے دلیل کا آئینہ ہے۔ لیکن تعلیمی لحاظ سے ذہنیت افروز ہے تاہم میں ایک دنیا دار کی حیثیت سے اس تعلیم کی تائید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ فلاح کے ذرائع پر عام طور پر ان ظالمانہ قوتوں کا قبضہ ہوتا ہے جو تمام دینی و دنیوی ترقیوں کو اپنے اغراض کے ماتحت چلانا چاہتی ہیں۔ اور ظالم جنونِ قوت میں صلح و آشتی سے ان چیزوں سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ جن پر وہ غاصبانہ قبضہ جما چکا ہے۔ اس حالت میں طالبانِ فلاح کے لئے دو ہی راستے ہیں یا اپنی خواہشوں کو

نذرِ نامرادی کر دیں یا ظالمانہ طاقتوں کو فنا کر دیں۔ جوان کی رفتارِ ترقی
میں رکاوٹ ڈال رہی ہیں۔ لیکن تقدیمِ ظلم صلح و آشتی سے نہیں
ہو سکتی۔ یہ مقصد آگ اور خون کی بارش ہی سے پورا ہو سکتا ہے
ان حقائق کے پیشِ نظر خواجہ صاحب کا نظریہ مخصوص حالات میں
قابلِ قبول ہو تو ہو لیکن استمراری تعلیم کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

اب میں طوالت کے خوف سے خواجہ صاحب کے ناصحانہ
اشعار صرف تشریحی عنوانات کے تحت پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ اس
طرح تنقید و تبصرہ کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اربابِ بصیرت
کے سامنے صرف فانوس پیش کرنے کی ضرورت ہے شمع کی لمعانیوں
پر وہ خود بخود نگاہ ڈال لیتے ہیں۔

اعمالِ صالح پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ منشائے خداوندی کا
خیال رکھنا چاہیئے۔

(۱۵) بر عمل تکیہ مکن خواجہ کہ در روزِ ازل
تو چہ دانی قلمِ صنع بنامت چہ نوشت

ہر چیز کی بنا خلل پسند ہے۔ لیکن بنائے محبت بے خلل
ہے۔

(۱۶) خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

دنیا کی مخالفت کی پروا نہ کر اور رضائے خداوندی کا خیال
رکھ اگر تو دنیا سے لڑے گا تو دنیا بھی تیرے ساتھ جنگ کریگی۔

(۱۷) بر آستانہ تسلیم سر بنہ حافظ ؛ اگر ستیزہ کنی روزگار بستیزد
اسی نظریہ کو میں نے دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔ جو
خواجہ صاحب کے مصرعِ ثانی کی شرح کی حیثیت رکھتا ہے ؎
زمانہ میرے موافق نہیں تو کس کا قصور؟ ؛ کہ میں نے بھی تو نہ مانی کوئی زمانے کی

تنگ دستی میں بھی خدا کا شکر کر کہیں یہ حالت بد سے بدتر نہ ہو
جائے ؎

(۱۸) روزے اگر غمے رسدت تنگدل مباش
رو شکر کن مبادا کہ از بد بتر شود

ایامِ مصیبت میں صبر کر کیونکہ بُرے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔

(۱۹) اے دل صبور باش مخور غم کہ عاقبت ؛ این شام صبح گردد و این شب سحر شود
بُرے لوگوں کی صحبت انسان کو خراب کرتی ہے ؎

(۲۰) زاہد از کوچہ رنداں بسلامت بگذر ؛ کہ خرابت نہ کند صحبتِ بدنامے چند

عقل و دانش کی بات جاہلوں کو نہیں بتانا چاہیئے ؎

(۲۱) پیرِ میخانہ چہ خوش گفت بدردی کشِ خویش ؛ کہ مگو حالِ دلِ سوختہ با خامے چند
تکلیف اُٹھائے بغیر راحت نہیں ملتی ؎

(۲۲) مکن ز غصہ شکایت کہ در طریقِ ادب ؛ براحتے نہ رسید آنکہ زحمتے نہ کشید
ناجنس کی صحبت سے پرہیز لازم ہے ؎

(۲۳) نخست موعظہ پیرِ مے فروش این است ؛ کہ از مصاحبِ ناجنس احتراز کنید
قابلیت اوصافِ ذاتی پر مبنی ہے کوئی شخص قابل لوگوں
کا بہروپ بھر لینے سے قابل نہیں ہو سکتا ؎

(۲۴) نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

(۲۵) نہ ہر کہ طرفِ کلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہداری و آئینِ سروری داند

(۲۶) ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا ست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ریاکاری شریفانہ شیوہ نہیں "سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا"

(۲۷) در سماع آ، ز سرت خرقہ برانداز و برقص
ورنہ در گوشہ نشیں، دلقِ ریا در بر گیر

کینہ ور لوگوں کو رازِ دل نہیں بتانا چاہیئے ؎

(۲۸) حکایتِ شبِ ہجراں بدشمناں مکنید
کہ نیست سینۂ اربابِ کینہ محرمِ راز

گرفتارِ مصیبت ہو کر صبر و تحمل کا رشتہ چھوڑنا نہ چاہیئے۔
کیونکہ یہ عقلمندی کے خلاف ہے ؎

(۲۹) اے دل اندر بندِ زلفش در پریشانی منال
مرغِ زیرک چو بدام افتد تحمل بایدش

واقفِ راز ہونے کے بعد کسی شخص کے عیوب منظرِ عام پر نہ
لانے چاہئیں ؎

(۳۰) احوالِ شیخ و قاضی و شرب الیہود شاں
کردم سوال صبح دم از پیرِ مے فروش

(۳۱) گفتا نہ گفتنی ست سخن گرچہ محرمی
درکش زباں و پردہ نگہدار و مے بنوش

تجھے پرائی پیڑ میں پڑنے سے کچھ نہیں مل سکتا۔ ہر شخص اپنے
مقاصد کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

(۳۲) رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند : گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

دنیا کے غم کھانا فضول ہے ۔

(۳۳) گوش کن پند اے پسر از بہر دنیا غم مخور
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ دُنیا اور کار دُنیا فانی ہے ۔

(۳۴) جہان و کارِ جہاں جملہ ہیچ در ہیچ است
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق

دوست کیمیائے سعادت ہے ۔

(۳۵) دریغ و درد کہ تا این زماں ندانستم
کہ کیمیائے سعادت رفیق بود رفیق

غم و شادی اگر گذشتنی ہیں تو بہتر یہی ہے کہ ہر وقت دل کو خوش رکھا جائے ۔

(۳۶) حافظا چو غم و شادیٔ جہاں در گذر است
بہتر آنست کہ من خاطر خود خوش دارم

میں اپنے کمزور بازوؤں کی وجہ سے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان میں مردم آزاری کے لئے زور نہیں ۔

(۳۷) من از بازوئے خود دارم بسے شکر
کہ زور مردم آزاری ندارم

دوستوں کے ظلم کا شکوہ دشمنوں سے نہیں کرنا چاہیئے ۔

(۳۸) آشنایانِ رہِ عشق گرم خوں بخورند
کافرم گر بشکایت بر بیگانہ روم

اِس مضمون کو اساتذۂ اردو نے بھی غلو آمیز رنگینی کے ساتھ پیش کیا ہے چنانچہ

(ناسخ) شکوہ اک بُت کا ہے محشر میں خدا کے سامنے
آشنا کا ہے گلہ نا آشنا کے سامنے

(ذوق) ہم نہیں وہ کہ کریں خون کا دعوےٰ تجھ پر
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

ذوق کے شعر کی امتیازی خوبیاں حافظ و ناسخ کے شعروں پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتی ہیں ۔

جان سے ہاتھ دھو ڈالنا آسان ہے لیکن دلی دوستوں سے قطع تعلق مشکل ہے ۔

(۳۹) از جاں طمع بریدن آساں بود ولیکن : از دوستانِ جانی مشکل توان بریدن

راز پوشی ذریعۂ نجات ہے ۔

(۴۰) بر پیرِ میکدہ گفتم کہ چیست راہِ نجات
بخواست جامِ مے و گفت راز پوشیدن

جن لوگوں کے اقوال میں اعمال کی روشنی نہیں ان کی باتوں سے پرہیز لازم ہے ۔

(۴۱) عناں بمیکدہ خواہیم تاخت زین مجلس
کہ وعظ بے عملاں واجب است نشنیدن

بوڑھوں کی نصیحت بختِ جواں سے بھی اچھی ہے ۔

(۴۲) جوانا سر متاب از پندِ پیراں
کہ رائے پیر از بختِ جواں بہ

زمانے کی آنکھیں نہیں کہ وہ علم و جہل کے حسن و قبح پر نظر ڈال سکے ۔

(۴۳) جہل من و علمِ تو فلک را چہ تفاوت
آنجا کہ بصر نیست چہ خوبی و چہ زشتی

انسان کا رشتۂ اختیار دستِ قدرت میں ہے ۔

(۴۴) در دائرۂ قسمت ما نقطۂ پرکاریم
لطف آنچہ تو اندیشی حکم آنچہ تو فرمائی

طریقِ عشق میں خود بینی و خود آرائی کفر ہے ۔

(۴۵) فکرِ خود و رائے خود در عالمِ رندی نیست
کفر است درین مذہب خود بینی و خود رائی

یہ ہیں وہ جواہر ریزے جن کی لمعانیاں محفلِ فکر و عقل میں شمع بصیرت روشن کر رہی ہیں۔ لیکن دلدادگانِ تصوف ان نصیحت آمیز شعروں میں دستِ فکر ڈال الہٰیات کے رموز و اسرار نکالنے کی فکر میں تھے اگر مصروفیات نے فرصت دی تو میں خواجہ صاحب کے وہ اشعار بھی پیش کرنے کی کوشش کروں گا، جو نفسیاتِ محبت کو صحیح صورت میں تو پیش کرتے ہیں، لیکن ان کی اپنی نفسیات پر یار لوگوں نے پردہ ڈال رکھا ہے ۔

و باللّٰہ التوفیق ۔

اظہر امرتسری

بزمِ انتخاب

دُولہا کی واپسی

"خیر، مجھ ماں کو بھلا بیٹھا تو کچھ بیجا نہیں" — "تجھ دُلہن کو بھول بیٹھا، آئے یہ کیونکر یقیں؟"

"لیکن اے بیٹی، مرا بیٹا سعادتمند ہے" — سچ مچ اپنے مرنے والے باپ کا فرزند ہے"

"بیٹی، اِن بجھتی ہوئی آنکھوں میں نور آجائے گا" — "لال میرا، آج، یا کل تک ضرور آجائے گا"

"دل مرا بےچین ہے اُس دلربا کے واسطے" — "جا ذرا تصویر تو لے آ، خدا کے واسطے"

"ہاں یہی، کیوں سر جھکاتی ہے؟ اِدھر آ تو سہی"

"اس پہ میں قربان، میرے دل کا ٹکڑا ہے یہی"

"بچپنا چہرے پہ ہے، بالوں میں ہلکے جال سے" — "چودھویں کا چاند شرماتا ہے میرے لال سے"

"منہ سے کہہ "آمین" یہ کیسا حیا کا جوش ہے؟" — میں دعائیں دے رہی ہوں، اور تو خاموش ہے"

"ہائیں یہ آواز؟ لاری! اور یہ کیا اے خدا؟" — "لاش! یہ کیا، ہائے اے اللہ یہ کیا ہو گیا؟"

"کیا ہے یہ اماں؟ ہوا جاتا ہے کیوں دل پاش پاش؟"

"میرے بچے کا جنازہ، اور ترے دولہا کی لاش!"

(کلیم) — جوش ملیح آبادی

آغا حشر کی یادگار اور ڈرامے

آغا حشر کو وفات پائے تیسرا سال گزر رہا ہے اور ابھی تک مرحوم و مغفور کے عقیدت مندوں کی "ہنگامہ خیزیوں" "ہمہمہ زائیوں" اور "اعلان فرمائیوں" کے باوجود آغا حشر کی کوئی یادگار قائم نہ ہوسکی! ہر روز سنتے ہیں کہ فلاں مقام پر آغا مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے واسطے ملک کے بہترین دماغوں نے مختلف تجاویز پر غور فرمایا اور عنقریب ایک ایسی یادگار قائم ہو جائے گی جسے آغا حشر کی یادگار کہا جا سکے۔ مگر یہ دیکھ کر ہماری مایوسی کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ اس سلسلے میں ابھی تک کسی تجویز کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا اور اس پر مستزاد یہ کہ ان حالات میں اس قسم کی توقع کے پورا ہونے کا ہلکا سا بھی گمان نہیں ہوسکتا!

یورپ میں ایک معمولی سا مصنف فوت ہو جاتا ہے اور فوراً اس کی ایک نہیں بیسیوں یادگاریں قائم کر دی جاتی ہیں اور ہر سال ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے حال ہی میں اخبارات کے ذریعے معلوم کیا ہوگا کہ روس کے شعلہ طراز مصنف "میکسم گورکی" کی یادگار ملک نے کس طرح قائم کی؟ ایسی متعدد مثالیں ہر روز آپ کی نگاہوں کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں! مگر یہاں اپنے مصنف کی یادگار کون قائم کرے؟ --- وہ ملک جس کی آبادی کے معتد بہ حصے کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آغا حشر کون تھا؟ وہ ملک جو اپنے کسی زندہ مصنف کو قوت لایموت بہم پہنچانا بھی بہت بڑا جرم سمجھتا ہے۔ اس سے اس قسم کی توقع رکھنی، فطرت آتش سے خاصیت آب کی توقع رکھنی نہیں تو اور کیا ہے؟؟ اب رہ گئی قوم --- وہ قوم جو اپنے اہل قلم کی دماغی کاوشوں کو حقارت کی ٹھوکریں لگانے میں مسرت محسوس کرے اور اپنے اس فعل، کو ان بیچاروں کی قدر افزائی پر محمول کرے وہ قوم جس کے افراد کتاب کو خریدنا انتہائی فضول خرچی سمجھتے ہوں، وہ قوم اپنے اہل قلم کے ساتھ انتہائی بیرحمانہ سلوک بھی روا رکھے تو بجا ہے۔ ملک اپنے بیہودہ، لغو اور مضحکہ خیز رسومات پر تو روپیہ پانی کی طرح بہا دینا اپنا فرض سمجھتا ہے، مگر اپنے جلیل القدر صاحب قلم کی یادگار قائم کرنے کے واسطے حقیر سے حقیر رقم بھی صرف نہیں کرسکتا۔ قوم مختلف تقاریب پر شرمناک اسراف و تبذیر کا مظاہرہ کرنے پر تو تیار رہے، مگر اپنے کسی مصنف کے سرمایۂ حیات کو محفوظ و مصئون رکھنے کے واسطے اس کے پاس کچھ نہیں ---!! اسے غلامانہ ذہنیت کی "کرشمہ طرازی" سمجھا جائے، یا کچھ اور ---؟؟؟

یادگار کے سوال کو چھوڑ دیجئے یہ بہت دور کا معاملہ ہے۔ ماتم طلب امر تو یہ ہے کہ قوم و ملک کے سامنے مرحوم کی تمام عمر کی کمائی برباد کی جا رہی ہے، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ آغا مرحوم کے ڈراموں کو کتابی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ یہ دستبرد روزگار سے محفوظ رہ سکیں --- آغا مرحوم نے اپنی تمام زندگی فن ڈرامہ نگاری کی خدمت میں صرف کی اور دم واپسیں تک اس فرض سے بے توجہی نہیں برتی، مگر آج ہماری نگاہیں مرحوم کی ذہنی کاوشوں سے محروم ہیں۔ کیا ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں جو ان کے ڈراموں کو اکٹھا کرکے اور کتابی صورت میں انہیں ملک کے سامنے پیش کرے، کیا آغا حشر کے بے شمار عقیدتمندوں میں کوئی بھی ایسا "سچا" عقیدتمند نہیں جو اس طرف توجہ کرے؟؟؟

آغا مرحوم کے چند ڈرامے مل تو جاتے ہیں مگر نہایت ذلیل حالت میں - اغلاط سے معمور، باقی تمام ڈرامے، سنا جاتا ہے کہ ان کے عزیزوں کے پاس ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے ایک ڈراما دیکھا تھا جس میں فقرات کے فقرات آغا مرحوم کے ایک ڈرامے میں سے لئے گئے ہیں --- اس کے بعد اس قسم کی اور مثالیں نظروں سے گزریں، اگر یہی حال رہا تو آغا مرحوم کے تمام ڈرامے صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے مصنف اپنی تصنیف سے زندہ ہوتا ہے۔ جب تصنیف مٹا دی گئی تو مصنف کہاں زندہ رہا؟ آغا مرحوم و مغفور کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کیا جا رہا ہے، آغا حشر کے ڈرامے ان کے خاندان کی وراثت نہیں، بلکہ یہ وراثت ہیں ملک اور قوم کے، اور کسی کو حق نہیں کہ وہ ہمیں اس وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کرے!!

ہم ہندوستانیوں کو یہ عادت سی ہوگئی ہے کہ وقتی جوش کے اظہار میں تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، مگر جب عمل کا سوال آتا ہے، تو ہم پر سکوت و جمود طاری ہو جاتا ہے، آغا حشر ملک کا مایۂ ناز ڈراما نویس تھا، اس کی دماغی کاوشوں نے اردو ڈراما نگاری کو جس بلند سطح پر پہنچا دیا، وہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔ آغا حشر کی مسلسل و متواتر

کوششوں نے اردو ڈراما کو اس وقت ترقی و فروغ دیا، جب وہ انتہائی پستی کے عالم میں دم توڑ رہا تھا۔ یہ آغا مرحوم کی مساعی جمیلہ ہی کا نتیجہ تھا کہ اردو ڈراما، حیرت انگیز رفتار سے منازل ترقی طے کرتا ہوا معراجِ کمال تک پہنچ گیا، کیا یہ صریحاً ناانصافی نہیں کہ جس شخص نے اپنی تمام عمر ڈرامانگاری کی خدمت میں گزار دی، اس کے احسانات کو یکسر فراموش کر دیا جائے؟ کیا یہ احسان فراموشی نہیں کہ جس مصنف نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ محض "فنِ تمثیل" کو فروغ دینے میں صرف کر دیا، اس کی ایک ادنیٰ سی یادگار قائم نہ کی جائے؟؟ اور پھر کیا یہ تکلیف دہ امر نہیں کہ اردو کے سب سے بڑے ڈرامانویس کی عمر بھر کی کمائی ضائع جا رہی ہو، اور ہم پر بدستور سکوت و جمود طاری رہے؟؟؟ اگر یہ ناانصافی نہیں تو پھر کس چیز کا نام ناانصافی ہے، اگر اسے احسان فراموشی نہیں کہہ سکتے تو پھر احسان فروشی کیا چیز ہے؟؟ اور اگر یہ تکلیف دہ امر نہیں تو پھر کون سا تکلیف دہ امر ہو سکتا ہے؟؟؟

یہ سب کچھ ہوا اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ قوم اپنے محبوب ڈرامانویس کی دماغی کاوشوں سے لاپروایانہ سلوک کر رہی ہے۔ شاید وہ سمجھتی ہے کہ اپنے ایک جلیل القدر فرزند کا رشتۂ عظمت رشتۂ زندگی کے انقطاع کے بعد ٹوٹ جاتا ہے، اگر یہ حقیقت نہیں تو پھر اس لاپروائی سے کیا مراد ہے؟ ملک اپنے گرانمایہ "تمثیل نگار" کو فراموش کرتا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ چونکہ اب آغا حشر زندہ نہیں اور ڈرامے کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اس لئے اسے بھلا دینا ہی بہتر ہے، اگر ملک کی یہ خواہش نہیں تو پھر مرحوم کے ادبی کارناموں سے غفلت برتنا کیا مطلب اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے؟؟ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یادگار قائم کرنا دُور کا سوال ہے، اس لئے فی الحال ہمیں اپنی تمام کوششوں کو صرف ایک چیز پر مرتکز کر دینا چاہیئے اور وہ ہے آغا مرحوم کے ڈراموں کی فراہمی ان کی ترتیب و تہذیب اور پھر ان کی اشاعت! اور یہی سب سے ضروری چیز ہے، اگر ہماری غفلت جاری رہی، تو ہمیں ڈر ہے کہ آغا مرحوم کے ڈرامے تلف ہو جائیں گے یا دوسرے الفاظ میں "ذاتی منفعت" کے حصول کی خاطر تلف کر دئے جائیں گے! اور یہ افسوسناک واقعہ کوئی ہندوستانی دیکھنے کے واسطے تیار نہیں!

جو حضرات اس فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں، وہ... خاموش ہیں اور شائد خاموش ہی رہنا بہتر سمجھتے ہیں، ہم جہاں مرحوم کے اعزا کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس سلسلے میں کام کرنے والوں کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں، وہیں مدیرانِ رسائل و جرائد اور ملک کے مراکزِ ادبیہ سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سوال پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے!!

جو حضرات اس سلسلے میں کچھ لکھنا چاہیں، ان کے لئے "ادب لطیف" کے صفحات حاضر ہیں۔

سردست ہم ملک کی مقتدر و موقر انجمن، انجمن اردو پنجاب کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں، اگر اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تو ہمیں یقین کامل ہے کہ آغا حشر کے ڈرامے ضائع نہیں کئے جائیں گے۔

کیا ہم امید رکھیں کہ عقیدتمندانِ حشر بالخصوص ارکانِ انجمن اردو اس طرف بہت جلد توجہ دیں گے؟۔

میرزا ادیب بی اے　　　　(ادبِ لطیف)

ذرائع ترقی اردو

اس زبان کے استعمال کرنے والوں کے دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک گروہ ایسا ہے جو اردو بولتا ہے اور یہ اس کی مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس گروہ کے بعض افراد اسے دیوناگری رسم خط میں لکھتے ہیں اور بعض اردو رسم خط میں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جس کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن وہ اسے سمجھتا ہے، یا تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سمجھ سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں ترقی اردو کے ذرائع بالکل مختلف اور طریقۂ کار قطعاً جداگانہ ہوگا جو میں بالتفصیل عرض کرتا ہوں:۔

(۱) جس گروہ کی مادری زبان اردو ہے اس میں عام اور جبریہ تعلیم کو جاری کرنا سلطنت کا فرض ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اردو زبان میں ابتدائی تعلیم عام طور پر رائج ہو اور اس کا نصاب ایک ایسی جماعت سے متعلق ہو جو عوام کی ضروریات اور تعلیمی تجربے کے ساتھ ساتھ آسان اردو زبان کی کامل مہارت رکھتی ہو۔ یعنی انجمن ترقی اردو کا منظور کردہ نصاب عام طور پر جاری کیا جائے اور جو صورت اصنافِ تعلیم کے مقرر کرنے کی آج کل جاری ہے وہ قطعاً بند کر دی جائے۔ یعنی کئی کئی کورس نہ منظور کئے جائیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف صوبوں کے سرمایہ دار تجارتی فوائد کے اصولوں کو زیادہ پیش نظر رکھتے

ہیں اور مختلف مدارس کے ہیڈ ماسٹروں پر اس کا دار و مدار ہوتا ہے کہ وہ کون سا کورس اپنے مدرسے کے لئے پسند کریں۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک ہیڈ ماسٹر یا ڈپٹی انسپکٹر لسانیات کا ماہر نہیں ہوتا اور مدارس میں محض پبلشر کی مروت یا ہیڈ ماسٹر کی عدم توجہی کی وجہ سے ناقص کتابیں رائج ہو جاتی ہیں۔

(۲) اس گروہ کے اکثر افراد متوسط الحال طبقے کی اس جماعت پر مشتمل ہوتے ہیں جو ادنیٰ طبقے سے قریب تر ہیں یعنی ان میں تعلیم بہت کم ہوتی اور وہ صرف ایسی کتابوں کو پسند کرتے ہیں جنہیں اعلیٰ طبقے کے لوگ سوقیانہ اور عامیانہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے لئے ہم ان کی پسند کا لیکن بہتر لٹریچر مہیا کر سکتے ہیں اور اگر ہم ٹالسٹائی، ٹامس ہارڈی، ٹیگور، گورکی، ماشر اور پریم چند کے افسانوں اور عام پسند لٹریچر کو دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا لٹریچر ابھی اردو میں بہت کم ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ہم اردو کو عام پسند بنانے کے لئے ایسے لٹریچر کو کثرت سے شائع کریں جو صرف خشک اور علمی مسائل ہی پر مشتمل نہ ہو۔

اسی سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر میں فلمی کہانی لکھنے والوں کی اردو کشی کی طرف آپ کو متوجہ کروں، ہمیں ایک ایسے ماہرین زبان کے بورڈ کی سخت ضرورت ہے جو مختلف فلمی کہانیوں پر لسانی اور فلمی نقطۂ نظر سے ایسی تنقید کریں جو عوام کی سمجھ سے باہر نہ ہو اور افسانہ نویسوں کو مجبور کریں کہ وہ رائے عامہ کا لحاظ کر کے بہتر زبان میں اپنے افسانے تیار کریں، اور اگر ممکن ہو تو ہماری انجمن کے منظور شدہ افسانوں کی تصویریں دکھائیں۔ غالباً یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ لاکھوں اردو بولنے یا سمجھنے والوں کی زبانیں موجودہ صنعت افسانہ سازی کی بدولت تباہ ہو رہی ہیں۔

(سہ ماہی "اردو") — محمد اجمل خاں ایم۔ اے

مولانا نذیر احمد اور حقیقت نگاری

اب ہم ان چند خصوصیات پر بھی نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے بعض ناقدین مغالطہ میں پڑ کر مولانا نذیر احمد کو باقاعدہ ناول نویسوں میں شمار کرنے لگے ہیں، ان میں سب سے پہلی چیز حقیقت نگاری ہے۔

مولانا نے جہاں تک عورتوں کی خانگی زندگی کا تعلق ہے بہت حد تک حقیقت نگاری کی ہے۔ ان کی آپس کی رنجشیں، چشمکیں، لین دین، رشک و حسد و غیظ بہت ہی عمدہ طرز پر پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں دوسرے جذبات سے بھی بحث کی ہے مثلاً اولاد سے محبت، بھائی سے محبت، باپ سے محبت، مگر اس کے ساتھ ان کی متشرع طبیعت رنگین محبت ہی سے نہیں، بلکہ زن و شوہر کی محبت کے نام سے بھی "لجاتی" ہے۔ ان کی معرکۃ الآرا کتاب مراۃ العروس نام ہی نام کی رنگین ہے۔ اس کی ہیروئن اصغری اس طرح کی قدسی صفات ہے کہ اس کا شوہر غالباً اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے پہلے وضو کرنا ضروری سمجھتا ہوگا۔ بنات النعش کی جھلک بھی صرف نام ہی تک محدود ہے، ورنہ حسن آرا کا اس میں ذکر ہے وہ دن ہو یا رات کسی وقت بھی "عریاں" ہونے والی نہیں۔ توبۃ النصوح میں توبہ و استغفار ہی ہے، بھلا اس کی "فہمیدہ" میں قیامت کی متانت نہ ہوگی تو کس میں ہوگی؟ رہیں مبتلا اور ابن الوقت سی تصنیفیں تو آخر الذکر کے ہیرو نے ساری عمر انگریز بننے میں صرف کر دی، اسے صنف نازک کو جنس لطیف سمجھنے کا وقت ہی نہ ملا اور اول الذکر نے گو ایک کی جگہ دو دو بیویوں کا بیک وقت تجربہ حاصل کیا، مگر نہ اس کے ہاں ان دکھیاریوں کے لئے کوئی خاص کشش پیدا ہوئی اور نہ ان بے چاریوں کے ہاں اس مایہ النزاع سرتاج کے لئے، ہمارے نزدیک اس لطیف ترین جذبے کے ذکر سے اغماض کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں، یا تو مولانا ان کا ذکر ہی بے حیائی سمجھتے تھے یا انہیں اس دنیا سے کلیتہً ناواقفیت تھی ان میں سے جو بھی سبب ہو، مگر اس عنصر کے عدم نے مولانا کی کتابوں سے ناول کہلانے کا حق سلب کر لیا اور خود انہیں حقیقت نگار کے خطاب سے محروم کر دیا۔

مکالمہ و زبان

اب رہا مکالمہ تو بے شک و شبہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔ صنف نازک کا تکلم، طرز گفتگو، نشست الفاظ اور روزمرہ و محاورہ پر جیسا انہیں عبور ہے سوائے سرشار اور مرزا رسوا کے کسی کو نصیب نہیں، ان مقامات پر مولانا نے سلاست، روانی اور آمد کے دریا بہا دئے ہیں اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے پر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے وہاں سادگی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے

شعر وہاں بھی بلا کا ہے۔ ہوائیں کمی نہیں، مگر ہاں یہ سبزہ زاروں سے گزرتا ہوا دریا نہیں، بلکہ کہساروں سے الجھتی ہوئی ندی ہے۔ پھر ان مقامات کی زبان بھی دلی اور لکھنؤ کی ٹکسال کی پابند نہیں، اس میں جگہ جگہ پر اس کے بیّن ثبوت ملتے ہیں کہ مولانا نے مدت العمر ایک دورہ کرنے والے ڈپٹی کی زندگی بسر کی ہے اور ان کا اصلی وطن دلی کا شہر نہ تھا بلکہ یوپی کا بجنور!

(جامعہ) علی عباس حسینی

سیاسی انقلابات اور شاعری

ہم اردو شاعری کو ادب اور زبان کے ارتقا کے لحاظ سے مختلف دوروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ زبان کا ارتقا تو خیر ایسی چیز ہے کہ وہ سیاسی انقلابات کے بغیر بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ایسے انقلابات آتے ہیں کہ وہ زبان کے انداز میں بھی یکبارگی ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے لئے موجودہ دور کو لیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی مثال میں ہم خاص طور پر اکبر کے کلام کو پیش کر سکتے ہیں، لیکن جہاں تک خیالات اور شاعری کے مختلف دوروں کا تعلق ہے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر زمانہ کی ... تبدیلیاں شاعری پر بھی برابر اپنا اثر کرتی رہتی ہیں اور ان چیزوں کو چھوڑ کر جو شاعری میں محض مادی شکل میں داخل ہو جاتی ہیں شاعروں کے سطحِ نظر اور اندازِ تخیل میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اردو شاعری کے سب دوروں کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد مختلف شاعروں کے ذہنی رجحانات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ عموماً یہ ذہنی رجحانات سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری کے انداز میں سیاسی انقلابات کا اثر ہے۔ اس کے بعد کے دور کی شاعری جس میں انشاؔ، رنگینؔ اور جرأتؔ کی شاعری خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ اسی سیاسی انقلاب کا اثر ہے کہ شاعر لکھنؤ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور اس دربار کے شاعروں کے رجحانات اور ان کے میلانِ طبع سے متاثر ہو کر ایسی شاعری کی جس کا انداز دہلی کی شاعری سے الگ ہے۔ ریختی کو بھی اس خاص سیاسی تبدیلی کا مرہونِ منت سمجھنا چاہئیے۔ غدر کے بعد کی شاعری پرانے شاعرانہ رنگ سے بالکل الگ ہے۔

غزلوں تک نے اس سیاسی تبدیلی کا اثر محسوس کیا اور شاعروں نے غزلوں کے علاوہ مستقل نظموں میں اپنے ان خیالات کا اظہار نئے نئے طریقوں سے کیا۔ حالیؔ، اکبرؔ، چکبستؔ اور اقبالؔ کی شاعرانہ کوششیں ایسی ہیں جن میں قدم قدم پر ان تبدیلیوں کا نمایاں اثر ہے۔

شاعروں نے قوم کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر اسے ابھارنے کی کوشش کی۔ وطن کی محبت کا جوش ان کے دلوں میں طرح طرح سے پیدا ہوا۔ شعروں میں انہوں نے اس محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا، کہیں قدیم سورماؤں کے جذبۂ وطن پرستی کا بیان کیا۔ کہیں قوم کی قدیم عظمتوں کا ذکر کیا۔ کہیں ایثار و قربانی کا سبق دیا اور کہیں وطن پر فدا ہونے کی تعلیم۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے اس دور میں وطنی شاعری کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں اور اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں اس جذبہ کا نمایاں اثر ہو۔ اس جذبہ کی مثالیں ہمیں سرورؔ، محرومؔ، مہرؔ، نظرؔ، حفیظؔ، جوشؔ، اخترؔ اور اس کے علاوہ اکثر شاعروں کے یہاں ملتی ہیں۔ اقبالؔ کا کلام اس رنگِ تخیل سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک دور ایسا ہے جس میں ہندوستان کی حبِ وطن کا جذبہ موجود ہے۔ ایسی نظموں میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی شاعری کے متوسط اور آخری دور کا انداز بالکل ہی جداگانہ ہے۔ متوسط دور میں ان کی سیاسیات پر پیغامِ عمل کا غلبہ ہے اور اسے بھی کسی حد تک ہندوستان کی سیاسی فضا کا اثر سمجھنا چاہئیے

موجودہ دور شاعری پر اس حیثیت سے سیاسیات نے جو گہرا اثر کیا ہے، اس کی اگر صرف مثالیں ہی جمع کی جائیں تو دفتر کے دفتر جمع ہو جائیں۔ اس لئے اس دور کی شاعری کے ان اثرات کو نمایاں کرنے کے لئے اور مثالوں کا لکھنا فضول سا ہے۔

اب تک ہم نے سیاسی انقلابات کے تحت میں شاعری کے جن جن پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے انہیں دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں کن کن مختلف طریقوں سے شاعری پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

(ادبی دنیا) سید وقار عظیم

تبصرا

تنویر کراچی (مصحفی نمبر):- ایڈیٹر عبدالحمید جیسلمیری - ضخامت $\frac{20\times30}{8}$ سائز کے ۵۶ صفحے - قیمت مصحفی نمبر چار آنے چندہ سالانہ عہ (دو روپے)

رسالہ تنویر کراچی تین سال سے سندھ میں علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے - حال ہی میں اس کا "مصحفی نمبر" شائع ہوا ہے جسے یادگارِ مصحفی حضرت علامہ افسر صدیقی امروہی نے مرتب کیا ہے - علامہ موصوف ہی نے سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی غلط تنقید کے خلاف آواز بلند کی تھی اور "نگار لکھنؤ" میں سو صفحے کا بلند پایہ مضمون لکھ کر مصحفی مرحوم کو صحیح معنوں میں ملک سے روشناس کرایا تھا - اب آپ "استاد کامل" کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں اور مصحفی نمبر دراصل "استاد کامل" کی مختصر تلخیص کی حیثیت رکھتا ہے -

اس نمبر میں علامہ صاحب نے "مصحفی اہلِ تحقیق کی نظر میں" "حالاتِ مصحفی"، "تلامذۂ مصحفی"، "تصدیقاتِ تلمذ"، "مصحفی کے اصلاحی کارنامے"، "مصحفی کے خاص اشعار"، "شانِ تغزل" اور انتخاب کلام وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے -

مصحفی مرحوم کے متعلق چند نظمیں بھی زینتِ مجلہ ہیں - اہلِ ذوق و ادب کو ضرور اس نمبر کا مطالعہ کرنا چاہیئے -

ماہانہ "حشر" جالندھر:- ایڈیٹرز:- ودیا پرکاش سرور کیفوریہ و ضیا حشری -

چندہ سالانہ دو روپے -

اردو تمثیل نگاری کے شہنشاہ آغا حشر مرحوم کی یادگار ایک اہم سوال ہے - میرزا ادیب بی - اے کے دو شذرے شاہکار کے اسی نمبر میں بزم انتخاب کے زیرِ عنوان دئے جا رہے ہیں جن میں آغا حشر کی یادگار اور ان کے ڈراموں کی اشاعت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے -

اسی دوران میں ماہانہ حشر جالندھر کے تین نمبر ریویو کے لئے موصول ہوئے، معلوم ہوتا ہے کہ حشر کے عقیدتمندوں میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں -

حضرت جوش ملیح آبادی، جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی جناب عیش فیروز پوری اور حضرتِ الطاف مشہدی کا قلمی معاونین میں شامل ہونا رسالہ کے شاندار مستقبل کا آئینہ دار ہے -

اپریل نمبر سے آغا حشر مرحوم کے شاہکار "رستم و سہراب" کی بالاقساط اشاعت بھی شروع کر دی گئی ہے -

امید ہے کہ شائقین فراخ دلی سے اس کا خیر مقدم کریں گے

صنفِ نازک (جہاں آرا نمبر):- "صنفِ نازک" مدت سے خواتین میں علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے - حال ہی میں محترمہ جہاں آرا بیگم شاہنواز کے نام سے اس کا "جہاں آرا نمبر" شائع ہوا ہے - جس میں متذکرہ موضوع کے علاوہ اور بھی مفید و پُر معلومات مضامینِ نظم و نثر شائع ہوئے ہیں - قیمت فی پرچہ درج نہیں - سالانہ چندہ تین روپے -

پتہ :- مینجر صاحب رسالہ صنفِ نازک، سادات سٹریٹ میکلوڈ روڈ لاہور -

نافۂ تاتار:- یہ حضرت خواجہ شیخ فریدالدین عطار کے مشہور و معروف پندنامہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے - جسے شریف الاسلام سید فرزند علی شاہ (مرحوم) سابق مدرس اعلیٰ اردو فارسی بہاول پور نے اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے - اس کتاب کے سادہ مگر دلفریب الفاظ میں جملہ ضروریاتِ دینی کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے جو لانگاہِ دنیا کے تمام نشیب و فراز کا نقشہ کھینچ کر راست روی کی ہدایت کی گئی ہے - ہر مذہب و ملت کے افراد اور خصوصاً نوجوانوں کے لئے شمع ہدایت ہے - سوا چھ آنے کے ٹکٹ بھیج کر "مہتمم اردو محل منٹگمری" سے طلب کریں -

طبیبِ نسواں دہلی:- ایڈیٹر:- ڈاکٹر سعید احمد بریلوی سالانہ چندہ عہ فی پرچہ ۳ر

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا اسم گرامی ادبی و طبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کامیاب ڈاکٹر ہونے کے علاوہ نغز گو شاعر اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ مارچ سنہ ۳۷ء سے آپ کی ادارت میں ماہانہ "طبیب نسواں" شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ تاحال دو نمبر شائع ہوئے ہیں۔ جنہیں دیکھنے کے بعد اس کے مستقبل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تندرستی ہزار نعمت ہے، بیمار کے سرہانے، کہانیاں (نصیحت آمیز معاشرتی افسانے) تعمیر آشیانہ، بی ہمسائی، ننھے میاں، چہار دیواری کے باہر، مفرحات، آسان اور مجرّب نسخے، بیماریاں اور ان کے علاج مستقل عنوان ہیں، جن سے رسالہ کی فنی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حفظانِ صحت کے شائقین خصوصاً مستورات کے لئے نہایت مفید ہے۔ ٹائیٹل پیج رنگین و دیدہ زیب۔ کتابت و طباعت زیبا، کاغذ عمدہ۔ چندہ سالانہ عہ
منیجر صاحب طبیب نسواں دہلی کے پتے سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

یزدانی

تمدّنِ عتیق

قاعدے کی بات ہے کہ جب کوئی نئی تصنیف یا تالیف پہلے پہل منظرِ عام پر لائی جاتی ہے تو اُسے اپنی بقار کی خاطر انسانوں کی طرح کتابوں کو بھی جہد للبقاء کا مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ان مشاہیر اور اہل الرائے صحافیوں کی قدرتی طور پر تلاش دامن گیر ہوتی ہے، جن کی قوتِ فیصلہ والہانہ جوش و عقیدت اور مروت و محبت کا شکار نہیں ہوتی۔ اگرچہ کسی کتاب کی افادیت اور معنوی حیثیت کے تخمینہ کرنے کا یہ اصول عمومی مستحسن نہیں ہے اور نہ اس کو کلیاً تسلی ہونا چاہیئے۔ تاہم یہ ایک سنتِ دیرینہ ہے کہ جب کسی نئی کتاب کے درخورِ ستائش ہونے کی صدائیں گوش گزار ہوتی ہیں تو ذوقِ مطالعہ تغافل پیشہ قارئین کو اُکساتا ہے اور دستِ طلب جیب کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

بعض علمی رسائل کی سہاتی تنقیدوں نے مجھے بھی تمدنِ عتیق کے مطالعے کا شوق دلایا کیونکہ متعلمین تاریخ کے لئے تمدنی ارتقار کی سرگزشت نہایت پُر لطف اور خاصے کی چیز ہے۔ بشرطیکہ مؤلف نے تمدنوں کے پراگندہ تار و پود کی شیرازہ بندی میں جانفشانی اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہو۔ اس خصوص میں ماہرینِ علم الآثار کی بے لوث مساعی کا اعتراف نہ کرنا ابطالِ بدیہات کے مترادف ہوگا، اس لئے کہ انہوں نے اسلاف کی ناقابلِ فراموش یادگاروں کو، جو گردشِ لیل و نہار کے باعث تقریباً نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی تھیں خاک کے تودوں سے باہر نکالا اور نہ صرف نام نیک رفتگاں کو قعرِ گمنامی اور کنجِ خمول سے نکال کر حیاتِ جاودانی بخش بلکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے وافر مواد فراہم کردیا۔

زیرِ نظر کتاب سٹی کالج حیدرآباد دکن کے دو فاضل اساتذہ مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم۔ اے، اور مولوی محمد عطاءالرحمٰن صاحب بی۔ اے کی متفقہ تحقیق اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے، جس کی ترتیب و تدوین میں فاضل مؤلفین نے اس موضوع کے مستند ماخذوں سے کما حقہٗ استفادہ کیا ہے اور ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ضروری امور قلم انداز نہ ہوں۔ اس کتاب کو بائیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تخلیق کائنات پر جدید زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالتے ہوئے قدیم تمدنوں سے متعلق عصری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ نیز سنین اور تاریخ کی اعانت کے بغیر آغازِ گیتی، کرشمۂ حیات، نیانڈرٹال انسان، قدیم عصر الحجر، جدید عصر الحجر، ابتدائی تخیلات، تحریر کی ابتداء، تمدن کے اوّلین نقوش، سامرستان و مصر، مذہبی اور ادبی رجحان، اولیں فرمانروا اور طبقاتی نظام، علوم و فنون اور کاروباری زندگی، قوانین اور اقتدارِ شاہی، قدیم آوارہ گرد، اوّلین بحر پیمار، اوّلین قومی مملکت قدیم ترین سلطنتیں، مصر کے عروج کا پہلا اور دوسرا دور، اشوریہ کا عروج اور عبرانیوں کی قلمرو سے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے، جس سے واضح ہوگا کہ تمدنی زندگی کے احیاء کا سہرا اہلِ مشرق ہی کے سر ہے کیونکہ دریائے سندھ، دجلہ، فرات اور نیل کی وادیاں قدیم

تمدنوں کا گہوارہ تھیں۔

اولین تمدنوں کے بانیوں کے متعلق فاضل مؤلفین کا یہ نظریہ نہ صرف جاذب توجہ بلکہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قدیم الایام باشندے بلاشمار سہولتوں اور خاص کر اسباب خورد و نوش کی فراوانی کے باعث بالعموم دریاؤں کی سرسبز اور حاصل خیز وادیوں ہی میں اقامت گزیں ہوتے تھے۔ اس طرح ایک عرصے کی بود و باش اور باہمی میل جول سے تمدنی زندگی کے آثار شروع ہوئے جس کا بین ثبوت وہ اولین نقوش ہیں جو ماہرین علم الآثار کی عرق ریز کاوشوں کے منت گزار ہیں لیکن تعجب ہے کہ بعض افراد اس باب میں بڑا وہم غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "عور" بابل اور موہنجوداڑو کے پرانے کھنڈر کھودنے سے بعض چیزیں یکساں برآمد ہوئی ہیں جس سے ثابت ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان اور عراق ایک ہی بادشاہ کے زیر نگیں تھے۔" یہ نظریہ "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" کی عملی تفسیر ہے۔ اس لئے کہ عہد بربریت میں ایک منظم اور باضابطہ حکومت کا تصور مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہیں، خلط اشیاء کے اسباب سمجھنے کے لئے علمائے انسیات اور لسانیات سے رجوع کرنا از بس ضروری ہے۔ نیز اس گتھی کو سلجھانے کے لئے ماہرین آثار قدیمہ کی رہنمائی بھی ناگزیر ہے۔ یہ دور ازمنہ ماضیہ کے تاریک ترین دور میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اس زمانے میں انسانوں نے علوم و فنون اور دیگر کاروبار زندگی میں نہ تو کافی دستگاہ حاصل کی تھی اور نہ اُن میں اتنا شعور پیدا ہوا تھا کہ ایک ایسی منضبط داستان اپنے کارناموں کی چھوڑ جاتے جو عہد حاضر کے مورخین کی خاطر خواہ رہنمائی کرتی۔ البتہ "خشت و گل" کی برباد شدہ نشانیوں سے یہ مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ جتھابندی دنیا کی نئی رسم نہیں ہے

چنانچہ اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ دریائے دجلہ کے وہ باشندے جو سامریوں کے بعد اس علاقے پر متصرف ہوئے سامی النسل تھے، عکادی، عامری اور اشوری وغیرہ اسی نسل کی یادگار ہیں اور کنارِ فرات کے وہ باشندے جن کو ان لوگوں نے مغلوب کیا، دراوڑی نسل سے علاقہ رکھتے تھے

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہوس رانیاں اور رزم آرائیاں بنی نوع انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں۔ جب ایک فریق کمزور ہو جاتا ہے تو دوسرا اقتدار حاصل کرنے اور اپنی عظمت و برتری کا سکہ بٹھانے کے لئے ممکنہ جد و جہد کرتا ہے۔ اطالیہ و حبشہ کی حالیہ معرکہ آرائیاں اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ عہد عتیق میں بھی اسی کلیہ کے ماتحت لاغول زغشی کے خلاف عکادیوں کے قائد اعظم سارگن نے یلغار کی اور اُس کو ہزیمت دے کر سامرستان پر عکادیوں کا پرچم لہرایا اور عامریوں کے بے جگر سردار حمرابی نے نہایت جرأت و پامردی سے شمشیر آزمائی کی اور "ہر کہ تلوار زند سکہ بنامش خوانند" کا درس دیا۔ وقس علیٰ ہذا۔

ہو سکتا ہے کہ وادیٔ فرات کے باشندوں نے اپنے ہمسایوں کے پے در پے حملوں کی تاب مقاومت نہ پا کر شمال مغربی راستوں سے ہندوستان کو ہجرت کی ہو یا تلاش معیشت اُن کے وہاں زیں گیر ہونے کا باعث ہوئی مگر یہ خیال بہر نوع قابل تسلیم نہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان اور عراق کی سی رفیع الشان مملکتوں پر کسی فرد واحد کا "لوائے شاہی" لہرا رہا تھا۔

اس سے قطع نظر ایک گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ کسی زمانے میں بنگال سے قرطاجنہ "شمالی افریقہ" تک ایک ہی قوم آباد تھی۔ اُن کا بیان ہے کہ "بنگال میں عرصے تک پال خاندان کے راجاؤں کی حکومت رہی، وہاں اب تک اُن کے نام لیوا موجود ہیں، اسی طرح عراق میں سمریوں (سامریوں) کا راجہ آشور بانی پال گزرا ہے۔ قرطاجنہ کا بہادر جرنل ہنی بال بھی پال خاندان کا رکن تھا کیونکہ بال و پال ایک ہی چیز ہیں، اسی طرح اجودھیا میں دشرت راجہ کا راج تھا۔ عراق میں بھی اسی نام کا ایک بادشاہ ہوا" لسانی وحدت کی یہ دو چار مثالیں ڈاکٹر پران ناتھ پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی کی نیم منطقی توجہات بالسانی۔ لسانی سے خوشہ چینی کی آئینہ دار ہیں، جو ہزار دلچسپ اور پُرلطف سہی، لیکن محض تخیلی موشگافیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ تاریخ عبارت ہے حقیقی اور عملی واقعات سے، محض ایک زبان میں، دوسری زبان کے چند لفظوں کی ہم آہنگی اور خلط ملط کی بنا پر یہ یقین ماننا کہ ان وسیع تر مملکتوں کے باشندے ایک ہی نسل اور خاندان سے ہیں۔ غیر منطقی اور لاطائل نظریہ ہے۔

پیشِ نظر کتاب پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ "اس میں غیر مانوس اصطلاحات اور بے تکی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔"

اس اعتراض کی کاوا کی کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو جامعہ عثمانیہ جیسے مہتم بالشان ادارۂ علمی کی وضع کردہ اصطلاحات سے کماحقہ واقف ہیں۔ زبان اردو کے مخلص خدمت گذاروں کا اوّلین فرض ہے کہ ملکی تعصبات سے قطع نظر، اس سرچشمۂ علوم و فنون کے فیوض و برکات سے متمتع ہوں کیونکہ زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا دارومدار الفاظ کی بہتات اور بولنے والوں کی روز افزوں تعداد پر ہے اگر الفاظ صرف وضع کئے جائیں اور اُن کو استعمال نہ کیا جائے تو پھر اُن کا بنانا بیکار ہے۔ یورپ میں اگر کوئی نیا لفظ قواعد زبان کے مطابق بنایا جاتا ہے اور اس سے کوئی مفہوم نسبتاً اختصار کے ساتھ ادا ہوتا ہے تو پھر فقید المثال انشا پرداز اور ادیب اُس کو بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ایسی علمی اصطلاحات سے ملک کے انشا پردازوں اور بالخصوص مدیران رسائل کو کامل طور پر بہرہ مند ہونا چاہئیے تاکہ کم مائگی کے الزامات سے ہماری زبان مبرّیٰ ہو سکے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ بعض کہنہ مشق صحافتی حضرات اپنی نری ناواقفیت یا تعصب کی بنا پر اچھی خاصی اور سریع الفہم اصطلاحوں کو ثقیل اور بھونڈی قرار دیتے ہیں مثلاً مصر جدید کے علما نے (Reptiles) کا ترجمہ "زحافہ" کیا ہے جو عام طور پر چالو ہے اور سمندر کی راہ دُور دراز سفر کرتا ہوا ہمارے کانوں تک پہنچا ہے۔ علیٰ ہذا ارباب جامعۂ عثمانیہ نے (Mammals) کا ترجمہ "پستانیاں" کیا ہے جو . . . (Mamma۔ پستان) کا لفظی ترجمہ ہے اور قواعد زبان کی رُو سے نہایت معنی خیز اور سانچے میں ڈھلا ہوا لفظ ہے ایسے الفاظ کو ثقیل اور نامانوس ٹھہرا کر ایک مشہور رسالے کے مدیر نے عرشِ ادارت سے اُن کی جگہ جو زود ہضم اصطلاحیں تجویز فرمائی ہیں، (کہ ان بھاری بھرکم اصطلاحوں کی بجائے علی الترتیب "پیٹ کے بل رینگنے والے جانور" اور "دودھ پلانے والے جانور" زیادہ بہتر تھے۔) کم از کم اردو زبان کے حق میں کچھ آشنائی کا حق ادا نہ کیا۔ فاضل نقاد کو معلوم ہونا چاہئیے کہ زبان کی عظمت اور شان ادبیت کا مدار کم سے کم لفظوں میں وسیع تر مفہوم کی ترجمانی پر ہے۔ مجوزہ ترجمہ وسطانی اور فوقانی جماعتوں کے طلبا کی تفہیم کر سکتا ہے لیکن علمی مقالات کے شایاں نہیں ہو سکتا۔ آگے چل کر فاضل نقاد کا ارشاد ہوتا ہے کہ لفظ (Skelton) کا ترجمہ "استخوانی باقیات" کی بجائے "ڈھانچہ یا پنجر" ہونا چاہیئے یا . . . (Curvature) کا ترجمہ "خماؤ" کی جگہ صرف "خم" مناسب تھا۔ یہ اعتراضات بھی محض غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے کہ "ڈھانچہ یا پنجر" کے لئے جس انگریزی لفظ کا حوالہ دیا گیا ہے بالکل درست ہے، لیکن "استخوانی باقیات" کے لئے غالباً (Remains of bones.) استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ نیز "خم اور خماؤ" کی معنوی نزاکت کا اندازہ کچھ وہی لوگ پورے طور پر کر سکیں گے جو (Curve) اور (Curvature) میں امتیاز کرتے ہوں اس لطیف فرق کو محسوس کرنے کے لئے وسعت نظر اور نگاہ باریک بیں کی ضرورت ہے۔

اسی فاضل تبصرہ نگار نے اپنی عالمانہ تنقید میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "عقیرہ، طیرہ، صیدان ان ناموں کو معرب کرنے کی فضول کوششیں کی گئی ہیں، کیونکہ عربی میں ان شہروں کے نام پہلے ہی سے عکہ، طیرا، اور صیدا موجود ہیں۔" ہمارے دوست نے یہاں بھی اپنی ہمہ دانی کے پندار میں فضول اعتراض کیا ہے اس لئے کہ عکہ، عقیرہ، صیدا اور صیدان یا طیرہ اور طیرا میں کوئی ایسا خاص فرق نہیں جس کی بنا پر یہ اتنی عالمانہ موشگافی کی جاتی۔ پھر یہ کہ علامہ نذیر احمد خاں مرحوم کے مترجمہ انجیل مقدس کے اوراق میں کم از کم صیدان اور صیدانیوں کا لفظ بار بار آیا ہے۔ ممکن ہے کہ مؤلفین نے انگریزی نام (Siddan) سے قریب تر ہونے کی خاطر "صیدان" کو "صیدا" پر ترجیح دی ہو۔

بسا اوقات جوشِ تنقید میں تبصرہ نگار جملوں کو غلط پڑھ کر کے طرز نگارش کا سقم قرار دیتے ہیں مثلاً "بے سروسرمایہ زندگی پر اُن کی گذران تھی۔" زندگی پر کسی کی گذران نہیں ہوتی، یہ بالکل صحیح ہے لیکن زیر بحث کتاب میں جملہ اس طرح سے ہے "محض تنگ اور بے سروسرمایہ زندگی پر اُن کی گذران تھی۔" اب جملہ صاف ہے "گذران" بمعنی "بسراوقات" غلط نہیں ہے۔ مولینا حالی فرماتے ہیں ؎

اے غم دوست نہیں تجھ پہ ہی اپنی گذران
کچھ فتوح اس کے سوا اور ہے بالائی بھی

اس سے قطع نظر جن دوسرے جملوں میں گنجلک اور تعقید دکھائی گئی وہ چنداں لائق التفات نہیں ہے کیونکہ یہ نقص بہ خصوصیت۔

یہ ہیں وہ سطحی اور بے مایہ اعتراضات جو فاضل نقادوں کی علمیت اور ہمہ دانی کے آئینہ دار ہیں جو بے محل اعتراضات سے قارئین کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ ہرگز غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ میرے مخاطب وہ نقاد بھی ہیں جو کھرے اور کھوٹے کو تنقید کی کسوٹی پر آزمانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

الحاصل تمدن ہائے عتیق کی غیر مربوط اور بکھری ہوئی نشانیوں سے جو کچھ بھی ان برباد شدہ قوموں کے متعلق معلومات فراہم کی جاسکتی تھیں، زیرِ بحث کتاب کے صفحات میں جابجا محفوظ ہیں جن کے مطالعے سے قارئین کی معلومات میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے، البتہ یہ کہنا زیادتی نہ ہوگی کہ بعض واقعات کو اگر کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اس لئے کہ مؤرخ کا کام محض واقعات کو جمع کرنا ہی نہیں بلکہ ماحول کی روشنی میں کافی وضاحت و تشریح کرنا بھی ہے

اب رہی طرزِ نگارش تو مثل مشہور ہے کہ "ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است۔" فاضل مؤلفین کی تحریر میں نام نہاد ادبِ لطیف کی کتابوں کا سا سوقیانہ پن، ہندی اور عربی کے اکھڑ محاورے اور بے جوڑ الفاظ کی پیوند کاریاں نہیں پائی جاتیں۔ زبان نہایت شستہ و رُفتہ ہے۔ نیز طرزِ نگارش نہایت سلجھی ہوئی ہے جس سے آثارِ پختگی نمایاں ہیں اور اندازِ بیان حد درجہ دلچسپ ہے۔ عام طور پر تاریخی کتابوں میں جو خشکی اور بنجر پن نظر آتا ہے۔ اس سے یہ کتاب یکسر پاک ہے، اربابِ ذوق کو مؤلفین کی سرپرستی کرنی چاہیئے تاکہ وہ اس سے زیادہ مفید اور بیش بہا موضوعات پر خامہ آزمائی کرکے ادب اردو کو مالا مال کریں۔

ابتدا میں مولوی سیّد محمدؐ اعظم صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایس سی (کینٹب) پرنسپل سٹی کالج کا پُر از معلومات "پیش لفظ" بھی شامل ہے جس میں تمدن کی ابتدا اور درجاتِ ترقی پر عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے جو باوصفِ ایجاز نہایت معنی خیز ہے۔ صاحب موصوف نے مؤلفین سے بجا خواہش کی ہے کہ وہ تاریخ عالم کے وسیع تر موضوع پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔

بہر حال ادبی کتابوں اور نایاب معلومات سے حقیقی دلچسپی رکھنے والے قارئین سے میری درخواست ہے کہ وہ گمراہ کن اور سطحی تنقیدوں سے احتراز کرکے اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ بہ لحاظ لطفِ زبان اور معلومات رنگا رنگ، یہ کتاب اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔

سیّد مہدی حسین (عثمانیہ)

(حیدر آباد دکن)

(بقیہ صفحۂ اطفال)

تک تمہارے تجربات کی زبان اس کی دوستی کی گواہ نہ بن جائے۔

سن لو! کہ زود اعتمادی[1] ہی نے تمہارے باپ کو زندگی بھر ناکام بنائے رکھا۔ دشمن اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مگر دوستوں کی خود غرضیوں، بددیانتیوں اور عیاریوں[2] نے اس کا نقشۂ زندگی بگاڑ کر رکھ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم سب کو دشمن نہ بنانا۔ بلکہ دشمنوں کے ساتھ مدارات[3] کا سلوک کرنا۔ اس طرح تم انہیں دوست تو نہ بنا سکو گے۔ لیکن ان کی شر[4] سے ضرور بچ جاؤ گے۔

آؤ تمہیں سچے، وفادار اور بے غرض دوستوں کا پتہ بتاؤں۔ دیکھو بیٹے! اصلی اور قابلِ اعتماد دوست تمہیں انسانی آبادیوں، جماعتوں اور محفلوں میں نہیں ملیں گے۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے تمہیں لائبریریوں اور کتب خانوں میں جانا پڑے گا۔

کتاب ـــــ خدا شاہد[5] ہے کہ اس سے بڑھ کر وفادار۔ راہبرِ راہ زندگی۔ غم خوار و غم گسار دوست تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔

شاہد! خدارا کتاب کو اپنی زندگی بنا لینا۔ اگرچہ یہ نعمت زندگی سے بھی عزیز تر ہے۔ باقی اگلے خط میں۔

تاجور　　　(منقول از پریم لاہور)

---

[1] جلدی بھروسہ کرلینا [2] مکاریوں [3] آؤ بھگت [4] شرارت۔ بدی [5] گواہ

صفحۂ اطفال

مدیرؔ "پریم" کا خط ــــــ شاہد جاوید درّانی کے نام

(۱)

میرے سب سے چھوٹے اور سب سے پیارے بیٹے شاہد! خدا کرے تم اپنی زندگی کو ملک و ملت اور بنی نوع انسان کے لئے مفید بنا سکو۔ آمین۔

اس وقت تمہاری عمر آٹھ ماہ کی ہے۔ تمہاری معصومانہ شوخیاں تمہارے غم زدہ ماں باپ کی زندگی کا سہارا بن رہی ہیں۔ میں تمہیں ہنستا کھیلتا دیکھ کر تمہارے جواں مرگ بھائیوں کا صدمہ بھول جاتا ہوں۔

ممکن ہے تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے میں ہوش و حواس کو خیرباد کہہ دوں اور تمہیں زمانے کی ٹھوکروں کے حوالے کر جاؤں۔

ذہین و حسین بچے! خدا نہ کرے۔ ایسا وقت تم پر آپڑے۔ تو ہمت نہ ہار بیٹھنا۔ یاد رکھو! کہ دنیا میں یتیموں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ انسانیت کی تاریخ یتیموں کے کارناموں سے جگمگا رہی ہے آج بھی جب یہ خط میں تمہیں لکھ رہا ہوں اور اس وقت بھی جب تم اِس خط کو پڑھنے کے قابل ہو گے ..... تو تم دیکھو گے کہ دُنیا کے سب سے بڑے زندہ آدمیوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو یتیمی کی گرد اور بیکسی کی خاک سے اُٹھ کر آسمانِ عزت پر چاند سُورج کی طرح چمک رہے ہیں۔

شاہد! میں تو اِس یقین میں مُبتلا ہوں کہ بچے کے بڑا آدمی بننے کے لئے اس کا یتیم ہونا ضروری ہے۔

میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے نہیں کہ میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ یا زندگی میں مجھے کچھ لطف حاصل ہے۔ بلکہ تم ننھے ننھے بھائی بہنوں کے لئے زندہ رہنے کا خواہش مند ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ موت کسی کی خواہش کی پابند نہیں اور دیکھ رہا ہوں کہ میری نت نئی بیماریاں مجھے کشاں کشاں ساحلِ فنا کی جانب لئے جا رہی ہیں۔ میری عمرِ رواں تمہاری نشو و نما سے تیز رو ہے۔ تم جب تک منزلِ شباب تک پہنچو گے۔ غالباً میری قبر کا بھی نشان مٹ چکا ہوگا۔

تمہاری بصارت مجھے دیکھ رہی ہے۔ مگر تمہاری بصیرت جب اپنے پرائے میں امتیاز کرنے کے قابل ہوگی، تو مجھے نہ پائے گی۔

عزیز و اقارب جب میری زندگی ہی میں میرے تمہارے پرسانِ حال نہیں۔ تو میرے بعد تم ان سے نگاہِ التفات کی توقع کیسے رکھ سکتے ہو؟ اس لئے جب تم ہوش سنبھالو گے تو اپنے پاس کسی کو نہ پاؤ گے۔

جانِ پدر! اس بیکسی کے ماحول سے تم گھبرا نہ جانا۔ اوسان قائم رکھنا اور خدا کے بعد اپنی خداداد قوتِ بازو پر بھروسہ کرنا۔ زندگی کی کشاکش انسان کا امتحان لیا کرتی ہے۔ تمہیں بھی اپنے وقت پر یہ امتحان دینا پڑے گا۔ خدا تمہیں اس آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

شاہد! نیک روشی! نیک نیتی اور ان صفات کے ساتھ عمل کوشی پر مضبوطی سے قائم رہے۔ تو خدا تمہارا حامی و ناصر بن جائے گا۔ اور خدا کو تم نے اپنا بنا لیا، تو پھر کسی کو اپنا بنانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ بیگانے، یگانے اور پرائے خود بخود تمہارے اپنے بن جائیں گے۔ دنیا تمہارے آگے بڑھنے کے لئے راستہ چھوڑ دے گی۔ منزل مقصود کی جانب تم جتنے بڑھو گے۔ منزل مقصود اتنی ہی تیز روی کے ساتھ تمہاری طرف بڑھے گی اور ایک دن عزت و عظمت کی ان بلندیوں پر پہنچ جاؤ گے۔ جہاں تمہارے حاسدوں کی نگاہ بھی نہ پہنچ سکے گی۔ مگر دیکھنا بیٹے! زندگی کو کامران دیکھ کر زندگی کے غرور میں مبتلا نہ ہو جانا کہ غرور اپنے متعلق فریب کھانے کا نام ہے اور کبریائی تو صرف خدا کے لئے ہے۔ جاہ و جلال کی انتہا کو پہنچ کر اپنی ابتدا کو کبھی نہ بھولنا اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زریں ارشاد کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ

"تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو اور آدمؑ کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی۔"

بڑے ہو کر اور بڑے آدمی بن کر خدا کی عبادت اور خلق خدا کی خدمت سے بے پروا ہو جانا۔

اپنے خدا، مذہب، وطن، ملت، برادری اور اپنے خاندان کے حقوق کی ادائیگی کو زندگی کی سب سے ضروری چیز سمجھتے رہنا۔

دوستوں کی امداد، عزیزوں کی خبرگیری، پڑوسیوں سے ہمدردی اور اہلِ کمال کی قدر کرتے رہنا۔

پیارے شاہد! بے غرض دوستوں کی تلاش میں وقت نہ کھونا۔ بے غرض دوستی کو اب دنیا بے وقوفی اور مخلص دوست کو مجنوں کا خطاب دیتی ہے۔

کسی کو دوست بنانے میں جلدی نہ کرنا۔ جب

(باقی بر صفحہ ۱۳۰ دیکھیں)

۱ بینائی ۲ رشتہ دار ۳ خبرگیر ۴ مہربانی ۵ مددگار ۶ اپنے ۷ حسد کرنے والوں ۸ کامیاب ۹ بزرگی

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور
آنریری ایڈیٹر:- میرزا ادیب بی۔ اے

"شاہکار"

بابت جون ۱۹۳۷ء

ادارہ:-
خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
سیّد عبدالرشید یزدانی جالندھری

جلد ۵ فہرست نمبر ۳

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

"شاہکار" کے متعلق

اہلِ قلم و اہلِ علم و تعلیم حضرات کی رایوں کے اقتباسات

جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

"ایک باغ کی چھپ تختی نظارگی کو معاً اس کے باغبان کے سلیقہ چمن طرازی و کاربہ ملندی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا ذاتی تناگری نہیں کہ مولانا تاجور سلمہ میدان صحافت کے فردِ کامل ہیں۔ انہیں نے "مخزن" مرحوم میں تجدید شباب کی رُوح پھونکی اور اگر وہ انہیں کے ہاتھوں میں رہتا تو آج ہم اسے مرحوم نہ لکھتے۔ "ہمایوں" بھی آپ کے سحر طراز قلم کا مرہون کرامت رہا۔ "ادبی دنیا" تو انہیں کی گود کا بچہ ہے اور "شاہکار" کبھی جسے ارتقائے صحافت کی اعلیٰ منزل کہنا چاہیئے۔

"شاہکار" صوری و معنوی خوبیوں میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو اردو کے چوٹی کے رسالوں میں مل سکتا ہے اور اس کے ماورا بھی موجود ہے۔ اس کا مقصد صرف یہی نہیں کہ اچھے مضامین، اچھے افسانے اور اچھی نظمیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جائیں، بلکہ مزید برآں اردو زبان اور ادب کی خدمت بھی اس کے اوّلین مقاصد میں ہے۔ اِس ضمن میں صرف ایک "بزمِ تحقیق" کا نام لے دینا کافی ہوگا۔ یہ اور ایسی کئی مفید چیزیں جو "شاہکار"...... کی خصوصیت ہیں۔ اس کے لئے مایہ الامتیاز قائم کرتی ہیں۔

فاضل مدیر مولینا تاجور کے لکھے ہوئے شذرات "شاہکار" کا صحیح الاسحہ عمل ہیں۔

"امید قوی ہے کہ ملک "شاہکار" کو ہاتھوں میں لے گا اور آنکھوں پہ ہی نہیں دل میں جگہ دے گا جس کا وہ یقیناً مستحق ہے۔"

مشہور ادیب مسٹر ل۔ احمد اکبر آبادی

"پرچے کی خوبیوں کے متعلق کچھ کہنا درحقیقت آپ کی جریدہ نگاری کے تجربوں پر عدم اعتمادی کا مرادف ہوگا۔"

"یہ ایک حقیقت ہے کہ رسالے میں خصوصیات پیدا کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے کوئی آئیڈیل موجود ہوتا ہے اور آپ اپنا آئیڈیل خود پیدا کرتے ہیں۔ پرچے کے مقاصد نہایت اعلیٰ اور نہایت ضروری ہیں۔ دعا ہے کہ اربابِ وطن کو آپ کا ہاتھ بٹانے کی توفیق نصیب ہو۔"

مشہور مصنّف و ادیب مسٹر سیّد حسن برنی بی۔ اے (علیگ) ایڈووکیٹ مصنف "البیرونی"

"شاہکار" پہنچا، بنا خزانہ کا دروازہ کھلا اور کھوئی ہوئی دولت پھر ہاتھ آئی۔ تاجور اسی کام کے لئے بنے ہیں اور یہ کام تاجور کے لئے۔ ماشاء اللہ آغاز اچھا ہے۔ خدا پروان چڑھائے۔ نظرِ بد سے بچائے اور اونچے اونچے درجوں پہ پہنچائے۔

شروع سال سے انتظار تھا۔ "شاہکار" آیا اور خوب آیا۔ ہاتھوں ہاتھ لینے کی چیز ہے۔ دیکھیں اس متاعِ شاہوار کے کتنے گاہک ہوتے ہیں۔ اس کی کامیابی ہمارے علمی و ادبی مذاق اور دلچسپی کی کسوٹی ہوگی۔ کوشش اپنا کام اور کامیابی خدا کے ہاتھ میں۔ آپ نے اپنے جنون میں اپنی ساری پونجی گنوا دی ہے اور ایثار کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ علمی و ادبی ذوقِ عشق کا ایک شعبہ ہے۔ اس کو وہی سمجھتے ہیں جو اس میں مبتلا ہوں۔ خدا آپکی مدد کرے۔"

مختصرا

محکمۂ تعلیم کی ایک اہم ضرورت

محکمۂ تعلیمات پنجاب السنۂ مشرقیہ و ملکیہ کی ترقی و نشوونما کی جانب سے گزشتہ چالیس سال سے بے پروائی برت رہا ہے۔ مشرقی و ملکی زبانوں کے استحقاق ارتقا اور ان کے اساتذہ کے حقوق ترقی سے محکمے کی یہ مسلسل بے نیازی آخر کب تک جاری رہے گی۔ اُس روز سعید کا آفتاب کب طلوع ہوگا۔ جب ہم اپنی زبانوں اور ان کے ذریعہ سے اپنی تہذیب کو اپنی متاعِ عزیز خیال کر کے ان کی حفاظت حمایت اور اشاعت کو ضروری خیال کریں گے۔

کیسا اندھیر اور کس قدر رنج دہ ہے کہ نصف صدی پہلے چند بے مغزوں نے جو راستہ نکال دیا ہے وہ منزلِ مقصود سے کتنا ہی دُور ہو اسی پر آنکھیں بند کئے اب تک چلے جا رہے ہیں۔

اس جرأت کی توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ اس راہ منزل ناآشنا کو ترک کر کے کوئی نیا اور سیدھا راستہ تلاش کریں۔

صورت حال یہ ہے کہ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر طلبہ کالجوں میں مشرقی و ملکی زبانوں سے یکسر نابلد ہو کر آتے ہیں۔ حالانکہ اُن میں اکثر تعداد اُن طلبہ کی ہوتی ہے جنہوں نے اسکول کی تعلیم میں کسی مشرقی اور ملکی زبان کو بطور لازمی مضمون لے رکھا تھا، لیکن ان زبانوں سے ان کی ناواقفیت بھی عموماً اُن طلبہ کے لگ بھگ ہوتی ہے جنہوں نے اسکول میں ڈرائنگ یا سائنس کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھا اور زبانوں کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ میٹرک کے فارسی یا عربی کورس کو رٹ رٹا کر امتحان میں بیٹھ گئے اور یونیورسٹی کے غلط طریقۂ امتحان سے فائدہ اُٹھا کر ان مضمونوں میں بھی پاس ہو گئے۔ بالکل یہی حال اُن کی اردو (ہندی) کا ہے کہ مڈل اور میٹرک کے پانچ سال اردو ہندی پڑھنے میں صرف کرنے کے باوجود اردو، ہندی زبانوں اور اُن کے ادبیات سے لگاؤ پیدا نہیں کر سکتے۔

میں نے اس مسئلے پر بہت کچھ غور کیا ہے اور ان زبانوں کے بعض صاحبِ علم و ذوق اساتذہ سے بھی تبادلۂ خیالات کرتا رہتا ہوں مسلسل سعی و جستجو کے بعد اس رائے پر پہنچا ہوں کہ ملکی اور مشرقی زبانوں سے ہمارے طلبہ کی بے خبری کے حسب ذیل اسباب ہیں:۔

(۱) ان زبانوں کے نصابوں کی بے مائگی اور غلط ترتیب۔

(۲) غلط طریقۂ تعلیم۔

(۳) غلط طریقۂ امتحان

(۴) سب سے آخری اور سب سے مؤثر علت اکثر معائنہ کرنے والے افسران کا ان زبانوں کے ادبیات سے نابلد اور ذوق ادب سے ناآشنا ہونا۔

اس تذکرے میں آنریبل وزیر تعلیم کو اس آخری وجہ کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

مجھے اس سلسلے میں ذاتی تجربہ ہے۔ اور بعض قابل اور اہلِ نظر اساتذہ کی رائے میرے تجربے کی تائید بھی کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صوبے کے تمام اضلاع کے افسران تعلیم میں السنۂ مشرقیہ و ملکیہ سے یا تو ناآشنائے محض اور یا نہ جاننے کی برابر جاننے والے حضرات کی کثرت ہے۔

یہ حضرات جب ان مضامین میں خود کورے ہوں تو ان مضامین کے اساتذہ کی تعلیمی کارگزاریوں سے کیسے واقف ہو سکتے ہیں۔ کبھی نہیں ہو سکتے۔

اور چونکہ اساتذہ میں زیادہ ایسے مدرسوں کی تعداد ہے جو ان زبانوں کے صرف امتحانات پاس کئے ہوئے ہیں اور ڈپلوموں کی مدد سے ان زبانوں کی تعلیم پر لگا دئے گئے ہیں، ورنہ ان زبانوں کے ادب سے مطلق لگاؤ نہیں رکھتے۔ وہ اپنا فرض صرف یہی سمجھتے ہیں کہ طلبہ کو غلط سلط کورس رٹا دیں اور انہیں امتحان میں کسی طرح پاس کرا دیں، خواہ انہیں کسی مضمون میں درک حاصل ہو یا نہ ہو۔

ادھر طریقۂ امتحان مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکا ہے۔ بے لیاقت مگر رٹنے والے طلبہ اس طریقۂ امتحان سے بیجا فائدہ اُٹھا کر ان مضمونوں میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ بے ذوق اور بے لیاقت مدرسین کی خام کاریوں پر یوں پردہ پڑ جاتا ہے۔

افسرانِ معائنہ عموماً ان زبانوں سے نابلد ہونے کے سبب استادوں کی بے سوادی اور قوتِ استعداد سے واقف ہی نہیں ہو سکتے، اس لئے وہ ایسے اساتذہ کی رہنمائی بھی نہیں کر سکتے۔

یہ اسباب مل جل کر زبانوں کو اتنا نقصان پہنچا رہے ہیں اور پہنچا چکے ہیں کہ اس کی تلافی دشوار ہو گئی ہے۔

میں ایک ہائی اسکول میں تین سال تک اردو فارسی اور عربی کی تعلیم دیتا رہا ہوں، مجھے افسرانِ معائنہ کی بے سوادی کا ذاتی تجربہ بھی ہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سیکنڈ مڈل کی عربی کا معائنہ کرنے ایک انسپکٹر صاحب تشریف لائے اور کتاب ہاتھ میں لے کر طلبہ سے کتاب کے مندرجہ سوالات کرنے لگے۔

طلبہ جو کچھ جواب دیتے آپ مندرجہ جوابات سے انہیں منطبق کر لیتے اور کسی جواب میں ذرا بھی تبدیلی پاتے تو مجھے ایک مغرور آقا کی نگاہ گرم سے دیکھتے اور کہتے "مولانا! آپ نے کیا پڑھایا ہے؟ لڑکوں کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔ آپ نے مولوی فاضل پاس کیا ہے یا نہیں؟"

میں نیا نیا اسکول میں مدرس بنا تھا اُن کے دو چار فقرے تو کسی طرح پی گیا، لیکن مسلسل عتاب برداشت نہ کر سکا۔

یہ میں اندازہ پہلی ہی بار کر چکا تھا کہ حضرتِ قبلہ عربی سے بالکل ہی کورے ہیں۔ میں نے لڑکوں کے جوابات کو جو واقعی غلط تھے، صحیح ثابت کرنا شروع کیا۔ چونکہ اس راہ کے رہنما تو کجا وہ رہرو بھی نہ تھے۔ میرے رُعب میں آ گئے۔ حیرت سے کہنے لگے "مگر کورس والا تو سوالات کے جوابات لڑکوں کے جوابات سے مختلف لکھ رہا ہے"

میں نے کہا "کورس بنانے والا آسمان سے تو نازل نہیں ہوا۔ سیکنڈ لنگویج کے طور پر عربی میں ایم۔اے پاس کر کے عربی کا اسکالر بن بیٹھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عربی کا ایم۔اے پاس کرنے والوں کو عربی کبھی منہ نہیں لگایا کرتی وہ تو عربی کتابوں کے انگریزی ترجموں کے صدقے میں اورینٹلسٹ بنے پھرتے ہیں۔ اُن سے ترجمے چھین لئے جائیں تو میری، آپ کی طرح عربی سے بے لگاؤ ہو جاتے ہیں۔"

اس پر وہ بہت بگڑے کہ معمولی ٹیچر نے اپنی بے لیاقتی میں انہیں کیوں شریک کر لیا۔ وہ اگر عربی سے کچھ آشنا ہوتے تو شاید مجھے اسکول سے جواب دلا دیتے۔ مگر اپنی کمزوری اور میری جرأت سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے کلاس کی عربی کے متعلق "ویری بیڈ" لکھ کر اپنے خیال میں مجھے سزا دے گئے۔

اسی قسم کا دوسرا ایک واقعہ مجھے دیال سنگھ ہائی اسکول میں پیش آیا، ایک مسلمان انسپکٹر جو ریٹائر ہو چکے ہیں سالانہ معائنے کے لئے تشریف لائے۔

اپنی فارسی دانی کے متعلق انہیں کچھ مغالطہ تھا، میں نویں جماعت کو فارسی پڑھا رہا تھا۔ کورس میں شیخ سعدی شیرازی کے اشعار زیرِ تشریح تھے۔

انسپکٹر صاحب نے طلبہ سے سوال کیا "بتاؤ! شیخ سعدی کا کیا نام تھا۔" طلبہ جواب نہ دے سکے، تو انسپکٹر صاحب نے میری بے لیاقتی کی جانب اشارے کرنے شروع کر دئیے۔ جماعت کے سامنے اپنی تجہیل و تحمیق مجھے ناگوار ہو رہی تھی۔ میں انتقام کی فکر میں تھا کہ انسپکٹر صاحب نے طلبہ کو محققانہ انداز میں بتایا۔ تم نے استاد سے کیا خاک پڑھا ہے۔ سعدی کا نام

"مَصلحُ الدین"

تھا۔ غرورِ تحقیق میں ایک خندۂ استہزا مجھ پر بھی ارزانی فرمایا۔

مجھے انتقام کا موقعہ مل گیا۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ طلبہ بے چارے اُس کے نام سے کیوں کر واقف ہو سکتے ہیں؟ جب ہم اور آپ بھی اُس نام سے ناآشنا ہیں۔" یہ الفاظ اُنھوں نے اپنی انسپکٹری کی زندگی میں پہلی بار سُنے تھے۔ چراغ پا ہو کر بولے:۔

"اور اگر سعدی کا نام مَصلحُ الدین ہی نکلا تو آپ کی کیا سزا؟"

میں نے کہا:۔

میں وہی سزا قبول کر لوں گا جو آپ اُس صورت میں کہ سعدی کا نام مَصلحُ الدین ثابت نہ کر سکنے پر اپنے لئے تجویز کریں گے۔

بولے:۔

"آپ ان لفظوں کی قیمت سے واقف ہیں؟"

میں نے کہا:۔

میں اپنے ہر لفظ کی قیمت اور موزونیت سے واقف ہوں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ مَصلح الدین دنیا میں کسی آدمی کا نام تھا نہ ہے نہ ہو گا نہ ہو سکتا ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ "مَصلح" کسی زبان کا لفظ نہیں۔ اصل لفظ مُصلِح ہے اور سعدی کا نام "مُصلِح الدین" تھا۔

اب وہ اپنی غلطی سمجھے اور بلندیوں سے اُترتے ہوئے میری

سطح پر آئے۔ کہنے لگے۔

"شکریہ۔ مصلح کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ جو آدمی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا ترقی نہیں کر سکتا، میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔"

میں نے جواب میں اپنے لہجے کی تلخی کے متعلق اظہار افسوس کیا اور اس طرح یہ حادثہ تکمیل سے پہلے ختم ہو گیا۔

ان واقعات کے نقل کرنے سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ السنۂ مشرقیہ وملکیہ کے معائنے کے لئے وہ اہلِ علم مخصوص ہونے چاہئیں جو ان زبانوں میں درک وافر رکھتے ہوں۔ ہر بی۔ اے، بی ٹی یہ مہم انجام نہیں دے سکتا۔

یہ مشکل اس طرح رفع ہو سکتی ہے کہ السنہ مشرقیہ وملکیہ کے ایسے اساتذہ کو انسپکشن لائن میں منتقل کیا جائے جو ان زبانوں کی تحصیل وتکمیل پر کچھ سال صرف کر چکے ہوں اور ان کے ادبیات پر بھی عبور رکھتے ہوں۔ ان صفات کے اہلِ علم وفضل کی کمی نہیں، محکمۂ تعلیم کے کارپرداز جستجو کریں گے تو انہیں اسکولوں ہی میں ان صفات کے ماہرین السنہ مل جائیں گے۔

ماہرین السنہ ہی السنہ کی تعلیم دینے والے اساتذہ کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں اور اُن کے نتائج امتحان، طریقۂ تعلیم اور قابلیت واستعداد اور اُن کے استحقاق کے متعلق افسران بالا سے سفارش کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح السنہ کے عام اساتذہ میں اپنے اپنے مضامین کے متعلق ذوقِ مطالعہ کو ترقی دینے، اپنی استعدادی خامیاں دور کرنے اور اپنے طلبہ میں مذاق لسانی پیدا کرنے کی ترغیب پیدا ہو گی۔ اسکولوں میں ایسے جامع قابلیت اور حاوی استعداد کے مالک اساتذہ کا قحط نہیں، ضرورت اتنی ہے کہ افسران بالا زبانوں کے اساتذہ کو ازراہِ کم بینی وحقیر شماری مدِ غیر ضروری کی حیثیت دینا چھوڑ دیں۔ ہر ڈویژن میں ایسے اساتذہ موجود ہیں۔ جو اپنے ڈویژن کے اضلاع میں مشرقی زبانوں کے مدرسین کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں

لیکن اس انتخاب میں ایک بات کا لحاظ نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ وہ اساتذہ جنہوں نے مولوی فاضل، منشی فاضل اور شاستری وغیرہ کے امتحانات پاس کئے ہیں اور اپنے مضمون میں وسعت نظر کے مالک ہیں صرف وہی اس خدمت کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں ورنہ فارسی، عربی اور سنسکرت کے ایم۔ اے جو انگریزی کے توسط سے فارسی عربی اور سنسکرت سے بالواسطہ متعلق ہیں اُن کے بس کا یہ روگ نہیں۔ کیونکہ مسلسل تجربات نے اس واقعیت کو تسلیم کرا دیا ہے کہ مشرقی زبانوں کے ایم۔ اے ان زبانوں کے ماہر نہیں ہو سکتے۔ ماہر ہونا تو درکنار وہ اسی فارسی عربی اور سنسکرت کی تعلیم دے سکتے ہیں جس کا انگریزی ترجمہ ان کے پاس ہو۔ ڈاکٹر نکلسن، اور ہیوَن کے ترجموں ہی نے انہیں ماہر لسانیات مشہور کر رکھا ہے، سیکنڈ لنگویج کی حیثیت میں فارسی، عربی، یا سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے سے یہ زبانیں کبھی آ ہی نہ آ سکتی ہیں۔

دیہاتی لائبریریاں

محکمۂ تعلیم دیہاتی بچوں اور بالغوں کو چار درجے تک تعلیم دے کر اپنے طور پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ بچے اور بوڑھے بس ضروری تعلیم حاصل کر چکے اور پھر اُن کی جانب سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ چوتھی جماعت پاس کرنے والے تعلیم کے بعد اپنے دیہاتی کاروبار میں لگ جاتے ہیں اور اپنے اوقات فرصت کو فضول باتوں اور بے نتیجہ بلکہ مخرب اخلاق گفتگو میں برباد کرتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ برائے نام تعلیم بھی آٹھ پہر جہالت ماحول میں رہتے رہتے سے لوح دماغ سے محو ہو جاتی ہے اور اس طرح محکمے کی چہار سالہ توجہ، سعی، روپیہ اور طالبعلموں کا وقت اور انرجی رائیگاں چلی جاتی ہے۔ دیہاتی تعلیم کی اشد ضرورت یہ ہے کہ خواندہ دیہاتیوں کی تعلیم باقی اور تازہ رکھنے اور اسے ترقی دینے کے لئے دیہاتی لائبریریوں کا سسٹم جاری کیا جائے۔ تاکہ خواندہ اہلِ دیہات، اپنے اوقات فرصت و لمحات تفریح کو بیہودہ باتوں میں برباد کرنے کی بجائے اپنی دیہاتی لائبریری میں جا کر کتابوں کا مطالعہ جاری رکھیں اور اپنے اَن پڑھ بھائیوں کو دیہاتی ترقیوں اور زندگی کے متعلق ضروری ہدایات سے باخبر اور خود اپنی تعلیم کو ترقی دے سکیں۔

دیہاتی لائبریری کے لئے مفید، دلچسپ اور تازہ ترین دیہاتی مسائل سے متعلق آسان زبان میں کتابیں لکھوائی جائیں۔ جن میں ترقی یافتہ ملکوں، ترقی پذیر دیہاتی اصلاحات اور نئی دنیا کی نئی اور فائدہ رساں معلومات کا بیان ہو۔

"چو ہے نامہ" اور "طوطا کہانی" جیسی مبتذل کتابوں کی اشاعت اور محکمۂ تعلیمات میں ان کی منظوری قطعاً بند ہو جانی چاہیئے۔

محکمۂ تعلیم دیہاتی مسائل سے باخبر اچھے مصنفین سے دیہاتی لائبریری کے لئے کتابیں لکھوائے اور ان لائبریریوں کو یہ کتابیں مہیا کرے۔

اسی صورت میں دیہاتی تعلیم پر جو وقت اور روپیہ صرف ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے اس کا نفع باقی رہ سکے گا۔

حیرت ہے کہ اس ضروری مسئلے پر محکمے نے اب تک کیوں نہیں توجہ کی۔ مسٹر برین کی دیہات سدھار تحریک کے زیر اثر جو ہر ضلع کے کمیونٹی بورڈ سے اخبارات اور رسالے جاری ہیں اُن کا موزوں مقام کباڑیوں کی دکانیں اور صحیح استعمال پنساریوں کی پڑیاں باندھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر ٹیچر اور افسرانِ تعلیم ان پرچوں سے اکتا چکے ہیں۔ ان پر روپیہ اور وقت برباد کیا جا رہا ہے۔

مختصر یہ کہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ڈائرکٹر اور آنریبل وزیر تعلیم کو اس اہم ضرورت کی جانب توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔

میٹرک کے امتحان کا نتیجہ

پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان کا نتیجہ شائع ہو چکا ہے۔ ۲۳ ہزار امیدوار شریک امتحان ہوئے تھے جن میں سے ۱۷ ہزار کے قریب طلبہ کامیاب ہوئے۔

یہ نتیجہ بظاہر بہت تسلی بخش ہے۔ صوبے کے بہت سے اسکولوں کا نتیجہ سو فیصدی رہا ہے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے زیادہ تعداد میں امیدوار امتحان میں بھیجے اور نوّے فی صدی سے لے کر ۹۸ فی صدی تک نتیجہ نکالا۔ اسی کے ساتھ اُن کے طلبہ کی زیادہ تعداد فسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی اور متعدد وظائف بھی حاصل کئے۔

اس نتیجے پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور ان کے اساتذہ شبانہ روز تعلیم و تدریس اور طلبہ کے مضامین کی تیاری میں منہمک رہتے ہیں۔

ہم اُن تمام محترم ہیڈ ماسٹروں اور معزز استادوں کو دلی مبارک پیش کرتے ہیں جنہوں نے اپنے حقوق ترقی سے محرومی، تاریکی مستقبل اور مشکلات مالی کی جانب سے آنکھیں بند کر کے اپنے فرائض تعلیم و تدریس کی ادائگی میں اوقات عزیز کو صرف کرتے ہوئے اپنے اپنے مدرسوں کی شان بڑھائی۔

اسی طرح وہ طلبہ بھی مستحق تہنیت و تبریک ہیں جنہوں نے اپنا وقت، صحت، دماغ اور روپیہ صرف کر کے اس خارزار کو طے کر لیا ہے۔ ہیں کامیابی حاصل کی، خدا انہیں طاقت، توفیق اور ہمت بخشے کہ وہ اپنی کامیابی کی آنے والی منزلوں کو بھی اسی سرخروئی کے ساتھ طے کریں۔

اسکولوں اور کالجوں کی تعطیلات

اسکولوں میں اساتذہ کو جتنا کام کرنا پڑتا ہے اُس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہوں نے اِس فضا میں زندگی کی کچھ ساعتیں گزاری ہوں۔

اسکولوں کے غریب اساتذہ روزانہ چھ چھ سات سات پیریڈ پڑھاتے ہیں۔ پھر اسکول سے خارج وقت میں بھی یونیورسٹی کی تیاری کے لیئے انہیں دسویں جماعت کو پڑھانا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ گھروں پر بھی عموماً طلبہ اپنے مضامین کی مشکلات حل کرنے کے لئے جاتے رہتے ہیں اور اس طرح صبح سے لے کر رات تک وہ اپنی بے شمار ذمہ داریوں کے پیشِ نظر تعلیم و تدریس ہی میں لگے رہتے ہیں۔ خانگی حالات کی دیکھ بھال اپنے بچوں کی تربیت اور ضروری سے ضروری ذاتی کاموں کی انجام دہی کے لئے بھی انہیں وقت نہیں ملتا۔ اس کے برعکس کالجوں میں پروفیسروں کو عام طور پر تین یا چار پیریڈ سے زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ کالجوں میں اسکولوں کی بہ نسبت متفرق چھٹیاں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ پھر پروفیسروں کو یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ اپنے پیریڈ پڑھا کر گھر چلے جاتے ہیں۔ کالج لگا رہتا ہے مگر اپنا کام ختم کرنے کے بعد کالج میں اُن کی موجودگی ضروری نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ کالج کی فضا اسکول کے ماحول کے مقابلے میں بہشت ہے لیکن مرتے کو مارے شاہ مدار موسم گرما کی تعطیلات کالجوں کو تو تین ماہ کی مل جاتی ہیں اور اسکول صرف چھ ہفتوں کے لئے بند ہوتے ہیں۔ اسکولوں کے ساتھ یہ بڑی بے انصافی اور کالجوں کے لئے حد درجہ کی جانبداری ہے۔ آنریبل وزیرِ تعلیم اور ڈائرکٹر صاحب کو اس بے انصافی کو پہلی فرصت میں دور کرنا چاہیئے۔

اسکولوں پر کچھ ایسا جمود اور خواب مرگ طاری ہے کہ اساتذہ اس فضا میں رہ کر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کوئی احتجاج نہیں کرتے۔ اسکولوں کی ٹیچرز ایسوسی ایشنیں اگر ہر ہر اسکول میں ریزولیوشن پاس کر کے محکمۂ تعلیم کو بھیجیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے اس جائز مطالبے کی جانب محکمہ توجہ مبذول نہ کرے۔

سر سکندر حیات کے خلاف غوغائے بے ہنگام

کانگریسی رہنماؤں کی سیاسی نیرنگی اب کچھ فہم و ادراک سے بالاتر ہوتی جاتی ہے۔

(۱) ایک جانب تو انہوں نے جدید دستور حکومت کو تباہ کرنے

کے بلند آہنگ دعوے کر کے اہل ملک سے ووٹ حاصل کئے کہ یہ دستور اُن کے خیال میں "دائمی غلامی کا پٹہ ہے" کمیونل ایوارڈ کو لعنت قرار دے کر تمام کانگریسی اور مہاسبھائی بہ یک زبان اس کے استرداد پر متحد ہو گئے۔ اس کا مطلب جو الفاظ سے متبادر ہے یہی ہو سکتا ہے کہ وہ مجالس قانون ساز میں جا کر حکومت سے ترک موالات کریں گے۔ اور حکومت کے لئے کاروبار حکومت کو چلانا ناممکن بنا دیں گے۔

(۲) دوسری جانب جب انہیں چند صوبوں میں اکثریت حاصل ہو گئی تو اب اُن سب وعدوں کو محبوب بیمان شکن کی صورت فراموش کر کے جدید دستور حکومت کو آئینی حدود میں کامیاب بنانے پر آمادگی کا اظہار کرنے لگے۔ بشرطیکہ گورنر یہ اطمینان دلا دیں کہ وہ آئینی حدود میں کانگریسی وزرا کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ حکومت سے تعاون کرنا چاہتے ہیں اور جدید دستور حکومت کو کامیاب بنانے پر رضامند ہیں۔

جدید و قدیم منطق کے کسی اصول پر تو یہ متضاد پالیسی منطقی نہیں ہو سکتی۔ غالباً شاعر نے کسی ایسے ہی غیر منطقی دماغ دار محبوب کے لئے کہا تھا۔

"با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد"

پھر حیرت در حیرت یہ ہے کہ جدید دستور حکومت سے تعاون کے لئے یہ انوکھی شرط پیش کر رہے ہیں کہ گورنر عدم مداخلت کا اطمینان دلا دیں۔ حالانکہ جس دستور سے تعاون کرنا چاہتے ہیں اس کی ایک ضروری دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر اکثریت کے وزرا کسی اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کرنے لگیں تو گورنر مداخلت کا حق رکھتا ہے۔ اس پالیسی سے یہ خطرہ غیر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت سے تعاون کی شرط اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ اسی لئے کانگریس کا صدر بہ بانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ

"ہندوستان میں کسی اقلیت کا وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا"

ادھر مہاتما گاندھی کا ارشاد ہے کہ

"اکثریت اقلیت سے بگاڑ کر ایک دن بھی حکومت نہیں کر سکے گی"

گویا ان کے نزدیک اقلیتیں ملک میں موجود تو ہیں اور اُن کے حقوق بھی ہیں لیکن خوش فہمی کے طور پر فرماتے ہیں کہ کوئی اکثریت اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کر کے حکومت نہیں کر سکتی۔

لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب کوئی اکثریت کسی اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کرنے لگے اور گورنر مداخلت کرنے کا مجاز نہ ہو تو اکثریت کے وزرا کو جو اپنی اکثریت کی تائید پر ایسا کرنا چاہیں کونسی طاقت روک سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع ... پر مہاتما جی کا اپریشن کوئی نہ سنے گا اور اقلیت منہ دیکھتی رہ جائے گی۔

فرض کیجئے کمیونل ایوارڈ کا مسئلہ ہے۔ اکثریت کے وزرا اس پر عمل درآمد کرنے سے گریز کرنے لگیں تو یہ ایوارڈ محض کاغذی حیثیت کا رہ جائے گا مسلمان سکھ اور اچھوت اپنے حقوق کو پامالی سے نہیں بچا سکتے۔ پھر ذرا غور کیا جائے کہ گورنروں سے مداخلت کا حق چھین لیا جائے تو اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کیونکر ہو سکے گی۔ گورنروں نے اعلان کر دیا ہے کہ ہم وزرا کی ذمہ داریوں میں ہرگز مداخلت نہیں کریں گے۔ بشرطیکہ وہ آئینی حدود میں رہتے ہوئے حکومتی کاروبار کو چلاتے رہیں۔ ہماری مداخلت تو بدرجۂ مجبوری صرف اُن خاص حالات میں ہو گی جب اقلیتیں اپنے حقوق سے محروم ہونے لگیں اور مفاد عامہ میں اختلال پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال اور مہاتما گاندھی کے ارشادات کا مفہوم ایک ہی ہے، اگرچہ صرف الفاظ اور پیرایۂ اظہار مختلف ہے۔ دونوں ایک طرح سے اقلیتوں کے وجود کو نہیں تسلیم کرتے۔ اس پالیسی کی موجودگی میں ہر صاحب انصاف یہ کہے گا کہ کانگریسی حکومت میں اقلیتوں کا کوئی مستقبل نہیں، وہ پولٹیکل شودر کی حیثیت میں رہ جائیں گی۔

کھتری کانفرنس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے پنجاب کے پریمیر نے اسی حقیقت نفس الامری کا اظہار فرمایا تھا جس پر کانگریسی اور مہاسبھائی پریس میں ایک شور بے ہنگام برپا ہے۔

تم حقائق کو جذباتی رنگ آرائیوں سے چھپا نہیں سکتے۔

گورنر اگر کانگریسی رہنماؤں کی شرط تعاون کو تسلیم کر لیں تو وہ اقلیتوں کے حقوق سے غداری کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔ اقلیتیں گوروں کی گورنمنٹ سے بھی اگرچہ اپنے تمام تر حقوق حاصل نہ کر سکیں، لیکن کالوں کا راج تو سیاسی برہمنوں کا راج بن کر انہیں دامن سیاست کا داغ سمجھتے ہوئے چھیل کر پھینک دے گا۔

کل کو پنجاب کی حکومت کانگریسی تسلط میں آ جائے تو سب سے

پہلے ایکٹ انتقال اراضی، ساہوکارہ ایکٹ، قرضہ ایکٹ، گوردوارہ ایکٹ کتاب قوانین سے مٹا دئے جائیں گے۔

کانگریس کے نعرہائے آزادی بہت دل خوش کن ہیں، اُس کے نصب العین سے بھی کسی سچے ہندوستانی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن اس نصب العین کو حاصل کرنے کے ذرائع پر آنکھ بند کرکے ایمان لانے کا اصرار درست نہیں۔ حقائق جذبات کی بجائے معقولیت کے طلبگار ہیں۔ جب تک ہندوستانیوں میں صحیح معنی میں قومیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس وقت تک اکثریت کی استبداد نما فرقہ داری سے ہر اقلیت کو بجا طور پر خطرہ رہے گا اور موجودہ صورتِ حالات کے پیشِ نظر کوئی اقلیت اپنے حقوق کو اکثریت کے رحم کے سپرد نہیں کر سکتی۔

کل کا دن ہے کہ پنجاب میں سر فضل حسین مرحوم کی متوقعہ حکومت کے خطرات کو بھیانک صورتوں میں پیش کرکے ان کے مقابلے میں سر سکندر حیات خاں کو کلکتے سے بلانے پر اصرار عام تھا۔ سر سکندر میں دنیا بھر کی نیکیاں تسلیم کی جاتی تھیں۔ اُنہیں بے تعصب، روادار اور جمہوریت پسند کے خطابات دئے جا رہے تھے۔ آج وہی سکندر حیات ہیں، اُن کے سیاسی خیالات بھی وہی ہیں۔ اُنہیں جمہوری خیالات کا اظہار اتحاد پارٹی کی حکومت کے ذریعہ متواتر ہو بھی رہا ہے، لیکن اب اُن میں دنیا جہان کے کیڑے ڈالے جا رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اُنہوں نے ایک حق بات کیوں منہ سے نکال دی۔ اقلیتوں کے حقوق کا لفظ اُن کی زبان پر کیوں آگیا!؟

اصل یہ ہے کہ کانگریسی رہنماؤں میں اکثروں کی تو نیت ہی صاف نہیں اور جن کی نیت صاف ہے وہ ملک کے حالات کو نظر انداز کرکے آئڈیلزم کی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں۔

اِس وقت نگاہ انصاف سے دیکھا جائے تو پنجاب کی اتحاد پارٹی اور پنجاب گورنمنٹ کے کابینۂ وزارت کی پالیسی وہی اتحادی پالیسی ہے جو کانگریس کا مطمح نظر ہے۔ اس کی جمہوری صورت کانگریس کی کاغذی جمہوریت سے بالکل مطابق ہے۔ اتحاد پارٹی اور حکومت کی ساخت بالکل کانگریسی ہے۔ لیکن موجودہ مہاسبھائی ذہنیت کے کانگریسیوں کو کوئی حکومت خوش نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ کیسی ہی آزاد خیال اور کسی قدر جمہوریت نواز کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اگرچہ کانگریسی رہنما منہ سے نہیں کہتے، لیکن اُن کا طرزِ عمل زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ

جس نیکی کا اظہار کانگریس کے ذریعہ نہ ہو وہ کوئی نیکی نہیں اور کانگریس کے ذریعہ جو کام انجام پائے خواہ وہ بے انجام یا بد انجام ہی ہو۔ اُس پر حرف گیری کرنے کا کوئی مجاز نہیں۔

صرف طفل تسلیوں اور خوش فہمیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ کانگریس اگر حقیقت میں اتحاد و ارتباط کی خواہاں ہے تو اُسے اقلیتوں کو مطمئن کرنا چاہیئے۔

اتحاد پارٹی اور سر سکندر حیات کو سیاسی گالیاں دینے سے کانگریسی رہنما اقلیتوں پر اپنا تسلط نہیں جما سکتے۔

فرقہ داری اور قابلیت کے ہوّے سے ڈرا ڈرا کر اقلیتوں کے حقوق زیادہ دیر تک غصب نہیں کئے جا سکتے۔

سر چھوٹو رام

آنریبل راؤ بہادر سر چھوٹو رام وزیر حکومت پنجاب کو ملک معظم کے جشن تاجپوشی کی تقریب پر سر کا خطاب ملا ہے۔

اگرچہ یہ خطاب ان کی رفعتوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتا کہ بعد از وقت حاصل ہوا ہے۔ لیکن بہرحال وہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ زود یا بدیر ان کی حق رسی ہو گئی۔ اِس خطاب کا موزوں وقت وہ تھا جب وہ ایک طویل مدت تک وزارت تعلیم کی اہم خدمات انجام دینے کے بعد اِس منصب سے سبکدوش ہوئے تھے۔

سر چھوٹو رام کے پیکر میں ایک جواں کار، جفاکش، کار آگاہ، قابل اور روادار رہنما کی خصوصیات جمع ہیں۔ انہوں نے ساری عمر غریب کسانوں کی امداد میں گزاری ہے، زندگی کی بہترین اور طویل ساعتیں صوبے کی زراعت پیشہ آبادیوں کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت میں گزاری ہیں۔ کسانوں کی زندگی ساہوکارے کے مصائب سے گھری ہوئی تھی، وہ ارب کا انبار در انبار قرضہ انہیں نیست و نابود کئے دے رہا تھا۔ سود در سود کے ناقابل شکست جال میں پھنسے ہوئے وہ تڑپ رہے تھے۔ سر چھوٹو رام اور ان کی اتحاد پارٹی کے ممبروں نے مجلس قانون ساز پنجاب میں ایسی مفید تجاویز کو قانون کی صورت دی جس کے سہارے پنجاب کے کسان بہت حد تک ان مصائب سے رہا ہو چکے ہیں۔

سر چھوٹو رام کی یادگار خدمات نے انہیں زندگی جاوید کا مستحق بنا

دیا ہے۔ اتحاد پارٹی خوش قسمت ہے کہ ایسا قابل، تجربہ کار، محنتی، مخلص اور غیر متعصب وزیر اُسے مل گیا۔

*

آغا حشر کی یادگار

مرحوم آغا حشر نے اردو ادب کے لئے ڈراموں کی صورت جو متاعِ گراں ارز مہیا کی ہے اس پر دنیائے ادب ہمیشہ فخر و مباہات کا اظہار کرے گی۔

آغا حشر کی موت درحقیقت اردو زبان کے لئے ایک حادثہ سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ حشر کسی زندہ قوم کا ڈراما نویس ہوتا تو اس کے مرنے پر مختلف صورتوں میں جگہ جگہ اس کی یادگاریں قائم کی جاتیں، مگر اس غلام آباد ہند میں زندہ اہل کمال کو کوئی نہیں پوچھتا تو مرنے کے بعد بھلا اُسے یاد کرنے کی زحمت کون گوارا کر سکتا ہے؟

آغا حشر کی موت کو چند ناکام ڈراما نگاروں نے اپنی ناکام ڈراما نگاری کے پروپیگنڈے کا ذریعہ بنانا چاہا تھا۔ چند روز مصنوعی بزمِ ماتم بچھائی گئی۔ حشر کی یادگار قائم کرنے کی تجویزوں سے آسمان سر پر اٹھایا گیا اور پھر چند روز کے بعد یہ تمام طوفان فرو ہو گیا۔

اس سلسلے میں حکیم احمد شجاع (علیگ) اسسٹنٹ سیکرٹری مجلس قانون ساز پنجاب سے گلہ ہے کہ انہوں نے حشر کی کوئی موزوں یادگار قائم کرنے کی سعی نہ کی۔ حالانکہ حشر مرحوم اپنی زندگی میں اپنا جانشین حکیم صاحب کو بنا چکے تھے۔ مرنے سے ایک ہفتہ پہلے بسترِ مرگ پر حشر نے کہا تھا "کہ مجھے اپنے مرنے کا کچھ غم نہیں، کیونکہ میری کمی کو حکیم احمد شجاع پورا کریں گے۔"

اس میں شک نہیں کہ حکیم صاحب جس رفیع سطح سے ڈراما نویسی کرتے ہیں، پیشہ ور ڈراما نویسوں کی وہاں نگاہ بھی نہیں پہنچ سکتی اور درحقیقت حشر مرحوم نے انہیں اپنا جانشین تسلیم کر کے اُن کے کمال کا منصفانہ اعتراف کیا ہے۔

بلند سوسائٹیوں میں حکیم صاحب کا دائرۂ تعارف بہت وسیع ہے وہ اِس اہم خدمت کو اپنے ذمے لے لیں تو یقیناً حشر کی موزوں یادگار قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ حکیم صاحب حشر کلب کے نام سے ایک مجلس کی تنظیم کریں تو انہیں ایسے ساتھی اور ممبر کثیر تعداد میں میسر آ جائیں گے، جن کی امداد و سعی سے حشر کے غیر فانی ڈرامے اپنی اصلی صورت میں مرتب ہو کر زیورِ طباعت سے آراستہ ہو سکتے ہیں۔ ان ڈراموں کو اچھا مرتب نصیب ہو گیا تو اردو ادب کے لئے بیش بہا سرمایہ بن سکیں گے۔

انجمن اردو پنجاب کا اجلاس

انجمن اردو پنجاب صوبے میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ کیفی اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر اور میاں بشیر احمد بی۔اے (آکسن)، بار ایٹ لا، ایڈیٹر "ہمایوں" سیکرٹری ہیں۔ انجمن اردو کی مجلس انتظامیہ اعلیٰ حکام، یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور عمائد کو شامل ہے۔

میاں بشیر احمد صاحب کی تمام تر توجہ انجمن ہی کی تعمیر کی نذر ہو رہی ہے۔ حضرت حفیظ ایم۔اے ہوشیارپوری تنخواہ دار اسسٹنٹ سیکرٹری کی حیثیت میں قابل قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ریڈیو پر ہر ہفتے انجمن کے زیرِ اہتمام اردو زبان میں اہم موضوعات پر لیکچروں کا باقاعدہ سلسلہ جاری ہے۔ مجالس علم و ادب میں تنقیدی مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ انجمن کا ماہانہ ایک ادبی جلسہ وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں ہوا کرتا ہے۔ اس جلسے میں ہر طبقے کے اہلِ ذوق شرکت ضروری سمجھتے ہیں۔

۲۷ مئی کو انجمن اردو پنجاب کا ایک ادبی جلسہ میری صدارت میں ہوا۔ آتش فشاں گرمی کے باوجود ہال کی تمام نشستیں پُر ہو گئی تھیں اور شرکاء جلسہ میں طلبہ کے علاوہ کالجوں کے اساتذہ، وکلاء، ادباء، اسمبلی کے ممبر، اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر کافی تعداد میں نظر آتے تھے۔

میں نے صدارتی تقریر میں اردو زبان کی شانِ ایجاد، اس کی ساخت ہندی اور پنجابی زبانوں سے اس کے عناصر کی ترتیب، ہندو ادباء اور شعراء کی قابلِ قدر اردو خدمات مسئلہ رسم الخط، وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس عام اور غلط خیال کی تردید کی کہ

"اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔"

اس سلسلے میں اس تاریخی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی کہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے اور ہندوستان میں ان کی حکومتی زبان فارسی ہے غدر کے بعد تک مسلمان ادیب اور شعراء اردو میں خط و کتابت کو ادبی تہذیب کے خلاف خیال کرتے رہے۔ اردو کا سب سے بڑا نثر نگار اور شاعر مرزا غالب اپنی اردو شاعری کو "مجموعۂ بے رنگ" اور اردو میں خط نویسی کا عذر ضعف دماغ بتاتا ہے۔

اس لئے یہ قول کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تاریخی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔

اس کے برعکس اردو زبان مختلف اقوام ہند کے ارتباط و اختلاط

کے سبب معاشری ضرورت کی حیثیت میں پیدا ہوئی اور درحقیقت اقوام ہند کے اتحاد کی ایک شاندار یادگار ہے - اس کی تعمیر میں بے شمار ہندو ادبا و شعراء کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا مسلمان اہلِ قلم کا - اور آج بھی اردو صرف ہندو اخبارات و رسائل، ہندو مصنفین، ہندو شعراء و ادباء اور ہندو پبلشروں کی وجہ سے روز افزوں ترقی کر رہی ہے (وغیرہ)

اس مناظرہ کے بعد مشاعرہ شروع ہوا - مشاعرے کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ حضرات شعراء کو دعوت نامہ بھیجتے ہوئے یہ درخواست کی گئی تھی کہ اس مجلس ادبی میں اپنے سب سے بہتر اشعار پڑھیں، چنانچہ حسب ذیل سخن طرازوں نے اپنے اپنے رنگ میں بہت دلکش نظمیں سُنا کر اہلِ بزم کو مسرور فرمایا -

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب ایم - اے - پی، ایچ، ڈی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی - خواجہ دل محمدؐ صاحب ایم - اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، مولینا نصر اللہ خاں صاحب عزیزؔ بی - اے مدیر روزنامہ زمیندار لاہور اردو ڈراما نگار حکیم احمد شجاع بی - اے (علیگ) سیکرٹری مجلس قانون ساز پنجاب - مولینا لنشترؔ جالندھری - پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم - اے دیال سنگھ کالج لاہور - حضرت احسانؔ ابن دانش - مولینا جلال الدین اکبر بی - اے، بی، ٹی ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول - پروفیسر رام پرشاد ناشادؔ ایم - اے -

نوجوان شعراء میں حضرات سراج الدین ظفر بی - اے، مسٹر مسعود حفیظ، سردار کرپال سنگھ بیدارؔ بی - اے، مسٹر پرشوتم لال ضیا، پروفیسر رامد تا مل ضیا ایم - اے - مسٹر دیا شنکر نظرؔ، قمر جلال آبادی وغیرہم نے اپنے رنگین و شیریں کلام سے اہلِ مجلس سے بہت داد و تحسین حاصل کی -

انجمن ارباب علم پنجاب کے یادگار ادبی جلسوں نے نوجوانوں میں ذوقِ ادب عام کر دیا تھا اور بہت سے مسلمان ہندو اور سکھ نادرہ بیان نوجوان اس سرزمین ادب سے اُٹھے تھے - آج انجمن اردو پنجاب کے اس شاندار جلسے میں اُس ذوق ادب کو دوبارہ کارفرما اور اُن سحر طرازوں کی آتش فشانیوں کو پھر آسماں پیما دیکھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی - چونکہ انجمن اردو کے اس جلسے میں لاہور کی تعلیم یافتہ جماعت شریک تھی - اس لئے یہ جلسہ عام ادبی جلسوں کی طرح شور و شغب سے بالکل پاک تھا - ترنم میں پڑھنے والے شعراء کے ساتھ تحت اللفظ پڑھنے والے شعراء بھی اس دورِ ترنم و تنغم میں حیرت انگیز حد تک کامیاب نظر آئے - ورنہ عام مشاعروں میں ترنم پذیری کے ہنگامے دیکھ کر میں تو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ تحت اللفظ پڑھنے والے سحر طرازوں کا عہد ختم ہو چکا ہے - شکر ہے کہ انجمن اردو کے اِس جلسے نے میرے خیال کی اصلاح کر دی -

تاجور

اہلِ قلم سے گزارش

چند ماہ سے شاہکار کے مستقل عنوانات باقاعدہ شائع نہیں ہو سکے - اس کی وجہ ادارہ کی غیر معمولی مصروفیت اور قلمی معاونین کی بے توجہی ہے - اِس لئے اہلِ قلم حضرات سے گزارش ہے کہ شاہکار کے مستقل عنوانات پر بھی خامہ فرسائی فرمائیں - مثلاً جو صاحب تعلیمات سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس موضوع پر پُر مغز مضمون تحریر فرمائیں، جن کو "تعلیمی ادارات" سے واقفیت حاصل ہو وہ اس عنوان کے ماتحت مختلف یونیورسٹیوں اور ان کی جدید علمی تحریکات پر روشنی ڈالیں - مذہبی اور قومی قسم کے تعلیمی اداروں کے متعلق بھی کچھ لکھا جائے -

"سینما" شہری زندگی کا جزو بن چکی ہے - کوئی صاحب اس موضوع پر فنی نقطۂ نظر سے تنقید کریں - "تنویرات" ایک اور عنوان ہے جس کے ماتحت جدید تحریکات، علمی تحقیقات اور سائنس کے جدید ترین انکشافات کے متعلق لکھا جا سکتا ہے -

مجھے امید ہے کہ یہ گزارش خالی نہ جائے گی اور اہلِ قلم حضرات خود بخود اپنے لئے موزوں موضوع منتخب کر کے اس پر مضمون لکھنا شروع کر دیں گے - ایسے تمام حضرات مجلس ادارہ کے رکن تصوّر ہوں گے اور شاہکار اعزازی طور پر مستقل ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا ؏

آہ منصور احمدؒ!

ناظرینِ شاہکار کو یہ سُن کر افسوس ہو گا کہ مولانا منصور احمدؒ ایڈیٹر "ادبی دنیا" تین ماہ کی علالت کے بعد ، رمئی کو اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے - اِس حقیقت کے پیشِ نظر یہ صدمہ اور بڑھ جاتا ہے کہ مرحوم کی عمر اس وقت بمشکل چھتیس سال کی تھی -

مرحوم کو اردو زبان و ادب سے عشق تھا - کئی سال تک آپ خیالستان اور ہمایوں کی ادارات کے فرائض انجام دیتے رہے - مولانا تاجور صاحب (مدظلہ) کی دست برداری کے بعد "ادبی دنیا"

کے معیار و وقار کو قائم رکھنا آپ ہی کا کام تھا۔ آپ نہ صرف کامیاب ایڈیٹر بلکہ سحر طراز شاعر، رنگیں بیاں ادیب اور بلند پایہ مترجم بھی تھے۔ نوجوانوں میں صحیح ذوقِ ادب پیدا کرنے کے بیحد شائق تھے اور اپنے اوقاتِ عزیزہ کا بیشتر حصہ نوجوان ادبا کو مشورہ دینے اور ان کے مضامین کی اصلاح میں صرف کیا کرتے تھے۔ ادبِ اردو کو آپ کی وفات سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کے لئے ایک مدت درکار ہوگی۔

اردو زبان کو اس وقت منصور احمد جیسے جاں فشانوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے مگر افسوس ہے کہ ان دو سال میں اردو ایسے ایسے نامور اہلِ قلم کی خدمات سے محروم ہوگئی، جن کی جگہ پُر کرنے والا نہیں ملے گا۔

ہم مرحوم کے لئے دعائے مغفرت اور ان کے اعزا و احباب اور ادارۂ "ادبی دنیا" سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

یزدانی

گلگشتِ خیال

کھڑے ہوئے ہیں مغبچے گلابیاں لئے ہوئے
گلابیوں کے سائے میں جوانیاں لئے ہوئے

یہ مستیوں کی بارشیں، یہ حُسن کی نوازشیں
فروغِ مے سے ہر جبیں ہی سرخیاں لئے ہوئے

یہ کس کا دستِ ناز ہے، جو محوِ انتظار ہے
ہری ہری ہبک ہبک، گلوریاں لئے ہوئے

رواں دواں ہیں چار سُو حسین و شوخ مغبچے
شراب سے بھری ہوئی صراحیاں لئے ہوئے

یہ کس کی زلفِ مشکبو، بکھر رہی ہے چار سُو
مرے گناہِ عشق کی سیاہیاں لئے ہوئے

شراب کو نہ کچھ کہو، شراب پھر شراب ہے
خنک ہوا کی موج بھی ہی گرمیاں لئے ہوئے

شرابِ حُسن، رنگ و بُو، بہار، نغمہ، ہاؤ ہو
یہ کس کی بزمِ ناز ہے تباہیاں لئے ہوئے

مرا خیال آ گیا مجھے کہاں لئے ہوئے

ماہر القادری

ڈیوک آف ونڈسر کی شادی

طویل انتظار کے بعد "تمثیلِ محبت" کا وہ آخری سین بخیر و خوبی انجام کو پہنچا، جس پر ایک مدت سے تمام دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں یعنی ۳ جون کو سرزمینِ فرانس میں ڈیوک آف ونڈسر (سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم) اور مسز وارفیلڈ (سابق مسز سمپسن) کی شادی ہوگئی اور یہ جوڑا "ڈیوک اینڈ ڈچز آف ونڈسر" کے نام سے منسوب ہوگیا۔

دنیا خصوصاً ہندوستان کا ہر فرد ڈیوک آف ونڈسر سے بیحد ہمدردی اور ان کے حالات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ انہوں نے محبت اور آزادیٔ ضمیر کے لئے تخت و تاج پر لات مار کر جس ایثار، بسالت اور آزادیٔ فکر و ضمیر کا ثبوت دیا وہ قابلِ صد تحسین ہے۔

اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی قابلِ ملاحظہ ہے، وہ یہ کہ اس شادی سے صرف تین روز پیشتر مسٹر بالڈون وزیر اعظم برطانیہ جنہوں نے اس رشتہ کی مخالفت کر کے شہنشاہ ایڈورڈ کو تخت سے علیحدگی پر مجبور کیا تھا خود بھی وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو کر گوشہ گیر ہوگئے ہیں۔ دنیا سب کچھ بھلا دیا کرتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ بالڈون کو بھی بھول جائے، لیکن ڈیوک آف ونڈسر کا نام تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

یزدانی

سوال و جواب

سوالات

(۱) لسان العصر اکبر اور مولینا حالی کی ادبی حیثیات میں مشترکہ اور ممتاز خصوصیات کیا کیا ہیں؟

(۲) مولینا آزاد اور مرزا غالب دونوں نثر کے بادشاہ ہیں ان کی طرز نثرنگاری کی امتیازی صفات پر روشنی ڈال کر ممنون فرمایئے۔

(پروفیسر) ضیا ایم۔اے
ڈی۔اے۔وی کالج لاہور

(۳) مولینا حالی کی اردو غزل نگاری پر ایک مختصر سا نوٹ حوالہ شاہکار کرکے ممنون فرمایئے۔

(لالہ) پیارے لال شاکر بی۔اے

(۴) پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے جو اسکولوں کے لئے جدید کورسز کی نئی اسکیم شائع کی تھی اُس کا کیا حشر ہوا؟

قاضی فیض محی الدین مسلم زمیندارہ ہائی اسکول
گجرات

جوابات

(۱) لسان العصر مولینا اکبر الہ آبادی اور خواجہ حالی کی مشترکہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(ا) دونوں کی شاعری مصلحانہ ہے۔

(ب) دونوں کی شاعری یادگار انقلاب ہے۔

(ج) دونوں کی شاعری کے جدید و قدیم دور قائم کئے جاسکتے ہیں۔

(د) دونوں مشرقی تہذیب کے حامی اور مذہبی منّاد ہیں۔

اِن کی ادبی حیثیات کی ممتاز صفات حسب ذیل ہیں۔

(ا) خواجہ حالی نثر نگار بھی ہیں۔اُن کی نثری تصانیف اردو ادب کی متاع گراں ارز ہیں۔

لسان العصر اکبر کی کوئی نثری تصنیف نہیں۔البتہ اُن کے بہت سے مکاتیب ہیں جو مختلف اشاعتی اداروں سے شائع ہوچکے ہیں لیکن کوئی مستقل تصنیف نہیں رکھتے۔

(ب) خواجہ حالی، ادب، شاعری، شعراء، سیاسی رہنماؤں ملی رسمیات و حالات، کے بہت بلند پایہ نقاد ہیں۔ان کے قابل قدر تصانیف حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب، نثر میں اور مدوجزر اسلام، دیوان حالی کی جدید نظمیں، نظم حالی کی نظمیں، نظم میں حالی کی نقادانہ حیثیت کے تنوع کی آئینہ دار ہیں۔

مولینا اکبر کی جدید شاعری مغربی تہذیب کے ہمہ گیر تسلط، مشرقی تہذیب کی پامالی، جدید تعلیم کے مضر نتائج، بدمذہبی، بے دینی، بے پردگی، فیشن پرستی کے خلاف ایک موثر و مسلسل صدائے احتجاج ہے۔ صرف یہی نہیں اکبر نے موجودہ دور زندگی کے ہر پہلو پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ وہ سرسید کے ذاتی طور پر دوست تھے۔لیکن ان کی تعلیمی و سیاسی پالیسی پر مختلف پیرایوں میں بار بار نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس بارے میں دوستی کی مروت کو قطعی حائل نہیں ہونے دیتے۔

بخلاف خواجہ حالی کے کہ وہ سرسید کے نہ صرف مداح بلکہ پیرو بھی ہیں بلکہ ان کی پالیسی کے مبلغ اور منّاد بھی۔ہزار صفحات کی حیات جاوید جو سرسید کی سوانح عمری، اُن کی تعلیمی، سیاسی، اصلاحی، ادبی معاشری، خدمات کے تفصیلی بیان پر حاوی ہے۔سرسید سے خواجہ حالی کی عقیدت کی شاہد ہے۔

(ج) اکبر تصوف کے دلدادہ ہیں۔اُن کی صوفیانہ شاعری سے سے زیادہ ان کے خطوط ان کو ایک صوفی ادیب کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں۔

خواجہ حالی جدید تعلیم یافتہ طبقے کے علمائے مذہب میں شمار ہوتے ہیں۔اُن کا مذہبی تقشف انہیں تصوف کے دائرے میں آنے سے روکتا رہا۔سرسید کے ساتھیوں سے تصوف پذیری کی توقع بھی کیسے ہوسکتی ہے۔

(د) اکبر کی جدید شاعری کا زیادہ حصہ ظریفانہ ہے۔بلکہ اکبر کی ظریفانہ شاعری ہی انہیں فسانہ ہر بزم و انجمن بنائے ہوئے ہے۔

خواجہ حالی کی شاعری متانت و ثقاہت کے دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالتی۔وہ گفتگو میں ظریف ضرور تھے۔شاعری

ہیں مرد مقدس نظر آتے ہیں۔

(۵) اکبر چونکہ ظریف شاعر ہیں اور ظرافت فنی پابندیوں کی پابند نہیں ہوا کرتی، اس لئے وہ اردو گرامر کے قاعدوں کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر اوقات ان قاعدوں کو توڑ کر ہی کلام میں ظرافت پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً

"کریما بہ بخشائے بر حال بندہ
کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ"

خواجہ قولاً اردو شاعری کی روز افزوں پابندیوں کے خلاف ہیں، لیکن عملاً ان پابندیوں کو توڑنا پسند نہیں کرتے۔

اکبر صرف شاعر ہیں اور حالی شاعر بھی ہیں اور مصنف بھی۔ مقرر بھی ہیں اور ادیب بھی، تعلیمی رہنما بھی ہیں اور عالم بھی۔

(۲) آزاد کی نثر تنقیدی تجزیہ و تحلیل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس نثر میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ آزاد کی نثر کو دیکھ کر علمائے معانی و بیان کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ بلند کلام میں خوبیاں پائی جاتی ہیں بیان نہیں کی جا سکتیں۔

"توجد و لا توصف"

اس کے اندازِ نگارش میں قدامت کی جھلک موجود ہے۔ لیکن تلمیحات و تشبیہات اور دلکش استعارات سے کلام کو الہام بنا دیتا ہے جس انداز میں اردو زبان کی ابتدائی درسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اسی عام فہم رنگ میں فلسفہ زبان جیسے دقیق مسئلے پر اظہار خیالات کرنے پر بھی قادر ہے۔ اسی سہل زبان اور اندازِ بیان میں تاریخی نکتہ آفرینیاں بیان کر جاتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایسی آسان زبان اور سہل انداز بیان میں لکھ کر ہم بھی آزاد جیسی نثر لکھنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ اس کی نثر تو سہل الممتنع ہے آسان معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا تتبع اور پیروی دشوار حد درجہ دشوار ہے۔

مرزا غالب کی نثر نصف صدی کے بعد بھی نئی ہے اور شاید ہمیشہ نئی رہے گی اس کے چھوٹے چھوٹے دلکش فقرے، اچھوتی تراکیب۔ نئے نئے الفاظ کی تراش خراش، اسلوبِ ادا، جدت بیان نے اس کی نثر کے فقروں کو جاندار بنا دیا ہے۔ ذوق بصیرت کو وہ فقرے کاغذ پر تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی خط کی عبارت کے کچھ فقرے مسجع و مقفیٰ ہیں ان میں بھی رنگ قدامت کو انداز بیان کی جدت نے مغلوب و مستور کر دیا ہے۔ یقیناً غالب کی نثر بھی اس کی شاعری کی طرح سہل الممتنع ہے۔

آزاد اور غالب کی ادبی حیثیتوں میں امتیاز یہ ہے کہ آزاد نثر کا شہنشاہِ مطلق العنان ہے اور شاعری کے کوچے کا فقیر۔ مرزا غالب نظم، نثر دونوں قلمرووں میں کوسِ "لمن الملکُ الیوم" بجا رہا ہے۔

(۳) خواجہ کی قدیم شاعری زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ حالی کی غزل نگاری کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) جذبات میں پاکیزگی اور متانت بلکہ ثقاہت ہے۔

(۲) خیالات میں غالب کی سی رفعت تو نہیں البتہ پستی سے بھی ملوث نہیں۔ اپنے معاصرین میں داغ کی سی عامیانہ معاملہ بندی سے اجتناب کرتے ہیں۔ زبان داغ کی زبان کی طرح صیقل نہیں اور روزمرہ داغ کے روزمرہ کی برابری نہیں کرتا۔ ہاں واردات عشق کے اظہار میں داغ سے بہت بلند اور ممتاز ہیں۔ پختہ مشقی اور قادر الکلامی، آمد اور اثر حالی کی غزلیات میں بہت ہے مگر بعض اوقات غزل کو اخلاقی وعظ بنا کر اس میں یبوست پیدا کر دیتے ہیں۔ ابتذال سے حالی کا کلام یکسر معرّیٰ و منزّہ ہے۔

شعر کی تعبیر میں داخلی عنصر سے زیادہ مدد لیتے ہیں۔

حالی غزل میں ایک رفیع المرتبت ثقہ اور پاکباز عاشق کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کا کلام خیالاتِ ہوا و ہوس سے خالی ہے۔ حالی کی غزلیات میں اوّل درجے کے اشعار جنہیں حالی کے نشتر کی حیثیت دی جا سکتی ہے کم نہیں ہیں۔ معاصرین کے کلام سے نسبتاً بہت زیادہ ہیں۔

(۴) پنجاب ایڈوائزری بورڈ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے کچھ مختلف چیز نہیں۔ بلکہ

"وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے"

نہ اس نے کچھ کیا تھا نہ بظاہر حال اس سے کچھ کرنے کی امید۔ اردو کورسز کی جدید اسکیم موجودہ فضا میں ناممکن العمل تھی۔ اس لئے معرضِ التوا میں پڑ گئی۔

نئی اسکیم کی کامیابی کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔

(۱) راز داری۔ اس کے بغیر نئی اسکیم ایک تماشے سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔ لیکن راز داری اس فضا میں عنقا کا حکم رکھتی ہے۔

بعض پبلشنگ فرمیں اس محکمے کی جزئیات کی عالم الغیب ہیں۔ محکمے کا ہر راز ان فرموں کی تلاش میں رہتا ہے۔ پھر جب یہ صورت ہو تو نئی اسکیم کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے۔

(۲) دوسری ضرورت تنقید نگاروں کے انتخاب کی ہے - اس کا حال یہ ہے کہ ہر کورس کے لیئے جو نقاد منتخب ہوں گے وہ عموماً اردو داں تو ضرور ہوں گے ان کا ماہر تعلیم بھی ہونا یہ مشکل سوال ہے اور جب تک ریویو کرنے والے دونوں حیثیات کے جامع نہ ہوں وہ تعلیمی کتابوں پہ تنقید کا حق نہیں رکھتے۔ مختصر یہ کہ رازداری اور نقادوں کے انتخاب کا مسئلہ لاینحل سوالات ہیں - اس لئے نئی اسکیم کا اجرا ابھی تشنۂ نمود رہے گا۔ **تاجور**

رباعیات

(۱)

کب تک یہ غرورِ جاہ و تمکین و وقار
کب تک مے نخوت سے رہیگا سرشار
آرائشِ کاشانۂ فانی بے سود
آثارِ تغیّر ہیں یہی نقش و نگار

(۲)

وہ جوششِ تمنّا کی نشانی نہ رہی
وہ کیف بہارِ زندگانی نہ رہی
اک خواب تھی یا وہم حقیقت سے جو دور
صد حیف! کہ وہ دن بھی جوانی نہ رہی

(۳)

دل زہد کی دنیا سے جو بیگانہ بنا
اک موجِ کرمِ ساقیِ میخانہ بنا
میں کیف سے خالی نہ رہا توڑ کے جام
جب چھوٹ گیا ہاتھ سے پیمانہ بنا

(۴)

انجامِ محبت کا جب افسانہ بنا
ہر نقشِ وفائے دل جدا گانہ بنا
فریاد و فغاں ہوئی عنادل کی سرشت
خاموش جو جلتا رہا پروانہ بنا

(۵)

بے برگیِ ہر شاخ ہے پیغامِ بہار
دیکھ اے دلِ افسردہ یہی ہیں آثار
ظلمت جو مٹی ہو گئی دنیا روشن
عالم نظر آتا ہے یہی لیل و نہار

دل شاہجہانپوری

کیریکٹر

دوستی ایک آسمانی رشتہ ہے اور سچے دوست کے بغیر زندگی کا یہ پُرخطر راستہ طے کرنا بیحد مشکل ہے۔ بہروپیوں کی اِس دنیا میں دھوکہ۔ بیوفائی اور سنگدلی ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ رشتہ داروں کی عہد شکنی، اذیت رسانی اور طنزیہ تبسم کے تاثرات کا بوجھ مسافر کے دماغ اور قدموں کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ اُس کے گرد وپیش تاسف اور احساسِ تنہائی کے یاس آمیز اندھیرے پھیل جاتے ہیں۔ تاہم اس حوصلہ شکن ظلمت میں اُمید کی تابناک کرن سچے دوست کی حسین اور پاکیزہ صورت میں تابندہ و روشن نظر آتی ہے۔ مسافر، دنیا کے سنگدل بیٹوں کی سرد مہریوں کے ہتھوڑوں سے چور سر کو اُس کے فراخ سینے سے لگا کر زمانے کی تمام کلفتیں بھول جاتا ہے۔ اُس کی گداز باہیں اُس کے جسمِ خستہ کو پناہ دے کر ایک حیاتِ تازہ بخش دیتی ہیں۔ اُس کی ایک نگاہِ لطف ایک دفعہ پھر اُس کے مردہ دل و دماغ میں حرکت و عمل کی بجلیاں بھر دیتی ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے۔ شاہ جی!" میں نے سگریٹ کی راکھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس دھوکے کی دُنیا میں سچے دوست کا وجود عنقا ہے۔" شاہ جی نے فیصلہ کُن انداز میں جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ عزیز دوست! دوست مِل سکتے ہیں لیکن اس کے لئے دل، رُوح اور نظر کی ضرورت ہے۔ دوستی کی دنیا میں ہم اپنی کمزوریوں کو بھول جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو اخلاق کے بلند ترین اور سنگین معیار کے برابر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوستی قائم رہ سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم دوستوں کو فرشتوں کی بجائے انسان سمجھیں اور اُن کی غلطیوں کو معاف کر دیں"۔

"اوہ! یہ کتابی باتیں ہیں منصور! مجھے کوئی عملی صورت دکھاؤ۔ تم دوستوں کی تعریف میں خطرناک طریق پر رطب اللساں ہو۔ تم نے بھی کوئی دوست پایا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ میں نے اپنا دوست دیوتاؤں کی بجائے انسانوں میں سے منتخب کیا ہے۔ شاید آپ باور نہ کریں شاہ جی! اُس نے اپنی ایک ایک چیز کو میرے قدموں پر نچھاور کر دیا ہے۔ وہ اپنی تمام پونجی لُٹا کر میرا اور صرف میرا ہو گیا ہے"۔

"یہ کیونکر ہو سکتا ہے منصور! مجھے اپنے کانوں پر دھوکہ ہو رہا ہے تمہارے یہ الفاظ سچ ہیں یا جھوٹ . . . . . . اُف میں کیا کہہ سکتا ہوں! میں دولت مند ہوں اور دولت سے خدائی بھی خریدی جا سکتی ہے، مگر دوست . . . ."

"دولت سے خدائی ضرور خریدی جا سکتی ہے۔ مگر محبت کا آشیانہ اس کی پرواز اور رسائی سے بہت بلند ہے۔ محبت کی قیمت سچے آنسوؤں اور خونِ جگر کی شفاف بوندوں کے سوا کچھ نہیں!"

"مثال! مثال! مجھے مثال دے کر سمجھاؤ۔ تمہاری شاعرانہ باتوں کے معمے میری سمجھ میں نہیں آتے۔"

"اُف! میرے خدا! تم اسے صرف شاعری ہی سمجھتے ہو؟" میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

دروازے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ایک لمحے میں سردار رچھپال سنگھ بیدی دروازے میں کھڑے مُسکرا رہے تھے۔

"منصور صاحب کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے . . . .
شاہ جی! انہیں کھانا کھانے کی اجازت دیجئے۔

سردار صاحب نے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سگریٹ کو کرسی کے نیچے چھپا لیا۔ لیکن دھُواں چھپانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے میرے چہرے کا رنگ ندامت اور فکر کی سیاہی بن کر دھوئیں کے ساتھ اُڑا جا رہا ہے

"آپ چلیئے! میں ابھی آتا ہوں!" میں نے اُن سے گھبراہٹ کے انداز میں درخواست کی۔

سردار صاحب کھڑے رہے۔ دھُواں ابھی تک میری کرسی کے نیچے سے میرے بائیں ہاتھ کے قریب بلند ہو رہا تھا۔ اُن کی نگاہیں دھوئیں کے پیچ و خم اور میری گھبراہٹ کا بغور معائنہ کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے دھوئیں کی پیچ در پیچ زنجیروں نے میرے

دماغ کو جکڑ لیا تھا اور میری روح ایک ناقابلِ بیان تیرگی میں تیر رہی تھی
انہوں نے رازدارانہ طریق پر مجھے دیکھتے ہوئے کہا "میاں تو دھوئیں
کے بادل اڑائے جا رہے ہیں - جلدی آئیے! میں آپ کا منتظر رہوں گا-
اتنا کہہ کر سردار صاحب چلے گئے - مگر میں نے دیکھا - اُن کے چہرے پر
اُن کے دلی جذبات کی کشمکش صاف طور پر نمایاں تھی - اُن کی نگاہوں میں
حیرت تھی اور لبوں پر تبسم - وہ تحیر اور محبت کی عظیم کشمکش میں مبتلا تھے -

"یہ کون تھے منصور صاحب؟" شاہ جی نے استفسار کیا -

یہ میرے دوست ہیں - سچے اور حقیقی دوست "

"دوست؟ ممکن ہے ، اس خوبصورت سادہ اور خوش انسان
کے دل میں محبت کا کوئی سانس موجود ہو "

"شاہ جی! آپ نے مثال چاہی تھی - سردار صاحب اس کی
زندہ مثال ہیں - سگرٹوں کے معاملے میں بلا نوشی کے باوجود میں
نے ان کے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پیا - محض اس خیال سے کہ شاید
میرے اس فعل سے انہیں تکلیف پہنچے - انہیں میرے سگریٹ
نہ پینے کا لازوال یقین تھا - بعض اوقات میرے دوستوں نے مجھے
سگریٹ پیش کیا تو انہوں نے فوراً کہا "یہ آپ کی خوش فہمی ہے
منصور سگریٹ نہیں پیتے" آج انہوں نے مجھے سگریٹ پیتے اپنی
آنکھوں سے دیکھا ہے - شاید انہوں نے محسوس بھی کیا ہو - انہیں
میرے یہ الفاظ کہ "میں سگرٹ سے نفرت کرتا ہوں -" ضرور یاد
آئے ہوں گے - مگر ان کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ تک
نہیں نکلا - تم اسے مجبوری سمجھتے ہو یا حد سے متجاوز جذبۂ دلکشی؟"

"ممکن ہے - انہوں نے میرے سامنے کہنا مناسب نہ سمجھا ہو -
اب آپ جائیں گے تو وہ ضرور شکایت کریں گے - "

"دیدہ باید" میں نے جواب دیا اور سردار صاحب کے کمرے
کی طرف روانہ ہو گیا -

کھانے کے میز پر سردار صاحب میرا انتظار کر رہے تھے -
مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے - اچھا ہوا! آپ آ گئے! انہوں
نے مسکراتے ہوئے کہا -

"مجرم کا اتنا احترام -" میں دل ہی دل میں منفعل ہو گیا - دھڑکتے
ہوئے دل کے ساتھ میں نے کھانا شروع کیا - کھانے کے دوران
میں ہم حسبِ معمول مذاق کرتے رہے ، ہنستے رہے اور کھاتے
رہے - لیکن اس واقعے کے متعلق سردار صاحب نے اشارہ تک
نہ کیا -

اس واقعہ کو ایک مدت ہو گئی ہے - ہمارے درمیان اختلاف
ہوتے ہیں لیکن کبھی اُس واقعہ کا تذکرہ نہیں ہوا - سگریٹ میں اب بھی
پیتا ہوں - لیکن سردار صاحب کی عدم موجودگی میں - اب بھی میں ، شاہ
جی اور سردار صاحب جب کبھی اکٹھے بیٹھتے ہیں ، تو آنکھوں ہی آنکھوں
میں اس واقعہ کو یاد کر لیتے ہیں - شاہ جی اب سردار صاحب کی تعریف
کرتے رہتے ہیں اور میں خاموشی سے مسکراتا رہتا ہوں!

منصور طارق

کرنول کے آخری تاجدار کی حکومت سے بیدخلی کے اسباب

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

بہرحال سلطنت کرنول کے بانی داؤد خاں کی سچی دوستی ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے، جس زمانہ میں داؤد خاں علاقہ کرناٹک پر حکمران تھے انہوں نے انگریزوں کو علاقہ مدراس کے پانچ اضلاع گرمائی مقامات کے استعمال کی غرض سے عنایت کئے تھے داؤد خاں کے غیاب میں سعادت اللہ خاں نے انگریزوں سے ان اضلاع کی واپسی کا مطالبہ کیا جب داؤد خاں کو اس خبر کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ان اضلاع کے معاوضہ میں اپنی ذاتی جاگیر کے ایک حصہ کا ایثار کیا اور اس طرح وہ پانچ ضلعے انگریزوں کے حق میں دائمی طور پر لکھ دئے گئے، اس اعتبار سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بانیوں کی خصوصی فہرست میں داؤد خاں کا نام نامی بھی شریک کیا جا سکتا ہے۔ صرف ایک دفعہ اور وہ بھی عارضی طور پر داؤد خاں نے انگریزوں سے بے اعتنائی برتی تھی یعنے شاہی احکام کی تعمیل میں ان کو قلعہ سینٹ جارج کا محاصرہ کر لینا پڑا - یہ کام محض ظاہرداری کے طور پر انجام دیا گیا تھا تاکہ شہنشاہ دہلی ان سے ناخوش نہ ہو جائیں - بہ الفاظ دیگر اس فعل سے داؤد خاں کا یہ مقصد تھا کہ انگریزوں کو یہ سبق سکھا دیا جائے کہ شہنشاہ کے غصہ کی روک تھام کیسے کی جا سکتی ہے اور یہ کہ اس عمل کی وجہ سے انہوں نے انگریزوں کی نجات کے لئے کیا کچھ کوشش نہیں کی ہے - ان حالات کی روشنی میں اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو بہ آسانی معلوم ہو جائے گا کہ برطانیوں کے سچے بہی خواہ اور حقیقی ہمدرد کون تھے برطانوی حکومت کی بعض ایسی حلیف ریاستیں بھی تھیں جو بالکلیہ کمپنی کی حفاظت، نگرانی بلکہ اس کے اقتدار کے تحت ہونے کے باوجود ہر وقت فتنہ و فساد اور شر انگیزیاں کرتی تھیں اور اپنے محسن یعنے کمپنی کی حکومت کے خلاف دوسری سلطنتوں سے سازشی مراسلت کرتی رہتی تھیں اور ایک سے زائد دفعہ ان کی بے وفائی بھی ثابت ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود حکومت نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا اور نشانہ بنایا تو ایک ایسی طاقت کو جو کمپنی کی سچی بہی خواہ اور ہر معاملہ میں اس کی دست راست بنی ہوئی تھی جس نے پہلے ہی مرحلہ میں کمپنی کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا تھا، اور جس نے صدق دل سے اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا تھا ایک ایسی ریاست کے والی جو اپنی ہمسایہ ریاستوں میں مقتدر مانے جاتے تھے، چاہتے تو کمپنی کو ناکوں چنے چبوا کر چھوڑتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے حکمرانوں نے دوستی کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے وقت ضرورت کمپنی کے مفاد کی خاطر ...... مال کے قطع نظر اپنے عزیزوں کی جان کے تک ایثار کو بے دریغ روا رکھا بالآخر اسی کو برے دن دیکھنے پڑے -

اس لحاظ سے برطانوی حکومت کے رحم و کرم کے واقعی حقدار داؤد خاں کے ورثا ر یعنے نوابان کرنول ہو سکتے تھے نہ کہ انوارالدین خاں اور اس کی اولاد - انوارالدین خاں کوئی خاندانی نواب نہیں تھا، وہ ایک نوخیز نواب تھا جسکو حضور نظام نے یہ عزت بخشی تھی، اور یہ فخر اس کے خاندان میں دو پشت سے زیادہ نہیں رہا، اس کے برخلاف کرنول کی حکومت مسلسل آٹھ پشت تک قائم رہی - جس کی مطلق العنانی کا سکہ پورے ایک سو چار سال تک جنوبی ہند میں مانا جاتا تھا، اس کے بعد یعنی سنہ ۱۸۰۲ء میں بعض سیاسی فائدوں کے تحت کرنول کی حکومت برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی نگرانی میں ہو گئی - کرنول کی حکومت کا بانی کوئی معمولی شخص نہ تھا بلکہ علاقہ کرناٹک کا سپہ سالار اعظم اور علاقہ دکن کا

وہ صوبہ دار جس کو خود شہنشاہ دہلی نے ۱۶۷۸ء میں ایک خاص فرمان کے تحت نامزد کیا تھا اس اعتبار سے خود داؤد خاں اور اس کے ورثا دہلی کے شاہی دربار سے کرنول کی نوابی کے استحکام اور قیام سے متعلق وقتاً فوقتاً اسناد شاہی حاصل کرتے رہتے تھے۔

مذکورہ بالا حالات کے قطع نظر اور تمام سازشی چالبازیوں کے باوجود حکومت وقت نے نوابان کرناٹک کی حمایت کی اور عمدۃ الامرا کی اولاد سے اظہار ہمدردی کیا، یہاں تک کہ جب عمدۃ الامرا کے لڑکے علی حسین نے معاہدہ کی شرائط سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا تو بجائے اس کے کہ کرناٹک کی نوابی کو ختم کر دیا جاتا حکومت نے علی حسین کے چچا زاد بھائی کو بالا کر تخت نشین کر دیا اور اس طرح کرناٹک کی نوابی پر عظیم الدولہ کا دور دورہ قائم ہو گیا۔

حکومت کی یہ مہربانی صرف عظیم الدولہ تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے تین پشت تک اس خاندانی نوابی کو قائم رکھنے میں مدد کی، اس کے بعد حکومت نے مناسب سمجھا کہ اس اقتدار کو توڑ دیا جائے چنانچہ خطاب نوابی کو برخاست کر کے حکومت نے اعظم جاہ کو شہزادہ ارکاٹ کے خطاب سے سرفراز کیا اور وہی خطاب خاندان ارکاٹ میں اب تک چلا آ رہا ہے شہزادہ ارکاٹ اور اس کے خاندان کو ۱½ لاکھ روپیہ سالانہ بطور معاش دیا جاتا ہے اور اس خاندان کے رہنے کے لئے امیر محل نامی عمارت مقرر کر دی گئی ہے۔

برطانوی حکومت نے اپنے دشمنوں اور ان کی اولاد کے ساتھ تو یہ سلوک کیا کہ ہر موقعہ پر ان کی مدد کی اور ہر وقت عنایت و مہربانی سے پیش آتی رہی لیکن ایک بے قصور اور بے گناہ شخص کو بلا کسی خاص وجہ کے بغیر سوچے سمجھے اس کے موروثی حق سے بے تعلق کر دیا اور نواب غلام رسول خاں کو محض شبہات کی بنا پر تخت سے علیحدہ کر دیا اور یہ شبہات بھی ایسے تھے جن کو بعد میں چل کر کمیشن نے بالکل دور کر دیا تھا۔ شاید یہ سلوک اس کا بدلہ تھا جو اولاً داؤد خاں نے انگریزوں کو علاقہ مدراس کے پانچ ضلع بطور مہربانی عنایت کئے تھے اور شاید حکومت کا یہ فعل داؤد خاں اور اس اولاد کی حکومت برطانیہ سے گہری اور سچی دوستی اور حکومت کے ساتھ ان کی ممکنہ اعانت و امداد اور ہر آڑے وقت ہر کام آنے کا بدلہ تھا؟ حکومت اس دن کو بھول گئی تھی جب داؤد خاں نے بطور دوستی و ہمدردی شہنشاہ اورنگ زیب کے حضور میں نووارد انگریز سوداگروں کی ہر روز سفارش کر کے جنوبی ہند میں ان کے دائمی قیام کی سند دلوا دی تھی، الحاصل مہربان حکومت نے اسی داؤد خاں کی اولاد کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کو تاریخ کے صفحات بطور نظیر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں چھپائے رکھیں گے تاکہ ہر وقت حکومت برطانیہ کے عدیم المثال کارنامہ کی یاد تازہ ہوتی رہے۔

یہ وہی حکومت ہے جو داؤد خاں کے رحم و کرم سے قائم ہوئی اور یہ وہی حکومت ہے جو سوداگری کے بھیس میں سانپ بن کر داؤد خاں، اس کی اولاد اور شاہ دہلی کو ڈسنے کے لئے آئی تھی اور یہ وہی حکومت ہے جو کسی زمانہ میں اپنے رہنے کے لئے نامور داؤد خاں کے آگے دست طلب بڑھانا جانتی تھی بالآخر یہ وہی حکومت ہے جس نے اپنے مشفق و مہربان اور سچے مربی کی بے گناہ اولاد کو اس کے موروثی حق سے بلا وجہ بے دخل کر دیا، غلام رسول خاں کو نوابی سے علیحدہ کرنا انتہائی احسان فراموشی تھی .... اور یہ ایک ایسا .... فعل ہے کہ جس کو دنیا کی بزدل سے بزدل قوم بھی روا نہیں رکھ سکتی، اگر حکومت کی نظر میں غلام رسول خاں واقعی نا اہل تھا اگر اس نے یہ فعل نیک نیتی سے اور ملک و رعایا کی ہمدردی کے خیال سے کیا تھا تو ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ حکومت نے اس معاملہ میں بھی وہی طرز عمل کیوں نہیں اختیار کیا جیسا کہ اس نے کرناٹک کے نواب کی برطرفی کے وقت کیا تھا غلام رسول خاں کے خاندان میں بہت سے قابل افراد موجود تھے، حکومت کو چاہیئے تھا کہ عظیم الدولہ کی طرح کرنول کی نوابی کے لئے بھی کوئی قابل فرد تلاش کرتی نہ یہ کہ ریاست اور سلطنت ہی کا خاتمہ کر دیتی، اب آپ خود بتایئے کہ حکومت کے اس فعل سے سوائے اس کے اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت کرنول کی نوابی کو ختم کرنے کا محض بہانہ تلاش کر رہی تھی ورنہ وہ غلام رسول خاں کے صلبی لڑکے کو اس کا جانشین کر کے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیتی حالانکہ مسٹر بلین اور مسٹر لشنگٹن نے اس امر کی ہر روز سفارش کی تھی کہ اگر حکومت نواب غلام رسول خاں کو حکومت کرنے کے قابل نہیں سمجھتی، تو اس کے لڑکے کو کرنول کا نواب بنا دیا جائے

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کمپنی نے اس سفارش کی طرف مطلق توجہ نہ کی حکومت نے کرنول کا ازسرِنو نواب بنانا مناسب نہیں سمجھا لیکن عمدۃ الامراء کے بھتیجے کو اور اس کے بیٹے اور پوتا پوتی کو ارکاٹ کے تخت کا وارث قرار دینا گوارا کیا اس فعل سے حکومت کے جس نیک ارادہ کا اظہار ہوتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

نواب غلام رسول خاں کے تین صلبی لڑکے تھے الف خاں، غلام محمد خاں، حیدر علی خاں پہلے اور تیسرے لڑکے کا انتقال بغیر کسی اولاد کے ہوگیا۔ دوسرے سے ایک لڑکا داؤد خاں بہادر بدقسمت نواب غلام رسول خاں کا واحد نمائندہ تھا اور غلام رسول خاں ہی کا نہیں بلکہ نواب داؤد خاں بانیٔ سلطنت کرنول کا جس نے اپنے آپکو سلطنت برطانیہ کا وفادار اور حقیقی مربی ثابت کیا تھا اور حکومت موصوف کی ایسے نازک موقعہ پر امداد کی تھی جب انگریز ہندوستان میں اپنے قدم جمانے اور اس ملک میں اپنا وقار قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، موجودہ داؤد خاں نوابان کرنول کی شاہی یادگار ہے اور عظیم الدولہ بہادر کی اولاد اس وقت حکومت ارکاٹ پر برسرِاقتدار ہونے کے باوجود داؤد خاں کی سی شان نہیں پیدا کرسکتی۔ اس لئے کہ حکومت برطانیہ نے عظیم الدولہ کی اولاد کو اپنے اختیار سے گدی نشین کیا تھا، عظیم الدولہ کے بیٹے اعظم جاہ کے بعد اس کی اولاد نرینہ غلام محمد غوث کو بھی حکومت کمپنی ہی نے کرناٹک کا حکمران بنایا تھا، غلام محمد غوث کے انتقال کے بعد حکومت نے کرناٹک کے خطابی نواب کو برخاست کرکے اعظم جاہ کے بھائی عظیم جاہ کو سالانہ چار ہزار روپے وظیفہ کے ساتھ برائے نام شہزادہ بنادیا تھا لیکن عظیم جاہ نے اس وظیفہ کے لینے سے انکار کردیا جسکی بنا پر حکومت نے اس رقم میں دگنا اضافہ کردیا مگر شہزادہ مذکور نے اس مقدار کو بھی قبول نہ کیا۔ تب ۱۸۷۱ء میں حکومت نے عظیم جاہ کو ارکاٹ کا باقاعدہ حکمران بناکر شہزادہ ارکاٹ کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور پندرہ توپ کی سلامی بھی مقرر کردی اس کی گدی نشینی ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند کے ایک شاہی فرمان کی بناء پر عمل میں آئی جس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"وکٹوریہ۔ خدا کے فضل و کرم سے ممالک متحدہ برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کی ملکہ، ایمان پناہ .... وائسرائے، گورنر جنرل گورنر اور تمام دوسرے عہدہ دار، وزراء اور رعایا سے مخاطب ہے

تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ما بدولت نے اپنی مہربانی سے اپنی معلومات اور ارادہ کی بناء پر اپنے سچے وفادار الشان اور عزیز رعایا عظیم جاہ امیر الامراء عمدۃ الملک سراج الامراء، اسد الدولہ ذوالفقار جنگ کو ریاست، شان و شوکت اور امیری ارکاٹ یا شہزادگی ارکاٹ کی عزت کے ساتھ ہندوستان میں مفتخر فرمایا ہے اور مذکورہ صدر عظیم جاہ امیر یا شہزادہ ارکاٹ کو ہندوستان میں ان مذکورہ عطایا کے ساتھ مقرر فرمانے یا اس عظیم جاہ امیر یا شہزادہ ارکاٹ ہندوستان کو اس کے نام ریاست، شان و شوکت اور عزت امیری یا شہزادگی سے مفتخر فرمانے کا اختیار ہمارے ورثاء اور ہماری اولاد کو بھی اسی طرح حاصل رہے گا جن شرائط کے ساتھ ہم نے انہیں عزت بخشی ہے مذکورہ صدر عظیم جاہ امیر ارکاٹ یا شہزادہ ارکاٹ کو ان کی زندگی تک یہ حق حاصل ہے کہ ہمارے فرمان کے مطابق علاقہ ارکاٹ پر حکومت کرے اور اپنے آخری ایام میں اپنے چار فرزندوں محمد بدیع اللہ المخاطب بہ ظہیر الدولہ محمد بدیع اللہ خاں بہادر فطرت جنگ، احمد اللہ المخاطب بہ ممتاز الدولہ احمد اللہ خاں بہادر رستم یار جنگ انتظام الملک، نور اللہ میاں المخاطب عمدۃ الدولہ محمد نور اللہ خاں بہادر جرأت جنگ غلام محی الدین المخاطب بہ معز الدولہ محی الدین .. یار خاں بہادر اصالت جنگ کو ان عمر اور مراتب کے اعتبار سے بالترتیب اپنا وارث و جانشین قرار دے اور اس ارادہ کے ساتھ ہمارے فرمان کے مطابق اور ان خاص شرائط مذکورہ کے ساتھ ہماری یا ہمارے جانشینوں کی مرضی ان کے شاملِ حال ہو صرف ایسے ہی حالات کے تحت امیر ارکاٹ اپنی کسی صلبی اولاد کو ریاست، شان و شوکت اور عزت عطا کرنے کا مجاز ہوگا جس کی وراثت کو ہم یا ہمارے جانشین تسلیم کریں شرائط مذکورہ کی تکمیل کی صورت میں ہم اپنی خوشنودی کا اظہار عظیم جاہ کی صلبی اولاد کو ریاست، شان و شوکت اور عزت عطا فرمایا کریں گے اور جو شخص قانوناً، شرعاً، رسماً اور رواجاً کی بناء پر وارث تخت و تاج قرار پائے گا ہم بھی صرف اسی شخص کو امیر ارکاٹ یا شہزادۂ ارکاٹ کے خطاب عالی سے مفتخر فرمائیں گے۔

مذکورہ بالا عطایا کی پابندی کرتے ہوئے ہم یا ہمارے جانشین مذکورہ صدر عظیم جاہ کو اپنے فرمان کی مطابقت میں امیر ارکاٹ یا شہزادہ ارکاٹ کا خطاب دے کر ہر اسم مروجہ ملک کے مطابق گدی نشین کرتے ہوئے مناسب شان و شوکت اور عزت

ہے۔ سرفراز فرماتے ہیں لیکن بعض خاص وجوہات کی بناء پر گدّی نشینی کی یہ رسم بالکل سیدھی سادی اور بغیر کسی غیر معمولی شان و شوکت اور زرق برق کے انجام پائے گی، امیرارکاٹ کی شہزادگی کے استحکام کی خاطر ہم یہ مزید عنایت کرتے ہیں۔ کہ ہمارا یہ فرمان خود ہماری شاہی مہر سلطنت متحدہ برطانیہ عظمیٰ اور آئرستانی حکومت کی مستند علامت کے ساتھ تم کو مرحمت فرماتے ہیں تاکہ آئندہ زمانہ میں تم اور تمہاری اولاد کو بطور سند کام آسکے، بمقام وسٹ منسٹر بتاریخ ۲ر اگست ہماری حکمرانی کے چونتیسویں سال میں خود ہم نے اس فرمان کی تصدیق کی ——

حسب فرمان مبارک شاہی مُہر کے ساتھ،

شرح دستخط

سی - او ملی"

عظیم جاہ کے ساتھ جو ایک بڑی مہربانی کی گئی وہ قابل ملاحظہ ہے کہ خود اس کے خاندان کو "خاندان ارکاٹ" تسلیم کرلیا گیا اور خود اس کو سالانہ تین لاکھ روپیہ بطور وظیفہ دئے جانے لگے لیکن اس رقم کے نصف حصّہ کا مالک اس کا خاندان تھا اور یہ وظیفہ ان پُرزور الفاظ کے ساتھ منظور ہوا تھا کہ جب تک سلطنت ہند پر پرچم برطانیہ لہراتا رہے گا۔ اس وقت تک خاندان ارکاٹ اس مقررہ رقم سے مستفید ہوتا رہے گا اور اسی طرح عظیم جاہ اور اس کی اولاد یکے بعد دیگرے شہزادگی ارکاٹ کے خطاب اور امیری ارکاٹ سے مفتخر ہوتی رہے گی، ان عنایات کے علاوہ عظیم جاہ کو مزید ایک ہزار روپے کی رقم بطور کرایہ مکان مرحمت ہوتی تھی حالانکہ اس کے رہنے کے لئے سرکاری خرچ سے امیر محل کا مکان تیار کروایا گیا تھا جس میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتا بھی تھا ان تمام مہربانیوں کے علاوہ حکومت نے ایک زبردست مہربانی یہ کی کہ عظیم جاہ کے جملہ سابقہ قرضوں کی ادائی کے لئے ۱۸۷۲ء میں بارہ لاکھ روپے کی کثیر رقم منظور کی اور اس طرح عظیم جاہ اور اس کے خاندان کو ایک بھاری بوجھ سے بالکل نجات دلائی گئی ——

یہ امر قابل غور ہے کہ عظیم جاہ نواب عمدۃ الامراء کے اسی بھتیجے کا لڑکا تھا جس نے برطانوی حکومت سے کئی مرتبہ دغا کی تھی اور ہر وقت اقتدار اعلیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتا تھا، ایک ایسے دشمن کی اولاد کے ساتھ حکومت نے جو بھی سلوک کیا اوپر کی سطروں میں ظاہر کردیا گیا ہے اور نواب کرنول کے وفادار خاندان کے ساتھ جو بھی سلوک ہوا اس سے بھی قارئین کرام بخوبی واقف ہیں کہ نواب کرنول کے پورے خاندان کے لئے سالانہ اکاسی ہزار روپے کا وظیفہ منظور کیا گیا جس میں سے وارث اصلی یعنی نواب غلام رسول کے پوتے محمد داؤد خاں بہادر کو صرف چارسو روپے ماہوار کا وظیفہ دیا گیا، لیکن اس مقدار میں آہستہ آہستہ اضافہ کرکے سات سو روپے ماہوار کیا گیا ہے، داؤد خاں بہادر جو زیادہ تر شاہ قلندر داؤد قادری کے نام سے مشہور ہیں اور یہ نام انہوں نے اپنے خلیفہ یا پیرومرشد سید شاہ عبداللطیف عرف شاہ محی الدین صاحب قادری کے نام پر رکھا ہے، بہادر موصوف مرحوم نواب کے واحد زندہ پوتے اور خاندان کرنول کی واحد مرد یادگار ہیں، اگرچہ صاحب موصوف اصلی شان و شوکت کے اعتبار سے نواب کرناٹک سے کہیں بلند رتبہ رکھتے ہیں لیکن حکومت نے انہیں جس حالت میں رکھا ہے وہ امیر ارکاٹ عظیم الدولہ بہادر کے ایک معمولی ملازم کی شان تک کے مساوی نہیں خود عظیم الدولہ کے مرتبہ سے ہر شخص واقف ہے کہ اس کی حیثیت ایک معمولی وظیفہ خوار سے کچھ زیادہ نہیں۔

کرنول کے مرحوم نواب غلام رسول خاں کے متعلق ہم نے بارہا لکھا ہے کہ وہ ایک بے گناہ شخص تھا اور اس نے برطانوی حکومت کے ساتھ کبھی دغا نہیں کی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے وارث حقیقی اور واحد نمائندے محمد داؤد خاں بہادر کو نواب ہی بنایا گیا، نہ کم از کم شہزادہ کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا اور نہ ہی کوئی ایسا وظیفہ جاری کیا گیا جو سالم پشت در پشت جاری رہ سکے بلکہ اس کی بجائے ایک مظلوم کے مصائب میں اضافہ کرنے کے لئے سنہ ۱۹۲۰ء میں حکومت نے یہ حکم جاری کیا کہ داؤد خاں کا موجودہ وظیفہ مبلغ سات روپے ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس لئے اس کو گھٹا کر دو سو روپے کردیا جائے اور صرف یہی رقم پورے خاندان کی کفیل ہو۔ باقی پانچ سو روپے سرکار داخل کردئے جائیں، آجکل ... داؤد خاں اپنے قدیم آبائی خستہ اور بوسیدہ محل میں حکومت کی اجازت سے مقیم ہے یہ وہی عمارت ہے جس کی تیاری میں ابتداً تین لاکھ روپے صرف ہوئے تھے اور آج کس مپرسی کے باعث اس شاندار عمارت کے مختلف

جھڑے گر رہے ہیں اور شاہی محل کھنڈر کا نمونہ پیش کر رہا ہے ۔ اس غریب اور مظلوم شخص میں اتنی سکت کہاں کہ ایسے عالی شان مکان کی مرمت کے لئے رقم پیدا کرے چونکہ یہ محل حکومت کے قبضہ میں ہے ۔ اس لئے اس کا فرض تھا کہ اس کی تعمیر و ترمیم کی طرف توجہ کرتی لیکن حکومت کا طرزِ عمل اور بے توجہی یہ بتا رہی ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ نواب کرنول کی کوئی یادگار بھی باقی نہ رہے۔

کچھ تو ضعیفی اور بہت کچھ حکومت کے دل شکن رویہ کے سبب داؤد خاں کی صحت تباہ ہو گئی ہے، پچھلے پچیس سال سے وہ گٹھیا جیسے ..... تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہے ۔ ایسے مریض کے لئے تو عربستان کی سی گرم آب و ہوا کی ضرورت تھی لیکن غریب جائے تو کیسے، دو سو میں اپنا پیٹ پالے ملازمین کی تنخواہیں دے اور خاندان کے دوسرے افراد کی سربراہی کرے یا اپنی بیماری اور اس کے علاج کی فکر۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کو چلے جانا آسان نہیں اور وہ بھی ایک بیمار انسان کا اس کے ساتھ کوئی دیکھ بھال کرنے والا اپنا پرایا یا کم از کم ایک آدھ ملازم تو ہو، آنے جانے کے اخراجات سفر وہاں رہنے اور کھانے پینے کا خرچ نیا مقام نئی جگہ ایک کی جگہ دس کا خرچ ہونا ضروری لہذا داؤد خاں جیسے محدود آمدنی والے مفلوک الحال اور مظلوم بیمار کے لئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنی صحت اور جان کا بھی خیال رکھ سکے، اس میں شک نہیں ہر شخص کو جان عزیز ہوتی ہے، خراب سے خراب کردار کا انسان بھی چار دن زیادہ جینے کی فکر کرتا ہے کسی کو بھی موت نہیں بھاتی لیکن یہ غریب مصیبت کا مارا درد و الم کی داستان اور مصائب کا سراپا سوائے موت کے اور کیا چاہتا ہوگا واقعہ ہے ایسی..... زندگی سے تو موت ہی زیادہ بہتر ہوتی ہے ایک قبیلہ پرور اور ایسے آن بان کے انسان کے لئے دو سو روپے دو کوڑی کے برابر بھی نہیں نہ معلوم ان کی گزر کس طرح ہوتی ہوگی، ایک اتنا بڑا خاندان دو سو روپے میں جوار کی روٹی پانی میں بھگو کر کھانے کے باوجود اپنے پیٹ کی آگ پورے طور پر نہیں بجھا سکتا ۔ اب آپ خود غور فرمائیے کہ ایسا مفلس اور تنگ دست شخص بجائے دوا کے خیال کے موت کی دعا کرے تو کیا بے جا ہے ۔

الحاصل اس کی قلیل آمدنی شاید اس کی معمولی ضرورت تک کو پورا نہ کر سکے ۔ پھر تبدیلِ آب و ہوا کا وہم و گمان بھی کیسے ممکن ہے، اس کی آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ تو ہے نہیں سوائے اس کے کہ مصائب کو خوشی سے برداشت کرے اور توکلت علی اللہ کے نعرے لگاتا رہے، سنتے ہیں کہ بعض اوقات بڑوں کے گناہ کی سزا آل اولاد کو بھی بھگتنی پڑتی ہے مگر داؤد خاں کے بزرگوں نے نیکی کے سوا کوئی کام نہیں کیا تھا اور شخص مذکورہ ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہا ہے، اس کے دادا نواب غلام رسول خاں نے حکومت برطانیہ کے ساتھ وہ نیک سلوک کیا ہے جو شاید ایک باپ اپنی اولاد کے ساتھ بھی بمشکل ہی کرتا ہو ۔ لہذا ایک ایسے محسن کے پوتے کے ساتھ ہم جسقدر بھی اظہار ہمدردی کریں کم ہے داؤد خاں ایک ایسے نواب کا پوتا ہے جس کا دادا مسند نشین اور شاہی اقتدار کا مالک تھا لیکن افسوس کہ ایسے شخص کی حالت آج کے زمانہ میں عوام کی حالت سے بھی گری ہوئی ہے ۔

یہاں تک تو آپ نے غلام رسول خاں کے پوتے کے حالات سنے، لیکن اب ہم مرحوم نواب کی بیٹیوں کے دل شکن حالات بھی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں تاکہ عوام پہ یہ ظاہر ہو جائے کہ سونے اور ہیرے جواہرات میں تولی ہوئی اور سیج پر سوئی ہوئی اولاد کے نازک جسم مہربانِ حکومت کی عنایتوں سے سختیوں کی تاب لانے کے قابل بن گئے تھے، عورتوں کے نام جو وظیفہ جاری ہوا وہ تاحیات ہے حالانکہ ان وظائف کے اجراء سے پیشتر یہ کہا گیا تھا کہ نواب غلام رسول خاں کی اولاد کو بھی ویسے ہی وظائف دیئے جائیں گے جس نوعیت کے وظائف کرناٹک اور ٹیپو سلطان کے شاہی خانوادوں کے نام جاری کئے گئے ہیں، لیکن بعد میں عمل کر حکومت کے قول و فعل کا فرق بخوبی ظاہر ہو گیا کرناٹک کے ہر ایک خطابی نواب کے نام سالانہ بارہ لاکھ روپے کا وظیفہ منظور ہوتا رہا، اس کے علاوہ نواب کے خاندان کے دوسرے افراد اور رشتہ داروں کے نام جو رقمیں منظور ہوتی تھیں وہ علیحدہ ہیں بہرحال وظائف کے اجراء کا طریقہ یہ تھا کہ مرد کے نام جو رقم منظور ہوتی تھی اس کا نصف عورت کے نام جاری کیا جاتا تھا اصل وظیفہ خوار کے مرنے پر مابقی رقم اس کی اولاد یا ورثاء میں تقسیم کر دی جاتی تھی اور ان وظیفہ خواروں کی موت واقع ہونے کی صورت میں یا ان کے ورثاء جو وظیفہ کے مستحق قرار پاتے تھے ان کے

مرنے پر بھی وہی چارہ کار اختیار کیا جاتا تھا جس کی تفصیل پہلی شکل میں بیان کر دی گئی ہے اور یہ سلسلہ عرصہ دراز تک قائم رہتا تھا، دوسرے معنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نوابان کرناٹک کی اولاد یا ورثا کو موروثی وظائف دئیے جاتے تھے لیکن کسی صورت میں بھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ وظیفہ جس شخص کے نام منظور ہوا اسی تک محدود رہے یعنی تاحیات ہو مگر یہ انوکھی شکل مرحوم نواب کرنول کی ستم رسیدہ لڑکیوں کے وظائف میں نظر آتی ہے۔ اس ناانصافانہ طریق کار کا نتیجہ ہم اپنی آنکھوں سے مجبوراً دیکھ رہے ہیں اور آٹھ آٹھ آنسو بہا رہے ہیں کہ مرحوم نواب کی نواسیاں جن کا نانا کسی زمانہ میں سلطنت کرنول کی مسند پر فاخرانہ شان سے بیٹھ کر حکومت کرتا اور سرزمین کرنول کی رعایا کا آقا اور مالک کہلاتا تھا آج اسی نامور حکمران کی نواسیاں گدائے بے نوا کی طرح اسی سرزمین کی خاک چھان رہی ہیں اور اسی محکوم رعایا کے آگے دست طلب بڑھا رہی ہیں انہیں کھانے کے لئے کھانا اور پہننے کے لئے کپڑا تک برابر میسر نہیں، ان کی آل اولاد اچھی بُری چیز کے لئے بلبلاتی ہے اور یہ خود اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ترستی ہیں۔ بہرحال یہ ایک ایسے نواب کی آل ہے جس کے ادنیٰ غلاموں کی آل اولاد ان سے کہیں بہتر حالت میں تھی۔

(باقی آئندہ)

غلام محمد خاں (عثمانیہ)

مناظر

وہ چاندنی چھٹکی ہوئی راوی کے کنارے ‏ ‏ پانی میں چمکتے ہوئے ضوریز ستارے

غنچوں کے لبِ سرد پہ ہلکا سا تبسّم ‏ ‏ کلیوں کی نگاہوں میں بلاخیز اشارے

مدہوش گھٹاؤں میں چمکتی ہوئی بجلی ‏ ‏ اُڑتے ہوئے تاریک فضاؤں میں شرارے

گلزار کے ہر کونے میں اُتری ہوئی پریاں ‏ ‏ آبادیِ گلشن کے حسیں راج دلارے

کہسار کے پہلو میں گرجتے ہوئے بادل ‏ ‏ میدان میں سہمے ہوئے آہو کے ترارے

سبزے کی مسہری پہ وہ پھولوں کا تکلّف ‏ ‏ پودوں کو سنبھالے ہوئے جھونکوں کے سہارے

نوخیز شگوفوں کا چمن زارِ جوانی ‏ ‏ شاخوں کا لچکنا وہ بہت بوجھ کے مارے

مہتاب سے اُتری ہوئی پُرنور شعاعیں ‏ ‏ چاندی کے سمندر میں نہائے ہوئے تارے

تڑپاتے ہیں کیوں مجھ کو یہ پُر لطف مناظر
کیوں مجھ کو رُلاتے ہیں یہ بدمست نظارے

سید فیضی جالندھری

دل و دماغ

دماغ کیا ہے، خیالات کا خزانہ ہے — اسی کے زیرِ نگیں وقت اور زمانہ ہے
شعور و علم کی مانند بیکراں ہے دماغ — طلسمِ شام و سحر کا مزاج داں ہے دماغ
جہانِ معنیٔ حیرت طراز رکھتا ہے — ہزار گوہرِ تحقیق و راز رکھتا ہے
صنم گری کے معارف کا شعبہ مقام ہے یہ — نگار خانۂ خلّاقیٔ دوام ہے یہ
طلسم و سحر و کرشمہ کی کارگاہ ہے یہ — ہر اک رفیع تخیّل کی بارگاہ ہے یہ
مگر دماغ کے ڈھالے ہوئے بتوں کا جمال — ہے بے حرارت و بے آب و ناشناسِ جلال
نہ دل کا سوز اگر جاں طراز ہو اُس میں — جو بیقرار نہ روحِ گداز ہو اُس میں
دماغ ایک تخیّل ہے، دل شباب اُس کا — دماغ ایک جہاں ہے، دل آفتاب اُس کا

دماغ ہیچ ہے، دل کا اگر ظہور نہ ہو
کہ آفتاب بجھے تو جہاں میں نور نہ ہو

عدمؔ

گلریزیٔ خیالؔ

(خیالؔ مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام حضرت واسطی نیوڑی)

نواب سید نصیر حسین خیالؔ عظیم آبادی (خلد آشیاں) اردو کے بہترین نثار تھے۔ اُن کی تحریروں میں ہر جگہ ایک ہی آمد اور ایک ہی طرح کی روانی و ہمواری پائی جاتی ہے۔ جس دلکش اندازِ تحریر کے وہ مالک تھے، اسے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ نواب خیالؔ کے اور یہ رنگ۔ خواب و خیال ہوگیا!

رسالہ "نیرنگِ خیال لاہور" کے سالنامہ ۱۹۳۶ء میں نواب صاحب کے چار خط شائع ہوئے تھے۔ چونکہ ہمارے نزدیک نواب صاحب کی ہر تحریر لٹریچر کی حیثیت رکھتی ہے اور منظرِ عام پر لائے جانے کے لائق ہے۔ اِس لئے ہمارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ نواب صاحب کے اُن خطوط کو جو انہوں نے ادیب الملک سید واسطی نیوڑی مرحوم کو لکھے تھے پبلک سٹیج پر لایا جائے۔ خود سید واسطی مرحوم ان خطوط کو شائع کرانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مخدومی و محتشمی قبلہ مولوی سید محمد سبطین صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لدھیانہ کو لکھا تھا کہ اگر نواب خیالؔ مرحوم کے خطوط "البرہان" میں شائع ہو جائیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ پیشتر اس کے کہ واسطی مرحوم نواب خیالؔ مرحوم کے خطوط اشاعت کے لئے بھیجیں یکایک ۱۲ر فروری کی شام کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا، اور یہ بات آئی گئی ہوئی۔

اب جبکہ ہم نے سید واسطی مرحوم کے کلام کی اشاعت کا تہیہ کیا۔۔۔ اور اُن کے مسودات کو دیکھا بھالا۔ نواب خیالؔ مرحوم کے خطوط بر آمد ہوئے۔ پڑھے تو نہایت قیمتی۔ اس لئے اشاعت کا خیال پیدا ہوگیا۔

نواب خیالؔ اور سید واسطی کی خط و کتابت کا اہم موضوع میر انیسؒ ہے اور بس۔ اِن خطوط کو پڑھنے سے یہ ذہن نشین ہوتا ہے کہ دو ادیب کس جانفشانی کے ساتھ ادبِ اردو کی خدمت کر رہے تھے۔

غالباً نومبر ۱۹۱۰ء کے مخزن میں سید واسطی مرحوم نے یہ تحریک کی تھی کہ میر انیسؔ پر ایسی مبسوط کتاب لکھی جائے جو کسی لحاظ سے بھی تشنہ نہ رہے۔ مولوی شبلیؔ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا لیکن چند ناگزیر واقعات کی بنا پر وہ اس کام کو انجام نہ دے سکے۔ جب کسی نے بھی اس موضوع پر قلم نہ اٹھایا تو مجبوراً آپ ہی کو یہ کام اپنے ذمہ لینا پڑا اور "معراجِ اردو" تصنیف کی۔ اس کتاب میں مرحوم نے میر انیسؔ کے کلام پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے اور ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جو اب تک مفقود تھیں۔ یہ کتاب بدقسمتی سے اب تک شائع نہیں ہوئی، امید ہے کہ جلد ہی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

بہرکیف نواب خیالؔ مرحوم کی ہر تحریر منظرِ عام پر لائے جانے کے لائق ہے۔ اسی لئے ہم نواب صاحب کا ایک خط "شاہکار" کے لئے نقل کرتے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ قائم رکھنے کا ارادہ ہے۔

نقل خط :-

گرینڈ ہوٹل شملہ

۵ر اکتوبر ۱۵ء

جنابِ مکرم۔ کل یہاں پہنچا۔ دیر راستہ میں ہوگئی۔ علی گڑھ سے لکھنؤ آنا پڑا اور کئی دن رہ گیا۔ یہ سفر مبارک ہوا۔ وہاں بیٹھ کر مراثی انیسؔ کی تصحیح کا بندوبست کرلیا۔ کچھ ایسا موقعہ آگیا کہ خاندانِ انیسؔ کے کل موجودہ حضرات اِدھر متوجہ ہوگئے۔ حضرت عارفؔ صاحب اور عروجؔ صاحب مشہور ہیں۔ دولہ صاحب اور میر علی محمد صاحب سے صاحبزادوں کو اس کام کے لئے تیار کیا اور احسنؔ (صاحبِ واقعاتِ انیسؔ) کو اُن پہ ہیڈ مقرر کرکے آیا ہوں، کام ہمارے سامنے شروع ہوگیا تھا۔ ان جملہ صاحبان سے بلمعاوضہ کام لیا جائے گا اور ایک ماہ کی پیشگی بھی میں وہاں سے

آیا ہوں، یقین ہے کہ اس صورت کو آپ پسند کریں گے۔

یہاں بھی زیادہ تر اسی فکر میں آیا ہوں۔ مرا ثی کے طبع ہونے کی اسکیم پیشِ نظر ہے۔ جس طرح ہم آپ اُس کا شائع ہونا چاہتے ہیں۔ اس میں پچاس ہزار سے کسی طرح کم خرچ نہیں ہو سکتے۔ میری کوشش ہوگی کہ گورنمنٹ آف انڈیا اِدھر متوجہ ہو جائے۔ اس میں بڑے اور دیرپا مصالح ہیں۔ روپیہ کوئی چیز نہیں۔ اس کام کے لئے برس چھ مہینے کی کوشش میں اتنی رقم کا فراہم ہو جانا کونسی بڑی بات ہے۔ لیکن ہماری پولیسی ہی اَور ہے۔ دعا کیجئے کہ خدا اِس کام کو میرے ہاتھوں سے انجام کرا دے۔

ابھی سنا کہ مہاراجہ پٹیالہ بھی یہاں ہیں۔ اغلب ہے کہ خلیفہ صاحب بھی یہیں ہوں۔ دریافت کروایا ہے۔ اگر ہوئے تو میں پٹیالہ کی حاضری سے بچ جاؤں گا۔

اسکیم تیار ہو جانے پر بھیج دوں گا۔ مگر وہ عرصہ تک کونفی ڈینشل رہے گی، گورنمنٹ آف انڈیا کے مان لینے پر اس کا اعلان ہوگا۔ آپ کے دماغ و ذہن میں جتنی باتیں ہیں اور وقتاً فوقتاً جس کو آپ ظاہر کر چکے ہیں، وہ سب باتیں اسکیم میں موجود ہیں۔ پھر بھی صلاح دیجئے۔ اس کام کے انجام کے لئے ایک مستعد اسٹاف ہوگا۔ جس میں سُنّی، شیعہ، ہندو، انگریز سب شامل ہوں گے، یہ کمیٹی اِس چیز کو ترتیب دے گی۔ انشاء اللہ۔

کام اور خرچ کی عظمت صرف اس سے معلوم ہو جائے گی۔ کہ برس دن تک یہ کمیٹی کام کرے گی اور کسی سے مفت کام نہیں لیا جائے گا۔ میں عبدالحلیم شررؔ۔ چکبستؔ سے ملے بھی کر آیا ہوں اور اسکیم کے منظور ہو جانے پر دو ایک اَور مستعد صاحبوں کو رکھنا ہوگا۔ جیسے وحیدالدین سلیم پانی پتی وغیرہ وغیرہ۔ آپ کی نظر میں بھی جو صاحب ہوں اور اس کام کو انجام دے سکتے ہوں اُن کا نام ارشاد فرمائیے گا۔ غرض میں ہمہ تن اس میں مصروف ہوں۔ آئندہ خدا کے ہاتھ ہے۔

میں بقرعید تک یہاں رہوں گا، جواب دیجئے اور میرے لئے دعا کرتے رہئیے۔ میں ہوٹل میں ہوں، لفافہ انگریزی میں لکھوائیے گا۔ پتہ سرورق چھپا ہؤا موجود ہے، خدا کرے آپ... معہ الخیر ہوں۔

میں نے جتنی باتیں عرض کی ہیں۔ ابھی یہ صیغۂ راز ہیں۔ ان کے اظہار کا وقت بھی آئے گا۔ انشاء اللہ۔

نیازمند
خیالؔ

یسد افضال حسین غزنوی
(شاہ آبادی)

جذباتِ انور

ہر رگ و ریشہ میں دل تحلیل ہونا چاہیئے
اب نظامِ زندگی تبدیل ہونا چاہیئے

آرزوؤں کا فسانہ چھیڑتے جاؤ۔ مگر
بے نیازِ خواہشِ تکمیل ہونا چاہیئے

جا و بیجا کیوں جھکا جاتا ہے حیرت ہے مجھے
تیرا سر تو زینتِ اکلیل ہونا چاہیئے

بارگاہِ عشق کے احکام ہیں انور کٹھن
تیرے دل میں جذبۂ تعمیل ہونا چاہیئے

لطیف انور

قربان گاہ

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افرادِ ڈراما :-

زرنجیف ——— روم کا عیسائی بادشاہ
عبید ——— مسلمان جنگجو، پرستارِ آزادی
حمدونہ ——— عبید کی بیوی
نجمہ ——— عبید کی سولہ سالہ لڑکی
صاعد ——— نجمہ کا چھ سالہ معصوم بھائی

پہلا سین

موسمِ سرما کی ایک تاریک رات ——— پہاڑی علاقہ

[بلند پہاڑی درختوں کے جھنڈ میں ایک تنہا، بوسیدہ جھونپڑا ہے، جو درختوں کی ٹہنیوں اور پتیوں سے بنا ہوا ہے، جھونپڑے میں مٹی کا ایک چراغ جل رہا ہے۔ چولھے میں کچھ لکڑیاں دھواں کر رہی ہیں، حمدونہ اور نجمہ بیٹھی آگ تاپ رہی ہیں، صاعد نجمہ کے پہلو میں سویا ہوا ہے، دونوں لمبے اور کھلے سیاہ لباس میں ملبوس ہیں، حمدونہ کے سر پر ایک سیاہ رنگ رومال بندھا ہوا ہے اس کی دونوں گندھی ہوئی زلفیں اس کے سینہ پر لٹک رہی ہیں، نجمہ اپنے لمبے کرتے کے اوپر سرخ بانات کی ایک چولی پہنے ہوئے ہے، جو گردن کے نزدیک مربع دار کٹی ہوئی ہے، اور اس کے سیاہ کرتے کی آستینیں ہاتھوں کے نزدیک بہت چوڑی ہیں، اس کی دونوں گندھی ہوئی زلفیں اس کے سر کے اوپر لپٹی ہوئی ہیں۔

وہ باہر کان لگا کر سرد تیز ہوا کا شور اور درختوں کی آواز سنتی ہے اور پھر اپنی والدہ سے مخاطب ہوتی ہے۔]

نجمہ :- امّی! اُف کسقدر بھیانک اور تاریک رات ہے،.... اور کس زور کی آندھی چل رہی ہے۔

حمدونہ :- ہاں بیٹی! ...... بھائی کو کپڑا اوڑھا دو ...... سردی نہ لگ جائے۔

[نجمہ آگے بڑھ کر نزدیک پڑے ہوئے کمبل کو اٹھاتی ہے ——— جو اونٹوں کے بالوں سے بنا ہوا ہے۔ اور اپنے بھائی پر آہستہ سے ڈال دیتی ہے پھر یکدم کسی خیال سے چونک کر خاموشی کو توڑتی ہے ..... اس کی نگاہیں والدہ کے چہرہ پر ہیں۔]

نجمہ :- امّی! اتنی رات گزر گئی ہے، آبا جان ابھی تک نہیں آئے، ..... کس غضب کی سردی پڑ رہی ہے!

حمدونہ :- (بے چین ہو کر) بیٹی! تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا باپ اپنی قلیل معیّت کے ساتھ، اپنی مقدس آزادی کی پرورش کے لئے ظالم زرنجیف سے برسرِ پیکار ہے؟ آہ! (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) دیکھو فطرت کی ہر شے آزاد ہے، پرندے کھلی فضا میں اُڑتے ہیں اور آزادانہ اپنے شیریں نغمے الاپتے ہیں، درخت پیدا ہوتے ہیں اور اپنے آزاد سر، کائنات کی وسعتوں میں فخر سے بلند کرتے ہیں۔.... (دبی ہوئی آواز میں) پہاڑوں کی بلندیاں، ترنم خیز آبشاریں، بہتی ہوئی مستانہ ندیاں، اس بھیانک خاموشی میں بھی اپنے اپنے نظام

کی تکمیل میں کس جرأت اور استقلال سے کوشاں ہیں؟ —
لیکن انسان (جوش میں آکر بلند آواز میں) آہ! کس طرح خونخوار
بھیڑیئے کی طرح اپنے بھائی کا تعاقب کر رہا ہے؟ کس طرح
اپنے بھائی کی متاعِ آزادی پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے، اپنی فرعونیت
دولت اور طاقت کو عمل میں لا رہا ہے؟ ... آہ! دُنیا کے
درندے، وجاہت کے غرور میں آئے ہوئے انسان،
جس انسانیت نوازی کی پرستش میں اپنی نجات سمجھتے ہیں، کیا
اسی انسانیت کے قتل پر آمادہ نہیں ہیں؟

نجمہ: ۔ (معصومانہ انداز سے) امّی! کیا آزادی کی راہیں اتنی سخت اور
دشوار ہوتی ہیں؟

حمدونہ: ۔ دشوار؟ (مسکراتے ہوئے) سرمایہ داری کے غرور
اور عیش پرستی کے زعم میں آئے ہوئے بیوقوف انسان
خدا کی گرفت کو ڈھیلا اور زندگی کی حدوں کو بہت وسیع
سمجھتے ہیں ..... ان کے لئے زندگی ایک آسان کھیل ہے
ان کے خیال میں غریبوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، ان کے
لئے غریبوں کی آزادی بے معنی ہے۔ وہ اپنی تمکنت، وجاہت
اور ثروت کے لئے غریبوں کے خون کا آخری قطرہ بہانا بھی
ایک فخر سمجھتے ہیں .....

نجمہ: ۔ (بات کاٹ کر) امّی! آج ہمیں تیسرا فاقہ ہے .....
بھوک کی شدّت برداشت کی حدوں سے باہر جا چکی ہے
..... (یکدم خاموشی توڑتے ہوئے) امّی! امّی!! ابّا جان
کا کیا حال ہوگا؟

حمدونہ: ۔ (گہری آواز میں) اس خداوند کریم کا ہزار بار شکر ہے
کہ اس نے تمہارے ابّا اور امّی کو ایسی روح، زندگی،
جذبۂ حق پرستی اور صبر عطا فرمایا ہے کہ ان پر بھوک کی شدت،
غربت کی سختی، کسمپرسی کی مصیبت قطعاً اثر انداز نہیں ہو
سکتی ..... آہ! آزادی کی سخت ترین کشمکش میں ظالموں
کے ظلم ..... کس قدر صبر آزما ہوتے ہیں۔
(باہر درختوں میں کچھ آہٹ ہوتی ہے، ماں بیٹی
دونوں اس طرف متوجہ ہوتی ہیں)

نجمہ: ۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) ..... شاید ابّا جان آگئے ہیں۔
[حمدونہ بھی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے، نجمہ چراغ ہاتھ
میں لے لیتی ہے، لیکن دروازہ پر آکر ٹھہر جاتی ہے۔
چراغ کی روشنی باہر درختوں پر پڑتی، جنگی لباس میں
ایک قدآور مضبوط نوجوان جس کا تمام جسم خون سے تر اور
ہے، لڑکھڑاتے ہوئے درختوں کے عقب سے
نمودار ہوتا ہے، نجمہ چراغ اور اپنی آنکھوں کے درمیان
ہاتھ رکھ کر اسے پہچانتی ہے۔ حمدونہ چیخ مار کر اس
سے لپٹ جاتی ہے، نجمہ بے تابی سے چراغ زمین
پر رکھتی ہے (مگر وہ اُلٹ کر بجھ جاتا ہے) اور دردناک
آواز میں "ابّا جان" کہہ کر اس سے لپٹ جاتی ہے]

حمدونہ: ۔ (سسکتے ہوئے اندوہگیں انداز میں) پیارے جاں نثار!
..... آہ! آج خونی ہاتھوں نے ایک غریب درماندہ علمبردارِ
آزادی کے دامنِ زندگی کو تار تار کر دیا ..... آہ! میرے
نگارخانۂ انبساط میں غم و اندوہ کی تاریکی مسلط کر دی۔ غلامی کے
پروردہ، جھوٹ کے شیدائیوں، طاقت کے نقیبوں نے،
آج ... آہ! میری رُوح کی روشنی، جذبات کی فرحت، دل
کے چاند کو اُفق کی تاریکی میں گم ہونے کے لئے بھیج دیا۔
[نجمہ دیوانہ وار اپنے والد کی حالت کا جائزہ لیتی
ہے، آنسو اس کے رخساروں پر چمک رہے ہیں، وہ
خود ایک مجروح انسان کی طرح بے تاب معلوم ہوتی
ہے]

عبید: ۔ (لڑکھڑاتی زبان میں) .... آج تاریکی میں دھوکہ سے
..... تمام معیّت سمیت .... کافروں .... کے نرغہ میں
..... پھنس .... گیا .... میرے ساتھی اپنی عزیز جانوں
کو ..... مقدّس آزادی پر ..... قربان .... قربان
..... کر گئے ..... آہ! ایک میں بدنصیب ہی .....
دنیا میں دکھوں کی اذیت کے لئے باقی .... بچ گیا ...
[نجمہ اور حمدونہ اس کو دونوں پہلوؤں سے سہارا
دے کر اندر لے جاتی ہیں اور جھونپڑے میں اسے
ایک گھاس کے بستر پر لٹا دیتی ہیں، نجمہ اپنے باپ
کا سر گود میں لے کر خاموشی سے آنسو بہاتی ہے، حمدونہ
بیتابی سے اپنے لباس سے ایک چیتھڑا پھاڑ کر اپنے
خاوند کا خون پونچھنے لگتی ہے۔ صاعد جاگ اُٹھتا ہے۔

صبح اپنی پہلی رنگین کرنوں سے نمودار ہو رہی ہے]

حمدونہ:۔ (نجمہ سے) بیٹی نہ رو۔ ایسے حادثات تم اس وقت تک برداشت کرتی رہوگی، جب تک ظالموں کے سینے رحم سے، غلاموں کی فطرت آزادی کی متبرک روح سے خالی ہے۔ . . . بس نہ رو . . . پیاری بیٹی! ابھی رونے کے لئے بہت وقت باقی ہے، . . . جا! . . . صاعد کو صبح کی رنگینیوں میں بہلا . . . تاکہ وہ بھوک کی شدت بھول جائے۔

[نجمہ اپنے آنسو کرتے کے دامن سے پونچھتی ہے، پھر نزدیک پڑا ہوا پتھر اٹھا کر اس پر کچھ گھاس رکھتی ہے اور اپنے والد کا سر آہستہ سے اٹھا کر اپنے گھٹنے کی بجائے اس پتھر پر رکھ دیتی ہے، پھر صاعد کے پاس جاتی ہے جو اسے آتا دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے ——— نجمہ اسے ہمراہ لے کر باہر نکل جاتی ہے۔]

دوسرا سین

طلوعِ آفتاب کی پہلی سنہری کرنیں نمودار ہو رہی ہیں۔ پہاڑی اور درختوں کی تمام چوٹیاں آتشیں ہیں۔ ایک بلند چٹان پر نجمہ اپنے بھائی کی انگلی پکڑے کھڑی ہے، اس کا لباس ہوا سے اڑ رہا ہے۔ چٹان کے دامن میں ایک ندی بہہ رہی ہے، تمام پہاڑی کی پتھریلی زمین خودرو گھاس اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے، ہر طرف سکوت چھایا ہوا ہے، دور سے ایک بانسری کی آواز خاموشی کو توڑتی اور فضا میں لہراتی نجمہ تک پہنچتی ہے۔ وہ اس طرف متوجہ ہوتی ہے اور نغمہ سننے میں مست ہو جاتی ہے ——— صاعد اپنی بہن کے چہرے کو معصومانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، آواز نزدیک تر ہوتی جاتی ہے اور نجمہ دور ایک ڈھلوان سے ایک چرواہے کو اپنی بھیڑوں کے ہمراہ نیچے اترتا ہوا دیکھتی ہے، اور بہلانے کی غرض سے صاعد سے متوجہ ہوتی ہے۔

نجمہ:۔ پیارے صاعد! وہ دیکھو کس طرح چرواہا اپنی بھیڑوں کو لئے نیچے اتر رہا ہے؟ ——— آہ! ——— درختوں پر خوش الحان پرندے میٹھے آسمانی گیت گا رہے ہیں! . . . خوبصورت رنگین پھول کھلے ہیں! شفاف پانی میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کیسی پھرتی سے تیر رہی ہے ———

صاعد:۔ (بھیڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ چھوٹے میمے کھیل رہے ہیں . . . . بی بی! انہیں بھوک نہیں لگتی؟

[نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں وہ خاموش ہو جاتی ہے، جیسے کچھ سوچ رہی ہے، پھر ایک دم کھڑی ہو جاتی ہے اور صاعد کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر غمگین آواز میں کہتی ہے:]

نجمہ:۔ تم تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو میرے بھائی! ——— میں تمہارے لئے ——— روٹی ——— (وہ جھونپڑے کی طرف جاتے ہوئے بھائی کو مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی ہے، صاعد نزدیک پڑی ہوئی چھوٹی کنکریوں سے کھیلنے لگ جاتا ہے)

[تھوڑی دیر بعد نجمہ دور ایک ڈھلوان سے تیزی میں اترتی ہوئی نظر آتی ہے، اس کی دونوں لمبی سیاہ گندھی ہوئی زلفیں اس کے سینے پر لٹک رہی ہیں، سورج کی شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی ہیں، کبھی کبھی وہ روشنی سے بچنے کی خاطر اپنی آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھ لیتی ہے اور اپنے بھائی کو دیکھ لیتی ہے . . . . صاعد اپنی بہن کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کنکریوں کے ساتھ کھیلنا بھول جاتا ہے اور اپنے معصوم ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیتا ہے]

صاعد:۔ (معصوم ملتجیانہ انداز میں) بی بی! روٹی . . . .

نجمہ:۔ (اپنی سرخ بانات کی چولی کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک روٹی کا ٹکڑا نکالتی ہے، جس کے کنارے سوکھے ہوئے ہیں) میری روح کا آرام! میری زندگی کا راز . . . . بھائی! یہ لو . . . روٹی (صاعد لپک کر روٹی کا ٹکڑا لے لیتا ہے اور اسے کھانے لگ جاتا ہے) یہ میں نے تمہارے ہی لئے رکھ چھوڑی تھی۔

[صاعد روٹی کا ٹکڑا کھاتا رہتا ہے اور نجمہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہوتی ہے، اس کے چہرے پر آلام کے آثار نظر آتے ہیں، اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، وہ بائیں ہاتھ سے زمین پر ٹیک لگائے

ہوئے ہے اور دائیں ہاتھ سے اپنی چولی کے پھندنے کو مسل رہی ہے۔ اچانک کسی گہرے خیال سے چونک کر ایک نظر اپنے بھائی کو دیکھتی ہے، جو ابھی تک روٹی کے سوکھے ٹکڑے کو چبانے میں مصروف ہے، وہ غم سے بیتاب ہو کر دوسری طرف منہ پھیر لیتی ہے اور خاموش سسکیوں سے آنسو بہانے لگتی ہے، صاعد روٹی کا ٹکڑا کھا کر بہن کا کندھا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے]

نجمہ:۔ (پلٹ کر بھائی کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے) آہ! چرواہے کی بانسری کی آواز، فضا کی وسعتوں میں جذب ہو کر رہ گئی۔ درختوں کی سرسبز ٹہنیوں سے خوش الحان پرندے اُڑ گئے..... کائنات کی گود میں لاڈلی فطرت خاموش ہو گئی...... جذبات کی تلاطم خیز دنیا میں سکوت کا عالم چھا گیا... چلو... پیارے بھائی!..... گھر چلیں.....

(نجمہ کھڑی ہو جاتی ہے اور بھائی کی انگلی پکڑ کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے، اس کی چال میں ایک مجروح انسان کی طرح لغزش ہے۔ وہ کسی گہری بے چینی میں اپنے بھائی سے بے خبر معلوم ہوتی ہے اس کا چہرہ زردی مائل ہے]

نجمہ:۔ (شکستہ انداز میں) آزادی!..... کیا... تو اتنی مشکل سے..... حاصل ہوا کرتی ہے..... آہ!.... میرا دل... گھُٹ رہا ہے،.... میری رُوح.... پرواز کے لئے بے چین ہے۔

(صاعد اپنی ہمشیرہ کے چہرے کو بغور دیکھ رہا ہے اور غیر ہموار زمین سے ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا ہے، جب اُسے کوئی ٹھوکر لگتی ہے تو وہ نجمہ کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔

دونوں اپنے جھونپڑے تک پہنچتے ہیں، نجمہ اندر قدم رکھتے ہی اپنے باپ کو ہوش میں پاتی ہے دوڑ کر اس تک پہنچنا چاہتی ہے کہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہتی ہے۔ اُٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر بھوک اور ضعیفی کی شدت سے اُٹھ نہیں سکتی۔ حمدونہ اُسے آکر اٹھاتی ہے، مگر متغیر حالت میں وہ پھر زمین پر آ رہتی ہے۔]

تیسرا سین

[نجمہ اپنی ماں کی گود میں بے ہوش پڑی ہے، زخمی عبید گھاس کے بستر پہ مایوسانہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہا ہے، صاعد اپنی ماں کا کندھا پکڑ کر حیرت سے نجمہ کو تک رہا ہے]

عبید:۔ (غمگین آواز میں حمدونہ سے) میرے دل کی حسین ملکہ! بے بسی نے ہمارے کاروانِ آزادی کو گمراہ کر دیا ہے...... کہ.... آج... وہ بہادر سپاہی جس کے دل میں (جوش سے) فنا کی آگ، ہلاکت کا طوفان اور موت کی طاقت ہوتی تھی، جس کے وطن پرست ایمان کو حریف کی پرشکوہ امارتیں، فلک بوس جھنڈے اور ظالمانہ طاقتیں متزلزل نہ کر سکتی تھیں...... جس نے اپنی قلیل معیت سے حریف پر زندگی حرام کر دی تھی — آج، آہ! (مجروح آواز میں) اپنی نوجوان لختِ جگر کو دم توڑتے ہوئے دیکھ کر... اپنی فلک بوس ہمت کو خاک کے سپرد کر رہا ہے..... اپنی کوششوں کے الاپے ہوئے آزادی کے نغموں کو خاموشی کی نیند... سُلا رہا ہے،..... آہ!..... خداوند کریم! (چند لمحات خاموشی چھا جاتی ہے، وہ تخیل کے جوش میں اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہے) غلامی!..... اور.... موت!... کیا زر تخبیت کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لوں؟ کیا اپنی گذشتہ کامیاب عظمتوں کو خاک میں ملا کر قومی غداری کا مکروہ جامہ پہن لوں؟.... کیا۔ اپنے نیزوں کی تیز نوکیں، اپنے دشمنوں کے سینوں میں پیوست کرنے کی بجائے.... اپنے بھائیوں کے سینوں میں گھونپ دوں! مجھ سے.... ایسا... ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مذہب کی سچائی، ملت کی خدمت اور آزادی کی پرستش صرف زر تخبیت کی غلامی پر.... کبھی ...... کبھی قربان نہیں ہو سکتی.....

حمدونہ:۔ میرے دل کا چین یہ کیا فرما رہے ہیں؟

(عبید بدستور اپنے خیال میں گم رہتا ہے)

عبید:- (بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے) اولاد! تو کتنا حسین اور مقدس عطیہ ہے.... دنیا کا مقبول ترین تحفہ اور عقیدتوں کا گایا ہوا آسمانی نغمہ ہے..... تجھے نہ پاکر انسان کتنا مغموم ہوتا ہے اور —— تجھے کھو کر کیسی روحانی اذیتوں میں گرفتار ہوتا ہے!

(خیال تبدیل ہوتا ہے)

(اپنی عورت سے) میرا مقدس سرمایہ! آج جب ایلچی آئے..... تو اسے کہنا، کہ میں.... زرنجیف کی اطاعت (کھرائی ہوئی آواز میں)... قبول کرتا ہوں.....

حمدونہ:- اطاعت!؟.......

عبید:- ہاں!...... اطاعت......

نجمہ:- (بدستور آنکھیں بند کئے ہوئے مہین آواز میں) اطاعت! ...... اطاعت!!.... ایسا مکروہ لفظ کس کی زبان سے نکل رہا ہے؟

عبید:- مجھ بدنصیب کی.....

نجمہ:- کس لئے؟

عبید:- اپنی اولاد کی سلامتی کے لئے......

نجمہ:- آہ! اولاد —— اور —— آزادی.... فرض کے احساس پر شفقت کا دھاوا.... کتنا زبردست انقلاب! ...... ابا جان آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟... آج آپ کا وہ وطن پرست دل، صف شکن شمشیر آہنی بازو کیا ہو گئے ہیں؟........ دنیا کیا کہے گی؟.... عبید —— فاتح اور آزاد عبید نے - اولاد کی سلامتی کی خاطر —— زرنجیف کی ظالم اور جابر..... حکومت کے سامنے ہتھیار ڈال دئے؟!.... (آہستہ سے آنکھیں کھولتے ہوئے) ابا جان! کیا زرنجیف کو معلوم نہیں..... کہ.... عبید کی بیٹی محض زندگی کی خاطر —— اپنی آزادی کے جھنڈوں کو سرنگوں اپنے پاکیزہ جذبات کو مجروح، اپنی مقدس عصمت کو غلامی کے بے عزت بازار میں فروخت کرنا —— ایک خطرناک فعل، ایک لعنت آمیز جرم اور ایک عبرتناک گناہ سمجھتی ہے! ..... میرے ابا! اپنی بیٹی کی بے سود زندگی کے لئے قوم کی لاکھوں زندگیوں کو خون کی بھینٹ نہ چڑھائیے۔

(اس کے تمام بدن میں سنسنی اور لرزہ پیدا ہو جاتا ہے اور سانس تیزی سے آنے لگتا ہے، تمام دم بخود ہوتے ہیں، نجمہ آنکھیں کھولتی ہے اور ایک جدا ہونے والے انسان کی طرح سب کا ایک آخری نظارہ کرتی ہے)

نجمہ:- (مدھم، ڈوبی اور ٹوٹی ہوئی آواز میں) ابا جان! —— ایسا نہ —— کرنا —— (آواز گم ہو جاتی ہے اور پھر بہت دھیمی آواز میں "یا اللہ" سنائی دیتا ہے، ——

(اس کی رُوح پرواز کر جاتی ہے)

[عبید جوش میں کھڑا ہو جاتا ہے، حمدونہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہتی ہے]

عبید:- بیٹی! بیٹی!! جان نثار بیٹی!!! —— میں تیری لاش کی قسم کھاتا ہوں کہ میرے خون کا آخری قطرہ، میری حیات کا اولین سرمایہ، مذہب اور ملت کی قربانگاہ پر نچھاور ہو گا —— میں تیرے آخری الفاظ کی قسم کھاتا ہوں —— کہ میرا عَلم آزادی، زرنجیف کی طاقت، شوکت اور ظلم کے آگے کبھی —— کبھی —— سرنگوں نہ ہو گا ——

ایک آواز:- ہاں! واقعی ایسا ہو گا!!

(تمام آواز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ایک سفید پوش، سفید پوش بزرگ فقیرانہ انداز میں داخل ہوتا ہے، حمدونہ اور عبید مؤدبانہ طریق پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

فقیر:- آفرین!! اے سچائی کے علمبردار آفرین..... تم نے ثبات اور استقلال کی دنیا کے سامنے ایک نہ مٹنے والی مثال پیش کی ہے، —— آنے والی نسلیں تمہارے اس "ایثار کے خمار" سے ایک قومی احساس حاصل کریں گی - اور —— ایک غیر فانی جذبۂ وطن پرستی کو اپنا امتیاز بنائیں گی.....

(فقیر اپنے بازو عبید کی طرف بڑھاتا ہے اور اس سے بغلگیر ہو جاتا ہے)

فقیر:- اے میرے بہادر عبید! آج سے تجھ کو اور تیری قوم کو زرنجیف کی حکومت میں مکمل آزادی ہے..... بس یہی میرا

آخری فرمان ہے۔

(اوپر کا چغہ اور مصنوعی داڑھی اتارتا ہے)

عبید:۔ ہیں! ارزنجیف؟ ـــــ روما کا بادشاہ فقیر کے لباس میں ـــــ ظلم کا فرشتہ رحم کے دامن میں ـــــ یا اللہ!

(زخموں کی شدت سے اپنے گھاس کے بستر پر گر پڑتا ہے)

ـــــ پردہ ـــــ

امین حزیں۔ بہاولپور

غزل

سرشک آنکھوں میں ہیں اور لب پہ افسانہ نہیں آتا
کسی ڈھب راہ پر اب قلبِ دیوانہ نہیں آتا

ہر اک ذرّے کو سجدہ کر کے بھی محرومِ منزل ہوں
ہزاروں کعبے آئے ایک بتخانہ نہیں آتا

ہر اک ذرّہ ہے محمل اور ہر محمل میں لیلیٰ ہے
فریبِ جستجو میں کوئی دیوانہ نہیں آتا

نہیں سیکھا مرے غم نے خوشی میں محو ہو جانا
مرے نالوں کو نغموں میں سما جانا نہیں آتا

محبّت زندگی کی جان۔ غم جانِ محبّت ہے
سمجھتا ہوں، مگر دُنیا کو سمجھانا نہیں آتا

محبّت آگ ہے میں آگ میں جلتا ہوں اور خوش ہوں
مجھے غم کھا رہا ہے مجھ کو غم کھانا نہیں آتا

جنوں میں اہلِ دل کا یہ بھی اِک انداز ہے فطرت
کہ ٹھوکر کھانا آتا ہے۔ سنبھل جانا نہیں آتا

عبدالعزیز فطرت

قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں

ناظرینِ شاہکار کو کچھ اُجڑی ہوئی محفل کی جھلک دکھانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے اور اگر دل رکھتے ہیں تو اس بدنصیب اور مظلوم تاجدار اور اس کے متعلقین کی تباہی پر آنسو بہائیے۔

حالاتِ نوروز:- ہولی کے نو دن بعد نوروز کی عید منائی جاتی تھی۔ اس دن صبح کو سبزواری مرغی کے انڈے لڑائے جاتے تھے۔ سبزواری مرغیوں کا جوڑا تین تین سو روپے کا ہوتا تھا اور دو تین ماہ میں چھ سات انڈے دیتی تھی۔ یہ انڈا بہت سخت و کرخت اور چھوٹا ہوتا تھا اور اس میں چنے کی دال برابر ایک نوک نکلی ہوئی ہوتی تھی جس کو نیش کہتے تھے، لڑانے کی ترکیب یہ تھی کہ ایک شخص انڈے کا نیش باہر نکال کر دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا تھا اور بیٹھ جاتا تھا اور دوسرا شخص اپنا سبزوار کا انڈا لے کر اس کے نیش سے دو ہاتھوں میں چھپے ہوئے انڈے پر پلوے ہاتھ سے مارتا تھا لیکن اس ضرب کی آواز دور تک جاتی تھی۔ جب انڈے کی آواز میں فرق آجاتا تھا تو "وہ مارا! وہ مارا!" کی صدائیں بلند ہوتی تھیں اور جس کے انڈے میں بال آجاتا وہ ہار جاتا تھا۔ اس پر ہزاروں روپوں کی ہار جیت بھی ہوتی تھی لیکن سبزوار کے انڈے صرف شہزادوں اور اہلِ دولت ہی کو میسر آتے تھے اور وہی کھیلتے تھے، لیکن عوام الناس مختلف انڈوں سے کھیلتے تھے

نوروز کے دن شہر میں چاروں طرف انڈے لڑتے تھے۔ خصوصاً جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بڑی بہار آتی تھی۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوتے اور انڈے لڑائے جاتے۔

سبزوار مرغیوں کے انڈے رائی اور دوسری قسم کی ادویہ میں رکھے جاتے تھے۔ انڈے لڑانے کا بھی ایک ہنر تھا۔ اہلِ شہر میں سے بیشتر لوگ سال بھر اپنے ہاتھوں کو سدھاتے تھے تاکہ اپنے ہنر کے ذریعے قلعۂ معلّٰی میں آکر کچھ روٹی کمائیں۔

نوروز کی شام کو دسترخوان ہوتا تھا۔ اس پر ہر قسم کا کھانا، مٹھائیاں، میوہ جات وغیرہ چُنے جاتے اور اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کی نیاز ہوتی تھی۔

آخری چہار شنبہ:- آخری چہار شنبہ کے دن ان مردوں کو جو رشتے میں چھوٹے ہوتے تھے انگوٹھی اور چھلے اور عورتوں کو مختلف قیمت کے ڈوپٹے دئے جاتے تھے۔ جہاں پناہ کے پاس سے بھی شہزادوں اور خاص خاص غلاموں کو عنایت ہوتے تھے۔

منجھلا شہزادہ

سنا گیا ہے کہ بہادر شاہ بادشاہ دہلی شکار کے گوشت کا عرق چوس لیتے تھے اور ایک گھنٹے کے بعد تازہ پانی سے استفراغ کر کے سارا کھایا پیا خارج فرما دیتے تھے اور یہ آپ کا ہمیشہ کا دستور تھا۔

یہ عادت حضور بہادر شاہ کو اس وجہ سے پڑ گئی تھی کہ آپ کے فرزند مرزا کیومرث بہادر ولی عہد نے بدمصاحبی کی وجہ سے لالچ میں آکر شیر کی مونچھ کا بال[۱] پان میں رکھ کر کھلا دیا تھا اور کھلایا بھی اس طرح کہ ایک نہایت پُرتکلف دعوت کی۔ حضور بہادر شاہ صدر جگہ پر تشریف فرما تھے۔ مرزا نے اشارہ کیا اور کسی مشہور طوائف کا گانا شروع ہوا۔

---

[۱] اس کی چھوٹی سی کرچی پان یا کسی خوردنی شے میں رکھ کر کھلا دیتے ہیں۔ وہ کرچی آنتوں میں داخل ہونے کے بعد سمِ قاتل ہو جاتی ہے۔ گذشتہ زمانہ میں دوست نما دشمنوں کا یہ حربہ تھا۔ اسی لئے شیر کے شکار کے بعد اس کی مونچھ کے بال جلا دیا کرتے تھے تاکہ کوئی بہ نیت خصومت کسی کی جان کو نقصان نہ پہنچائے۔

اس طوائف نے ٹھمری کو اس خوبی اور نفاست سے گایا کہ بہادر شاہ بادشاہ پر خاص کیفیت طاری ہو گئی - اس وقت نہایت ہی تکلف کے ساتھ آپ کے سامنے گلوری پیش کی گئی اور اس پان کی نس میں شیر کی مونچھ کا بال بڑے کمال کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا - اور یہ اس طمع میں کیا گیا تھا کہ اگر باپ کی موت واقع ہو جائے تو خود کو بادشاہی مل جائے گی -

بہرحال جب آپ کی حالت غیر ہوئی تو حکمار وقت کی قے آور ادویہ ... استعمال کرانے سے ڈکلے کے ڈکلے خون کے نکلنے لگے اور اتنے کہ کئی چلمچیاں بھر جاتیں - آخرکار اسی خون میں وہ بال کی کرچی بھی نکل آئی جو کھلائی گئی تھی - تحقیقات ہوئی اور کئی دنوں تک پکڑ دھکڑ رہی، آخر شش معلوم ہوا کہ یہ کام شاہزادہ کیومرث کا ہے -

جب حضور بہادر شاہ کو اس مرض الموت سے افاقہ ہوا تو آپ نے جشن صحت یابی کی تقریب میں شاہزادہ کیومرث کو طلب فرمایا اور اپنے پاس ایک پیالہ مسموم شربت کا تیار رکھا

منجھلا نوجوان فرزند سہما ہوا سر جھکائے حاضر ہوا، آداب بجا لایا - اور منتظر کھڑا رہا کہ حکم پدر کی تعمیل کرے - بادشاہ نے شربت کا پیالہ ہاتھ میں لے کر بیٹے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا :-

"بیٹا! جس طرح تم نے مجھے شیر کی مونچھ کا بال کھلایا
اب اس کی مکافات بھرو! اور لو!! یہ زہر کا پیالہ ابھی
پیو -"

مرزا کیومرث بہادر نے ہاتھ باندھ کر کچھ عرض کرنا چاہا تھا کہ باپ نے للکار کر کہا :-

"او موذی! کیا اب ناخلف بھی بننا چاہتا ہے!!"

مرزا کیومرث دست بستہ آداب گاہ پر آئے، آداب بجا لائے اور

"جو حکم!"

کہہ کر غٹ غٹ زہر کا پیالہ چڑھا گئے اور تھوڑی دیر میں باپ کے سامنے گر کر سرد ہو گئے -

ٹرٹرھ موی خانم :- ایک بادشاہی طائفہ بھی تھا جو بہت منہ چڑھا تھا، کمال اس میں یہ تھا کہ بادشاہ جب کوئی غزل یا ٹھمری طبع زاد فرماتے اسی وقت یہ طائفہ یاد کر کے سنا دیتا تھا - اس طائفہ میں ٹرٹرھ موی خانم بھی تھی - ٹرٹرھ موی خانم اس لئے مشہور ہو گئی تھی کہ پان میں چھالیہ بہت کھاتی تھی اور اس کو ایک طرف کے کلے میں دبا لیتی تھی - اسی وجہ سے ایک طرف کا کلہ پھولا ہوا اور منہ ٹیڑھا معلوم ہوتا تھا - یہ بہت ذہین عورت تھی - فن موسیقی میں کمال رکھتی تھی اور گانے بجانے میں دماغ حاضر رکھتی تھی - اسی کے دم سے بادشاہی طائفہ میں چار چاند لگے ہوئے تھے -

---

جیلانی صاحب جو لغداد کے پیرزادوں سے تھے نقل کرتے ہیں کہ "میں نواب ممتاز محل کے ہاں جو اکبر شاہ ثانی کی بڑی بیگم تھیں مہمان تھا - ان کی بہو یعنی مرزا کامران کی والدہ کچھ علیل ہوئیں حکیم رکن الدین خاں نے جلاب تجویز کیا - بیگم صاحبہ نے جلاب سے انکار کیا اور یہ کہا کہ

"جلاب کا قدح مجھ سے نہ پیا جائے گا -"

حکیم صاحب نے عرض کیا - "حضور قدح نہ ہوگا -"

فرمایا - "اگر قدح نہ ہوگا تو اس میں املتاس کی بو تو ہو گی -"

حکیم صاحب نے کہا - "نہیں املتاس کی بو بھی نہ ہو گی -

فرمایا - "گاڑھا تو ضرور ہو گا -"

حکیم صاحب نے عرض کی - "جی نہیں! بالکل رقیق اور مقطر ہو گا اور ہر طرح کی لطافت و خوشبو سے معطر ہو گا جس سے آپ کی طبیعت کو فرحت ہو گی لیکن اثر املتاس کا ہو گا اور وہ املتاس ہی ہو گا - اگر آپ نوش فرمائیں تو میں خود بنا کر لاؤں، لیکن فی جلاب پانسو روپے عنایت فرمائیں -"

بیگم صاحبہ نے بخوشی منظور کر لیا - چنانچہ حکیم صاحب نے پانچ جلاب دئے - بعد صحت بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں اور جلابوں کی مقررہ قیمت کے علاوہ شال، دو شالے، مشروع کے تھان وغیرہ عنایت ہوئے -

دیکھا آپ نے! اس گئے گزرے زمانے کی یہ حالت ہے -

دہی کے کونڈے :- بروایت شاہزادہ مرزا محمد شجاع، حضرت لبیب دہلوی مدظلہ، ناقل ہیں :-

شاہزادہ مرزا حیدر شکوہ ابن شاہزادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم ثانی خاصہ تناول فرما رہے تھے کہ ایک امیر نیاز مند دل

سے حاضر ہوئے۔ صاحب عالم و عالمیان نے اشارہ فرمایا کہ آؤ بھائی کھانا کھالو۔ انہوں نے عرض کی :۔

"پیر و مرشد! میرا دل تو اس وقت دہی کو چاہ رہا ہے۔"

فرمایا۔ "آؤ تم کھانا تو شروع کرو۔"

اتنا صاحب عالم کے منہ سے نکلنا تھا کہ بیس خدمتگار دہی لینے کے لئے بازار کی طرف لپکے اور دہی کے کونڈے آنے شروع ہوئے۔ تقریباً سو کونڈے آئے تھے کہ امیر نے پریشان ہو کر دہی لانے کی ممانعت کر دی۔

اس زمانے میں شہزادے اور امرائے شہر جس چیز کو طلب کرتے تھے وہ بہت بڑی مقدار میں آیا کرتی تھی۔

یہ تھیں کچھ جھلکیاں اس زمانے کی جبکہ تیموری سلطنت آخری ہچکی کی منتظر تھی۔

عرش تیموری دہلوی

رباعیات

پیران سالوس

قبروں پہ مریدوں کو جھبکاتے رہئے
ڈھولک پہ سفیہوں کو نچاتے رہئے
اللہ اگر رُوٹھ رہا ہے، رُوٹھے
بے خوف و خطر عرس مناتے رہئے

محشر میں پنہا رہے ہیں مجھ کو زنجیر
اِک بندۂ مجبور کی آخر تقصیر
آواز تو دو کوئی، کدھر ہے آخر
ماحول و وراثت و سرشتِ تقدیر

حقائق

آزاد ہو رُوح، شادمانی ہے یہی
بشاش ہو قلب کامرانی ہے یہی
کچھ بھی ہو، غمِ حیات و نیش غم کو
محسوس نہ کر کہ زندگانی ہے یہی

تھا جانِ چمن جن کا ترانہ اِک دن
گُم ہو گیا ان کا آشیانہ اِک دن
کہتی ہے جسے آج "حقیقت" دنیا
بن جائیگی یہ شے بھی "فسانہ" اِک دن

جوش ملیح آبادی

غول بیابانی

عرب کے نزدیک جن اور شیاطین میں فرق ہے۔

بعض نے جن کو ایک جنس اور شیاطین کو دوسری جنس قرار دیا ہے۔

اور بعض نے یہ تفریق کی ہے کہ جن تو نیک اور طاہر روحیں ہیں اور شیاطین موذی اور شریر روحیں ہیں انہیں کو جنِ ماردُ بھی کہتے ہیں۔

شیخ الرئیس بو علی سینا جن کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ حیوان ہوائی ہیں جو مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جنوں کو موت آتی ہے، شیاطین کو نہیں آتی۔

حِنّ (بحائے حطی) جنوں کا ایک قبیلہ ہے یا جنوں میں سے لُچّے لفنگے رذالے کم ذات حِن کہلاتے ہیں ایک قول یہ بھی ہے کہ انسانوں اور جنوں میں یہ ایک درمیانی خلقت ہے۔ شیاطین یا جنّ ماردُ جو موذی اور شریر ہوتے ہیں ان کی کئی نوعیں ہیں ان انواع کے ذکور کے نام۔

عَیْہَران ۔ قُطْرُوب اور قُطْرَب ہیں۔

اور اِناث (عورتوں) کے نام غُول اور سِعلاۃ[1] ۔ قُطْرُبہ و شہام ہیں، گھُومنے پھرنے والے جنوں کو جو طوف کرتے رہتے ہیں نَظَرہ بولتے ہیں۔

کوئی جِنّی[2] یا جِنّیہ جو کسی انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے جہاں وہ جاتا ہے یہ بھی پیچھے پیچھے جاتا ہے اُسے تابع (مذکر) یا تابعہ (مؤنث) کہتے ہیں۔

شَیْصَبان جنوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔

اَحْقَب ۔ اُن جنوں میں سے ایک جنّی کا نام ہے جنہوں نے قرآن شریف سنا تھا[3]

غُول بیابانی

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ غول (خبیثنی) جن ماردہیں سے

ہے اسے مادہ خیال کیا جاتا ہے، اکثر اس کو ساحرہ قرار دیتے ہیں۔ یہ مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے[4]

جنگل بیابان میں مسافر کو رستہ بھُلا کر اور کسی سنسان جگہ لیجا کر اُسے مار ڈالتا ہے۔

عرب اُس روشنی کو بھی غول سمجھتے تھے جو دوُر سے جنگل میں نظر آیا کرتی ہے، قبرستانوں اور مرگھٹوں میں زیادہ دیکھی جاتی ہے۔ اُس کے پاس جاؤ تو ہٹ کر دوسری جگہ چلی جاتی ہے۔

غول کے خیال نے آہستہ آہستہ مدارج تخییل اختیار کئے اور اس چڑیل کی خلقت تو انسانی اور پاؤں گدھے ایسے بن گئے۔

اس دابّہ کو عرب نے دیکھا ہے اور اُسے پہچانتے ہیں۔ حتےٰ کہ تأبّط شراً جو قدیم شعرائے عرب سے ہے اور جس کے اشعار میں غول کا بہت ذکر آتا ہے، بیابان نوردی میں اس کے رفیق طریق اکثر غول رہے ہیں (آغانی جلد ۱۸ ص۲۰۹)

جب ایک غول نے کچھ شرارت کی ہے تو اس نے اُسے قتل بھی کر ڈالا ہے۔ قزوینی نے غول کو جن متشیطنہ کی قسم سے قرار دیا ہے۔

حیٰوۃ الحیوان دَمیری اور کتاب الحیوان جاحظ مطبوعہ قاہرہ میں غول کو عرب کے خیال مذکور کے موافق حیوانوں میں شمار کیا ہے۔ غول کی جمع غیلان اور اغوال آتی ہے۔

غول کی صفات مذکور کے لحاظ سے عربی زبان میں کئی لفظ پیدا ہو گئے، مثلاً تغوّل طرح طرح کی صورتیں اختیار کرنے کو اور اغتیال کسی کو دھوکے سے یا پُراسرار طریق سے قتل کر ڈالنے پر بولنے لگے۔ لفظِ تغوّل نے اور عموم حاصل کیا اور محض تغییر لوَن یا تغیر حالت و کیفیت پر بھی رائج ہو گیا مگر بُری حالت اور بُری کیفیت ہی کے لئے۔ ذم اس کے معنٰے کے ساتھ لازم ہے چنانچہ کعب بن زہیر نے قصیدۂ بردہ میں سُعاد کو اُس کے تلوّن و

---

[1] سہیلی کا قول ہے کہ سعلاۃ دن کو اور غول رات کو دیکھنے میں آتا ہے [2] جنی جن کا مفرد جنوں کا ایک فرد ۱۲ منہ [3] فرائد اللغہ الجزاء الاول فی الفروق مطبوعہ بیروت ص۵۸ و ص۱۴۳ [4] سِعلاۃ جس کی جمع سَعالی ہے اس کو بھی صورۃ بدلنے کی قدرۃ حاصل ہے یہ بھی ساحرہ جن ہے (انوار اللغۃ)

تغیر کے سبب نہ غول سے تشبیہ دی نہ مصدر تغول کا کوئی صیغہ بنتا۔ حالانکہ غول اس کے قصیدے کا قافیہ تھا۔ اسی طرح اغتیال بھی ہر آفت وہلاکت پر استعارۃً بولا جانے لگا مگر وہی جو کسی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہو۔

ہر بھوت پریت کو بھی غول نہیں کہتے تھے، غول بیابان کے ساتھ خاص تھا۔ اسلام آیا تو غول کے معنے میں بھی عموم آ گیا۔ حضرت نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ

لا غُولَ ولا صَفَرَ (الحدیث) (لسان العرب صفہ ۲۱) — غول کی (جسکی خلقت انسانی اور پاؤں گدھے کے ایسے مانے جاتے تھے) اسکی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے اور نہ صفر کے مہینے کی نحوست کوئی حقیقت رکھتی ہے۔

چنانچہ معتزلہ غول کی مجازی ہستی کے بھی قائل نہیں (کشاف کلکتہ صفہ ۱۲۰۵)

اہلِ سنت کے محققین کہتے ہیں کہ عرب کے خیال میں جو غول ایک خاص ہیئت رکھتا ہے، اس حدیث میں اس کی نفی ہے جس طرح صفر کا مہینہ تو ہے مگر اس کی نحوست ایک وہم ہے اسی طرح غول بھی ہے مگر اذہان عرب میں جو اس کی صورت ہے وہ وہم محض ہے۔

غرضکہ اسلام نے آکر زبان عرب میں غول کے معنے کچھ کے کچھ کر دئے، اس سے بیابان بھی چھوٹ گیا اور ہر نقصان و خسران غول بن گیا، حتےٰ کہ ایک حدیث میں آتا ہے :-

الغضب غُولُ الحِلْم — غضب حلم وبردباری کے لئے غول ہے۔

حادثات ارضی وسماوی و باد مرض سب پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ ایک حدیث میں آیا ہے :-

اذا تغوّلت الغیلان — جب طرح طرح کے حادثے ہونے لگیں تو اذان اوّل وقت دیا کرو اور دیر تک نمازیں پڑھا کرو۔ (تعاونو بالصبر والصلوٰۃ)

اکثر نے یہ معنے کئے ہیں کہ اذانیں دیا کرو۔ اذان کی آواز سے بلائیں بھاگتی ہیں۔ شیطان اور غول دونوں کے معنے میں بہت وسعت ہوگئی۔ چور کو بھی شیطان کہنے لگے۔ حضرت ابوایوب کا قول ہے کہ شیطان میرے مچان سے کھجور چرا کر لے جاتے ہیں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے شیطان کا کھجور چرانا ثابت ہے۔

ایک شاعر نے تمام اہلِ شام کو شیاطین کہہ دیا ہے۔

ملائکۃ الارض اَهلُ الحجاز ؛ واهل الشام شیاطینها

اہلِ حجاز تو زمین میں فرشتے ہیں اور اہلِ شام شیاطین ہیں۔ (فرائد اللغۃ)

مختصر یہ کہ عربی میں غول کی تعریف اور اس کے معنے میں بعدِ اسلام ایک خاص تبدیلی ہوگئی، چنانچہ عربی کے معتبر لغات میں ہے

وکل ما اغتال الانسان فاهلکه فهو غولٌ۔ (قطر المحیط - بطرس البستانی) — ہر وہ شے جو انسان کو فریب دے اور اس کی ہلاکت کا موجب ہو وہ غول ہے۔

خیالی اور وہمی غول عنقا بن گیا، ایک شاعر نے کہا ہے :-

الغُولُ والخِلُّ والعنقاء ثالثةٌ ؛ اسماءُ اشیاءٍ لم توجد ولم تکن

غول اور بے خلل دوست اور تیسرے عنقا ایسی چیزوں کے نام ہیں کہ نہ وہ ہوتی ہیں نہ پائی جاتی ہیں۔

قرآن شریف میں لفظ غول بفتح غین شراب جنت کی تعریف میں آیا ہے :-

لا فیها غولٌ ولا هم عنها ینزفون۔ — نہ اس میں ہلاکت ہوگی نہ وہ اس سے متوالے ہوں گے۔

یہاں غول کے معنی ہیں ایسے طریقے پر ہلاک کر دینا کہ محسوس نہ ہو۔ (مفردات راغب)

غول کا انگریزی میں مرادف ogress ہے اور یہ لفظ بھی مفرنج ہوگیا Ghoul بھی بولتے ہیں۔

اردو میں قدیم معنے کے لحاظ سے اس کا مرادف چڑیل ہونا چاہیئے اور ہر آفت وصدمے کے معنے پر آسیب۔ اس روشنی کے معنے پر جو پیچھے پیچھے آتی ہے چھلاوہ اور اگیا بیتال۔

اگیا میں گاف پہلے مشدد تھا۔

کیوں نہ انگارے اچھالے پھر وہ انشارات کو ؛ ہے ہماری آہ شاگرد اگّیا بیتال کی

بعد میں یہ گاف مخفف ہوگیا (رشک)

بادشاہوں کی بادشاہی ہے ؛ اگیا بیتال کی دہائی ہے

جنّ بجائے حطلی کا ترجمہ اردو میں چنڈال مناسب ہے۔
سِعلاۃ کا ڈاین، عیہزان کا بھوت، قطروب و قطرب کا پریت ہے۔
ایرانؔ۔ مصرؔ۔ طرابلسؔ۔ ترکیؔ میں بھی عام طبقے غول کو مانتے ہیں۔
الف لیلہ میں سندباد جہازی، قصّہ سیف الملوک، قصّہ وزیر
حاسد میں جن و غول کا بیان آتا ہے۔
لینؔ صاحب نے اپنی کتاب مصریین حاضرہ میں غول کا قبریں
تلاش کر کے مردوں کی لاشوں کو نکال کر کھانا روایت کیا ہے۔
(انسائی کلو پیڈیا آف اسلام)
مقریزی کے خِطط میں ایک روایت ہے کہ غول اور دیو
داء الکلاب (کلب الکلب) کی بیماری عارض کر دیتے ہیں۔

حکیم عیش امروہوی (رنگون)

---

۱ Sketches Of Persia سرجان ملکم ۲ Contes Arabes اسٹپا ۳ Marchen aus Tripoli
۴ Turkisch V. Marchens اسمی ۱۲ منہ - کونوس

وجدانیات

دریا

ہے کتنی جنوں خیز یہ دریا کی روانی
رفتار میں غلطاں ہے کوئی مست جوانی
لہریں ہیں حسیں تار، اثرؔ ساز ہے دریا
سیّاح سناتا ہے حوادث کی کہانی

بہار

گلوں میں رقص ہے، تاروں میں حسنِ دل آویز
فضا میں پھیلی ہوئی ہے ضیائے کیف آمیز
اُمنگ جھوم رہی ہے، خیال لرزاں ہے
بہار کیا ہے؟ شباب جنوں فزا، غم ریز

جوانی

کلیوں کا فسانہ ہے جوانی تیری
پھولوں کا ترانہ ہے جوانی تیری
بہکی ہوئی، شاداب گھٹاؤں کا سرور
ساون کا زمانہ ہے جوانی تیری

ہمدم!

اُلفت کا دل آویز ترانہ ہمدم!
سرمست جوانی کا فسانہ ہمدم!
جب یاد مجھے آتا ہے رو دیتا ہوں
گزرا ہوا، شاداب زمانہ ہمدم!

اثرؔ چکوالی

بصائر

شاعرِ اعظم تلسی داس خیالات میں غرق گنگا کے کنارے اس ویران جگہ میں ٹہل رہے تھے جہاں لوگ مُردوں کو جلاتے ہیں۔ انہوں نے ایک عورت کو دیکھا جو عروسی لباس میں اپنے مردہ شوہر کی لاش کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔

انہیں دیکھ کر وہ اُٹھی، انہیں پرنام کیا اور بولی: "مالک، مجھے اپنی دعاؤں کے ساتھ اجازت دیجیے کہ اپنے شوہر سے بہشت میں جا ملوں۔"

"کیوں بیٹی، اس قدر جلدی کیوں؟" تلسی داس نے پوچھا "کیا یہ دنیا بھی اسی کی نہیں جس نے بہشت بنائی ہے؟"

"لیکن مجھے بہشت کی تو تمنّا نہیں" عورت نے کہا۔ "مجھے تو میرا شوہر چاہیئے۔"

تلسی داس مسکرائے اور بولے "بچی، گھر واپس جا اور اس مہینے کے ختم ہونے سے پہلے تو اپنے شوہر کو پا لے گی۔"

عورت خوش خوش بڑی امیدوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ تلسی داس روز اس کے گھر پر جاتے اور اسے بڑی بڑی باتیں بلند خیالات بتاتے۔ یہاں تک کہ اس کا دل عشقِ حقیقی سے معمور ہو گیا!

ابھی مہینہ مشکل سے ختم ہوا تھا کہ اس کے ہمسائے اس کے پاس آئے اور پوچھا: "تمہیں شوہر مل گیا؟"

بیوہ مُسکرائی اور بولی: "ہاں"

انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا: "وہ کہاں ہے؟"

"میرا آقا میرے سینے میں ہے۔ اب وہ، اور میں، ایک ہیں!" عورت نے جواب دیا۔

"سرکار!" راجہ کے خادم نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "رشی نورتن نے کبھی شاہی محل میں قدم نہیں رکھا۔"

"وہ کھلی سڑک پر درخت کے نیچے بھجن گا رہا ہے۔ مندر پجاریوں سے خالی ہے۔"

"مدھ مکھیوں کی طرح، جو شہد کے سنہرے مرتبان کو چھوڑ کر کنول کے گرد جمع ہو جاتی ہیں، سب اس کے چاروں طرف جمع ہیں۔"

راجہ دل میں جھنجھلایا۔ وہ اس جگہ گیا جہاں نورتن گھاس پر بیٹھا تھا۔

اس نے پوچھا: "پتا جی، آپ سنہرے گنبد والے مندر کو چھوڑ کر خدا کی محبت کے پیغام لوگوں کو یہاں باہر بیٹھ کر کیوں سُنا رہے ہیں؟"

"کیونکہ خدا تمہارے مندر میں نہیں" نورتن نے کہا۔

راجہ کی بھنویں سکڑ گئیں "آپ کو معلوم ہے، بیس لاکھ سونے کے سکّے آرٹ کے اس نادر نمونہ کی تیاری میں خرچ ہوئے اور روپیہ برباد کرنے والی فضول رسموں کے ساتھ اسے خدا سے منسوب کیا گیا؟"

"ہاں میں جانتا ہوں" نورتن نے جواب دیا۔ "اسی سال تمہاری غریب رعایا کے ہزاروں فرد جن کے گھر آتش زدگی کی نذر ہو گئے تھے تمہارے دروازہ پر کھڑے مدد کے لئے بے سود التجائیں کر رہے تھے۔"

"اور خدا نے کہا، وہ جو اپنے بھائیوں کو پناہ نہیں دے سکتا میرے لئے گھر بنا دے گا!"

"اور وہ بھی ان بے پناہوں کے ساتھ سڑک کے کنارے درخت کے نیچے آ رہا۔"

"اور اس سنہرے بلبلے میں غرور کے گرم بھاپ کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

راجہ غصّہ سے چیخ اٹھا: "میرا ملک چھوڑ دو!"

رشی نے بڑے اطمینان سے کہا: "ہاں مجھے بھی وہاں جلاوطن کر دو جہاں تم نے میرے خدا کو جلاوطن کیا ہے!"

شراوستی میں قحط کا زور تھا۔ بودھ نے اپنے پیروؤں سے پوچھا: "تم میں سے کون ہے جو بھوکوں کو کھلانے کا کام اپنے ذمّہ لیتا ہے؟"

بنک کے مالک رتناکر نے سر جھکا کر کہا: "بھوکوں کو کھلانے کے لئے میری ساری دولت سے بھی زیادہ چاہیئے۔"

راجہ کی فوج کے سپہ سالار جے سن نے کہا: "میں اپنا خون تک بہانے کو تیار ہوں، لیکن میرے گھر میں تو کافی کھانا نہیں۔"

دھرمپال جو ایک بڑا زمیندار تھا ایک سرد آہ بھر کر بولا: "خشک سالی کے خوفناک دیو نے میرے کھیتوں کو سکھا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ راجہ کی مالگذاری کیسے دوں گا۔"

تب فقیر کی لڑکی سپریا اُٹھی۔

اس نے جھک کر سب کو پرنام کیا اور بڑی آہستگی سے بولی: "میں بھوکوں کو کھلاؤں گی۔"

"کیسے!" سب حیرت سے چلّا اُٹھے "تم یہ کیسے کر سکو گی؟"

"میں آپ سب سے غریب ہوں اور یہی میری قوت ہے۔ میرا حصہ، میرا خزانہ آپ سب کے گھر میں ہے!"

گنگا کنارے سناتن تسبیح پڑھ رہے تھے کہ برہمن پھٹے چیتھڑوں میں، ان کے پاس آیا اور بولا: "میری مدد کیجئے، میں غریب ہوں!"

"میرے پاس اب صرف میرا کشکول ہے۔" سناتن نے جواب دیا۔ "میرے پاس جو کچھ تھا میں نے دے ڈالا۔"

"لیکن شیو نے مجھے خواب میں درشن دے کر آپ ہی کے پاس آنے کو کہا۔" برہمن نے کہا۔

سناتن کو یکایک یاد آگیا کہ دریا کے کنارے سنگریزوں میں سے انہوں نے ایک پتھر اٹھایا تھا اور یہ خیال کر کے کہ شاید کسی کو اس کی ضرورت ہوگی ریت میں اُسے چھپا دیا تھا۔

انہوں نے برہمن کو وہ جگہ بتا دی۔ برہمن نے بڑی حیرت کے ساتھ پتھر کھود نکالا۔

برہمن زمین پہ بیٹھا سوچ رہا تھا یہاں تک کہ سورج درختوں کے پیچھے چلا گیا اور چرواہے اپنے مویشی لے کر گھر واپس آ گئے۔

تب وہ اُٹھا، آہستہ آہستہ سناتن کے پاس آیا اور بولا: "مہاراج مجھے اس دولت کا ایک ٹکڑا بھی عنایت فرمائیے جو دنیا کی تمام دولت سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔"

اور اس نے اس قیمتی پتھر کو پانی میں پھینک دیا۔

(ٹیگور)

تمنائی

باتیں!

خیال میں نہیں آتیں خیال کی باتیں
یہی تو ہیں غم و رنج و ملال کی باتیں

نہ ربط غم سے، نہ راحت سے کچھ تعلق ہے
عجیب ہیں دلِ شوریدہ حال کی باتیں

برنگِ بو، ہیں پریشانِ گلشنِ ہستی
تمہارے حُسنِ رخِ بیمثال کی باتیں

نہ چھیڑ نغمۂ راحت کو اے مغنّیِ دل
فریبِ کارِ الم ہیں وصال کی باتیں

بپاسِ عشق بیانِ ستم نہیں کرتا
یہ سوچتا ہوں کہ ہیں انفعال کی باتیں

ترے خیال میں سود و زیاں سے کام نہیں
مآلِ کار پہ چھوڑیں مآل کی باتیں

رہیں گی تا بہ قیامت زبان زدِ عالم
جنابِ فائقِ شیریں مقال کی باتیں

فائق کرتپوری

تنویرات

ہندوستان میں فلمی کاروبار :-

مسٹر جی، اے، دوسانی نے روٹری کلب کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے فلمی کاروبار پر حسب ذیل روشنی ڈالی ہے :-

اس وقت ہندوستان کے فلمی کاروبار میں پانچ کروڑ کا سرمایہ لگا ہوا ہے، ایک سو دس اسٹڈیو ہیں اور ننانوے کمپنیاں فلموں کی تجارت کرنے والی ہیں، چھ سو ستر سینما ہال ہیں، جو لوگ فلمی کاروبار میں حصہ لے رہے ہیں ان کی تعداد ۲۵ ہزار ہے۔

مقرر نے کہا کہ ہنوز فلمی کاروبار ابتدائی حالت میں ہے، اگر حکومت اس کی حوصلہ افزائی کرے تو اس سے ملک کے بیکاروں کی تعداد میں بھی کمی ہو سکتی ہے اور چنگی وغیرہ کے ذریعہ حکومت کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے، مسٹر دوسانی کی رائے ہے کہ حکومت صنعت فلم سازی کی اعانت کے خیال سے فلمسازی سے متعلق خام اشیاء کی چنگی معاف کر دے اور فلم سے اصلاح دیہات میں کام لے۔

ہندوستان کی مختلف زبانوں میں فلمیں تیار ہوتی ہیں، ہندی یا اردو کی اوسط درجے کی ایک ناطق فلم کی تیاری پر ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں، یعنی ۱۸ ہزار کچے فلم اور لیبوریٹری پر، ۱۲ ہزار اسٹڈیو کے کرائے پر، پندرہ ہزار آرٹسٹوں کے مشاہرے پر، ۵ ہزار پروپگینڈے پر اور دس ہزار متفرق ضروریات پر"

ہندی کا خبط :-

شیو پرشاد گپتا اور مسٹر سری پرکاش ایم۔ اے بنارس کے مشہور کانگریسی لیڈر ہیں، حال ہی میں مؤخر الذکر نے مسٹر گپتا کے متعلق ایک مضمون "میرے دوست کے تین خبط" کے عنوان سے بنارس کے روزنامہ "آج" میں شائع کیا ہے، اس مضمون کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیو پرشاد گپتا کا اولین خبط یہ ہے کہ انہیں ہندی سے مجنونانہ عشق ہے۔ وہ انگلستان میں بھی مسٹر شری پرکاش کو خطوط لکھتے تھے تو پتہ ہندی میں ہوتا تھا۔

مسٹر گپتا نے ہندی ہی کی ترویج و اشاعت کے لئے "گیان منڈل" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، اسی کی جانب سے اخبار "آج" شائع ہوتا ہے، وہ "ناگری پرچارنی سبھا" اور ہندو یونیورسٹی سے عمیق دلچسپی لیتے تھے، لیکن ان اداروں سے ان کی تشفی نہیں ہوئی، ہندو یونیورسٹی کے قیام میں انہوں نے بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں۔ لیکن جب تعلیم کی خاص زبان ہندی قرار نہ پا سکی تو وہ یونیورسٹی سے دلبرداشتہ ہو گئے اور "ودیا پیٹھ" کے نام سے ایک علیحدہ تعلیمگاہ قائم کی، جس کے چلانے کے لئے انہوں نے دس لاکھ روپے علیحدہ کر دئے۔

مسٹر گپتا کے حالات و واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندی کی توسیع و ترویج میں پندرہ بیس لاکھ روپے سے کم کا ایثار نہ کیا ہوگا۔ حامیان ہندی کی یہی جنون انگیز کوششیں اور قربانیاں ہیں جو ہندی کو اس طرح پروان چڑھا رہی ہیں۔ کیا اردو کے حامیوں میں بھی مسٹر گپتا کی کوئی مثال موجود ہے؟ افسوس کہ اس کا جواب قطعاً نفی میں ہے۔

کاشتکاری کا ماضی و حال :-

اس وقت پنجاب میں ۵۶ فیصدی کاشتکاروں میں سے ہر ایک کے پاس پانچ پانچ ایکڑ زمین ہے۔ بمبئی کے علاوہ باقی صوبوں میں فی کاشتکار اس سے بھی کم اراضی ہے، پنجاب کے دو ہزار دیہات کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۸ فیصدی کاشت کے کھاتے ۵ ایکڑ سے کم ہیں۔ "ڈاکٹر مین" کے بیان کے مطابق سنہ ۱۷۷۱ء میں ضلع پونہ کے کاشت کے کھاتے کا اوسط نتیجہ ۴۰ ایکڑ تھا، اس کے ۱۴۴ سال بعد یعنی سنہ ۱۹۱۵ء میں وہ سات ایکڑ رہ گیا۔ چنانچہ ہندوستان کی مردم شماری تو بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن کاشت کے

کھاتے میں کمی ہی واقع ہوتی جا رہی ہے۔

تفصیل کے لئے ذیل کے اعداد شمار کو ملاحظہ کیجئے۔

نام ضلع	سنہ ۱۸۹۴ء	سنہ ۱۹۲۲ء
	ایکڑ	ایکڑ
حصار	۱۲٫۴	۷٫۷
رہتک	۴٫۶	۳٫۰
گوڑگاؤں	۳٫۷	۲٫۴
کرنال	۴٫۷	۳٫۱
انبالہ	۲٫۷	۱٫۷
شملہ	۱٫۳	۱٫۱
کانگڑا	۲٫۱	۱٫۲
ہوشیار پور	۱٫۲	٫۹
جالندھر	۱٫۶	۱٫۲
لدھیانہ	۲٫۹	۲٫۱
فیروز پور	۶٫۹	۴٫۴
لاہور	۵٫۰	۳٫۶
امرتسر	۵٫۰	۳٫۶
گورداسپور	۲٫۰	۱٫۶
سیالکوٹ	۱٫۹	۱٫۳
گوجرانوالہ	۴٫۴	۲٫۹
گجرات	۲٫۸	۱٫۸
شاہ پور	۵٫۳	۵٫۰
جہلم	۳٫۶	۱٫۷
راولپنڈی	۳٫۰	۱٫۳
منٹگمری	۶٫۷	۱٫۶
جھنگ	۵٫۲	۴٫۷

(جب سے نہروں کے ذریعہ آبپاشی ہونے لگی ہے کاشت کی زمین میں اضافہ ہو رہا ہے)

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ زمین پر گزر کرنے والوں کی تعداد میں تو اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر کاشت کے کھاتوں میں کمی واقع ہوتی جا رہی ہے، یعنی جس رفتار سے زمین پر گزر کرنے والوں کی تعداد میں ترقی ہو رہی ہے۔ اس کی مناسبت سے کاشت کے کھاتوں میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ عہد مغلیہ کے کاشتکار عہد حاضرہ کے مزارعین کے مقابلہ میں زیادہ کھاتے پر کاشت کرتے تھے اور ان کھاتے کی اوسط پیداوار آج سے زیادہ تھی۔

ایک سو چالیس سال کی زندگی کا نظریہ :-

ڈاکٹر "سرج ووروناف" بندر کے غدود کا پیوند لگا کر بوڑھے کو جوان بنانے کے عمل کے باعث غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں، انہوں نے حال ہی میں برطانی پریس کو ایک بیان دیا ہے جس میں وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ انسان عام طور پر ایک سو چالیس برس کی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کے بیان کا ایک حصہ حسب ذیل ہے :-

"اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان مرد ہو یا عورت کم از کم ایک سو چالیس برس تک زندہ نہ رہ سکے، میرے مشاہدات و تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ جتنا زمانہ کسی حیوان کے سن بلوغ تک پہنچنے میں صرف ہوتا ہے اس کے سات گنے زمانے تک وہ زندہ رہتا ہے۔ چنانچہ انسان بیس سال کی عمر میں کامل بلوغ کو پہنچتا ہے لہذا اسے کھلی ہوئی فضا، فطری ماحول، محبت و خوشی اور غم کے بنیادی جذبات کی معتدل دنیا نصیب ہو تو اسے بیس سال کے سات گنے وقت یعنی ایک سو چالیس برس تک یقیناً جینا چاہیئے۔"

ادارہ

احسن الکلام

جب تک ہمارے ساتھ دلِ بیقرار تھا — حاصل سکونِ زندگیٔ مستعار تھا

تربت میں بھی جنوں کا اثر آشکار تھا — دیکھا جو لاش کو تو کفن تار تار تھا

جو تیر بے چلے ہوئے سینے سے پار تھا — وہ اِک کرشمۂ نگہِ شرمسار تھا

اچھا ہے زندگی کے بکھیڑے تمام ہوں — خوب آئی اے اجل کہ ترا انتظار تھا

جو بوند شاخِ گل پہ گری پھول بن گئی — تھا گلکدہ کہ دامنِ ابرِ بہار تھا

خوش اعتمادِ عشق کا اللہ رے حسنِ ظن — وہ جھوٹ بولتے تھے مجھے اعتبار تھا

دامن جھٹک جھٹک کے اُڑاتے رہے جسے — وہ اُن کے پائمالِ ستم کا غبار تھا

جب آپ لے کے آگئے سرمایۂ سکوں — پھر جان مضطرب تھی نہ دل بیقرار تھا

اب دیکھئے کہ حشر میں آتا ہے کیا نظر — اس دن کا عمر بھر سے ہمیں انتظار تھا

مایوسیوں سے جس کو ہوئیں راحتیں نصیب — وہ نامراد آپ کا امیدوار تھا

مجبورِ عشق کیوں نہ کرے اعترافِ عجز — وہ دل کہاں ہے جس پر اُسے اعتبار تھا

احسن جو رہ کے نیک بھی بدنام ہی رہا
یہ اِک کرم نما ستمِ روزگار تھا

احسن مارہروی

ملوک شاہ

میں نے آج تک کوئی افسانہ ترجمہ نہیں کیا - اردو کا یہ دور، دورِ ترجمہ ہے۔ اردو ادب کو ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کے منتخب خیالات کے ترجمے کی ازحد ضرورت ہے اور تخیل لکھنے کی توفیق تو بہت ہی قابلِ ستائش ہے، یہ پہلا افسانہ ہے جسے میں ترجمہ کر رہا ہوں - اس افسانے کے مصنف مسٹر محمد خالد اختر (ریاست بہاولپور) ہیں - انہوں نے یہ افسانہ انگریزی میں لکھا تھا، اس قسم کا بلند اور کامیاب افسانہ لکھنا اُن کے مستقبل کی انتہائی کامیابی کی دلیل ہے، وہ اردو میں بھی لکھتے ہیں اور اُن کا افسانہ "ایک ہزار ڈالر" جو او ہنری کے ایک مختصر افسانے کا ترجمہ تھا، ملک میں بہت مقبول ہوا تھا۔

ترجمے میں وہ کیفیت قائم رکھنے کی ازحد کوشش کی گئی ہے، جو خالد صاحب کے افسانوں کی بنیاد ہوتی ہے ——— خوف، اسرار رومانی سُرعت اور پیارا انجام ———

(احمد ندیم)

(۱)

ہم افسانہ نگار لوگ بہت عجیب اور اُلجھے ہوئے نفسیات رکھتے ہیں - میری عادت بن چکی ہے کہ میں ریت کے ٹیلوں کی خشک سنسان وسعتوں میں بہت دُور تک چلا جاتا ہوں، ایک شام کا ذکر ہے، میں جیبیں بسکٹوں سے بھرے بغل میں ایک دُوربین دبائے گھر سے دبے پاؤں نکلا اور ملوک شاہ کی طرف چل پڑا -

ملوک شاہ کی طرف جانے والی سڑک سرسبز کھیتوں میں سے گزرتی ہے، اور اس کے دونوں طرف گنجان سایہ دار درخت سر اٹھائے لہرا رہے ہیں - آدھ گھنٹے کے بعد ایک تباہ شدہ گرد آلود [illegible] پہنچا۔ یہاں سے جنوب کی طرف ایک پگڈنڈی ہے، جو ملوک شاہ کے قلب تک جاتی ہے -

یہاں کے نظارے پر وحشت اور تنہائی برس رہی تھی -

یکایک سڑک، ایک غیر آباد علاقے میں داخل ہو گئی - صرف چند کھجوریں ایک بلند ٹیلے پر اگی ہوئی خشک گھاس کے قریب کھڑی ہوئی مجھے گھور رہی تھیں - درخت اور زیادہ گنجان ہو گئے تھے، اور شام کے پھیلتے ہوئے دھندلکوں میں اُن کا وجود اور بھیانک ہوتا جا رہا تھا -

طویل اور شاندار کھجور کے درختوں کے ایک سیاہ جھنڈ کی

ملے شہر بہاولپور کے جنوب مغرب کی طرف ایک پرانے قبرستان کا نام ہے۔

دوسری جانب سورج غروب ہو چکا تھا -

مجھے ملوک شاہ کا سفید گنبد نظر آیا - اُفق پر ابھی تک بجھتی ہوئی آگ کی سی چمک باقی تھی اور ویران قبرستان پر ایک مدھم اور اداس سی روشنی کانپ رہی تھی - میں اب چاروں طرف مُردوں کے [illegible] سے گھرا ہوا تھا - یہ خیال آتے ہی میری رگوں کا خون منجمد ہو کر رہ گیا - [illegible] تو تھا ہی - جھٹ، ایک قبر کے تعویذ کے قریب بیٹھ کر بسکٹ کھانے لگا - ہر طرف قبریں تھیں ——— مختلف جسامت کی لاتعداد اُبھری ہوئی ڈھیریاں ——— اور وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے مرے ہوئے لوگوں کے متعلق بھیانک بھیانک خیالات ستانے لگے - وہ بھی اسی زمین پر چل چکے ہیں جس پر آجکل ہم چل رہے ہیں اور اب وہ پتھروں کی طرح ان تنگ و تاریک غاروں میں دفن ہیں - کسی دن مجھے بھی دھوپ اور بارشوں کی تکالیف سے بے نیاز اور مستقبل سے بے خبر ہو کر یہاں سونا پڑے گا!

میں تھرا اُٹھا - کیا انسان کا یہی انجام ہے، زندگی نو میدی کا نام ہے اور زندگی کا انجام؟ ——— ایک مُٹھی بھر خاک! پھر ان فانی لوگوں میں غرور کیوں ہوتا ہے؟ ان تصورات سے یہ بات میرے دل پر نقش ہو گئی - کہ ہم فنا ہو جانے والے کھلونے، زندگی کی مضطرب لہر پر اچھلتے ہوئے جھاگ کی طرح ہیں اور ہمارا علم غیر معمولی طور پر محدود ہے!

میں ان خیالات میں محو ہو کر وہیں سو گیا - میں نے ہولناک

خواب دیکھے ، لاشیں دیکھیں۔ کھلی ہوئی بے نور آنکھوں والی لاشیں جو چیختی چلاتی قبروں پر سے کودتی پھاندتی سڑک کے اس پار تک میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میں یکایک نیند سے بیدار ہو گیا۔ ڈر کے مارے لرزتا ہوا ——— میرا سانس حلق میں اٹکا ہوا تھا اور میرا دل ایک زخمی پرندے کی طرح میری پسلیوں میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

میرے خدا! ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجے تھے! میں پورے دو گھنٹے تعویذ کے قریب سویا رہا۔ رات قبر کی طرح تاریک تھی اور میرے ارد گرد سوئے ہوئے پنجر! قبرستان پر خوفناک سکوت چھایا ہوا تھا۔ میرے قریب ہی ملوک شاہ کی سیاہ عمارت سر اٹھائے خاموش کھڑی تھی، اگر کوئی آواز تھی تو میرے دل کے دھڑکنے کی جو اُن مینڈکوں کی آواز میں گم ہوئی جا رہی تھی، جو دور بارش کے پانی سے بھرے ہوئے ایک گڑھے میں چیخ رہے تھے۔ کبھی کبھی بہت قریب ہی کسی قبر میں مجھے سانپ کے پھنکارنے کی آواز سنائی دیتی تھی اور میرا خون جم جاتا تھا، کیونکہ کائنات کی ہر چیز سے زیادہ میں سانپوں سے بہت ڈرتا ہوں، مجھے اکثر ان غلیظ بھیانک کیڑوں کو اپنی ٹانگوں میں رینگتا ہوا دیکھنے کے خواب آتے ہیں اور میں خوف کے مارے اپنے بستر پر چیخ کر جاگ اٹھتا ہوں اور اپنے پاؤں کو پائنتی کی رسی میں پھنسا ہوا پاتا ہوں۔

میں اس سنسان اور "مردہ" جگہ پر حیران بیٹھا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ یہ سوال میرے دماغ میں طوفان مچا رہا تھا ——— گھر کس طرح پہنچوں؟ ——— !

مجھ میں حرص کا عنصر بہت کم ہے، مگر اُس وقت میرے جی میں آئی کہ کاش اس وقت میرے پاس الہ دین کا چراغ ہوتا اور میں مہربان بوڑھے جن کو بلاتا، جو پل بھر میں مجھے اپنے نرم و گرم بستر پر لٹا دیتا۔ آہ! ——— گزرے ہوئے زمانے کتنے اچھے تھے! ——— ہارون الرشید کے خوشگوار عہد میں نیک دل جن اور پریاں پریشان لوگوں کو اُن کی تکلیفوں سے رہائی دلاتی تھیں ——— کاش میں بھی اُس خلیفۂ اعظم کے جگمگاتے ہوئے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا ہوتا!

میں اپنے خشک تصورات میں محو بیٹھا تھا۔ خوف کے مارے میرا سلسلۂ تنفس بہت بے ربط ہو گیا تھا اور سانپوں کے ڈر سے تعویذ سے نیچے پاؤں رکھنے سے بھی ہچکچاتا تھا۔

ناظرین! آپ مجھے بزدل تصور نہ کریں۔ آپ کا یہ فیصلہ صحیح نہیں میں تو بہادر بحری قزاقوں کے دل گردہ کا انسان ہوں اور میرے خیال میں رابنسن کروسو ایسے مہم پسند شخص سے میرا رشتہ جا ملتا ہے، میرا بزرگ (خدا اس کی نسل کو بڑھائے!) مردم خوروں کے نقوشِ پا سے بہت ڈرتا تھا۔ میں سانپوں سے ڈرتا ہوں — ہم دونوں میں کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں۔ ہر انسان دنیا میں کسی نہ کسی چیز سے ضرور ڈرتا ہے۔

(۲)

اُفق سے چاند نمودار ہوا اور سنسان قبرستان پر مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ ملوک شاہ کے مقبرے کا عظیم الشان گنبد چاندنی میں برف کی طرح چمکنے لگا۔ لیکن باقی عمارت اُسی طرح تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ عمارت ایک دیو کی طرح آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑی تھی اور میں اس کی طرف خوف اور احترام کے مخلوط جذبات سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے اس میں زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔

میں نے کسی چیز کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنی، کوئی قبرستان کے پھاٹک کو کھول رہا تھا یا بند کر رہا تھا، لالٹین کی ہلکی سرخ روشنی سیڑھیوں پر پھیلی ہوئی تھی، اچانک مجھے ایک سایہ لالٹین ہاتھ میں لٹکائے دکھائی دیا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع نہ ملا، کیونکہ وہ تیزی سے مڑا اور پراسرار ملوک شاہ کی دیوار کے اندھیرے میں تیزی سے چلنے لگا۔ "وہ قبرستان کا رکھوالا ہوگا" میں نے خیال کیا "اسے کیوں نہ کہوں کہ مجھے گھر تک پہنچا دے — وہ ضرور میری بات مان لے گا۔ میں اُسے بسکٹ کھلاؤنگا اور وہ میرا دوست بن جائے گا۔"

میں اُسے بلانے کے ارادے کو نہ روک سکا۔ "او میاں!" میں نے چیخ کر اُسے بلایا اور ملوک شاہ نے میرے الفاظ دہرائے۔ میری آواز پر وہ اچانک اس طرح کودا، جیسے کسی نے اس کی پشت پر ٹھوکر لگائی ہے، وہ سانڈ کی طرح موٹا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا کریہہ المنظر آدمی نہیں دیکھا۔ اس نے خون کی سی سرخ آنکھیں جو اس کے موٹے سر سے باہر نکل جانے پر تُلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، مجھ پر گاڑ دیں۔

میرا سلسلۂ تنفس بند تھا۔ میں بھاگ جاتا۔ مگر بھاگنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ وہ اپنی راہ پر جا رہا تھا۔ او خدا! میں نے اُسے کیوں بلایا! میں مایوس ہو کر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

اس کا سر جو اُسترے سے اچھی طرح صاف کیا ہوا تھا چاندنی میں شیشے کی طرح چمک رہا تھا، اُس کا منحوس چہرہ چیچک کے گہرے گہرے داغوں سے بُری طرح بدنما ہو گیا تھا۔ وہ کوئلے کی طرح سیاہ تھا اور بلاشبہ اسقدر خوفناک اور گھناؤنا انسان کہ اُس کو دیکھ کر شیطان کے دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی!

وہ میری طرف آنے لگا۔ اس لالٹین اٹھائے ہوئے بدصورت بھوت کا سامنا کرنے کی بجائے میں آگ میں کودنے پہ تیار تھا۔ اُس نے اپنی رفتار میں کوئی تیزی نہ دکھائی، وہ خاموش پُراسرار طریقے سے موت کی طرح میری طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے مایوس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی پناہ؟ ——

افسوس! —— میں نے اپنے آپ کو مقدر کے حوالے کر دیا!

میں قبر کے پاس کھڑا ہو گیا اور اپنے چہرے پر جرأت اور سکون کے آثار لانے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک لمحے کے بعد ہم بالمقابل کھڑے تھے!

"تم کون ہو؟" اُس نے ریاستی زبان میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے اُس کے چہرے پر لیباط بھر قدرے دلیر نظروں سے دیکھا اور خاموش رہا۔

"کیا تم بہرے ہو؟ کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں؟ بولو!"

اب جب کہ وہ کمبخت میرے سامنے کھڑا تھا، میں اپنے تمام کھوئے ہوئے حواس مجتمع کرتے ہوئے انگارے کی طرح سرخ ہو کر چلایا،

"اور اگر میں نہ بولوں؟"

"تو میں تمہیں بولنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔" اس کی آواز سخت اور بھاری تھی۔

"اچھا! بھونکو نہیں!" میں نے غصہ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنی راہ لو۔"

لیکن اُس کی نظریں میرے ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے بسکٹوں کے پیکٹ پر پڑیں اور وہیں جم کر گئیں۔

"بابو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اُس نے نہایت نرمی سے پوچھا۔

"اوہو، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" میں نے صاف آواز میں کہا" میں نے تمہیں صرف بسکٹ دینے کے لئے بلایا تھا۔ لو میرے دوست! اب تم جا سکتے ہو، مجھے افسوس ہے، میں نے تمہیں اتنی دیر روک کے رکھا۔"

میں اپنی بات ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ پیکٹ میرے ہاتھوں سے نوچ لیا گیا تھا۔ اُس نے اُسے اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا اور اُسے ایک ہی لمبا بسکٹ سمجھتے ہوئے اُس کا ایک سرا منہ میں ٹھونس کر چبانے لگا۔

"اس طرح نہیں بھائی" میں نے کہا "مجھے دو نا۔ میں اس کا طریقہ تمہیں بتاؤں۔"

لیکن وہ تو میری طرف سے قطعاً بے توجہ ہو گیا تھا۔ پیکٹ کو اپنے منہ سے نکالا اور میری طرف مڑا۔ اُف کسقدر بھیانک چہرہ تھا! میں خوف سے سہم گیا۔

"کاغذ!" اُس نے کہا "تم مجھے کاغذ کھانے کو دیتے ہو؟ ہاں؟ دیکھو۔ میں مذاق برداشت نہیں کر سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ تمہارا بسکٹ ہے؟" اور اس نے دھمکی کے انداز میں پیکٹ میری طرف پھینک دیا۔

اُس بے وقوف کو یہ سمجھانے میں بھی کافی وقت لگا کہ بسکٹ پیکٹ کے اندر ہوتے ہیں۔

اُس کی سیاہ موٹی انگلیاں پیکٹ کے اندر گھس گئیں اور چار پانچ پسے ہوئے بسکٹ باہر گھسیٹ لائیں۔ اُس نے وہ سارے کا سارا "سفوف" منہ میں گھسیڑ دیا، یہ بہت غلیظ منظر تھا!

"آہا ہا!" اُس نے کہا "یہ کتنے لذیذ ہیں! حلوے سے بھی زیادہ لذیذ! نوجوان۔ تو نے مجھے بہت خوش کیا ہے، میں تجھے اِس کا بدلہ دوں گا!"

میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس شخص کے دل میں کوئی ایسی بات ڈال دے کہ مجھے چھوڑ کر اپنی راہ لے۔

"لڑکے" اس نے بسکٹوں کو چباتے ہوئے کہا "اب میری باری ہے کہ تمہیں خوش کروں۔ تیار رہو۔"

یہ الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ یہ ایک وحشیانہ مسرت سے بے تاب ہو کر کہے گئے تھے اور پھر یہ عجیب بھی تھے۔ ظاہراً بے معنی بھی! مجھے اُن میں ظلم اور شرارت کی جھلک نظر آئی۔ کمبخت کا مطلب کیا تھا!

"ہاہاہا!" بدصورت شخص ہنسا "میں تمہارے دل کی بات

سمجھ چکا ہوں، میں حافظ ہوں، قرآن مجھے فرفر یاد ہے اور میں سب
کچھ سمجھ چکا ہوں، تم مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو میں تمہیں
نقصان پہنچاؤں گا؟ مجھ پر خدا کا قہر برسے اگر میں تمہارا بال تک
بیکا کروں، تم نے مجھے بسکٹ کھانے کو دئے ہیں اور میں تمہارے
ساتھ شرارت کروں؟ یہ مہمان نوازی کے اصول کے خلاف ہے،
لیکن میں تمہیں ضرور ـــــ"

اور پھر ـــــ اور پھر ـــــ وہ اپنا چہرہ میرے قریب
لایا اور اُس نے یہ الفاظ ایک ایسی آواز میں کہے جو سرگوشی سے بہت
کچھ ملتی جلتی تھی: "بلاشبہ بسکٹوں کا ایک پیکٹ اٹھارہ سال کی ایک
خوبصورت دوشیزہ سے زیادہ لذیذ نہیں ہو سکتا!"

میں اُس کی بات نہ سمجھ سکا! میں اُس کی بات سمجھنا ہی نہ چاہتا
تھا! اُس کی باتیں میرے لئے پہیلیاں تھیں!

(۳)

"میرے ساتھ آؤ نوجوان!" اُس نے میرا بازو اپنے آہنی پنجے
میں پکڑتے ہوئے کھینچا میرے پاؤں اُکھڑ گئے۔

میں اُس منحوس شخص کے ہمراہ جانے کے بغیر اور کر ہی کیا سکتا
تھا، اُس خوفناک حافظ کے ساتھ ساتھ چلتا میں سڑک پر پہنچ گیا۔

فراقانہ دلیری اور شاعرانہ بلند نظری کی رُوح میرے دل
سے ہوا ہو گئی اور میں نے جی ہی جی میں قسم کھائی کہ پھر اس طرح کے تنہا
اور خوفناک مقام پر کبھی نہ آؤں گا۔

"بابو" اُس نے میرا بازو اپنی گرفت سے رہا کرتے ہوئے
کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام خالد ہے" میں نے کہا "محمد خالد" مجھ میں اتنی طاقت
کبھی تو نہ تھی کہ یہاں ایک سہل سا جھوٹ ہی بول دیتا!

"اچھا" وہ کہتا ہے "میں تمہیں خالد ابن ولید کہا کروں گا۔ اچھا
خالد ابن ولید۔ تم وقت بتا سکتے ہو؟"

"گیارہ" میں نے غمزدہ ہو کر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
گھر پہنچ جانے کا ابھی وقت باقی تھا۔ میں کہہ دیتا کہ میں سینما پر گیا تھا اور
سب یقین کر جاتے۔ لیکن جس طرح آپ دیکھیں گے، مجھے تقریباً
ساری رات ملوک شاہ میں گزارنا پڑی۔

ناظرین! اگر آپ کبھی ملوک شاہ گئے ہوں، تو آپ نے سڑک
کی دائیں جانب ایک مسجد کے کھنڈر دیکھے ہوں گے، یہ مسجد
بدحالی کی آخری حدود تک پہنچی ہوئی ہے اور چاندنی رات میں اس کا
نظارہ بہت افسوسناک اور قدرے بھیانک سا ہوتا ہے، جنگلی جھاڑیاں
اور خاردار بیلیں دیوار پر سے اندر لٹک رہی ہیں۔ تین طرف سے تو یہ
قبروں سے گھری ہوئی ہے، چوتھی جانب سڑک ہے، اس خانۂ خدا
کو خدا والوں نے بالکل بھلا دیا ہے اور اب یہ شہر کے غنڈوں اور بدمعاشوں
کی آخری آرامگاہ ہے، میرے اس بیان کی سچائی کے ثبوت طلب کئے
جائیں گے اور میں پیش کر سکتا ہوں!

وہاں جا کر حافظ قرآن ٹھہر گیا۔

"وقت؟"

"گیارہ بجکر بیس منٹ" میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"کتے" وہ گرج اٹھا "اُن پر قہر برسے، وہ ابھی تک نہیں آئے،
میں پورے دو گھنٹے سے اُن کا انتظار کر رہا ہوں۔"

چاندنی میں سڑک سفید اور صاف معلوم ہوتی تھی۔ اُس پر کوئی
جاندار نظر نہ آتا تھا۔ میرے سامنے وہ ایک سیمیں فیتے کی طرح دور تک
لہراتی ہوئی جنگل اور تاریکی میں گم ہو گئی تھی۔

اچانک جنگل سے چار مدھم سایے نمودار ہوئے، اور ہماری طرف
آنے لگے، انہوں نے اپنے کاندھے پر ایک تابوت اُٹھایا ہوا تھا وہ
نزدیک آتے گئے۔ وہ کتوں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ صاف ظاہر
تھا کہ دُور سے آ رہے تھے، وہ ٹھہر گئے، انہوں نے تابوت کو حافظ
کے قدموں میں رکھ دیا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر ہانپتے ہوئے کھڑے
ہو گئے، حافظ اُن کی طرف قاتلانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس کی وجہ
سے اُن کے رنگ فق ہو گئے تھے۔

حافظ کے ہونٹوں پر ایک حرف تک نہ آیا۔ اُس کا چہرہ قبر کی
طرح ساکن تھا اور قلم کی نوک کی طرح چبھتا ہوا۔ اُس نے انہیں بہت
گالیاں دیں اور پھر میری طرف مڑ کر اُس نے اپنا سر پیچھے کی طرف اس
طرح گرا دیا۔ جس طرح ایک سانپ کسی کو ڈسنے کی نیت سے پھن اٹھا کر
اُبھرتا ہے، میں خوف کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔

اُس نے میرے بازو پر رازدارانہ طور پر چٹکی لی۔

بدسرشت وحشی تابوت پر جھکا اور اُس کا ڈھکنا اُٹھانے لگا۔

آہستہ آہستہ، تھم تھم کر، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ـــ
اور تابوت میں ایک نوجوان لڑکی پڑی تھی۔ اس کا زرد چہرہ شمع کی طرح
میری آنکھوں میں چمکا۔ اُس کا قد میانہ تھا۔ میرا دل محبت اور رحم سے

مجبور ہو کر اُس کی طرف جھک گیا۔ میرا سارا خون میرے چہرے پر
اکٹھا ہو گیا۔ ایک معصوم مقدس لڑکی ظلم اور بے حیائی میں گھری ہوئی
تھی۔ اُسے بچانا چاہیئے! یہ میرا فرض تھا! لیکن میں اتنے لوگوں کے
مقابلے میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ میں اتنا زبردست جنگجو بھی تو نہ تھا۔
پانچ خونی بدمعاش ایک طرف اور دوسری طرف میں! جسمانی طاقت
بے سود تھی۔ اُن نفرت انگیز سفلوں کے سامنے دلائل و براہین پیش
کرنا میری بے وقوفی تھی۔ بُری خواہشات اور غلیظ جذبات کے
ماتحت وہ کسی دلیل کو سُننا ہی نہ چاہتے تھے، اسلئے مجھے کوئی اور
رستہ تلاش کرنا تھا۔

اسٹونکسن اپنے ناول "ماسٹر آف بیلنٹرے" میں لکھتا ہے کہ
بُرے لوگ بہت بزدل ہوتے ہیں۔ اُس کی یہ بات میرے دل میں
گھومنے لگی!۔

حافظ سے اُس لڑکی کو چھٹکارا دلانے کا طریقہ صرف یہ تھا کہ
اُسے کسی طرح ڈرایا جائے، یہ خیال بجلی کی طرح میرے دل میں لہرانے
لگا۔ لڑکی کو دیکھنے کے بعد حافظ میری طرف رُخ پھیر کے کھڑا تھا۔
گویا کہ وہ مجھ سے لڑکی کے حُسن کے متعلق استفسار کر رہا ہے۔
لیکن میں بہت بے تابی اور اضطراب سے ایک اور طرف دیکھ رہا
تھا۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ مجھے کوئی خاص چیز نظر آئی ہے۔ آخر میں نے
نہایت مدھم آواز میں تیزی سے کہا "پولیس!"

پانچوں بدمعاشوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ جیسے
اُن پر کوئی منتر پڑھ دیا گیا ہو، وہ مردے کی طرح زرد ہو گئے اور
اپنی جگہ سے ایک انچ تک نہ سرکے، بلکہ ایک دوسرے کی طرف
خوفزدہ نظروں سے دیکھتے رہے، اُن کی بہادری ہوا ہو گئی۔ اُن
کی رگ رگ میں خوف سمایا جاتا تھا۔ اُن کے چہرے سب کچھ
بتا رہے تھے۔ حافظ تو ان چاروں سے زیادہ مضطرب تھا۔ اُس
کی سُرخ آنکھوں سے خوف پھوٹا پڑتا تھا۔ میں اُس کے بھیانک
چہرے سے صاف طور پر سب کچھ پڑھ سکتا تھا۔ یہ سب اثر ایک
لفظ "پولیس" کا تھا۔

"حافظ" میں نے دھیمی آواز میں کہا "انہوں نے ابھی ہمیں
نہیں دیکھا، اس طرح کریں، تابوت کو مسجد کے حجرے میں رکھ دیں۔
اور بھاگ چلیں۔ اگر تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو، تو یہی ایک راہ ہے
ایک منٹ اور تاخیر کرنے پر یقینی طور پر ہم حوالات میں ہوں گے۔"

میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"تم واقعی سچ کہہ رہے ہو" حافظ نے دبی ہوئی بھدی آواز
میں کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بے وقوف نہیں ہو۔" اور پھر وہ اپنے
آدمیوں کی طرف مُڑا "اگر تمہارے ان بیوقوف سروں میں کان بھی
ہیں، تو تم اُس جوان بابو کی تجویز کو سُن چکے ہو گے، یہی کرو" ——
اور بزدل حافظ ہم سب سے پہلے کھسک گیا!

چاروں بدمعاش اپنے آقا کا حکم ماننے کے لئے ٹھہرے رہے،
میں بھی اُن کے ساتھ تھا، لیکن کسی اور مقصد کے لئے، انہوں نے
تابوت کو کاندھوں پر اٹھایا اور اُسے حجرہ میں لے گئے، اور پھر چاندنی
سے چمکتی ہوئی سڑک کی اُس طرف تاریک گنجان درختوں میں گھس گئے۔
میں مسجد کے پیچھے ٹہلتا رہا اور انہیں خوفزدہ بھیڑوں کی طرح دبے
پاؤں بھاگتا ہوا دیکھتا رہا۔

جب سب چلے گئے اور میدان صاف نظر آیا تو میں آہستہ آہستہ
حجرہ کی طرف بڑھا، میرے خدا! لڑکی تابوت سے نکل کر کھلی کھڑکی کے
پاس کھڑی تھی۔ لڑکی کا سیاہ جسم میرے اور تاریک جنگل کے درمیان
ساکت کھڑا تھا، اور جب میں حجرہ میں داخل ہوا تو مجھے اُس کا زرد خوفزدہ
چہرہ نظر آیا۔ وہ کانپتی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی رہی۔

"مجھے قسم ہے، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا لڑکی"
میں نے شعریت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "میں نے تمہیں ظالم
آدمیوں کے پنجوں سے چھٹکارا دلایا ہے، اور اب میں تمہیں صرف
اپنا بنانے کے لئے آیا ہوں، تمہیں محبت کی مسرتوں کے گیت سنانے
کے لئے! —— لیکن ہمیں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔
پیاری لڑکی —— آؤ، باہر چلیں اور اس بھیانک جگہ کو چھوڑ دیں۔
بدمعاش شاید ابھی لوٹ آئیں۔"

"تم مجھے دھوکا تو نہ دو گے؟" اُس نے مجھے خوفزدہ مگر
سحر انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ اچھی دوشیزہ! آؤ"

"دھوکا نہیں دو گے نا؟" اس نے میری آنکھوں سے آنکھیں
ملاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ آؤ۔ دیر نہ ہو جائے۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔"

"یاد رکھو نوجوان! کہ یہ زندگی ایک خواب ہے اور خواب
کی طرح ختم ہو جاتی ہے، یہ بھی یاد رکھو کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے

اُسے وہ خدا ضرور جانتا ہے۔" اُس کی آواز کانپ رہی تھی اور قدرے بھرائی ہوئی بھی تھی۔ "ڈرو نہیں" میں نے کہا۔ "میں ایک غریب بے یار و مددگار لڑکی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ہمیں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ باور کرو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

اُس کے تمام جسم میں ایک کپکپاہٹ سی تھی۔ جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری بیحد ممنون ہے، وہ بڑھی اور اپنا ملائم ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ اُس لڑکی کے سفید ہاتھ کے لمس سے میری رگوں میں محبت اور رحم کی ایک لہر دوڑ گئی، حجرے سے نکلنے سے پہلے ہم نے باہر مدھم تاریکی میں جھانکا۔ ایک بادل کے ٹکڑے نے چاند کو ڈھانپ لیا تھا اور اب بالکل اندھیرا تھا۔ جنگل آہیں بھر رہا تھا۔ ہم سڑک پر پہنچ گئے جہاں سایے سو رہے تھے اور پھر ہم اپنی طاقت سے بھاگے، پندرہ منٹ کے بعد ملوک شاہ کا قبرستان مدھ اندھیرے میں ہمارے پیچھے گم ہو گیا۔

..... اور باقی حالات میں تیزی سے بیان کئے دیتا ہوں، میں نے اُس لڑکی کو تمام حالات بتائے، کس طرح میں نے حافظ اور اُس کے چیلوں کو ڈرا کر بھگایا تھا۔ وہ میرا بار بار شکریہ ادا کرتی تھی۔ مگر میں صرف شکریہ نہ چاہتا تھا۔ میری خواہش کچھ اور تھی —— ایک دوشیزہ کا پیار۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم صادق سینما کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں سے راستے جُدا ہو رہے تھے۔ یکایک وہ ٹھہر گئی۔

"اب ہم کو جُدا ہونا پڑے گا" اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُسے پکڑے رکھا مگر زبان سے کچھ نہ بولا!

"میرا نام عذرا ہے" اُس نے کہا "میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی تم کتنے اچھے ہو۔"

"عذرا! میں تمہیں مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔" میں نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا اب تم آنے والے دنوں میں میرے تصوّرات پر منڈلاؤ گی عذرا! —— تمہاری زندگی سورج کی نرم کرن کی طرح میری زندگی میں تحلیل ہو گئی ہے، خدا جانے ہم پھر ملیں گے یا نہیں۔ عذرا —— میری عذرا بتاؤ۔ ہم پھر ملیں گے؟"

"کون کہہ سکتا ہے!" اس نے کہا "صرف آسمانوں والا خدا جانتا ہے!"

"ہاں صرف آسمانوں والا خدا جانتا ہے!"

"ہمیں اب جدا ہونا چاہیئے۔"

"تنہا عذرا؟ —— تم تنہا جاؤ گی؟ —— تم بھولی سی لڑکی ہو، تم کہاں جاؤ گی؟"

"کہیں" اس نے شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کہیں عذرا؟"

"ہاں۔ کہیں۔ میں نہیں جانتی کہ آج رات میں کہاں سوؤں گی۔ میرا کوئی گھر نہیں۔"

"تمہارے والدین اچھی لڑکی؟" میں نے پوچھا "وہ کہاں ہیں؟"

"وہ مر چکے ہیں۔"

"مر چکے ہیں عذرا؟" مجھے سخت صدمہ ہوا۔

وہ شہر کی طرف چلنے لگی۔ اور اُس تاریکی میں گم ہو گئی جس میں سارا شہر ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

نوٹ:۔ تابوت کے متعلق یقینی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خود عذرا کچھ نہ بتا سکی۔ میرے خیال میں یہ ایک خانہ بدوش لڑکی کو اڑا لے جانے کا طریقہ تھا اور تھا بھی محفوظ طریقہ! تابوت دیکھنے میں لکڑی کا ایک معمولی سا صندوق تھا۔ شرلک ہومز ایسے جاسوس کو بھی یہ خیال نہ آ سکتا کہ اُس لکڑی کے معمولی صندوق میں ایک دوشیزہ بند ہے! —— یہ میرا ذاتی خیال ہے اور ممکن ہے حقیقت کہیں دُور لا انتہا گہرائیوں میں چھپی ہو۔ عذرا کون ہے؟ وہ کیا ہے؟ میں اُسے پھر ملوں گا یا نہیں؟ میرے خیال میں ان سوالوں کے جواب کا ابھی وقت نہیں۔ انتظار کیجئے۔

(محمد خالد اختر)

مترجمہ:۔ احمد ندیم قاسمی بی۔ اے

"ستی"

ہے یہ وقت امتحانِ عہد و پیمانِ وفا — حشر در آغوش ہے انجامِ عنوانِ وفا
ہو رہا ہے عشق کی دنیا میں اعلانِ وفا — کھیلنے کو آج شعلوں سے ہر اک جانِ وفا

بڑھ رہی ہے اس طرح پر آتشِ سوزِ نہاں
پھونک ڈالے گی یہ گویا سب زمین و آسماں

آج دو بچھڑی ہوئی روحیں بہم ملنے کو ہیں — گلشنِ فردوس میں دو تازہ گل کھلنے کو ہیں
آج حسن و عشق دونوں کے کفن سلنے کو ہیں — زلزلے میں ہے زمیں ہفت آسماں ہلنے کو ہیں

دیکھئے وہ اک مریضِ غم کو جھپکی آ گئی
وہ در و دیوار پہ گر کے اداسی چھا گئی

وہ جوانا مرگ پر کہرام برپا ہو گیا — وہ امنڈ کر سیلِ اشک آنکھوں سے دریا ہو گیا
وہ فضائے دہر میں اک شور پیدا ہو گیا — وہ زمین و آسماں کا شق کلیجا ہو گیا

اُف یہ دقتِ امتحان و الوداعِ ہوش و صبر
اور اک کمسن حسیں کا یہ دلِ محزوں پہ جبر

اپنے آغوشِ محبت میں لیے شوہر کا سر — بیٹھی ہے خاموش گویا کچھ نہیں اس کو خبر
ڈالتی ہے اس طرح سوئے فلک اپنی نظر — خندہ زن ہو زندگی جیسے قضا کے وار پر

کہہ رہی ہے رُوحِ شوہر سے بصد اندوہ و یاس
فکرِ تنہائی نہ کر میں آ رہی ہوں تیرے پاس

اب یہ صبحِ نوبہارِ زندگی کی شام ہے   موت کی تاریکیاں ہیں اور دلِ ناکام ہے
آرزوئے زندگانی اِک خیالِ خام ہے   جل کے مرنے ہی میں روشن اب وفا کا نام ہے

اُٹھ رہے ہیں رفتہ رفتہ سب حجاباتِ نظر
آتشِ فرقت دکھانے کو ہے اب اپنا اثر

ہٹ گئی وہ دیکھئے بل کھا کے چہرے سے نقاب   بن گیا اِک حُسنِ عالم سوز اب رنگِ شباب
بڑھ گئی سوزِ دروں سے یوں رُخِ زیبا کی تاب   جیسے ایامِ خزاں میں کھِل اُٹھے کوئی گلاب

یوں اُٹھی وہ بازوؤں پر موئے سر کھولے ہوئے
مائلِ پرواز طائر جیسے پر تولے ہوئے

اپنے ارمانوں کی دُنیا دیکھ کر جاتی ہوئی   وہ بھی چل دی نقش کے ہمراہ بل کھاتی ہوئی
درسِ آئینِ وفا عالم کو سکھلاتی ہوئی   جا رہی ہے یوں رگوں میں خون گرماتی ہوئی

جیسے کوئی رُوٹھ کر جاتا ہو مایوسِ حیات
پھونک دینے کو چتا میں زندگی کی کائنات

خرمنِ ہستی پہ ٹوٹی اس طرح برقِ تپاں   آتے ہی آتے چتا میں ہو گیا شُعلہ عیاں
الاماں اے شوزشِ غمہائے پنہاں الاماں   پھونک ڈالا حُسن کو بھی عشق نے آخر یہاں

داغہائے سینۂ سوزاں چمک کر کھل گئے
دل کے شعلے آگ کے شعلوں سے بڑھ کر مل گئے

اللہ اللہ جذبۂ اُلفت بھی کتنا پاک ہے　　عرش پر ہے رُوح زیرِ فرش مُشتِ خاک ہے
زندگی آگے قضا کے گو خس و خاشاک ہے　　پھیر دیتی ہے قضا کا منہ یہ وہ بیباک ہے

صفحۂ ہستی سے موت اس کو مٹا سکتی نہیں
خاک میں نقشِ وفا کو یہ ملا سکتی نہیں

پی کے صہبائے فنا کا آخرش اِک تلخ جام　　دے کے اپنے درد دل کا اہلِ دُنیا کو پیام
زندۂ جاوید کر کے مہر نسوانی کا نام　　کر لیا جنّت میں جا کر اپنے شوہر کو سلام

توڑ کر قیدِ عناصر دونوں روحیں مل گئیں
گلشنِ فردوس کی پژمردہ کلیاں کھل گئیں

وحشی کانپوری

نوائے درد

پامالِ راہِ مہر و وفا میں تو ہو چکا　　میرا خیال بھی جو کسی کو نہیں نہ ہو
رنج لحد میں سونے کی ہے آرزو مگر　　ڈر ہے کہ آسماں کوئی زیرِ زمیں نہ ہو

وہ کیفِ زندگی سے ہے ناآشنا نصیرؔ
جو دل کسی کی یاد میں اندوہگیں نہ ہو

نصیر سیالوی

محاورہ میں تبدیلی

اردو زبان اپنے ادبا و شعرا کی کثرت پر بجا ناز کر سکتی ہے۔ گراں قدر لٹریچر نظم و نثر کی صورت میں انبار در انبار موجود ہے۔ مگر تحقیقی مضامین کا قابلِ افسوس حد تک فقدان ہے۔ علم بیان و معانی میں کوئی جامع رسالہ نہیں لکھا گیا۔ اگر کوئی ہے تو اس میں عربی زبان کی کورانہ تقلید کی گئی ہے اور اردو کے خصائص کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور تو اور "محاورہ" ایسی کثیر الاستعمال چیز کی "جامع و مانع" تعریف مفقود ہے۔ فصحائے اردو کے اس قول کا کہ "محاورہ میں کوئی تصرف و تبدیلی ناجائز ہے۔" تجزیہ کئے بغیر قواعد نویس حضرات نے استاد سوداؔ کے شعر

جو کہ ظالم ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں
سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو شمشیر کا

میں "شمشیر کا کھیت" کو غلط قرار دے دیا۔ خدا بھلا کرے حضرت عیش امروہوی کا کہ انہوں نے اردو کی اس تہی دامنی کو محسوس کیا اور "محاورہ" کی جامع و مانع تعریف اور "محاورہ میں تبدیلی" پر سیر حاصل بحث کی۔

محاورہ کے دو اقسام "مفرد" "مرکب" بیان کر کے کلیہ "در بارہ تبدیلی" و "تصرف" بتایا گیا ہے کہ :-

مرکب محاوروں صرف ان اجزا میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یعنی ان کے عوض دوسرا لفظ آ سکتا ہے، جو مدارِ محاورہ نہ ہوں۔ یعنی اپنے اصلی معنی میں مستعمل نہ ہوں۔ مثلاً کنواں ٹوٹنا۔ (کنوئیں میں پانی نہ رہنا) اس میں مدارِ محاورہ جزوِ دوم یعنی ٹوٹنا ہے۔ جو اپنے اصلی معنی کے علاوہ کوئی اور معنی دے رہا ہے۔ پس اگر پہلے جزو کے عوض اس کا دوسرا ہم معنی لفظ لائیں اور "چاہ ٹوٹنا" لکھیں تو صحیح ہوگا۔ ناسخ

سفلہ ہو جاتا ہے وقتِ امتحاں بے آبرو
ہے دلیل اس مدعا پر ٹوٹ جانا چاہ کا

ہم معنی لفظ کی تشریح کے سلسلہ میں ارشاد ہے کہ :-

تبدیلی اصل محاورہ کے کسی جزو کے بدلے دوسرا ہم معنی لفظ لانے کے لئے یہ ہے کہ وہ لفظ پوری پوری معنوی مطابقت رکھتا ہو۔ مثلاً جان۔ زیست اور زندگی کا ہم معنی ہے۔

جان کے لالے پڑنا کی بجائے زندگی کے لالے پڑنا۔ زیست کے لالے پڑنا کہیں تو درست ہے۔

آمنّا و صدقنا! لیکن

"تڑکا ہو جانا" ایک اردو محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں تہی آ جانا۔ صفایا ہو جانا۔ تڑکے کا صحیح عوض صبح ہے جو اردو میں مانوس ہے۔ لہٰذا اس محاورہ کی بجائے "صبح ہو جانا" بھی صحیح ہے۔ صباؔ

حشر ہوتا کھینچتے گر آہِ پُر تاثیر ہم
صبح ہو جاتی جو کرتے نالۂ شبگیر ہم

کے متعلق یہ خادم یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ "تڑکا ہو جانا" میں مدارِ محاورہ جیسا کہ ظاہر ہے۔ "تڑکا" ہے۔ یعنی جزو اوّل اور ہم معنی لفظ آ سکتا ہے اس جزو کے عوض جو مدارِ محاورہ نہ ہو۔ جیسے کنواں ٹوٹنا میں "کنواں" کی بجائے "چاہ"۔

بنا بریں "صبح" "تڑکے" کا پورا پورا ہم معنی ہونے کے باوجود اس محاورہ میں "تڑکا" کا عوض یا بدل کیونکر ہو سکتا ہے؟

امید ہے کہ علامہ عیش امروہوی ان دونوں متضاد [illegible] تطبیق فرما کر مشتاقانِ ادب کو مستفید فرمائیں گے۔

میرزا خادم ملتانی فالؔ

میں اور تم

حسنِ فطرت رازِ ہستی راز تم
قلبِ حسرت کیش کے دمساز تم
افتخارِ عاشقی ہوں میں اگر
افتخارِ بزمِ حسن و ناز تم

یزدانی

آغا حشر کی یادگار اور ڈرامے

مولینا یزدانی کو شاید یہ معلوم نہیں کہ آغا حشر کی ذرہ نواز زندگی سے فائدہ اُٹھانے والے چند ناکام ادیبوں نے لاہور میں اس کی موت سے بھی اپنی تعمیر شہرت کا فائدہ اُٹھانے کے لئے آغا حشر کی یادگار کا ہنگامہ برپا کیا تھا - چونکہ نیتوں میں خلوص نہ تھا، خود غرضی کے کوشش نے ان کی نیتوں کو شرمندۂ ظہور نہ ہونے دیا - آغا حشر کے ڈرامے یقیناً نثری شاعری کے غیر فانی نمونے ہیں - یہ ڈرامے ان پڑھ ایکٹروں کی ہنگامی ضرورتوں کے طفیل اسقدر مسخ ہو چکے ہیں کہ انہیں اصلی صورت میں لانا ایک مبصر نقاد کی شبانہ روز محنت کے بغیر مشکل ہے - بازاری پبلشروں نے ایکٹروں کی زبان سے نقل کئے ہوئے مسخ کردہ ڈرامے آغا حشر کے نام سے شائع کر دیے ہیں - آغا حشر کے یہ ساحرانہ فتوحات، وقت، ذوق، روپیہ اور دماغ چاہتے ہیں اور ہمارے بازاری ادب میں ان چیزوں کا قحط ہے - مجھے ڈر ہے کہ حشر کے جواہر پارے خذف ریزوں میں مل کر اردو ادب کی قسمت کے نہیں رہے - کبھی کوئی مرد کار اس قحط الرجال میں پیدا ہو گیا تو شاید حشریات کو انبار خس و خاشاک سے نکال سکے گا - (زناجور)

آغا حشر کاشمیری مرحوم کے متعلق ہندوستان خصوصاً اردو داں اور اردو خواں طبقے نے سرد مہری اور فراموشگاری کا ثبوت، دیا وہ افسوسناک ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہے، حشر مرحوم اردو دنیا میں اپنی عدیل و نظیر خود آپ تھے، اگر وہ مسلمان کی بجائے ہندو اور اردو کی بجائے صرف ہندی کے ڈراما نویس ہوتے تو آج ہندو قوم اور ہندی دنیا ان کی پرستش کرتی، کیا حامیان اردو کو معلوم ہے کہ ہندو قوم اور ہندی دنیا منشی پریم چند کی یادگار قائم کرنے کے لئے کیا اسکیمیں تیار کر رہی ہے اور اس کے کیا کیا عزائم ہیں؟ کیا ڈراما نویسی میں حشر مرحوم کا وہ درجہ بھی نہیں ہے جو افسانہ نگاری میں منشی پریم چند کا مرتبہ ہے؟

آغا حشر مرحوم نے اردو ڈراما نویسی کو ابتدا ہی میں درجۂ کمال تک پہنچا دیا، ان کے ڈرامے یقیناً زبان اردو کے لئے سرمایۂ فخر و ناز ہیں اور اس لائق ہیں کہ ان عدیم المثل اور غیر فانی ڈراموں کو بے رحم زمانہ کی دستبرد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا جائے - اس میں شک نہیں کہ ان کے ڈرامے ان کی بہترین اور صحیح ترین یادگار ہیں، اگر وہ خدانخواستہ تلف ہو گئے تو ان کی بڑی سے بڑی یادگار بھی اس نقصان و اتلاف کی تلافی نہیں کر سکتی -

"ادب لطیف" کے اداریہ میں "آغا حشر کی یادگار اور ڈرامے"[1] کے عنوان سے جو اہم اور ضروری صدا بلند کی گئی ہے وہ مانگ گر باید حمایت کی مستحق ہے، کوئی شخص جو برائے نام بھی ادب دانشار سے ذوق رکھتا ہو، وہ اس پکار کی اہمیت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا - پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ ہنوز یہ آواز ملک میں شرمندۂ سماعت نہیں ہوئی، اور اردو دنیا کی طرف سے اس کے خیر مقدم کا کوئی معمولی سے معمولی مظاہرہ بھی نہیں ہوا -

وائے گر از پس امروز بود فردائے

اس سے زیادہ کسی فن کی اور کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے کہ اس کے ماہرین اور ارباب دستگاہ کی قدر دانی و قدر شناسی کے اعتراف عمل سے مجرمانہ سرد مہری اور غفلت اختیار کر لی جائے؟

اس مختصر سے مضمون میں جو "ادب لطیف" کی پکار سے اثر پذیر ہو کر بطور تائید سپرد قلم کر رہا ہوں - حشر مرحوم کے ڈراموں سے تفصیلی بحث ناممکن ہے - مرحوم کے صرف ایک ڈراما کے بعض اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جس سے میری غرض یہ ہے کہ حامیان زبان اردو

---

[1] اس عنوان سے برادر محترم میرزا ادیب بی۔اے "ادب لطیف" کے دو شماروں میں اظہار خیال کر چکے ہیں - جن کا اقتباس "شاہکار" بابت مئی ۱۹۳۷ء کی "بزم انتخاب" میں شائع ہو چکا ہے - اس مضمون کے ساتھ ایک نظر اُسے بھی دیکھ لیں - (یزدانی)

اور قدر شناسانِ فن تمثیل مرحوم کے شہپاروں کے تحفظ کی جانب اپنی تمام وکمال توجہ مبذول کریں -

آغا حشر کا ایک ڈراما "عشق و فرض" ہے جو مرحوم کی ڈرامہ نویسی کا ایک بلند پایہ اور گرانمایہ نمونہ ہے - سہراب، رستم کا فرزند اور توران کا شہرۂ آفاق بہادر ہے - گرد آفرید قلعۂ سفید واقعہ سرحد ایران کے حاکم گستہم کی پری جمال اور شیر دل لڑکی ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے والہ وشیدا اور عاشق صادق ہیں، کتنا مشکل پلاٹ ہے؟ - ایک طرف عشق ہے اور دوسری جانب فرض، نہ عشق کو فراموش کیا جا سکتا ہے اور نہ فرض سے روگردانی کی جا سکتی ہے - بیک وقت و بیک لمحہ دونوں کو ملحوظ رکھنا اور دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہونا کسقدر متضاد اور پیچیدہ صورت حال ہے، لیکن اس تضاد اور پیچیدگی پر مرحوم حشر نے جس طرح غلبہ اور قابو حاصل کیا ہے وہ ان کا کھلا ہوا اعجاز فن ہے -

سہراب اور گرد آفرید کی میدان جنگ کی گفتگو کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

سہراب اور گرد آفرید ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں -

گرد آفرید مردانہ لباس میں ہے، دشمنوں کے کثرت ہجوم سے گرد آفرید گھوڑے سے گر پڑتی ہے اور اس کے سر کے بال پریشان ہو کر اس کی نسائیت کا اظہار کر دیتے ہیں - سہراب اسے دیکھ کر کہتا ہے:-

سہراب:- "رعنائی نسائیت کی جمیل ترین تصویر مردانہ مرقع میں! حسن کی دنیا کا ماہِ کامل زرہ بکتر کے بادلوں میں!! موسم بہار کی رنگینی جنگی نقاب میں!!!"

گرد آفرید:- "اقبالمند سہراب! وہ ایران کی بہادر لڑکی جس کے بازوؤں میں طاقت کا طوفان، جس کی تلواروں میں بجلیوں کا سیلاب جس کے حملے میں کوہ آتش فشاں کا ہنگامہ پوشیدہ تھا، جو حریف کو کتاب زندگی کا مہمل نقطہ اور فتح کو اپنے گرز کی ضرب کی صدائے بازگشت سمجھتی تھی آج اس کے اعتقاد کی دنیا ناکامی کے زلزلے سے تباہ ہو گئی۔"

سہراب:- "بہادر نازنین! زندگی کی سلطنت میں عورت حاکموں کی حاکم اور فاتحوں کی فاتح ہے جو خون کا ایک قطرہ گرائے بغیر اپنی رنگین مسکراہٹ سے ایک لمحہ میں آدھی دنیا کو قتل کر سکتی ہے - جو شرم آلود نگاہوں کے اشارے سے چشم زدن میں بادشاہوں کا تاج اور دلیروں کی تلوار چھین سکتی ہے، اسے تیر و شمشیر لے کر میدان جنگ میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ حسن کے مقابلے میں ہمیشہ مرد کے غرور کو شکست ہوئی ہے - اٹھو یہ میری فتح نہیں تمہاری فتح ہے۔"

باتوں ہی باتوں میں دونوں میں عشق و محبت کا عہد و پیمان ہو جاتا ہے -

قلعہ سفید کے دروازے پر پھر سہراب اور گرد آفرید میں دو حریفوں کی حیثیت سے سامنا ہوتا ہے -

گرد آفرید:- زمین کی لعنت اور دنیا ظلم فروشی کا بازار، غلام سازی کا کارخانہ، وقار انسانیت کی قتل گاہ، عزت نفس کا مذبح نہیں ہے - ہوا پانی روشنی کی طرح خدا کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں سے آزادی بھی ایک نعمت ہے ...... تو بہادر نہیں، جا واپس جا - بہشت کے آستانے پر اہرمن کے کارندے کا اور قلعہ سفید کے دروازے پر ایک ننگ انسانیت ڈاکو کا خیر مقدم نہیں ہو سکتا۔"

سہراب:- "پیاری آفرید! یہ اہل وفا کی زبان اور محبت کا لہجہ نہیں ہے۔"

گرد آفرید:- خبردار! ان سامعہ خراش لفظوں سے میرے تقدیس حسن کی توہین نہ کر - مغرور اپنی اتفاقی کامیابیوں کو وقت کی سفلہ نوازی اور قسمت کی غلط بخشی سمجھنے کے بدلے یہ سمجھ رہا ہے کہ تو جہان پر جابرانہ حکومت کرنے کے لئے اور یہ جہان مجبور بیل کی طرح اپنے زخمی کندھوں پر اطاعت کا جوا رکھ کر تیرے دائرہ حکم میں گردش کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے، لیکن ... ایران اپنی قوت و صولت کے ساتھ زندہ رہے گا اور ثابت کر دے گا کہ سہراب وقت کے کھلونے کا کھلونا اور اتفاقات کی ہوا میں قسمت کی لہروں پر ناچتے ہوئے بلبلے کا تماشا ہے -"

سہرام قلعہ سفید کی فوج کا ایک غدار اور خود غرض رکن ہے - وہ سہراب کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لئے اپنے زیر اثر فوجیوں کو لے کر گرد آفرید پر یورش کرتا ہے اور موقع پا کر گرد آفرید کی پشت میں خنجر بھونک دیتا ہے - گرد آفرید گرتے گرتے دونوں ہاتھوں سے سہرام کا گلا پکڑ لیتی ہے اور چاہتی ہے کہ گلا دبا کر اس کا بھی خاتمہ کر دے لیکن پھر رک جاتی ہے اور کہتی ہے:-

"مگر نہیں، تو بد فطرت ہے، نمک حرام ہے، سنگ دل ہے قاتل ہے، دنیا کی بدترین مخلوق ہے - سب کچھ ہے - پھر بھی میرا ہم وطن ہے، (گلا چھوڑ دیتی ہے) جا - قوم پرستوں کے مذہب میں بدی کا بدلہ

بدی نہیں ہے، میں اپنے وطن کی عزت کے صدقے میں تجھے اپنا خون معاف کرتی ہوں۔"

گرد آفرید زمین پر گر پڑتی ہے، سہراب آتا ہے اور گرد آفرید کو خاک و خون میں آلودہ دیکھ کر کہتا ہے :۔

"یا خدا، میں کیا نظارہ دیکھ رہا ہوں، قفس خالی، رنگیں نوا فاختہ، پیکرِ شجاعت کی حسین روح، شعلۂ حسن کی تجلی، خون میں ڈوبی ہوئی ہے۔

افسانۂ عزت کا عنوان، صحیفۂ حریت کا سرنامہ، جرأتِ نسوانی کی تاریخ کا ورق زریں خاک پر پڑا ہوا ہے۔"

(گرد آفرید کا سر زانو پر رکھ کر)

آفرید! پیاری آفرید آنکھیں کھولو، میں تمہیں بیوفائی کا الزام دینے کے لئے نہیں، اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے آیا ہوں۔"

گرد آفرید :۔ (آنکھیں بند کئے ہوئے نیم بے ہوشی کی حالت میں) کس کی آواز؟ ستاروں کا گایا ہوا نغمۂ آسمانی، زمین پر کون گا رہا ہے؟"

سہراب :۔ تمہارا شیدائی، تمہارا پرستار سہراب۔"

گرد آفرید :۔ (آنکھیں کھول کر) تم۔ تم۔ اوہ۔ مرنا بھی مشکل ہو گیا۔

(جوشِ محبت سے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے) "آؤ پیارے سہراب آؤ، تمہیں دیکھ کر دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہو گئی، لیکن اب تمنا کا وقت نہیں رہا، عدم کے مسافر کا سامان بندھ چکا ہے، زندگی کے نظارے اسے ہمیشہ کے لئے رخصت کر رہے ہیں، میرے دل کے مالک، میرے فرض نے مجھے بے مروت بننے کے لئے مجبور کر دیا تھا، حق وطن کا مرتبہ عشق سے بلند تر ہے۔ اس لئے مجھے معاف کرو، اور جو ہوا اسے بھول جاؤ، موت کے دروازے پر دنیا کی دوستی دشمنی ختم ہو جاتی ہے۔"

سہراب :۔ پیاری آفرید! تم نے دنیا سے فرض کی ایک جدید حقیقت اور عورت کے دل کی عظمت کا ایک عظیم الشان راز ظاہر کر کے وہ بوجھ دور کر دیا جس سے میری روح پاش پاش ہوئی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھے اپنی محبت کا مستحق نہیں سمجھتیں اس لئے اسقدر جوشِ مخالفت کے ساتھ جنگ کر رہی ہو۔"

گرد آفرید :۔ تمہیں کیا معلوم کہ "عشق و فرض" کی کشمکش میں میری روح نے کتنے عذاب برداشت کئے ہیں، کتنے طوفان، کتنے زلزلے سے تنہا وقف پیکار رہی ہے، صدمہ نہ کرو دوست دشمن ہمنام ہیں تمہیں دھوکا ہوا، میں نے اپنے پیارے سہراب سے نہیں، اپنے ملک کے مخالف سے جنگ کی ہے۔

گرد آفرید کے دم توڑنے کے بعد سہراب اس کی لاش سے لپٹ کر کہتا ہے :۔

سہراب :۔ قدرت نے کائنات سے اپنا عطیۂ عظمت واپس لے لیا، دنیا کا حسن بہشت کے اضافۂ جمال کے لئے بلا لیا گیا۔ زمین کے چہرۂ فخر کا جلال تاریکیٔ عدم کو مطلعِ نور بنانے کے لئے چلا گیا۔"

آخر میں کہتا ہے :۔

اے پژمردہ بہارِ آفرینش! اے سوختہ شعلۂ وطن پرستی! اے خوابیدہ طوفانِ شجاعت میں تیرے قدموں کو الوداعی بوسہ دیتا ہوں، یہی اولیں اور یہی آخری بوسۂ محبت ہے۔"

روتا ہوا گرد آفرید کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔

آغا مرحوم کے ڈراموں کی عظمت کے اظہار کے لئے یہ اقتباسات کافی ہیں، مرحوم کے ڈرامے ادبی حیثیت سے جس طرح نادر المثال ہیں اسی طرح اخلاقی مرتبے کے اعتبار سے بے عدیل ہیں، ان لازوال جواہر پاروں کے ضائع کر دینے سے زیادہ مذہبِ ادب میں اور کوئی کفرانِ نعمت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہوں کہ حشر مرحوم کے ڈراموں کی تحریکِ تحفظ کا حقیقی خیر مقدم کیا جائے گا اور عملی اقدام میں مزید تعویق جائز نہ رکھی جائے گی۔

یزدانی جالندھری

اردو، ہندی جھگڑا اور گاندھی جی

اپریل کے شاہکار میں سیّد ابوالقاسم صاحب کا طویل مقالہ "مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں" شائع ہوا ہے ۔ یہی مضمون سیّد صاحب نے مہاتما جی کو بھیج کر جواب طلب کیا تھا اس کا جواب اور جواب الجواب ملاحظہ فرمائیے ۔ سیّد صاحب ابوالقاسم صاحب نے ہم سے بھی اس کے متعلق کچھ لکھنے کو کہا ہے ۔ انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں مہاتما جی کے خطوط پر تبصرہ کیا جائے گا ۔　　　(ادارہ)

مکرمی تسلیم ۔ مہاتما سے بات چیت والا مضمون بارہ میں سے چار رسالوں نے چھاپا اور بیشتر ارباب رسائل تازہ اور باسی مضمون کی سطحی بحث ہی میں اُلجھے رہے ۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات نوعیت مضمون نہ سمجھ سکے ۔ اگر فلسفہ پر کچھ لکھا جاتا، سائنس سے بحث کی جاتی، منطق کی گتھیاں سلجھائی جاتیں، ادبیات پر نقد و تبصرہ ہوتا یا متداولہ علوم میں سے کسی خاص علم پر کوئی مقالہ سپردِ قلم کیا جاتا اور اسے مختلف رسائل میں اشاعت کے لئے بھیجتا تو یقیناً یہ میرا طرزِ عمل نادرست اور اس بات میں آپ کا پس و پیش کرنا، اصول صحافت کے خلاف اس کے نشر و اشاعت کو قرار دینا سراسر بجا اور درست ہوتا، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ زبان پر کیسا وقت پڑا ہے ۔ اس کے مٹانے کے لئے کیا کیا جتن کئے جا رہے ہیں ۔ ایڑی چوٹی کا پورا زور لگا کے حریف چاہتا ہے کہ مردہ کو جلائے اور زندہ کو موت کی نیند سُلائے ۔ مٹی مٹائی بھاشا جی اُٹھے اور جیتی جاگتی زبان مٹ مٹا کر رہ جائے ۔ اس کے لئے اُدھر کیسا منظم پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور اِدھر بس خیریت، مدت تک منتظر رہا کہ اِدھر سے بھی کوئی قلم کا دھنی اپنی زبان کے بچاؤ کے لئے اُٹھ کھڑا ہو اور مجھے بغیر قلم اٹھائے اس واجب کفائی سے نجات مل جائے مگر چاروں طرف سناٹا اور اس ناروا جھگڑے کی بڑھتی ہوئی لے دیکھ کر نہ رہا گیا اور اچھا یا بُرا جیسا لکھ سکتا تھا وہ لکھا ۔ مدیران خوش گستر کے واسطے صرف آٹھ نو ورق اور وہ بھی فقط ایک مرتبہ کے لئے نکالنا کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس بات میں ناتواں بینی سے کام لیا گیا ۔ خیر ۔

یہ سُن کر کہ گاندھی جی اچھی طرح اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے زیرِ تذکرہ مضمون ناگری میں لکھوانا پڑا جس نے سو صفحوں سے جگہ زیادہ گھیری حالانکہ اردو ٹائپ اسے پچاس صفحوں تک بھی نہ پہنچا سکا ۔ ناگری میں لکھی ہوئی کاپی پر اردو ٹائپ کی ۳۵ صفحوں والی کاپی رکھ کے جوابی رجسٹری کے ذریعہ گاندھی جی کے پاس بھجوائی، یہ اس لئے کہ ناگری کا غیر معمولی پھیلاؤ اور اردو رسم الخط کا اختصار بھی ساتھ ہی ساتھ مہاتما دیکھ لیں ۔ گاندھی جی نے اس کا جو جواب دیا وہ بے کم و کاست درج ذیل ہے :۔

(گاندھی جی کی پہلی چھٹی)

"بھائی صاحب ۔ آپ نے بہت مہنت لیکر مجھے لمبا خط لکھا ہے لیکن جو بات میں نے کبھی نہیں کی ہے اُس پر آپ نے اپنا لیکھ بنایا ہے ۔ میں تو اردو زبان کی بڑی قدر کرتا ہوں ۔ اردو زبان اچھی طرح جاننے کی کوشش کرتا ہوں ۔ میں نے جو خیالات دس برس پہلے اندور میں ظاہر کئے تھے وہی آج بھی ہیں ۔ اب آپ کہیں مجھ سے کیا چاہتے ہیں ۔　　　آپکا

گاندھی ۔ وردھا

اِس جواب پر یہاں سے غالباً ایسے ہی دو ڈھائی بول لکھ بھیجے تھے :۔

مہاتما جی ! آپ نے پوری لکھت نہیں پڑھی ۔ اسے پڑھ لیتے تو پھر آپ مجھ سے یہ نہ پوچھتے (آپ کیا چاہتے ہیں) اچھا آپ نے مجھ سے جو کہا اور مدراس میں جو آپ کو کہنا پڑا کیا یہ دونوں ایک ہیں ۔ مہاتما کے لئے پہلے میری لکھت پوری پڑھ لیجے اور پھر جو آپ کو لکھنا ہے وہ لکھیے ۔

مہاتما نے اس کا جو جواب بھیجا اس کی نقل بھی بے کم و کاست بعینہٖ درج کی جاتی ہے ۔

(مہاتما کی دوسری چھٹی)

سیّد صاحب ۔ آپ کا خط ملا ہے ۔ میں نے آپ کی لکھت پوری پڑھ لی تھی ۔ میرا کہنا تو یہ تھا نہ کہ جو آپ نے مان لیا ۔ میں نے کہا تھا وہ میں نے کہا ہی نہیں تھا ۔ آپ کو تو یہ بتانا ہے میں نے ایسا کہاں کہا تھا ۔ جی ہاں جو میں نے مدراس میں کہا سو میں نے ہمیشہ کہا ہے مانا ہے ۔ مجھے معلوم نہیں اخبار والوں نے کیا لکھا ہے ۔　　　آپکا ۔ گاندھی ۔ وردھا "

؎ محنت کو مہنت، ظاہر کو زاہر، نہ کہ کی جگہ نہ کی لکھنا نظر انداز کرنے کے قابل ہے کیونکہ مہاتما گجراتی اور انگریزی کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتے ۔ بہر طور میں نے جو کچھ لکھا وہ اور گاندھی جی نے جو اس کے جواب دئے یہ سب سرمایہ آپ کے سامنے ہے اب آپ قلم اٹھائیں اور اس موضوع پر آپ جو تحریر کریں اس کی ایک کاپی مجھے بھی عنایت فرمائیں ۔

شعر

مظہرِ جذباتِ عشق! آئینۂ تصویرِ حُسن
شوخیٔ تحریرِ اُلفت! لذتِ تقریرِ حُسن

دودِ آہِ دلگداز و قطرۂ خونِ جگر!
شعلۂ مجلس فروز و نکتۂ معنی اثر

شیشۂ صہبائے ناز و بادۂ کیفِ نیاز!
جُرعۂ جامِ حقیقت! ساقیٔ بزمِ مجاز!

نالۂ شبگیرِ فرقت! شرحِ رنجِ انتظار!
دفترِ شوقِ وصالِ و محضرِ احوالِ زار!

شکوۂ دردِ جدائی، نوحۂ جور و جفا
شورِ دریائے محبّت اور سودائے وفا

ترجمانِ حالِ دل، کیفیتِ سوز و گداز!
تحفۂ دنیائے عشق و ہدیۂ عجز و نیاز

نغمۂ سازِ معانی، زخمۂ تارِ بیاں
مایۂ نازِ ادب ہے اور شمعِ شبستاں

بُلبلِ باغِ محبّت، طوطیٔ گلزارِ عشق
رونقِ بازارِ حُسن و گرمیٔ گفتارِ عشق

شہپرِ مرغِ تخیّل، رفعتِ پروازِ فکر
موجۂ بحرِ طبیعت، بازوئے شہبازِ فکر

ہے بجا کہنا تجھے مشاطۂ گیسوئے حُسن
تیزیٔ تیرِ نظر، تیغِ خمِ ابروئے حُسن

دلگداز و سحر آئیں ہے تری صورت گری
اے طلسمِ شعر! تُو ہے شیشۂ دل کی پری

نکتہ آموزِ رموزِ حکمت و عرفاں ہے تُو
اور آزادِ قیود و حُجّت و بُرہان ہے تُو

ہے شکستِ خاطرِ غمدیدہ کی آواز تُو
درد کا درماں ہے تُو اور عشق کا اعجاز تُو

تجھ سی ہوتی ہے عیاں بے تابیٔ دل کی تڑپ
تیرے لفظوں میں بھری ہی مرغِ بسمل کی تڑپ

محفلِ عشاق کو باتوں میں گرماتا ہے تُو
رُوح تڑپاتا ہے تُو اور وجد میں لاتا ہے تُو

ہے تری ترکیب میں موسیقیٔ جادو اثر
تو سرودِ دردِ دل ہے، نغمۂ زخمِ جگر

تیر و نشتر سے نہیں کم تیرے لفظوں کی نشست
بیٹھتی ہے عین دل میں بے خطا تیری شست

جلوہ فرما تجھ میں ہیں دلسوزیاں، غمخواریاں
پھول کی رنگینیاں، بجلی کی آتش باریاں

ہے صدائے غم، زبانِ درد کی آواز تو
سحر تو، افسوں تو، الہام تو، اعجاز تو

ہے چراغِ بزم بھی تو اور اصلِ رزم بھی
ولولہ انگیز و جوش افزائے نام و ننگ بھی

ہے طلسمستان معقولات و محسوسات کا
ایک محشر ہے سراپا عالمِ جذبات کا

کام تو دیتا رہا ہے صورِ اسرافیل کا
تیری شور انگیزیوں نے مردہ دل زندہ کیا

زندگی بخش ابد ہے چشمۂ حیواں ہے تو
سچ تو ہے اے شعر یہ خضرِ رہِ انساں ہے تو

تجھ سے فردوسی نے پائی ہے حیاتِ جاوداں
ہے نوائے سازِ ہستیٔ انیسِ نکتہ داں

تیرے آئینہ کا طوطی، غالبِ حکمت سرا
آج بھی بزمِ ادب میں دل کو ہے برما رہا

اُلفتِ شیرین و خسرو کی ہے بے شک جان تو
نوحہ خوانِ محنتِ فرہادِ پُر ارمان تو

ہے سراپا تو نقیبِ لیلیٰ محمل نشیں
داستاں ہے بادیہ پیمائیٔ قیسِ حزیں

نرگس و سنبل کی محبوبی تری تصنیف ہے
لالہ و گل کی یہ سب خوبی تری تصنیف ہے

کر دیا ذرّہ کو تُو نے رو کشِ مہر مبیں
کاہ کو کوہِ گراں اور خاک کو چرخِ بریں

تُو نے ظلمت کو فروغِ شمعِ نورانی دیا
خار کو گُل کر دکھایا، زہر کو آبِ بقا

تُو نے جس کو بد کہا بدنام و رسوا ہو گیا
جس کی مدح و ثنا سر آسماں سے مل گیا

ہے تری معراج یہ، تاثیر سے خالی نہ ہو
درد سے خالی نہ ہو، تسخیر سے خالی نہ ہو

ہو سراپائے محبت عشق کی بنیاد تو
کر دکھائے خانہ بربادوں کو پھر آباد تو

(حضرت واسطی (مرحوم))

تبصرا

داغ:۔ مؤلفہ جناب نور اللہ محمد نوری صاحب۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۱۰ صفحات۔ قیمت ۱۲؍۔ ملنے کا پتہ:۔ غلام دستگیر تاجر کتب۔ چار کمان۔ حیدرآباد دکن

زیرِ نظر کتاب میں نواب فصیح الملک بہادر داغ (مرحوم) کے مکمل حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر مفید و کار آمد تبصرہ درج ہے۔

داغ کا ماحول۔ داغ کی شاعری کے محرکات۔ داغ کا فلسفۂ زندگی۔ داغ کی شاعری میں مقامی عنصر وغیرہ بہترین تنقیدی مباحث ہیں۔ داغ کے کلام کا تجزیہ بلحاظ اصنافِ سخن و مضامین، داغ کا اسلوبِ بیان، داغ کا ہندوستانی زبان میں تعمیری حصہ وغیرہ بھی قابلِ غور عنوانات ہیں۔

داغ کی شاعری پر بعض سوانح نگار حضرات نے جو اعتراض کئے ہیں اُن کے جواب بھی دئے گئے ہیں۔ آخر میں داغ کے مشہور شاگردوں کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام درج ہے۔ کتاب کی ترتیب و تدوین میں کافی محنت سے کام لیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی تنقیدی کتابیں اردو میں بہت کم شائع ہوئی ہیں۔ ہم مؤلف کی اس کامیاب کوشش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قدر دانانِ ادب میں خاص قبولیت حاصل کرے گی۔

کاغذ سری رامپوری۔ کتابت و طباعت گوارا۔

منتخب دیوانِ غالب معہ شرح:۔ از نور اللہ محمد نوری صاحب۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۸۲ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ قریباً ایک روپیہ ہوگی۔ ملنے کا پتہ:۔ غلام دستگیر تاجر کتب چار کمان حیدرآباد دکن

غالب کے متعلق اردو میں جسقدر کتابیں لکھی گئی ہیں کسی اردو شاعر کے متعلق نہیں لکھی گئیں۔ آئے دن غالب کی ایک نہ ایک سوانحعمری، شرح دیوان یا انتخابِ دیوان وغیرہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب بھی دیوان غالب کا مشرح انتخاب ہے لیکن انتخاب میں کسی خاص معیار کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اکثر عمدہ غزلیں شامل نہیں کی گئیں اور بعض معمولی اشعار شامل کر لئے گئے ہیں شرح میں بھی کوئی خاص جدت نہیں۔ اکثر جگہ "اردوئے معلےٰ" سے مدد لی گئی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اچھی ہے۔ کتابت و طباعت کتاب داغ ایسی کاغذ اس سے عمدہ ہے۔

زندگی:۔ از (ضیاءالملک) ملا رموزی۔

سائز عام۔ ضخامت ۳۱۲ صفحات۔ قیمت ۱۲؍۔ ملنے کا پتہ:۔ غلام دستگیر تاجر کتب حیدرآباد دکن

ملا رموزی کے سترہ فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ آغاز میں ملا صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس میں اردو میں فکاہی مضامین کے فقدان کا رونا روتے ہوئے اپنی "شانِ نزول" بیان فرمائی ہے۔ مزاح نگاروں کے باہمی نزاع کا ذکر بھی کیا ہے۔

مضامین میں "کھانسی"، "غصہ"، "نمائش"، "خوشامد"، اور "دفتری ملازم" وغیرہ دلچسپ اور عمدہ ہیں۔ باقی معمولی۔ بعض میں وہی عامیانہ مذاق علیگڈھ اور ننھے میاں کی والدہ وغیرہ کے قصے۔ کتابت و طباعت اچھی۔ کاغذ حسبِ سابق۔

مجلہ طیلسانیین:۔ مجلس طیلسانیین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ جو جنوری ۱۹۳۷ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ جس کے منتظم اعزازی سید مہدی حسین (عثمانیہ) اور مجلس ادارت میں ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری ایم۔اے۔ عبدالمجید صدیقی ایم۔اے۔ غلام دستگیر رشید ایم۔اے۔ سید محمد ایم۔اے۔ ایسے فاضل حضرات شامل ہیں۔ قلمی معاونین میں تمام جامعہ عثمانیہ کے فارغ التعلیم نظر آتے ہیں۔ مضمون ٹھوس اور علمیت سے لبریز ہیں۔ افاداتِ فلسفہ، عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست۔ فقہ اسلامی کی ابتدا اور ترقی۔ اردو ادب بیسویں صدی میں بہترین مقالے ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد ہر صاحبِ ذوق رسالہ کی علمی و ادبی خدمت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظمیں بھی نہایت بلند پایہ ہیں۔ آخر میں انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی روئداد بھی درج ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت بہترین۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ چندہ سالانہ ۳؍ (سکہ عثمانیہ) علاوہ محصول ڈاک۔ خط و کتابت کا پتہ:۔ سید مہدی حسین (عثمانیہ) منتظم اعزازی

محلہ طبلبسائیٹین - بازار گھانسی - حیدرآباد دکن ۔

"لائلپور اخبار" لائلپور - کارونیشن نمبر :- "لائل پور اخبار"
چند سال سے دیہات سدھار کمیٹی ضلع لائل پور کی زیر سرپرستی، کسانوں
اور زمینداروں کی بہترین خدمت انجام دے رہا ہے - ملک معظم
شہنشاہ جارج ششم تاجدار برطانیہ و قیصر ہند کی تاجپوشی کے موقع پر
اس کا کارونیشن نمبر شائع ہوا ہے - جس میں ملک معظم، ملکہ معظمہ اور
شاہزادیوں کے سوانح حیات کے علاوہ قدیم و موجودہ رسوم تاجپوشی
کے متعلق مضامین اور ملک معظم کی تاجپوشی کے قصائد منظوم درج
ہیں - پانچ فوٹو بلاک تصاویر بھی زینت اخبار ہیں - آنریبل سر سکندر حیات خان
چیف منسٹر پنجاب - مسٹر سی - سی گاربٹ کمشنر ملتان - مسٹر ایف - ایل
برین - کمشنر محکمہ اصلاح دیہات پنجاب - مسٹر اے - اے میکڈانلڈ ڈپٹی
کمشنر امرتسر - مسٹر ڈی پی سیلنٹن ڈپٹی کمشنر لائل پور اور آنریبل میجر
ملک خضر حیات ٹوانہ وزیر پنجاب کے پیغامات مظہر ہیں کہ اخبار کو
پنجاب کے محکمہ اصلاح دیہات میں خاص امتیاز حاصل ہے - ہم
اس کامیاب "کارونیشن نمبر" کے لئے ادارہ تحریر خصوصاً محمد رمضان
صاحب سرور بی - اے جائینٹ ایڈیٹر کو مستحق تبریک سمجھتے ہیں، جن
کی مساعی سے یہ کامیاب نمبر مرتب ہوا ہے -

اخبار تعلیم لاہور - نظام سلور جوبلی نمبر :- ہفتہ وار
اخبار تعلیم مدت سے تعلیمی حلقوں کی خدمت انجام دے رہا ہے -
جس کے ایڈیٹر منشی طالب علی پابند قریشی ہیں اس کا نظام سلور جوبلی نمبر
بغرض ریویو موصول ہوا - اعلیٰ حضرت حضور نظام کی سیرت، ہز اگزالٹڈ
ہائی نس میر عثمان علیخان - خانوادہ آصفیہ - مملکت آصفیہ کے جغرافیائی
حالات - دولت آصفیہ کے تعلیمی حالات - جسین سالگرہ وغیرہ قابل
دید مضامین ہیں - ٹائٹل پیج سنہری رنگ میں چھپا ہوا ہے - کاغذ
کتابت و طباعت عمدہ - قیمت فی پرچہ درج نہیں - چندہ سالانہ
چھ روپے ۔

ترکان احرار باتصویر (طبع ہفتم) :- مؤلفہ جناب
محمد عبدالمجید صاحب عتیقی سائز ۱۸×۲۲ حجم ۲۱۶ صفحات - قیمت
فی جلد عہ مجلد سنہری عہ ملنے کا پتہ :- کامل بک ڈپو (طبی مرکز اشاعت)
لاہور -

اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن ریویو کے لئے موصول ہوا -
اردو کی کسی کتاب کا لگاتار سات بار شائع ہونا اس کی انتہائی مقبولیت
کا ثبوت ہے - سچ تو یہ ہے کہ جناب عتیقی نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف
مسلمانوں کی بلکہ اردو علم و ادب کی بہترین خدمت انجام دی ہے -
کتاب ترکی کی پچیس سالہ خارجی و داخلی سیاست کا دلکش تذکرہ اور
ترکوں کی جرأت، ایثار، صداقت، بلند عزمی اور حب الوطنی کے
غیر فانی واقعات کا سبق آموز ذخیرہ ہے - جسے پڑھنے سے مردہ
دلوں میں حرکت اور جوش پیدا ہو جاتا ہے -

کتاب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک، غازی انور پاشا، غازی
عصمت پاشا، غازی رفعت پاشا، جنرل نورالدین پاشا، غازی محمود شوکت
پاشا، غازی رؤف پاشا، غازی احمد مختار پاشا، غازی محمود مختار پاشا،
ایسے مجاہد ترکوں اور خالدہ ادیب خانم، شوکت بلقیس خانم، فاطمہ علیا
خانم اور فاطمہ یوسف خانم ایسی حریت نواز و محب قوم خواتین
کے حالات پر مشتمل ہے - آخر میں سعد زاغلول پاشا اور دیگر احرار
مصر کے سوانح حیات بھی درج ہیں - کتاب کے آغاز میں ظفر الملت
حضرت مولانا ظفر علیخاں مدیر زمیندار کا فاضلانہ مقدمہ ہے جسے
تاریخ حریت ترکی کا جامع خلاصہ سمجھنا چاہیئے -

جس کتاب کے متعلق امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مسیح الملک
حکیم محمد اجمل خاں (مرحوم)، رئیس الاحرار مولانا محمد علی (مرحوم) لسان العصر
حضرت اکبر الہ آبادی (مرحوم) اور ملک کے مشہور رہنما، اخبار نویس
حضرات کے علاوہ خود غازی رؤف پاشا، خالدہ ادیب خانم اور
فخری پاشا ایسے مجاہد ترک رطب اللسان ہوں اس کی تاریخی و ادبی
افادیت کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے - ہر حریت پسند مسلمان
اور محب وطن ہندوستانی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے - کاغذ اعلیٰ -
کتابت و طباعت نفیس -

کتب و رسائل موصولہ :-

ماہانہ "پیام ادب"، پندرہ روزہ "نواب صاحب" ماہانہ
"شاعر" سالگرہ نمبر - مجلہ "عثمانیہ" جشن سیمیں نمبر - ان پر اگلے نمبر میں تبصرہ کیا
جائے گا -

یزدانی

کے مقابلے میں ہندی کا کوئی خاص روزانہ اخبار نہیں "ملاپ" نے ایک ہندی ایڈیشن نکالا ہے جس کی اشاعت پانچ سات سو سے آگے نہیں بڑھی۔

لاہور سے اردو کے بے شمار ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ رسالے بھی نکلتے ہیں، لیکن ہندی کا کوئی اعلیٰ درجہ کا ہفتہ وار اخبار یا ماہانہ رسالہ نہیں چھپتا۔ انہیں باتوں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں پنجاب کو اردو کا مرکز مانا جاتا ہے اور یہ ہے بھی ٹھیک! ہندوستان کے باقی صوبوں کے روزانہ ہفتہ وار اور ماہانہ اخباروں اور رسالوں کی تعداد مل کر بھی لاہور کے اردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد سے کم رہتی ہے۔

میں نے اس تقریر میں دو باتیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اول یہ کہ ہندی ہی صوبجاتِ متحدہ، صوبجاتِ متوسط، اور وسطِ ہند کی دیسی ریاستوں کی اصلی زبان ہے اور یہی درجہ پنجاب، صوبہ سرحد اور کشمیر میں اردو کو حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ عملی طور پر اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان نہیں سمجھا جا سکتا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے رسم الخط مختلف ہیں۔ ایک فارسی میں لکھی جاتی ہے۔ اور دوسری ناگری میں۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے پنجاب میں اردو رسم الخط جاننے والوں کی تعداد نو لاکھ ساڑھے آٹھ ہزار ہے اور اس کے برعکس گورمکھی، ہندی اور انگریزی جاننے والوں کی تعداد مل کر بھی سوا چار لاکھ سے زیادہ نہیں۔

اگر صوبجاتِ متحدہ اور دیگر صوبوں کی تمام پڑھی لکھی آبادی کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ تو ہندوستان بھر میں فارسی رسم الخط جاننے والوں کی تعداد ناگری رسم الخط جاننے والوں کی تعداد کے تقریباً برابر ہو جاتی ہے۔ اس لئے بعض حضرات رسم الخط کے جھگڑے کا حل یہ پیش کرتے ہیں کہ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط اُڑا دئے جائیں اور ان کی بجائے رومن رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔ یہ لوگ ترکی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ترکی ایک چھوٹا سا ملک ہے جہاں کی عام زبان ایک ہے۔ ایسے ملک میں زبان یا رسم الخط کا ایک ہونا یا کر دینا ہندوستان کی بہ نسبت آسان ہے جو ترکی کے مقابلے میں ایک وسیع برِ اعظم ہے اور جس میں مختلف نسلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگ بدیسی حکومت کے نیچے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

غرض رسم الخط کا سوال بہت اہم ہے اور اس کا حل بہت مشکل! موجودہ حالات میں شاید رومن رسم الخط ہی ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ لیکن فارسی، ناگری اور گورمکھی کو چھوڑ کر اسے قبول کرنے کی کوشش کی گئی تو لوگوں کی زبانوں سے اور اخباروں کے کالموں میں یہ الفاظ سنے اور دیکھے جائیں گے" مذہب خطرے میں!"

(ہمایوں)　　　　پروفیسر سومناتھ چب بی۔ اے

ادب کیا ہے؟

ادب کے گہرے مطالعہ کی کیوں ضرورت ہے؟ اور ہم کو ادب کے متعلق وسیع معلومات کیوں حاصل کرنا چاہیئے؟

ادب اس دنیا کا دل ہے جسے دنیا کی ہر خوشی اور غم، اور دنیا میں بسنے والے انسانوں کی امیدیں اور ان کے شیریں خواب، ان کا غم و غصہ، حسنِ فطرت کے لئے ان کا جذبۂ احترام اور رازہائے سربستہ کا ڈر، یہ سب مل کر پر پرواز دیتے ہیں۔ انسانی دل ابدی طور پر خودشناسی کی پیاس سے، اتنی قوت کے ساتھ تڑپتا ہے گویا اس میں فطرت کے تمام وہ مادے اور قوتیں جن کی بدولت انسانی شخصیت کی تخلیق و ترقی ہوتی ہے زندگی کا مقصد اور مطلب صاف طور پر بیان کرنے کے لئے بیچین ہیں۔ انسان کی ہستی اس کی ذہانت اور پیچیدگیوں کی بہترین مظہر ہے۔

ادب کو دنیا کی سب کچھ دیکھنے والی آنکھ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کی نگاہ روحِ انسانی کی عمیق ترین تہوں کو چیر کر پہنچتی ہے۔ ایک معمولی سی کتاب، جس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت دنیا کے طلسمی عجائبات میں ہے۔ ایک لکھنے والا جسے ہم جانتے بھی نہیں سیکڑوں میل کے فاصلہ پر بیٹھا ہوا بعض اوقات ایک نامعلوم زبان میں کاغذ پر کچھ نشانات بنا دیتا ہے۔ جن کو ہم حروف کہتے ہیں اور کتاب لکھنے والے سے دور اور ناواقف ہونے کے باوجود جب ہم اس کے لکھے ہوئے حروف پر نظر ڈالتے ہیں تو یکایک اس تحریر پر تمام الفاظ اور خیالات، محسوسات اور محاکات کے معنی ہم پر روشن ہو جاتے ہیں۔ ہم مناظرِ قدرت کی تعریف کرتے ہیں، مکالمہ کی دلآویز ہم آہنگی اور الفاظ کی موسیقی سے خوش ہوتے ہیں، کبھی آنسوؤں کے تار ہیں، کبھی غصہ میں بھرے ہوئے، کبھی خواب دیکھتے ہوئے اور کبھی

مختلف رنگوں میں چھپے ہوئے صفحات پر ہم روحانی زندگی کو پا جاتے ہیں۔ خواہ ہم اس سے پہلے سے مانوس ہوں یا نہ ہوں۔ غرض انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں مستقل قوت اور دائمی آسودگی کے لحاظ سے ایک کتاب دنیا کا سب سے زیادہ پیچیدہ اور عظیم الشان معمہ ہے۔

ادب ہماری غلطیوں اور حیرانیوں، ہمارے اسلاف کی خوبیوں اور ناکامیوں کی معتبر اور زندہ تاریخ ہے۔ جس میں نظام تخئیل پر بے پناہ اثر ڈالنے، جبلی عادتوں کی بدنمائیوں کو درست کرنے اور قوتِ ارادہ کو منظم کرنے کی پوری قوت ہے۔ ادب کو ایک دن اپنی یہ آفاقی خدمت پوری کرنا ہو گی۔ خدمت اور قوت کا وہ کارنمایاں جو استقلال اور ہوشیاری سے لوگوں کو اُن کے آلام اور خواہشات سے باخبر کر کے اور ان کی زندگی کو پُر مسرت بنانے کی خواہش میں ہم آہنگی کا آزاد اور خوبصورت شعور کرتا ہے، قوموں کو متحد بنا دیتا ہے۔

(زمانہ) میکسم گورکی

رباعیات حضرت ابوسعید ابوالخیر

فارسی شاعری میں "رباعی" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قریب قریب ہر شاعر نے اس منزل میں تخیلات کو جلاں کیا ہے۔ رباعی بظاہر جسقدر آسان نظر آتی ہے، اسی قدر مشکل بھی ہے۔ جب تک کوئی شاعر ایک عرصے کی مشق کے بعد اظہارِ مطلب پر کافی قدرت حاصل نہ کر لے، رباعی کی منزل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جن نومشق شعراء نے اس صنعت کو ہاتھ لگایا ہے، وہ اکثر و بیشتر ناکامیاب ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رباعی کا اگر ایک مصرع بھی پھس پھسا اور غیر وزنی ہو تو رباعی کا وزن بہت کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ رباعی میں شاعر کی قادر الکلامی، قدرتِ زبان، اظہار بیان کی خوبی اور الفاظ کے صحیح استعمال کی قابلیت کا بھرم کھلتا ہے۔ اس کے بعد بلندیٔ خیال کی باری ہے۔ رباعی میں جب تک کوئی خاص بات پیش نہ کی جائے۔ رباعی کی غرض و غایت ہی پوری نہیں ہوتی، کامیاب رباعی سو نظموں اور پچاس غزلوں پر بھاری ہوتی ہے۔

فارسی شعراء میں عمر خیام کو بہ حیثیت رباعی گو شاعر کے نہایت ہی بلند رتبہ حاصل ہے۔ عمر خیام کی عظمتِ شاعری سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُس کی ایک ایک رباعی دل و دماغ کو کیف و مستی میں غرق کر کے، خیال کو اس دنیا میں پہنچا دیتی ہے، جہاں عشرت و مسرت کے سرمدی چشمے اُبلتے ہیں، اور ذرہ ذرہ سے شراب اُبلتی ہے۔ خیام ایک مفکر فلسفی تھا، اپنے غور و تفکر کا نچوڑ اس نے رباعیوں کی صورت میں دُنیا کے سامنے پیش کیا، لیکن حیرت ہے کہ ایران سے زیادہ اس کی قدر یورپ نے کی، اور اس وقت جبکہ خیام کے ایران میں بہت کم جاننے والے تھے، یورپ کے علمی اداروں میں اس کی پرستش ہو رہی تھی۔ یورپ نے خیام کی بارگاہ میں عقیدت کا خراج کس لئے پیش کیا؟ اس سوال کے جواب کے لئے کسی خاص غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ یورپ پر ان دنوں عیش و مسرت کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور وہ ہر اُس تحریک کو سراہتا ہے جو عیش و مسرت کے محرکات کو قوی بناتی ہو، خیام کے فلسفے کا دار و مدار ہی اس خیال پر ہے کہ "کھاؤ، پیو، مزے اُڑاؤ، اور مسکراتے ہوئے چلے جاؤ۔" خیام دُنیوی آلام و مصائب کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ چاہتا ہے کہ بوریہ نشیں فقیر بھی فاقے کی حالت میں عیش و راحت کے تصور سے لُطف لیکر زندگی کے لمحے گزار دے۔ خیام کی دنیا میں فکر و مصیبت کا وجود ہی نہیں۔ وہاں تو راحت و مسرت کے ساز چھڑے ہوئے ہیں۔ عشرت و شادمانی کے کنول روشن ہیں۔ اور کیف و مستی کے پیمانوں میں رنگین تمناؤں کی شراب ڈھل رہی ہے۔ خیام سے بہت پہلے اسی فلسفہ کو لذتیئن گروہ کے امام "ایپی کورس" نے پیش کیا تھا، جس کی یورپ میں بہت کچھ قدر کی گئی۔

شعر کی دُنیا صرف شراب و نغمے تک ہی محدود نہیں ہے، مشرقی شاعری کا بڑا سرمایہ تصوف و اخلاق سے عبارت ہے، تصوف و اخلاق مشرقی ادب کا طغرائے امتیاز رہا ہے اور یہی نقطہ ہے جہاں پہنچ کر مشرق و مغرب کی حدیں جُدا ہو جاتی ہیں۔ خیام نے بھی تصوف کے موضوع کی اپنی رباعیوں میں بہت کچھ تشریح کی ہے۔ لیکن اکثر مقامات پر اُس کی سرمستی کا نشہ ضرورت سے زیادہ تیز ہو گیا ہے، جس کو دیکھ کر یورپ والے تو اپنے ذوق کے مطابق یہی سمجھ بیٹھے کہ خیام درحقیقت ایک رند ہوسناک تھا، یورپ کے نظریہ سے متاثر ہو کر، مشرقی ادیبوں نے بھی خیام کے متعلق دھوکا کھایا ہے، اور وہ خیام کی رباعیوں کو پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان رباعیوں کا مصنف ہر وقت شراب کی بھٹی کے ارد گرد چکر لگایا کرتا تھا۔ بہرحال اس غلط فہمی کا دُور کرنا میرا موضوعِ بیان نہیں ہے۔ میں اس تمہید کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کیف و مستی

سے قطع نظر کر لی جائے تو جہاں تک تصوف و اخلاق کا تعلق ہے، حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ کا پایہ بحیثیت رباعی گو شاعر کے تمام شعراء سے بلند ہے۔ یورپ شاید حضرت ابوالخیر کے نام سے آشنا بھی نہ ہوگا، اور اُسے ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ تصوف و اخلاق مغربی ادب کے موضوع سے خارج ہے، جہاں دن رات وسکی اور برانڈی کے دور چلتے ہوں، عریاں رقص کے مناظر پیش کئے جاتے ہوں، حمیت و غیرت کے دامن قدس کو پارہ پارہ کیا جاتا ہو، وہاں حضرت ابوالخیر کے نغمہ ہائے تصوف کو کوئی کیوں سننے لگا۔

بعض خصوصیات:۔

حضرت ابوالخیر شاعر ہونے کے علاوہ ایک پاکباز صوفی اور خدا شناس متفکر تھے، اُن کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر سنی سنائی باتیں بیان نہیں کر رہا، بلکہ آپ بیتی سنا رہا ہے۔ اُن کے کلام میں درد ہے، سوز و گداز ہے، حقائق کی صحیح ترجمانی ہے اور تصوف و عرفان کی وہ خوشگوار چاشنی ہے، جس کے لئے انسانی روح ہر وقت بے تاب رہتی ہے، اُن کی رباعیاں عرفان و حقیقت کے رنگین جام ہیں، جس کے پینے کے بعد دل جذبات کی زبان میں پکار اُٹھتا ہے:۔

عشق از اوّل و آخر ہمہ ذوق است و سماع
ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

حضرت ابوالخیر مشکل سے مشکل مسئلہ کو اس خوبی کے ساتھ حل فرماتے ہیں کہ دل و دماغ تفکر کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ اُن کے اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر رُوح القدس کی زبان سے عرفان کا پیغام دُنیا کو دے رہا ہے اور وہ سارے عالم کو اُس سطح پر لے آنا چاہتا ہے جہاں حرم و کلیسا کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔

مولینا رومؔ تصوف کے امام گزرے ہیں، اُن کی مثنوی کے متعلق کہا گیا ہے ع

"ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

لیکن ان تمام اوصاف و محاسن کے باوجود، فنِ شعر کے اعتبار سے مولینا رومؔ کا کلام کوئی خاص درجہ نہیں رکھتا۔ ان کے یہاں حشو و زوائد بھی ہیں اور شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اگر مثنوی مولینا رومؔ کی تحلیل کی جائے تو بہت سی جگہ وجدانِ شعری کو پریشان ہونا پڑے گا۔ اس کے برخلاف حضرت ابوسعید ابوالخیر کا کلام شعری محاسن سے لبریز ہے، اُن کے یہاں حافظِ شیرازؔ کی مستی، اور سعدیؔ کی سلاست پائی جاتی ہے۔ اُن کا کلام پڑھ کر جس طرح رُوح وجد کرتی ہے اسی طرح زبان چٹخارے لیتی ہے اور وجدان لذّت اندوز ہوتا ہے، اس زمانے میں جب کہ شعر کو اخلاق و تصوف سے دُور کیا جا رہا ہے، حضرت ابوالخیر کی رباعیوں کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

(ساقی) ماہر القادری

مادری زبان ذریعۂ تعلیم

کیا یہ لوگ ہمیشہ کے لئے اپنی اور ہندوستان کی تمام دوسری جماعتوں کی تعلیم کو اس خیال سے مسخ اور بے رُوح رکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں کسی دوسری زبان یا زبانوں کو ملک میں برتری حاصل نہ ہو جائے؟ شاید آپ نے اس بڑھیا کا قصّہ سُنا ہوگا جو یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کمر سیدھی ہو جائے بلکہ یہ آرزو رکھتی تھی کہ دوسروں کی کمر بھی اس کی طرح کُبڑی ہو جائے؟ کیا ہماری ذہنیت اس کُبڑی بڑھیا سی ہو گئی ہے، اگر آپ کو اپنی زبان سے واقعاً اُنس ہے اور آپ خلوص سے چاہتے ہیں کہ اُسے ملک میں وہ درجہ حاصل ہو جس کی کہ وہ مستحق ہے۔ تو اس کی خدمت پر کمربستہ ہو جائیے اور اس کی خدمت کی بہترین صورت یہی ہے کہ آپ جرأت کے ساتھ اپنی تعلیمی پالیسی پر نظر ثانی کریں۔ اردو کو اپنے اسکولوں کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں جہاں کہیں وہ بولی جاتی ہے وہی درجہ دیں جو دوسرے اہم مضامین کو حاصل ہے اور اسے نیچے سے اوپر تک ذریعۂ تعلیم بنائیں۔ اس طرح اردو زبان میں وسعت پیدا ہوگی۔ اردو ادب مالا مال ہوگا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کو اس کی طرف زیادہ توجہ ہوگی۔ مختلف علوم و فنون کی کتابیں اس میں تصنیف اور ترجمہ ہوں گی۔ جدید خیالات اور جدید اسالیبِ بیان اس میں راہ پائینگے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارے تخلیقی سوتے جو ایک بے رُوح اور خلافِ فطرت طریقۂ تعلیم کی وجہ سے خشک ہو گئے ہیں دوبارہ رواں ہو جائیں گے۔ اور پھر کوئی مخالف قوّت یا تعصّب اس کی حق تلفی نہیں کر سکے گا۔ برخلاف اس کے اگر آپ دوسری ہندوستانی زبانوں سے ڈریں گے خوفزدہ اور بدحواس بچوں کی طرح ایک غیر زبان کا دامن پکڑینگے۔ اپنی زبان کو حقیر سمجھیں گے۔ تو میں آپ کو ایسے وقت کی بشارت دیتا ہوں جب

(بقیہ صفحہ ۱۹۸ پر دیکھیں)

صفحۂ اطفال

مدیر "پریم" کا خط شاہد جاوید درّانی کے نام

(۲)

نورِ نظر شاہد! پہلے خط میں تمہیں میں نے یہ ہدایت کی تھی کہ :-

(۱) کسی حال میں ہمّت نہ ہارو! خواہ حالات کیسے ہی ابتر ہوں۔

(۲) وقت کو کسی نہ کسی مفید کام میں لگائے رکھو۔

(۳) خدا پر اور خدا کے بعد اپنی قوّتِ بازو پر بھروسا کرو۔

(۴) ہر حال میں نیک نیّت رہو۔

(۵) اپنا چال چلن درست رکھو!

اس خط میں ہدایات کی تھوڑی سی تشریح کر دوں تو مناسب ہوگا۔

پہلی ہدایت کہ "کسی حال میں ہمّت نہ ہارو!" اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات اگر تمہارے خلاف ہوں تو حوصلہ ہار کر انہیں بد سے بدتر نہ بناؤ! بس خدا کا نام لے کر حالات کو اپنے موافق بنانے کی کوشش میں لگ جاؤ! یہ یاد رکھو! کہ انسان حوصلے اور ہمّت سے کام لے، تو بُرے سے بُرے حالات بھی درست ہونے لگتے ہیں اور انہیں سنوارنے کی دھن میں لگا رہے۔ تو ناممکن ہے کہ حالات موافق نہ ہو جائیں۔ بُرے حالات دیکھ کر جی چھوڑ دوگے۔ تو وہ اور بھی زیادہ خراب ہو کر تمہیں پریشان کریں گے۔ ایسے وقت آدمی کو اوسان اور حواس قائم رکھنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اوسان خطا ہوئے اور کام بگڑا۔ اوسان قائم رہیں تو دماغ کو حالات پر قابو پانے کی تدبیریں سوچنے کا موقعہ ملتا ہے اور پھر خدا کی مہربانی سے ایسی تدبیریں دماغ میں آنے لگتی ہیں۔ جن سے بگڑے بگڑائے حالات خود بخود موافق اور سازگار ہونے لگتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ناموافق حالات میں

(۱) اوسان قائم رکھو! پھر

(۲) خدا سے مدد مانگو! اس کے بعد

(۳) یہ دل میں ٹھان لو کہ ان حالات کو اپنے موافق بنا کر چھوڑوں گا۔

(۴) جب دل میں یہ بات ٹھان چکو تو اب خدا کا
نام لے کر سوچنا شروع کر دو۔ پھر دماغ میں جتنی تدبیریں
آئیں ان میں سے زیادہ مؤثر تدبیر سے کام لو اور دیکھو
کہ حالات کی ابتری میں کچھ کمی ہوئی یا نہیں؟ اگر یہ تدبیر
کارگر نہیں ہوئی، تو گھبرانے کی مطلق ضرورت نہیں۔ پھر سوچو
اور پھر دوسری تدبیر اختیار کرو! پھر بھی حالات بدستور بگڑ
رہے ہوں۔ تو دماغ پہ پھر زور دو! اطمینان سے حالات
پہ ایک نظر ڈالو اور دماغ سے مدد لے کر تدبیروں سے
کام لیتے رہو۔ مگر دیکھنا حالات کی درستی کے عزم وارادے
کو جنبش نہ ہونے پائے۔ سوچو پھر سوچو، باربار سوچو، اس
طرح سوچتے سوچتے کوئی ایسی تدبیر دماغ میں آجائے گی
کہ اس پر عمل کرنے سے بگڑے ہوئے کام سنورنے
شروع ہو جائیں گے۔ یہ بات یقینی ہے۔ اس میں بالکل
شک نہ کرو! تم اپنی مدد کرتے رہو۔ خدائے تعالیٰ تمہاری
مدد ضرور کرے گا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا طریقہ یہی ہے
کہ اپنے حالات کے سنوارنے کی دُھن میں لگے رہو۔
اس دُھن میں لگے رہے۔ تو خدا تمہارے عزم و ارادے
کو دیکھ کر بگڑے ہوئے حالات بنانے میں تمہاری مدد
کرے گا۔ تمہارے دماغ کو کوئی ایسی تدبیر سجھا دیگا۔
جو تمام حالات کو سنوار دے گی۔

شاہد! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ یہ فقط نظریہ[1] ہی نہیں
میرا ذاتی تجربہ بھی ہے اور بار بار کا تجربہ ہے۔ خدا نہ کرے
جس وقت تم حالات کو بگڑتا دیکھو۔ تو سمجھ لو کہ تمہیں اپنی
بہادری دکھانے کا وقت آیا ہے تنہائی میں طاقت و
اور اونچی آواز سے کہنا شروع کر دو کہ:۔

"میں انشاء اللہ حالات کو اپنے اوپر غلبہ نہ پانے
دوں گا۔ بلکہ انہیں مغلوب کر کے چھوڑوں گا۔ انہیں اپنے
موافق بنا کے دم لوں گا۔"

اور جب یہ کہنا شروع کرو، تو اپنے دل کو بھی اس
یقین میں شامل کرنے کی سعی کرو۔ اپنے دل پہ یہ بات طاری
کر لو کہ حالات کی ابتری کے مقابلے میں تم زیادہ طاقتور
ہو۔ تمہاری زبان تمہارے دل کو ہمنوا بنائے گی اور
دل تمہارے دماغ کو اس قابل بنائے گا کہ دماغ ساری
توجہ سے حالات کو سنوارنے کی تدبیریں بتانے لگے گا۔
جہاں تم نے یہ کیا تم دیکھو گے کہ حالات کی ابتری تمہیں
چیونٹی سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دے گی اور تمہاری
سوئی ہوئی تمام طاقتیں جاگ پڑیں گی۔ پھر تم اپنے کو
اس قابل پاؤ گے کہ حالات کے سر پہ چڑھ بیٹھو اور
ان کی لگام درستی کی جانب پھیر دو! ؎

الوالعزمانِ[2] دانشمند[3] جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پھاڑتے ہیں کوہ سے دریا گرتے ہیں

ہمت کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو۔ ہمت

[1] رائے۔ [2] ارادے کے پکے [3] سمجھ دار

تمہارے ساتھ ہے۔ تو سمجھ لو کہ خدا بھی تمہارے ساتھ ہے۔ ہمت ہار بیٹھے تو تم اکیلے ہو۔ نہ صرف اکیلے بلکہ بزدل بھی ہو۔ بیٹا! بزدلی انسان کو انسانیت سے گرا دیتی ہے۔ ہمت کرو۔ حوصلہ پیدا کرو۔ خدا تمہاری مدد کریگا۔ یہ سچ ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔"

تاجور

(بقیہ بزم انتخاب)

۲ پچھتانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ چڑیاں کھیت کو چگ گئی ہوں گی۔

(ندیم) خواجہ غلام السیدین ایم۔ اے

ایران میں تعلیمی ترقی

ایران کی وزارت تعلیم نے جو سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۳۶-۳۷ء لکھی ہے اس سے وہاں کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے، اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:-

۱- جدید اسکیم کے مطابق دارالسلطنت میں ابتدائی مدارس کے (۴۸) درجوں کا اضافہ کیا گیا (۱۱) نئے ابتدائی مدارس (۹) جدید ثانوی مدارس کے درجے (۱) بہت چھوٹے بچوں کا مدرسہ، اور (۵) مخصوص پیشوں کے درجے کھولے گئے۔

۲- صوبوں میں ابتدائی مدارس میں (۲۷۰) درجوں کا اضافہ کیا گیا، (۱۱۸) مدرسے چھوٹے بچوں کے لئے جدید طرز تعلیم کے کھولے گئے، ثانوی مدرسوں میں (۳۴) جدید اور اونچے درجوں کا اضافہ کیا گیا (۵) ابتدائی نارمل اسکول، (۲) چھوٹے بچوں کے مخصوص مدرسے (۸) معمل، اور (۲) کتب خانے قائم کئے گئے۔

۳- بالغوں کی تعلیم کے لئے طہران میں (۹۱) اور صوبوں میں (۶۵۹) درجے کھولے گئے۔

۴- ۱۹۳۶-۳۷ء میں تمام ملک میں اتنے مدرسے قائم ہوئے۔ لڑکوں کے لئے ابتدائی مدارس (۷۶۹) لڑکیوں کے لئے (۱۴۳) لڑکوں کے لئے ثانوی مدارس (۶۴) لڑکیوں کے لئے (۱۸)

۵- ۱۹۳۶-۳۷ء میں داخلوں کی تعداد:- ابتدائی مدارس میں (۸۵۲۱۵) لڑکے اور (۳۲۲۲۴) لڑکیاں، ثانوی مدارس میں (۶۷۷۸) لڑکے اور (۱۰۰۱) لڑکیاں۔

(معارف) ع۔ ز

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ

امریکہ کے ماہرین تعلیم کے سامنے اس وقت یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کا موجودہ تعلیمی نظام کہاں تک مناسب ہے اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کی کس حد تک گنجائش ہے، اس مسئلہ میں ماہرین کی دو مخالف جماعتیں قائم ہوگئی ہیں اور درجنوں کتابیں موافقت اور مخالفت میں لکھی جاچکی ہیں، ایک طرف وہ لوگ ہیں، جن کا خیال ہے کہ امریکن یونیورسٹیوں میں فنی (Vocational) تعلیم پر اس قدر زور دیا جانے لگا ہے کہ اب وہ مختلف پیشوں اور تجارتوں کی تعلیم گاہیں ہوکر رہ گئی ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یونیورسٹیوں میں خالص عقلی اور علمی تعلیم دی جائے۔ دوسری طرف اکثریت ان لوگوں کی ہے جو موجودہ نظام تعلیم کے حامی ہیں، اس بنا پر کہ یہ نظام قوم کے لئے مفید اور کارآمد ہے، اس دوسری جماعت میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت ڈاکٹر وائٹ ہیڈ (Alfred North White Head) کی ہے جو ہارورڈ یونیورسٹی کے شہرۂ آفاق استاد فلسفہ ہیں، موصوف کی رائے ہے کہ اگر یونیورسٹیاں فنی تعلیم میں ذرا بھی تخفیف کردیں گی، تو یہ ان کے لئے حد درجہ مضرت رساں ہوگا۔

اصلاح کے حامیوں میں پہلا نام ڈاکٹر ہچنیں (Robert Hutchins) صدر شکاگو یونیورسٹی کا ہے، ان کے نزدیک یونیورسٹی کی تعلیم میں مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کو اساس قرار دینا چاہئیے، یعنی تمام علوم کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دینی چاہئیے، تاکہ علم کی تمام مختلف شاخوں میں ربط و اتحاد پیدا ہوسکے۔ اس کے لئے ان کے خیال میں یہ ضروری ہے کہ کالج کے نصاب میں جو مضامین خالصاً کسی پیشہ یا فن سے تعلق رکھتے ہیں، وہ نکال دئے جائیں، کیونکہ عملی علوم کا باہمی اختلاف و تغایر تعلیمی انتشار کا سب سے بڑا سبب ہے۔ (معارف)